اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

(۶/۱۲۵)

اللہ ہی جانتا ہے کہ رسالت جیسے عظیم القدر منصب کی اہل کس قسم کی ہستی ہو سکتی ہے

مقامش عبدہٗ [illegible] ولیکن
جہانِ شوق [illegible] دگر است

مِعراجِ اِنسانیت

(معارف القرآن، جلد چہارم)

یعنی

سیرتِ صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینہ میں

تقدیمِ اخلاص پرویز

ناشر ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قیمت مجلد

کتاب [illegible] کا پتہ

ادارۂ طلوع اسلام

کراچی

مصنّف کا پتہ

پرویز

۲۳/۱ فادرلرز لائن

نیپئر بارکس کراچی ۲

س، کراچی میں طبع ہو کر، جے۔ بی۔ عارف، پرنٹر و پبلشر کی وساطت سے ادارۂ طلوع اسلام سے

شائع ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مطالب معارف القرآن

جلد چہارم

استقامت
صفحہ ۲۵۷ تا صفحہ ۳۱۷

مَرکزِ ملّت (تحویلِ قبلہ)

صفحہ ۳۸۱ تا صفحہ ۳۹۲

جہاد

صفحہ ۳۹۳ تا صفحہ ۵۱۴

سلسلۂ غزوات
صفحہ ۵۱۵ تا صفحہ ۵۹۵

(۱) غزوۂ بدر

معراج

جہان نو
صفحہ ۷۷۵ تا صفحہ ۷۹۱

ختم نبوت
صفحہ ۷۹۲ تا صفحہ ۸۲۸

غیر مسلم ائمہ فکر و تاریخ کی شہادات

محمد سے عظیم تر انسان کائنات نے

آج تک پیدا نہیں کیا۔

حضور ملت بیضا تپیدم

نوائے دل گدازے آفریدم

ادب گوید سخن را مختصر گو

تپیدم، آفریدم، آرمیدم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاتحۃ الکتاب

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام، دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے

معارف القرآن جلد سوم کے عنوان "تلک الرسل" کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا۔

طائرانِ حظیرۂ قدس کا وہ کاروانِ شوق جو صبحِ ازل، جھلملاتے تاروں کی سکوت افزا شبنمی چھاؤں میں، جانبِ منزل روانہ ہوا تھا، قندیلِ آسمانی کی بصیرت افروز و جہانتاب روشنی میں، زمزمہ سنج و نغمہ بار، جذب و کیف کی نورانی وادیاں طے کرتا، اس مقام تک آ پہنچا جہاں سے چراغ منزل، روشنی کے جگمگاتے مینار کی طرح، دور سے مسکراتا نظر آرہا ہے۔ وہ مقام جہاں اس منزل کی تکمیل ہوگی جس کے لئے خاک کے ذرّے، مختلف ارتقائی ادوار طے کرکے پیکرِ آدم میں متشکل ہوئے۔ اور یہ پیکرِ آب و گل، مقامِ شرف و مجد انسانیت کی طرف رواں دواں جادہ پیما ہوا۔..... یہ راحلۂ شوق اس وقت میقات میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دیکھئے ہر فرد کارواں مصروفِ احرام بندی ہے کہ اب اگلا قدم حریم کعبہ ہوگا۔ جب تک یہ کارواں تیاریوں میں مصروف ہے، آیئے ہم ان قطع کردہ راہوں پر ایک طائرانہ نگہِ بازگشت ڈالیں تاکہ گزری ہوئی منازل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور ہم ان شگفتہ و شاداب پھولوں کو دامن نگاہ میں لئے، ان کے ساتھ آگے بڑھیں۔ کہ اس سے آگے فاران کی مقدس وادی میں پہنچ کر، جہاں کا ہر سنگ ریزہ جلوہ فروش صد طور اور ہر ذرہ آئینہ نمائے ہزار سینا ہے، اس کی فرصت نہ مل سکے گی، کہ وہاں قلب کی ہر حرکت صرف نیاز اور نگاہ کی ہر جنبش وقفِ سجود ہوگی۔

میقات پر پہنچ کر، ہر زائرِ حریم قدس کا ولولۂ شوق تیز اور راحلۂ ذوق عناں گسیختہ ہو جاتا ہے کہ منزل کا قرب اور عید نظارہ کی کشش اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھر دیتی ہے۔ لیکن اس مقام پر میرا یہ عالم کہ ذوق و شوق کی تمام برق آسا بے قراریاں اور جذب و کیف کی والہانہ مستیاں یکسر حیرت بن گئیں کہ یہ وہ مقام تھا جہاں کا ہر ذرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید، جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

معارف القرآن کی پہلی جلدیں اس منزل تک پہنچنے کی تمہید تھیں۔ لیکن یہاں پہنچ کر، اس سدرۃ المنتہیٰ کی بلندی اور اپنے دستِ شوق کی کوتاہی شہوداً سامنے آگئی جس سے کیفیت یہ ہوگئی کہ جب بھی قلم اٹھانے کا ارادہ کیا

چشم بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

کا احساس فوراً عناں گیر ہوگیا۔ لیکن اس مقام پر بھی اُسی توفیق ایزدی اور رفاقتِ خداوندی نے میری دستگیری فرمائی کہ جس نے، بایں شکستہ بالی و ناتوانی مجھے یہاں تک پہنچنے کی ہمت عطا فرمائی تھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک نعم المولیٰ ونعم الوکیل۔

آسمانی سلسلۂ رشد وہدایت سے مقصود ومطلوب کیا ہے؟ اس کی تشریح وتبئین میں کتابوں پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن اگر اسے مجملاً چند الفاظ میں سمجھنا ہو تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی تمدنی اور معاشی زندگی یعنی ہیئتِ اجتماعیہ کو کس طرح اُن مستقل اقدار سے ہم آہنگ رکھ سکتا ہے جو ایک ہمہ گیر آفاقی ضابطۂ قوانین کی حیثیت سے، کارگۂ ہستی کو اس نظم وضبط، توازن واعتدال اور حسن و رعنائی سے نہ صرف سرگرمِ عمل رکھ رہی ہیں بلکہ اس کے تعمیری پہلوؤں کو بروئے کار لاکر، اسے تخلیقی ارتقار کے مراحل طے کراتے ہوئے رواں دواں جانبِ منزل لئے جارہی ہیں۔ قرآن میں اقوام وملل سابقہ کے احوال وکوائف اور حضرات انبیار کرام کے تذکار جلیلہ سے بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ جب انسان نے اپنے تمدنی اور معاشی نظام (یعنی حیات اجتماعیہ) کو آفاقی قوانین سے الگ کرلیا تو اس کا نتیجہ زندگی کی ان ناہمواریوں کی شکل میں سامنے آگیا جسے وہ فساد کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے کاروانِ انسانیت، شرف ومزیت کی طرف جانے کی بجائے سبعیت وبہیمیت کی پستیوں کے جہنم میں جاگرا۔ اور اس کے برعکس جب انہوں نے اپنی "زمینی زندگی" (حیاتِ ارضی۔ معاشی نظام) اور آسمانی اقدار میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کرلی (جسے تقویٰ کہا جاتا ہے) تو کس طرح زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی، اور عالم انفس وآفاق میں کس طرح شگفتگی وشادابی کی جنتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت یہ فساد اپنی وسعتوں اور گہرائیوں کے اعتبار سے پوری شدت اختیار کرچکا تھا لیکن نوعِ انسانی کے اس محسن اعظمؐ اور آسمانی انقلاب کے اس داعیٔ اکبرؐ کے تئیس ۲۳ سالہ سعی وعمل سے انسانی نظام حیات کے یہ تمام ناہموار گوشے یکسر ہمواریوں اور استواریوں میں بدل گئے اور انسانیت نے اس فردوس گم گشتہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے تبسم ریز وکوثر فشاں دیکھ لیا جس کی تلاش میں وہ قرنہا قرن سے حیران وسرگرداں پھر رہی تھی۔ لہٰذا سیرت محمدیہ درحقیقت تعارف و تاریخ ہے اس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اُس ذلت آمیز وکرب انگیز جہنم سے نکل کر جس میں اُسے ملوکیت کی ستبدانہ دراز دستیوں، پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا، بلندیوں اور ہمواریوں کی اُس روح پرور و نشاط انگیز جنت میں جا پہنچی

جس میں ہر متنفس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمرباری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء ۔ اس شجر طیب کی طرح جس کی جڑیں زمین (کے معاشی اور تمدنی نظام) میں محکم و استوار ہوں اور جس کی شاخیں آسمانی (اقدار مستقلہ کی) جنت در آغوش فضاؤں میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں۔ ذالک ھو الفوز العظیم۔

قرآن نے اس انقلاب عظیم کی تاریخ کو اپنی لوح محفوظ میں منقوش کر رکھا ہے تاکہ آنے والی نسلیں جب کبھی اپنے نظام زندگی کو فطرت کے صحیح خطوط پر متشکل کرنا چاہیں تو یہ تاریخی یادداشتیں (ذکریٰ للعالمین) ان کے لئے چراغ راہ بن سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تئیس برس پر پھیلے ہوئے اس انقلاب انسانیت کی تمام تفاصیل و جزئیات قرآن کے اندر نہیں مل سکیں گی کہ قرآن کا انداز یہی ہے کہ وہ اصولوں سے بیشتر اور جزئیات سے قلیل تر بحث کرتا ہے۔ اس لئے ان جزئیات کے لئے انسانوں کی جمع کردہ و ترتیب دادہ تاریخی یادداشتوں سے بھی استفادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز بڑی آسان سی نظر آتی ہے اس لئے کہ ہمارے ہاں کتب آثار و روایات سیرت طیبہ کے متعلق بڑا ذخیرہ موجود ہے، لیکن ایک قرآنی سیرت نگار کے لئے یہی مرحلہ سب سے زیادہ دشوار گذار ہے۔ اور یہ دشواری ہے قرآن اور تاریخ کی صحیح حیثیت کا تعین۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان فکر و نظر کی جس پریشانی و خلفشار اور خیالات و معتقدات کے تشتت و افتراق میں مبتلا چلا آرہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح تعلق کا عدم تعین ہے۔ یعنی اس نے قرآن اور تاریخ کا صحیح صحیح مقام متعین نہیں کیا جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی حقیقت اور دین کا صحیح مقام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا۔ اگر ہم قرآن کو اس کا صحیح مقام دیدیں اور تاریخ کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں تو ہماری بیشتر مشکلات کا حل آج ہی مل جائے۔

قرآن ایک حقیقت ثابتہ اور ایک یقینی صحیفہ ہے جس کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو نبی اکرمؐ کے حسن توسط سے امت کو ملا تھا۔ اس میں نہ کسی ریب و تشکیک کی گنجائش ہے نہ تغیر و تبدل کا امکان۔ لہذا جو کچھ قرآن میں ہے اسے بلا توقف و تامل حتمی اور یقینی قرار دیا جائے گا۔ لیکن تاریخ کی یہ حیثیت نہیں۔ تاریخ کی تدوین انسانوں کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے اور ان کوششوں میں کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتی جائے، ان کا ماحصل بہر کیف ظنی اور قیاسی رہے گا۔ لہذا تاریخ کو بہر حال قرآن کے تابع رکھنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس باب میں غلو برتا گیا اور دین کی تاریخ کو نہ صرف قرآن کے ہم پایہ (مثلہٗ معہٗ) سمجھ لیا گیا بلکہ اسے قرآن پر قاضی اور اس کا ناسخ تک قرار دیدیا گیا۔ یعنی ایک حتمی اور یقینی ذریعہ علم کو، جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، قیاسی اور ظنی ذریعہ علم کے تابع کر دیا اور اس بحث کو صرف علمی دائرہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے جزو عقیدہ اور عین دین بنا دیا۔ چنانچہ جب اس طرح تاریخ دین کا جزو بن گئی تو تنقید کی حد سے بالا ہو گئی۔ اس غلط نگہی سے دین میں جس قدر تضاد اور ملت میں جس قدر انتشار پیدا ہوا وہ ہماری

ہزار سالہ تاریخ اور مسلمانانِ عالم کی موجودہ تاسف انگیز حالت سے ظاہر ہے۔ اگر اس غلط بینی کا اثر صرف ہماری ذات تک ہی محدود رہتا تو بھی خیر، اسے طوعاً و کرہاً جھیل لیا جاتا۔ لیکن سب سے زیادہ ....

جگر سوز اور دل دوز یہ جانکاہ حدیث الم ہے کہ ہم نے تاریخ کو دین کی حیثیت دے کر، خود سیرتِ حضور سرور کائناتؐ کو مخالفین کی ہرزہ سرائیوں کا ہدف بنا کر رکھ دیا۔ اس "ظلم عظیم" کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جس نے غیر مسلم مصنفین کی مرتب کردہ کتب سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتابیں اس قسم کی خرافات و مزخرفات سے بھری ہوئی ہیں جن کے تصور سے ہماری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ لیکن ان کی بنیاد ان روایات پر ہوتی ہے جو ہمارے ہاں کی "صحیح ترین" کتب احادیث میں درج ہیں۔ ہم اُن غیر مسلم مصنفین کو تو موردِ طعن و تشنیع اور گردن زدنی و کشتنی قرار دیتے ہیں لیکن اُن روایات کے معصوم اور منزہ عن الخطاء ہونے کے عقیدہ کو بدستور اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم نے تاریخ کی ان یادداشتوں کو دین کا جزو اور تنقید سے بالا قرار دے رکھا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ، قرآن کے عین مطابق تھی۔ خود قرآن کریم میں حضورؐ سے بار بار ارشاد ہے کہ آپ وحی کی اتباع کریں اور اس کے سوا کسی اور راستہ پر نہ چلیں۔ خود حضورؐ نے بار بار اس کا اعلان فرمایا کہ میں صرف وحی کی اتباع کرتا ہوں۔ اگر قرآن میں یہ کچھ بصراحت مذکور نہ بھی ہوتا تو بھی اس حقیقت باہرہ میں کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ اتباعِ قرآنی کی مشہود صورت تھی۔ اس لئے کہ اگر رسول بھی اپنی وحی کی کامل اتباع نہیں کرے گا تو اور کون اس کے مطابق چلے گا۔ قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں بلفظہٖ موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر، ہمارے پاس ایک ایسا یقینی اور حتمی ذریعہ علم موجود ہے جس کی رو سے ہم بآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخ کا کون کون سا بیان درست ہے اور کونسا حصہ ناقابل اعتماد۔ یعنی اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور کتب سیر و احادیث میں نبی اکرمؐ کا کوئی قول یا عمل اس کے خلاف مذکور ہے تو ہم بلا تردد اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ تاریخ نے اس واقعہ کو صحیح شکل میں نہیں پہنچایا۔ اس لئے کہ جب کبھی ظن اور یقین میں تصادم و تباین واقع ہو تو یقین کو بہرحال صحیح تسلیم کیا جائے گا، ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً۔ ایک مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ قرآن میں ہے کہ کفار نبی اکرمؐ کے متعلق کہا کرتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) رجل مسحور ہیں، یعنی آپ پر کسی نے جادو کر رکھا ہے جس کی وجہ سے آپ (پناہ بخدا) اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (۱۷/۴۷)

جب یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے آدمی کی پیروی کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔

یہ کفار کا طعن تھا جسے قرآن نے "ظالمین کا عمل" کہہ کر پکارا ہے اور حضورؐ کے دامن شرف و مجد کو اس الزام سے پاک ٹھہرایا ہے۔ لیکن بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ روایت مذکور ہے کہ "حضور پر کسی نے جادو کر دیا تھا

حبس کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ آپ سمجھ لیتے تھے کہ میں فلاں کام کر چکا ہوں حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا (بخاری، جلد دوم صفحہ ۱۳۷ - مطبوعہ مصر) اب ظاہر ہے کہ قرآن کی مذکورہ صدر تصریح کے بعد اس روایت کا غلط ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں رہ سکتا - لیکن چونکہ بخاری شریف دین کا جزو قرار پا چکی ہے اس لئے اس روایت کے غلط سمجھنے والے کو "منکرِ حدیث" (لہٰذا دائرۂ اسلام سے خارج) قرار دیدیا جاتا ہے - اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تاریخ کو یقینیات کا درجہ دے کر اور دین کا جزو ٹھہرا کر ہم نے کس قدر مشکلات پیدا کر رکھی ہیں اور اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ ایک قرآنی سیرت نگار کے لئے تاریخ کے ان ذخائر سے صحیح معلومات کا الگ کرنا کس قدر دشوار گزار مرحلہ ہوگا - میں چونکہ تاریخی نظائر و شواہد کی صحت و سقم کے لئے صرف قرآن کو محور و معیار قرار دیتا ہوں اس لئے معارف القرآن کی پیش نظر جلد میں، جو قرآن کی رو سے مرتب کردہ سیرت طیبہ پر مشتمل ہے، یہی محکم اصول سامنے رکھا گیا ہے کہ تاریخ کی انہی جزئیات کو قابل قبول سمجھا جائے جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں -

اس مرحلہ سے آگے ایک اور دشوار گزار گھاٹی بھی قرآنی سیرت نگار کے راستہ میں حائل ہوتی ہے - ہماری کتب سیر و آثار میں، مخالفین کی تدلیسات و تلبیسات کے علاوہ (جس کی ایک مثال اوپر آچکی ہے) عقیدت مندوں کی شدت و غلو نے بھی کچھ کم مفتریات کا اضافہ نہیں کیا - حقیقت یہ ہے کہ جس طرح لوگوں نے خدا کو اپنے اپنے ذہن کے مطابق تراش رکھا ہے اسی طرح رسول کو بھی اپنے اپنے تصورات کے قالب میں ڈھال رکھا ہے - جو تصور کسی کو محبوب تھا اس نے ویسا ہی رسول کو بنا کر پیش کر دیا - اس لئے رسول اکرمؐ کی سیرت عظمیٰ کے بیشتر گوشے عقیدت مندوں کے اپنے اپنے محبوب و مرغوب تصورات کے افسانوی پیکر ہیں جنہیں انہوں نے عقیدت و ارادت کے نگاہ فریب پردوں میں لپیٹ رکھا ہے - ان عقیدتمندیوں نے نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کے صحیح خط و خال کو، محیر العقول مافوق البشریت اور تحیر انگیز خوارق کے دھندلکے میں اس طرح چھپا رکھا ہے کہ سیرت مقدسہ کا حقیقی پیکر کبھی نگاہوں کے سامنے آنے نہیں پاتا - قرآن نے اس ذات گرامی کا جو مرقع پیش کیا ہے وہ ایک چلتے پھرتے انسان کا سیدھا سادہ نقشہ ہے جو اپنے بیوی بچوں میں رہتا ہے - دوستوں سے ملتا جلتا ہے - کاروبار کرتا ہے جس میں اسے نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی - زندگی کے مراحل میں اسے رنج بھی ہوتا ہے راحت بھی، فتح بھی ہوتی ہے شکست بھی - وہ اپنے مقصد پیش نظر کے لئے انسانوں کی طرح تدبیریں کرتا ہے، اس میں اپنے رفقاء کار سے مشورہ بھی لیتا ہے اور ان کی رائے پر عمل بھی کرتا ہے - ان تدابیر میں کبھی سقم بھی رہ جاتا ہے جس کا علم ہو جانے پر اس کی تلافی کی جاتی ہے - وہ زندگی کے تضادات (CONFLICTS) سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو فریب نہیں دیتا کہ وہ تضادات مٹ گئے ہیں - وہ ان کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتا ہے اور اپنے قلب کے پورے سکون اور نگاہ کی کامل گہرائیوں سے ان میں عدیم النظیر اعتدال اور فقید المثال ہم آہنگی

(HARMONY) پیدا کرتا ہے جس سے حالات کی نامساعدت، حسین خوشگواریوں اور شگفتہ کامرانیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قرآن اس کی ان کامیابیوں کا راز، اس کا اپنی دعوت کی صداقت پر ایمان محکم اور اپنے نصب العین کے حصول کے لئے سعی پیہم میں قرار دیتا ہے۔ اس کے پاس سب سے بڑا معجزہ اس کی اپنی سیرت ہے۔ وہ سیرت مخالفین کے ہجوم اور دشمنوں کے ازدحام میں، اپنی صداقت کے ثبوت میں بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ اور اس شہادت کے خلاف کہیں سے ایک انگلی بھی نہیں اُٹھتی۔ یہ ہے وہ رسول جسے قرآن پیش کرتا ہے، اور پیش اس لئے کرتا ہے کہ آنے والے انسانوں کو بتا دیا جائے کہ جو شخص، انسانیت کے شرف اعلیٰ کے مقام بلند پر فائز ہوتا ہے اس کے خصائص و امتیازات ایسے ہوتے ہیں تم اپنے آپ کو اس معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ تم کہاں تک شرف انسانیت کے حامل ہو۔ تم جس قدر اس معیار پر پورے اترتے جاؤ گے اسی قدر تمہاری انفرادی صلاحیتیں نکھرتی اور اجتماعی زندگی سنورتی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کو مافوق البشر قرار ہی اس وقت دیا جاتا ہے جب قوم میں جذبۂ عمل اور جوشِ کردار باقی نہ رہے۔ اس وقت جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رسول نے یہ کچھ کر کے دکھایا تھا، لہٰذا تم بھی وہی کچھ کرو تو وہ اپنی کوتاہی ذوقِ عمل کو اس فریب نفس سے چھپانے کی سعی ناکام کرتے ہیں کہ صاحب! وہ تو خدا کے رسول تھے۔ ان کا مقام کچھ اور تھا۔ بھلا ہم "عاجز بندوں" کے لئے یہ کب ممکن ہے کہ ہم بھی وہی کچھ کر سکیں جو انہوں نے کیا۔ ہمیں ان سے کیا نسبت؟ فقدانِ عمل کا یہی وہ فریب تھا جس سے مسلمانوں نے خدا کو "رفیق اعلیٰ" کے بجائے پرستش کا محل OBJECT OF WORSHIP) قرار دے لیا اور رسول کو، ایک انقلاب آفریں تصورِ حیات کا عملی معمار اور ملت کی ہیئتِ اجتماعیہ کا اولیں مرکز سمجھنے کے بجائے عجائب آفرینیوں کا مظہر اور چیستانِ خیال کا پیکر تصور کر لیا۔ مسلمان نے خدا کا مفہوم اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ اس کے نام کی قسم کھائی جاتی ہے اور رسول سے اتنا ہی واسطہ کہ حضورؐ کے زلف و خط و خال کی تعریف میں قوالوں سے نعتیں سنی جاتی ہیں یا سال میں ایک مرتبہ عید میلاد کا جلوس نکال لیا جاتا ہے۔ زندگی کے عملی مسائل کا نہ خدا کے قانون سے کچھ تعلق نہ اس کے رسول کے متشکل فرمودہ نظام سے کچھ واسطہ!

معارف القرآن میں آپ کے سامنے حضور رسالتمآب کا وہی پیکرِ حسن و خوبی آئے گا جسے قرآن نے ایک جیتے جاگتے چلتے پھرتے، ایمان و عمل کے بلند ترین مقام پر فائز انسان کی سیرت کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جو ہر اس قوم کے لئے جو دنیا میں اس قسم کا خوشگوار انقلاب پیدا کرنا چاہے جسے نبی اکرمؐ نے متشکل کر کے دکھا دیا تھا، بہترین نصب العین بن سکتا ہے۔ اس سیرتِ طیبہ اور حیاتِ نیرہ میں کوئی پیچ و خم راہ نہیں۔ کوئی راز مستور نہیں۔ کوئی پس پردہ نہیں۔ ایک جگمگاتے ہوئے چراغ کی روشنی (سراجاً منیرا) جو ایک طرف خود اس چراغ کے ہر پہلو کو، دیدۂ بینا کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے اور دوسری طرف ہر شے کا اصلی مقام بھی متعین کر دیتی ہے۔ لیکن مسلمانوں نے جس طرح قرآن جیسے نیّرِ درخشندہ کو انسانی تصورات و تخیلات کے بادلوں میں چھپا رکھا اور اس طرح اس کی روشنی اور حرارت سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ ساری

دنیا کو محروم کر رکھا ہے، اسی طرح انہوں نے سیرتِ محمدیہ کے جگمگاتے چراغ کو بھی اپنے توہمات و معتقدات کے دبیز پردوں میں مستور کر رکھا ہے۔ آج ساری دنیا اس روشنی کے لئے مضطرب و بے قرار پھر رہی ہے اور بوالعجبی کہ ان ہی حیران و سرگرداں پھرنے والوں میں خود یہ قوم بھی شامل ہے جس نے اس نیّرِ درخشندہ و ضیائے تابندہ کو اپنے ہی دامن میں چھپا رکھا ہے، اور کوئی نہیں جو انہیں اس کا سراغ تک بھی بتائے۔ میرا ایمان ہے، اور میں اس ایمان کے سہارے زندہ ہوں کہ اگر آج بھی قرآن سے ان توبرتو پردوں کو الگ کر دیا جائے جو انسانی تصورات نے اس پر ڈال رکھے ہیں، اور سیرتِ محمدیہ کو ان حشو و زوائد سے پاک کر دیا جائے جو ہماری ناعاقبت اندیشیوں اور غلط عقیدت مندیوں نے اس ذاتِ اقدس و اطہر کی طرف منسوب کر رکھے ہیں، تو اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت، اب بھی زندگی کی اس متوازن و ہموار راہ پر لگ سکتی ہے جو اسے سیدھے شادابیوں اور کامرانیوں کی جنّت کی طرف لے جانیوالی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا مقصود انسانیت سازی ہے جس کا مشہود پیکر ذاتِ محمدی ہے (لیکن وہی مشہود پیکر جسے قرآن نے پیش کیا ہے) جب تک دنیا اس مقام تک نہیں پہنچ جاتی، شرف و مزیت کی فیروزمندیاں اس کے حصے میں نہیں آسکتیں۔ اور اس مقام تک پہنچنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن اور سیرت صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) دنیا کے سامنے اپنی اصلی شکل میں آجائے۔ معارف القرآن کا سلسلہ اسی مقصد کے حصول کی کوشش ناتمام ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

زیرِ نظر کتاب میں آپ کو ضمنی طور پر بعض ایسے مباحث دکھائی دیں گے جن کا تعلق تقسیم ہند سے پیشتر کے زمانہ سے ہے اور جن کی آج وہ اہمیت نہیں رہی جو اُن حالات میں تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جلد کا مسودہ اوائل ۱۹۴۷ء تک مکمل ہو چکا تھا اور بہت سے حصوں کی کتابت بھی وہیں ہو چکی تھی۔ اس کتابت شدہ حصہ میں ردّ و بدل اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس تمام حصہ کو ضائع کر کے، از سرِ نو کتابت کرائی جائے۔ اس کے لئے نہ وقت تھا نہ حالات سازگار۔ اس لئے ان مقامات کو علیٰ حالہ رہنے دیا گیا ہے۔ آپ انہیں پڑھتے وقت صرف اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ یہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی لکھی ہوئی باتیں ہیں۔ یوں بھی، ان وقائع و حوادث کا تذکرہ محض ضمناً آگیا ہے، اصل موضوعِ بیان کا کوئی اثر نہیں۔

معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلدیں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ یہ (چوتھی جلد) ۱۹۴۶ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہو جائے۔ اس لئے اس کے مسودہ کی تبییض اور کتابت ساتھ کے ساتھ ہوتی جا رہی تھی کہ اتنے میں تقسیم ہند کے عواقب میں پیدا کردہ خلفشار کی قیامت خیز آندھیاں اٹھیں۔ ہم مشرقی پنجاب والوں پر اس رستاخیز میں کیا گزری، اس کی یاد نہ ہی دلائی جائے تو اچھا ہے۔ البتہ معارف القرآن کے مسودہ اور کاپیوں پر کیا گزری؟ اس کا مختصر سا تذکرہ ناگزیر ہے۔ میرے دہلی چھوڑتے وقت ان کی کیفیت یہ تھی کہ

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

کچھ حصے دہلی میں، کچھ دیوبند میں، کچھ سہارنپور میں۔ چند ورق میرے ساتھ کراچی پہنچ گئے۔ باقی وہاں دوستوں اور کاتبوں کے پاس رہ گئے۔ اس سانحہ ہوش ربا کا صحیح اندازہ وہی مصنف لگا سکتا ہے جس کا مدت العمر کا سرمایہ اس مسودہ کی صورت میں اس طرح منتشر ہو جائے جس کی نقل بھی اس کے پاس نہ ہو۔ یہ مسودہ میری ذہنی کاوشوں ہی کا نتیجہ نہ تھا، میری قلبی عشق سامانیوں کا بھی ماحصل تھا۔ اس کی تسوید قلم کی روشنائی ہی کی رہین منت نہ تھی اس میں خونِ جگر کی سرخی بھی شامل تھی۔ ایک مدت اسی بیم و رجا میں گزر گئی کہ نہ معلوم یہ متاعِ عزیز، وجۂ نورانیتِ دیدۂ یعقوب بنتی ہے یا نہیں۔ اُس کے بعد اس مبداء فیض کی عاجز نوازیوں کے تصدق، یہ منتشر اوراق رفتہ رفتہ جمع ہونے شروع ہو گئے لیکن بایں نمط کہ اگر اصل ہے تو نقل نہیں اور اگر کہیں نقل ہے تو اصل نہیں، بایں ہمہ یہ جگر لخت لخت کسی نہ کسی شکل میں مجتمع ضرور ہو گیا فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ اس مقام پر بہت جی چاہتا ہے کہ ان مخلص احباب کا نام بہ نام شکریہ ادا کروں جنہوں نے میری اس متاعِ عزیز کی اس طرح حفاظت کی کہ انہوں نے گولیوں کی بوچھار اور سنگینوں کی یلغار میں بھی ان اوراق کو اپنے سینے سے الگ نہ کیا۔ لیکن اُن کا یہ اصرار کہ شکریہ کا اظہار خندیدۂ وزدیدہ سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے، عناں گیر ہو جاتا ہے اور قلم کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رشتہ جو قرآن کی رو سے پیدا ہو جاتا ہے رسمیات سے بہت بلند ہوتا ہے۔

ویسے تو میں معارف القرآن کی ہر جلد کے متعلق چاہتا تھا کہ وہ صوری حیثیت سے بھی "بالائے ہر بالا ترے" ہو لیکن جلد زیر نظر کے متعلق تو خاص طور پر میرا ارادہ تھا کہ اسے محبوب ترین انداز میں پیش کروں گا کہ یہ میرے شوق کی سدرۃ المنتہیٰ اور میرے ذوق کی جنت الماویٰ ہے۔ لیکن اس کے منتشر اوراق کی بازیافتگی کے بعد سے جن حالات میں طبع کرانا پڑا، ان میں محض کتاب کا چھپ جانا ہی غنیمت جانا۔ خطرہ تھا کہ اگر مساعدتِ حالات کے انتظار میں کچھ مدت اور گزر گئی تو تمام کتابت شدہ کاپیاں ضائع ہو جائیں گی۔ لہٰذا جس طرح بن پڑا کتاب کو محفوظ کر لینے کی کوشش کی گئی۔ اس کے باوجود، میری خوش بختی تھی کہ میرے نادیدہ کرم فرما، محترم عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کے خلوص و محبت نے وہ مرصع جدولیں عطا کر دیں جو "صبحِ بہار" کے دلآویز عنوان سے متصل باعثِ تزئین اوراق ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، دورِ حاضرہ کے بے مثل خوشنویس منشی محمد یوسف صاحب دہلوی، بروقت کراچی آپہنچے اور ان جدولوں کے خاکہ میں، اپنے قلم سحرکار کی گہر ریزیوں سے تابندگیٔ حسن کا موجب بن گئے۔ اس قسم کا قران السعدین بہت کم نصیب ہوا کرتا ہے۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

لیکن، میرے لئے طباعت کے نقصِ زیبائی سے کہیں زیادہ سوہانِ روح وہ غلطیاں ہیں جو اس افراتفری میں، کتاب کے قریب قریب ہر صفحہ پر موجود ہیں، میری کیفیت یہ ہے کہ اگر میرے کسی عام مضمون میں بھی کتابت کی غلطی رہ جائے تو

میرے کلیجہ پر چھری چل جاتی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ احساس کی اس شدت کے بعد کتاب زیرِ نظر میں اسقدر غلطیوں کی موجودگی میرے لئے کس قدر المناک ذہنی کوفت اور دردانگیز قلبی اذیت کا موجب ہوئی ہوگی۔ لیکن۔ قہرِ درویش بجانِ درویش سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایک رفیق نے ہمت کر کے اغلاط نامہ مرتب کر دیا ہے جو چند صفحات بعد آپ کے سامنے آجائے گا۔ اگر آپ کتاب پڑھنے سے پہلے ان غلطیوں کی تصحیح کی زحمت گوارا فرمالیں تو آپ راستہ میں قدم قدم پر پاؤں سے کانٹے نکالنے کی کوفت سے بچ جائیں گے۔
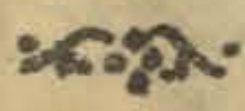
سلسلۂ معارف القرآن میں اب ہم اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں خدا کی طرف سے متعین کردہ دین حضور خاتم النبیینؐ کی حسن وساطت سے اپنی مکمل صورت میں، انسانوں تک پہنچ گیا اور جسے اب اس وقت تک غیر متبدل رہنا ہے جب تک انسانی کتاب زندگی کا دوسرا ورق نہیں الٹا جاتا۔ لہٰذا اب ہمارے سامنے یہ سوال آئے گا کہ یہ دین ہے کیا؛ اسلام کہتے کسے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ یہ سوال کونسا مشکل ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ لیکن جب آپ اس سوال کی سطح سے ذرا نیچے اتریں گے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اس سوال کا جواب ایسا آسان نہیں جیسا بظاہر نظر آتا ہے۔ اس کا جواب وقتِ نظر اور عمقِ فکر کا محتاج ہے۔

یہ ہمارا دعویٰ ہے (اور ہر مسلمان کا ایمان، کہ خدا کی طرف سے متعین کردہ دین، صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راہ، حق وصداقت کی راہ نہیں۔ اس کے مقابلہ میں کوئی مذہب نہیں آسکتا۔ اس کی نظیر وشیل پیش کرنا ناممکن ہے۔ لیکن جب آپ یہ پوچھیں گے کہ اسلام کی وہ کونسی تعلیم ہے جس کی بناء پر اس کا شریک وسہیم اور مثیل و نظیر نہیں ہو سکتا تو اس کے جواب میں یا تو یہ کہدیا جائے گا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو۔ زنا کے مرتکب مت ہو۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ وغیرہ، یا اس کے ارکان خمسہ کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ گنا دیئے جائیں گے۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ ان میں سے کونسی چیز ایسی ہے جو ہمارے اس دعوے کی دلیل بن سکتی ہے کہ اسلام ہی دنیا میں حق وصداقت کی راہ ہے، اس کا مثیل ونظیر ناممکن ہے؟ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، وغیرہ انداز کے اخلاقی نصائح دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کسی مذہب کے قائل نہیں اور خدا کی ہستی تک سے بھی منکر ہیں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے اور چوری کرنا قابل ستائش عمل ہے۔ باقی رہے، نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ

ؔ اسی بنا پر ابوالکلام صاحب آزاد نے کہدیا ہے کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں" اس لئے کہ ان کے سامنے اسلام کی تعلیم یہی چند اخلاقی مواعظ ہیں اور یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اگر اسلام کا صحیح تصور ان کے سامنے ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جو کچھ اسلام پیش کرتا ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔

شعائر و مناسک۔ تو ان کے بے مثل ہونے کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آخرت کی نجات ان ہی ارکان و مناسک کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن یہ دلیل بجائے خویش محتاج ثبوت ہے۔ یعنی فریقِ مخالف پوچھ سکتا ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ آخرت کی نجات ان ہی رسوم و مناسک سے مختص ہے دیگر مذاہب کے انداز و طرقِ پرستش سے نجات نہیں مل سکتی![1] لہذا اگر اسلام کی تعلیم کا ماحصل یہی چند اخلاقی نصائح اور پرستش کے شعائر و مناسک ہیں تو یہ کچھ تو اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے "ارکانِ دین" کے مصالح و حکم کو بطور شہادت پیش کر سکیں گے لیکن اس سے بھی اتنا ہی کہا جا سکے گا کہ عبادت کے یہ طریقے اور طریقوں سے اچھے ہیں۔ اس لئے یہ مقام بڑے غور و فکر کا مقام ہے۔ اگر اسلام فی الواقعہ یہی کچھ پیش کرتا ہے تو ہم اپنے آپ کو لاکھ اطمینان دلائیں، دنیا ہمارے اس دعوے کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگی کہ اسلام ہی حق و صداقت کی راہ اور خدا کا سچا دین ہے۔ اگر ہم اس دعوے کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ وہ اسلام کیا ہے جس کی مثل و نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

معارف القرآن کی آئندہ جلد جو اس وقت زیرِ ترتیب ہے، اسی سوال کا جواب ہوگی۔ جہاں تک میری بصیرتِ قرآنی میری راہ نمائی کر سکی ہے۔ میں یہ سمجھا ہوں کہ قرآن، انسانی زندگی کے مسائل (PROBLEMS OF LIFE) کا حل پیش کرتا ہے اور انسانیت کے سامنے ایسی راہیں کھولتا ہے، جو اسے ان مشکلات سے نکال کر جن میں آج دنیا اس بری طرح سے گرفتار ہے کاروانِ انسانیت کو اس کے مقصود و منتہیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ بتانا یہ ہوگا کہ مسائلِ حیات کے وہ کون سے حل ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے اور وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف وہ کاروانِ انسانیت کو لیجانا چاہتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ مسائلِ حیات کے حل، دنیا کے اربابِ فکر و سیاست بھی پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ کیا ان کے پیش کردہ حل قابلِ اطمینان نہیں ہیں؟ اگر یہ قابلِ اطمینان نہیں تو کیسے، اور ان کے مقابلہ میں قرآنی حل کامیاب قرار دیئے جائیں گے تو کس طرح؟ پھر اس سے یہ اعتراض پیدا ہوگا کہ اگر قرآنی حل ایسے کامیاب اور قابلِ اطمینان ہیں تو سب سے پہلے یہ اُس قوم کے مسائلِ حیات کو حل کیوں نہیں کرتے

---

[1] یہی دلیل ابو الکلام صاحب آزاد نے پیش کی ہے جب انہوں نے لکھا ہے کہ "دینِ حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی یہ راہ نہیں کہ عبادات کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی قسم کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی سے حاصل ہوتی ہے" (ترجمان القرآن)

ان کے نزدیک خدا پرستی خدا کی پوجا پاٹ ہے اور نیک عملی، ان اخلاقی نصائح کی پابندی جنہیں وہ عالمگیر سچائیاں قرار دیتے ہیں۔ لہذا اس اعتبار سے اسلام کو فی الواقعہ کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی!

جو قرآن پر ایمان رکھتی ہے اس قوم کی حالت تو یہ ہے کہ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مشکلات کے لیئے بھی مختلف دروازوں پر دستک دیتی نظر آرہی ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے جس نے غیر تو غیر، اکثر مسلمانوں کے دلوں کو بھی ان شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنا رکھا ہے جن کی بنا پر وہ بالعموم دبے الفاظ میں اور بسا اوقات کھلے بندوں یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ قرآن نے ایک خاص زمانہ کے مخصوص حالات کے ماتحت ایک نتیجہ پیدا کر دیا تھا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں کہ زمانہ کے اس قدر بدلے ہوئے حالات اور ایسے ایسے پیچیدہ مسائل کا خاطر خواہ حل پیش کر سکے۔ لہذا ہمیں اس "رجعت پسندانہ" مسلک کے بجائے، ان تحریکات کا ساتھ دینا چاہیئے جو دنیا کی قومیں، اپنے تجربہ کے بعد اختیار کر رہی ہیں۔ یہ شکوک و اعتراضات ایسے نہیں جنہیں محض ایک استہزائی لاحول کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے۔ اگر ہم قرآن کو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جو دور حاضرہ کے مسائل حیات کا اطمینان بخش حل اپنے اندر رکھتی ہے تو ہمیں ان تمام اعتراضات و شکوک کا سامنا علیٰ وجہ البصیرت کرنا ہوگا اور ان کا جواب دیانت اور متانت سے دینا ہوگا۔

یہ تمام مسائل و مشکلات اور شبہات و اعتراضات میرے سامنے ہیں آئندہ جلد ان ہی مباحث پر مشتمل ہوگی واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب

اس حقیقت کو میں معارف القرآن کی سابقہ مجلدات میں بار بار پیش کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہذا میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ نور قرآنی کے تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ۝ (۳۴/۵۰)

پرویز

۲۳/۱ فاؤلرز لائن
نیپیئر بارکس ۔ کراچی
۱۰ محرم سنہ ۱۳۶۹ھ
۲ نومبر سنہ ۱۹۴۹ء

کتبہ: سعید احمد

اغلاط نامہ

افسوس ہے کہ احتیاط کے باوجود اس جلد میں کتابت کی متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ان میں سے معمولی غلطیوں کو تو نظر انداز کر دیا گیا ہے البتہ جہاں حوالے اور نام غلط ہیں یا جن غلطیوں سے مضمون و مفہوم خبط ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ آپ کو زحمت تو ضرور ہوگی لیکن کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پیشتر کچھ وقت صرف کر کے ان غلطیوں کو درست فرمالیجیے۔ اس سے مطالعہ میں آپ کو سہولت ہو جائے گی۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۱۸	مصنف کا نام	Pringle Kennedy	۲۱	۱۰	عہدنامہ عقیق	عہدنامہ عتیق
				۲۲	۱	مصنف کا نام	Leslie Paul ہے
۵	۱۲	برفراز	برقرار				
״	۱۴	ناصح	واضح	۲۹	۲	محلوق	مخلوق
۶	۴	رشدہ ہدایت	رشد وہدایت	۳۱	۱۳	مزلف	مؤلف
۷	چوتھی سطر یوں پڑھئے		جن میں ذہن انسانی کی	۳۳	نیچے سے تیسری سطر	حیروم	جیروم
			آمیزش کا امکان ہو۔	״	نیچے سے دوسری سطر	۱۹۱۰	۱۹۱۱
״	۵	لیکن ..... کوششوں	لیکن چونکہ کتب روایات	۳۴	۸	جان جیس	جان جینس
			کی جمع وتدوین انسانی	۳۹	۱۳	مصنف کا نام	Leslie Paul ہے۔
			کوششوں۔				
״	۶	رہنے	سامنے				
״	۷	قیتی	ختمی	۴۰	۱۰	عہدنامہ جدید پولوس	عہدنامہ جدید میں پولوس
״	۷	سور ادلی	سور ادبی	۴۲	۱۰	مصنف کا نام	Dr. Inge ہے
״	۱۰	محاذاللہ	معاذاللہ	۴۲	فٹ نوٹ سطر پہلی	خوابیاں	خرابیاں
״	۱۱	کھاتے	کھولتے	۴۶	۱۲	مغ زرتشت کے بعد کا	لفظ "ابن ہرمز" ہے۔
״	۱۲	الحرف	محرف	״	۱۳	مورخ کا نام	Herodotus ہے
״	۱۳	متواہا	شواہد	״	۱۴	مفول	مغول
۸	۴	استتنار	استثنار	۴۸	فٹ نوٹ سطر پہلی	لیجئے دشاہ	لیجیے رجوشاہ
۱۳	۱	اس ..... کے متعلق	ان ۲، ۳، کتابوں کے مجموعہ کے متعلق				

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۹	۱	لینا	کینا
۵۷	۸	سکے	سے
"	۱۴	اہسا	اہمسا
۶۶	۱۶	آبادی مذہب	آبادی کے مذہب
۷۰	۲	ویدوں کی زبان	ویدوں کے زمانہ
۷۲	۵	ہو	ہوا
"	۷	اس سطر کے ابتدائی الفاظ	"جوئے کا پانسہ" ہیں
"	"	نہامنی	نہارشی
"	فٹ نوٹ سطر ۳	بطن سے کے	بطن سے کتے
۷۵	انگریزی	فقرہ کی تیسری سطر کا دوسرا لفظ	Semi-obscurity
۷۶	۴	کھلوایا	کہلوایا
۸۲	۱	خالات	حالات
"	فٹ نوٹ سطر ۲-۳	"حالانکہ ڈاکٹر داس	گپتا نے صرف ۱۱۲ لکھا ہے" کے الفاظ غلطی سے لکھے گئے ہیں۔
۸۴	۲	میمانسنا	میمانسا
"	۱۱	یورب میمانا	پورب میمانسا
۸۷	۱۸	لے	کے
"	آخری سطر	کے آخری الفاظ	"جاکر" فالتو ہیں۔
۹۰	فٹ نوٹ سطر ۹	رسم کہن	رسم کہنا
"	فٹ نوٹ آخری سطر	بٹیادی	بنیادی
۹۴	۱۲	مسلک تنویت	مسلک ثنویت
۱۰۶	۵	انگریزی لفظ	Kau ہے
۱۰۷	۱۴	خالی جگہ میں	Tao لکھ لیجیے
"	۱۵	کرآئی ہے	کرآتی ہے۔
"	۱۷	ہوتی ہے" کے بعد	"جنہیں" لکھ لیجیے!
"	۱۸	انگریزی لفظ	Lao Tze ہے،
۱۰۸	۱۹	انگریزی لفظ	Kami ہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰۹	۱	اترا	اُترا
"	۷	نوالود	نوسولود
"	نیچے سے دوسری سطر	بنتتا	بننا
۱۱۰	۹	مشاہوالفظ	"سکتا" ہے
۱۱۱	نیچے سے دوسری سطر	انگریزی لفظ	Imhotep
۱۱۳	۸	سندراں	سندروں
۱۱۴	۵۔۶	انگریزی الفاظ	Behistun Tablets
۱۱۵	آخری سطر	انگریزی نام	Sophocles
۱۱۶	۷	انگریزی نام	Plato
"	۸	"	Aristotle
"	نیچے سے تیسری سطر	آتے ہیں	آتا ہے
"	آخری سطر	انگریزی نام	History of the World (Weech)
۱۱۷	۴	انگریزی نام	Zeno ہے
"	۱۸	کتاب کا نام	Survey of Greek Civilisation
"	نیچے سے چھٹی سطر	مصنف کا نام	Dickinson ہے
"	نیچے سے تیسری سطر	کتاب کا نام	The Greek View of Life
۱۱۸	۶	انگریزی نام	Crete
"	۱۶	انگریزی نام	Horace
"	۱۷	انگریزی نام	Virgil
"	نیچے سے پانچویں سطر	انگریزی نام	Phillipson
"	" چوتھی "	کتاب کا نام	International Law & Custom
"	" دوسری "	انگریزی نام	Constantine

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۹	۳	انگریزی نام	Briffault
"	۱۱	کتاب کا نام	The Making of Humanity
"	آخری سطر	انگریزی لفظ	Corruption
۱۲۰	۳	انگریزی نام	Briffault
"	۱۲	کتاب کا نام	The Making of Humanity
"	نیچے سے پانچویں سطر	کتاب کا نام	The History of the World
۱۲۱	۲	کتاب کا نام	Gibbon- Decline & Fall
"	۱۹	شرپذیر	اثرپذیر
۱۲۵	۱۵	انگریزی نام	Briffault
"	۱۹	"خانقاہیں تھیں" کے بعد کا انگریزی لفظ	Stoudion
۱۲۶	۴	انگریزی نام	St. Benedict
"	۱۰	انگریزی نام	White
"	۲۰	کتاب کا نام	Civilisation
۱۲۷	۱۰	انگریزی الفاظ	Crown Of Virginhood
"	۱۶	انگریزی نام	Briffault
۱۲۸	۶-۷	مصنف کا نام	M.R.C. Dutt ہے اور کتاب کا نام A History of Civilisation in Ancient India.
۱۳۲	نیچے سے پانچویں سطر	حقیقت	حنیفیت
۱۳۵	پہلی سطر کا پہلا لفظ		"معلوم" ہونا چاہیے
"	۹	کتاب کا نام	History of Arabs

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۸	۱	مال	فال
"	۶	رہن	راہن
"	نیچے سے پانچویں سطر	آیت میں "بالاُنثیٰ" کے بعد	"ظَلَّ وَجْهُهٗ" پڑھیے
۱۴۷	نیچے سے دوسری سطر	کے آخری الفاظ	"قبیلہ بنی شیبان" ہیں
۱۵۰	نیچے سے ساتویں سطر	"پوری کی پوری" کے	الفاظ فالتو لکھے گئے ہیں
۱۵۳	نیچے سے نویں سطر	ناروانتقام	ثاروانتقام
۱۵۴	۸	انگریزی لفظ	Values ہے
۱۵۶	نیچے سے تیسری سطر	خطیات اقبال	خطبات اقبال
۱۶۱	دوسرا	اقتباس	Briffault کا ہے
۱۶۱	۷	تبیہی	تشبیہی
"	۱۱	اسر	خاسر
۱۶۲	۶	اوکیت	ملوکیت
۱۶۵	۱۱	اس سطر کا ابتدائی لفظ	"قرنیا قرن" ہے۔
"	"	یہ الانثی	یہ مالانثی
"	"	"تھیں" اور "پھول" کے درمیان	"یا" کے بجائے "یہ" ہونا چاہیے۔
۱۶۹	فٹ نوٹ ۲	میں پہلا حوالہ	۳/۱۴۴ ہے اور تیسرا ۱۴۷/۲
۱۸۷	نیچے سے چوتھی سطر	آیت کا حوالہ	۹۳/۷ ہے۔
۱۹۰	نیچے سے ساتویں سطر	وَاَسْرَفَتْ	وَاَشْرَقَتْ
"	چھٹی "	آیت کا حوالہ	۲/۱۸۵ ہے
۱۹۴	نیچے سے چھٹی سطر	حطبہ	خطبہ
۱۹۶	آخری سطر	طے کرنی ہوئی	طے کرتی ہوئی
۲۰۲	"	رڑے بوڑھے	بڑے بوڑھے
۲۰۳	نیچے سے پانچویں سطر	پہنچلنے	پہنچانے
۲۱۱	۳	خد اس سے باتیں کرتا ہے	خدا اس سے باتیں کرتا ہے
۲۱۲	۱۶	پہی	پہلی
"	نیچے سے تیسری سطر	میں	ہیں
۲۲۱	۱۱	جیسے	جسے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲۳	۸	آیات کا دوسرا حوالہ	۳۴/۴ ہے
۲۶۱	۱۰	انذار	انذار
〃	نیچے سے دوسری سطر	یَسَمَعُ	یَسْمَعُ
۲۶۹	۱۴	آیت کا دوسرا حوالہ	۱۳/۴۲ ہی
۲۷۰	۱۷	تقدیریں	تقدیریں
۲۷۳		اس صفحے کا نمبر غلطی سے	۲۷۲ لکھا گیا ہے
۲۷۴	فٹ نوٹ	نمبر ۲ "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِ	یْنَ" والی آیت سے شروع ہوتا ہے
۲۷۵	۱۷	آیت کا حوالہ	۳۸/۱۷ ہے
۲۸۶	۱۲	آیت کا حوالہ	۴۱/۳۶ ہے۔
۲۹۰	فٹ نوٹ ۲	شرر صدر	شرح صدر
۲۹۴	نیچے سے تیسری سطر	ناہر	باہر
۳۰۱	۱۵	آیت کا حوالہ	۴۵/۲۲ ہے۔
۳۰۶	۵	صد	ضد
۳۰۷	۳	اِنَّ	اِنْ
۳۱۴	آخری سطر	نالص	خالص
۳۲۲	۱۴	مصنف کا نام	McKenzie
۳۲۴	فٹ نوٹ	دس سی	ودَسّٰی
۳۲۶	نیچے سے دوسری سطر	اتفاق	انفاق
۳۲۷	فٹ نوٹ	دوسرا حوالہ	۳/۲۷ ہے اور چوتھا ۲۰/۲۷
۳۲۸	۹	طرہ	طرح
〃	۱۲	انگریزی لفظ	Institution
۳۳۱	۱۷	تیرے حکم کی ذلت وخواری	ذلت وخواری
۳۴۰	نیچے سے دسویں سطر	رشدوت	رشاوت
〃	۱۰ آٹھویں	آیت کا حوالہ	۳/۱۴۱ ہے۔
۳۴۱	۲	آیت کا حوالہ	۲/۷-۶ ہے۔
۳۴۲	۱۴	آیت کا پہلا حوالہ	۳۲/۲۰ ہے۔
۳۴۳	۱۷	اقف	واقف
۳۴۵	۸	آیت کا حوالہ	۳۶/۷۰ ہے
۳۴۷	نیچے سے آٹھویں سطر	آیت کا حوالہ	۶۸/۴۴ ہے
۳۴۸	۱	آیت کا حوالہ	۶۸/۴۵ ہے۔
〃	۵	زَرُ ذُبِيُّ	ذَرُ رُبِيُّ
〃	۱۶	سُوَ	حُوَ
۳۵۰	۱۳	بِقَوْمِهِمَ	لِقَوْمِهِمْ
۳۵۳	نیچے سے ساتویں سطر	پرکنے	پرکھنے
〃	〃 تیسری	آیت کا حوالہ	۱۱/۱۲۱—۱۲۲ ہے
〃	〃 دوسری	مٹے ہوئے الفاظ	"ہیں ان سے" ہیں
〃	آخری سطر	مٹا ہوا لفظ	"منتظر" ہے۔
۳۵۵	۱۵-۱۶	انگریزی الفاظ یوں ہیں	The Law of Substitution and Succession
۳۵۶	۲	نسنیعہ	شنیعہ
۳۵۹	۴	بَکْنُہٗ	بَکِیْتُہٗ
۳۶۰	۶	آیت کا حوالہ	۲/۲۱۰ ہے
〃	۱۵	آیت کا حوالہ	۳/۱۹۵ ہے۔
۳۶۱	نیچے سے پانچویں سطر	لیں	میں
۳۶۸	۵	آیت کا حوالہ	۱۰۷/۱ ہے
〃	۱۷	لوکول	لوگوں
〃	نیچے سے دوسری سطر اور تیسری سطر	جملوں میں قدر اہم	جملوں میں کس قدر اہم
۳۷۲	۳	لموج	تموج
۳۷۲	۱۳	يُشْتُوْكَ	لِيُثْبِتُوْكَ
〃	〃	يُقْتِلُوْكَ	يَقْتُلُوْكَ
۳۷۳	۱۳	ترو	تردد
〃	۱۷	یحویز	تجویز
۳۷۴	۳	نے	کے
〃	۶	جائز	جائزہ
۳۷۵	۷	اس سطر کا آخری لفظ	"منظر" ہے
۳۷۶	۷	وفو	وفور

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۷۸	نیچے سے تیسری سطر	بندے	جذبے
۳۸۳	۴	آیت کا حوالہ	۳/۹۶-۹۷ ہے۔
۳۸۵	۳	آیت کا حوالہ	۸/۳۹ ہے۔
"	۱۰	آیت کا حوالہ	۹/۴۸ ہے۔
"	آخری سطر	آیت کا حوالہ	۶/۹۰ ہے۔
۳۸۹	۱۳	قبا	قبلہ
۳۹۷	۱	آیت کا حوالہ	۱۳/۲۳-۲۵ ہے
۳۹۹	نیچے سے آٹھویں سطر	نفش پرستیوں	نفس پرستیوں
۴۰۱	۱۷	تَسُبُتُوْا	تَسُبُّوْا
۴۰۲	۱۶	آیت کا حوالہ	۶/۱۵۲ ہے
۴۰۴	۳	آیت کا حوالہ	۴۲/۱۵ ہے۔
۴۰۵	نیچے سے تیسری سطر	کے یہ حکم	کے لئے یہ حکم
۴۱۰	۶	جبا	بنا
۴۱۴	۵	آیت کا حوالہ	۴۹/۱۴ ہے۔
۴۱۵	نیچے سے پانچویں سطر	آیت کا حوالہ	۳/۹۰ ہے۔
۴۲۳	۱۱	آیت کا حوالہ	۶/۱۹۱ ہے۔
"	۱۶	آیت کا حوالہ	۲/۱۳۲ ہے
۴۲۵	۱۴	آیت کا حوالہ	۵۷/۲۷ ہے۔
۴۲۷	۱۰	اس سطر کا پہلا مٹا ہوا لفظ	"دو" ہے۔
"	نیچے سے تیسری سطر	نَنْفُكُ	یَلْفِعُكَ
"	"	تَعَلْتَ	فَعَلْتَ
۴۲۹	۱۲	اِنَّ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ	کا حوالہ ۱۲/۴۰ ہے
۴۳۰	۱۱	عبادت	عبارت
"	آخری سطر	وَصَّبْنَا	وَصَّيْنَا
۴۳۵	۱۸	آیت کا حوالہ	۲۲/۴۱ ہے۔
۴۳۶	۱۰	آیت کا حوالہ	۴۹/۲۹ ہے۔
"	۲۰	یہ مصرع یوں ہے:	گر صاحب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
۴۴۳	۱۱	اَنَامُوْا	اَقَامُوْا
۴۴۴	۴	انہیں	ان میں
۴۴۷	۳	آیت کا حوالہ	۲۳/۷۱ ہے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۴۷	نیچے سے	دوسری سطر کا پہلا لفظ	"شمشیر" ہے۔
"	آخری سطر	میں آیت کا پہلا حصہ	یوں ہے:- اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝
۴۴۹	۱۰	آیت کا حوالہ	۶/۱۹۴ ہے۔
۴۵۰	۶	آیت کا حوالہ	۹/۳۶ ہے۔
۴۵۳	۹	آیت کا حوالہ	۲/۱۰۰ ہے۔
۴۶۴	"	آیت کا حوالہ	۵۹/۴-۱۱ ہے۔
۴۷۸	۹	انگریزی نام	یوں ہیں۔ Treatise on Right and Wrong; H.L. Mencken
۴۷۹	۷	انگریزی نام	Einstein
۴۸۶	۴	یُلْدِوْنَ	یَدْرَءُوْنَ
"	۸	وَالسَّیِّئَةُ	وَلَا السَّیِّئَةُ
۴۹۰	۱	آیت کا حوالہ	۵/۳۵ ہے۔
"	۶	آیت کا حوالہ	۳/۱۴۲ ہے۔
۴۹۴	۹	قدیہ	فدیہ
۴۹۵	۱۵	آیت کا حوالہ	۳/۱۶۹ ہے۔
"	نیچے سے تیسری سطر	آیت کا حوالہ	۳/۱۹۵ ہے۔
۴۹۶	۹	آیت کا حوالہ	۳/۱۵۷ ہے۔
۴۹۷	۱۳	زَفْتًا	نَقْعًا
۵۰۶	۶	رَبِیَةٌ	دِیَةٌ
۵۰۷	۱	آیت کا حوالہ	۵/۸۹ ہے۔
"	۱۰	رَفَبَةٍ قَبْلِ	رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ
"	نیچے سے ساتویں سطر	آیت کا حوالہ	۹۰/۱۱-۱۳ ہے۔
۵۰۸	نیچے سے آٹھویں سطر	آیت کا حوالہ	۲۴/۳۲ ہے۔
۵۰۹	نیچے سے تیسری سطر	بِالْجُنُبِ	بِالْجَنْبِ
۵۱۰	۱۲	اَوِالبِّفْلِ	اَوِ الطِّفْلِ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۱۰	۱۷	سینوں ر	سینوں پر
۵۱۱	۴	بِبَعْضٍ	عَلٰی بَعْضٍ
"	۵	آیت کا حوالہ	۴/۲۳ ہے۔
"	۱۶	انگریزی لفظ	Status
"	نیچے سے دوسری سطر	آیت کے آخری الفاظ	غُلْبٌ مُلُوْبِیْنَ ہیں
"	"	آیت کا حوالہ	۲۳/۵-۶ ہے
۵۱۲	۶	آیت کے آخری الفاظ	"اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا" ہیں
۵۲۰	۱۲	طُرْفًا	طَرَفًا
"	"	آیت کا حوالہ	۳/۱۲۳-۱۲۷ ہے
۵۲۲	نیچے سے چھٹی سطر	آیت کا حوالہ	۳/۱۳ ہے۔
۵۲۳	نیچے سے دوسری سطر	بجبر	بجبر
"	آخری سطر	پتترا	پینترا
۵۲۹	نیچے سے دوسری سطر	آیت کا حوالہ	۳/۱۲۱-۱۲۲ ہے
۵۳۱	۱۶	آیت کا حوالہ	۳/۱۵۲ ہے۔
۵۳۲	۸	آیت کا حوالہ	۳/۱۵۳ ہے۔
"	نیچے سے چوتھی سطر	آیت کا حوالہ	۳/۱۵۴ ہے۔
۵۳۳	۱۵	آیت کا حوالہ	۳/۱۵۵ ہے۔
۵۳۴	۲	آیت کا حوالہ	۳/۱۵۶-۱۵۷ ہے
"	۶	خلات	خیالات
"	۱۲	آیت کا حوالہ	۳/۱۶۵ ہے
"	نیچے سے پانچویں سطر	آیت کا حوالہ	۳/۱۶۶-۱۶۷ ہے
۵۳۵	۲	طَاعُوْنَا	اَطَاعُوْنَا
"	۷	آیت کا حوالہ	۳/۱۶۸ ہے۔
"	۱۴	آیت کا حالہ	۳/۱۶۲ ہے۔
"	۲۰	آیت کا حوالہ	۳/۱۶۸ ہے
۵۳۶		آخری شعر یوں ہونا چاہیئے:	
		عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام	
		اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں	
۵۳۷	۲	جنتی	جہنمی
۵۳۹	۱۰	کے	نے
۵۴۰	۲	کے ہ جھنڈ	کے وہ جھنڈ
"	۱۴	ان کیلئے قلعے نہیں	ان کے قلعے انہیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۴۲	۴	اپے	اپنے
"	نیچے سے ساتویں سطر	بَاْمُھُمْ	بَاْسُھُمْ
"	نیچے سے چھٹی سطر	مَشَدِیْدٌ	شَدِیْدٌ
۵۴۳	۵	بَرِیُٔ	بَرِیْءٌ
۵۴۸	۸	جیش خداوی	جیش خداوندی
"	۱۸	طغانیوں	طغیانیوں
۵۵۱	آخری سطر	عَلَنَہُ اللہُ	عَلَیْہُ اللہُ
۵۵۳	۳	پھر انہی	پھر ان ہی
۵۵۵	آخری سطر	تُغْنِ دُوْہُ	تُعَزِّرُوْہُ
۵۵۶	آخری سطر	ھم	ہم
۵۶۰	۲	ہوے	ہوتے
۵۶۲	۱۷	آیت کا حوالہ	۴/۱۴۱ ہے۔
۵۶۳	نیچے سے دوسری سطر	فَاتُوْا	فَاْتُوْا
۵۶۹	۱۱	بے صورت صدا	بے صوت صدا
"	۱۴	آیت کا حوالہ	۳/۱۳۹ ہے۔
۵۷۰	۱۱	ہرمیت	ہزیمت
۵۷۱	۱	صنصب	منصب
"	نیچے سے دوسری سطر	رام جمبیل	(رام جمیلہ)
۵۷۲	۵	شکست یرا بے چارگی	شکست ید بے چارگی
۵۷۳	۱۸	آیت کا حوالہ	۱۷/۸۱ ہے۔
"	فٹ نوٹ	ضافشت	مناقشت ہوئی
۵۷۴	۵	گذایانہ	گدایانہ
"	۱۳	آوزی	آذری
"	۱۴	افتنان	امتنان
"	نیچے سے دوسری سطر	"تمام مفاخر کے بعد یوں" پڑھئے	تمام انتقامات خوں بہا ہے / قدیم، سب خوں بہا۔
۵۷۵	۶	بہادری	پہاڑی
۵۷۷	۵	ہلوان	ہوازن
"	۱۲	قوت قلب وجے	قوت قلب اجے
"	۱۸	ہرمیت	ہزیمت
۵۷۸	۵	نی جبت	نی جُبُتْ
"	۸	اترگئے	اتر لے گئے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۷۸	۱۳	سَکِیْنَۃٌ	سَکِیْنَتَہٗ
"	نیچے سے تیسری سطر	فتح مکہ کے مسلمان	فتح مکہ کے بعد مسلمان
۵۸۰	۱	اقلب	اقارب
"	عنوان	"غزوہ تبوک" کے نیچے دوسری سطر میں "غتابنوں" کی بجائے "غسانیوں" پڑھیے۔	
۵۸۱	۲	خَنَ نَّا	حَزَنًا
	نیچے سے دوسری سطر	وارُ نابَتْ	وارُ ثابِتْ
۵۸۲	۴	نہ خیر	بخیر
۵۸۲	۵-۶	یہ آیت یوں ہے: وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝	
"	۸، ۹	بوجہل	بوجھل
"	۱۱	پڑے	پڑتے
"	۱۴	نِیْکُمْ	فِیْکُمْ
"	۱۴	آیت کا حوالہ	۹/۴۷ ہے۔
"	۱۵	حاصل	زیادہ
"	۱۸	نجز	بجز
۵۸۳	۷	گدھ	گھر
"	۱۸	شروع کے الفاظ ہیں اور آخری لفظ	یُصِیْبَکُمُ اللّٰہُ بِعَذَابٍ "اِنَّا" کی بجائے "اِنَّا"
۵۸۴	۸	"تُقْبَلَ" اور "نَفَقٰتُهُمْ" کے درمیان "مِنْهُمْ" ہونا چاہیے	
"	۱۵	"اللّٰہُ" اور "بِهَا" کے درمیان "لِيُعَذِّبَهُمْ" ہونا چاہیے۔	
"	۱۹	اتفاق	انفاق
	نیچے سے دوسری سطر	"قَوْمٌ" کے بعد کا لفظ	"یَفْرَقُوْنَ" ہے۔
"	آخری سطر	یَجْمَعُوْنَ	یَجْمَحُوْنَ
۵۸۵	نیچے سے چھٹی سطر	یُجَاھِدُوْا	یُجَاھِدُوْا
۵۸۸	۱۲	دَائِرَۃُ السُّوْءِ	دَائِرَۃُ السُّوْءِ
۵۹۱	نیچے سے ساتویں سطر	من جَوْنَ	مُرْجَوْنَ
"	"چوتھی"	رہی	اسی
۵۹۲	فٹ نوٹ سطر ۶	کھڑی	گھڑی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۹۳	۲	رُحُبَتْ	رَحُبَتْ
۵۹۵	۱۳	توتوں	قوتوں
"	۱۴	انگریزی نام	Hitti ہے
۵۹۶	۷	فتح کر	فتح مکہ
۵۹۷	۱۰	آیت کا حوالہ	۳/۴۴ ہے۔
"	نیچے سے چوتھی سطر	آیت کا حوالہ	۳/۹۱ ہے۔
۵۹۸	۱۸	لِیَفَقَّھُوْا	لِیَتَفَقَّھُوْا
۵۹۹	۲۶	آیت کا حوالہ	۲/۱۴۳ ہے۔
"	۲۸	اسمال	اعمال
۶۰۱	نیچے سے چھٹی سطر	آیت کا دوسرا حوالہ	۶/۵۷ ہے۔
۶۰۳	۵	سے آیا	لے آیا
۶۱۳	نیچے سے ساتویں سطر	آیت کا حوالہ	۴۶/۹ ہے۔
۶۱۵	۶	آیت کا حوالہ	۵۰/۴۵ ہے۔
۶۱۸	۱۴	یُقْتَلُوْا	یُقَتَّلُوْا
۶۲۶	۱۳	آیت کا حوالہ	۲/۸۳ ہے۔
۶۲۷	فٹ نوٹ سطر ۲	"کسی" اور "کے" کے	درمیان کا لفظ "زندہ" ہے
۶۳۲	نیچے سے چھٹی سطر	ازاز	انداز
۶۴۰	فٹ نوٹ سطر ۳	تنقیص	تنقیض
۶۵۱	فٹ نوٹ سطر ۵	حَبِیْبَ	حَبَّبَ
۶۵۳	نیچے سے چوتھی سطر	مٹا ہوا لفظ	"زمان" ہے۔
۶۶۰	۱۷	"اللہ" اور "کھلی"	کے درمیان "کی" ہونا چاہیے
۶۷۹	۱	اجازت	حارث
"	۱۳	ہمارے ہمارے	ہمارے
۶۸۹	۹	اصل کتاب	اہل کتاب
۶۹۰	نیچے سے چھٹی سطر	آیت کا حوالہ	۳۳/۱۱ ہے۔
۶۹۴	۵	یہ مصرع یوں پڑھیے: ہر لئیمے رازدار دیں شد است	
۷۰۲	۴	شریک	شرک
۷۱۱/۷۱۲	۹	آیت کا حوالہ	۳/۱۸۳ ہے۔
۷۱۵	۴	کُلُّھُمْ	کَلَّمَھُمْ
۷۲۱	۵	مٹا ہوا لفظ	"خَلَقَ" ہے۔
"	۶	آیت کا حوالہ	۳۰/۲۰—۲۱ ہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۲۵	۱	اکارو	اکارت	۷۹۶	۵	اختراوات	اختراعات
۷۲۶	فٹ نوٹ سطر ۲	بہت	جہت	″	۱۸	احصار	امصار
۷۲۷	۲	گرہ	گھٹر	۷۹۸	۲	آیت کا حوالہ	۱۲/۱۶۰ ہے
″	۸	آیت کا حوالہ	۲۹/۵۰—۵۱ ہے	″	۱۷	سورۂ نمل	سورہ النحل
۷۳۳	۴	لے گیا	لے گئی	″	۱۹	یبَانًا	تبیانًا
۷۳۵	۴	آیت کا حوالہ	۲/۱۸۵ ہے۔	″	۲۱	ہیں	میں
″	۶	خطوط وحدانی میں حوالہ	۲۳/۴۸ ہے۔	″	۲۲	اقوام رسم	اقوام و اُمم
۷۴۰	نیچے سے تیسری سطر	کہ ایسی	کہ آیا ایسی	۷۹۹	۲	۳۶/۱۹۱	۳۶/۱۹۶
۷۴۸	۳	اموال	احوال			۵۲/۵۶	۵۳/۵۶
۷۵۰	۵	آیت کا آخری لفظ	"حَلِيمًا" ہے۔	۸۰۰	۱۰	قمیص	نقیض
۷۵۵	۱۶	آپس وارو ں	آپس والوں	″	۱۲	بصرۃ	بصیرۃ
۷۶۱	نیچے سے چھٹی سطر	دو	در	″	۱۵	ہنمیر	ضمیر
۷۶۶	۳	آخری لفظ	"بکم" ہے	۸۰۲	۱	"وحدتِ فکر" اور "اسی" کے درمیان الفاظ کا اضافہ کر لیجئے: "پرکھتا ہے اور وحدتِ فکر"	
″	۱۴	اعتصتم	اِعْتَصَمْتُمْ				
۷۷۳	۱۳	ممبر	منبر	″	۹	وسالت	رسالت
۷۷۷	۹	ابتدائی آفرنیش	ابتدائے آفرینش	۸۰۴	۶	سرتا	سرتاپا
۷۸۱	نیچے سے چھٹی سطر	مصنفہ کا نام	Dr. Maude Royden	۸۰۶	۱۶	اس سے کہ	اس لیے کہ
				۸۱۰	۱۱	حاوی	دعاوی
۷۸۳	نیچے سے چوتھی سطر	ناقابل تفسیر	ناقابل تغیر	۸۱۵	۱۰	الر	اگر
۷۸۸	۱۱	بتایا	بنایا	″	۱۱	عوے	دعوے
″	نیچے سے چوتھی سطر	تیود	قیود	۸۲۵	۱۵	أعرّۃ	أعِزّۃ
۷۹۵	نیچے سے دوسری سطر	"ایۃ" اور "اعلم" کے درمیان	لفظ "وَاللّٰہُ" ہونا چاہیے	″	″	یُجَاهِدِیْن	یُجَاهِدُوْن
۷۹۶	نیچے سے تیسری سطر	اِنَّا لُحٰفِظُوْنَ	اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ	۸۲۶	۶	حنگیز	چنگیز
				″	فٹ نوٹ آخری سطر	باوے	آوے

اس اغلاط نامہ میں ان آیات کو درج نہیں کیا گیا جن کے اعراب غلط ہیں۔ ان غلط اعراب کی آپ قرآن کریم کی مدد سے خود تصحیح فرمالیں۔

(۲) کتابت کی غلطیوں کے علاوہ، متن کتاب میں اگر آپ کوئی سہو دیکھیں تو اس سے مجھے مطلع فرمائیں۔ اس کے لئے شکر گزار ہوں گا۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

پرویز

ظَهَرَ الْفَسَادُ

فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

محمد عربیؐ کی محیر العقول کامیابی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپؐ کے زمانہ میں دنیا کی جو حالت تھی اس کا مطالعہ کیا جائے۔ آپ کی بعثت کے وقت حضرت عیسیٰؑ کی تشریف آوری کو ساڑھے پانسو سے بھی زیادہ برس گذر چکے تھے اس زمانہ میں، یونان، روم اور بحیرہ روم کے گرد و پیش کی صدہا ریاستوں کے قدیم مذاہب سب اپنی توانائی کھو چکے تھے اور ان کی جگہ قیصریت ایک زندہ مسلک کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ سلطنت کی پرستش روتہ الکبریٰ کا مذہب تھا اور سلطنت نام تھا بر سر اقتدار قیصر کا۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ دوسرے مذاہب بھی موجود تھے لیکن ان کے لئے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس مسلک جدید (قیصر پرستی) کو اپنے پہلو میں جگہ دیں اور اس حیثیت سے جگہ دیں کہ یہ مسلک بہر حال ان پر غالب ہے لیکن قیصر پرستی بھی انہیں مطمئن رکھنے میں ناکام رہی۔ مشرقی مذاہب اور توہمات (مصری، شامی اور ایرانی) ابھی اکثر مقامات پر مقبول تھے اور ان کے ماننے والے کئی جگہ موجود، لیکن یہ مسالک و مشارب کئی حیثیتوں سے نفرت انگیز پستیوں میں گر چکے تھے (ایران میں)، مذہب متراد مجوسیت جدیدہ) کی اٹھان عمدہ تھی اور ان سعید روحوں میں ہنوز مقبول تھا جن میں اسرار کائنات (کی تجسس) کا جذبہ اور یہ احساس باقی تھا کہ مافوق قوتوں کی پرستش محض رسومات کی ادائیگی کا نام نہیں لیکن اس کیلئے مشکل یہ تھی کہ یہ پارتھیا اور فارس کی رقیب سلطنتوں کے مذہب کی پیداوار تھا۔ شروع شروع میں عیسائیت نے قیصر پرستی سے مصالحت نہیں کی لیکن چوتھی صدی عیسوی میں یہ خود اس مسلک میں تبدیل ہو گئی اور (وہ اصلی) مذہب عیسائیت ختم ہو گیا جس کی تبلیغ شروع میں کی گئی تھی۔ اب یہ مذہب روحانیت سے خالی، رسومات کا مجموعہ اور مادیت کا پیکر بن کر رہ گیا۔ رواداری کے بجائے احساس برتری اور احساس برتری کے بعد دیگر اہل مذاہب پر مظالم، یہ تھے اس کی تبدیلی کے مدارج۔ باقی رہی یہودیت، سو چھٹی صدی عیسوی میں اگر کسی کو کہیں "مجموعہ رسومات" کی تلاش ہوتی تو وہ اسے اس مذہب میں پا لیتا ....۔ (دنیائے مذاہب کو چھوڑ کر اگر تہذیب و تمدن کے گوشوں کی طرف آئیے تو اس زمانہ میں) آرٹ پر افسردگی چھا چکی تھی اور عقل و دانش مردہ ہو چکی تھی"

(Pringh Kennady :- Arabian Socialy at the time of mohammad - pp 9-17)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

دنیائے مذاہب اور عالم تہذیب و تمدن میں ہر جگہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ کوئی حقیقت اپنی اصل پر موجود نہ تھی۔

معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلد میں مقام نبوت اور تاریخ رسالت کے متعلق جو تفاصیل پیش کی جا چکی ہیں ان کی روشنی میں یہ حقیقت نکھر کر ہمارے سامنے آچکی ہے کہ کشمکش حیات میں عقل انسانی کی راہ نمائی کے لیے وحی کے نور کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کے لیے خارجی روشنی کی۔ اس لیے انسانی زندگی کی ابتدا ہی میں اس سے کہدیا گیا تھا کہ اس کی رہبری کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی روشنی ملتی رہے گی۔ گذشتہ مجلدات میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اس اجمال کی تفصیل اور اسی ایفائے عہد کی داستان بصیرت نواز و حقیقت کشا تھی۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس سلسلۂ رشد و ہدایت کا نہج و اسلوب کیا تھا؟ ایک رسول آتا اور پیغامات خداوندی لوگوں تک پہنچاتا۔ اس پر خود بھی عمل کرتا اور اپنے متبعین سے بھی عمل کراتا اور پھر دنیا سے چلا جاتا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ پیغام اس قوم کے پاس اس کی اصل شکل میں محفوظ رہتا۔ لیکن ازاں بعد ارباب اختیار کی خود غرضانہ دسیسہ کاریاں اپنا دست تصرف بڑھاتیں اور اس چشمۂ صاف و شیریں کو اپنے قلبی میلانات و رجحانات اور ذہنی تصورات و تخیلات کی آمیزش سے اس درجہ مکدر کر دیتیں کہ کچھ عرصہ کے بعد اصلیت ان ہی آلائشوں اور آمیزشوں میں گم ہو کر رہ جاتی۔ پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حوادث ارضی و سماوی سے یہ محرف پیغام بالکل تلف ہی ہو جاتا اور انسانوں کی یہ جماعت وحی کی روشنی کے بغیر اندھیرے میں رہ جاتی۔ جب ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی تو پھر ایک اور رسول آجاتا اور پیغام خداوندی کو ان تمام تحریفات و الحاقات سے پاک اور صاف کر کے اسے اس کے اصلی رنگ میں سامنے لے آتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آچکی ہے کہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے اولین ادوار میں اس کی مدنی ضروریات بہت مختصر اور اس کے عمرانی اور تمدنی

تقاضے نہایت محدود تھے اس لئے آسمانی ہدایت جو اس تک پہنچائی جاتی تھی، انہی مختصر ضروریات کی کفالت اور محدود تقاضوں کی تسکین تک محصور ہوتی تھی۔ وحی کی تعلیم کا اصل الاصول تو شروع سے اخیر تک ایک ہی تھا۔ یعنی انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل ایک ایسے نظام کے ماتحت کی جائے جس کی بنیادیں اس آئین پر ہوں جو فطرتِ انسانی کا ترجمان اور ضمیرِ انسانی کی گہرائیوں کی آواز ہو۔ اسی کو دین یا نظام حکومت الٰہیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس اصول کی فروعات اور اس اجمال کی تفصیلات انسانی زندگی کے تمدنی تقاضوں کی تبدیلی و وسعت کے ساتھ ساتھ بدلتی اور پھیلتی جائیں گی۔ ان فرائض کی سر انجام دہی منصبِ رسالت میں شامل تھی۔ اس لئے بھی رسولوں کا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد علی التواتر آنا ضروری تھا۔ تیسرے یہ کہ ازمنۂ قدیمہ میں سامان رسل و رسائل اور ذرائع نشر و اشاعت نہایت قلیل اور بعض مقامات پر بالکل مفقود ہوتے تھے۔ اس لئے ان انقلابی تحریکات کے دوائر اثر و نفوذ بہت محدود ہوتے تھے۔ بنابریں اس زمانہ میں رسالت بالعموم قبائلی یا اس سے ذرا آگے بڑھ کر قومی ہوتی تھی، عالمگیر نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک نیا رسول ان تمام احوال و ظروف اور مقتضیاتِ متعلقات کو سامنے رکھ کر نظام دین متعین کرتا اور اسی طرح ایک نیا ضابطۂ زندگی قوم کے سپرد کر کے چلا جاتا یہ سلسلہ اسی طرح سے جاری رہا۔ انسان کی تمدنی زندگی کے تقاضوں میں وسعت اور اس کے ذرائع نقل و حرکت میں پھیلاؤ ہوتا چلا گیا۔ تاآنکہ آج سے قریب دو ہزار سال قبل بیت المقدس کی وادیوں میں دعوت عیسوی کا ظہور ہوا۔ گذشتہ دو جلدوں میں ہم اسی سلسلۂ بہار کے ساتھ قدم بقدم، منزل بمنزل، چلتے آئے ہیں۔ اب یوں سمجھئے کہ ہم چھٹی صدی عیسوی میں آ پہنچے ہیں۔ یعنی یہ وہ زمانہ ہے جب پیغام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی پانچسو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس وقت اس نقطۂ نگاہ سے دنیائے مذاہب اور جہان تہذیب و تمدن کی کیا حالت تھی؟ اس حقیقت کا جائزہ لینا کیوں ضروری ہے؟ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رُخ آپ متعین کر لیتی ہے۔ اسی کو مذہب کی زبان میں وحیِ نبوت کہتے ہیں۔ (خطبات صفحہ ۱۴۱)

دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس عہد میں جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے زمانہ کے تقاضے اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ حیاتِ کائنات ایک نئے ظہور کو وجود میں لاتی؟ اس کے لئے ہمیں مسئلہ زیر نظر کو دو پہلوؤں سے دیکھنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ کیا اس زمانہ میں ساری دنیا میں کسی جگہ بھی خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں موجود تھا۔ اور دوسرے یہ کہ دنیا میں جو نظام ہائے تہذیب و تمدن رائج تھے ان کے نتائج نوع انسانی کے .. حق میں حیات آور ثابت ہو رہے تھے یا ہلاکت انگیز!! "ساری دنیا میں" اس لئے کہ جس رسالت عظیمہ کا تذکرۂ جلیلہ اس کے بعد ہمارے لئے وجہ سیرابی قلوب و انظار ہونے والا ہے وہ

سچی آسمانی تعلیم

رسالت ساری دنیا کے لئے اور وہ پیغام انقلاب آفریں تمام نوع انسانی کے لئے تھا اسی سوال کے جواب سے ایک اور اہم مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ آج کل عام طور پر یہ آواز

سنائی دیتی ہے کہ اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی "سچی تعلیم" پر عمل پیرا ہو جائیں تو دنیا کی نجات و سعادت کے لئے یہ کافی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ "سچی تعلیم" اس کو کہا جائے گا جو رسولوں کی وساطت سے انسانوں کو ملی تھی۔ اگر تاریخی شہادات اور داخلی تصدیقات سے یہ ثابت ہو جائے کہ دنیا میں (قرآن کے سوا) کسی مذہب والوں کے یہاں ان کی "سچی تعلیم" اپنی اصلی صورت میں کہیں موجود نہیں تو پھر ان کا اپنے مذہب کی "سچی تعلیم" پر عمل پیرا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس وقت صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ اس آسمان کے نیچے "سچی تعلیم" اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہاں ہے؟ وہ جہاں بھی ہو ہر مذہب پرست کے لئے اس کی پیروی لازمی ہوگی۔ اس مقصد کے پیش نظر بھی یہ ضروری ہے کہ جویائے حقیقت اس امر کی تحقیق کرے کہ بعثت نبی عربی صلعم کے وقت خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی تعلیم اپنی اصل شکل میں دنیا کے کسی گوشہ میں بھی موجود تھی؟ اس کے لئے ہمیں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کا جائزہ لینا ہوگا جن کا دعویٰ ہے کہ انہیں آسمانی تعلیم ملی۔

یہ مسئلہ جس قدر نازک اور یہ مرحلہ جس قدر دشوار گذار ہے، اس کا ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں مختلف مذاہب کا وجود ہی اس دعوے کی بنیاد پر ہے کہ ان کے پاس آسمانی تعلیم موجود ہے۔ اگر کسی مذہب کے متعلق یہ تحقیق ہو جائے کہ اس کی تعلیم صحیح آسمانی تعلیم نہیں تو پھر اس کا دعوئے صداقت و حقانیت باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ اور جب اس کی سند احقانیت ہی برقرار نہ رہے تو پھر وہ کیا کہہ کر دنیا میں اپنا وجود باقی رکھ سکتا ہے؟ اور ہم ہیں کہ کسی ایک مذہب کے متعلق نہیں بلکہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کے متعلق یہ تنقیدی ترازو لیکر سامنے آرہے ہیں جس سے واضح ہو جائے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اپنے مذہب کی سچی تعلیم (یعنی وہ تعلیم جو انہیں منجانب اللہ ملی تھی) اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اس لئے آپ خود

معاملہ کی نزاکت

اندازہ فرما لیجئے کہ یہ مرحلہ کس قدر دشوار گذار ہے۔ اور پھر چونکہ مذہب کا تعلق خالصتاً جذبات سے ہوتا ہے اس لئے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ معاملہ کس درجہ نازک ہے۔ اس لئے اس وادی پر خار میں قدم رکھنے سے پیشتر، ہم غیر مذاہب کے حضرات سے چند الفاظ تمہیداً کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں

قرآن کریم کی رو سے ایک مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم میں، ہر ملک میں، ہر زمانہ میں اپنے رسول بھیجے جو انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے تھے اور اپنے حقیقت کشا عمل سے اپنے متبعین پر شرف انسانیت کی راہیں کھولتے تھے۔

مسلمان کا مسلک

(۲) ان حضرات انبیاء کرام میں سے بعض کا تصریحی تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے اور باقیوں کے متعلق مذکور ہے کہ ان کا تصریحی ذکر نہیں کیا گیا

(۳) ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ یہ تمام انبیائے کرام اپنے

اپنے وقت میں خدا کی طرف سے سچی تعلیم لائے تھے۔ ان کی نبوت و رسالت کے بارے میں کسی قسم کی تفریق و تمیز قطعاً جائز نہیں

(۴) ایک مسلمان کے لئے اس امر پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ ان حضرات انبیاء کرامؑ پر جو کچھ نازل ہوا وہ اسی کی طرف سے تھا۔ اور اپنے اپنے وقت میں انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے ضابطۂ آسمانی۔

(۵) اسی سلسلۂ رشد و ہدایت کی آخری کڑی[۱] جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حضورؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایک مسلمان کے لئے تمام سابقہ انبیاء کرامؑ کی صداقت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے

(۶) اور یہ ایمان بھی کہ جو تعلیم سابقہ انبیاء کرامؑ نے خدا کی طرف سے پیش کی تھی وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہی۔ اب وہ تعلیم اصولی طور پر قرآن کریم کے اندر ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔

ان حقائق کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا کسی قوم کے "بانیٔ مذہب[۲]" یا ان کی اصلی تعلیم کے متعلق تحقیر و تنقیص کا تصور بھی کسی مسلمان کے دماغ میں آسکتا ہے؟ مسلمان تو اس باب میں بڑا معذور واقع ہوا ہے۔ مثلاً اگر ایک عیسائی حضور ختمی مرتبت کی شان میں (خاکم بدہن) گستاخی کے کلمات استعمال کرے تو مسلمان اس کے جواب میں عیسائیوں کے رسول (یعنی حضرت عیسےٰؑ) کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کہہ سکنا تو ایک طرف، اس کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ حضرت عیسےٰؑ، عیسائیوں سے کہیں زیادہ خود مسلمانوں کے رسول ہیں۔ مسلمانوں کے لئے اُن پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری ہے جیسا نبی اکرمؐ پر ایمان لانا۔ اس لئے ان کی تنقیص و تنکیر کا (معاذ اللہ) خیال بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اسی سے دوسرے رسولوں اور نبیوں کے متعلق اندازہ لگا لیجئے۔ ان کے متعلق بھی جن کا ذکر قرآن کریم نے تصریحاً فرمایا ہے اور وہ بھی جن کا مجملاً ذکر کیا ہے۔ یہی صورت ان مذاہب کی اصل آسمانی کتابوں کی ہے۔ اس لئے جب ہم کسی مذہب کی مبینہ آسمانی کتاب پر تنقید کرتے ہیں تو یہ تنقید اس بنا پر ہوتی ہے کہ وہ آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہی۔ بلکہ انسانی افکار و تخیلات کا مجموعہ بن چکی ہے۔ اس لئے یہ تنقید درحقیقت خدائی تعلیم کے

---

[۱] حضور خاتم النبیین کے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں آسکتا۔ اس لئے جن حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ سب وہ ہیں جو حضورؐ سے پہلے مبعوث ہوئے۔ حضورؐ کے بعد کسی تعلیم اور تعلیم کے مدعی کو منجانب اللہ نہیں مانا جا سکتا۔ [۲] "بانیٔ مذہب" کے الفاظ غیر مسلموں کی زبان میں استعمال کئے گئے ہیں ورنہ مسلمانوں کے نزدیک کوئی رسول کسی مذہب کا "بانی" نہیں ہو سکتا۔ وہ مذہب (یعنی دین) کو خدا کی طرف سے لاتا ہے اس کی بنیاد نہیں ڈالتا۔

یہ تنقید کیا ہے؟

نہیں ہوتی بلکہ اس انسانی تعلیم کے خلاف ہوتی ہے جس نے آسمانی تعلیم کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ یہ تنقید وہ ہے جس سے ہم غیر مذاہب کی کتابیں تو ایک طرف خود اپنے ہاں کی ان کتابوں کو بھی مستثنیٰ نہیں سمجھتے جن میں توہین اسلامی کی آمیزش کا ارمان ہو۔ ایک مسلمان کے دل میں احادیث نبی اکرمؐ کی جو عزت و عظمت ہو سکتی ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔ لیکن چونکہ کتاب روایات کی جمع انتخاب دین انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے اس لئے ہمارے نزدیک وہ بھی تنقید کی حد سے بالاتر نہیں۔ چنانچہ گذشتہ مجلدات میں کئی ایک روایات پر تنقید آپ کی نظروں سے گذر چکی ہے اور اس کے بعد بھی آپ کے سامنے آئے گی۔ اگر کوئی شخص اس تنقید سے یہ نتیجہ نکالے کہ یہ حضورِ قدسی مرتبت کی ذات گرامی کی معاذ اللہ) سوءِ ادبی ہے تو اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو گی۔ یہ سوءِ ادبی نہیں بلکہ انتہائے ادب و احترام ہے کہ ایسی باتیں جو حضور کی شان اقدس کی سطح سے گری ہوئی ہوں ان کے متعلق صاف صاف کہ دیا جائے کہ وہ حضورؐ کی نہیں ہو سکتیں بلکہ آپ کی طرف غلطی سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح جب ہم گزشتہ (مزعومہ) کتب سماوی پر تنقید کرتے ہیں تو اس سے بھی یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ ہم معاذ اللہ ان حضرات انبیاء کرامؑ کے خلاف زبان کھولتے ہیں جن کی طرف یہ کتابیں منسوب ہیں، بلکہ یہ کہ ہم فقط اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ اس قسم کی غلط تعلیم کبھی ان برگزیدہ حضرات کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔ لہذا یہ تعلیم المحرف ہے۔ بنا بریں، ہماری اس تنقید سے برافروختہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اس تنقید کے دو پہلو ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ تاریخی نظائر و شواہد سے یہ بتایا جائے کہ دیگر مذاہب کی مروجہ کتب آسمانی "درحقیقت وہ نہیں ہیں جو اُن کے" بانیانِ مذاہب "نے انہیں دی تھیں اور دوسرے یہ کہ جو کچھ ان کتابوں کے اندر ہے اس سے۔ شہادت سامنے لائی جائے کہ اس قسم کی تعلیم کبھی خدا کے کسی برگزیدہ پیغمبر کی نہیں ہو سکتی۔ اس تحقیق و تنقید میں ہم نے التزام یہ کیا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں۔ بلکہ خود ان مذاہب کے مورخین و محققین کی شہادت پیش کرتے جائیں۔ لہذا آئندہ صفحات میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا وہ یا تو ان (مزعومہ) کتب سماوی کی وہ اجمالی تاریخ ہو گی جسے خود ان کتابوں کے ماننے والوں نے مرتب کیا ہے یا ان کتابوں کے اقتباسات ہوں گے۔

---

(۱) یہودیت

عیسائی جس کتاب کو بائبل کہکر پکارتے ہیں وہ عہد نامۂ عتیق (Old Testament) اور عہد نامۂ جدید (New Testament) کا مجموعہ ہے۔ عہد نامہ عتیق کو بنظر سہولیت تورات کہدیا جاتا ہے تورات حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت یہ کتاب بنی اسرائیل کی تاریخ ہے جس میں ان کے مختلف

توراۃ انبیائے کرام کی طرف منسوب کردہ کتابیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں (۳۹) کتابیں ہیں جنہیں علمائے یہود ذیل کے تین سلسلوں میں تقسیم کرتے ہیں:-

(۱) سلسلۂ اول - توراۃ (یا قانون) اس میں پانچ کتابیں (اسفار) شامل ہیں جنہیں کتب موسیٰ کہا جاتا ہے۔ پیدائش۔ خروج۔ احبار۔ گنتی۔ استثناء۔

(۲) سلسلۂ دوم نبئیم۔ اس میں بڑی چھوٹی، بائیس کتابیں شامل ہیں۔

(۳) سلسلۂ سوم۔ کتبئیم۔ اس میں بارہ کتابیں شامل ہیں (زبور اسی سلسلہ کی کتاب ہے)

یہ کتابیں (جیسی کچھ بھی ہیں) آج موجود ہیں۔ لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آتا ہے جن کا وجود اس مجموعہ میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی کم از کم گیارہ کتابیں آج گنائی جا سکتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عہد نامہ عتیق کا جو مجموعۂ کتب آج دنیا میں موجود ہے، اس کی اپنی شہادت کی بنا پر بھی یہ مکمل نہیں ہے۔

اس سے آگے بڑھئے۔ سلسلۂ اول کی پانچ کتابوں کو حضرت موسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں حضرت موسیٰ کی وفات اور وفات کے بعد کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پانچ کتابوں کا کم از کم کچھ حصہ یقینی طور پر بعد کا اضافہ ہے۔ عہد نامۂ عتیق کی کتابوں کے متعلق اس وقت تک بہ تحقیق ثابت نہیں ہو سکا کہ ابتداءً یہ کس عہد میں مدون ہوئیں اور ان کے مؤلف کون تھے۔ البتہ اتنا ضرور متحقق ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا تھا جس میں ان کا وجود ناپید ہو چکا تھا اور اس کے بعد از سر نو ان کی تدوین عمل میں آئی تھی۔

بنی اسرائیل کا دورِ انتشار ہم جلد سوم میں دیکھ چکے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل باہمی تشتت و افتراق کی مصیبت میں گرفتار ہوئے اور ان کی دو مختلف سلطنتیں، ایک دوسرے کے مقابل رقیبانہ حیثیت سے قائم ہو گئیں۔ یعنی دس اسباط بنی اسرائیل پر مشتمل ایک سلطنت (جس کا دار الحکومت سماریہ تھا) اور دو اسباط (یہودا اور بنیامین) پر مشتمل دوسری سلطنت (جس کا مرکز یروشلم تھا)۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں، اسیریا والوں نے سماریہ کی سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا اور بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے نینوا لے گئے۔ قوس اپنی مرکزیت کھو کر کس طرح ریت کے ذروں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے، اس کی عبرت انگیز شہادت ان دس اسباط پر مشتمل قوم بنی اسرائیل کا انجام ہے۔ آج محققین و مکتشفین کی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ نہیں بتا سکتی کہ یہ دس اسباط بالآخر کہاں گم ہو گئے۔ اِدھر اُدھر سے قیاسی سراغ نکالے جاتے ہیں۔ کچھ حصہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آج افغانستان اور سرحد کے پٹھانوں کی صورت میں متشکل ہے۔ اور ایک حصہ کے متعلق قیاس ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں کے پیکر میں متحرک ہے (تفصیل اس کی ہندومت کے عنوان میں ملے گی) بہرحال یہ قیاسات ہیں۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی مرکزیت کھو کر یہ عظیم الشان قوم کن کن صحراؤں میں جذب اور کون

کون سے بیابانوں میں فنا ہو گئی۔ ہر قوم جو اپنی ملی مرکزیت کی حفاظت نہیں کرتی اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہے کہ بعد میں ان کی جداگانہ ہستی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ بہر حال، یہ تھا انجام بنی اسرائیل کے ایک حصہ کا۔ اب دوسرے حصہ کو لیجئے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں، بابل کے شاہنشاہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کیا اور اسے تاخت و تاراج کرنے کے بعد یہودیوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ (بابل) لے گیا۔ حضرت سلیمانؑ نے، الواح تورات

کتب مقدسہ تباہ ہو گئیں

اور دیگر تبرکات کو بیت المقدس کے ہیکل میں محفوظ رکھا تھا بخت نصر نے ان سب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا[1]۔ اور باقی سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا۔ تورات میں ہے:۔

> تب یسعیاہ نے حزقیاہ سے کہا خداوند کا کلام سن۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ سب جو کچھ تیرے گھر میں ہے، اور جو کچھ کہ تیرے باپ دادوں نے آج کے دن تک جمع کر رکھا ہے، سب بابل کو لے جائیں گے۔ کچھ باقی نہ رہے گا۔
>
> (سلاطین ۲ — ۲۰: ۱۶-۱۷)

یہ تھا وہ زمانہ جب ان کتب مقدسہ کا وجود دنیا سے ناپید ہو گیا۔ کیونکہ یہ کتابیں یروشلم کے ہیکل میں تھیں اور ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ پچاس برس کی قید و بند کے مصائب اور غلامی و محکومی کے جانگسل نوائب کے بعد عزرا اور نحمیاہ نبیؑ[2] کی کوششوں سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کی اجازت ملی۔ خدا خدا کر کے بنی اسرائیل کے بقیۃ السیف پھر اس ارض مقدس کی طرف لوٹے جسے ان کے اعمال کی بدبختیوں نے ان سے یوں چھین لیا تھا۔ سپنگلر کی تحقیق کے مطابق ان واپس آنے والوں کی مجموعی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہ تھی جو یہود کی کل آبادی کا بیسواں حصہ بھی نہ تھا۔

(Decline of The West II; P. 208)

---

[1] تورات سے تو بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الواح تورات، حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے بھی پہلے ضائع ہو چکی تھیں کیونکہ ہیکل کی تکمیل کے بعد جب اس صندوق کو وہاں منتقل کیا گیا ہے، جس میں تورات کی تختیاں رکھی تھیں تو اس میں سے صرف دو تختیاں برآمد ہوئیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان دو تختیوں پر موجودہ تورات کی پانچ کتابیں (جنہیں کتب موسیٰ کہا جاتا ہے) کسی طرح بھی نہیں لکھی جا سکتی تھیں۔ چہ جائیکہ حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت سلیمانؑ تک کے انبیائے بنی اسرائیل کے تمام صحیفے ان دو تختیوں پر لکھے مل جاتے۔ تورات میں ہے کہ جب ہیکل کی تعمیر ہو چکی تو

> کاہنوں نے خداوند کے عہد کے صندوق کو اس کی جگہ پر گھر کی الہام گاہ میں یعنی پاک ترین مکان میں لا کے اسے کروبیوں کے پروں کے نیچے رکھا۔ یعنی کروبی اپنے دو بازو صندوق کی جگہ کے اوپر پھیلائے ہوئے تھے۔ اور کروبیوں نے صندوق کو اور اس کی چوبوں کو چھپا رکھا۔ سو چوبیں ادھر بڑھائیں۔ ایسی کہ چوبوں کے سرے پاک مکان سے الہام گاہ کے سامنے دکھائی دیتے تھے لیکن باہر سے نہیں دکھائی دیتے تھے اور وہ وہاں آج کے دن تک ہیں۔ اور صندوق میں کچھ نہیں تھا سوائے پتھر کی ان دو لوحوں کے جنہیں موسیٰ نے حورب پر اس میں رکھا۔ جبکہ خداوند نے بنی اسرائیل سے ان کے زمین مصر سے نکلتے وقت عہد باندھا تھا۔ (سلاطین ۱ — ۸: ۶-۹)

[2] یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہودی لٹریچر میں نبی کا لفظ قرآنی اصطلاح کے مفہوم میں ہی استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس سے ہیکل کا ایک اعلیٰ منصب دار مراد تھا۔

تورات کی از سرِ نو ترتیب

اب جو ذرا سکون نصیب ہوا تو سب سے پہلے اپنے گم گشتہ صحف مقدسہ کی ترتیب نو کی فکر ہوئی۔ عزرا نبی نے تورات (یعنی سلسلۂ اول کی پانچ کتابوں) کو از سر نو مرتب کرکے واقعات کو مؤرخانہ حیثیت سے قلمبند کیا۔ (اس کی تفصیل تورات۔ کتاب نحمیاہ۔ باب ۸ میں موجود ہے۔) عزرا نے ان کتابوں کو کس مواد (material) سے از سر نو مرتب کیا تھا، تاریخ اس پر کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔ جو کچھ زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے علماء نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ سبت کے دن لوگوں کو جمع کرکے انہیں روایات بالمعنی کے طریق پر، تورات کا وعظ سناتے (یعنی تورات کے الفاظ نہیں بلکہ اس کا مفہوم۔ اسی کو روایت بالمعنیٰ کہتے ہیں۔ ہماری کتب احادیث بھی اسی طرح مرتب ہوئی ہیں۔ یعنی ان کے الفاظ رسول اللہ کے نہیں ہیں بلکہ مفہوم دوسروں کے الفاظ میں ہے) جنہیں تورات کی کچھ آیات یاد ہوتیں وہ پہلے ان آیات کو پڑھتے (جو قدیم عبرانی زبان میں تھی) اور پھر اس کی تفسیر ارامی زبان میں بیان کرتے جو بابل کے اثر سے یہود کی ہو گئی تھی[1] یہ سلسلہ بیت المقدس کی واپسی پر بھی جاری رہا۔ غالباً یہی وہ روایات تھیں (یعنی تورات کا جو مفہوم علمائے یہود لوگوں کو بتاتے تھے۔) جو عزرا نبی کی مرتب کردہ پانچ کتابوں کا ماخذ تھا۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ خود عزرا کے متعلق بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کب یروشلم میں آئے۔ عام یہود کے خیال کے مطابق وہ بابل کی اسارت کے زمانہ میں بھی ان کے ساتھ تھے اور پھر ان کے ساتھ ہی یروشلم واپس

---

[1] غور کیجئے کہ محکومی کا اثر کس قدر برق رفتار اور جڑرس ہوتا ہے۔ اتنے سے عرصہ میں یہود اپنی آبائی زبان کھو بیٹھے۔ یروشلم کی تباہی کے سلسلہ میں یہودیوں کی سلطنت چھنی۔ دولت لٹی۔ عزت گئی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن ان سب سے کہیں بڑھ کر جو نقصان ہوا وہ یہ تھا کہ اس محکومی سے وہ اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی آبائی زبان تک سے محروم ہو گئے۔ بیت المقدس دوبارہ تعمیر ہو گیا۔ بنی اسرائیل اس میں پھر آکر بس گئے۔ یہ سب کچھ واپس مل گیا۔ لیکن اپنی زبان چھن جانے سے جو نقصان پہنچا اس کی تلافی آج تک نہ ہو سکی۔ قوموں کے ملی وجود کے تحفظ کے لئے ان کی زبان کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ زبان مٹ جانے سے قومی تشخص مٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کی اسیری کے زمانہ میں (اور اس کے بعد بھی) ان کے ارباب بصیرت اپنا سر پیٹتے تھے کہ یہ خارجی اثرات جنہیں یہودی یوں قبول کئے جا رہے ہیں ان کی ابدی تباہی کا موجب بن جائیں گے۔ نحمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:۔

> ان ہی دنوں میں میں نے چند یہودیوں کو بھی دیکھا جو اشدودی عورتیں اور موآبی عورتوں کو بیاہ لائے تھے اور ان کے لڑکے آدھی اشدودی زبان بولتے تھے اور یہودی زبان نہ بول سکتے تھے بلکہ ملی جلی بولی بولتے تھے۔ تب میں نے ان سے جھگڑا کیا اور انہیں ملامت کی اور ان میں سے کتنوں کو مارا اور ان کے بال کھسوٹے اور ان سے یوں خدا کی قسم لی کہ ہم اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو نہ دیں گے اور ان کی بیٹیاں اپنے بیٹوں کے لئے اور نہ اپنے لئے لیں گے۔ (۱۳/۲۳-۲۵)

لوٹے یہودیوں کی اسیری کا زمانہ ۵۱۵ق۔م میں ختم ہو چکا تھا لیکن تاریخ کی شہادت ہے کہ عزرا (فقیہہ) کو شاہ ارتخششتا (Artaxerxes) نے ۴۵۸ق۔م یا زیادہ سے زیادہ ۴۵۷ق۔م میں بابل سے یروشلم بھیجا تھا یعنی

تورات کیسے مرتب ہوئی

یہودیوں کے زمانہ اسیری کے اختتام کے بہت عرصہ بعد لیکن وہ یروشلم میں ۴۵۸ق۔م میں آئے ہوں یا ۴۵۷ق۔م میں یہ متحقق ہے کہ انہوں نے اسفار موسیٰ کی تدوین، ۴۴۵-۴۴۴ق۔م میں کی تھی۔ یہ تدوین کس طرح عمل میں آئی تھی؟ اس کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ ایک بیان یہ ہے

> معلوم ہوتا ہے کہ عزرا نے زمانہ اسیری میں صحف مقدسہ کا خصوصیت سے مطالعہ کیا اور نحمیاہ نبی اور کنیسۂ عظمیٰ کے دیگر اراکین کی مدد سے ان غلطیوں کو درست کیا جو کاتبوں کے سہو یا تغافل سے ان مقدس نوشتوں میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے ان تمام کتابوں کو اکٹھا کیا جو اس زمانہ میں مقدس مانی جاتی تھیں۔ انہیں ترتیب دیا اور اپنے عہد کے لئے بائبل کا قانون مدون کیا۔ اس نے مقدس روح کی مدد سے ان میں ان چیزوں کا اضافہ بھی کیا جو توضیح مطالب یا ترتیب و تکملہ کے لئے ضروری سمجھی گئیں۔ اگرچہ وہ خود نبی نہ تھا لیکن اس نے یہ سب کچھ روح القدس کے ماتحت لکھا اور اس کی کتاب کی شرعی حیثیت کبھی محل نظر نہیں ٹھیری
>
> (Introduction to Polyglot Bible)

لیکن کیٹو (Kitto) اپنے سائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر میں لکھتا ہے:۔

> یہاں تک کہا جاتا ہے کہ عزرا نے تمام عہد عتیق کو محض حافظہ کی مدد سے از سر نو تحریر کیا کیونکہ ان کتابوں کے تمام نسخے تغافل شعاری کی وجہ سے معدوم ہو چکے تھے۔

غور کیجئے کہ ان ہر دو تاریخی بیانات میں کس قدر فرق ہے۔ پہلے بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ عزرا نے ان پراگندہ نوشتوں کو صرف از سر نو ترتیب دیا۔ اگرچہ اس میں اپنی طرف سے بھی اضافے کئے۔ لیکن کیٹو کی تحقیق کے مطابق، عزرا (فقیہہ) نے تمام کتابوں کو حافظہ کی مدد سے از سر نو لکھا، کیونکہ ان کے تمام نسخے ضائع ہو چکے تھے۔ دوسرا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ تورات کے بیان کے مطابق ہے، جس میں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) بصراحت مذکور ہے کہ بخت نصر کے حملہ کے وقت یروشلم میں جو کچھ تھا، سب تباہ اور برباد ہو چکا تھا۔

عزرا کا بیان

لیکن دیکھئے کہ عزرا (فقیہہ)، اس جمع و تدوین کے متعلق کیا لکھتے ہیں۔ انہوں نے اسفار موسےٰ وغیرہ کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں دو کتابیں (عزرا اول و دوم) خود اپنے متعلق ہیں۔ کتاب دوم میں باب ۱۴۔ آیات ۲۰-۲۲ میں مذکور ہے۔

۱؎ دیکھئے Chronological Index To The Holy Bible

اے خداوند خدا! دنیا میں اندھیرا چھا رہا ہے اور جو لوگ اس میں بستے ہیں سب بغیر روشنی کے ہیں کیونکہ تیری ہدایت (قانون) جل چکا ہے اس لئے کوئی شخص نہ ان معاملات کا علم رکھتا ہے جو گذر چکے ہیں اور نہ ان کا جو شروع ہونے والے ہیں۔ لیکن میں نے تیرے حضور عزت پائی ہے (اس لئے اے خداوند خدا) روح القدس کو مجھ میں داخل کر دے اور میں پھر وہ سب کچھ لکھوں جو دنیا میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو چکا ہے اور جو تیرے قانون کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا۔ تاکہ لوگ تیرا راستہ پا لیں اور تاکہ آنے والے بھی صحیح زندگی بسر کریں۔

یہ تھی عزرا (فقیہہ) کی دعا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

دوسرے روز ایک آواز نے مجھے بلایا اور کہا۔ عزرا! اپنا منہ کھول اور وہ کچھ پی جو میں تمہیں پینے کے لئے دیتا ہوں۔ سو میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ تب دیکھو اس نے مجھ تک ایک پیالہ بھیجا۔ وہ پانی سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا رنگ آتشیں تھا۔ میں نے اسے لیا اور پی گیا۔ جب میں نے اسے پی لیا تو میرے دل میں فہم و فراست اور سینے میں بصیرت پیدا ہو گئی اور میری روح نے میرے حافظہ کو قوی بنا دیا اور پھر جو میری زبان کھلی ہے تو بند نہیں ہوئی اور لکھنے والے چالیس دن تک بیٹھے لکھتے رہے۔ وہ دن بھر لکھتے تھے اور صرف رات کے وقت کچھ کھاتے۔ اور میں دن بھر لکھاتا رہتا تھا۔ اور رات کو بھی میری زبان بند نہ ہوتی۔ چالیس دنوں میں انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھ ڈالیں۔

(کتاب عزرا ۲ ۱۴ / ۴۴ - ۳۸)

یہ بیان کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کو عزرا (فقیہہ) نے اپنے حافظہ کی مدد سے لکھوایا اور اس وقت تمام اصلی کتابیں ناپید تھیں۔ یہاں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے کہ یروشلم کی تباہی ۵۸۶ ق۔م کے قریب ہوئی اور عزرا (فقیہہ) نے ان کتابوں کو ۴۴۴ ق۔م میں لکھا۔ یعنی تقریب ڈیڑھ سو سال (۱۴۲ سال) بعد۔ اس سے یہ واضح ہے کہ خود عزرا (فقیہہ) نے بھی ان کتابوں کو کہیں نہیں دیکھا تھا۔ جہاں سے انہیں حفظ یاد کر لیا ہوتا اور پھر اپنے حافظہ کی مدد سے دوبارہ لکھوا دیا ہوتا۔ لہذا ان کتابوں کے مصنف خود عزرا (فقیہہ) ہیں۔ [جس انداز سے عزرا (فقیہہ) نے، اپنے بیان کے مطابق، ان کتابوں کو تصنیف کیا ہے۔ بعینہٖ یہی انداز مذہب زرتشت کی گم گشتہ "آسمانی کتابوں" کی از سر نو تصنیف کے بارے میں مذکور ہے۔ تفصیل اس کی "زرتشت" کے عنوان میں آئے گی۔ تاریخ کی تحقیق جدید ہے کہ عزرا (فقیہہ)[2] زرتشتی تعلیم سے متاثر تھے۔ اس لئے انہوں نے اسی انداز سے جس میں زرتشتی کتابوں کی بازیافت کا قصہ مشہور تھا عہد عتیق کی کتابیں یہودیوں کو تصنیف کر دیں جو درحقیقت زرتشتی تعلیم پر مبنی ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ خود عزرا (فقیہہ) کے بیان کے مطابق۔ انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھوائی تھیں۔ لیکن اب کہا یہ جاتا

---

[1] یاد رہے کہ اسفار موسیٰ میں سب سے پہلی کتاب "پیدائش" میں دنیا کی ابتداء سے واقعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

[2] صفحہ ۱۳ ملاحظہ فرمائیے۔

ہے کہ انہوں نے صرف اسفارِ موسیٰ (یعنی تورات کی پہلی پانچ کتابیں) مرتب کی تھیں۔ اس ۲۴ کتابوں کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر آتا ہے۔

بہر حال یہ ہے تاریخ تصنیف و ترتیب ان اسفارِ موسیٰ (یعنی تورات کی بنیادی کتابوں) کی، جو مذہب یہودیت کا عروۃ الوثقیٰ ہیں۔

عزرا (فقیہہ) کے بعد نحمیاہ نبی نے نبیم۔ یعنی سلسلۂ دوم کی کتابوں کو (حصۂ زبور) جمع کیا (مقابان ۲۷ : ۲/۱۳)

لیکن اس کے بعد فلسطین کی طرف یونانیوں کا سیلاب امنڈا، اور سنہ ۱۶۸ ق۔م میں انٹونیس (انطاکیہ کے یونانی بادشاہ) نے پھر بیت المقدس کو برباد کیا۔ مقدس صحیفوں کو جلوایا اور تورات کی تلاوت کو حکماً بند کر دیا۔ اس کے بعد یہودا مقابی کی ہمت سے بیت المقدس کی بازیابی ہوئی۔ مقدس صحیفوں کو از سر نو جمع کیا گیا۔

دوبارہ بربادی

اور اس مرتبہ، پہلے دو سلسلوں کے ساتھ، سلسلہ سوم، یعنی کتبیم کی کتابوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر رومیوں کا طوفان امڈا۔ اور ٹائٹس نے ۷۰ء میں بیت المقدس کو اس طرح برباد کیا کہ پھر یہودی اس میں آکر آباد نہ ہو سکے۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ ٹائٹس مقدس صحیفوں کو ہیکل سے نکال کر فتح کی یادگار کے طور پر، روما کے محلات میں لے گیا۔ یہ بنی اسرائیل کی آخری تباہی تھی اس کے بعد یہودیوں کی آبادیوں میں ان کے علماء نے انفرادی طور پر تورات کے وعظوں کا سلسلہ جاری کیا (جس طرح اسارت بابل کے زمانہ میں کرتے تھے) اور اپنے اپنے طور پر (جو کچھ جسے یاد تھا۔ یا جیسا کچھ مفہوم ذہنوں میں مستحضر تھا) ان صحیفوں کو ترتیب دیا۔ یہ صحیفے صندوقوں میں رکھے جاتے تھے اور جب لوگ کنسیوں میں جمع ہوتے تو انہیں ان میں سے کچھ سنا دیا جاتا تھا۔ اس مقام تک ہم اتنا دیکھ چکے ہیں کہ یروشلم کی آخری بربادی (۷۰ء) کے زمانہ تک یہودیوں کے ہاں تینوں سلسلوں کی کتابیں مدون ہو چکی تھیں جن کی تعداد آج ۳۹ ہے۔ لیکن یہودیوں کا سب سے بڑا مستند مورخ۔ (Antiquities of Jews) کا مصنف (جوزیفس) ان کتابوں کی تعداد کے متعلق کچھ اور ہی لکھتا ہے۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں رقمطراز ہے۔

جوزیفس کا بیان

حاشیہ صفحہ ۱۲

۱؎ یہاں یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بخت نصر کو فارس کے زرتشتی بادشاہ سائرس نے (جس کا ذکر ذوالقرنین کے عنوان میں (جلد سوم میں) آپ کی نگاہوں سے گذر چکا ہے) شکست دی تھی۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو بابلیوں کے مظالم سے چھڑا کر یروشلم میں بسنے اور ہیکل کے تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ سائرس کے بعد دارا جانشین ہوا۔ پھر ارتخششتا جس نے عزرا کو یروشلم بھیجا تھا یہ سب بادشاہ مذہب زرتشتی کے پیرو تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عزرا (فقیہہ) پر زرتشتی تعلیم اور معتقدات کا کس قدر اثر ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود زرتشتی مذہب کے ہی پیرو ہوں۔ قرائن خود اسی کی تائید کرتے ہیں۔

جب میرے ملک کی تباہی ہوئی.... تو میں نے ٹائیٹس سے درخواست کی کہ میرے خاندان کو آزاد کر دیا جائے

اس کی عنایت سے مجھے کتب مقدسہ بھی مل گئیں۔

اب ان کی تعداد کا ذکر آتا ہے۔

ہمارے ہاں کتابوں کا سلسلہ لاتعداد نہیں جو ایک دوسرے سے متخالف ومتباین ہوں (جیسا کہ یونانیوں کے ہاں ہے)

ہمارے ہاں کل بائیس کتابیں ہیں جن میں تمام ازمنہ سابقہ کے واقعات محفوظ ہیں اور جو تمام الہامی ہیں۔ ان میں

پانچ کتابیں موسیٰ کی ہیں جن میں شریعت کے قوانین اور نوع انسانی کی ابتداء سے لیکر (حضرت) موسیٰ کی وفات

تک کی تاریخی روایات ہیں۔ (حضرت) موسیٰ کے بعد کے انبیاء نے تیرہ کتابوں میں اپنے عہد کے حالات لکھے ہیں

باقی چار کتابوں میں حمد وستائش کے نغمے اور انسانی زندگی کے عام اخلاقی ضوابط درج ہیں

(Reply to Apion, Book I - Sec: 8)

یعنی جوزیفس کے بیان کے مطابق ۸۰ء کے لگ بھگ یہودیوں کے ہاں صرف ۲۲ کتابیں تھیں نہ ۲۴ جیسا کہ عزرا

رفقیہہ نے لکھا ہے۔ اور نہ ۳۹ جنہیں آج مجموعہ عہد عتیق کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔

پھر یہی نہیں کہ ان کتابوں کو حوادث ارضی وسماوی ہی تباہ کر دیتے تھے بلکہ ان میں دانستہ تحریف و الحاق کا سلسلہ

بھی جاری تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مؤرخ رینان لکھتا ہے کہ

اسی زمانہ (یعنی زمانہ قرب حضرت مسیحؑ) میں تورات میں بھی بہت سی اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ (بالکل) نئی کتابیں مثل

کتاب استثناء مرتب کی گئیں اور کہا یہ گیا کہ یہ کتابیں (حضرت) موسیٰ کی اصلی شریعت کی حامل ہیں۔ حالانکہ درحقیقت ان کی

روح پرانی کتابوں سے بالکل مختلف تھی۔ (Life of Jesus, pp 40)

جب یہوداہ مقابی نے انٹوپیس کی زنجیروں کو توڑ کر دوبارہ آزادی حاصل کی اور صحف مقدسہ کی ترتیب کے ساتھ سلسلۂ سوم

بھی ملایا تو یہودیوں کے دو فرقے ہو گئے۔ ایک صدوقی جنہوں نے سامریہ والوں کی طرح، صرف سلسلۂ اول (یعنی موسیٰ کی

پانچ کتابوں) پر ہی اکتفا کیا اور باقی صحف کو مذہب سے خارج کر دیا۔ دوسرے فریسی جنہوں نے سلسلۂ دوم وسوم کی

کتابوں کو بھی جزو دین قرار دیا۔ ان کے ہاں یہ عقیدہ رائج ہو گیا کہ در اصل حضرت موسیٰ کی وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک

وحی متلو وغیر متلو

تورہ شبکتب، یعنی وحی مکتوب۔ اور دوسری تورہ شبعلفہ، یعنی وحی غیر مکتوب۔ یہ وحی

غیر مکتوب، حضرت ہارون اور ان کی اولاد کی وساطت سے، بہ سلسلۂ روایات آگے بڑھ

تا آنکہ یہ سلسلہ عزرا تک پہنچا جس نے تورات کی کتابت کے لئے ۱۲۰ علماء پر مشتمل ایک مجلس متعین کی۔ اس طرح یہ سلسلۂ

روایات ان علماء تک پہنچا اور ان سے آگے بڑھا۔ اس جماعت کا آخری رکن (شمعون) ۳۰۰ ق۔م میں فوت ہو گیا۔ اس سے

یہ سلسلہ سفریم (یعنی کاتبان وحی) تک پہنچا۔ وہاں سے تنائم (یعنی عام علماء تک) پھر ان سے احبار و ربیین نے سیکھا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طرح اس "وحی غیر مکتوب" کے سلسلۂ روایات کا کتنا بڑا طومار جمع ہو گیا ہوگا۔ ان تمام روایات کو بھی وحی سمجھا جاتا تھا۔ دوسری صدی عیسوی کے اخیر میں، ربی یہودا نے ان اقوال کو جمع کیا۔ اس مجموعہ کا نام مشناہ (Mishnah) ہے پھر اس مجموعہ کی تشریحات و تفسیرات جمع کی گئیں۔ اس کا نام جمارا (Gemara) ہے ان دونوں کے مجموعہ کو تالمود کہتے ہیں۔ یہ تالمود بھی یہودیوں کے ہاں تورات کی سی اہمیت رکھتا ہے بلکہ

تالمود

تورات سے بھی زیادہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مجموعہ تورات کی تفسیر ہے اور وحی کا ہم پلہ۔ تالمود بھی دو ہیں۔ ایک شامی (یا فلسطینی) اور دوسرا بابلی۔ یہ دونوں پانچویں صدی عیسوی کے مرتب شدہ ہیں۔ پہلے فلسطینی اور پھر بابلی جیسا کہ روایات میں ہوا کرتا ہے تالمود میں ایسے ایسے عجیب و غریب افسانے۔ عجائبات۔ بے سر و پا قصص و حکایات، جادو اور طلسمات کے کرشمے۔ گنڈے۔ تعویذ۔ جھاڑ پھونک۔ غرضیکہ دنیا بھر کے اوہام جمع ہیں جن پر عقل ہنسے اور علم ماتم کرے[1]

یہ تو تھا سلسلۂ روایات۔ اس کے علاوہ ایک اور ذخیرہ بھی تھا جو اس سے بھی زیادہ پُرپیچ اور مخفی راستوں سے جمع کیا گیا تھا۔ عزرا (فقیہہ) کے متعلق مشہور تھا کہ جب انہوں نے تورات کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا ہے تو اس کے ساتھ ہی ستر مخفی ملفوظات بھی مدوّن کئے تھے جن کی تعلیم پوشیدہ طور پر صرف خواص تک محدود تھی۔ اس مجموعہ کو سفریم جنوزیم (یعنی مخفی خزانہ کی کتابیں) کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ سینہ بسینہ جاری رہا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ

باطنی علم

میں بھی اختلافات کی کس قدر گنجائش اور وضع و تلبیس کی کتنی وسعت تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ کے حاملین کی ایک دوسرے سے ردّ و کد ہوتی رہتی تھی یہ اُسے جعلی قرار دیتے وہ اسے وضعی کہتے۔ نتیجہ یہ کہ آہستہ آہستہ اس مجموعہ کا

---

[1] یہودیوں کے اس سلسلۂ روایات اور طلسم و خرافات کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ خود مسلمانوں نے کس طرح ایک ایک چیز ان سے مستعار لی اور انہیں اسی طرح دین کا جزو بنا دیا ہے جس طرح انہیں یہود نے عین دین بنا رکھا تھا۔ دیکھئے کہ ایک غیر مسلم مورخ اس باب میں کیا لکھتا ہے:۔

> یہ طریقہ جس سے ہر ایک مقولہ کو کسی راوی کے ذریعے اوپر تک پہنچایا جاتا تھا یہود کے ہاں، تالمود میں اور پھر اسلامی دینیات میں اپنی شدت تک پہنچ گیا۔ تالمود کی کوئی روایت یا مسلمانوں کی حدیث اگر ایک غیر منقطع سلسلۂ روایت سے حضرت موسیٰ یا حضور محمد رسول اللہ تک پہنچا دی جائے تو وہ ثقہ قرار دے دی جاتی ہے۔ اس کے لئے ہر مذہب میں یہ مقدس طریق رائج تھا کہ "میں نے اپنے استاد سے یوں سنا" اسی طرح ژند اوستا میں یہ طریق تھا۔
>
> (Spengler; Decline of the West, Vol: II; P. 247)

لیکن خدا کا احسان ہے کہ مسلمانوں کے ہاں قرآن کریم حرفاً حرفاً اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور یہ چیز کسی اور مذہب کو نصیب نہیں۔

نام ہی اپوکریفہ (Apocrypha) یعنی جعلی پڑ گیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہودیوں (اور عیسائیوں) کے ہاں (Apocryphic Literature) ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ عہد نامۂ عتیق کے سلسلہ میں قریب ۳۵ کتابیں ایسی موجود ہیں جو اس سلسلہ میں شامل ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان مخفی نوشتوں کو خود عزرا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ عزرا کا اپنا بیان ہے کہ ان ۲۰۴ کتابوں کے متعلق (جو انہوں نے مرتب کی تھیں) اس "بلند و بالا ہستی" کا ارشاد ہوا کہ ان کے پہلے حصّے کو عام طور پر شائع کر دو۔

تاکہ اہل اور نا اہل سب انہیں پڑھ سکیں۔ لیکن دوسرے حصّہ کی ستر کتابوں کو مخفی رکھو اور صرف ان ہی کو دو جو لوگوں میں سمجھ بوجھ کے مالک ہوں۔ کیونکہ یہی لوگ ہیں جن میں فہم و فراست کا چشمہ عقل کا منبع اور علم کا دریا ہے[1]۔"

(عزرا کتاب دوم - ۱۴ / ۴۴-۴۶)

اس سے واضح ہے کہ جن کتابوں کو بعد میں اپوکریفہ کہا گیا وہی درحقیقت دین کا مغز ہیں۔ باقی تو "استخوان" ہیں جنہیں اہل و نا اہل سب کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اپوکریفہ لیکن ان اپوکریفہ کتابوں کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ انہیں جعلی قرار دیکر مسترد کر دیا گیا ہے۔ عیسائیوں کے فرقہ پراٹسٹنٹ کے بانی لوتھر نے انہیں ضرور مسترد قرار دے دیا تھا لیکن ٹرنٹ (Trent) کی کونسل (منعقدہ ۱۵۴۵ء) نے یہ فیصلہ دیا کہ یہ کتابیں بھی دیگر کتب مقدسہ کے ہم پایہ ہیں[2]۔ اس لئے رومن کیتھولک کے نزدیک، ان میں اور دیگر کتب مقدسہ میں کچھ فرق نہیں۔ چنانچہ ان کی شائع کردہ بائبل میں یہ مجموعہ برابر شامل ہوتا ہے۔ اور خود پراٹسٹنٹ کے ہاں بھی ان سے مستفید ہونے میں چنداں قباحت نہیں۔ ان کتابوں کی عام اشاعت کی ممانعت کے متعلق ہیں (Library of Universal Knowledge) میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔

اپوکریفہ بعض اوقات ان تحریروں کو بھی کہا جاتا تھا جن کی عام اشاعت مناسب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ جنہیں خدا نے انبیاء کو بذریعہ وحی دیا لیکن بعد میں علماء نے سوچا کہ خدا کا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) درست نہیں۔ لہٰذا اس وحی کو دبا لینا ہی بہتر ہے۔

لیکن اپوکریفہ کے متعلق رینان کی رائے بھی قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

---

[1] غور فرمایا آپ نے کہ "علم لدنی" کے عقیدہ اور "شریعت و طریقت" کے امتیاز کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اسپنگلر کے بیان کے مطابق اس نظریہ کی ابتدا مجوسیوں کے ہاں سے ہوئی اور اس کے بعد یہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام سب میں پھیل گیا۔ (جلد دوم ۲۵۷)

[2] حالانکہ (Council of Laodicea) منعقدہ ۳۶۰ء میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اپوکریفہ کتابوں کو شریعت کا قانون نہ سمجھا جائے۔

دیانتداری اور جعلسازی، دو ایسے الفاظ ہیں جو ہمارے ضمیر کے مطابق یکسر متضاد ہیں اور ان میں کسی صورت میں توافق پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مشرق میں ان میں بے شمار لطیف روابط کے ذریعے تطابق پیدا کر لیا جاتا ہے۔ کتب اپوکریفہ (مثل کتاب دانیال اور انوخ) کے مصنف بڑی عزت و تکریم کے حامل تصور کئے جاتے ہیں، جنہوں نے اپنے مشن کی سرفرازی کے لئے، بلا تامل و تردد ایسے کام کئے جنہیں ہم آج سراسر فریب کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ، ایک مشرقی کے نزدیک خالص صداقت کی کچھ قیمت نہیں۔ وہ ہر شے کو اپنے خیالات، اپنے مفاد اور اپنے جذبات کے آئینے میں دیکھتا ہے[۱] (Life of Jesus, P 186)

تورات کی زبان

یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ یہودیوں کی اپنی زبان قدیم عبرانی تھی لیکن بابل سے مراجعت کے بعد ان کی زبان ارامی ہوگئی۔ عزرا نے عہد عتیق کی کتابوں کو کس زبان میں لکھا تھا یہ بالتحقیق معلوم نہیں۔ اس لئے کہ ان کی مرتب کردہ کتابوں کا بھی دنیا میں کہیں وجود نہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو یا تو یہودیوں کی اصل زبان (عبرانی قدیم) میں لکھا ہوگا، یا پھر بعد کی زبان (ارامی) میں۔ لیکن دنیا جن کتابوں سے روشناس ہوئی وہ سب کی سب یونانی زبان میں تھیں۔ جس طرح یہودیوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں اپنی اصلی زبان بھلا دی تھی اسی طرح یونانیوں کے زیر اثر اسکندریہ میں بھی انہوں نے اپنی مادری زبان بھلا دی اور ان کی زبان یونانی ہی ہوگئی۔ اس لئے تاریخ کا بیان ہے کہ قریب ۲۸۵ ق م میں اسفار موسیٰ کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کا نام (Septuagint Edition) ہے بعد میں اس یونانی نسخہ کا ترجمہ عبرانی میں ہوا۔ یہ یونانی نسخہ[۲] اسکندریہ کی لائبریری میں تھا (اس لائبریری کو عیسائیوں نے نذر آتش کر دیا تھا) عیسائی علماء نے انجیل کے نسخوں میں اور اس کے علاوہ دوسرے لٹریچر میں جو کچھ عہد نامہ عتیق سے نقل کیا ہے وہ اسی یونانی ترجمہ سے تھا اور حال کی تحقیق یہ ہے کہ یہ یونانی ترجمہ عزرا کی کتابوں کا ترجمہ نہیں بلکہ سماراوالوں کی کتابوں کا ہے جن کی یروشلم کے یہودیوں سے سخت عداوت تھی۔ جوزیفس کا خود اپنا بیان ہے کہ۔

---

[۱] رینان صاحب ان "مقدس جعلسازیوں" سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ پورے کے پورے مشرق کے متعلق بلا استثناء فتوی صادر فرما دیا۔ [۲] یعنی نسخہ سبعینہ جس کے متعلق جوزیفس کا بیان ہے کہ بادشاہ مصر بطلیموس فلاڈلفس اپنے کتب خانہ اسکندریہ کیلئے یہودی کتب مقدسہ کی ایک نقل چاہتا تھا۔ اس نے بہت سے یہودی غلاموں کو آزاد کر کے یروشلم کے کاہنوں کے پاس بھیجا وہاں سے ستر علماء کو منتخب کر کے ایک جزیرہ میں بھیجا گیا جہاں ان میں سے ہر ایک نے کتب مقدسہ کا الگ الگ ترجمہ کیا۔ آخر میں دیکھا گیا کہ ہر ایک کا ترجمہ لفظ بہ لفظ یکساں ہے۔ اس لئے یقین کر لیا گیا کہ یہ ترجمہ الہامی ہے۔ ستر علماء کی نسبت سے اسے سبعینہ کہا جاتا ہے۔

یہ کتاب (یعنی اس کی تاریخ) پانچ ہزار سال کی تاریخ پر مشتمل ہے جسے میں نے اپنی مقدس کتابوں سے مدون کیا ہے۔ لیکن میں نے ان کا ترجمہ یونانی زبان میں کر دیا ہے۔

(Against Apion - 1st Book, Sec: 1)

یعنی عزرا کی اصلی کتابیں نہ کہیں الگ موجود ہیں نہ جوزیفس کی تاریخ میں۔ الگ بھی ان کے یونانی ترجمے ہیں اور جوزیفس کی تاریخ میں بھی یونانی زبان ہی میں ہیں۔ عبرانی نسخہ کے متعلق یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ وہ یونانی زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مروجہ عبرانی نسخہ اور یونانی کے مستند ترجمہ (سبعینہ) میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اختلافات بھی اس قسم کے کہ (مثلاً) تخلیق آدم سے طوفان نوح تک کا زمانہ، عبرانی نسخہ کے مطابق ۱۶۵۶ سال کا ہے۔ لیکن یونانی ترجمہ میں یہ مدت ۲۲۶۲ سال کی لکھی ہے۔ ۳۹۷ء میں سینٹ جیروم نے عہد عتیق کا مشہور رومی ترجمہ شائع کیا جو (Vulgata) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ترجمہ بہت مستند سمجھا جاتا ہے

عبرانی نسخے

یہ تو تھے تراجم۔ عبرانی نسخوں کے متعلق پادری ہارن اپنی کتاب "دیباچہ علوم بائبل" میں لکھتا ہے۔

عہد عتیق کی کتابیں دراصل عبرانی زبان میں تھیں اور وہ دو ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔ ایک آٹوگرافس۔ یعنی وہ کتابیں جنہیں خود الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا ان میں کے سب نسخے ناپید ہو گئے۔ کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ دوسرے اپوگرافس۔ یعنی وہ نسخے جو اصل نسخوں سے نقل ہوئے تھے اور جو نقل در نقل ہوتے ہوئے بہت کثرت سے پھیل گئے تھے۔ یہ موخر الذکر نسخے بھی دو قسم کے تھے۔

(۱) پرانے، جو یہودیوں میں معتبر اور مستند مانے جاتے تھے۔ مگر یہ نسخے بھی مدت سے معدوم ہو چکے ہیں۔

(۲) نئے جو سرکاری کتب خانوں میں یا دوسرے لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ یہ پھر دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو معابد میں کام آتے ہیں اور دوسرے وہ جو عام لوگوں کے پاس ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ عبرانی نسخے جو آجکل مروج ہیں ان کا اصلی نسخوں سے کس قدر تعلق ہے؟ پھر ان نسخوں میں بھی اختلافات ہیں۔ اس قسم کے اٹھارہ اختلافی مقامات تو ایسے ہیں جو اب تک عبرانی نسخوں میں نقل ہوتے چلے آرہے ہیں اور ان کے متعلق لکھا ہوتا ہے کہ یہ احبار یہود کی تصحیحات ہیں۔ ان کے علاوہ اور متعدد مقامات پر مذکور ہوتا ہے کہ فلاں بات زیادہ صحیح ہے اور فلاں محض روایت ہے۔ عبرانی نسخے دوسری صدی عیسوی سے مختلف ادوار و منازل طے کرتے رہے۔ تا آنکہ گیارھویں صدی میں ان سب کے تقابل سے ایک متفقہ علیہ نسخہ مدون کیا گیا جو اب تک مروج ہے۔ اس نسخہ میں مذکورہ صد اختلافات کو حاشیہ پر لکھ دیا گیا ہے۔ سب سے پہلا نسخہ ۱۴۸۸ء میں چھپا۔ لیکن جب ۱۵۲۵ء میں دوسرے ایڈیشن کا انتظام کیا گیا تو پہلے ایڈیشن کے نسخہ سے بارہ ہزار جگہ اختلاف کرنا پڑا۔ طبع دوم کا نسخہ اب عام رائج ہے۔ یہ ہے عہد عتیق کی کتابوں کی سرگذشت جن کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار بائبل کے عنوان میں لکھتا ہے:۔

عرصہ دراز تک کتب مقدسہ کا مطالعہ، جرح و تعدیل کے مسلمہ اصول سے محروم رہا۔ یہود محض اس عبرانی نسخہ کی پیروی کرتے تھے جس کی نسبت مشہور تھا کہ غالباً دوسری صدی عیسوی میں مرتب کیا گیا تھا اور بعد ازاں احتیاط سے محفوظ رکھا گیا۔ لیکن اس نسخہ میں چند تحریفات تو ایسی ہیں جو اب صاف صاف نظر آجاتی ہیں۔ اور غالباً ایک کافی تعداد ایسی تحریفات کی بھی موجود ہے جن کی شاید پورے طور پر قلعی نہ کھل سکے۔ عیسائی اور اسکندریہ کے یہود، علماء کی حالت بہت ابتر تھی۔ کیونکہ پانچویں صدی عیسوی تک، باستثنائے شاذ اور پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک بلا استثناء، ان سب بزرگوں نے ترجموں ہی پر اکتفا کیا۔

جرح و تعدیل کے آئینہ میں ان صحف مقدسہ کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یورپ کے مورخین نے ان کتابوں کے باہمی تضاد و تناقض سے تنگ آکر یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے سب افسانہ ہی افسانہ ہے۔ کتاب دانیال کے متعلق جس کی پیش گوئیوں پر عیسائیت کی تمام عمارت قائم ہے کیٹو اپنے سائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ علاوہ ان عجائبات اور پیش گوئیوں کے، جو ایک مبصر کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔

اس کتاب کا وہ حصہ جو تاریخی کہلا سکتا ہے یکسر افسانہ ہے اور ناممکنات کا مجموعہ۔

ان کتابوں پر اس قسم کی تنقید کچھ دور حاضرہ کی "روشن خیالی" ہی کی پیداوار نہیں۔ بلکہ قرون اولیٰ کے مبصرین نے بھی ان کے متعلق اسی قسم کی تنقیدات کی تھیں لیکن مذہب پرست طبقہ نے انہیں باقی نہ رہنے دیا۔ تیسری صدی عیسوی میں (Porphyry) نامی ایک بہت بڑا فلاسفر گذرا ہے۔ اس نے قریب پندرہ جلدوں میں ان مزعومہ "کتب مقدسہ" پر تنقید لکھی اور بتایا کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ لیکن عیسائی شاہنشاہ قسطنطین کے حکم سے یہ تمام کتابیں جلا دی گئیں اور حکم دیدیا گیا کہ جس کے پاس ان کا کوئی نسخہ ہوگا اسے سزائے موت دیجائے گی۔ اس سے بھی پہلے۔ قریب ۱۷۰ء میں (Celsus) نے اسی قسم کی تنقیدی کتابیں لکھیں لیکن ان کا بھی ویسا ہی حشر ہوا۔ ازمنہ سالقہ کی یہ تنقیدی کتابیں تو ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ لیکن عصر حاضر میں ان "آسمانی کتابوں" کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ قرآن کریم نے، تحریف و الحاق کے علاوہ یہودیوں کے متعلق کہا تھا کہ

تنقید

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ ..... (۲/۷۹)

بدبختی ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر اس کے متعلق یہ مشہور کر دیتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ ہے۔

یعنی ان کی حالت یہ تھی کہ خود باتیں وضع کرتے اور انہیں پھر خدا کی طرف منسوب کر کے آسمانی کتابوں کا جزو بنا دیتے جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:-

یہودیوں کے لٹریچر میں اس قسم کی تلبیس، یعنی خود لکھ کر اسے دوسروں کی طرف منسوب کر دینے کی عادت بہت پرانی ہے۔ اعلیٰ ناقدین کی رائے کے مطابق کتب تورات کا بیشتر حصّہ ایسا ہی ہے۔

اس قسم کی فریب دہی اور جعلسازی کو نہ صرف گذشتہ زمانہ میں ہی جائز سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ آج بھی یہود و نصاریٰ کی "دنیائے مذہب" میں اس "آرٹ" کو مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ مسٹر چیڈوک (J. W. Chadwick) اپنی کتاب "بائبل اوف ٹوڈے" میں لکھتا ہے:

جو لوگ اپنی تحریروں کو ان نامور ہستیوں کی طرف منسوب کر دیتے تھے جو ان سے بہت پہلے ہو گذرے تھے ان کے متعلق اتنا تو ضرور ماننا پڑے گا کہ وہ اپنی ان تصنیفی کوششوں کا سہرا اپنے سر نہیں باندھنا چاہتے تھے بلکہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کا مشن ترقی کرے اگر ان کا مشن کامیاب ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو گوشۂ گمنامی میں رکھنے کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ آج تک گمنامی کے پردے ہی میں مستور ہیں۔

غور فرمائیے! کس طرح عیب کو ہنر بنا کر چمکایا جا رہا ہے! یعنی اُن کے اس فریب اور تلبیس کو معیوب تصور کرنے کے بجائے، ان کے "ایثار و قربانی" کی داد دی جا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے مشن کی کامیابی کی خاطر اپنی شہرت دوام تک کو قربان کر دیا۔ خود گمنامی کی زندگی جیئے اور گمنامی کی موت مرے۔ لیکن اپنی جگر کاوی اور سینہ سوزی کے نتائج و ثمرات کو اپنی طرف منسوب نہ کیا۔ (اس باب میں رینان کا بیان پہلے گذر چکا ہے)

یہ ہیں وہ تحریفات جن کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "اگرچہ اس نسخہ کی بہت سی تحریفات صاف صاف نظر آ رہی ہیں لیکن غالباً ایک کافی تعداد ایسی تحریفات کی بھی موجود ہے جن کی اب یا شاید کبھی بھی قلعی نہ کھل سکے۔"

انتخاب کیسے ہُوا؟

تحریفات و تلبیسات کے اس انبارِ عظیم میں سے کتابوں کا انتخاب کس طرح ہوا۔ اس کے متعلق جوزف اپنی کتاب (Judaism As Creed & Life) میں لکھتا ہے۔

جس فیصلہ کی رو سے بعض کتابیں عہد نامۂ عتیق میں شامل کر لی گئیں اور دوسری مسترد کر دی گئیں وہ فیصلہ انسانی تھا۔ خدائی نہ تھا۔ بڑے بڑے استادان کتابوں کو لے کر بیٹھ گئے اور محض اپنی فراست کی بنا پر فیصلہ کر دیا کہ ان میں سے فلاں فلاں کتاب مستند ہے۔ بعض حالات میں یہ فیصلہ بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ بعض کتابوں کے متعلق تیسری صدی عیسوی تک بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ انہیں کس زمرہ میں رکھا جائے۔

پھر یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے۔

بائبل چونکہ خدا پرست انسانوں کا کارنامہ ہے اس لئے اس میں لازمی طور پر خدائی اور انسانی دونوں عناصر شامل

ہیں۔لیکن ہر شے جو انسانی ہوگی غیر مکمل ہوگی۔اس لئے ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ ان آسمانی کتابوں میں خدا کی صداقت صحیح صحیح طور پر پیش کر دی گئی ہے۔جب روشنی کی شعاعیں کسی رنگین شیشہ سے گذریں گی تو نہ صرف اپنی درخشندگی ہی کھو بیٹھیں گی بلکہ اس شیشہ سے مختلف رنگ بھی مستعار لیں گی۔یہی کیفیت بائبل کی ہے۔(اسے) اس کے علاوہ کچھ اور سمجھنا اس امر کے مرادف ہوگا کہ ان انسانوں کو انسانی حدود سے بلند لے جا کر خدائی دائرہ میں شامل کر دیا جائے۔

کس قدر صاف اور واضح! پھر لکھتا ہے۔

بائبل کی بعض کہانیاں بالکل افسانے ہیں اگرچہ نہایت حسین اور عبرت آموز۔باقی رہے علوم و فنون سو وہ اس زمانہ کی سطح کے مطابق ہیں جس میں ان کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے۔

اور دیکھئے:۔

یہودی روایات اگرچہ اس امر پر زور دیتی ہیں کہ عہد نامہ عتیق کی بعض کتابیں ان ہی کی لکھی ہوئی ہیں جن کے حالات پر وہ مشتمل ہیں (اور اس کا باور کرنا کچھ غیر معقول نہیں) لیکن انہیں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی ذرا تامل نہیں کہ بعض کتابوں میں بعد میں رد و بدل اور حک و اضافہ بھی ہوا ہے۔

(Vallentine's Jewish Encyclopedea ; P. 93)

آگے چل کر لکھا ہے۔

تاریخ اور وقائع کے مستند ماخذ کی حیثیت سے بائبل کی حالت عام طور پر مایوس کن ہے۔اس کے بیانات اور اطلاعات یا تو مبہم اور متضاد ہیں اور یا اس زمانہ کی تاریخ سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔ (P. 95)

خود جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ

اگرچہ اسفار موسے، خود حضرت موسے کی تصنیف بتائی جاتی ہیں لیکن تحقیق جدید کی رو سے اس کے قریب اٹھائیس مختلف ماخذ تسلیم کئے گئے ہیں۔ (جلد ۴)

پادری ڈملو . . . . نے بائبل کی مکمل تفسیر لکھی ہے جس میں وہ اس حقیقت کا اعتراف کر کے کہ جو کتابیں حضرت موسیٰ کی طرف منسوب ہیں درحقیقت حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔بلکہ بعد کی تالیف ہیں۔اس کی تائید میں بہت سے نظائر و شواہد پیش کرتا ہے اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ:۔

موسیٰ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر بعد میں تالیف کی گئی ہیں۔

سفر ایوب کے متعلق تو سپنگلر یہاں تک لکھ گیا ہے کہ اس کا انداز قطعاً یہودی نہیں بلکہ اسلامی ہے (زوال مغرب جلد دوم صفحہ ۲۰۸)

(Leslie Paul) اپنی کتاب (The Annihilation of Man) میں، جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس باب میں رقمطراز ہے

عہد نامہ عتیق یا جدید، سائنٹفک اصطلاح میں، خدا کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ تو صرف انسانی کوشش کا ریکارڈ ہیں جو خدا تک پہنچنے کے لئے کی گئی۔ اس لئے یہ خدا کے متعلق اکتشافات ہیں خدا کی وحی نہیں ہیں (P. 175)

واضح رہے کہ اس کتاب کا مصنف عیسائیت کا بہت بڑا معتقد ہے۔

یہ تو ہیں مجموعۂ تورات کے متعلق خارجی شہادات۔ یعنی ان کتابوں کی تاریخی حیثیت۔ باقی رہیں داخلی شہادات۔ یعنی یہ کہ جو کچھ ان کتابوں کے اندر آج موجود ہے اس کی کیا کیفیت ہے۔ سو اس کے متعلق آپ

داخلی شہادات

ابھی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جب تک کہ آپ انہیں خود نہ پڑھ لیں (میں اس چیز پر اس لئے زور دے رہا ہوں کہ مجھے متعدد مقامات پر اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ وضعی تصنیفات جو مذہب کا مقدس نقاب اوڑھ لیں ان کی عظمت و عقیدت کچھ اس طرح دل میں گھر کر لیتی ہے کہ اگر ان کے متعلق کہا جائے کہ ان میں اس قسم کی لغویات موجود ہیں تو کسی کا ماننے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ تصور میں بھی نہیں لانا چاہتے کہ ان میں فی الواقعہ اس قسم کی چیزوں کا امکان ہے اور جب ان کے سامنے کتاب کھول کر رکھ دی جائے تو دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جاتے ہیں۔ اور شرم و ندامت سے کتاب بند کر دیتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ انہیں خود پڑھا جائے لیکن اگر آپ ایسا نہ کر سکیں تو کم از کم معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلدوں کو پھر سے کھولئے اور مختلف انبیاء کرام کے تذکار حسنہ کے سلسلہ میں جو جو اقتباسات درج کئے گئے ہیں انہیں ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ حضرات نوح۔ ابراہیم۔ لوط۔ موسیٰ۔ ہارون۔ داؤد۔ سلیمان علیہم السلام سب یہود کے نزدیک خدا کے مقدس رسول ہیں۔ لیکن ان کے متعلق جو کچھ تورات کے مجموعۂ کتب میں موجود ہے کیا اس کے پیش نظر آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ تعلیم خدا کی ہو سکتی ہے؟ لیکن حیرت ہے کہ یہ سب باتیں آج تک اس مجموعہ میں موجود ہیں اور "آسمانی" کہکر پیش کی جاتی ہیں۔

یہ تو رہا حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق۔ مذہب کی بنیاد خدا کے تصور پر ہوتی ہے۔ تورات میں خدا کا تصور کس قسم کا پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق (Joseph Wheless) اپنی کتاب (Is it God's Words?) میں لکھتا ہے

تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور۔ غدار۔ انتقام کے جذبہ میں ایک خونخوار عفریت۔ گناہگار اور بے گناہ دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک۔ ظلم اور تعصب کا مجسمہ۔ متکبر۔ شیخی باز۔ وعدہ خلاف۔ غلط بیان اور

ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔

معاذاللہ۔ استغفراللہ جس کتاب میں خدائے بزرگ و برتر کا یہ تصور پیش کیا گیا ہو، اس کے متعلق خود ہی اندازہ لگائیے کہ اسے خدا کی کتاب، کہنا کس درجہ زیادتی ہے،

نگہِ بازگشت

جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے اگر آپ اسے بالترتیب ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکے ہوں تو آگے بڑھنے سے پیشتر، اس کی یاد پھر سے تازہ کر لیجئے۔ کہا یہ گیا ہے کہ

(۱) عہد نامہ عتیق میں (جسے مجموعہ کتب تورات کہا جاتا ہے۔ کل ۳۹ کتابیں ہیں جن میں سے پانچ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن ان میں حضرت موسیٰ کی وفات اور اس کے بعد کے حالات بھی مذکور ہیں۔

(۲) ان ۳۹ کتابوں میں بعض ایسی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں جو آج ان میں موجود نہیں اس سے ظاہر ہے کہ کسی زمانہ میں ان ۳۹ کے علاوہ اور کتابیں بھی اس مجموعہ میں شامل تھیں۔

(۳) بخت نصر کے حملہ یروشلم کے بعد ان کتابوں کا وجود صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکا تھا۔

(۴) ان کتابوں کو عزرا (فقیہہ) نے ۴۴۰ ؁۔ ق م کے قریب از سرِ نو اپنے حافظہ کی مدد سے مرتب کیا۔ یعنی یروشلم کی تباہی کے قریب ڈیڑھ سو سال بعد۔ عزرا کے بیان کے مطابق ان مرتب کردہ کتابوں کی تعداد ۲۰۴ تھی۔

(۵) جب دوسری صدی۔ ق۔م میں یونانیوں نے یروشلم پر حملہ کیا ہے تو ان صحفِ مقدسہ کو پھر جلا دیا گیا اس کے بعد انہیں پھر مرتب کیا گیا۔

(۶) پھر جب رومیوں نے ۷۰ء میں یروشلم کو تباہ و برباد کیا تو وہ ان کتابوں کو اپنے ساتھ روما لے گئے۔ مؤرخ جوزیفس کہتا ہے کہ یہ کتابیں وہاں سے اسے واپس ملیں۔ لیکن اس نے ان کا یونانی ترجمہ اپنی تاریخ میں شامل کیا وہ ان کتابوں کی تعداد ۲۲ لکھتا ہے۔

(۷) یہودیوں کی زبان پہلے عبرانی تھی اور بابل سے مراجعت کے بعد ارامی۔ لیکن تورات کا جو نسخہ دنیا کے سامنے آیا وہ یونانی زبان میں تھا۔ جسے بادشاہِ مصر بطلیموس نے اسکندریہ کے کتب خانہ کے لئے تیار کرایا تھا۔ اس یونانی ترجمہ سے بعد میں عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ لیکن عبرانی نسخوں میں اور اس یونانی نسخہ میں بھی اختلافات موجود ہیں۔

(۸) نہ صرف یہ بلکہ عبرانی نسخوں میں بھی باہمی اختلافات تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں یہودیوں نے ان تمام نسخوں کا باہمی مقابلہ کر کے ایک متفقہ علیہ نسخہ مرتب کیا اور اختلافی مقامات کو حاشیہ پر لکھ دیا۔ یہ نسخہ پندرھویں صدی میں پہلی مرتبہ چھپا۔ لیکن جب اس کے دوسرے اڈیشن کی طباعت کی نوبت پہنچی تو پہلے اور دوسرے اڈیشن میں بارہ ہزار

مقامات پر اختلاف کرنا پڑا۔ یہ نسخہ آجکل مروج ہے۔ یعنی جو

(ا) نہ حضرت موسیٰ کا ہے

(ب) نہ عزرا فقیہ کا۔

(ج) نہ اصل عبرانی زبان کا، بلکہ یونانی سے ترجمہ شدہ۔ اور جس نسخہ سے ترجمہ کیا گیا تھا اس سے بھی مختلف

(د) اور سینکڑوں قسم کے اختلافی مقامات اپنے حاشیہ پر لئے ہوئے۔

(۸) نیز پندرھویں صدی میں جو سب سے پہلا ایڈیشن چھپا تھا اس سے ہزارہا مقامات میں مختلف۔

اب بھی بائبل کے ہر نئے ایڈیشن میں، سابقہ ایڈیشن سے عام طور پر کچھ نہ کچھ اختلاف ہوتا ہے۔

(۹) اس مجموعہ کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں بھی آج موجود ہیں جنہیں اپوکریفہ (یعنی مخفی یا جعلی صحیفے) کہا جاتا ہے لیکن سمجھا انہیں بھی مقدس جاتا ہے۔

(۱۰) علاوہ بریں روایات و تفسیرات کا ایک عظیم الشان انبار ہے جسے وحیٔ غیر مکتوب قرار دیکر مذہب کا جزو سمجھا جاتا ہے۔

(۱۱) ان تمام کتابوں پر شروع سے ہی تنقید ہوتی چلی آئی ہے۔ لیکن دور حاضرہ کی تحقیق نے ان کی اصلیت کو بالکل بے نقاب کر دیا۔

(۱۲) اور سب سے بڑی شہادت ان کی وضع و تحریف کی خود ان کتابوں کا متن ہے۔ ان میں ایسی ایسی باتیں مذکور ہیں جن کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ ان میں کہیں (معاذ اللہ) حضرت نوح شراب میں بدست برہنہ دکھائی دیتے ہیں۔ اور کہیں (پناہ بخدا) حضرت لوط نشہ میں مخمور اپنی بیٹیوں سے...... کہیں (توبہ توبہ) حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بولتے بتائے گئے ہیں۔ اور کہیں (معاذ اللہ) حضرت یعقوبؑ اپنے والد کو فریب دیکر حق وراثت چھینتے۔ کہیں (توبہ توبہ) حضرت موسیٰؑ پر کوشی عورت کا اتہام لگایا گیا ہے۔ اور کہیں حضرت ہارونؑ کو (معاذ اللہ) گوسالہ پرستی کرتے اور کراتے دکھایا گیا ہے۔ کہیں (خاکم بدہن) حضرت داؤدؑ اپنے پڑوسی کی بیوی پر فریفتہ ہو کر اسے اپنے قبضہ میں لاتے نظر آتے ہیں۔ اور کہیں (معاذ اللہ) حضرت سلیمانؑ اپنی بیویوں کے اثر میں آکر بتوں کی پرستش کرتے۔ وقس علی ہذا۔ اور پھر خدا کے متعلق جو تصور ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے اس کا خیال کرنے سے بھی حیا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں

یہی وجہ ہے کہ دور حاضرہ کے مغربی محققین نے ان کتابوں کو وضعی اور افسانوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔

۲۔ عہد نامہ جدید۔ اناجیل

حضرت عیسیٰؑ کے تذکرۂ مقدسہ (جلد سوم) میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ کی حیات طیبہ کے ابتدائی ایام کے حالات ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئے۔ اناجیل کی رو سے آپ کی پیدائش کے تھوڑے دنوں بعد حضرت مریمؑ اور ان کے شوہر نومولود کو ساتھ لے کر مصر چلے گئے۔ جہاں سے اس وقت واپس آئے جب بچے کی عمر سات برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن تاریخی تنقید کی روشنی میں یہ بیان بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا اور عصر حاضر کے محققین کی رائے ہے کہ آپ کی زندگی کے تیس سال تک کے حالات بالکل گمنامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور سفر حیات کے صرف آخری مراحل کی کیفیات دنیا کے سامنے آسکی ہیں، جب آپ شرف نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد فلسطین واپس ہوئے ہیں (Mosheim) مسیحی دنیا کا ایک بہت بڑا مورخ ہے جس کی "تاریخ کلیسا" عیسائیوں کے ہاں مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے۔

> آپ کی بقایا زندگی (یعنی پیدائش کے تھوڑے دنوں کے بعد سے) بالکل بھی حیثیت سے گوشۂ ظلمت میں گذری۔
>
> حتیٰ کہ آپ کی عمر تیس سال کی ہوگئی۔

اس کے بعد یہی مورخ لکھتا ہے۔

> بہت سے مصنفین نے، اپنے تصورات کی دنیا میں مست، یا عام لوگوں کی توجہات کو مرکوز کرنے کے لئے، ہمارے منجی "(حضرت مسیح) کی زندگی کے (مذکورہ صدر) گمنام گوشے کے متعلق عجیب و غریب مضحکہ خیز افسانے وضع کر رکھے ہیں۔

اسینی فرقہ

ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ قیاس یہ ہے کہ اس دوران میں جس سے متعلق آپ کی مقدس زندگی کے حالات و کیفیات ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آسکے آپ ایسین فرقہ (Essenes) سے متعلق رہ کر زہد و ریاضت اور گمنام و انزوا کی زندگی بسر کرتے رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرما دی۔ اور پھر آپ اپنی دعوتِ انقلاب کو لے کر مراجعت فرمائے یروشلم ہوئے۔ چونکہ عنوان زیر نظر میں اس فرقہ کے اکثر لوگ نمایاں طور پر ادھر ادھر دکھائی دیں گے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق ذرا تفصیلی معلومات سامنے آجائیں۔ جوزیفس کی "تاریخ اسلاف" کی رو سے (جس کا ذکر تورات کے بیان میں گذر چکا ہے

> سنہ ۱۲۳ ق۔م کے قریب، یہودیوں میں تین فرقے موجود تھے جن کے، انسانی اعمال و معاملات کے متعلق، مختلف خیالات تھے۔ ایک فریسی۔ دوسرا صدوقی۔ اور تیسرا ایسین۔

کہا جاتا ہے کہ (Essene) کلدانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "ڈاکٹر" (یعنی طبیب) کے ہیں۔ یونانی میں ان کا نام (Therapeutae) تھا جس کے معنی آج بھی "ڈاکٹر" ہی کے ہیں۔ یہ

فرقہ ابتدائی ایام سے بابل کے ملحقات میں پایا جاتا تھا۔ ان کی تعلیم، یونان کے حکمائے اشراقین سے ملتی جلتی تھی (یوں سمجھئے کہ یہ اس عہد کے صوفی تھے)۔ لیکن اس وقت ان کے معتقدات پر زرتشتی تعلیم۔ بالخصوص مسترا (Mitra) کی پرستش کے امیال و عواطف کا زیادہ اثر تھا۔ یونانی حکیم فیثاغورث نے جس مجلس اخوت، کی بنیاد رکھی تھی، اس فرقہ نے اسے ایک منظم صورت میں متشکل کر دیا اور یہی تنظیم ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ مسیحی مؤرخ، یوسی بس (Euse Bius) نے فیلو (Philo) کے حوالہ سے ان سے متعلق معلومات اپنے ہاں محفوظ کر رکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ درویش منش، مرنجاں مرنج زندگی بسر کرتے تھے اور ایک آنے والے "مسیحا" کے منتظر تھے جو دنیا میں عدل و مساوات کا نظام قائم کرنے والا تھا۔ یہ لوگ اپنی صداقت زبان کے لئے مشہور تھے اور خدا کے سوا کسی کو اپنا آقا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی نہایت ضبط و انضباط (Discipline) کی تھی۔ بلکہ اس میں بہت زیادہ تشدد برتتے تھے۔ ان کی ایک شاخ تجرد کی زندگی کی قائل تھی اور دنیاوی حظ کظ ولذائذ کے ترک میں روحانیت کی نشو و ارتقار کا راز مضمر سمجھتی تھی۔ جو کچھ ان کی ملک میں ہوتا وہ سب ایک جگہ مشترک طور پر اپنے امیر کی تحویل میں رکھ دیتے۔ امیر ہی ان کی اطاعت کا مرکز تھا۔ جوزیفس لکھتا ہے۔

ان لوگوں کا زہد و تورع بلا کا ہے۔ سورج نکلنے سے پیشتر وہ اٹھ بیٹھتے ہیں اور دنیاوی معاملات سے متعلق بات چیت کرنے سے پہلے اپنی عبادت سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد جن جن باتوں میں وہ ماہر ہوتے ہیں ان کا امیر (.....) انہیں ان امور کی سرانجام دہی کے لئے بھیجدیتا ہے واپس آکر وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے، سفید لباس پہن لیتے اور عبادت خانہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ دعاؤں اور مناجاتوں کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ جس کے اول و آخر خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنے امیر کے حکم کے تابع رہتے ہیں.... ان میں سے بعض لوگ آئندہ کی باتوں کے متعلق پیش گوئیاں بھی کرتے ہیں اور مذہبی کتابوں پر خاص طور پر عبور رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں سب کچھ خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے۔ اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔

ان کے متعلق اسی قسم کے حالات (Pliny - المتوفی ۷۹ء) نے بھی لکھے ہیں

یہی ایک فرقہ ہے جس کے لوگ بغیر مال و متاع اور زن و اولاد کے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کھجوریں وغیرہ کھا کر زندہ رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو زندگی کی مشکلات و صعوبات سے گھبرا اٹھتے ہیں ان میں آکر شامل ہو جاتے ہیں۔ قریب قریب ہر بستی میں اس فرقہ کے لوگ موجود ہیں۔ جو اپنے فرقہ سے متعلق مسافروں کی اس طرح تواضع کرتے ہیں گویا وہ خود ان ہی میں سے ہیں۔ خواہ انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ دیکھا ہو۔ جب وہ سفر کے لئے نکلتے ہیں تو اپنی مدافعت کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کچھ (زاد راہ وغیرہ) ساتھ نہیں

رکھتے۔ ہر بستی میں ان کے فرقہ کا ایک امیر ہوتا ہے جس کے ذمہ ان مسافروں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ خرید و فروخت نہیں کرتے بلکہ جس کے پاس کچھ فاضلہ ہو وہ اس کے حاجتمند کو بلا قیمت دیدیتا ہے۔

فیلو (Philo) المتوفی ۵۰ء کے بیان کے مطابق، اس فرقہ کی بستیوں میں معابد اور خانقاہیں ضرور ہوتیں خانقاہوں میں یہ لوگ، روحانیت کی بلند و بالا زندگی کے لئے بڑی بڑی پُر اسرار ریاضتیں کرتے اور اپنے اسرار و بواطن کسی کو نہ بتاتے خواہ ان کی جان پر بھی کیوں نہ بن جاتی۔ ان کے پاس ازمنہ قدیمہ کے نوشتے بھی محفوظ رہتے اور ان نوشتوں میں ساتھ کے ساتھ اضافہ بھی ہوتا رہتا۔ خدمتِ خلق ان کا مسلک۔ اور بیماروں کا علاج سب سے نمایاں فریضہ ہوتا اور یہ سب کچھ بلا مزد و معاوضہ سرانجام دیا جاتا۔

ؔ

حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی گم گشتہ بھیڑوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ لیکن ان بھیڑوں نے آپ سے بھیڑیوں کا سا سلوک کیا۔ البتہ آپ کے گرد مقدس حواریوں کی ایک جماعت جمع ہوگئی جو آپ کی تعلیم کی علمبردار اور آپ کی دعوتِ انقلاب کی مبلغ تھی۔ قیاس یہ ہے کہ حواری اسی فرقہ ایسین ہی کے افراد تھے۔

حواری

حضرت عیسیٰؑ نے ان کے عقائد و تصورات زندگی کے ان گوشوں کی اصلاح فرمائی جن میں غیر خدائی تعلیم کے اثرات داخل ہوگئے تھے اور اس طرح یہ مخلص گروہ، خالص توحید کا پیغامبر بن گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو ان کی دعوتِ انقلاب کے آخری مراحل میں جو واقعہ پیش آیا اُس کے بعد اس جماعت پر بھی طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوئیں جن کی وجہ سے وہ ادھر ادھر بکھر گئے لیکن جونہی حالات نے ساعدت کی انہوں نے بیت المقدس میں ایک خاص صوفیانہ قسم کا حلقہ قائم کر لیا جس کی خصوصیات کم و بیش وہی تھیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ "رسولوں کے اعمال" میں ہے۔

> پس جن لوگوں نے اس کا کلام قبول کیا انہوں نے بپتسمہ لیا اور اسی روز تین ہزار آدمیوں کے قریب ان میں مل گئے۔ اور یہ رسولوں سے تعلیم پانے اور رفاقت رکھنے اور روٹی توڑنے اور دعا مانگنے میں مشغول رہے اور ہر شخص پر خوف چھا گیا اور بہت سے عجیب کام اور نشان رسولوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتے تھے۔ اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ اور ہر روز ایک دل ہو کر ہیکل میں جمع ہوا کرتے اور گھروں میں روٹی توڑ کر خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔
>
> (رسولوں کے اعمال ۲/۴۱-۴۷)

اس حلقہ کے افراد اور یہودیوں میں کچھ خاص فرق نہ تھا اس لئے کہ شریعت کے احکام دونوں کے لئے قریب قریب ایک ہی تھے البتہ یہودی آنے والے مسیح کے منتظر تھے اور یہ کہتے تھے کہ وہ آنے والا تو آچکا۔ اس وقت تک حضرت

عیسیٰؑ کے متبعین نے اپنا الگ نام بھی کچھ نہیں رکھا تھا[1]۔ اس کے بعد جب سینٹ پال (پولوس) جو پہلے یہودی تھا اور حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کو سخت ایذائیں پہنچایا کرتا تھا عیسائی ہو گیا تو اس نے سینٹ برناس کی معیت میں، انطاکیہ میں مسیحیت کی عام منادی شروع کر دی۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ نے تو (انجیل کی روایت کے مطابق) یہ فرمایا تھا کہ میں صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ اور "بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے" ڈالنے کے لئے نہیں آیا لیکن سینٹ پال نے اس تعلیم کے علی الرغم غیر یہود میں بھی مذہب عیسائیت کو پھیلانا شروع کر دیا۔ اس وقت یہ مسئلہ

کرسچن؟ درپیش ہوا کہ جو غیر یہود عیسائیت قبول کریں ان پر شریعت کے احکام کی پابندی کہاں تک ضروری ہے اس کے متعلق اعمال باب پندرہ میں تفصیل موجود ہے۔

اس طرح عیسائیت، یہودیت کے دائرہ سے نکل کر غیر یہود (Gentiles) تک بھی پہنچنی

غیر بنی اسرائیل شروع ہو گئی (یعنی حضرت عیسیٰؑ کے اولین مخاطب صرف بنی اسرائیل، یعنی یہود تھے، لیکن اب غیر بنی اسرائیل، یعنی غیر یہود بھی عیسائیت کے دائرہ میں آنے شروع ہو گئے

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۷۰ء میں یہودیوں کا شیرازہ بکھرا تو عیسائیت پر غیر یہودی عنصر بہت غالب آگیا جس کی وجہ سے عیسائیت۔ اپنی تعلیم سے الگ ہو کر کچھ کا کچھ ہو گئی۔ ایسین فرقہ میں اگرچہ یہودی بھی شامل ہوتے تھے۔ لیکن وہ یہود اور غیر یہود سب کو اپنی آغوش میں لے لیتے تھے۔ اب یوں سمجھئے کہ وہ عیسائیت جو پہلے صرف بنی اسرائیل تک محدود تھی۔ ایسین فرقہ کے اثر میں آگئی۔ یروشلم کی تباہی کے بعد عیسائی کلیسا، شام میں قائم ہوا۔ لیکن اس میں یہودی عنصر بہت کم رہ گیا۔ رفتہ رفتہ جب حالات مساعد ہوئے تو کلیسا پھر یروشلم میں منتقل ہو گیا۔ لیکن جب ۱۳۲ء میں یہودیوں نے پھر شورش کی تو انہیں حکومت کی طرف سے یروشلم میں آنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس سے یہودی عنصر اور بھی کم ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جب ۳۲۵ء میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی ہے۔ تو عیسائیت۔ ایک بالکل جداگانہ اور یہودیت سے الگ مذہب کی صورت میں متشکل ہو گئی۔ اب باپ بیٹا اور روح القدس (اقانیم ثلاثہ) مقام الوہیت کے مستقل بالذات رکن تسلیم کئے گئے۔ اور کونسل نے فیصلہ دیدیا کہ:-

---

[1] انجیل کی رو سے ان کا نام "کرسچن" سب سے پہلے ۴۳ء میں رکھا گیا (اعمال ۱۱/۲۶) لیکن انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجس نالج "میں لفظ کرسچن" کے تحت لکھا ہے کہ ان کا یہ نام قریب ۶۵ء میں رکھا گیا اور رکھا بھی ان کے دشمنوں نے جو ازراہ طعن و تعریض انہیں کرسچن "یعنی تیل اور چربی مل کر گندے رہنے والے کہا کرتے تھے۔ (Christ) کے معنی تیل یا چربی سے مسح کرنے والے (Anointed) کے ہیں۔ یہ یونانی لفظ (Greaser) کے مرادف ہے۔

جو شخص دعویٰ کرے کہ کسی وقت، خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا۔ یا وہ نیست سے ہست کیا گیا۔ یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو ربانی نہیں ہے۔ یا وہ مخلوق یا متغیر ہے۔ ایسے شخص کو کلیسائے مقدس ملعون قرار دیتا ہے۔

تثلیث

اس عقیدہ کو قسطنطین نے حکومت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا۔ اس طرح تثلیث عیسائیت کا بنیادی عقیدہ قرار پا گئی۔ اور پھر رفتہ رفتہ یونانیوں اور مصریوں کے تمام توہمات اور رسومات، اس مذہب کے اجزا بنتے چلے گئے۔ اس کے قریب ایک سو سال بعد، حضرت مریمؑ کی پرستش بھی بحیثیت "خدا کی والدہ" کے جزو مذہب قرار پا گئی۔

ہم نے یہ طولانی تمہید اس لئے پیش کی ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ حضرت عیسیٰؑ کی وہ تعلیم جو سابقہ انبیائے کرامؑ کے اصولی پیغامِ خداوندی پر مشتمل تھی آہستہ آہستہ کیا سے کیا ہو گئی۔ اس تمہید کے بعد اناجیل کی صحیح حیثیت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔

*

حضرت عیسیٰؑ جو صحیفۂ ربانی (انجیل) اپنے حواریوں کو دے کر گئے تھے، تاریخ اس کے متعلق بالکل ساکت ہے۔ آپ کی تشریف براری کے بعد، چونکہ عام عقیدہ کے مطابق، عیسائی آپ کی واپسی کے منتظر تھے (اور اصل بات یہ تھی کہ حواریوں کی انقلاب پسند جماعت پر بڑی پریشانی کا زمانہ گزر رہا تھا)، اس لئے انجیل کی ترتیب و تدوین کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو سکی۔ بعد میں جب عیسائی کلیسا، یہودی اور غیر یہودی عناصر کی کشمکش کی رزمگاہ بن گیا تو ان مختلف الخیال فرقوں نے اپنی اپنی انجیلیں مرتب کرنا شروع کر دیں۔

اناجیل

چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کی رو سے اس زمانہ میں قریب ۳۴ اناجیل کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اناجیل درحقیقت حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات تھیں۔ جنہیں اس زمانہ کی مروج روایات سے مرتب کیا گیا۔ سپنگلر لکھتا ہے:

> جب (حضرت مسیحؑ کے دوست اور شاگرد بوڑھے ہو گئے اور یروشلم میں اس جماعت کا صدر آپ کا بھائی تھا تو انہوں نے ان قصص و روایات کو جو عام طور پر زبان زد خلائق تھیں یکجا مرتب کر کے آپ کی سوانح عمری تصنیف کی ۔۔۔ یہی انجیل ہے۔
>
> (زوال مغرب جلد دوم صفحہ ۲۱۲)

حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے حواریوں کی زبان ارامی تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ ان ۳۴ اناجیل میں سے (سوائے ایک کے جو اب مفقود ہے) کوئی بھی ارامی زبان میں نہ تھی۔ سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان خطوط کی تھی جو حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے تھے ان کی تعداد قریب ۱۱۳ تک شمار ہوتی تھی۔ نیقیہ کی مشہور کونسل (منعقدہ ۳۲۵ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار اناجیل (متی۔ مرقس۔ لوقا۔ یوحنا)

رسولوں کے اعمال، پولوس، یعقوب، پطرس، یوحنا اور یہوداہ کے خطوط اور مکاشفات یوحنا منتخب کر لئے گئے اور باقی اناجیل اور خطوط کو وضعی (اپوکریفہ) قرار دیدیا گیا۔ جو کچھ منتخب کیا گیا اسے عہدنامہ جدید کہا جاتا ہے۔ دنیائے عیسائیت میں یہ مقدس آسمانی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ چاروں اناجیل، حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات ہیں جنہیں آپ کے حواریوں نے مرتب کیا (اس کا تفصیلی تذکرہ آگے چل کر آئے گا)۔ "رسولوںؑ کے اعمال"، آپ کے حواریوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ خطوط وہ ہیں جو مختلف کلیساؤں اور دوسرے لوگوں کے نام تبلیغی طور پر لکھے گئے۔

انتخاب

اور مکاشفات، یوحنا حواری کے مکاشفہ پر مشتمل ہے۔ نیقیہ کی کونسل میں ان کتابوں کا انتخاب بھی عجیب وغریب طریق سے عمل میں آیا۔ یہ کونسل شاہنشاہ قسطنطین کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس میں سلطنت روما کے اطراف وجوانب سے ۲ ہزار اڑتالیس مندوبین شامل ہوئے قسطنطین نے خود اس کی صدارت کی۔ اس کونسل کے انعقاد سے مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان میں باہمی تطبیق وتوفیق کی صورت پیدا کر کے ایک متفقہ علیہ مذہب کی تشکیل کی جائے۔ کونسل کی بحث وجدل نے ایسی شدت اختیار کی کہ ۱۷۳۰ مندوبین کو باہر نکال دینا پڑا۔ بقایا ۳۱۸ بھی کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے کہ مختلف فرقوں کی اناجیل میں سے کسے باقی رکھا جائے اور کسے مسترد کر دیا جائے۔ بالآخر انہوں نے ایک رات تمام کتابوں کو فرش پر بکھیر کر رکھدیا۔ صبح آکر دیکھا تو کچھ کتابیں اور خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ ان صحیفوں کو مقدس سمجھ کر منتخب کر لیا گیا۔ اور باقی کتابیں مسترد قرار پاگئیں۔ چنانچہ اس کونسل کی روئداد میں مذکور ہے کہ۔

> جو کچھ ان تین سو پادریوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا اسے خداوند کی خوشنودی سمجھ لینا چاہئے۔ بالخصوص اس لئے کہ ان قابل ہستیوں کے دل میں روح القدس سمایا تھا جس نے انہیں خداوند کی مرضی کی طرف راہ نمائی کر دی۔

(Historical view of the Council of Nicaea, by Rev: Isaac Boyle.)

یہ ہے عہدنامہ جدید کی مقدس آسمانی کتابوں کے انتخاب کی داستان جیسا کہ آپ پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں عہدنامہ عتیق کی کتابوں کا انتخاب علمائے یہود نے اپنی فہم وفراست سے کیا تھا۔ لیکن عہدنامہ جدید کے معاملہ میں اس سے بھی عجیب تر

متی کی انجیل

طریق انتخاب کا استعمال کیا گیا۔ ان کتابوں میں، عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق متی کی انجیل سب سے قدیم ہے۔ لیکن اس کے متعلق نہ تو یہی متعین ہو سکا ہے کہ اس کا مؤلف کون ہے اور نہ ہی یہ کہ یہ کس سن میں مرتب ہوئی۔ دور حاضرہ کی تحقیق کا رجحان اس طرف ہے کہ جس حصہ کا مؤلف

سلہ اس میں حواریوں کو رسول اور نبی کہا گیا ہے۔ دیکھئے اعمال ۱۴/۲۶ ، ۱۵/۳۲

حواری متی تھا وہ حصہ اسی زمانہ میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ باقی ہے اس کے مولف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ عہد تالیف کے متعلق عام طور پر خیال ہے کہ یہ سنہ ۷۰ء اور سنہ ۹۵ء کے درمیان مرتب ہوئی۔ لیکن پروفیسر ہارنک کے نزدیک اس کا زمانہ تالیف سنہ ۸۰ء اور سنہ ۱۰۰ء کے درمیان ہے۔ بہر حال، زمانہ تالیف سنہ ۹۱ء ہو یا سنہ ۱۰۰ء تاریخ کے صفحات میں اس انجیل کا نشان سنہ ۱۳۰ء سے قبل نہیں ملتا۔ یہ انجیل، یونانی زبان میں لکھی گئی تھی اور محققین کا خیال ہے کہ اس کا عبرانی ترجمہ، جیروم نے سنہ ۳۹۰ء میں کیا تھا۔ (اگرچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ کہیں سے عبرانی نسخہ پایا تھا۔)

مرقس

بعض مورخین کا خیال ہے کہ سب سے قدیمی انجیل، متی کی نہیں بلکہ مرقس کی ہے، جس کا ذکر سب سے پہلے یوسی بس نے اپنی تاریخ کلیسا میں، چوتھی صدی میں کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مرقس نے جو یہودی الاصل تھا، سنہ ۶۵ء میں اسے لکھا تھا۔

لوقا

تیسری انجیل لوقا کی ہے۔ یہ غیر یہودی مورخ تھا۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں اس انجیل کو مرتب کیا۔

یوحنا

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے۔ اگرچہ اسے حضرت مسیحؑ کے حواری یوحنا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن تحقیق جدید یہ ہے کہ اس کا مصنف ایک اور یوحنا تھا جو ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں اس انجیل کو مرتب کیا۔ اس انجیل میں فلسفۂ یونان کی پوری پوری چاشنی موجود ہے۔

ان اناجیل کے متعلق موسیو رینان کی تحقیق اور رائے ہر صاحب نظر کے لئے قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> چونکہ (حضرت مسیح کی تشریف برآری کے بعد) لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے۔ اس لئے انہوں نے مستقبل کے لئے کتابیں تصنیف کرنے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا ان کے لئے فقط اتنا ہی کافی تھا کہ جس شخصیت کے متعلق انہیں انتظار تھا کہ وہ اسے بادلوں کے اندر دوبارہ دیکھیں گے۔ اس کی تصویر کو اپنے آئینۂ قلب میں آویزاں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں اناجیل کو کوئی مستند حیثیت حاصل نہ تھی۔ ان میں اضافے کرنے۔ یا مختلف انداز سے ترتیب دینے۔ یا ایک کی تکمیل دوسرے سے کرنے میں کوئی باک اور تامل نہ تھا۔ (حیات مسیح صفحہ ۱۲)

دوسری جگہ مذکور ہے

> ابتداءً اناجیل کی حیثیت بالکل انفرادی تھی۔ اور سند کے اعتبار سے ان کا درجہ روایت سے بھی بہت کم تھا۔ (صفحہ ۲۱۴)۔

یوحنا کی انجیل کے متعلق یہ مؤرخ رقمطراز ہے۔

میں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گلیلی کے ماہی گیر کے قلم کی لکھی ہوئی ہے......

حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر اضافے ہو گئے ہیں (صفحہ ۱۲ ; صفحہ ۱۰)

سینٹ پال کا سابقہ ڈین ڈاکٹر (W. R. Inge) اپنی کتاب (The Fall of the Idols) میں لکھتا ہے۔

بہت کم علماء ایسے ہوں گے جو اس باب میں اختلاف کرتے ہوں کہ انجیل چہارم (یوحنا) ایشیائے کوچک کے کسی گمنام تصوف پسند نے ۹۵ء اور ۱۲۵ء کے درمیان لکھی تھی۔ (صفحہ ۲۶۱)

متی اور یوحنا کے بیانات کا ذکر کرنے کے بعد موسیو رینان لکھتا ہے۔

اگر مسیح نے ویسے ہی باتیں کی تھیں جیسے متی نے لکھا ہے تو یقیناً وہ مسیح، یوحنا کے بیان کے مطابق باتیں نہیں کر سکتا تھا یعنی متی اور یوحنا کے اسلوب و انداز میں اس قدر بین فرق ہے کہ ایک ہی شخص ایسے متضاد انداز میں باتیں کبھی نہیں کر سکتا (صفحہ ۱۲)

لوقا کے متعلق رینان کا بیان ہے۔

اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے۔ یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے.... اس میں کئی فقرے موڑے توڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں..... اسے تو یروشلم کے ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں (صفحہ ۲۲)

ہر چہار اناجیل کے متعلق لکھتا ہے۔

یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ (صفحہ ۲۹)

پھر جیسی کچھ بھی یہ کتابیں ہیں۔ ان میں بھی محض پند و نصائح کے اقوال ہیں۔ شریعت اور ضابطہ کے قوانین کوئی نہیں ہیں۔ موسیو رینان لکھتا ہے

حضرت مسیح کی تعلیم میں عملی اخلاقیات یا شرعی قوانین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف ایک مرتبہ شادی کے بارے میں آپ نے ضمنی طور پر کچھ فرمایا۔ اور طلاق کی ممانعت کی۔ (صفحہ ۲۱۳)
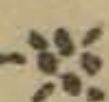
اسی طرح ڈاکٹر (Joad) اپنی کتاب (God and Evil) میں لکھتا ہے کہ "اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے پریشان کر دیا ہے" (صفحہ ۳۱۸) میں ان کے متعلق بہت کچھ پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسٹر (Bevan) کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ

ہماری قدیمی اناجیل، سینٹ مرقس اور سینٹ پطرس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ یعنی (حضرت) عیسٰی نے

پطرس کی وفات سے اڑتیس سال قبل جو کچھ کہا اس میں سے جو کچھ پطرس کو یاد رہ سکا۔ وہ بھی ارامی زبان سے یونانی میں ترجمہ شدہ۔ اس لئے (کلیسا کے فیصلے سے قطع نظر) یہ سمجھنا بالکل حماقت ہے کہ آج جو کچھ (حضرت) عیسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس طرح لفظاً لفظاً انہی کا ہے۔ گویا کسی مختصر نویس (شارٹ ہینڈ رائٹر) نے اسے لکھ لیا ہو یا فونوگراف نے محفوظ کر لیا ہو (صفحہ ۳۲۳)

اناجیل کی تعلیم کے متعلق جوڈ لکھتا ہے۔

سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق (حضرت) عیسیٰ کی تعلیم افسوسناک حد تک مبہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہی علماء سرمایہ داری۔ استعماریت۔ غلامی۔ جنگ۔ قید و بند دشمنوں کو زندہ جلانا یا اور تکالیف دینا، غرضیکہ جس چیز کو چاہیں بلادقت مسیح کی تعلیم ثابت کر سکتے ہیں۔ (صفحہ ۳۳)

یہ ہے ان اناجیل اربعہ کی تاریخ تدوین۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جو نسخے پہلی صدی عیسوی کے اخیر تک مرتب ہوئے یا جنہیں چوتھی صدی میں نیقیہ کی کونسل نے منتخب کیا تھا وہ اب تک موجود چلے آرہے ہیں۔ دنیا میں

قدیمی نسخے

اناجیل کے صرف تین قدیمی نسخے ہیں۔ ایک ویٹکن میں ہے، جس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ غالباً پانچویں یا چھٹی صدی کا ہے۔ اس نسخہ میں عہدنامہ عتیق و جدید کی کتابیں یونانی زبان میں ہیں لیکن مکمل نہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بائبل میں ہوں گی ہی اتنی کتابیں جتنی اس نسخہ میں موجود ہیں اور کتابیں بعد کا اضافہ ہیں۔

دوسرا نسخہ اسکندریہ کا ہے جو آج کل برٹش میوزیم میں ہے۔ اس کے متعلق بھی خیال ہے کہ یہ پانچویں صدی سے پہلے کا نہیں۔ یہ بھی یونانی زبان میں ہے اور ناقص۔

تیسرا نسخہ سینیا ہے جو روس کے (سابقہ) پایہ تخت پٹروگریڈ میں تھا اور جسے روسیوں نے انگلستان کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ یہ نسخہ چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انجیل مرقس کا آخری باب جس میں حضرت مسیح کے آسمان پر تشریف لیجانے کا ذکر ہے موجود نہیں۔ اس لئے اب رفتہ رفتہ یہ خیال پختہ ہو رہا ہے کہ یہ قصہ بعد کا الحاق ہے۔

تراجم

چوتھی صدی میں، جیروم نے یونانی زبان سے ان اناجیل کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ یہی ترجمہ اس انگریزی ترجمہ کا ماخذ ہے۔ جو شاہ جیمس کے عہد میں (سنہ ۱۶۱۱ء میں) شائع کیا گیا اور جو "مستند ترجمہ" کہلاتا ہے سنہ ۱۸۷۰ء میں کنٹربری میں، ۲۷ علمائے عیسائیت کی ایک مجلس بدیں غرض منعقد ہوئی کہ چونکہ سنہ ۱۶۱۱ء والا ترجمہ ناقص ہے

اس لئے ایک اور مستند ترجمہ شائع کیا جائے۔ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ کے ناقص رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں اناجیل کے دو قدیمی نسخے (اسکندریہ اور سینا) دریافت نہیں ہوئے تھے۔ نیز اس لئے کہ اثری تحقیقات نے دنیائے تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کانفرنس نے ۱۸۸۱ء میں ایک اور ترجمہ شائع کیا جسے (Revised Edition) کہا جاتا ہے۔ اس کانفرنس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ میں متعدد مقامات الحاقی ہیں۔ یہ تو ہے ان دو "مستند" ترجموں کے باہمی موازنہ کا نتیجہ۔ لیکن انجیل کے جو نسخے بائبل سوسائٹیز کی طرف سے شائع ہوتے ہیں ان کی کیفیت بھی یہ ہے کہ ہر نیا ایڈیشن، سابقہ ایڈیشن سے۔ اور ہر نئی زبان میں ترجمہ، کسی دوسری زبان میں ترجمہ سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ جرمن ڈاکٹر میل نے عہد نامہ جدید کے چند نسخے جمع کر کے جب موازنہ کیا تو تیس ہزار اختلافات شمار کئے۔ اور جان جیمس نے اس سے ذرا زیادہ تحقیق کی تو دس لاکھ اختلافات ابھر کر سامنے آگئے (مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون (Gospel) اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون (Bible) دیکھئے۔)

بائبل کا مفسر، پادری ڈمِلو (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) لکھتا ہے:۔

> اناجیل کے لکھنے والوں نے یسوع مسیح کے اقوال کو یونانی زبان میں لکھا ہے۔ حالانکہ وہ (حضرت مسیح) اغلباً ارامی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کا کبھی یہ خیال بھی تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے بھی جائیں گی۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے۔ اس کے خطوط، جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے اصل میں صرف ان ہی کلیساؤں کے لئے لکھے گئے تھے۔ جن کے نام وہ تھے جنہوں نے انہیں پہلے نقل کیا وہ ہرگز انہیں ان معنوں میں مقدس نوشتے نہ سمجھتے تھے جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔

آگے چل کر یہی مفسر رقمطراز ہے۔

> ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض اوقات وہ الفاظ درج نہیں کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ الفاظ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہیئے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ اعتبار حافظہ پر بھروسہ کرتا یا بعض وقت اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس سے وہ خود متعلق ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالجات کے علاوہ، عہد نامہ جدید کے قریب چار ہزار (مختلف) نسخے یونانی زبان میں ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اختلافِ عبارات بہت زیادہ ہے۔

٭٭٭

ٹرنٹ کی کونسل

جس طرح چوتھی صدی عیسوی میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تھی اسی طرح سولھویں (۱۵۴۵ء تا ۱۵۶۳ء) میں ٹرنٹ (Trent) کے مقام پر ایک

عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کونسل میں جو اہم مباحث فیصل ہوئے تھے ان کا اجمالی ذکر اس مقام پر کر دیا جائے۔ یہ بیان اس روئداد سے ماخوذ ہے جسے ریلجیس ٹریکٹ سوسائٹی (لندن) نے شائع کیا تھا۔ اس کونسل میں منجملہ دیگر امور، ذیل کی تین اہم باتیں زیر بحث آئی تھیں۔

(۱) اپوکریفہ کی حیثیت کیا ہے؟

(۲) کیا روایات اور اناجیل ہم پلہ ہیں؟

(۳) اناجیل کے مختلف نسخوں میں جو اختلافات ہیں انہیں کس طرح رفع کیا جائے؟

شق اول کے متعلق اس روئداد میں مذکور ہے

اگرچہ اپوکریفہ کتابوں کو جیروم نے بائبل کے ولگیٹ ایڈیشن میں شامل کر دیا تھا لیکن یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ انہیں مستند نہیں سمجھتا تھا... لیکن کونسل میں بحث و تمحیص کے بعد (سینٹا کروس کی رائے سب پر غالب آگئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ولگیٹ ایڈیشن میں جس قدر کتابیں بھی شامل ہیں انہیں آسمانی کتابیں تصور کیا جائے۔ (صفحہ ۲۶-۲۷)

اس طرح اپوکریفہ کی جعلی کتابیں آسمانی قرار پاگئیں۔

شق دوم کے متعلق کونسل کے اراکین میں بہت اختلاف تھا۔ چنانچہ جب یہ مسئلہ بحث کے لئے پیش ہوا اور وہ حصہ پڑھا گیا جس میں درج تھا کہ اناجیل اور روایات کو یکساں تقدس اور عظمت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو برٹنی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اگرچہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ان دونوں کا مصنف خدا ہی ہے۔ کیونکہ سچائی جو بھی ہو اس کا سرچشمہ وحی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ بھی سچ ہے وہ سب الہامی ہے (مزید براں) یہ حقیقت کہ بہت سی روایات اب استعمال میں نہیں رہیں اس امر پر دال ہے کہ خدا کا یہ قطعاً منشا نہ تھا کہ انہیں تقدس و عظمت میں اناجیل کا ہم پلہ سمجھا جائے...... (صفحہ ۲۹)

لیکن اس کے خلاف مخالفت کا ایسا سیلاب امڈا کہ اس بیچارے کو معافی مانگنی پڑی اور یہ وعدہ کرنا پڑا کہ جو کچھ بھی فیصلہ ہوگا وہ اسے تسلیم کرے گا۔ چنانچہ یہی قرار پایا کہ روایات کو وحی کا ہم پایہ سمجھا جائے (روایات کے متعلق یہودیوں کا مسلک اس سے پیشتر بیان ہو چکا ہے)

شق سوم کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ "اس قدر مختلف نسخوں کا وجود اناجیل کے معانی کو غیر متیقن کر دیتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ایک متفق علیہ نسخہ شائع کر دیا جائے جسے مستند سمجھا جائے" (صفحہ ۲۹)۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ چھ ارکان پر مشتمل ایک اور کمیٹی متعین کی جائے جو ولگیٹ کے مختلف نسخوں سے ایک متفقہ علیہ نسخہ مرتب کرے۔ (صفحہ ۳۰) (Pallavicini) کا بیان ہے

کہ اس کمیٹی نے ایک طویل رپورٹ پیش کی جس میں اغلاط و اختلافات کی لمبی چوڑی فہرست درج تھی۔ "اس کثافت کے ڈھیر کو کوئی سیلاب ہی صاف کر سکتا تھا۔ (صفحہ ۳۲) - اس کمیٹی نے بڑی محنت اور جان فشانی کے بعد ایک نسخہ مرتب کیا لیکن وہ پوپ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس نے یہ کام علماء کی ایک مجلس کے سپرد کیا۔ اس کے جانشین۔ (Pious V) نے بھی اس مہم کو جاری رکھا۔ اور بالآخر ۱۵۹۰ء میں ایک نسخہ شائع ہوا۔

اس مستقل مزاج پوپ نے نہ صرف اپنے گرد و پیش بڑے علماء اور نقاد کی جماعت ہی جمع کی۔ بلکہ خود بھی بڑے جذب و شوق سے اس کام میں منہمک ہو گیا۔ اس نے پریس میں بھیجنے سے پہلے اس نسخہ کو حرف بحرف خود پڑھا۔ دوران طباعت میں اسے دوبارہ پڑھا۔ جب چھپ کر آیا تو اسے پھر پڑھا اور اس کی تصحیح کی۔ اس کے بعد اسے مستند قرار دیکر شائع کیا گیا۔ لیکن ابھی یہ نسخہ شائع ہوا ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ چنانچہ اسے پھر واپس لے لیا گیا۔ اور ۱۵۹۲ء میں اس سے زیادہ صحیح ایک اور نسخہ شائع کیا گیا۔ ان دونوں نسخوں میں نمایاں اختلاف ہے۔ اس کے بعد ۱۵۹۳ء میں ایک اور نسخہ شائع ہوا جو ۱۵۹۲ء والے نسخہ سے بھی مختلف تھا۔ ڈاکٹر جیمس نے ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا تو ان میں قریب دو ہزار اختلافات نظر پڑے جن میں بعض آیات پوری کی پوری ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ اور بہت سی آیات ایک دوسرے سے متضاد تھیں۔ بایں ہمہ ان دونوں نسخوں کو یکساں طور پر مستند تصور کیا گیا۔ (صفحہ ۳۳-۳۴)

غور فرمایا آپ نے کہ اناجیل کے "مستند" نسخے کس طرح وجود میں آتے رہے۔ یہی مستند نسخے تھے جن کا انگریزی ترجمہ شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء میں) ہوا۔ اور جسے پھر ۱۸۸۱ء میں ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا گیا۔ سوچئے کہ اس آخری نسخہ کو (جو پھر ہر نئے ایڈیشن کے وقت بدلا جاتا ہے) جناب حضرت مسیح کی انجیل سے کیا نسبت باقی رہ جاتی ہے؟

ان اختلافات یا اغلاط کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ دور حاضرہ کی پیداوار ہیں؟ یہ تو اناجیل کی تالیف کے ساتھ ہی شروع ہو گئے تھے مشہور نقاد (Celsus) قریب ۲۰۰ء میں لکھتا ہے کہ

دانستہ تحریف عیسائیوں نے اپنی مقدس کتابوں میں، دیدہ و دانستہ فریب کارانہ انداز سے رد و بدل کر ڈالا ہے۔

اس تحریف و الحاق کے اسباب کیا تھے؟ سب سے پہلے تو یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ عام طور پر ناخواندہ تھے۔ چنانچہ مشہور عیسائی مورخ (Mosheim) جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اپنی تاریخ کے حصہ اول (پہلی صدی) باب ۲ میں لکھتا ہے۔

یہ تمام شاگرد تعلیم سے بے بہرہ اور فلسفہ اور دیگر علوم سے ناآشنا تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اناجیل کے اصل نسخے ان کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں رہ سکتے تھے (اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ موجودہ نسخے جو ان حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں دراصل ان کی تالیف نہیں ہیں کیونکہ وہ تو تعلیم سے بے بہرہ تھے) لیکن اس تحریف اور تغیر و تبدل کی اس سے کہیں گہری وجہ ایک اور تھی۔ یہ وجہ کیا تھی؟ سنئے اور غور سے سنئے! سینٹ پال (موجودہ عیسائیت کا بانی) انجیل (خطوط پال) میں لکھتا ہے:-

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے؟ (رومیوں کے نام ۳/۷)

"جھوٹ کی عظمت"

غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا عقیدہ ہے؟ اگر جھوٹ بولنے سے "خدا کی بڑائی" ظاہر ہوتی ہو تو بلا تکلف جھوٹ بولئے! جب جھوٹ کا دروازہ اس طرح چوپٹ کھول دیا جائے تو اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے، ظاہر ہیں۔ (Mosheim) چوتھی صدی کے متعلق لکھتا ہے۔

مذہبی صداقت اور پاکبازی کو ان دو خطرناک حماقتوں سے سخت ٹھیس لگی جو اس صدی میں عام طور پر مروج ہو چکی تھیں۔ اول یہ عقیدہ کہ اگر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے کلیسا کے مفاد کو تقویت پہنچتی ہو تو یہ کذب و فریب بڑے ثواب کا درجہ رکھتا ہے

.... یہ عقیدہ ایک عرصہ سے مروج چلا آتا تھا اور اس نے اس اثناء میں بے شمار مضحکہ انگیز روایات، افسانہ طرازیاں اور مقدس فریب (عیسائیت میں) داخل کر کے رکھ دیئے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کھلے بندوں کر لینا ہوگا کہ اس صدی (چوتھی صدی) میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں اور بڑے بڑے مقدس ولی بھی اس دروغ بافی اور کذب تراشی سے بری نہ تھے۔ اور اس کا ثبوت ان کی تحریروں سے اور ان کے کارناموں سے بآسانی مل سکتا ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ اس الزام سے بڑی بڑی مقدس ہستیوں (مثل فلاں اور فلاں) کو تو مستثنیٰ قرار دیدیں۔ لیکن کیا کیا جائے! سچائی ان بزرگوں کی عقیدت سے کہیں زیادہ قابلِ احترام ہے اور سچائی کا تقاضا ہے کہ انہیں بھی اس الزام کا مورد قرار دیا جائے۔ (چوتھی صدی۔ حصہ دوم۔ باب ۳/۱۶)

یہی مورخ تیسری صدی کے متعلق لکھتا ہے۔

جو لوگ یہ چاہتے تھے کہ نیکیوں میں دوسروں سے سبقت لے جائیں وہ اس چیز کو نہ صرف جائز ہی سمجھتے تھے بلکہ قابلِ تحسین بھی کہ نیکی کے مشن کو تصنع اور فریب سے تقویت دی جائے۔ (حصہ دوم۔ باب ۳/۱۱)

اسے نظرانداز نہ کیجئے کہ لکھنے والا کوئی غیر عیسائی نہیں بلکہ عیسائیوں کی دنیا کا ایک بہت بڑا مورخ جس کی تاریخ کلیسا ایک مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے اوپر چوتھی اور تیسری صدی کا ذکر آچکا ہے۔ اب دوسری صدی کو لیجئے۔

فلاطونی اور فیثاغورثی مسلک کے پیرو، صداقت اور نیکی کے مشن کو، جھوٹ اور فریب سے فروغ دینے کو نہ صرف جائز بلکہ قابل ستائش خیال کرتے تھے۔ جو یہودی مصر میں رہتے تھے، انھوں نے حضرت مسیح سے پیشتر ان لوگوں سے یہ اصول مستعار لے رکھے تھے۔ جیسا کہ ازمنۂ قدیمہ کی بے شمار دستاویزات سے صاف طور پر ثابت ہے۔ عیسائیوں نے اس اصول کو ان دونوں سرچشموں سے حاصل کیا جیسا کہ ان کثیر التعداد کتابوں سے ظاہر ہے جنہیں تصنیف کسی نے کیا اور وہ منسوب کسی کی طرف ہیں۔ (حصہ دوم باب ۳/۱۵)

اس سے بھی پیچھے چلئے اور پہلی صدی کی حالت دیکھئے۔

حضرت مسیح کے آسمان پر تشریف لے جانے کے تھوڑا عرصہ بعد، آپ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق بہت سی سیرت کی کتابیں لکھی گئیں جو مقدس فریبیوں اور اعجوبہ نگاریوں سے بھرپور تھیں۔ یہ کتابیں ان لوگوں نے تصنیف کیں جن کی شاید نیت تو خراب نہ تھی لیکن ان کی تحریروں سے سخت اوہام پرستی اور جہالت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہیں پر بس نہیں۔ بہت سے فریب کاروں نے خود کتابیں لکھیں اور انہیں مقدس حواریوں کی طرف منسوب کر کے دنیا کے حوالے کر دیا۔[1] (پہلی صدی۔ حصہ دوم۔ باب ۲/۱)

اندازہ فرمائیے کہ اس "مقدس جھوٹ" نے جسے سینٹ پال نے بہت بڑا کار ثواب قرار دیا ہے۔ کیا کیا گل کھلائے۔ اور یہ سلسلہ پہلی صدی ہی سے شروع ہو گیا۔ مندرجہ صدر اقتباسات صرف پہلی چار صدیوں کے متعلق ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ان ہی حقائق کے پیش نظر خود عیسائیوں کے علماء اب اس امر کا اعلانیہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ اناجیل ناقابل اعتبار ہیں۔ انگلیکن چرچ کا بشپ (Charles Gore) لکھتا ہے۔

سینٹ کرد سٹم کی طرح میرے لئے بھی اس امر کا تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اناجیل غلطی سے مبرا ہیں۔

(The Holy Spirit and The Church)

✲

یہ ہے اناجیل کی داستان۔ اب آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ اس مجموعہ کو کس طرح الہامی اور آسمانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان تصرفات سے صرف یہی نہیں ہوا کہ تاریخی حقائق افسانوں میں بدل گئے۔ بلکہ مذہب نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی

---

[1] کم و بیش پچاس انجیلیں آج بھی ایسی موجود ہیں جنہیں اپوکریفہ کی فہرست میں داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن جن کتابوں کو اصل سمجھ کر مقدس آسمانی خیال کیا جاتا ہے ان کی اصلیت کے متعلق بھی آپ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

جیسے کسی طرح بھی ایک مامور من اللہ، خدا کے رسول کی اصلی تعلیم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مذہب کا مدار ہے عقائد اور اعمال صالحہ پر، عقائد کے بارے میں جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں عیسائیت

عیسائیوں کے عقائد

کی بنا تثلیث قرار پاگئی اور اعمال کی جگہ کفارہ کے عقیدہ نے لے لی جس کی رو سے نجات کا مدار، اعمال کے بجائے حضرت عیسیٰؑ کی تصلیب کا عقیدہ قرار پاگیا۔ عقیدہ کی رو سے عیسائیوں کے اصول مذہب یہ ہیں:-

"ہم ایمان لائے (۱) خدا، قدرت والے باپ پر، جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے۔ اور (۲) رب یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ الٰہ الٰہ ہے۔ نور، نور ہے۔ عین خدا ہے مولود ہے مخلوق نہیں۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے اس کی وساطت سے تخلیق اشیاء ظہور میں آئی۔ یعنی جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے۔ ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا اور وہ انسان بن کر آیا۔ مبتلائے بلا ہوا اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آسمان پر چڑھ اور اب زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پھر آئے گا"

(Council of Trent ; p. 161)

(Reghi Paul) جس کا ذکر پہلے آچکا ہے لکھتا ہے:-

مادہ اور کائنات کی تخلیق و تعمیر کے متعلق عیسائیت کے نظریے غلط ہو سکتے ہیں۔ لیکن خدا کے متعلق تصور اور اس کے طریق عبادت کے متعلق اس کی تعلیم غلط نہیں ہو سکتی۔

(The Annihilation of man ; p. 175)

یعنی دنیائے علم میں اناجیل کے بیان کردہ حقائق، عصر حاضرہ کے انکشافات و تحقیقات کے پیش نظر مسترد کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن خدا کے متعلق اس کی تعلیم ناقابل تردید ہے۔ لیکن ایک دوسرا عیسائی محقق (Sir Richard Gregory) خدا کے متعلق اناجیل کے تعلیم کے بارے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ قابل غور ہے وہ لکھتا ہے۔

بائبل میں خدا کا تصور یکساں نہیں (کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ)۔ اور یہ یقین کے ساتھ بتایا جاسکتا ہے کہ فلاں مقام پر کون غیر مسیحی اثر کار فرما ہے۔ اور فلاں مقام پر کون۔

(Religion in Science Civilization ; p. 87)

یعنی خدا کے متعلق تعلیم، جسے پال نے قابل اعتناء بتایا تھا۔ وہ مزید تحقیق کے مطابق یکسر خارجی اثرات کا مجموعہ بن کر سامنے آگئی اسی بنا پر (Gregory) لکھتا ہے کہ

بائبل حسب ذیل وجوہ کی بناء پر اپنی صحت کے عقیدہ کو ثابت کرنے میں ناکام رہ جاتی ہے۔

(۱) اس کا خود باہمی تضاد

(۲) مذہب عیسائیت کی بنیاد کن چیزوں پر ہونی چاہیئے۔ اور اخلاق کا معیار کیا ہے۔ اس کے متعلق جو نظریئے آج کل مروج ہیں ان سے بائبل کا اختلاف۔

(۳) جو واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں، سائنس کے موجودہ انکشافات ان کی تغلیط کر رہے ہیں۔

(۴) اس کی تدوین و تالیف اور جمع و تدوین کے متعلق جو کچھ عقیدہ پیش کیا جاتا ہے۔ جب اسے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے وہ بالکل باطل نظر آتا ہے۔ اس لئے جب اس کی بنیادیں ہی غلط ثابت ہوتی ہوں تو اس کی صحت کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے۔ (p. 82)

کفارہ کے عقیدہ کا بانی اور مبلغ سینٹ پال ہے (اور حقیقت یہ ہے کہ مروجہ مذہب عیسائیت تمام کا تمام اسی کے دماغ کی اختراع ہے) عہدنامۂ جدید پولوس (سینٹ پال) کے خطوط پڑھئے۔ ہر جگہ اسی عقیدہ کی تبلیغ دکھائی دیگی

تم کو ایمان کے وسیلہ ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے۔ اور نہ اعمال کے سبب سے ہے (افسیون ۲/۸)

اور یہ کہ

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان۔ شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے (رومیوں کے نام۔ ۳/۲۸)

اسی عقیدہ نے رفتہ رفتہ "معافی ناموں" (Indulgences) کی صورت اختیار کر لی

معافی نامے

کر لی ان کی ابتداء یوں ہوئی کہ صلیبی جنگوں کے دوران میں، پوپ اربن دوم (Urban II) نے حکم جاری کیا کہ جو لوگ بذات خویش شریک جنگ نہیں ہو سکتے وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیجدیں اور اس کے بدلے میں انہیں "معافی نامہ" دے دیا جائے گا جو ان کی نجات کا کفیل ہوگا۔ جب پوپ لیو دھم (Leo X) نے روما میں سینٹ پیٹر کا گرجا بنوانا چاہا تو اس نے بھی اسی قسم کے "معافی نامے" بھیجنے شروع کر دیئے۔ بس پھر کیا تھا؟ ان معافی ناموں نے عام تجارت کی صورت اختیار کر لی۔ قریہ بہ قریہ، کوبکو۔ ہر مقام پر ان معافی ناموں کی ایجنسیاں قائم ہو گئیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں اس تجارت نے ایک طوفانی صورت اختیار کر لی۔ ہر گناہ کی معافی کے لئے الگ قیمت کا "معافی نامہ" موجود تھا۔ ذرا (Buck's Theological Dictionary) اٹھائیے اور اس میں (Indulgences) کے زیر عنوان دیکھئے کہ کیسی عجیب و غریب منڈی کا نقشہ نظر آتا ہے۔

معافی نامہ کی عام فارم یہ ہوا کرتی تھی۔

تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمہیں اپنے مقدس ترحم (خسروانہ) سے (تمام گناہوں کی پاداش سے آزاد کر دے۔ میں اس کی اور اس کے بابرکت شاگرد، پطرس، پولس اور مقدس پوپ کی اس سند کی رو سے جو مجھے انہوں نے عطا فرمائی ہے۔ تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے، خواہ وہ کسی شکل میں ہوں پھر تمہارے ہر ایک گناہ، حدود شکنی اور زیادتی سے خواہ وہ کیسے ہی مہیب اور شدید کیوں نہ ہوں۔ اور میں وہ سزا تم سے اٹھا لیتا ہوں۔ جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی۔ تاکہ تم جب مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں۔ اور جنت کی راہیں کشادہ۔ باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ان معافی ناموں کے لئے مختلف گناہوں کی قیمتیں الگ الگ ہوتی تھیں۔ اور ہر ایجنٹ کے پاس ان کی فہرست موجود ہوتی تھی۔ جس کی اصل (Tax of the Sacred Roman Chancery) کی کتاب میں مصدقہ طور پر محفوظ ہوتی تھی۔ چند ایک گناہوں کی معافی کی قیمتیں ملاحظہ فرمائیے۔

	پنس	شلنگ
(۱) اسقاط حمل	۶	۳
(۲) عدالت میں جھوٹی قسم	۰	۹
(۳) چوری	۰	۱۲
(۴) کسی عفیفہ کی عصمت دری	۰	۹
(۵) زنا کی اور بھیانک صورتوں میں	۶	۷
(۶) قتل	۶	۷
(۷) لونڈی رکھنے کے لئے	۶	۱۰

یہ معافی نامے نہ صرف اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے خریدے جاتے تھے بلکہ مردوں کے گناہوں کے لئے بطور کفارہ بھی خرید کئے جا سکتے تھے۔ چنانچہ ان معافی ناموں کے ایجنٹ کچھ اس قسم کی آوازیں لگایا کرتے تھے۔

آؤ۔ بڑھو! جنت کے دروازے کھل رہے ہیں اگر تم اب بھی داخل نہ ہو گے تو کب داخل ہو گے۔ تم بارہ پنس کے عوض میں اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کے لئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے؟ اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں فقط ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تاکہ اس قدر گراں بہا متاع خرید سکو[۱]

(Buck's Dictionary)

---

[۱] یہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

آکسفورڈ کا چانسلر (Thomas Gascoigne) ۱۴۵۰ء میں لکھتا ہے۔

آجکل گناہگار (ہر جگہ) یہ کہتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں کہ "میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ میں خدا کے حضور کتنے گناہ کرتا ہوں اس لئے کہ میں ہر وقت بلا وقت، ہر گناہ اور جرم کے لئے معافی نامہ خرید سکتا ہوں۔ کبھی چار پنس میں۔ کبھی جوئے کے ایک داؤ کی قیمت کے بدلے" اس لئے کہ ان معافی ناموں کے بیچنے والے ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں اور وہ انہیں کبھی دو دو پنس میں کبھی ایک جام شراب کے بدلے یا جوئے میں ہاری ہوئی رقم کے معاوضہ میں اور گاہے کسی رنڈی کے خرچہ کے عوض میں بیچ دیتے ہیں۔

(Quoted By Mencken in "Treatise on Right and wrong P.P. 187-88)

یہ خرابیاں محض بازاری لوگوں تک محدود نہ تھیں بلکہ نظام کلیسا کی بنیاد میں داخل تھیں۔ چنانچہ اس باب میں (Dr. Ing) جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لکھتا ہے۔

جس عہد میں کلیسا، سیاسی طور پر صاحب اقتدار رہا۔ وہی عہد سب سے زیادہ بدمعاشیوں کے لئے بدنام رہا۔ (ص 290)

اسی کو (Mencken) ان الفاظ میں دہراتا ہے۔

یونیورسل چرچ کے اقتدار کا زمانہ در حقیقت بے مثال جرائم و بدنظمی۔ ظلم و تعدی اور فسادات اور بدکاریوں کا زمانہ تھا۔ (P. 105)

فٹ نوٹ متعلقہ صفحہ ۴۱

[1] کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی خرابیاں اس وقت پیدا ہو جاتی ہیں جب مذہب اپنے مرکز ثقل سے ہٹ جاتا ہے، اور اس میں یہودیت اور عیسائیت کی کوئی خصوصیت نہیں۔ سب کے ہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ ہمیں تسلیم ہے اور اس حقیقت کا اعتراف بھی (اگرچہ نہایت جھکی ہوئی نگاہوں اور عرق آلود پیشانی سے) کہ خود مسلمانوں کے ہاں اس سے بھی بدتر خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ لیکن ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ اس قدر ہے کہ عیسائیوں کے ہاں یہ تمام خرابیاں اس تعلیم کی بنا پر پیدا ہوئیں جو آج بھی اس کتاب میں موجود ہے جسے وہ الہامی قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاں جس قدر عملی اور اعتقادی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ ان سب کی کھلی کھلی تردید ان کی آسمانی کتاب میں موجود ہے جسے قرآن کریم کہتے ہیں قرآن کے علاوہ ان کے ہاں اور کوئی تعلیم وحی پر مبنی نہیں ہے (جیسے یہودیوں کے ہاں وحی غیر مکتوب۔ یعنی مجموعۂ روایات اور عیسائیوں کے ہاں "رسولوں کے اعمال" اور "حواریوں کے خطوط و مکاشفات" بھی الہامی صحیفے قرار دیئے جاتے ہیں) اور ہر وہ تعلیم جو قرآن کے خلاف ہو بلا تامل ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے ہاں ہر وقت بتایا جا سکتا ہے کہ فلاں فلاں چیز آسمانی تعلیم کے خلاف ہے برعکس اس کے عیسائیوں اور یہودیوں میں ایسا نہیں بتایا جا سکتا۔ کیونکہ یہ غلط تعلیم خود ان کے مقدس نوشتوں میں شامل ہے جسے وہ آسمانی قرار دیتے ہیں

اعمال واعتقادات کی دنیا میں یہی قیامت خیزیاں تھیں جن سے متاثر ہو کر لوتھر نے پراٹسٹنٹ کے اصلاح یافتہ فرقہ کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس کی تنقید محض عقل کی بناء پر تھی اس لئے کہ وحی کی سچی تعلیم تو کہیں موجود ہی نہ تھی جس کی روشنی میں وہ اپنے فرقہ کی عمارت آسمانی خطوط پر تعمیر کرسکتا۔ اناجیل ان کے ہاں بھی وہی ہیں جو دوسروں کے ہاں ہیں۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ عیسائیوں میں پہلی مرتبہ یہ الگ فرقہ پیدا ہوا۔ ان کے ہاں ابتدائی ایام میں ہی بے شمار

عیسائیوں کے فرقے

فرقے پیدا ہو گئے تھے جو ایک دوسرے سے (بنیادی عقائد تک میں) اس قدر مختلف تھے کہ کوئی دیکھنے والا انہیں ایک ہی درخت کی شاخیں قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ایک فرقہ مارکیونی (Marcionist) اپنے بانی (Marcion) کے نام سے مشہور تھا جو حضرت عیسیٰ کی خارق عادت پیدائش، الوہیت اور مر کر جی اٹھنے کا قائل نہ تھا۔ ابیانی فرقہ بھی حضرت عیسیٰ کو حضرت مریم اور یوسف کا بیٹا مانتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ صلیب کے وقت مسیح، جسم مسیح سے الگ ہو کر آسمان کی طرف صعود کر گیا۔ اور جو کچھ تکلیف پہنچی وہ محض جسم کو پہنچی۔ یہ لوگ سینٹ پال سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مینز (Manes) نے ایک اور فرقہ کی بنیاد رکھی جس کا عقیدہ تھا کہ مسیح وہی عقل کل تھا۔ جسے مذہب زرتشت والے مترا کہتے ہیں (اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی) اس کا مسکن سورج تھا۔ وہ جسم ناسوت میں ظاہر ہوا۔ لیکن یہودیوں کے نازیبا سلوک کی وجہ سے پھر سورج میں جا بیٹھا۔ ناسٹک (Gnostic) فرقہ ان سب سے زیادہ مشہور تھا۔ اس لفظ کے معنی دانا کے ہیں۔ ان پر فیثاغورث اور افلاطون کے فلسفہ کا بہت گہرا اثر تھا۔ نیز زرتشت کی تعلیم کا بھی۔ یہ بھی سینٹ پال کے منکر تھے اور مسیح کو روح محض تسلیم کرتے تھے۔ تورات کی صرف پہلی پانچ کتابوں کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ تمام انبیائے بنی اسرائیل (معاذ اللہ) گنہگار تھے۔

ہم نے صرف، بر سبیل تذکرہ، ان فرقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو بنیادی عقائد میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ورنہ فرقے بے شمار تھے اور ایک ایک فرقے کی بے شمار شاخیں۔ گبن، صرف ایک فرقہ (ناسٹک) کی پچاس شاخیں بتاتا ہے۔ لیکن یہ تمام فرقے پانچویں صدی کے آغاز تک قریب قریب ختم ہو گئے۔ اور باقی فرقہ تثلیثیہ ہی رہ گیا۔ اس کی دو بڑی شاخیں اب مذہب عیسائیت کی مظہر ہیں۔ مغربی کلیسا کے متبع (رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ) اور مشرقی کلیسا کے پیرو، جن میں چودہ مختلف کلیسا شامل ہیں۔ ان میں پراٹسٹنٹ کچھ ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کی شائع کردہ اناجیل میں زمانہ کے حسب حال ساتھ کے ساتھ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ ابھی سات آٹھ سال ادھر انگلستان کے سب سے بڑے لاٹ پادری۔ لارڈ بشپ آف کنٹربری نے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا تھا کہ وہ رپورٹ کرے کہ موجودہ

لہ عیسائیت کے فلسفہ کی بنیاد ہی (Logos) کے نظریہ پر ہے جو یونانیوں سے مستعار لیا گیا ہے۔

اناجیل میں کس قسم کا تغیر و تبدل کیا جائے تاکہ علوم جدیدہ کی روشنی میں مذہب پر اعتراضات نہ ہو سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رپورٹ میں منجملہ دیگر امور، الوہیت مسیح، ابنیت اور کفارہ کے عقائد کی تنسیخ کی بھی سفارش کی تھی۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جو اناجیل دنیا میں رائج ہوں ان میں یہ عقائد باقی نہ رہیں۔

نگۂ بازگشت یہ ہے اناجیل اربعہ وغیرہ (عہد نامہ جدید) کی روداد جس پر مذہب عیسائیت کی عمارت قائم ہے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر نگۂ بازگشت سے دیکھتے جائیے کہ اس باب میں کیا چیزیں سامنے آئی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ:-

(۱) حضرت عیسیٰؑ جو انجیل اپنے حواریوں کو دے کر گئے تھے اس کا تاریخ میں آج کہیں سراغ نہیں ملتا۔

(۲) دوسری صدی میں قریب ۳۴ اناجیل اور ۱۲ خطوط رائج تھے۔ لیکن یہ سب یونانی زبان میں تھے۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کی زبان ارامی تھی۔

(۳) نیقیہ کی کونسل (منعقدہ ۳۲۵ء) نے عجیب غریب طریق سے ان تمام اناجیل و خطوط سے موجودہ چار اناجیل اور کچھ اور لٹریچر منتخب کر لیا (جو آج عہد نامۂ جدید کہلاتا ہے) اور باقی کتابوں کو وضعی قرار دیدیا۔

(۴) لیکن آج دنیا میں نہ اصل نسخے کہیں موجود ہیں اور نہ ہی وہ جو نیقیہ کی کونسل نے منتخب کئے تھے۔ آج دنیا میں قدیم ترین تین نسخے ہیں اور یہ چوتھی اور پانچویں صدی کے ہیں یونانی زبان میں اور وہ بھی ناقص۔

(۵) جو چار کتب اناجیل موجودہ عہد نامۂ جدید کے مجموعہ میں شامل ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ متی کی انجیل سنہ ۶۱ء اور سنہ ۷۰ء کے درمیان تصنیف ہوئی۔ مرقس کی انجیل سنہ ۶۴ء میں اور لوقاؔ اور یوحنّاؔ کی اناجیل پہلی صدی کے اخیر میں۔

(۶) یہ اناجیل حضرت عیسیٰ کی سوانح حیات ہیں جن میں پیدائش سے پہلے اور تشریف برادری کے بعد تک کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن ان میں بھی ربط اور نظم کی نمایاں کمی ہے۔

(۷) چوتھی صدی میں جیروم نے ان اناجیل کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس لاطینی ترجمہ سے سنہ ۱۶۱۱ء میں انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ لیکن سنہ ۱۸۷۰ء میں عیسائی علماء کی ایک جماعت نے اس ترجمہ کو ناقص قرار دیکر ایک اور ترجمہ شائع کیا۔ یہی ترجمہ اب بائبل (عہد نامہ جدید) کہلاتا ہے۔ اس ترجمہ کے ہر نئے ایڈیشن اور ہر نئی زبان کے ترجمہ میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ہوتا رہتا ہے۔

(۸) چونکہ یہ اصول مذہب عیسائیت کی بنیادی تعلیم میں داخل ہے اور ان کی بائبل میں موجود کہ مذہب کے فروغ کے لئے جھوٹ بولنا کارِ ثواب ہے۔ اس لئے پہلی صدی سے ہی الحاق و کتمان۔ تغیر و تبدل حک و اضافہ اور تلبیس و تحریف کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کتابوں میں کیا چیز کس کی ہے؛

(۹) پھر ان کتابوں میں جو تعلیم ملتی ہے وہ تو کسی طرح بھی خدا کے ایک رسول کی اصلی تعلیم قرار نہیں دی جا سکتی۔ کھلا ہوا شرک۔ یعنی تثلیث کا عقیدہ، الوہیت اور ابنیت کی تعلیم۔ کفارہ کا مسلک اور اس کے علاوہ وہ کچھ جو صرف ان کتابوں کے مطالعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ کس طرح خدا کے ایک برگزیدہ رسول کی آسمانی تعلیم سمجھی جا سکے؟ اور تو اور اناجیل خود حضرت عیسیٰؑ کی جو تصویر پیش کرتی ہیں وہ بھی خدا کے اس عظیم المرتبت رسول کے شایانِ شان نہیں۔ ڈاکٹر جوڈ، اناجیل کے باہمی اختلافات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے۔

"لیکن جو چیز (اس سے بھی زیادہ) افسوسناک ہے وہ (حضرت) عیسیٰ کا وہ کیریکٹر ہے جو اناجیل پیش کرتی ہیں" (God and Evil; p. 319)

اس کے بعد ڈاکٹر جوڈ نے مثالیں پیش کی ہیں جن کی رو سے حضرتِ عیسیٰ کی زندگی (جو اناجیل نے پیش کی ہے) خود ان کی اپنی تعلیم کے خلاف جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اخیر میں لکھتا ہے کہ "مسٹر (Claude Montefiore) نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

جی چاہتا ہے کہ (پیار اور محبت کی تعلیم دینے والے مسیح) کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا مل جاتا جس سے ثابت ہوتا کہ انہوں نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں سے کہیں بھی پیار اور محبت کا سلوک کیا تھا۔ (صفحہ ۳۲۱)

☆

۳۔ مذہب زرتشت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کریم نے صرف سامی النسل انبیائے کرامؑ کا ذکر کیا ہے۔ اس اعتبار سے ہمیں بابِ زیرِ نظر میں سامی مذاہب کی کتب مقدسہ (تورات۔ زبور۔ انجیل) کے تذکرہ تک ہی محدود رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن جس آسمانی دعوتِ انقلاب کا ذکر اس کے بعد آنے والا ہے، وہ انسانوں کی کسی خاص نسل یا زمین کے کسی خاص حصہ تک محدود نہیں۔ بلکہ اس کا تخاطب تمام نوعِ انسانی سے ہے اور اس کے مہرِ عالمتاب کی ضو فشانیاں تمام اطراف اکنافِ عالم کو محیط ہیں۔ اس لئے ہم اب سامی مذاہب کے دائرہ سے نکل کر آگے بڑھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ جس وقت

(یعنی چھٹی صدی عیسوی میں) اس دعوت کا ظہور ہوا اس وقت غیر سامی مذاہب کی کتب مقدسہ کی کیا کیفیت تھی۔ تاکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ وہ زمانہ فی الواقعہ ایسا تھا کہ دنیا کے کسی ایسے مذہب کے پاس جسے آسمانی ہونے کا دعویٰ تھا اس کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں قطعاً اور حتماً موجود نہ تھی اور متجسس نگاہیں ساری دنیا کے مختلف مراکز کا چکر کاٹ کر خاسر و ناکام کاشانۂ چشم میں لوٹ آتی تھیں

سب سے پہلے مذہب زرتشت[1] کو لیجئے۔ اس مذہب کو ایک وقت میں دنیا میں بہت بڑی اہمیت حاصل تھی

جناب زرتشت

لیکن بایں ہمہ، جناب زرتشت کے متعلق صحیح تاریخی معلومات دنیا کے کسی گوشے میں نہیں ملتیں۔ آپ کی سوانح حیات تو ایک طرف، آپ کے زمانہ تک کے متعلق بھی ابھی تک یقینی طور پر کچھ طے نہیں ہو سکا۔ جو کچھ اس وقت تک معلوم ہو سکا ہے اس میں اس قدر باہمی تضاد و تناقض ہے کہ حقیقت یکسر افسانوں کی چادروں میں لپٹی ہوئی مستور ہے

قدیمی تحریروں میں سب سے پہلے جناب زرتشت (Zoroaster) کا ذکر افلاطون کے ہاں ملتا ہے جو ۳۵۰ ق۔م کے قریب لکھتا ہے:۔

> ایرانی نوجوانوں کو مغ زرتشت یعنی ہرمز تعلیم دیا کرتا تھا"

اس سے قریب پچاس سال پیشتر مشہور مؤرخ، ہیروڈوٹس (Herodotos) ایرانی پجاریوں (مغول) کا ذکر کرتا ہے (Dr: Prideaux) کی تحقیق کے مطابق جناب زرتشت، دارا (شاہ ایران) کے ہمعصر تھے۔ ان تحقیقات کی روشنی میں، عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جناب زرتشت کا زمانہ ۶۰۰ ق۔م سے پہلے کا نہیں۔ لیکن گبن لکھتا ہے کہ

> دارا کے ہم عصر یونانی مورخوں کی رائے کے مطابق، (جناب) زرتشت کا زمانہ، دارا سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے کا ہے۔

انیسویں صدی میں ھاگ (Haug) اور بنسن (Bunsen) وغیرہ نے مزید تحقیق کی اور ژند اوستا کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کا خیال ہے کہ جناب زرتشت، دراصل باختر (Bactaria) کے رہنے والے تھے اور ان کا زمانہ ۲۲۰۰ ق۔م سے ۲۴۰۰ ق۔م کے درمیان ہے۔ اس کی تائید قدیم بابلی مؤرخ (Berosos) کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جس نے سکندر کے حملہ کے بعد (۳۲۵ ق۔م کے

---

[1] ہمارے ہاں یہ مذہب مجوس، پارسیوں کے مذہب کی حیثیت سے متعارف ہے جنہیں آتش پرست بھی کہا جاتا ہے۔ پارسی اب سمٹ سمٹا کر بمبئی کے ساحل پر مرکوز ہو چکے ہیں۔

کے قریب) اپنے ملک کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جناب زرتشت کا زمانہ (سنہ ۲۳۳۴ ق۔م) ہے لیکن ایسے محقق بھی ہیں جن کے نزدیک آپ کا زمانہ سنہ ۶۳۵ ق۔م کے قریب ہے۔ دوسری طرف (The Outline of Man's Knowledge) کے مؤلف کے نزدیک آپ کا زمانہ سنہ ۱۰۰۰ ق۔م سے زیادہ بعید کا نہیں۔ یہ ہے اس وقت تک کی تحقیق۔ جناب زرتشت کے زمانہ کے متعلق۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ جن تحقیقات و تفتیشات کی رو سے ایک شخص کا زمانہ سنہ ۶۰۰۰ ق۔م سے لے کر سنہ ۶۳۵ ق۔م کی پہنائیوں میں جھولا جھول رہا ہو۔ اس کی زندگی کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پہ کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ غالباً اسی وقت کے پیش نظر (René Guénon) کا خیال ہے کہ لفظ زرتشت کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے منصب کا نام ہے جس میں "نبوت اور قانون سازی" کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس لئے "زرتشت" بہت سے گذرے ہیں جن میں کے آخری زرتشت کا زمانہ سنہ ۶۰۰ ق۔م ہے۔ (The Crisis of the Modern World; p. 16) بہرحال کہا یہ جاتا ہے کہ جناب زرتشت کے مذہب کا اولین گہوارہ باختر تھا۔ وہاں سے یہ مذہب ایران میں آیا اور دارا کے زمانہ میں فارس اور اس کے ۱۲۷ صوبوں کا حکومتی مذہب (State Religion) قرار پاگیا۔ وہاں سے یہ گرد و نواح میں پھیلا۔ بابل کے راستے اس نے قدیم یہودی مذہب کو متاثر کیا اور اسکندریہ کی لائبریری کے راستے (حضرت عیسیٰ کے بعد) مذہب عیسائیت کا خمیر بنا۔ سنہ ۵۰۰ ق۔م کے قریب یہ مذہب ہندوستان میں داخل ہوا اور برہمنیت کی شکل میں ہندوؤں کا دھرم قرار پایا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ ہندوؤں کے سری ویاس جی ایک مدت تک جناب زرتشت کے پاس رہے اور انہی سے اس تعلیم کو حاصل کر کے ہندوستان لوٹے اور ہندو دھرم کی شکل میں اس کی نشر و اشاعت کی چنانچہ وساتیر نامہ زرتشت میں اس کا ذکر موجود ہے (تفصیل اس کی ہندومت کے عنوان میں ملیگی)

مقدس کتاب

ژند اوستا اس مذہب کی مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کا نام اوستا ہے۔ ژند اضافی لفظ ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو وہ زبان جو پہلوی سے پیشتر ایران میں رائج تھی۔ اس اعتبار سے ژند اوستا کے معنی ہوں گے "ژند زبان کی اوستا" یا ژند کے معنی ہیں تفسیر۔ اس لحاظ سے اس کے معنی ہوئے "اوستا کی تفسیر" ژند کا شمار اب مردہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ اوستا (جیسی کچھ بھی ہے) پہلوی زبان میں ہے۔ پھر اس تمام کتاب کی زبان بھی ایک سی نہیں۔ اس میں گتھاؤں کی زبان اور ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی حصہ (اپنی موجودہ مسخ شدہ صورت میں) جناب زرتشت کا ہے۔ باقی حصہ قدیم ایرانی کتابوں کا مرکب سا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی اصلیت کے متعلق ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اس قدر ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایران میں اس مذہب کے قریب ستر فرقے موجود تھے جن میں سے ہر ایک کا

دعویٰ تھا کہ اصلی اوستا صرف اسی کے پاس ہے اور دوسروں کی اوستا جعلی ہے۔ ہر فرقہ کی اوستا دوسرے فرقوں کی اوستا سے مختلف تھی۔ شاہ ایران، ارتخشتاہ (Artaxerxes) نے ان اختلافات کے مٹانے کے لئے (قریب [illegible] ق۔م میں) ایک عظیم الشان کونسل منعقد کی[1]۔ اس کونسل میں قریب اسی ہزار مُغ (پجاری) اطراف و اکنافِ سلطنت سے شامل ہوئے۔ لیکن یہ گروہ اس قدر کثیر تھا کہ کونسل کا انعقاد مشکل ہو گیا۔ اس لئے ان میں سے صرف سات مقدس مُغ منتخب کئے گئے۔ جو اپنے زہد و ورع اور علم و بصیرت کی بنا پر معتمد علیہ تصور کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ گبن کے الفاظ میں سنئے:۔

ان سات منوں میں سے ایک مقدس نوجوان، اردا ویرف نامی، کے سامنے آتشیں شراب کے تین پیالے پیش کئے گئے۔ اس نے انہیں پیا اور اس کے بعد ایک لمبی اور گہری نیند میں سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے بادشاہ اور دیگر حاضرین کو بتایا کہ اس نے کس طرح آسمانوں کی سیر کی ہے۔ یہاں مقدس دیوتاؤں کی اس سے ملاقات ہوئی۔ سننے والوں کے شک و شبہ کے خیالات اس نوجوان کی مافوق الفطرت شہادت (آسمانی) کے سامنے دب گئے اور اس طرح زرتشت کے مذہب کا ضابطہ قوانین مرتب کر دیا گیا۔

(اس کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مسٹر کپاڈیا کی کتاب The Teachings of Zoroaster)

غور فرمائیے! یہ طریقِ ترتیب و تدوینِ کتابِ مقدس وہی ہے جسے عزرا (فقیہہ) نے اختیار کیا تھا (اسی بناء پر مؤرخین کا خیال ہے کہ عزرا مذہب زرتشت ہی کا پیرو تھا اور اس نے اس مذہب کی تعلیم کو تورات کے لباس میں یہودیوں میں رائج کر دیا۔) بہرحال، اس طرح تعلیم جنابِ زرتشت کا جدید نسخہ مرتب کیا گیا۔ لیکن جس طرح عزرا کا مرتب کردہ، مجموعۂ اسفار موسیٰ بعد میں ضائع ہو گیا، اسی طرح اردا ویرف کی مرتب کردہ اوستا بھی اسکندر کے حملہ کے وقت نذرِ آتش ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد، مدتوں تک ژند اوستا کا کہیں نام نہیں ملتا۔ ازاں بعد، جنابِ زرتشت کے اقوال کے کچھ حصے، جو نسک کے نام سے مشہور تھے۔ پہلوی زبان میں ترجمہ شدہ پائے گئے۔ موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ ترجمہ قطعاً مستند نہیں اور یہ بھی کہ جن نسک کا یہ ترجمہ ہے، ان میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو چکا تھا۔ ساسانیوں کے زمانہ میں ان متفرق یادداشتوں کو پھر سے یکجا کیا گیا۔ اور کافی کانٹ چھانٹ کے بعد ان کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا۔ اس مجموعہ کا کچھ حصہ

ضائع شد

[1] آگے بڑھنے سے پیشتر چند ورق پیچھے الٹ کر ذرا اس کونسل کی روئداد ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے جو شاہ قسطنطین نے عیسائی فرقوں کے اختلافات مٹانے کے لئے منعقد کی تھی۔ اور جس نے اناجیل اربعہ کا انتخاب کیا تھا۔ نیز اس واقعہ کی یاد بھی تازہ کر لیجئے کہ عزرا فقیہہ نے کس طرح تورات کو از سرِ نو مرتب کیا تھا۔ عزرا کو اسی بادشاہ (ارتخشتاہ) نے بابل سے یروشلم بھیجا تھا۔

پارسی اپنے ساتھ ہندوستان لائے جو اس وقت اوستا کے نام سے دنیا کے سامنے ہے اس میں ایک حصہ لینا کہلاتا ہے جو ۷۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں قربانیوں کی رسومات اور دعائیں درج ہیں۔ اس میں سے ۲۸ سے ۵۴ ابواب تک جناب زرتشت کی طرف منسوب ہیں۔ یہ ان کی پانچ گتھائیں کہلاتی ہیں (Introduction to The History of Science) دوسرا حصہ وندیداد کہلاتا ہے جس میں دیوؤں اور بھوتوں سے محفوظ رہنے کے منتر ہیں۔ اور پارسیوں کے خدا اہرمزد اور جناب زرتشت کا مکالمہ ہے۔ تیسرے حصے ویسپرڈ میں بھی یسنا کی طرح دعائیں ہیں۔ چوتھا حصہ یشت ہے جس میں متعدد خداؤں اور مردہ روحوں سے استمداد کی دعائیں درج ہیں۔

ژنداوستا کے علاوہ، ان کے ہاں سب سے زیادہ مشہور مجموعۂ کتب دساتیر ہے۔ اس میں پندرہ مختلف اشخاص کے چھوٹے چھوٹے نامے ہیں۔ مثلاً نامۂ مہ آباد وخشور[۱]۔ نامۂ زرتشت وخشور۔ نامۂ منوچہر۔ نامۂ کیخسرو۔ ان ناموں کا ساسان پنجم نے خسرو پرویز کے عہد میں دری زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ نامے حقائق و بصائر اور خرافات و اباطیل کے عجیب و غریب مجموعے ہیں۔ مثلاً ان کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم کی طرح "بنام ایزد بخشایندہ بخشائش گر" اور تعوذ جیسی پاک تعلیم سے ہوتی ہے۔ لیکن آگے چل کر آگ اور ستاروں کی پرستش کا ذکر ملتا ہے۔

بایں ہمہ مذہب زرتشت کے ان کھنڈرات میں، کہیں کہیں مٹی اور کیچڑ سے ملوث، بعض جواہر ریزے ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس مذہب کی اصلی اور حقیقی تعلیم پاکیزہ تھی۔ اور اس کی موجودہ مسخ شدہ صورت اس کی اصلی تعلیم کبھی نہیں قرار دی جا سکتی۔ حیات بعد الممات کا عقیدہ۔ جنت اور دوزخ کا تصور۔ فرشتوں کی ہستی کا اعتراف۔ وحی کا اقرار۔ یہ تمام چیزیں (مسخ شدہ صورت میں) کہیں کہیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ یشت میں ہے:۔

تعلیم

> ہم زرتشت سپیتاما[۲] کی شریعت اور اس کے محافظ فرشتہ کی پرستش کرتے ہیں۔ جس کے دماغ میں سب سے پہلے نیک خیالات پیدا ہوئے۔ جس نے سب سے پہلے نیک باتیں زبان سے کہیں۔ جس نے سب سے پہلے نیک اعمال کئے۔ جو سب سے پہلا پجاری تھا۔ سب سے پہلا مجاہد۔ سب سے پہلا کاشتکار۔ سب سے پہلا نبی، یعنی جس پر سب سے پہلی وحی بھیجی گئی۔ وہ سب سے پہلا جس نے نوع انسانی کو (اس کی) فطرت، حقیقت (قوت)، بیان، سماعت، دولت۔ غرضیکہ وہ سب کچھ دیا جو مزدا نے پیدا کیا اور جس سے حقیقت کی زینت ہوتی ہے۔

---

[۱] وخشور کے معنی پیغمبر کے ہیں۔ نامۂ ساسان پنجم سے معلوم ہوتا ہے کہ مہ آباد سے مراد غالباً حضرت ابراہیمؑ ہیں کیونکہ اس میں مذکور ہے کہ مہ آباد نے کعبہ کو تعمیر کیا تھا۔ [۲] (Spitama) جناب زرتشت کا خاندانی نام تھا۔

وہ جس نے سب سے پہلے انسانوں اور دیوتاؤں میں چکر کو چلایا - وہ جس نے سب سے پہلے زندہ مخلوق کے تقدس کی حمد ستائش بیان کی۔ جس نے بت پرستی کو نیست و نابود کیا۔ جس نے اہرمزد سے متعلق زرتشی عقیدہ کا اقرار کیا۔ وہ عقیدہ جو شیطان کے مقابلہ میں زندہ خدا کا مذہب ہے۔ وہ جس کی وساطت سے اس وحی کی آواز سنائی دی جو یکسر پاک ہے۔ جو تمام کائنات کے لئے زندگی اور ہدایت ہے۔ اس کے علم اور کلام کی بدولت، روح مقدس کی پیدا کردہ تمام مخلوق مسرتوں کے نغمے گا رہی ہے۔

دیکھا آپ نے موتیوں کے ٹکڑے لیکن بعض مقامات پر کس طرح کثیف مٹی میں ملے ہوئے۔ لیکن اس تعلیم کی سب سے زیادہ مسخ شدہ صورت اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم اس میں ثنویت[1] کا عقیدہ دیکھتے ہیں۔ یہی عقیدہ اس مذہب کا نقطۂ ماسکہ اور مابہ الامتیاز ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اہرمزد، خیر کا مظہر اور نور کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہرمن شر کا پیکر اور تاریکی کا مالک ہے۔ یہ دو مستقل ہستیاں ہیں جن میں باہمی کشمکش جاری ہے۔ خیر اور شر کے متعلق دو مستقل سرچشموں کا تصور درحقیقت اس تخیل کی بنیاد ہے جس پر عیسائیت میں روح اور مادہ کے باہمی تضاد و تخالف کی عمارت قائم ہے۔ وہی عمارت جس نے ہندوستان میں آکر روح (آتما) کو برہما (اہرمزد) کا جزو اور مادہ (پراکرتی) کو مایا (سراب) یعنی فریب نگاہ بنا کر دکھایا۔ وہی جو پھر عجمی تصوف کے نقاب میں دین اور دنیا کی تفریق کا موجب بنا اور انہیں دو جداگانہ دوائر زندگی میں تقسیم کرنے کا باعث ہوا۔ اس مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ

> پاکیزہ روحوں کو اہرمن سے کسی قسم کا خوف نہیں۔ اہرمزد کا فیصلہ ہے کہ نیکی کو آخری فتح حاصل ہوگی جب زمین پر برائیاں عام چھا جائیں گی تو وہ اپنے پیغمبر بھیجے گا تاکہ وہ اپنے مظلوموں کی دادرسی کریں۔ اور انسانوں کو آسمانی روشنی دکھائیں۔ بالآخر تمام دنیا اہرمزد کی پرستش اختیار کرے گی۔ لوگ گوشت کھانا ترک کر دیں گے اور صرف دودھ اور پھلوں پر زندگی بسر کریں گے۔ پھر اس کے بعد صرف پانی پر زندہ رہیں گے۔ اس کے بعد وہ ایسے پیکر روحانیت بن جائیں گے جو کسی قسم کی غذا نہیں کھائیں گے۔ لیکن اس پر بھی زندہ رہیں گے۔

غور کیجئے! "مادہ کی کثافت" سے "روح کی لطافت" کی طرف کس قدر باریک اشارے ہیں۔ یہ وہی زندگی ہے، جو

---

[1] بعض محققین کا خیال ہے کہ ثنویت کے عقیدہ کا بانی ایران کا مانی تھا۔ جس نے تیسری صدی عیسوی میں دعویٰ نبوت کیا۔ اور مجوسیت اور عیسائیت اسی تعلیم سے متاثر ہوئیں۔ لیکن یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ مانی خود مجوسیت اور عیسائیت کی ثنویت سے متاثر ہوا۔ اور اس نے اس تعلیم کو عام کیا۔ یہ دوسرا خیال زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے (دیکھئے George Sarton کی تالیف Introduction to the History of Science, Volume I, p. 332)

عیسائیت میں رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ جو ہندوؤں میں یوگ اور سنیاس کے بہروپ میں آئی۔ اور پھر جب عجمی تصوف ایران کے آتشکدوں سے مسلمانوں کی خانقاہوں اور زاویوں میں پہنچا تو وہاں ترکِ دنیا اور ترکِ علائق کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

٭

مجوسی مذہب میں جناب زرتشت بلکہ اہرمزد سے بھی زیادہ ایک اور ہستی کو اہمیت حاصل ہے۔ جسے مترا یا مِقرا (Mithra) کہا جاتا ہے۔ اسے اہرمن و یزداں کی درمیانی کڑی اور انسان اور خدا کے درمیان واسطہ سمجھا جاتا ہے۔

مترا

مترا کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی نجات کے لئے دنیا میں آیا۔ دنیا والوں نے اسے سخت اذیتیں پہنچائیں اور بالآخر اس نے اپنی جان دے کر انسانی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اور تیسرے دن اپنی قبر سے زندہ جی اٹھا[1]۔ مترا کی خارق عادت پیدائش کا دن ۲۵ر دسمبر قرار دیا جاتا ہے۔ اور مر کر جی اٹھنے کا دن، ۲۵ر مارچ۔ ایران کے بعد مترا کی پرستش، ہندوستان، بابل، مصر اور دوسرے علاقوں تک بھی پھیل گئی۔ مترا کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ آخری زمانہ میں پھر دنیا میں آئے گا، اور اس کے ہاتھوں بالآخر حق کی فتح اور باطل کی مکمل شکست ہوگی، زرتشتی عقیدہ کے مطابق، خدا کا یہ فرستادہ، دنیا میں نیکی کی حکومت قائم کریگا اور اوستا کا وہ حصہ بھی اپنے ساتھ لائے گا جو اس وقت تک انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ مترا کی پرستش کی طرح، یہ دوبارہ آنے والے کا عقیدہ بھی رفتہ رفتہ عام ہو گیا۔ ڈاکٹر چارلس بگ (Charles Bigg) اپنے مجموعۂ خطبات (The Christian Platonists of Alexandria) میں لکھتا ہے۔

> مترا قدیم دنیا کی آرین نسل اقوام کا خدا تھا۔ ویدوں میں اسے نور و صداقت دینے والا قرار دیا گیا ہے۔ پلوٹارک کا بیان ہے کہ وہ اہرمزد اور اہرمن کے درمیان واسطہ ہے۔ یا یوں کہو کہ انسان اور خدا کے درمیان وسیلہ۔ وہ سورج ہے جو اس دنیا میں انسان کی خاطر، تاریکی اور سردی کے خلاف اپنی شعاعوں کے تیروں سے مصروفِ پیکار ہے۔ اس لئے غاروں میں اس کی پرستش ہوتی تھی .... یہ عقیدہ بھی تھا کہ آخر الامر دنیا میں ایک نجات دہندہ، مقدس زرتشت آئے گا۔ وہ خیر و شر کی جنگ کا خاتمہ کرے گا۔ موت اور جہنم کو فنا کر دیگا اور اس کے بعد انسان، ابدی مسرتوں کی دنیا میں رہے گا .... مترا کے معتقدین، توسل اور شفاعت، کفارہ اور ایک نجات دہندہ پر ایمان رکھتے تھے۔

---

[1] دیکھئے Dupu's Origin of Religious Beliefs

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ مذہب مجوس (یا مترا ئیت کے مسلک) میں ایک آنے والے کا عقیدہ بنیادی اور اساسی حیثیت لئے ہوئے تھا۔ یہ عقیدہ کچھ اس طرح پھیلا کہ مصر، یونان، ہندوستان، روم (یہودیت، عیسائیت ہندو مت) غرضیکہ ہر مذہب کا جزو بن گیا۔ یہودی اس وقت تک ایک آنے والے

آنے والے کا عقیدہ

کے انتظار میں نگاہیں آسمان کی طرف لگائے بیٹھے ہیں۔ عیسائی تو اعداد و شمار سے اس آنے والے کی آمد کا سال تک بھی متعین کر دیتے ہیں (اگرچہ وہ کئی بار غلط ثابت ہو چکا ہے) چنانچہ ۱۷۴۲ء میں جرمنی کے ایک پادری بنجل (Bengel) نے حساب لگا کر بتایا کہ مکاشفات یوحنا کی رو سے اس آنے والے کی آمد کا زمانہ ۱۸۳۶ء کا موسم گرما ہوگا۔ چنانچہ جب یہ زمانہ قریب آنے لگا تو دنیائے کلیسا میں بڑی ہلچل مچی۔ واشنگٹن کے پادری ولیم ملر نے اس کے متعلق لکچر دینے شروع کر دیئے۔ ۱۸۳۳ء میں اس سلسلے میں متعدد مقالے شائع کئے گئے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا کہ ۱۸۳۶ء آپہنچا۔ لیکن آنے والا نہ آیا۔ اس وقت حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ بنجل کو غلطی لگ گئی درحقیقت یہ واقعہ اپریل ۱۸۴۳ء میں ظہور پذیر ہوگا۔ پھر اس زمانہ کو ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۷ء اور اس کے بعد دو دو چار چار برس کر کے ۱۸۶۱ء تک کھینچا۔ لیکن اس کے بعد یہ سمجھ لیا گیا کہ کہیں حساب میں بہت بڑی غلطی لگ رہی ہے۔ چنانچہ اب پھر کوئی زمانہ متعین نہیں کیا گیا۔ لیکن انتظار بدستور باقی ہے۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وشنو (جو تین خداؤں میں سے ایک ہے) نو مرتبہ اوتار کی صورت میں مختلف پیکروں میں دنیا میں آچکا ہے۔ آخری مرتبہ وہ بدھ کی شکل میں آیا تھا۔ لیکن ابھی اسے ایک مرتبہ اور بھی دنیا میں آنا ہے۔ یہ اس وقت ہوگا جب دنیا سے ویدوں کی تعلیم اور شاستروں پر عمل اٹھ جائے گا۔ اور دنیا کا خاتمہ قریب آجائے گا۔ اس وقت وشنو آخری اوتار کی شکل میں آئے گا۔ وہ تمام چوروں اور ڈاکوؤں کا خاتمہ کر دے گا۔ اور جس جس من میں پاپ ہوگا اسے فنا کے گھاٹ اتار دے گا (لیکن بدھ مت والے، اس سے الگ خود اپنے ہاں ایک آنے والے میتیا کے منتظر ہیں)۔

ان تمام عقائد کا سرچشمہ مجوسیت ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اسے غالباً ویاس جی لائے۔ باقی رہے یہودی اور عیسائی یا یونانی اور رومی۔ سو میکس مُلر (Max Muller) کے بیان کے مطابق ژند اوستا کا یونانی ترجمہ۔ تیسری صدی ق۔م کے قریب۔ اسکندریہ کی لائبریری میں پہنچ چکا تھا[۲]۔ اور یہی وہ لائبریری تھی جو ان خیالات

---

[۱] مختلف انبیائے کرام نے جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ جس آنے والے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ چودہ سو سال ہوئے آیا رحمت بن کر آیا۔ اور دنیا کو خدا کا آخری پیغام دے کر چلا بھی گیا۔ لیکن یہ لوگ ابھی تک ایک آنے والے کے انتظار میں ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ حیرت خود مسلمانوں پر ہے کہ یہ بھی ان کی دیکھا دیکھی ایک آنے والے کے منتظر ہیں۔ (تفصیل اسی جلد کے آخر عنوان "ختم نبوت" میں دیکھئے۔)

[۲] دیکھئے Chips from a German Workshop, Vol: I

ومتعقدات کی نشر وترویج کا عام ذریعہ تھی۔ عیسائیوں نے اپنے پورے مذہب کی عمارت اسی لائبریری کے مسالہ سے تیار کی۔ اور پھر اس خیال سے کہ ان کے مذہبی عقائد کے ماخذ کا سراغ نہ مل سکے اس لائبریری کو نذر آتش کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ وہ عظیم الشان لائبریری جو

اسکندریہ کی لائبریری

بطلیموس فلا ڈلفس کے عہد (تیسری۔ ق۔ م) میں دو لاکھ کتابوں پر مشتمل تھی۔ ان کتابوں کی تعداد ۴۸ء ق۔ م میں سات لاکھ تک جا پہنچی تھی جب جولیس سیزر (Julius Caesar) نے اسے پہلی مرتبہ آگ لگائی۔ لیکن اس کے بعد قلوپطرہ نے اس گم گشتہ متاع گراں بہا کی بازیابی کی کوشش کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کتابوں کی تعداد چار لاکھ تک پہنچا دی لیکن ۳۹۰ء کے قریب، مقدس راہبوں کے ہاتھوں نے اسے اس طرح شعلوں کی نذر کر دیا کہ اس کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ یہی وہ شعلے ہیں جن کا الزام، بعض متعصب مستشرق، مسلمانوں کے سر تھوپنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ خود ان ہی کی یہ تحقیق ہے کہ

> ۳۹۱ء کے قریب، عیسائی مذہبی دیوانوں کی ایک جماعت نے۔ آرک بشپ تھیوفلس کی سرکردگی میں بے پناہ یورش کر کے مندر کو مسمار اور لائبریری کو تباہ کر دیا۔ اس لائبریری کی تباہی ان کے ہاتھوں سے ہوئی تھی نہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے جب انہوں نے حضرت عمرؓ کے عہد میں اسکندریہ کو فتح کیا ہے۔

(The Library of Useful Knowledge
Article :- Alexandria Library)
نیز دیکھئے (Sarton) کی کتاب (Introduction
to the History of Science, p. 466)

یہ ہے مختصر سی کیفیت مذہب زرتشت اور اس کی مقدس کتابوں کی۔ وہ مذہب جس کے آغاز اور حقیقی تعلیم کے متعلق تاریخ بالکل خاموش ہے لیکن جس کی مسخ شدہ تعلیم نے دنیا کے قریب قریب تمام بڑے بڑے مذاہب کو متاثر کر دیا اور ان مذاہب کو بھی کچھ کا کچھ بنا دیا۔ آج پارسیوں کو اس مذہب سے اتنا ساہی تعلق رہ گیا ہے کہ وہ آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ گائے کے پیشاب کو مقدس سمجھتے ہیں، جسے ان کے ہاں نرنگ کہا جاتا ہے۔ اور شراب کو جائز کہ اس سے "نیک و بد کی تمیز" ہو جاتی ہے۔ (بحوالہ کپاڈیا صفحہ)

نگۂ بازگشت

مذہب زرتشت کے متعلق جو کچھ ہمارے سامنے آیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

(۱) ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ جناب زرتشت کس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مختلف تاریخی تحقیقات کے مطابق آپ کا زمانہ چھ سو قبل مسیح سے لیکر چھ ہزار قبل مسیح تک قرار دیا جا سکتا ہے

(۲) اوستا اس مذہب کی مذہبی کتاب ہے جو ژند زبان میں تھی۔ یہ زبان پہلوی زبان سے پہلے فارس میں رائج تھی۔ لیکن آج کل اس کا شمار مردہ زبانوں میں ہے۔ ژند زبان میں اوستا کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

(۳) پانچویں صدی ق۔م میں اس مذہب کے مختلف فرقوں کے پاس اوستا کے مختلف نسخے تھے۔ ارتخششاہ رشاہ ایران نے ایک عظیم الشان مجلس منعقد کی تاکہ اوستا کا ایک مستند نسخہ مرتب کیا جائے۔ ایک نوجوان مغ نے، آتشیں شراب کے اثر کے ماتحت آسمانوں کی سیر کی اور اس طرح اوستا کا نسخہ مرتب کر دیا جسے مقدس سمجھ لیا گیا

(۴) یہ نسخہ اسکندر کے حملہ کے وقت ضائع ہو گیا۔

(۵) اس کے بعد جناب زرتشت کے متفرق اقوال جمع کئے گئے۔ مرور زمانہ سے ان میں بھی بیحد تغیر و تبدل واقع ہو گیا۔ ساسانیوں کے عہد میں ان متفرق یادداشتوں کو یکجا مرتب کیا گیا۔ اسی کا ایک حصہ پارسی اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے۔ اب یہی اوستا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ وساتیر کا مجموعہ بھی مقدس سمجھا جاتا ہے جو متعدد اشخاص کے مناجات کا مجموعہ ہے۔

(۶) اس مذہب کی تعلیم میں کہیں کہیں صداقت کے جواہر پاروں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے لیکن کثیف مٹی میں ملے ہوئے اہرمن و یزداں کی ثنویت اور مترا کی پرستش اس کے بنیادی عقائد ہیں۔ اس کے علاوہ ایک آنے والے کا تصور نقطۂ ماسکہ۔ اس مذہب نے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کو اپنے عقائد و تصورات سے متاثر کیا ہے۔ لیکن اب پارسیوں کی آتش پرستی کے علاوہ اس میں کچھ اور باقی نہیں رہا۔

(۴) ہندومت

اب ہم اپنے سفر کے اس حصہ میں پہنچ رہے ہیں جہاں راستہ نہایت دشوار گذار اور مرحلہ بہت نازک ہے۔ دشوار گذار اس لئے کہ آج تک یہ تعین ہی نہیں کیا جا سکا کہ ہندو کہتے کسے ہیں اس لئے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ ہندومت ہے کیا؟ مذہبی عقائد کی رو سے ایک ہندو دوسرے ہندو سے اتنا مختلف ہو سکتا ہے جتنا ایک ہندو کسی غیر ہندو سے۔ ذرا آگے چل کر آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہندومت کن کن متضاد عناصر کے مجموعہ کا نام ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کی کورٹ کونسل اور سینٹ کے ممبر مسٹر گووندداس اپنی کتاب ہندوازم میں لکھتے ہیں:۔

اگرچہ سب سے پہلے اس امر کا متعین کر لینا نہایت ضروری ہے کہ ہندومت کسے کہتے ہیں اور اس کا آخذ کیا ہو لیکن جنہوں نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا جواب کس قدر مایوس کن ہے ہندو دھرم کی کوئی تعریف (Definition) ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس کے حدود ہی متعین نہیں یہ باب دراصل علم الانسان سے متعلق تھا جسے بدقسمتی سے مذہب کا نام دیدیا گیا۔ ویدوں سے شروع ہو کر اور چند ایک قبائل کے رسم ورواج کو اپنے آغوش میں لے کر یہ آگے بڑھا اور ایک برف کے گولے کی طرح مختلف زمانوں میں لڑھکتے لڑھکتے اپنے حجم میں بڑھتا چلا گیا اور جس جس قوم اور قبیلہ سے یہ متمسک ہوا اس کے رسوم اور تخیلات کو اپنے اندر جذب کرتا گیا۔ حتیٰ کہ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ مذہب محیط کل۔ ہمہ گیر۔ ہر ایک کو اپنے اندر جذب کر لینے والا۔ سب کچھ برداشت کر لینے والا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ مطمئن رکھنے والا۔ اور ہر ایک کے ارشاد کی تعمیل کرنے والا واقع ہوا ہے (صفحہ ۴۵)

ہندو کسے کہتے ہیں؟

اس کے بعد مسٹر گووندداس لکھتے ہیں کہ ہندو ہونے کے لئے:

(۱) ہندو گھرانے میں پیدا ہونے کی بھی شرط نہیں۔

(۲) بھارت ورش کے حدود کے اندر پیدائش کی بھی شرط نہیں۔

(۳) ویدوں پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ گیتا بڑی سختی سے ویدوں کی تکذیب کرتی ہے۔ چارواک بڑے شدومد سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں مسخروں اور چرب زبان رنگین طبع، لوگوں کی تصانیف قرار دیتے ہیں[۱]۔ جینی، سکھ اور کئی اور فرقے ان کی تردید کرتے ہیں، ہندومت ویدوں کی تصانیف سے بھی پہلے موجود تھا۔ اس کی فنا یا بقا ویدوں سے منسلک نہیں۔

---

[۱] ویدوں کے مصنفین کے متعلق ایسا کچھ لکھنے کی جرأت ایک ہندو مصنف ہی کر سکتا ہے۔ ہم نہیں کر سکتے۔

(۴) ذات، پات (یعنی ورنوں کی تقسیم) کا عقیدہ بھی ضروری نہیں

(۵) گائے کی تقدیس اور برہمنوں کی عظمت کا عقیدہ بھی ضروری نہیں۔ اچھوت گائے کا گوشت بلااعتراض کھاجاتے ہیں۔

(۶) خدا پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ ہندوؤں کے چھ قدیمی مذاہب فلسفہ میں سے یوگ کے سوا اور کوئی خدا کا قائل نہیں۔

(۷) سر کی چٹیا بھی ضروری نہیں

(۸) زنار کی بھی شرط نہیں۔

(۹) کھانے پینے میں حرام اور حلال کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ جو ایک کے نزدیک حلال ہے وہ دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔

(۱۰) کوئی رسم ورواج بھی ایسا نہیں جو لاینفک ہو۔

(۱۱) کرم (جزا و سزا) روح اور اوتاروں پر ایمان رکھنا بھی ضروری نہیں۔

(۱۲) "ہندو لاء" (ہندوؤں کے مروجہ قانون) کا اطلاق بھی ضروری نہیں۔ اس لئے کہ یہ قانون بھی متضاد عناصر کا مجموعہ ہے۔ جو ایک کے نزدیک نہایت ضروری ہے، وہ دوسرے کے ہاں یکسر غیر ضروری۔

(۱۳) نسل اور رنگ کا امتیاز بھی کوئی ضروری شرط نہیں۔

لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ ہر وہ شخص جو ہندو کہلانے سے انکار نہیں کرتا۔ یا یوں کہئے کہ جو اقرار کرتا ہے کہ وہ ہندو ہے۔ ہندو قرار دیا جاسکتا ہے۔ (ہندوازم ص۵۰ـ۵۷)

غور کیجئے کہ ایسے مذہب کے متعلق تاریخی چھان بین اور اس کے "مسلمات" کی تحقیق و تفتیش کس قدر مشکل ہے۔ یعنی جہاں یہی تعین نہیں ہوسکتا کہ ہندو ہونے کے لیے شرائط کیا ہیں وہاں ان شرائط کے اصل یا محرف ہونے کے متعلق کیا تحقیق کیا جاسکے؟ اس باب میں پنڈت جواہر لال نہرو اپنی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں۔

ہندومت کے دائرہ میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہاجاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے۔ اور اس میں بقا کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم ہندو فلسفی چاروک تھے) لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں۔ چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور

میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں (میری کہانی جلد اول صفحہ ۲)

حال ہی (سنہ ۱۹۴۶ء) میں پنڈت جی کی ایک کتاب (The Discovery of India) شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے ہندوازم کے متعلق مزید تفصیل سے لکھا ہے وہ اس باب میں رقمطراز ہیں۔

ہندوازم بہ حیثیت ایک عقیدہ کے بالکل مبہم، غیر متعین، بہت سے گوشوں والا واقع ہوا ہے۔ جس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کے مطابق بات مل جاتی ہے۔ اس کی تعریف (Definition) بتانا ممکن نہیں حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب بھی ہے یا نہیں یہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں اور گزشتہ زمانہ میں بھی بہت سے عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ بھی ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ بھی، باہم دگر مختلف حتیٰ کہ ایک دوسرے کے متضاد۔ اس کا لازمی عنصر غالباً جذبۂ رواداری ہے۔ مہاتما گاندھی نے کوشش کی ہے کہ اس کی تعریف (Definition) پیش کر سکیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر مجھ سے کہا جائے کہ ہندو مذہب کی تعریف بیان کرو تو میں صرف اتنا کہونگا کہ یہ عدم تشدد کے ذریعہ سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ایک شخص خواہ خدا کو بھی نہ مانے لیکن بایں ہمہ وہ ہندو کہلا سکتا ہے۔ ہندوازم نہایت شدت سے سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ہندوازم سچائی کا مذہب ہے۔ سچائی ہی خدا ہے۔ خدا کے انکار سے ہم واقف ہیں۔ لیکن سچائی سے انکار کہیں نہیں سنا گیا" گویا گاندھی جی کے الفاظ میں اہنسا اور سچائی یہ ہے ہندو مذہب لیکن بہت سے مشہور اور سچے ہندو یہ کہتے ہیں کہ اہنسا ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے۔ لہٰذا باقی صرف سچائی رہ گئی جسے ہم ہندو مذہب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو کوئی تعریف (Definition) نہیں (P.53)

گاندھی جی کی تصریحات پر غور کیجئے۔ یعنی ایک شخص خدا کا منکر ہوتے ہوئے بھی صداقت (Truth) کا متلاشی رہ سکتا ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا ہے کہ "صداقت ہی خدا ہے" معلوم نہیں کہ پھر "خدا کے انکار اور صداقت کی تلاش" سے ان کا مفہوم کیا ہے؟

میرے ایک دوست نے ہندو اکابر مثل بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈین اور مہاتما گاندھی کی خدمت میں استفسارات بھیجے کہ وہ اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالیں کہ کسی شخص کے ہندو ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں۔ لیکن ان کی طرف سے ان استفسارات کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس باب میں مہاتما گاندھی کے اخبار ہریجن (بابت ۱۳/۱۰ ۴۶) کے مقالہ افتتاحیہ کی ذیل کی سطور کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس میں لکھا ہے

ایک طویل عرصہ کے مصائب اور سخت تجربہ کے بعد، ہندوستان کے مذہبی فرقوں نے مذہبی رواداری کا جوہر بطور عادت عامہ پیدا کیا۔ اگر ہندوازم کی اصطلاح کا اطلاق۔ شومت۔ وشنومت، جین مت، بدھ مت۔ وحدانیت شرک حیوان پرستی حتیٰ کہ خدا سے انکار جیسے متضاد و متخالف مسالک پر کیا جا سکتا ہے تو ان سب میں قدر مشترک غالباً

یہی جذبۂ رواداری (Tolerance) ہے۔ ہریجن بابت ۱۵ ۲۶/۱۲

ہندو مت کے متعلق یہ چیز کچھ آج کی پیدا شدہ نہیں۔ خود منوجی کا قول ہے کہ "دھرم کی سچی اتباع اپنے آپ کو اپنے ماحول کے قالب میں ڈھال لینے کا نام ہے" (ہندوازم صفحہ ۵۹)۔ مسٹر گوونداس کی تحقیق کے مطابق تو ہندو کا لفظ بھی سنسکرت زبان کی کسی قدیم یا جدید کتاب میں نہیں ملتا۔ بلکہ اس کا سراغ پارسیوں کی ژند اوستا میں ملتا ہے (صفحہ ۲۲)۔ باقی رہا باہمی تضاد کا معاملہ، سو خود مہابھارت میں ہے کہ

> ویدوں کے احکام ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اسی طرح سمرتی کے احکام بھی، کوئی رشی ایسا نہیں جس کی تعلیم دوسرے رشی کی تعلیم کے مخالف نہ ہو (ہندوازم صفحہ ۶۲)

اس تضاد کے علاوہ ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کی تاریخ کہیں محفوظ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں)

تاریخ محفوظ نہیں

جس طرح ایک فرد کی انفرادیت کا انحصار اس کے حافظہ پر ہوتا ہے۔ اگر اس کا حافظہ ضائع ہو جائے تو اس کا احساس انفرادیت بھی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے انا کو کھو بیٹھتا ہے اسی طرح ایک قوم کی انفرادیت کا مدار اس کے قومی حافظہ۔ یعنی تاریخ پر ہوتا ہے۔ جس قوم کی تاریخ محفوظ نہیں رہتی اس کا قومی تشخص بھی باقی نہیں رہتا۔ اس دشواری کے متعلق (George Sarton) اپنی کتاب (Introduction to the History of Science) میں لکھتا ہے۔

> وقائع نگاری کے فقدان کی وجہ سے ہندو سائنس کا مطالعہ بہت دشوار ہو چکا ہے ..... ہندوؤں کی بیان کردہ تواریخ اسی صورت میں قابل یقین سمجھی جاسکتی ہیں جب ان کی توثیق غیر ہندی (یونانی۔ عربی۔ چینی) مورخ کریں۔ (صفحہ ۳۶)

لہ یعنی ہندوازم کی خصوصیت کبریٰ بلکہ اس کی اساس و بنیاد اس پر ہے کہ یہ متضاد سے متضاد عناصر کو بھی اپنا کر جذبۂ رواداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس قسم کی رواداری کے متعلق گبن لکھتا ہے:۔

> ایک رواداری فلاسفر کی ہے جس کے نزدیک سب مذاہب سچے ہیں۔ ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک سب مذاہب جھوٹے ہیں۔ ایک رواداری سیاسی مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب اس کی مطلب براری کے لئے یکساں مفید ہیں۔ ایک رواداری اس شخص کی ہے جو ہر قسم کے خیالات اور مشارب کو برداشت کر لیتا ہے محض اس لئے کہ وہ کسی مسلک و مشرب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ایک رواداری ایک کمزور انسان کی ہے جو محض اپنی کمزوری کی وجہ سے ان تمام حملوں کو برداشت کرتا ہے جو ان خیالات اور افراد پر کئے جاتے ہیں جو اسے محبوب ہیں۔

رواداری کے ان اقسام میں سے کوئی قسم بھی بقول علامہ اقبالؒ، اخلاقی قیمت نہیں رکھتی۔

مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ ۱۲۰۰ء سے پہلے کی ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کوئی قابل تذکرہ کتاب جس کو تاریخی کتاب کہا جاسکے ۔یا کوئی ایسی تصنیف جس سے اس ملک کے تاریخی حالات معلوم ہوسکیں - اس ملک کے باشندوں یعنی ہندوؤں نے نہیں لکھی" (مقدمہ تاریخ ہند قدیم صفحہ ۱۰) مشہور مؤرخ الفنسٹن (سابق گورنر صوبہ بمبئی) اپنی کتاب تاریخ ہند میں رقمطراز ہے:-

جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی کیسی ہی جاہل اور اکھڑ قوم کیوں نہ ہو اکثر اپنے آباؤ اجداد کے حالات کی کوئی نہ کوئی کتاب لکھی ہے تو اس بات پر کمال تعجب ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے پاس باوجودیکہ ان کی قوم نہایت عمدہ شائستگی اور تربیت کے درجے پر پہنچ گئی تھی کوئی کتاب تاریخ سے ملتی جلتی ہوئی بھی نہیں ہے ۔ہندوؤں کے حالات کی تحریروں میں سے جو کچھ موجود ہے وہ چھوٹی کہانیوں اور مبالغہ آمیز جھوٹے تاریخی واقعات سے اس طرح خلط ملط ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسلسل تاریخ نکلنے کی توقع نہیں ہوسکتی اور نہ کسی عام واقعے کی تاریخ سکندر کے یورش کرنے سے پہلے کی قائم ہوسکتی ہے اور نہ کوئی مسلسل بیان ہندوؤں کے حالات کا ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کرنے تک کا لکھا جاسکتا ہے۔

مشہور فرانسیسی عالم ڈاکٹر لیبان کا بیان ہے۔

ان ہزارہا جلدوں میں سے جو ہندوؤں نے اپنے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے ۔ اس زمانہ کے کسی واقعہ کو معین کرنے کے لئے ہمیں بالکل بیرونی چیزوں سے کام لینا پڑتا ہے ۔ ان کی تاریخی کتابوں میں یہ عجیب خاصیت (یعنی) ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی نہایت بیّن طور پر پائی جاتی ہے اور انسان کو اس خیال پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے ...... قدیم ہندوؤں کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے اور نہ عمارات اور یادگاروں سے اس کی تلافی ہوتی ہے .... ہندوستان کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا، اور ہندوستان کے پہلے مورخ مسلمان ہیں۔ (تمدن ہند صفحہ ۱۴۳-۱۴۷)

خود بھائی پرمانند صاحب کا ارشاد ہے

ہندوستان میں عام طور پر جو تاریخی کتابیں رایج ہیں ان کے تین حصے ہیں، زمانۂ قدیم جو کہ بالکل نامکمل ہے، بدقسمتی سے ہمارے بزرگوں کو اپنے حالات درستی سے قلمبند کرنے کا شوق نہ تھا۔ اور جو کچھ حالات لکھے ہوئے ملتے ہیں وہ شاعرانہ مبالغہ سے بھرے ہوئے ہیں جن کی امداد سے صحیح واقعات پر پہنچنا محال ہے۔ غالباً سوسائٹی کے اندر ایسی تبدیلیاں ہوئی ہی نہ ہوں گی جن کو قلمبند کرنے کا انہیں خیال آتا۔

(رسالہ زمانہ کانپور ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء ۔مضمون "تاریخ ہند کا مطالعہ)

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب (The Discovery of India) میں رقمطراز ہیں:-

اہل چین، اہل یونان اور عربوں کے خلاف، قدیم ہندوستان کے لوگ مؤرخ نہیں تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے اور اسی نے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ ہم گذشتہ عہد کے واقعات کا زمانہ یا تاریخ متعین کر سکیں۔ یہ واقعات کچھ اس طرح باہم گڈمڈ ہو رہے ہیں کہ ان سے عجیب خلفشار پیدا ہو جاتا ہے..... ہمارے ہاں صرف ایک کتاب (یعنی کلہان کی راج ترنگنی) ایسی ہے جسے ہم تاریخی کتاب کہہ سکتے۔ یہ کتاب کشمیر کی تاریخ ہے اور بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ باقی واقعات کے لئے ہمیں تصورات کی دنیا میں جانا پڑتا ہے.... یا پھر بیرونی مؤرخین، مثل اہل یونان، اہل چین اور عربوں کی شہادت پر...... مثال کے طور پر بکرمی سمت کو لیجئے۔ یہ ۵۷ ق۔م سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے ادھر ادھر ہمیں تاریخ میں کسی بکرماجیت کا اتا پتا نہیں ملتا۔ ایک بکرماجیت چوتھی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ لیکن یہ چوتھی صدی عیسوی کا بکرماجیت اس سمت کا موجد کیسے ہو سکتا ہے۔ جو ۵۷ ق۔م سے شروع ہوتا ہے۔ اس بکرماجیت کو اس سمت سے متعلق ثابت کرنے کے لئے ہمارے پڑھے لکھے طبقہ نے جس طرح تاریخ سے کھیل کھیلا ہے وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ یہی وکرم ہے جس نے باہر سے آنے والوں کے خلاف جنگ آزادی کو برپا کیا اور اس بات کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ ہندوستان اکھنڈ رہے اور ایک ہی قومی حکومت کے ماتحت ہو۔ حالانکہ وکرم کی سلطنت شمالی اور وسطی ہندوستان سے آگے نہیں تھی...... یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی (یعنی ہندو) اپنی قدیم روایات ہی کو تاریخ تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور اس پر کسی قسم کی ناقدانہ نگاہ نہیں ڈالتے۔ انہیں اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ طریق فکر اور نہایت آسانی سے نتائج تک پہنچ جانے کے مسلک کو بالآخر چھوڑنا پڑے گا۔ (صفحہ ۹۔۹)

زمانہ کا تعین

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ جس قوم کی تاریخ محفوظ نہ ہو اس کا قومی حافظہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جب حافظہ ضائع ہو جائے تو ظاہر ہے کہ کسی واقعہ کی نسبت بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب ظہور پذیر ہوا۔ چونکہ ہندو اپنے دھرم کی قدامت کے مدعی ہیں اس لئے وہ (شاید غیر شعوری طور پر) ہر واقعہ کو قدیم سے قدیم زمانہ کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لاکھوں برس کے اعداد و شمار سے ورے کسی چیز کو متعین ہی نہیں کرتے۔ مثلاً سوریا سدھانتا ہندوؤں کی علم ہیئت کی مشہور کتاب ہے (Sarton) کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب پانچویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے (سارٹن کی کتاب مذکور صفحہ ۳۸۶) اور پادری بنتلی صاحب اسے گیارھویں صدی عیسوی کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ لیکن۔ ہندو اس

کتاب کو اکیس لاکھ پینسٹھ ہزار سال کی تصنیف بتاتے ہیں (کلیات آریہ مسافر حصہ اول صفحہ ۱۱) ہندوؤں کے ہاں دنیا کو چار زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کی مدت حسب ذیل ہے۔

(۱) ست جگ	۱۷،۲۸،۰۰۰	سال
(۲) ترت جگ	۱۲،۹۶،۰۰۰	"
(۳) دواپارہ	۸،۶۴،۰۰۰	"

(۴) کال جگ موجودہ زمانہ۔ جس کے پانچ ہزار سال گذر چکے ہیں اور جس کی مدت ۴،۳۲،۰۰۰ سال کی ہے۔ (ملاحظہ ہو ہندو ازم صفحہ ۳۰)

جینیوں کے ہاں زمانہ کا شمار کس حساب سے ہوتا ہے۔ اس کے متعلق سوامی دیانند صاحب نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں عجیب و غریب معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق۔

ستر لاکھ سال × ایک کروڑ × چھپن ہزار × ایک کروڑ = ایک پورو

اسنکھیات پورو = پلیویم کال

دس کرور پلیویم کال دس کرور پلیویم کال = اُت سرپنی کال

اُت سرپنی کال + اُت سرپنی کال = کال چکر

مذکورہ بالا اعداد و شمار میں **اسنکھیات** کا مفہوم جب تک سمجھ میں نہ آجائے بات آگے نہیں چل سکتی۔ اس لئے اسنکھیات کے متعلق سوامی جی نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک چار کوس مربع اور اتنا ہی گہرا کنواں کھود کر اس کو ایسے بالوں کے ٹکڑوں سے بھر دیں جو آجکل کے آدمیوں کے بال سے چار ہزار چھیانوے حصہ پتلا ہو ان پتلے بالوں کے ایسے ایسے چھوٹے ٹکڑے کریں کہ ایک انگل میں چھپن ٹکڑے ہوں۔ ان ٹکڑوں سے اس کنوئیں کو اس طرح ٹھوس دبا کر بھریں کہ اس کے اوپر سے کل روئے زمین کے راجہ کا لشکر گذر جائے تب بھی نہ دبے۔ اب ان ٹکڑوں میں سے سو سو سال کے بعد ایک ایک ٹکڑا نکالیں۔ جب وہ کنواں خالی ہو جائے تب ایک پلیویم کال ہوتا ہے۔ اس سے اگلا حساب سمجھ لیجئے۔ (وید اور اس کی قدامت۔ مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم)

جب زمانہ کے تعین اور شمار کے متعلق ایسے ایسے معیار مقرر ہوں تو ظاہر ہے کہ واقعات و حوادث بھی ان ہی پیمانوں سے ماپے جائیں گے۔ چنانچہ مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار راجہ دسرتھ کے متعلق تحریر ہے کہ جب ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی ہوئی تو ان کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے (ہندو ازم صفحہ ۱۳۲) اسی طرح لکھا ہے کہ... مہارانی سیتا جی کی پہلی اولاد اس وقت ہوئی جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی تھی (ایضاً) اور یہ معلوم ہے کہ سیتا جی کا سوامبر پانچ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ جبکہ رام چندر جی کی عمر بارہ برس کی تھی۔ مہاراجہ رام چندر جی کی عمر کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب

سب کچھ ہو چکنے کے بعد سیتا جی زمین میں سما گئی ہیں تو اس واقعہ کے دس ہزار سال بعد تک رام چندر جی مہاراج برسر حکومت رہے (یہ سب کچھ رامائن کے بیان کے مطابق ہے) اسی طرح راجہ بھارت کی عمر (جس کی نسبت سے ہندوستان کو بھارت ورش کہا جاتا ہے) شاستر میں دس ہزار برس کی لکھی ہے۔

مرحلہ کی نزاکت

ان حالات کے پیش نظر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندو دھرم کے متعلق یقینی طور پر کسی نتیجہ پر پہنچنا کس قدر مشکل (بلکہ ناممکن) ہے۔ یہ تو تھی راستہ کی دشوار گذاری اب رہی مرحلہ کی نزاکت۔ سو بدبختی سے ہمارے ہاں آج کل سیاسی فضا کچھ ایسی مکدر ہو رہی ہے کہ اس میں مذہب کے متعلق ہلکی سے ہلکی علمی تنقید بھی بعض طبائع کی بدنہادی سے اشتعالی جذبات کا ذریعہ بنالی جا سکتی ہے۔ اور یہ امر جس قدر افسوسناک ہے ظاہر ہے۔ اس باب میں ہمارا مسلک بالکل واضح ہے جسے ہم عنوان زیر نظر کے شروع میں تمہیداً لکھ چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ اسے ایک نظر پھر سے دیکھ لیا جائے تاکہ اس حقیقت کی یاد از سر نو تازہ ہو جائے کہ اس قسم کی تنقید سے مقصود کسی مذہب کے بانی یا ان کی سچی تعلیم کی تضحیک و تذلیل ہرگز ہرگز نہیں اس چیز کا تو تصور بھی ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا۔ یہ ایک خالصتہً علمی بحث ہے جسے علم ہی کے دائرہ تک محدود سمجھا جائے۔

وید

اگرچہ، جیسا کہ مسٹر گوونددا‌س نے لکھا ہے۔ ہندو ہونے کے لئے ویدوں کا ماننا بھی ضروری نہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر ہندو دھرم کی بنیاد ویدوں پر قرار دی جاتی ہے اس لئے موضوع کی ابتداء ویدوں ہی سے کی جانی مناسب ہے۔ وید کے لفظی معنی ہیں علم۔ اگرچہ آجکل عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وید چار کتابوں کا نام ہے لیکن درحقیقت وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ داس گپتا۔ (پرنسپل سنسکرت کالج۔ کلکتہ) اپنی مشہور کتاب (A History of Indian Philosophy Vol: I)[1] میں لکھتے ہیں۔

ایک مبتدی جسے پہلے پہل سنسکرت لٹریچر سے متعارف کرایا جائے یہ دیکھ کر پریشانی سی محسوس کریگا کہ متضاد مطالب اور موضوعات پر مختلف مستند کتابیں ہیں لیکن ان سب کا نام وید یا سرتی (سنی سنائی باتیں) ہے۔ یہ اس لئے کہ وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا۔ چونکہ یہ لٹریچر مظہر ہے اس علمی تگ و تاز کے ماحصل کا جو

---

[1] یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت اہم ہے آئندہ اوراق میں اس کے اکثر اقتباسات سامنے آئیں گے۔ بنظر اختصار وہاں اسے صرف "داس گپتا" کے الفاظ سے متعارف کرایا جائے گا۔

ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف وجوانب میں اس قدر طویل عرصہ میں جمع کیا۔ اس لئے اسے لازماً متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۲")

یعنی قریب دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندوستان کے باشندوں نے مختلف علوم رسوم سے متعلق جو کچھ جمع کیا اس کا نام ہے وید۔ اس مجموعہ کو زمانہ، اسلوب بیان اور موضوع کے اعتبار سے چار اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سمہت (Samhita) یا گیتوں کا مجموعہ

(۲) برہمن۔

(۳) آرنیک (Aranyakas)

(۴) اُپ نشد

نثر و نظم کا یہ تمام مجموعہ زمانہ قدیم میں ایسا مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اسے ضبط تحریر میں لانا گناہ تصور کیا جاتا تھا اس لئے یہ روایۃً سینہ بسینہ برہمنوں کے ہاں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا نام شرتی (روایات سنی ہوئی باتیں) ہے۔ (داس گپتا۔ صفحہ ۱۲)

چار وید سمہت کے مجموعہ کے چار حصے ہیں اور ان ہی کو چار وید کہا جاتا ہے۔ یعنی رگوید۔ سام وید۔ یجروید اتھروید۔ عام طور پر رگوید کو سب سے پرانا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگرچہ پرانوں کی رو سے۔ سب سے پہلے یجروید تھا۔ اس کو توڑ پھوڑ کر چار وید بنا لئے گئے" (ہندوازم صفحہ ۹۳) سام وید کی اپنی حیثیت الگ نہیں ہے۔ اس میں ۷۵ اشلوکوں کے سوا سب کچھ رگوید سے اخذ کردہ ہے۔ یجروید میں بعض حصے رگوید کے ہیں اور بعض اپنے۔ البتہ اتھروید، رگوید سے مختلف ہے اور پروفیسر میکڈونل کی تحقیق کی رو سے "عہد کہن کے تصورات کا مظہر ہے" (History of Sanskrit Literature) شروع میں وید ایک ہی تھا جسے (کہا جاتا ہے کہ) رشی ویاسؒ جی نے چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب یہ وید بالکل ضائع ہو چکا تھا۔ لیکن ایک رشی نے اسے محفوظ رکھا اور اس نے پھر اسے آگے منتقل کیا۔ چنانچہ مہابھارت میں لکھا ہے۔

ایک مرتبہ ملک میں بارہ برس تک سخت قحط سالی رہی۔ تمام رشی ویش چھوڑ کر تلاش معاش میں کہیں دوسری جگہ چلے گئے۔ اور وید کو قطعاً بھلا بیٹھے۔ لیکن دریائے سرسوتی کا بیٹا رشی سرسوت اپنے دیس میں رہا اور ایک مچھلی پر گذارہ کرتا رہا جو اس کی ماں (دریائے سرسوتی) اسے روزانہ دیدیتی تھی اس نے وید یاد رکھا اور جب رشی واپس لوٹے تو انہیں دوبارہ یاد کرایا (ہندوازم صفحہ ۹۳)

لہ ان کے متعلق تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ان واقعات کو پھر سے سامنے لے آئیے۔ جن کی رو سے عزرا نبی نے تورات کو از سر نو مرتب کیا تھا اور اردا ویرف نے گم گشتہ ژند اوستا کو دوبارہ ترتیب دیا تھا۔

موجودہ وید

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ وید جسے رشی سرسوت نے از سر نو دوسرے رشیوں کو پڑھایا تھا اور جسے بعد میں رشی ویاس جی نے چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ کیا آج بجنسہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے متعلق مسٹر گوونداس لکھتے ہیں

ہم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کتابیں جو آج ہمارے پاس ہیں۔ ویاس کے مرتب کردہ نسخہ کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ روایات کی رو سے ویاس بھی کئی ہو گذرے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ویدوں کے کئی اور ترتیب دہندگان بہت لٹریچر جو آج ہمارے پاس ہے وہ تو اس مجموعہ کا پانچواں حصہ بھی نہیں جو آج سے قریب ۲۲۰۰ سال پیشتر مہابھاشئے کے زمانہ میں موجود تھا (ہندوازم صفہ ۸۹)

یہی صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر رگوید کی تدوین کے زمانہ میں ہی اصلی منتر (جنہیں رگوید میں علی الحساب اکٹھا کر کے رکھ دیا گیا تھا) کھو چکے تھے اور ان کی نقط نامکمل سی یاد ذہنوں میں باقی رہ گئی تھی۔ (ایضاً صفہ ۲۴۵)

تصنیف کا زمانہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بہت لٹریچر (یا ویدوں) کی تصنیف کا زمانہ کونسا ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت تک یقینی طور پر طے نہیں ہو سکا۔ اور اس کے متعلق جو کچھ تحقیق کیا گیا ہے قیاسات پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ہندوؤں کے ہاں آن کے عہد قدیم کی تاریخ محفوظ نہیں اور جب کسی قوم کی تاریخ محفوظ نہ ہو تو زمانہ گذشتہ میں اس کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کیا کہا جا سکتا ہے؟ بالخصوص جب اس کے ساتھ یہ جذبہ عقیدت بھی شامل ہو کہ کسی شے کی قدامت اس کی عظمت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مثلاً رامائن یا مہابھارت کے واقعات کے متعلق عام طور پر بتایا جائے گا کہ انہیں لاکھوں برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اخبار تیج دہلی کے کرشن نمبر مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۹ء میں سوامی انوبھوانند جی لکھتے ہیں۔

ہماری ہندو جاتی میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور متبرک ہستیاں دو ہوئی ہیں۔ ایک مہاراجہ رام چندر والئ اودھ اور دوسرے بھگوان کرشن والئ دوارکا..... ہندو تاریخ کے مطابق رام اور راون کی لڑائی کو آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال ہوئے ہیں۔

جب رامائن کے واقعہ کی قدامت کی یہ کیفیت ہے تو ویدوں کے متعلق ظاہر ہے کہ انہیں کس قدر قدیم قرار دیا جائیگا۔

چنانچہ ویدوں کے متعلق ہندوؤں کا مقدس عقیدہ یہ ہے کہ یہ زمانہ کی حدود سے ماوراء ہیں۔ یعنی ازلی ہیں۔ اس سے یہ عقیدہ بھی ان کے ہاں مروج ہے کہ سنسکرت زبان بھی ازلی اور قدیمی ہے۔ لہذا ویدوں کی تصنیف وتدوین کا زمانہ متعین کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آریا جن کے ہاں وید مروج تھے۔ کون لوگ تھے اور ان کی زبان کہاں سے آئی۔

آریہ

تاریخ ہند میں قیاسات کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ کسی ابتدائی زمانہ میں وسط ایشیا میں ایک قوم رہتی تھی جس کا ایک حصہ مشرق کی جانب بڑھا اور کوہ ہندوکش کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ انہوں نے یہاں کے اصل باشندوں کو مفتوح ومغلوب کیا اور گنگا اور جمنا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہوگئے۔ ان کا نام آریا تھا۔ سیامک (جسے ایرانی اپنا پیغمبر مانتے تھے) کا دوسرا نام پارسا تھا۔ اسی کے نام پر ایران کا نام پارس ہوا۔ سیامک کے بعد ہوشنگ کو پیغمبری ملی جس کا دوسرا نام ایران شاہ تھا۔ لہذا فارس کا دوسرا نام ایران مشہور ہوا اور اس ملک کے رہنے والے ایرانی یا ایرین یا آریا کے نام سے موسوم ہوئے۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ لفظ آریا مصدر آر سے نکلا ہے جس کے معنی کاشتکار کے ہیں۔ بہر حال لفظ آریا کی تحقیق کے متعلق خیالات مختلف ہوں تو ہوں لیکن یہ قیاس قریب قریب متفق علیہ ہے کہ یہ قوم وسط ایشیا سے نکل کر ان ہی راستوں سے ہندوستان آئی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھتے ہیں۔

ہند میں آنے والے آریوں کے اپنے وطن میں رہنے اور وہاں سے جنوب مشرق کی سمت سفر کرنے کا حال ویدوں کے بھجنوں سے بخوبی منکشف ہوتا ہے۔ پہلے بھجن کابل میں درہ خیبر کے شمال تک پہنچنے اور پچھلے دریائے گنگا تک وارد ہونے کی خبر دیتے ہیں۔

قدیم ایرانیوں اور ہندوستان کے ان آریوں میں زبان اور عقائد کے اعتبار سے اس قدر اشتراک پایا جاتا ہے کہ ان دونوں کے ایک ہونے (یا کم از کم کسی زمانہ میں اکٹھے رہنے) میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ قدیم فارسی زبان کی تین مختلف زبانوں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک ژند اوستا کی زبان۔ دوسرے پہلوی زبان جو ژند کے بعد مروج ہوئی۔ تیسرے دری زبان جو پہلوی کے بعد ساسانی عہد میں رائج ہوئی۔ جس قدر مشابہت ژند اوستا کی زبان اور دری زبان میں ہے۔ اسی قدر مشابہت ژند اوستا اور سنسکرت زبان میں ہے۔ چنانچہ بعض یورپی علمائے سنسکرت کا قول ہے کہ ویدک گیت کا ہر ایک مصرعہ اوستا کی زبان میں اور اوستا کا ہر ایک جملہ

---

[1] ایران میں قدیم زمانہ کے بعض ایسے کتبے ملے ہیں جن میں ایرانی بادشاہوں کے ساتھ آریا کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ مثلاً شاہ گشتاسپ کے نام کے ساتھ۔ اسی طرح قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے ایران کے کئی بادشاہوں کے نام کے ساتھ آریا کا لفظ لکھا ہے۔

ویدک زبان میں ذراسی تبدیلی سے مبدل ہو سکتا ہے" (مقدمہ تاریخ ہند قدیم - از شاہ اکبر خاں صاحب مرحوم)
حتیٰ کہ ژند کی زبان کی طرزِ نگارش یعنی حروف کی شکلیں اکثر سنسکرت کی صورتوں سے مشابہ ہیں - چنانچہ ایران میں
غیر معروف قدیمی مخروطی حروف میں لکھے ہوئے ایسے کتبے ملے ہیں جن کی زبان سنسکرت سے مشابہ اور ژند اوستا
کی زبان ہے - ادھر ہندوستان میں ایسے قدیمی سکے ملے ہیں جن پر قدیمی پہلوی حروف سے مشابہ حروف پائے
گئے ہیں جو داہنی جانب سے بائیں جانب کو لکھے گئے ہیں - آج بھی فارسی اور سنسکرت زبان میں سینکڑوں الفاظ ایسے
ملیں گے جو آپس میں پوری پوری مشابہت رکھتے ہیں - ان حقائق کے پیش نظر محققین کی یہی رائے ہے کہ سنسکرت زبان
قدیم فارسی زبان سے ہی بنی تھی - یا کم از کم یہ کہ دونوں کا ماخذ ایک ہے - (آریوں اور ڈراوڈیوں کے اصلی وطن -
ہندوستان کی طرف انتقال - ان کی زبان اور معاشرت وغیرہ کے متعلق تحقیقاتِ جدیدہ کا رخ جن اور گوشوں کی
سمت پلٹتا ہے اس کا اجمالی ذکر اسی عنوان کے اخیر میں کیا جائے گا -) اس اعتبار سے سنسکرت زبان کے
قدیمی اور ازلی ہونے کا عقیدہ بلا دلیل ہے - چنانچہ مسٹر گووندداس اس باب میں رقمطراز ہیں

یہ مقدس تعلیم کہ سنسکرت دیوبھاشا (یعنی دیوتاؤں کی زبان) ہے اور دنیا میں سب سے قدیم زبان ہے
چپکے سے مسترد کر دینی چاہیے کہ تاریخ اس دعوے کا کافی بطلان کر چکی ہے - (ہندوازم صفحہ ۱۴۶)

عقائد کا اشتراک

اب رہا عقائد کا اشتراک سو زرتشتی مذہب اور ویدوں کے عقائد کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی مذہب
کی دو مختلف شکلیں ہیں - قدیم آریا جب ایران (یا وسط ایشیا) سے ہندوستان کی طرف آئے تو ظاہر ہے کہ اپنے
رسوم و عقائد بھی ساتھ ہی لائے ہوں گے - جب ایران میں زرتشت کا ظہور ہوا تو وہاں کی قدیم آبادی مذہب میں
بھی تبدیلی ہو گئی - ہندوستان کے آریوں کے ایرانیوں کے ساتھ روابط قائم تھے - انہوں نے اس تبدیلی کو بدعت
قرار دیا اور اس کے خلاف احتجاج کیا - ایران کے شاہ گشتاسپ نے ہندوستان کے سب سے بڑے عالم سنگراچہ
یا سنگرانکاچہ کو کہلا بھیجا کہ تم خود آکر زرتشت سے ملو اور اپنے شکوک رفع کر لو - دبستانِ مذاہب میں - اوستا و ساتیر
اور سنگرانکاچہ نامہ کی تصریحات کے مطابق سنگرانکاچہ اور زرتشت کی ملاقات وغیرہ کا حال تفصیلاً لکھا ہے -
سنگرانکاچہ زرتشت کا معتقد ہو گیا اور اوستا کا ایک نسخہ لیکر ہندوستان آیا - یہاں آکر زرتشت کے مذہب کو
پھیلایا - چنانچہ ہزار آدمی اس کے مطیع ہو گئے - اور زرتشت کے نام پر ایک تہوار بھی منایا جانے لگا - سنگرانکاچہ کے

ویاس جی

مقابلہ میں یہاں ایک اور عالم ویاس جی تھے - انہوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو زرتشت سے مناظرہ کے لئے بلخ کا سفر اختیار کیا - زرتشت سے مناظرہ کے بعد ویاس جی بھی ان کے معتقد
ہو گئے اور ان کے مذہب کے مبلغ بن کر ہندوستان واپس آئے - یہاں پہنچ کر انہوں نے ان متفرق اشعار کو جو اس وقت

تک عام لوگوں میں منتشر تھے جمع کیا اور اپنے جدید مسلک کو ان میں شامل کرکے وید کو مرتب کیا۔ ویاس جی کے متعلق خود ہندوؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ وہ وید کے مرتب کرنے والے ہیں۔ اس پس منظر کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ ویدوں کے عقائد و رسوم اور زرتشتی مذہب میں اس قدر شباہت کیوں پائی جاتی ہے۔ مذہب زرتشت میں آگ کی پرستش ہوتی ہے۔ ویدوں کی رو سے بھی اگنی قابلِ پرستش دیوتا ہے۔ رگوید منڈل ۷ سوکت ۴ رچا ۶ میں ہے

اگنی امرت کا مالک ہے دولت کا مالک ہے، وہی مستحکم خاندان دینے والا ہے۔ اے خدائے باقوت ایسا نہ کر کہ ہم تیرے غلام بلا اولاد بلا خوبی اور بغیر چڑھاوے کے رہ جائیں۔ کیا ہم نیک اگنی کی نعمتوں سے گھرے ہوں گے؟ کیا ہمیں دائمی دولت ملے گی؟ او اگنی! ہم کسی غیر قوم سے نہیں نکلے ہیں۔ تو وہی راستہ لے جو تجھے ہمارے پاس پہنچائے۔ اگر صرف وہی خون نہ ہوتا جو ہم میں ہے تو پھر اگنی کو چڑھاوے کہاں سے ملتے اور کون اس کی پرستش کرتا۔ اے پورا حق اس مکان میں رہنے کا ہے جسے ہم نے اس کے لئے خاص کیا ہے آ ہمارے پاس اے قومی فتحمند اور پرستش کے لائق دیوتا۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ وید میں جو مفہوم منتر کا ہے وہی مفہوم اوستا میں منتھر کا ہے۔ اوستا میں جس چیز کو ہوما کہا گیا ہے اس کو وید میں سوما کہا گیا ہے۔ ژند اوستا میں متزا یا منتھر ایک بڑا قابلِ تعظیم "خدا" ہے (تفصیل اس کی پہلے گذر چکی ہے)، اس کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ اس کے ایک ہزار کان، دس ہزار آنکھیں ہیں، اور ہمیشہ بلا اونگھے خلقت کی عافیت کی نگرانی کرتا ہے"، رگوید منڈل ۳ سوکت ۵۹ میں اسی متزا کے متعلق لکھا ہے کہ "متزا قوموں پر ہمیشہ بلا آنکھ بند کئے نظر رکھتا ہے۔ متزا کے آگے گھی کے ساتھ نذر دلاؤ" ژند اوستا میں جس فرشتہ ارمین کا ذکر ہے اسے رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۳۶ میں ارمین دیوتا کہکر پکارا گیا ہے۔ ژند اوستا کے

ویداور زرتشتی تعلیم

مذہب میں سورج کی بڑی تعظیم ہے۔ اسی طرح رگوید میں سورج کو دیوتا قرار دیا گیا ہے وایو دیوتا۔ ژند اوستا اور رگوید دونوں میں موجود ہے۔ اوستا میں بھقرتی تا سب سے پہلے حکیم بیان کیا گیا ہے۔ رگوید اور اتھروید میں ترتیا کو بیماریوں کا اچھا کرنے والا دیوتا کہا گیا ہے۔ قربانی چڑھانے والوں کو ژند اوستا میں اتھروا اور ویدوں میں اتھروَن کہا گیا ہے۔ ان کے علاوہ قربانیوں کے طریقے اور عبادت کے وقت کی دعائیں پارسیوں کی کتابوں اور ویدوں میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ ہندو جس طرح ایک خاص عمر میں لڑکے کے گلے میں زنار کا تاگہ ڈالتے ہیں ایرانی بھی اسی طرح ڈالتے تھے۔ ژند کی زبان میں ہوم کے معنی آگ جلانا اور اس میں کچھ چیزیں ڈالنا ہے۔ اسی کو ہندو ہون کہتے ہیں۔ آتش پرستوں کے صبح شام کے گانے کے منتروں کو گاتھا کہتے ہیں۔ ہندو اس قسم کے منتروں کو گائتری کہتے ہیں۔ یہاں جس طرح موسم سرما کی آمد پر دوالی کا تیوہار

مناتے ہیں، ایران میں آتش پرست آتش سوزیا چراغاں کا تیوہار مناتے تھے- یہاں جو کچھ ہولی کے تیوہار پر ہوتا ہے وہی کچھ آتش پرستوں میں "کوسہ برنشین" تیوہار میں ہوتا تھا- یہاں بسنت کا تیوہار وہی ہے جو آتش پرستوں میں جشن گل کوبی" تھا- ہندو دھرم کی بنیاد ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم پر ہے- یہی تقسیم ایرانیوں میں موجود تھی اول برمان (زہاد و علماء) ان کو یہاں برہمن کہا جاتا ہے- دوم چتر منی (بادشاہ، یا پہلوان جن کے چتر- سائبان کی حفاظت میں زندگی بسر کی جائے) یہی یہاں کے چھتری ہیں- سوئم باس یا بیش (تاجر و کاشتکار) جنہیں یہاں ویش کہکر پکارا جاتا ہے، چہارم سودین یا سود (خدمت گار) یہ یہاں کے شودر ہیں- ان ہی چیزوں کے پیش نظر محققین اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

ویدصاف طور پر زرتشت کی تعلیم کے مبہین ہیں-

(Researches in Oriental History - p.131)

آریوں کے اصل مسکن، ان کے نقل مکانی، ایرانیوں اور آریوں کے باہمی روابط و ضوابط اور مذہب زرتشت اور ویدک دھرم کی مشابہت و مماثلت کے پیش نظر ویدوں کی، تصنیف و تدوین کے زمانہ کے تعین کے لئے کچھ

ویدوں کا زمانہ تصنیف

دھندلی سی تاریخی روشنی مل جاتی ہے. اگرچہ مسٹر بال گنگا دھر تلک ان کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۶۰۰۰ ق.م. اور مسٹر ہاگ (Haug) قریب سنہ ۲۴۰۰ ق.م قرار دیتے ہیں. لیکن پروفیسر میکس ملر (Max Muller) کی تحقیق کی رو سے ان کا زمانہ زیادہ سے زیادہ سنہ ۱۲۰۰ ق.م قرار دیا جاسکتا ہے- پروفیسر ملر ویدوں کے عہد کو چار حصوں پر تقسیم کرتے ہیں-

(۱) سوتر لٹریچر — سنہ ۲۰۰ سے سنہ ۶۰۰ ق.م تک

(۲) براہمن — سنہ ۶۰۰ سے سنہ ۸۰۰ ق.م تک

(۳) منتر — سنہ ۸۰۰ سے سنہ ۱۰۰۰ ق.م تک

(۴) چھند (رگوید کے آخری حصہ سمیت) — سنہ ۱۰۰۰ سے سنہ ۱۲۰۰ ق.م تک

(Cambridge History of India, Part I p.112)

ویدوں میں بالعموم رگوید کو سب سے قدیم قرار دیا جاتا ہے اس کے متعلق ڈاکٹر داس گپتا لکھتے ہیں

رگوید کے منتر نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں، نہ کسی ایک زمانہ کی- یہ منتر غالباً مختلف زمانوں میں مختلف رشیوں نے تصنیف کئے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں سے بعض منتر آریوں نے ہندوستان میں آنے سے پیشتر تصنیف کئے ہوں- یہ منتر تمام سینہ بسینہ چلے آتے تھے اور ہر زمانے کے

شاعران میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔ غالباً جب یہ مجموعہ بہت ضخیم ہوگیا تو اسے موجودہ شکل میں مدون کیا گیا۔ اس لئے ان میں درحقیقت آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ کی ترقی کے مختلف ادوار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور عہد قدیم کی اس سوسائٹی کے انداز و اطوار کا پتہ چلتا ہے جس نے انہیں تصنیف کیا۔ (صفحہ ۱۵)

کیسے تصنیف ہوئے

اس سے ظاہر ہے کہ وید دراصل کیا ہیں۔ اور ان کی تصنیف کس طرح ہوئی یعنی مختلف زمانوں میں مختلف شاعروں نے (جس قسم کے شاعر اس زمانہ قدیم میں ہوسکتے تھے) اپنے ماحول، معاشرہ، بود و باش، رسوم و روایات، قصص و حکایات کے متعلق جو کچھ نظم کیا وہ آریوں کی خانہ بدوشی کی زندگی اور بعد میں کاشتکاری کے زمانہ میں زبان زد خلائق تھا۔ (جس طرح قدیم زمانہ کے بعض منظوم قصے آج کل بھی دیہات میں مروج ہیں) بعد میں ویاس جی نے ان میں اپنے مسلک و خیالات کا اضافہ کرکے انہیں مدون کردیا۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں بعض تعلیم الہامی بھی ہو۔ لیکن نہ تو تاریخ اس کے متعلق کچھ بتا سکتی ہے اور نہ ہی جس مسخ شدہ صورت میں وہ آج ہمارے سامنے ہیں اس سے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کی شہادت خود ہندوؤں کی مقدس کتب مثل پوران سے ملتی ہے۔

> اس ایک وید میں متعدد بار تحریف ہوئی ہے۔۔۔ رشیوں کی نسلوں نے اس میں نگاہ کی خرابی اور دل کی لغزش کی وجہ سے بہت سی اختلافی چیزیں داخل کردیں۔ منتروں۔ برہمنوں اور کلپ سوتروں کے نسخ میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں اور رگ۔ یجر اور سام وید بار بار مدون ہوئے۔ پہلے یجر ایک ہی تھا۔ پھر اس کے دو حصے ہوگئے۔ اسی طرح دواپر زمانہ میں تینوں ویدوں میں خلفشار واقع ہوگیا۔
>
> (ستیا پوران بحوالہ ہندو دھرم صفحہ ۹)

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ وید کسی ایک زمانہ کی تصنیف نہیں بلکہ ایک عرصہ دراز پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا مجموعہ ہیں جو سینہ بسینہ چلا آتا تھا اس میں مرور زمانہ سے رد و بدل بھی ہوتا رہا اور حک و اضافہ بھی۔ ویاس جی کے زمانہ میں جو کچھ ان کے سامنے تھا اسے ایک جگہ مدون کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی اس میں برابر تحریف ہوتی رہی۔ چنانچہ مسٹر گووند داس اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> اس تمام بیان سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے (جسے اکثر اوقات دیدہ دانستہ نظر انداز کردیا جاتا ہے) کہ ہندو مت آہستہ آہستہ مختلف زمانوں میں اپنی خصوصیات کو ادلتا بدلتا رہا کسی خاص زمانہ کو منتخب کرکے اس مذہب اور اس کی رسوم کو سناتنی (ازلی) کہنا ایک مقدس فریب ہے۔ (ہندو دھرم صفحہ ۴۳)

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وید سینہ بسینہ آگے منتقل ہوتے چلے آرہے تھے تو پھر یہ ضبط تحریر میں کب آئے۔

وید کب تحریر میں آئے

اس لئے کہ وہی تحریر شدہ نسخہ جس سے یہ سلسلہ نقل و کتابت آگے بڑھا قابل اعتماد سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً آج ویدوں کا ایک مطبوعہ نسخہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس سے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کس نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹایا جائے تو بالآخر کسی ایک نسخہ تک پہنچنا پڑے گا جس سے یہ سلسلہ آگے بڑھا تھا۔ لیکن یہاں بھی وہی مشکل ہے جو ویدوں کی زبان کے مسئلہ میں لاحق ہو رہی تھی۔ یعنی زبانِ تاریخ اس کے متعلق بھی خاموش ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ مستند نسخہ جس سے یہ سلسلہ آگے بڑھا کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے ساتھ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہندوستان میں تحریر کا رواج کب سے شروع ہوا۔ پروفیسر میکس ملر (جو سنسکرت زبان کا مشہور عالم اور محقق گذرا ہے) کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان کے مشہور جغرافیہ نویس پانینی کے زمانہ تک اس ملک میں کوئی شخص فن تحریر سے واقف نہ تھا۔ پانینی کا زمانہ اس مستشرق نے ۳۵۰ ق۔م مانا ہے۔ لیکن ڈاکٹر بوہلر نے پانینی کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح قرار دیا[1] ہے۔ ڈاکٹر ڈیوڈس نے اپنی کتاب (Budhist-India) میں لکھا ہے کہ دراوڑی تاجر قریب سات آٹھ سو سال۔ ق۔م میں عراق عرب سے سامی حروف لائے اور ان ہی حروف کی مدد سے یہاں فن تحریر کی ابتدا ہوئی۔ لیکن مذہبی کتابوں کی تحریر کا رواج بدھوں کے عہد حکومت سے پہلے نہیں ہوا۔ ادھر اگر ویاس جی کو ویدوں کا مرتب تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ سب سے پہلے ویدوں کو حیطۂ تحریر میں لائے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔ پارسیوں کے وساتیر سے ویاس جی کے زرتشت کے پاس جانے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وید سب سے پہلے قریب چھ سو سال ق۔م میں تحریر میں لائے گئے (کیونکہ یہی زمانہ جناب زرتشت کا قرار پاسکتا ہے) لیکن ویدوں کو لکھنے کا عام رواج اس زمانہ میں نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ البیرونی (جو ابھی کل ہندوستان میں آیا ہے) نے اپنی کتاب الہند میں لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں بھی ویدوں کو ضبط تحریر میں لانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اور اس کے ہندوستان میں آنے سے کچھ عرصہ پہلے (۱۰۰۰ء) میں ایک کشمیری پنڈت نے ویدوں کو کتابی صورت میں لکھا تھا۔ لیکن آج اس نسخہ کا بھی کسی کو علم نہیں کہ کیا ہوا۔ بہرحال اس امر کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ویدوں کا سب سے پرانا نسخہ کونسا ہے اور وہ کہاں ہے؟

---

[1] مسٹر گوونداس لکھتے ہیں کہ "اس امر کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی کہ ۳۵۰ ق۔م سے پیشتر ہندوستان میں تحریر کا رواج تھا"

(ہندوازم صفحہ ۱۵۳)

ویدوں کے مصنف کون تھے؟

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ویدوں کو تصنیف کس نے کیا؟ ظاہر ہے کہ جب تاریخ کی رو سے ویدوں کی تصنیف کا زمانہ ہی متعین نہیں ہو سکتا تو ان کے مصنفین کی تعیین کس طرح ہو سکتی ہے! لیکن خود ویدوں میں جن مصنفین کے نام موجود ہیں ان ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہیں۔ ویدوں کا انداز یہ ہے کہ ہر ایک منتر کا کوئی نہ کوئی رشی اور کوئی نہ کوئی دیوتا ہوتا ہے۔ متکلم کا نام رشی ہوتا ہے اور مخاطب یا موضوع سخن کا نام دیوتا۔ یہی رشی ان وید منتروں کے مصنف سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ وید منتروں میں ان رشیوں کے نام موجود ہیں۔ مثلاً رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۲۳ منتر ۱۷ میں رشی کا نام پلت کا بیٹا گئے لکھا ہے۔ رگوید منڈل ۳ سوکت ۳۳ منتر ۵ کا رشی کشک کا بیٹا وشوامتر ہے جو منتر کو اس طرح شروع کرتا ہے "میں وشوامتر جو کشک کا بیٹا ہوں" رگوید منڈل ۱ سوکت ۱۷۹ منتر ۴ کی مصنفہ کا نام لوپامدرا ہے جو اپنا حال یوں بیان کرتی ہے۔

بدنامی برہمچاری رشی نے کہیں سے اچانک آکر مجھ سے ... زبردستی کی۔ لوپامدرا سسکیاں لیکر روتی ہوئی فریاد کرتی ہے۔

رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵ کی رشی (مصنفہ) سوریا ساوتری ہے جو اس سوکت میں اپنی شادی کا حال لکھتی ہے رگوید منڈل ۸۔ سوکت ۱۹ منتر ۳۶ کا رشی سوبھری کنو لکھتا ہے

پردکتس کے بیٹے ترسدسیو راجہ نے مجھ رشی کو سواستو ندی کے تیرتھ پر پچاس رانیاں اور ۲۱۰ کالے رنگ کی گائیں خیرات دیں۔

اسی طرح تمام ویدوں میں رشیوں کے نام اکثر و بیشتر منتروں میں درج ہیں۔ یہ تو رہے انسان رشی۔ اس سے آگے بڑھئے تو رگوید منڈل ۸ سوکت ۶۷ منتر ۵ میں جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں اپنا حال بیان کرتی ہیں۔ اور اپنی رہائی کے لئے آدیتہ دیوتا کو مدد کے لئے بلاتی ہیں۔ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۰۸ منتر ۲—۱۱ کی رشی، دیوتاؤں کی کتیا سرما نامی ہے۔ جسے اندر دیوتا نے برہسپتی کی مسروقہ گایوں کا کھوج نکالنے کے لئے اسروں کے پاس بھیجا تھا۔ دوسری جگہ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۴ منتر ۱۰—۱۱ میں) اس کتیا کے پلوں کا حال یوں لکھا ہے۔

اے سرما کے دو پلو۔ چار چار آنکھوں والو اچھے راستے سے یہاں آؤ جو تیرے یم کے محافظ چار آنکھوں والے دو کتے ہیں۔

کسی جگہ وید منتروں کا رشی کبوتر ہے (رگوید منڈل ۱۰۔ سوکت ۱۶۵ منتر ۱)۔ اتھروید کانڈ ۱۲ سوکت ۴ منتر ۱ کا رشی نیل کنٹھ ہے۔

عجیب و غریب رشی

سام وید میں ایک رشی توشٹا کا بیٹا تین سروں والا لکھا ہے۔ شت پتھ براہمن میں (جسے ویدوں کی الہامی تفسیر مانا جاتا ہے)

اس کا حال یوں درج ہے۔

"اس کے تین سر اور چھ آنکھیں تھیں ایک منہ سوم پیتا تھا۔ دوسرا شراب پیتا تھا اور تیسرا اناج کھاتا تھا۔۔ اس سے اِندر نے لڑائی کی اور اس کے تینوں سروں کو کاٹ ڈالا۔ وہ جو سوم رس پینے والا منہ تھا اس سے کوا پیدا ہوا اور جو شراب پینے والا منہ تھا اس سے کال کلیچی پیدا ہوئی۔۔۔ اور جو کھانا کھانے کے لئے منہ تھا اس سے تیتر پیدا ہو۔

رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۹۴ کا رشی کدرو کا بیٹا اربد نامی سانپ[۱] لکھا ہے۔ حتیٰ کہ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۳۴ کا رشی جوئے کا پاسہ لکھا ہے۔ چنانچہ مہامنی یاسک اچاریہ جی مہاراج نیرانگ نرکت (۹ — ۸۱) میں لکھتے ہیں کہ

"یہ منتر یا سوکت اُلٹے پڑے ہوئے جوئے کے پانسے کا کلام ہے"

رگوید منڈل ۳ سوکت ۳۳ منتر ۴-۶ ؛ ۸-۱۰ کے رشی ستلج اور بیاس دریا لکھے ہیں جو وشوامتر سے باتیں کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ وید منتر مختلف لوگوں کی تصنیف ہیں۔ اور ان میں انسانوں کے علاوہ پرندوں جانوروں۔ درختوں۔ پہاڑوں۔ دریاؤں کی زبان سے بھی بہت سی باتیں درج ہیں۔ اس الجھاوے کے پیش نظر ویدوں کے ہندو عالم حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ انہیں الہامی (یا خدا کا کلام) کیسے مانا جاوے۔ چنانچہ گوروکل مہاودیالہ جوالاپور کے سکھیہ پنڈت نردیو شاستری وید تیرتھ اپنی تصنیف رگوید آلوچن صفحہ ۱۱۶ پر لکھتے ہیں

کئی سوکتوں میں امک (فلاں) کے پتر امک (فلاں) نے اس سونتر (سوکت) کو رچا بنایا۔ ایسا سپشٹ (صریح) لیکھ (لکھا) ہے۔

جس کے پیش نظر وہ صفحہ ۱۹۷ پر لکھتے ہیں کہ

جب ہم برہم وادی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے) کی درشٹی (نقطۂ نگاہ) سے ارتھ (غور) کرنے لگتے ہیں اب کہیں کہیں منتروں میں ایک کٹھنتا (مشکل) آپڑتی ہے وہ یہ کہ کہیں کہیں منتر درشٹا رشی (منتر بنانے والے رشی) کا نام ہی منتر میں مل جاتا ہے۔ تب سندیہہ (شبہ) ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے؟

---

[۱] "انسان کا بیٹا سانپ" وجہ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش (ص ۲۱۹) پر اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔ بھاگوت میں لکھا ہے کہ اونی کے بطن سے آدتیہ۔ دنتا کے بطن سے پرندے۔ کدرو کے بطن سے سانپ۔ سرما کے بطن سے کتے۔ گیدڑ وغیرہ اور دیگر عورتوں کے بطن سے ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ۔ گدھے بھینسے۔ گھاس پھوس اور ببول وغیرہ کے درخت کانٹوں سمیت پیدا ہوئے۔

وید الہامی کتاب نہیں

ان ہی اشکال کی بنا پر ہندوؤں کے بڑے بڑے ودوان (علماء) اس اعتراف پر مجبور ہوگئے کہ وید الہامی نہیں ہیں چنانچہ ویدوں کے عالم اور براہمن گرنتھوں کے مترجم پنڈت ستیہ ورت سام شری اپنی کتاب تری پراچے (صفحہ ۴۲) پر تسلیم کرتے ہیں کہ

ایسے ہی بلا شک و شبہ یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں ہی نے ویدوں کو تصنیف کیا تھا۔

اسی طرح پنڈت نردیو شاستری (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) اپنی کتاب رگوید آلوچن کی بھومکا (تمہید) میں مسٹر تلک کے متعلق لکھتے ہیں کہ

تلک بھی برہم واوی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے کے عقیدہ) کا کھنڈن (تردید) کرتے ہیں۔ !

یہی پنڈت جی اپنے گرو پنڈت سام شری کے متعلق لکھتے ہیں

سام شری پکش ورلتمان (موجودہ) ویدوں کو بھارتیوں (ہندوستانیوں) کے لئے ہی ملتے ہیں ویدوں کو ایشوری گیان (علم خداوندی) نہیں مانتے۔ ان کو آریہ ورتی آریوں کی سبھیتا (تہذیب) کا اتہاس (تاریخ) مانتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب (The Discovery of India) میں لکھتے ہیں:۔

بہت سے ہندو ویدوں کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک ہماری بڑی بدقسمتی ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کی حقیقت ہم سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وید صرف اس زمانہ کی معلومات کا مجموعہ ہیں۔ وہ بہت سی چیزوں کا غیر مرتب شدہ ذخیرہ ہیں۔ دعائیں۔ قربانی کی رسومات، جادو، نیچرل شاعری وغیرہ (صفحہ ۵۵)

حقیقت بھی یہی ہے کہ وید دراصل آریوں کی قدیم زندگی کی معاشرت کی تاریخ ہیں۔ چنانچہ پنڈت کرشن کمار بھٹاچارج سابق پروفیسر سنسکرت، پریذیڈنسی کالج کلکتہ لکھتے ہیں:

رگوید ایک کتاب ہے جو ایک ایسی قوم کی حالت بیان کرتی ہے۔ جو بلا شبہ حالت خانہ بدوشی سے بہت ترقی کر چکی تھی۔ اس میں شہروں کا، دیہات کا، اور پادشاہوں، قمار خانوں، اور کسبیوں کی کئی ایک دوسری علامات کا ذکر ہے جو کہ حالت خانہ بدوشی میں نہیں پائی جاتیں۔ رگوید کے دوسرے حصے اُن کے شاعروں یا رشیوں نے اس ملک میں تصنیف کئے۔ رگوید مختلف ملکوں میں لکھا گیا جن میں ایک دوسرے سے بہت عرصہ کا فرق ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے اس کی نسبت علم

ہنود (سنسکرت) کی نہایت ہی قدیم کتابوں میں اس قدر کم اشارات ملتے ہیں کہ فقط رگوید کے مطالعہ سے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ گایوں کی بازیافت، گایوں کی لوٹ، گایوں کی ترقی تعداد اور گایوں کی بخششیں اس کتاب کے مضامین ہیں اور کئی اور طریقوں سے اس بات پر زور دیا گیا ہے جس سے ایک بے تعصب پڑھنے والے کو بھی یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ یہ بیانات، حالات خانہ بدوشی کا ذکر کر رہے ہیں جو یا تو فی الحقیقت اس وقت موجود تھی یا جس کو گذرے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا تھا۔ اُن اصول کی نسبت جو اس زمانہ میں مروج تھے رگوید ہماری ذرا بھی دستگیری نہیں کرتا۔ اس بارہ میں ان ایک ہزار بھجن کی مثال ایک لق و دق اور ہولناک بیابان کی سی ہے جس میں جدھر نگاہ کرو ببول کے کانٹوں اور خاردار جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔ پرمیشر کی اس انادی گیان (علم ازلی یعنی رگوید) کی چند ایسی سوکتیں ہیں جن کا خطاب گھی، گائے اور کبیتن کی طرف ہے اور جن میں ایک ہارے ہوئے قمار باز کی ناامیدی کا ذکر ہے۔

دوسری سوکتوں میں ہم بے شمار جادو اور منتر پاتے ہیں جو بیماری کے دفعیہ، عشق، لڑائی یا قمار بازی میں پوری کامیابی حاصل کرنے کے لئے یا تو ایک آدمی کو خود یا اس کے لئے کسی جادوگر کو پڑھنے چاہئیں......

اتھروید میں چھوٹی چھوٹی مصیبتوں، مثلاً پسوؤں، جوؤں وغیرہ کے دفعیہ کے لئے اور ایک گنجے کے سر پر بال پیدا کرنے کے لئے معقول ہدایات لکھی ہیں، اور بے معنی ہذلیات بھی لکھی ہیں۔ مثلاً جارو گوانکلی کے سلیپر (ڈھیلی جوتی) پہنے ہوئے دروازے پر کھڑا ہے اور اسمیں دے رہا ہے۔ جناب مہربانی کرکے تبلایئے کہ نئے چاند کے روز ملاقات کرنے سے کیا فائدہ؟ وغیرہ (ویدوں کی قدامت از مولانا اکبر شاہ خان مرحوم)

حتی کہ ویدوں کی زبان کے متعلق بھی تحقیق ہے کہ وہ نقائص سے خالی نہیں۔ چنانچہ گوروکل کانگڑی کے پروفیسر وید پنڈت چندر منی، وِدیا النکار اپنے ترجمہ نرکت حصہ اول صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں۔

پرماتما پورن (مکمل) ہے۔ ویدی (اگر) وید، پرماتما کے دیئے ہوئے ہیں تو اس کی بھاشا (زبان) میں اس اپورنتا (نقص) یا ادھورے پن کا مہا دوش (عظیم الشان غلطی) نہیں ہونی چاہیئے.....

یہ آشنکا (اعتراض) ہمیں بہت ڈگمگاتا ہے۔ ویدک بھاشا میں اتنی بھاری تریٹی (کمزوری۔ خرابی) کا ہونا بڑا کھٹکتا ہے۔

ویدوں کی تعلیم

اب ہم اس مرحلہ کے نازک ترین حصہ پر پہنچ رہے ہیں۔ یعنی سوال یہ ہے کہ ویدوں کی تصنیف و تدوین کی تاریخ اور ان کے مصنفین سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ وید جس حالت میں بھی آج دنیا کے سامنے ہیں ان کی تعلیم کیا ہے؟ یعنی اب اسناد کو چھوڑ کر متن۔

(Text) کی طرف آنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ اس سے ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ ہم نے جس وقت سے عنوان زیر نظر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سے بھی قبل جب یہ مضمون "ہنوز اندر طبیعت می خلد" کے دور میں تھا، ہم اس کشمکش میں غلطاں و پیچاں ہیں کہ ویدوں کی تعلیم کو سامنے لانے کے لئے ان کے اقتباسات دیدیئے جائیں یا نہ۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اس میں آخر کشمکش و اضطراب کی کونسی بات ہے۔ لیکن یہ خیال آپ کے دل میں اس لئے آرہا ہے کہ آپ نے ویدوں کو پڑھا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود ہندوؤں میں سے بھی سوائے ان کے بڑے بڑے وِدوان ہندوؤں کے شاید ہی کسی نے ویدوں کا مطالعہ کیا ہو۔ ویدوں میں ایسی ایسی باتیں ہیں کہ انہیں سامنے لانے کا خیال کیا جائے تو شرم و حیا اس طرح دامنگیر ہو جاتی ہے کہ آگے قدم بڑھانے کی ہمت ہی نہیں پڑ سکتی۔ ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ ویدوں کی صحیح تعلیم کا اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے اقتباسات نہ سامنے آجائیں۔ لیکن ہم معارف القرآن کی متانت اور قارئین کے ذوقِ سلیم کی لطافت کو اس ضرورت پر قربان کرنیکی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس لئے مجبوراً فیصلہ یہی کیا گیا ہے کہ اس قسم کے اقتباسات کو چھوڑ کر محض اشارات پر اکتفا کیا جائے۔ ذرا غور کیجئے۔ پرنسپل گرفتھ نے ویدوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اول تو مترجم کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ جو کچھ بھی ان کے سامنے آئے ان کا ترجمہ کرتے جائیں۔ پھر اہل مغرب کا انداز ایسا ہے کہ جن باتوں کو ہم لوگ بڑی جھجک اور تامل سے کہتے ہوئے بھی ہچکچاتے ہیں وہ نہایت آزادی اور بے باکی سے کہہ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ویدوں میں ایسے مقامات آجاتے ہیں جہاں گرفتھ صاحب کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ مجھ میں ان کا ترجمہ سامنے لانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ مثلاً یجروید ادھیائے ۲۳ منتر ۲۰-۲۸ پر پہنچ کر جہاں یجمان کی بیوی کا گھوڑے سے...... کی کیفیات درج ہیں، گرفتھ صاحب قلم رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں تو فقط اتنا کہ

مشکل اندر مشکل!

This and the following nine stanzas are not reproducible even in the semi-obscurists of a learned European language.

یہ اور اگلے نو منتر اس قابل نہیں کہ انہیں یورپ کی کسی علمی زبان میں دھندلی سی شکل میں بھی پیش کیا جاسکے۔

یہ تو تھا ایک انگریز مترجم۔ اب خود ہندوؤں کی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف سنیئے۔ نکاح ایک مقدس رسم ہے۔ جس سے انسان کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس رسم میں انسان کو اس کی نئی زندگی

کی ذمہ داریوں۔ حقوق و فرائض اور میاں بیوی کے تعلقات و روابط کی یاد دلائی جاتی ہے۔ خطبات نکاح اور ایجاب و قبول ان ہی مقاصد کو لئے ہوئے ہیں۔

یک نگہ۔ یک خندۂ دز دیدہ یک تابندہ اشک ۔۔۔ بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر

دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب میں اس مقدس پیمان کی توثیق کے لئے کچھ نہ کچھ کھلوایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اس تقریب پر وید کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ وہ اشلوک کیا ہیں؟ ان کا ترجمہ تو ہم اس دقت کے ماتحت جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کے متعلق خود ہندوؤں کے سمجھدار طبقہ کی آرا پیش کر سکتے ہیں۔ پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے (ایم۔ اے) پردھان آریہ سماج الٰہ آباد۔ اخبار آریہ متر۔ بابت ۶ر جون ۱۹۲۹ء میں اس موضوع پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں

وہ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵ منتر ۳۸) منتر اتنا اشلیل (گندہ) ہے کہ سادھارن (معمولی) سنسکرت جاننے والا (دولہا) بھی اسے پڑھنے کا ساہس (حوصلہ) نہ کرے گا۔ ابھی تو لوگ اس لئے پڑھ دیتے ہیں کہ نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ پرنتو (مگر) کیا آریہ سماج سروا (ہمیشہ) یہی اوستھا (حالت) رکھنی چاہتا ہے؟ یدی (اگر) اس منتر کو نہ نکالا گیا تو اس کے ورودھ (خلاف) یا تو بھیانک ورودھ (خوفناک مخالفت) ہوگی۔ یا لوگ اسے اپیکشا کی درشتی سے (بنظر حقارت) دیکھ کر چھوڑ دیا کریں گے۔ دونوں ہی باتیں انشٹ (بری) ہیں۔

آریہ سماج مین پوری کے پردھان بابو شیام سندر لال جی نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ اخبار آریہ متر آگرہ (بابت ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء) میں اس کی تائید کی ہے۔ چنانچہ سوامی سوتنترانند جی مہاراج نے اس منتر (نیز اسی قسم کے دوسرے منتروں) کو اسی بنا پر سوامی دیانند جی کی تصنیف سنسکار ودھی سے نکال کر سوامی جی کے نام سے ایک نئی سنسکار ودھی شائع کر دی ہے (بحوالہ ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۱)

ان تصریحات سے آپ ہماری ان مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کے تذکرہ سے ہمارا مقصود کسی کی دلآزاری قطعاً نہیں۔ مقصود تو فقط یہ بتانا ہے کہ ویدوں کے اندر (جس شکل میں وہ آج ہمارے سامنے موجود ہیں) ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں جنہیں اور تو اور خود ہندو صاحبان بھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ انہیں ویدوں میں رکھا جائے۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ انہیں غیر محرف آسمانی کتابیں کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے (اور جیسا خود ہندو صاحبان کو بھی تسلیم ہے) وید قدیم آریہ قوم کی ابتدائی قبائلی زندگی کی معاشرت کی تاریخ ہیں۔ اس لئے ان میں تعلیم بھی اسی نہج کی ہے جس قسم کی ابتدائی ایام میں عام خیالات ہوتے تھے۔ چنانچہ ویدوں میں کہیں اس امر پہ تعجب ہے

کہ "سرخ رنگ کی گائے کس طرح سفید رنگ کا دودھ دیتی ہے" کبھی اس پر کہ "تمام دریا سمندر میں جا گرتے ہیں لیکن سمندر پھر بھی نہیں بھرتا" اس زمانہ میں قربانیاں، مذہب کی اصل و بنیاد ہوتی تھیں۔ اس لئے ویدوں میں اکثر و بیشتر قربانی اور اس کے لوازم و ماجریات سے متعلق گیت، منتر، اور احکام ملتے ہیں۔ قربانی کے وقت ہوتر برہمن رگ وید کے منتر پڑھتا تھا۔ ادھوریو (Adhvaryu) یجر وید کے منتر پڑھتا۔ اور اوگاتا برہمن سام وید کے۔ بعد میں ان پروہتوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا جسے برہما کہا جاتا تھا۔ وہ گویا ان کا صدر تھا اور اس امر کی نگرانی کرتا تھا کہ قربانی اتھر وید کے اصول و احکام کے مطابق ادا ہوتی ہے یا نہیں۔ قربانیوں میں سوم رس کا استعمال عام ہوتا اور اسے مقدس سمجھا جاتا۔ ان امور کی تصریحات کے لیے دیکھیے (اس گپت کی محولہ صدر کتاب)

قدیم آریوں کا معاشرتی نقشہ

ابتدائی خانہ بدوشی کی زندگی کے بعد ان آریوں نے زراعت کی زندگی اختیار کی۔ چنانچہ اس زمانہ میں ویدوں کے جو منتر تصنیف ہوئے ان میں ان کی اسی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً اتھر وید۔ ادھیائے ۱۲ منتر ۲۹ میں لکھا ہے۔

اے انسان! جس طرح طاقتور گائے نباتات کو کھا کر بچھڑے یا اور انسانوں کے لئے عمدہ دودھ دیتی ہے اسی طرح تو بھی پھل پھولوں کے رس کا استعمال کر کے اپنے جسم اور آتما کی طاقت کو حاصل کر۔

اسی ادھیا کا اٹھارواں منتر یہ ہے

اے کسانو! تم اناج وغیرہ بونے کے لئے زمین کو پھاڑنے والا جو "پھال" ہے اور اسی پھال کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے پیچھے جو لکڑی کی خوبصورت پٹی لگی ہوئی ہے تم اس سے اناج پیدا کرنے والی زمین کو پھاڑو۔ اسی طرح تم اپنے خوبصورت رتھوں کو چلاؤ اور اچھی حفاظت کرو۔

اس سے پہلے چار منتروں میں لکھا ہے۔

روشن عقل اور روشن ضمیر انسان ہل کو جوئے میں لگا کر کھیتی کا کام کرتے اور تمام دوانوں کے سکھ کو بڑھاتے ہیں۔ اے انسانو! تم ہلوں کو جوئے میں لگا کر کھیتی کی خاطر زمین کو اچھی طرح جوتو اور اس کو اچھی طرح سے جوت کر اس میں جو وغیرہ اناج بوؤ ...... جو محنت کرنے والا کاشتکار ہے اس کو چاہیئے کہ بیلوں کے ذریعہ ہل میں پھال لگا کر زمین کو جوتے ...... ودوانوں کو چاہیئے کہ وہ ہل کی نوکدار پٹی کو پانی اور گھی اور شکر یا شہد وغیرہ پدارتھوں میں اچھی طرح بھگو کر مضبوط کریں۔ تاکہ وہ زمین کو اچھی طرح کھود سکے۔ اس سے ہم گھی وغیرہ اشیاء کو حاصل کریں گے۔ اس پٹی کو بار بار پانی میں تر کرنا چاہیئے۔

ادھیائے ۱۸ منتر ۱۲ اس سے بھی واضح ہے۔

میرے چاول اور ساٹھی کے دھان۔ میرے جو اور ارہر، میرے اُڑد اور مٹر، میرے تل اور ناریل، میرے

مونگ، اور اس کا بنانا۔ میرے چنے اور اس کا سدھ کرنا۔ میری کنگنی اور اس کا بنانا۔ میرے سوکشم چاول اور ان کا پکانا۔ میرا سانوک اور منڈوا۔ چینا وغیرہ چھوٹے چھوٹے اناج۔ میرے بغیر بوئے ہوئے چاول اور ان کا پکانا۔ میری مسور اور ان کے سمندھی اناج۔ یہ سب کے سب تمام اناجوں کے دینے والے پرمیشور سے سامرتھ ہوں۔

تشبیہات بھی اسی قسم کی ہیں۔ مثلاً یجروید۔ ادھیائے ۲۸ منتر ۳۲ میں ہے

اے انسانو! جیسے بیل گوؤں کو گابھن کرکے پشوؤں کو بڑھاتا ہے، اسی طرح گرہستی لوگ عورتوں کو حاملہ کرکے پرجا کو بڑھاویں۔

خدا کا تصور

مذہب کی بنیاد خدا کے صحیح تصور اور اس کی توحید پر ہے۔ جیسا کہ معارف القرآن (جلد اول) میں بوضاحت لکھا جا چکا ہے، جو مذہب انسانی دماغ کی تخلیق ہوں یا جن الہامی مذاہب میں انسانی دستبرد نے تصرفات کر دیئے ہوں، ان میں خدا کا تصور ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے اور چونکہ ذہن انسانی محسوسات سے آگے بڑھ نہیں سکتا اس لئے اس کا تخلیق کردہ "خدا" بھی اسی قالب میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے ویدوں میں خدا کا تصور کس قسم کا ملتا ہے اس کی تفصیل جلد اول (باب اللہ) میں گذر چکی ہے۔ یہاں اس میں سے صرف ایک اقتباس کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ اتھرو وید کانڈ ۱۱ سوکت ۲ منتر ۵-۶ میں لکھا ہے۔

"ہے پشو پتے! جیوؤں کے سوامی! پرماتمن! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار ہے۔ ہے بھو! سرا تپادک اشیور! تیری جو چکشو میں (آنکھیں) ہیں ان کو بھی نمسکار ہے۔ تیری توچا (چمڑی۔ جسم) کو نمسکار ہے تیرے سمدیگ درشن روپ پرتیک آتم سوروپ کانتی۔ تیج کے لئے نمسکار ہے۔ "۵" ہے پرمیشور! تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے۔ تیرے اودر بھاگ (پیٹ) کو نمسکار ہے۔ تیری جیبھ (زبان) کو نمسکار ہے۔ تیرے آسیہ۔ مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے۔ تیرے (دانتوں کی) گندھ (بو) کو نمسکار ہے۔

دیگر خدا

ہندوؤں میں برہما شو اور وشنو تین خدا مانے جاتے ہیں۔ آج کل اس کا مفہوم یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ تینوں مستقل خدا نہیں ہیں بلکہ پرماتما کی تین صفتوں کے مظہر ہیں یعنی برہما (پیدا کرنے والا) شو جی (سلسلہ کو آگے بڑھانے والا) اور وشنو (ہلاک کرنے والا) ان میں سے شو جی کی پرستش (لنگ کے توسط سے) عام ہوتی ہے۔ لیکن مسٹر گووند اس کی تحقیق یہ ہے کہ برہما۔ شو۔ وشنو کا نام ویدوں میں تو ایک طرف رامائن و مہابھارت تک میں بھی کہیں نہیں ملتا۔ ویدوں میں ان کی جگہ ورن اندر اور اگنی کا نام آتا ہے جو اب بالکل بھلائے جا چکے ہیں

موجودہ دور میں برہما کی پرستش بالکل غائب ہے۔ پرانوں میں ہے کہ برہما کی پرستش اس لئے بند کر دی گئی کہ ایک دفعہ شوجی نے دیکھا کہ وہ اپنی لڑکی سرسوتی سے امر شنیع کا مرتکب ہو جانا چاہتا ہے" (ہندوازم صفحہ ۱۸۲) لیکن ہندوؤں کی

معاذ اللہ

مقدس کتابوں شل شت پتھ۔ برہمن۔ تانڈیہ مہابراہمن۔ مہابھارت اور رامائن وغیرہ میں برہما کے اس فعل کی مذمت نہیں کی گئی۔ مہابھارت ادیوگ پرب ادھیائے ۱۱۷ میں مندرجہ صدر واقعہ کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۰۱ از پنڈت آتما نند)

یہ تو تھا خدا کے تصور کے متعلق۔ اب رہی خدا کی توحید تو ہندومت میں اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ خدا اپنی ذات اور صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کی مثل و نظیر کوئی نہیں۔ اس کی ذات صمدیت کسی کی محتاج نہیں۔ لیکن ہندومت کی تمام اساس ہی دیوتاؤں کی پرستش پر ہے۔ مسٹر گووند داس کی

دیوتا

تحقیق کے مطابق " ویدوں میں ۳۳ دیوتا تھے لیکن بعد میں ان کی تعداد ۳۳ کروڑ تک پہنچ گئی" (ہندوازم صفحہ ۱۵۹) یہی نہیں کہ ہر کام اور ہر ضرورت کے لئے ہی الگ الگ دیوتا ہو۔ بلکہ ہر چیز کا جداگانہ دیوتا۔ چنانچہ یجروید کی چوبیسویں ادھیائے میں ہے۔

تیز رفتار گھوڑے، مارخور بکرے۔ نیل گائے کا دیوتا سورج ہے۔ کالی گردن والے پشو کا دیوتا اگنی ہے۔ داغدار پیشانی والی بھیڑ کا دیوتا سرسوتی ہے۔ کالے رنگ والے تند خو۔ بائیں اور دائیں طرف سفید دھاریوں والے یا بالکل سیاہ دھاریوں والے پشوؤں کا دیوتا یم ہے۔ جس کی دُم پر سفید داغ ہوں اس پشو کا دیوتا وایو ہے۔ بغیر بہار آئے سانڈ سے جفتی کر کے حمل اسقاط کرنے والی گائے کا اور چھوٹے قد اور ٹیڑھے ترچھے اعضاء والے پشو کا دیوتا وشنو ہے۔ سرخ اور سرخی مائل سیاہ رنگ والے اور بیر کے مانند ارغوانی رنگ والے پشوؤں کا دیوتا سوم ہے.......... اگلی ٹانگوں پر سفید داغوں والے۔ اگلے زانوؤں پر سفید داغوں والے پشوؤں کا دیوتا برہسپتی ہے۔ آسمانی رنگ والے پشوؤں کا دیوتا میگھ ہے۔ کالی گردن والے سفید جوڑوں والے، موٹی ٹانگوں والے پشوؤں کا دیوتا پون اور بجلی ہے۔ نیچی آواز والی اونچی آواز والی اور مدھم آواز والی تین قسم کی بھیڑوں کا دیوتا پرتھوی ہے۔ لال رنگ والوں کا دیوتا رُدر ہے۔ مگرمچھ کے بچے اور مگرمچھ اور دیگر آبی جانوروں کا دیوتا سمندر ہے۔

اتھروید کانڈ ۵۔ سوکت ۲۴ میں ہے

سوتا دیوتا حاملہ عورتوں کا مالک ہے وہ میری رکشا کرے۔ (۱) اگنی دیوتا جو نباتات کا مالک ہے مجھے محفوظ رکھے۔ (۲) دیوا در زمین جو کھیتوں کی مالکہ ہیں وے دونوں دیویئیں میری رکشا کریں۔ ۳۔ ورن دیوتا جو پانیوں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۴) متر اور ورن نامی دیوتے جو بارش کے مالک ہیں میری

رکشا کریں۔ (۵)۔ کرت دیوتے جو پہاڑوں کے مالک ہیں میری حفاظت کریں۔ (۶) سوم دیوتا جو بیلوں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۷)۔ ہوا جو طبقۂ وسطیٰ کی مالک ہے مجھے محفوظ کرے۔ ۸۔ سورج دیوتا جو آنکھوں کا مالک ہے میری رکشا کرے۔ ۹۔ چاند جو تاروں کا مالک ہے، میری حفاظت کرے (۱۰) اندر دیوتا جو دیولوک کا مالک ہے میری رکشا کرے۔ (۱۱) مرتوں کا باپ جو حیوانوں کا مالک ہے میری رکشا کرے۔ (۱۲)۔ موت کا دیوتا جو رعایا یا جانداروں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۱۳)۔ یم راج جو مرے ہوئے پتروں کا مالک ہے مجھے محفوظ رکھے۔

اسی طرح رگوید منڈل ۶۔ سوکت ۵۲ منتر ۱۳-۱۴ میں ہے۔

چڑھتی ہوئی اشا (شفق) میری رکشا کرے۔ لہروں والے دریا میری حفاظت کریں۔ ساکن پہاڑ میری رکشا کریں اور سورگ میں پہنچے ہوئے میرے پتر میری حفاظت کریں ۲۔ تمام دیوتا میری اس پکار کو سنیں جو طبقۂ وسطیٰ اور طبقۂ علوی میں ہیں اور جو آگ کی زبان والے اور ہوا والے ہیں وہ میری اس کُش پر آکر بیٹھیں۔

اسی طرح مختلف ویدوں میں سانپوں کی پرستش، بانجھ گائے کے بالوں اور کھردں کو سجدہ۔ گھوڑوں اور گھوڑوں کے مالکوں کو سجدہ۔ نائی کے استرے اور سردی والے بخار کو نمسکار (سجدہ) کرنے کی تلقین موجود ہے (تفصیل جلد اول میں گذر چکی ہے) اتھروید کانڈ ۳۔ سوکت ۱۰ منتر ۲-۳ میں سوشر دیوتا کے بت کی پرستش کا ذکر موجود ہے۔ ان تصریحات کے پیش نظر یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ خدا پرستی کے بارے میں ویدوں کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ ہم اس قیاس کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی خدا کی طرف سے آسمانی ہدایت کی مقدس قندیل نازل ہوئی ہو۔ لیکن وہ روشنی حوادث ارضی و سماوی یا انسانی تحریفات سے محفوظ نہ رہ سکی اور جس چیز کو آج آسمانی روشنی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ اس دعوے کی تکذیب کی خود زندہ شہادت ہے۔

ہمارا جذبۂ احترام

ہندوستان کی جن مقدس ہستیوں کو آسمانی ہدایت کی شمع نورانی ملی ہو گی ان کی تعظیم و احترام ہمارا جزو ایمان ہے۔ لیکن وہ تعلیم جو ویدوں میں آج موجود ہے لے تو ایسی ہستیوں کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر گوونداس اس باب میں رقمطراز ہیں۔

ان تمام لوگوں کو جو آج یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا موجودہ مذہب وہی ہے جو ویدوں کے زمانہ میں تھا اور جو ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ ان حقائق پر غائر نگاہ سے غور کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ جو تاریخ کا اس طرح بطلان کرتے ہیں اور ان مسلسل تغیرات سے چشم پوشی کرتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی

اور ہندوستان کو بھی سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ (ہندوازم صفحہ ۱۸۶)

معاملات کی دنیا

خداپرستی سے نیچے اتر کر اگر معاملات کی دنیا میں آیا جائے تو وہاں بھی ویدوں میں عجیب و غریب قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ اس باب میں پھر وہی شکل ہمارے گلوگیر ہو جاتی ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم دو ایک مثالوں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۱۷ منتر ۸-۹ نیز رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۰۹ منتر ۶ و ۷ میں لکھا ہے کہ

اگر کسی ایک عورت کے پہلے دس غیر براہمن خاوند موجود ہوں، اگر برہمن اس کا ہاتھ پکڑے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے۔ کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک یا خاوند ہے نہ کہ کشتری اور ویش۔

اس ایک حکم سے آپ پوری کی پوری معاشرتی اور عائلی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہی عائلی زندگی جس کے متعلق اتھروید کانڈ ۱۴ سوکت ۲ منتر ۱۸ میں یہ چیز بھی موجود ہے۔

خاوند سے سنتان کے ابھاؤ (اولاد نہ ہونے) میں دیور کی کامنا (چاہت) کرنے والی عورت!

اسی بنا پر یاسک اچاریہ نے نرکت میں دیور کے معنی ہی دوسرا ور (خاوند) لکھا ہے (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۳۳) انہی چیزوں کے پیش نظر مسٹر گوونداس یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

ویدوں کی ازلیت و تقدس کا عقیدہ کسی ایسے شخص کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا جس کی نگاہ تاریخ پر ہو یہ عقائد بالکل باطل ہیں۔ ہر اس شخص کے نزدیک جس نے ویدوں کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا ہو..... ان کے بے شمار باہمی تضاد، ان کے اکثر و بیشتر مہملات، ان کے مضحکہ انگیز بیانات اور فحش نگاری قدیم ایام میں بھی ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے رائے عامہ کی پرواہ نہ کی، سخت تنقید کا مرکز بنی رہی ہے۔ چنانچہ چارواک کے نزدیک ویدوں کے مصنف ...... [۱] ...... تھے (ہندوازم صفحہ ۸۲)

⁂

ویدوں کے علاوہ

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ ویدوں کے علاوہ برہمن۔ آرینک اور اپنشد بھی عہد قدیم کا مقدس لٹریچر تصور کیا جاتا ہے اگر ہندو دھرم میں یہ متعین ہوتا کہ صرف ویدہی مذہب کی مستند کتاب ہیں تو ہمیں ان سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ہندومت میں اس امر کا تعین ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان کے ہاں جو جو کتابیں مقدس سمجھی جاتی ہیں ان کا تذکرہ ہمارے لئے ضروری ہو گیا۔ برہمن ویدوں کی تفاسیر ہیں۔ لیکن عقیدہ یہ ہے کہ یہ تفاسیر بھی الہامی ہیں۔

[۱] یہاں جو الفاظ مسٹر گوونداس نے استعمال کیے ہیں انہیں وہ تو لکھ سکتے تھے کہ وہ خود ہندو ہیں لیکن ہم ان کی نقل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

آرنیک ان رشیوں کے خیالات کا مجموعہ ہے جو بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے اور چونکہ وہاں قربانیاں کر نہیں سکتے تھے اس لئے عالم تصور میں ان مذہبی رسومات و فرائض کو ادا کرنے لگ گئے۔ لیکن ہندو مذہب میں رشیوں کی حیثیت و منصب کے متعلق بھی کچھ متعین نہیں۔ یعنی جس طرح رسول یا نبی کی حیثیت، مقام اور منصب متعین ہے اور ان کے بعد محدثین و مفسرین۔ فقہا۔ صوفیا۔ وغیرہ کے مناصب و مقامات کے متعلق بھی معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ اس طرح رشیوں کے متعلق کچھ معلوم و متعین نہیں[1]۔ آپ نشد اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ (Upanishads) کے

اُپ نشد

نزدیک اس لٹریچر کی تقسیم یوں سمجھئے کہ برہمن ان لوگوں کے لئے ہیں جو عائلی زندگی بسر کریں۔ آرنیک ان کے لئے جو بن باس اختیار کر لیں اور اُپ نشد ان کے لئے جو ان سے بھی آگے سنیاس کی زندگی شروع کریں جس میں انسان مراقبہ و تصورات میں ایشور گیان (معرفتِ خداوندی) حاصل کرتا ہے (داس گپتا صفحہ ۲۹) اُپ نشد تعداد میں ۱۱۲ ہیں اگرچہ وہ مجموعہ جس کا ترجمہ داراشکوہ نے کرایا تھا صرف ۵۰ پر مشتمل تھا۔ اُپ نشد تمام کی تمام عہد قدیم کی تصانیف نہیں بلکہ ان میں ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے، حتیٰ کہ ان میں بعض چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کی تصانیف بھی ہیں (داس گپتا صفحہ ۲۸) ویدانت کا فلسفہ جس کے سب سے بڑے پرچارک شنکر اچاریہ ہیں ان ہی اُپ نشدوں پر مشتمل ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو ہمارے ہاں ہمہ اوست کے رنگ میں جلوہ فرما ہے ویدانت کی رو سے کمالِ زندگی۔

ایک ایسی نیند کی سی حالت ہے جس میں خواب تک نہ آئے[2] جسے یہ ابدی سرور حاصل ہو جائے اسے کسی قسم کا خوف نہیں رہتا..... اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب برہما سے نکلا

---

[1] ہندوؤں کی اصطلاح میں سرتی وہ الہامی تعلیم ہے۔ جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آئی اور سمرتی مذہب کے بزرگوں کی تصانیف ہیں۔ برہمن آرنیک اور اُپ نشد کے متعلق یہ طے نہیں کہ یہ سرتی ہیں یا سمرتی حالانکہ ڈاکٹر داس گپتا نے صرف ۱۱۲ لکھا ہے۔

[2] ویدانت یا وحدت الوجود کے تصوف کا منتہائے نظریہ ہے کہ انسان، مکان اور زمان (Space and Time) کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو جائے تاکہ اس کی ہستی کا "وا ہمہ" مٹ کر یہ برہما یا ذات واجب الوجود) میں پھر سے جا ملے۔ لیکن یہ جکڑ بندیاں بالخصوص زمان Time کی گرفت) ایسی سخت ہیں کہ ان سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ لیکن ایک ویدانتی (یا صوفی) اپنے عالم استغراق و محویت میں یہ خیال کر لیتا ہے کہ وہ زمان کی قیود سے آزاد ہو گیا ہے۔ وہ لمحہ جس میں یہ (بزعمِ خویش) اپنے آپ کو ان تعینات کی حدود سے ماوراء سمجھ لیتا ہے اس کے نزدیک وصال (یعنی اپنی اصل سے مل جانے) کا لمحہ ہے لہٰذا اگر یہ استغراق مستقل ہو جائے تو وصال بھی مستقل (یعنی فنائے کامل) ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام ہے ایک ایسی نیند (باقی صفحہ ۸۳ پر دیکھئے)

ہے اور برہما ہی میں واپس جائے گا۔ (داس گپتا صفحہ ۴۷-۴۸)

اور نجات یہ ہے کہ "انسان اپنے آپ کو پہچان لے۔ معرفتِ نفس فی ذاتہ مکتی ہے۔ اس سے انسان برہما کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔ نجات کا مدار اعمال پر نہیں بلکہ معرفت پر ہے۔" (داس گپتا صفحہ ۵۵)

برہمن کے متعلق مسٹر گووند داس کی تحقیق یہ ہے کہ

ان کی تصنیف میں بھی صدیاں لگی ہیں اور اس عرصہ میں ان میں بھی بہت کچھ حک و اضافہ ہوتا رہا ہے۔

(ہندوازم صفحہ ۱۰۶)

آرنیک کے متعلق یہ صاحب لکھتے ہیں:

ان میں بعض عجیب و غریب قسم کی قربانیوں کے احکام ہیں۔ مثلاً برہمامیدہ اور مہادرت۔ ایک نہایت ناپاک تقریب جس میں فحش کاری کا مظاہرہ ہوتا ہے اور انسانی نطفہ بطور چڑھاوا پیش کیا جاتا ہے (ایضاً صفحہ)

اور اُپ نشدوں کے متعلق:-

اُپ نشدوں کے مستند ہونے کے متعلق بہت سا خلجان ہے۔ ان کی تعداد تین سو سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے کون کون سے اصل اور کون کون سے جعلی ہیں یہ سوال سردست ہم سے متعلق نہیں۔ یہ یا تو تمام کے تمام اصل ہیں یا تمام کے تمام جعلی اور اس کا فیصلہ اس امر پر ہے کہ آپ انہیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں (یعنی فیصلہ عقیدت پر ہے) (صفحہ ۱۰۹)

اُپ نشدوں کے متعلق پنڈت جواہرلال نہرو لکھتے ہیں کہ

ان میں بہت سے ابہامات ہیں اور (اس لیے) ان کی بہت سی تفسیرات کی گئی ہیں۔

(The Discovery of India p. 66)

شاستر

اس کے بعد ہندوؤں کے عام فلسفہ سے متعلق کتابوں کو لیجئے جنہیں شاستر کہا جاتا ہے اس فلسفہ کی دو شاخیں ہیں، ایک ناستک اور دوسرا آستک۔ ناستک فلسفہ کے مؤید نہ ویدوں کو غلطی سے مبرا مانتے ہیں اور نہ انہیں بطور سند تسلیم کرتے ہیں۔ ناستک ہیں بدھ مت، جین مت اور چارواک فرقے

---

[۱] حالانکہ ڈاکٹر ویس گپتا نے صرف ۱۱۲ لکھا ہے۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۲

جس میں خواب تک نہ ہو۔ غور فرمائیے کہ یہ فلسفہ کس طرح تصور ہی تصور میں انسان کے ذہن میں ایک نئی دنیا بسا دیتا ہے جس کی حقیقت واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ یہ سب کشمکش زندگی سے فرار کی نظر فریب راہیں ہیں (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)

شامل ہیں (اور سب ہندو قرار دیئے جاتے ہیں) آستک کے چھ مذاہب (School of Thought)
ہیں۔ یعنی سانکھ۔ یوگ۔ ویدانت۔ میمانسا۔ نیایا۔ ویسے شک۔ یہ ویدوں کو تنقید سے بالا مانتے ہیں۔ سانکھ
کپل کی طرف منسوب ہے جس کی ہستی محض افسانوی ہے۔ یہ خدا کی ہستی کا منکر ہے اور محض عقل کی رو سے نجات کا
حامی۔ اس اسکول کا عہد قدیم کا تمام لٹریچر ضائع ہو چکا ہے (داس گپتا صفحہ ۶۸) دوسرا شاستر یوگ ہے جس کا بانی
پتنجلی کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے ایشور (خدا) کو آتما (روح) سے الگ مانا جاتا ہے۔ اس میں حبس دم (پرانایم)
کو حسن عمل قرار دیا گیا جس کی وجہ سے ایسی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ ہوا پر اُڑ سکتا ہے، دریا پر چل سکتا ہے، لوگوں
کی دل کی بات معلوم کر سکتا ہے (یعنی وہی قوتیں جو کرامات بن کر منصۂ شہود پر آتی ہیں۔) تیسرا شاستر ویدانت ہے
(جسے اتر میمانسا بھی کہتے ہیں) اسے بیاس دیوجی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا فلسفہ اُپنشدوں کی تعلیم کا ماحصل
ہے جس پر سارے ہندو تصوف کی بنیاد ہے۔ جو ہمارے ہاں ہمہ اوست کے نام سے معروف ہے۔ اس کی رو سے
کائنات کی ہر شے برہما ہے (یعنی جو نسبت مٹی کو برتن سے اور موج کو دریا سے ہے وہی نسبت موجودات کو خدا سے
ہے) ان کا کمال یہ ہے کہ مادہ کو ترک کر کے برہما میں جذب ہو جائے۔ چوتھا شاستر میمانسا (یا پورب میمانسا ہے)
جو جیمی جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ اس میں قربانی سے متعلق احکام ہیں۔ اور انسان کو مختار بالارادہ قرار دیا
گیا ہے، اس حد تک کہ یہ خدا کا بھی قائل نہیں (منوسمرتی کے قوانین جو آجکل (Hindu Law) کی حیثیت
لئے ہوئے ہیں۔ اسی شاستر کے مطابق ہیں) (داس گپتا صفحہ ۳۷۱، صفحہ ۴۰۲) پانچواں شاستر نیایا ہے جو گوتم یا نیایک
کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں انسان کو مجبور محض بتایا گیا ہے اور منطق کو ایک خاص حیثیت دی گئی ہے۔ چھٹا
شاستر ویسے شک ہے۔ جس کا مصنف کناد ہے اس میں طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل سے بحث
کی گئی ہے۔

فلسفہ کی ان تمام شاخوں میں قدر مشترک متشائم نظریۂ حیات (pessimism) ہے "خوشی دراصل
خوشی نہیں۔ وہ بھی غم ہی کا پیش خیمہ ہے۔ اصل خوشی خواہشات کے ترک میں ہے" (داس گپتا صفحہ ۹) وہی ترک
دنیا اور ترک لذات کی تعلیم!

———— ✲ ————

پران

پران بھی ہندوؤں کی مقدس کتابیں ہیں۔ برہمانند پران کی رو سے شروع میں وید کی طرح پران بھی ایک ہی
تھا جسے ویاس جی نے ویدوں کی ترتیب کے بعد تصنیف کیا تھا۔ ویاس جی کے شاگردوں نے اس
ایک سے چار پران مرتب کر لئے اس کے بعد ان کی تعداد اٹھارہ تک بڑھ گئی۔ اٹھارہ سے چھتیس چھتیس
سے چون اور اس کے بعد ساٹھ تک جا پہنچی۔ شروع میں ان کے کل اشلوکوں کی تعداد قریب چار ہزار تھی اب دس لاکھ

سے بھی زیادہ ہیں۔ پُران "اپنی موجودہ شکل میں سب ایک دوسرے سے متضاد ہیں" (ہندوازم صفہ ۱۱) حتیٰ کہ "کسی پُران کے دو نسخے بھی آپس میں نہیں ملتے"۔ (ایضاً صفہ ۱۱۹) "پُران عجیب و غریب افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان میں دس دس ہزار اور ساٹھ ساٹھ ہزار سال کی عمر کے انسان عام طور پر ملتے ہیں" (ایضاً صفہ ۱۲۳) ان کی تعلیم کا اندازہ لگانے کے لئے ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔ کیونکہ ان سے آگے بڑھنے میں وہی دشواری مانع ہے جس کا شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ پدم پُران میں ہے کہ برہما (یعنی ہندوؤں کے عقیدہ کی رو سے خالق کائنات) (اہنکاری (معاذ اللہ) شہوت پرست) ہے۔ اس نے اپنی بیٹی سرسوتی کی طرف بری نگاہ سے دیکھا تب اس کی بددعا سے اس کے منہ سے فحش جاری ہوا (اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) شو پران میں ہے کہ

شوجی نے خواہش کی کہ میں دنیا کو پیدا کروں اس نے برہما کو پیدا کیا۔ برہما نے ایک چلو پانی اٹھا کر پانی میں پھینک دیا اس سے ایک بلبلا اٹھا۔ بلبلے میں سے ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا "اے بیٹے! دنیا کو بنا" برہما نے کہا "میں تیرا بیٹا نہیں بلکہ تو میرا بیٹا ہے" دونوں میں جھگڑا برپا ہوا۔ مہادیو (شوجی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے لئے بھیجا تھا وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب ان دونوں کے بیچ میں سے ایک نورانی لنگ پیدا ہوا اور فوراً وہ آسمان میں چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران رہ گئے دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہیئے جو پہلے آئے وہ باپ جو پیچھے آئے وہ بیٹا کہلائے۔ وشنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا اور برہما ہنس کا جسم بنا کر اوپر کو اڑا۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی۔ برہما نے سوچا اگر وشنو پتہ لے آیا ہوگا تو مجھ کو اس کا بیٹا بننا پڑے گا۔ وہ ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت ایک گائے اور کیتکی کا درخت اوپر سے اترا۔ برہما نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلے آتے ہیں۔ برہما نے پوچھا کہ اس لنگ کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔

برہما نے کہا کہ میرے ساتھ چل کر ایسی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دودھ کی دھار بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جھوٹی گواہی نہیں دیں گے۔ تب برہما خفا ہو کر بولا کہ اگر گواہی نہیں دو گے تو میں تم کو ابھی خاکستر کر دوں گا۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہتے ہو ویسی ہی گواہی دیں گے تب تینوں نیچے کی طرف چلے۔

برہما نے وشنو سے سوال کیا کہ تو نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ برہما نے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ وشنو نے کہا کہ کوئی گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جھوٹی گواہی دی۔

اس پر لنگ نے کیتکی کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر یا کسی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھائے گا اس کا ستیاناس ہو گا۔ گائے کو بد دعا دی کہ جس منہ سے تو نے جھوٹ بولا ہے تو اس منہ سے پاخانہ کھایا کرے گی تیرے منہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا۔ لیکن دم کی کریں گے۔ برہما کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہوگی۔ وشنو کو دعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے اس لئے تیری پرستش سب جگہ ہوگی۔ پھر دونوں نے لنگ کی حمد و ثنا کی۔

اس حمد و ثنا کو سن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ تب مہادیو نے بالوں میں سے ایک راکھ کا گولا نکال کر دیا اور کہا جا کر اس سے خلقت پیدا کرو۔

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش سوامی دیانند جی صفحہ ۳۴۲، ۳۴۳)

دیوی بھاگوت میں ایک عورت کی کتھا لکھی ہے

اسی نے سب دنیا کو بنایا اور برہما وشنو مہادیو کو بھی اس نے پیدا کیا۔ جب اس دیوی کو خواہش ہوئی تو اس نے اپنا ہاتھ گھسا۔ اس سے ہاتھ میں ایک آبلہ ہوا۔ اس میں سے برہما کی پیدائش ہوئی۔ اس سے دیوی نے کہا تو مجھ سے شادی کر۔ برہما نے کہا "تو میری ماں ہے میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا" یہ سن کر ماں کو غصہ آیا اور لڑکے کو جلا کر خاک کر دیا۔ دیوی نے اسی طرح پھر ہاتھ گھسکر دوسرا لڑکا پیدا کیا اس کا نام وشنو رکھا۔ اس کو بھی اپنے ساتھ شادی کرنے کے لئے کہا۔ مگر اس نے بھی نہ مانا۔ چنانچہ اس کو بھی راکھ کر دیا۔ پھر اس نے تیسرے لڑکے کو پیدا کیا اس کا نام مہادیو رکھا۔ اس سے بھی کہا کہ تو مجھ سے شادی کر۔ مہادیو بولا "میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ تو دوسرا جنم بنا لے تو شادی کروں گا" چنانچہ دیوی نے ایسا ہی کیا۔

مہادیو بولا کہ یہ دو جگہ راکھ کیسی پڑی ہے۔ دیوی نے کہا کہ یہ دونوں تیرے بھائی ہیں۔ انہوں نے میرا حکم نہیں مانا تھا اس لئے راکھ کر دیئے ہیں۔ مہادیو نے کہا کہ میں اکیلا کیا کروں گا ان کو زندہ کر دے اور دو عورتیں اور پیدا کر پھر تینوں کی شادی تینوں سے ہوگی۔

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش سوامی دیانند جی صفحہ ۳۴۴)

پرانوں کی تعلیم کی مزید تفصیلات کے لئے ستیارتھ پرکاش دیکھنی چاہیئے جس میں سوامی دیانند جی نے ان کتابوں کی مضحکہ خیز انداز سے تردید کی ہے اور انہیں سخت ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ جہاں تک ان کے دھرم شاستر ہونے کا تعلق ہے اس کی بابت مسٹر آر۔ سی۔ دت اپنی مشہور کتاب (A History of Civilisation Ancient India Vol: II)

میں لکھتے ہیں۔

ان سو کہ دھرم شاستروں کے متعلق بھی ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ پورانک تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں سے بعض تو پورانک زمانہ کے ہیں لیکن ان میں بھی مسلمانوں کی فتوحات کے زمانہ کے بعد بہت سی آمیزش ہو چکی ہے (صفحہ ۱۹۷)

رامائن و مہابھارت

ان کے علاوہ ہندوؤں کے ہاں رامائن و مہابھارت بھی بڑی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ان کے مضامین سے ظاہر ہے کہ وہ صرف تاریخی کتابیں ہیں (تاریخی بھی صرف اس لحاظ سے کہ ان میں دو لڑائیوں کا ذکر ہے) ان کے زمانہ تصنیف کی تعیین بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ عام طور پر ہندوؤں کا خیال ہے کہ رامائن، مہابھارت سے بہت پہلے کی تصنیف ہے پنڈت لیکھرام صاحب تاریخ دنیا میں، مہابھارت کی تصنیف کا زمانہ ۳۱۰۰ ق۔م بتلاتے ہیں اور رامائن کو آٹھ لاکھ برس کی پرانی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ لیکن یوروپین مورخین (مثل ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ) کا خیال ہے کہ رامائن کی تصنیف کا زمانہ مہابھارت کے بعد کا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی تحقیق ہے کہ رامائن ۵۰۰ ق۔م یا اس سے بھی بعد کی تصنیف ہے اور مہابھارت قریب ۱۲۰۰ ق۔م میں لکھی گئی۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں سن عیسوی کے سینکڑوں سال بعد تک الحاقات ہوتے رہے۔ چنانچہ مہابھارت میں راجہ نل کا ذکر موجود ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ رامائن کے تعلق مسٹر گووند داس اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی تصنیف کا زمانہ قریب تیسری صدی ق۔م کا ہے (ہندو ازم صفحہ ۱۳۱) اگرچہ ہندوؤں کے عقیدہ کی رو سے مہاراج رام چندر جی کا زمانہ آج سے قریب بیس لاکھ سال پیشتر کا مانا جاتا ہے (ایضاً صفحہ ۱۶۴)

رامائن مختلف مصنفوں نے لکھی ہے اٹھارویں صدی عیسوی کے اخیر پر رامائن کے قریب بیس مختلف نسخے فقط بنارس کے ایک کتب خانہ میں موجود تھے جن میں سے ہر ایک میں واقعہ متعلقہ کی بابت بہت کچھ اختلاف پایا جاتا تھا۔ لیکن ویاس، کالیداس، ہیم چندر وغیرہ کی رامائن کے مقابلہ میں والمیکی کی رامائن بہت مشہور ہے لیکن اس کی بھی یہ حالت ہے کہ

اس میں پہلا اور ساتواں باب بعد کا اضافہ ہے۔ اور باقی متن کی بھی حالت یہ ہے کہ اس میں بے حد ردوبدل ہو چکا ہے۔ اگرچہ اتنا نہیں جتنا مہابھارت میں ...... یہ بھی یاد رہے کہ یہ محض شاعری ہے تاریخ نہیں (ہندو ازم صفحہ ۱۳۱-۱۳۲)

رامائن اور مہابھارت کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ "یہ کتابیں سینکڑوں برس کے عرصے میں جاکر

جا کر متشکل ہوئیں اور اس کے بعد بھی ان میں اضافے ہوتے رہے (The Discovery of India p. 75)

رامائن کی رو سے راجہ دسرتھ (مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار) کی تین بیویاں اور ساڑھے تین سو لونڈیاں تھیں (ہندو دھرم صفحہ ۱۲۳) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی تھی جب ان کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے (صفحہ ۱۳۲) جب مہارانی سیتا کا سوئمبر رچایا گیا تو ان کی عمر

رامائن کی تفاصیل

پانچ برس کی تھی اور جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی ہوئی تو ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا (صفحہ ۱۳۴) اس میں کس قسم کے قصے اور کہانیاں ہیں اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے جو مہاراج رام چندر جی کی پیدائش سے متعلق ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

> مہاراجہ دسرتھ کے تین رانیاں کوشلیا، کیکئی اور سومترا تھیں، لیکن کسی سے کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا لہذا بیٹے کی تمنا میں راجہ نے اشومیدھ جگ کیا، جس کا قاعدہ یہ تھا کہ جگ کرنے والے کی رانی قربانی ہونے والے گھوڑے کو ملبدان کرتی تھی اور اس گھوڑے کے ساتھ ایک رات رہتی تھی۔ چنانچہ کوشلیا نے گھوڑے کے ساتھ مراسم ادا کئے، پھر گھوڑے کو جگ میں چڑھایا گیا، یعنی اس کی سوختنی قربانی عمل میں آئی پھر کیا دیکھتے ہیں کہ جگ ریدی یعنی مذبح کی آگ میں سے ایک قوی ہیکل شخص سونے کے تھال میں کھیر لیکر نکل آیا، اور راجہ دسرتھ سے بولا کہ یہ کھیر اپنی رانیوں کو کھلاؤ۔ وہ تیرے لئے بیٹے جنیں گی۔ پس راجہ نے آدھی کھیر کوشلیا کو اور آدھی باقی رانیوں کو کھلا دی اور رانیاں حاملہ ہو گئیں۔ اور وشنو جی مہاراج چار حصے ہو کر ان رانیوں سے اس طرح پیدا ہوئے کہ کوشلیا سے رام۔ کیکئی سے بھرت اور سومترا سے لچھمن اور شتروگھن یہ چاروں بڑے ہوئے تو رام اور لچھمن میں بہت رفاقت پیدا ہوئی۔ اسی طرح بھرت اور شتروگھن آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ رفیق تھے۔ (مقدمہ تاریخ ہند قدیم صفحہ ۱۳۸)

یہ قصہ کی ابتدا تھی۔ اور اس کی انتہا یہ ہے کہ جب لنکا فتح کرنے کے بعد مہاراج رام چندر جی اجودھیا میں واپس تشریف لے آئے اور مہارانی سیتا کے ساتھ اپنے دار السلطنت میں رہنے سہنے لگے تو۔

> ایک روز سیتا جی نے تپوبن کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جہاں بالمیک رشی کا قیام تھا۔ رام نے لچھمن جی کو بلا کر حکم دیا کہ کل سیتا جی کو رتھ میں سوار کر کے تپوبن کی سیر کرا لاؤ، یہ ایک رات وہاں قیام کریں گی پھر واپس آجائیں گی، اتفاقات کو درمکھ نامی جاسوس نے حسب معمول تنہائی میں رام چندر جی کو اپنی رپورٹ سنائی اور رعایا کے حالات سے آگاہ کیا، اسی سلسلے میں اس نے کہا کہ آج میں نے ایک چمار اور چماری میں کچھ جھگڑا ہوتے ہوئے سنا، چمار نہایت حسرت کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ اب عورت کو بس میں رکھنا ہمارے لئے

دشوار ہو گیا ہے اس لئے کہ ہمارے راجہ نے ایسا بُرا نمونہ دکھایا ہے کہ اپنی رانی کو جو راون کے ساتھ فرار ہو گئی تھی پھر اپنی رانی بنا کر گھر میں رکھ لیا ہے۔ جب راجہ ہی عورت کے معاملے میں اس قدر کمزور ہے تو رعایا کیوں نہ متاثر ہو گی۔ یہ حال سنا کر دہ کھ زار وقطار رونے لگا۔ رام جی بھی بہت متاثر ہوئے اس کو رخصت کر کے اپنے تینوں بھائیوں کو بلا کر سب حال سنایا اور کہا کہ میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ صبح لچھمن جب سیتا کو بتوبن لیجائے تو یہاں کچھ نہ کہے۔ بتوبن میں پہنچا کر کہدے کہ رام نے تم کو طلاق دیدی ہے۔ اب رام کو تم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سنا کر اور سیتا کو وہاں چھوڑ کر...... واپس چلا آتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سیتا جو حاملہ بھی تھی، بے یار و مددگار اُس جنگل میں روتی ہوئی رہ گئی۔ بالمیک رشی کو معلوم ہوا تو وہ اپنی جھونپڑی میں لے گئے، وہاں سیتا کے دو جوڑواں بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام لو اور کش رکھے گئے، یہ دونوں لڑکے بالمیک رشی کے پاس بتوبن میں پرورش پا کر جوان ہوئے اور بالمیک جی نے جو اسی عرصے میں رام چندر جی کی مذکورہ داستان یعنی رامائن تصنیف کر رہے تھے ان دونوں لڑکوں کو زبانی یاد کرادی۔ ادھر رام چندر جی چند روز کے بعد سیتا کو بھول گئے اور اپنے کار و بار ریاست میں مصروف ہوئے۔ ایک روز ایک برہمن نے آکر عرضی دی کہ میرا بیٹا چھوٹی ہی عمر میں فوت ہو گیا۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ آپ کے راج میں کوئی خرابی ضرور ہے۔ رام چندر جی یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور رات دن اس تلاش میں رہنے لگے کہ میرے راج میں کونسی خرابی ہے۔ آخر انہوں نے ایک تالاب کے کنارے ایک سنیاسی کو دیکھا کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر کئے ہوئے ایک درخت میں لٹکا ہوا ہے، رام نے پوچھا تو کون ہے اور یہ ریاضت کیوں کر رہا ہے، سنیاسی بولا "میں ذات کا شودر ہوں میں نے اس لئے یہ سخت مجاہدہ اختیار کیا ہے کہ اسی جسم کے ساتھ سورگ (بہشت) میں پہنچوں" یہ سن کر رام چندر جی کو بہت غصہ آیا اور یہ کہتے ہوئے کہ او پاپی تو شودر ہو کر دوج ورن یعنی اونچی ذات والوں کے کام کر رہا ہے۔ "تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر اڑا دیا، یہ حسن عمل دیکھ کر دیوتاؤں نے اظہار خوشنودی کے لئے رام چندر جی پر پھول برسائے[1]۔ چند برسوں کے بعد رام چندر جی نے اشومیدھ جگ (گھوڑے کی قربانی) کا سامان کیا۔ اس متبرک جشن میں شریک ہونے

---

[1] ہم نے ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم اور چھوت چھات کے مسائل کے متعلق قصداً کچھ نہیں لکھا کہ ان مسائل نے آج کل مذہبی میدان چھوڑ کر سیاسی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ لیکن اس ایک واقعہ سے پوری تصویر سامنے آسکتی ہے۔ پیدائش کی رو سے انسانوں کی تقسیم و تفریق کس قدر خلاف فطرت ہے اس کی دلیل خود وہ تحریکات ہیں جو آج کل ہندوستان میں سرگرم عمل ہیں اور جن کے پیش نظر گاندھی جی کہتے ہیں کہ اگر ہندو اپنی خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے تو جب مذاہب عالم کا رحقائق کے ترازو میں وزن کیا جائیگا تو ہندو مت

(باقی صفحہ ۹۰ پر دیکھئے)

کے لیئے لو اور کُش بھی درویشانہ لباس میں والمیک جی کے حسب منشا اجودھیا پہنچے اور رام چندر جی کو رامائن کے اشعار جوان کو یاد تھے سنائے۔ جب رام چندر جی کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں نوجوان ان ہی کے بیٹے ہیں تو انہوں نے سیتاجی کو بلانے کا ارادہ کیا۔ دوسرے دن سیتاجی بھی بالمیک جی کے ہمراہ آگئیں اور بالمیک جی نے مجمع عام میں سیتاجی کی پاک دامنی کی گواہی دی، رام چندر جی نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ بالمیک جی جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ خود سیتاجی اپنی پاکدامنی کا کوئی ناقابل اشتباہ ثبوت پیش کریں، سیتاجی نے اٹھ کر قسم کھائی کہ میں نے رام کے سوا کسی دوسرے شخص کا خیال بھی نہیں کیا اور اے دھرتی ماتا تو میرے اس بیان کی صداقت کا ثبوت پیش کر کہ مجھے ابھی نگل جا۔ سیتاجی کا یہ کہنا تھا کہ زمین پھٹی اور اس میں سے ایک تخت نکلا سیتاجی فوراً اس تخت پر بیٹھ گئیں اور تخت مع سیتاجی زمین میں سما گیا۔ اس طرح سیتاجی کا خاتمہ ہوا اس واقعے کے دس ہزار سال بعد تک رام چندر جی زندہ اور برسرحکومت رہے۔ (مقدمہ تاریخ ہند قدیم صفحہ ۱۳۸-۱۵)

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۹

چھوت کے عقیدہ کی وجہ سے سب سے اچھوت رہ جائے گا۔ (ہندوستان ٹائمز ۳۰ $\frac{9}{۴۴}$)

دوسری جگہ آپ لکھتے ہیں۔

یہ چیز قدامت پسند ہندومت اور سناتنی ہندوؤں کے لئے موجب شرم ہے کہ مذہبی رسم ان اچھوتوں کو ان حقوق سے بھی محروم رکھتی ہے جو انہیں (ملک کا) قانون عطا کرتا ہے اور بدقسمتی سے یہ بھی درست ہے کہ بعض اوقات رسم، قانون پر غالب آجاتی ہے۔ لیکن رائے عامہ اب آہستہ آہستہ اس وحشی رسم کے خلاف اٹھ رہی ہے اور تھوڑے سے وقت میں یہ رسم معدوم ہو جائے گی (ہریجن بابت ۲۹ $\frac{12}{۴۶}$)

اچھوتوں کی اصلاح (اور اسی قسم کی دیگر اصلاحات جو ہندوؤں کے ہاں آہستہ آہستہ ہو رہی ہیں۔ مثلاً نکاح بیوگان۔ بیوی کا وراثت میں حصہ حق طلاق وغیرہ) ہمارے لئے موجب مسرت ہیں کہ اس سے انسانوں کو ان کے فطری حقوق ملتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کی بھی شہادت بہم پہنچاتے ہیں کہ دنیا کس طرح مجبور ہو کر اپنی تعلیم کو چھوڑ کر قرآن کی فطری تعلیم کی طرف آرہی ہے۔ لیکن چھوت چھات کو محض ایک رسم کہنا کتمان حقیقت ہے تناسخ ہندوؤں کے ہاں بنیادی عقیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور انسانوں کی پیدائشی تفریق اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے چھوت چھات سے انکار، عقیدہ تناسخ کا انکار ہے۔ پھر چار ورنوں کی تقسیم کا حکم خود ویدوں میں موجود ہے جہاں یہ بصراحت لکھا ہے کہ "برہمن برہما کے منہ سے پیدا ہوئے، کھشتری اس کے بازوؤں سے، ویش اس کے پیٹ سے اور شودر اس کے پاؤں سے" اس لئے ہم "خدائی تقسیم" کو جو ویدوں میں موجود ہے، محض ایک رسم کہنا درست نہیں۔ یہ ویدوں کا حکم اور شاستروں کا فرمان ہے اور اس لئے ہندو دھرم کا بنیادی عقیدہ۔

اور اس قسم کی باتیں بھی لکھی ہیں۔

برہما کی بیٹی اہلیا جو گوتم رشی کی بیوی تھیں اس کے ساتھ اندر دیوتا نے جو گوتم رشی کے شاگرد تھے، ناشائستہ برتاؤ کیا اور گوتم رشی نے اندر کو بد دعا دی جس سے ان کے جسم پر ایک ہزار علامات تانیث نمودار ہو گئیں اور اہلیا کو پتھر کا بنا دیا (ایضاً صفحہ ۱۳۸)۔

ہندوؤں کے ہاں رسول کا صحیح تصور کہیں نہیں ملتا۔ وہ اپنے مشاہیر کو خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ چنانچہ رام چندر جی کی بھی اسی طرح سے پرستش ہوتی ہے۔ لیکن اب خود ہندوؤں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ ایک انسان کس طرح سے خدا ہو سکتا ہے؟ ہندوؤں کے سیاسی اور مذہبی راہ نما، مہاتما گاندھی، رام نام کی پرستش کرتے ہیں اور اپنی پرارتھنا میں اس کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ذیل کا سوال اور اس کا جواب ہریجن بابت ۲۲ ستمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوتے ہیں۔ سوال کرنے والا ایک ہندو ہے اور جواب مہاتما گاندھی کے قلم سے ہے۔

سوال۔ وہ رام، جسے آپ (مہاتما گاندھی) غیر فانی سمجھتے ہیں، کس طرح دسرتھ کا بیٹا اور سیتا کا خاوند ہو سکتا ہے؟

جواب۔ سنت تلسی نے بھی یہ سوال اٹھایا ہے اور اس کا خود ہی جواب بھی دیا ہے۔ اس جواب کو عقلی طور پر سمجھایا نہیں جا سکتا۔ اس سے عقلی تشفی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو دل کی بات دل سے ہے۔ میں بھی ابتدا میں اس رام کی پرستش کرتا تھا جو سیتا کا خاوند ہے۔ لیکن جوں جوں خدا کے متعلق میرا علم اور تجربہ بڑھتا گیا وہ رام غیر فانی اور حاضر و ناظر ہوتا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ رام سیتا کا خاوند نہیں رہا لیکن رام کے تصور کی وسعت سے سیتا کے خاوند کا مفہوم بھی وسیع ہوتا چلا گیا.... اس شخص کے لئے رام کبھی حاضر و ناظر نہیں ہو سکتا جو اسے صرف دسرتھ کا بیٹا سمجھتا ہے۔ لیکن جو شخص رام کو خدا مانتا ہے اس کے لئے اس حاضر و ناظر خدا کا باپ بھی حاضر و ناظر ہو جاتا ہے۔ باپ اور بیٹا ایک ہو جاتے ہیں...... جب ہمیں صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کی حقیر سی خودی فنا ہو جاتی ہے اور سب کچھ خدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت رام دسرتھ کا بیٹا، سیتا کا خاوند، بھرت اور لکشمن کا بھائی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ اور اس کے باوجود غیر مخلوق اور ازلی خدا بھی ہوتا ہے...... رام کا مسئلہ ایسا ہے جو عقلی حدود سے ماورا ہے۔

چونکہ اس وقت ہمارا مقصد تنقید نہیں بلکہ محض وقائع نگاری ہے اس لئے خدا کے اس تصور کے متعلق کچھ کہے بغیر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

مہا بھارت کو ویاس جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے، جنہوں نے اس جنگ کے حالات بچشم خویش دیکھ کر لکھے تھے

اگر یہ صحیح ہے تو مہابھارت کی جنگ کا واقعہ قریب سنہ ۶۰۰ ق م کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ مہابھارت

مہابھارت کے موجودہ نسخوں کے متعلق مسٹر گووند اس لکھتے ہیں

ان میں بڑے بڑے اختلاف پائے جاتے ہیں۔ تین مختلف مرتب شدہ کتابوں کا ذکر تو خود مہابھارت کے اندر موجود ہے۔ (ہندوازم صفحہ ۱۴۱)

اس کتاب میں ہستنا پور کی ریاست کے لئے دو رشتہ دار خاندانوں (کورو پانڈو) کی جنگ کا ذکر ہے جو اٹھارہ دن تک رہی اور جس میں کہا جاتا ہے کہ مختلف اندازوں کے مطابق (۹۹،۰۷۶،۲۲۸) آدمی مارے گئے (ہندوازم صفحہ ۱۴۱) مہابھارت کے متعلق خود اس کے آدی پرب ادھیائے اول میں لکھا ہے کہ پہلے زمانہ میں دیوتاؤں نے مل کر ترازو کے ایک پلڑے میں چار وید اور دوسرے میں مہابھارت کو رکھا۔ مہابھارت کا وزن چاروں ویدوں سے زیادہ نکلا ...... نیز اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں پورے ساٹھ لاکھ اشعار ہیں جن میں سے تیس لاکھ اشعار دیولوک (عالم بالا) میں پڑھے جاتے ہیں۔ پندرہ لاکھ پتری لوک میں، چودہ لاکھ گندھرو لوک میں اور باقی ایک لاکھ منش لوک (انسانوں کی دنیا) میں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو مہابھارت اس دنیا میں موجود ہے اس کے ایک لاکھ اشعار ہیں۔ لیکن لیبا نے ان اشعار کی گنتی دو لاکھ پندرہ ہزار بتائی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مہابھارت میں مختلف ادوار میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ بھگوت گیتا، شکنتلا، رگھونس میگھ دوت وغیرہ متعدد رسالے مہابھارت کا جزو بن چکے ہیں۔ مہابھارت میں لکھا ہے کہ

دروپدی کے پانچ خاوند تھے۔ (۱) یدھشٹھر (۲) بھیم سین (۳) ارجن (۴) نکل (۵) سہدیو ان پانچوں خاوندوں سے ایک ہی بیوی دروپدی میں سے علی الترتیب پانچ بیٹے بھی پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ یدھشٹر کے فرزند کا نام (۱) پرتی وندیہ اور بھیم سین کے ارجمند کا نام (۲) سوت سوم۔ اور مہاراجہ ارجن کے بیٹے کا نام (۳) شرت کرما۔ اور نکل کے برخوردار کا نام (۴) شتانیک جس کا ذکر اتھروید کانڈ ۱ سوکت ۳۵ نمبر ۱ میں بھی پایا جاتا ہے اور سہدیو کے بیٹے کا نام (۵) شرت آشن لکھا ہے۔ چنانچہ جب راجہ دروپد اپنی بیٹی کے پانچ خاوند سن کر افسوس کرنے لگا تو مہرشی دیاس جی نے فرمایا اے دروپد! تو افسوس نہ کر۔ کیونکہ ایک عورت کے ایک ساتھ انیک (متعدد) خاوند ہونا ہی مین دیدک دھرم ہی ہے

(مہابھارت آدی پرب ادھیائے ۱۹۷ وغیرہ بحوالہ ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۴۲)

ایک عورت کے متعدد خاوندوں کے متعلق دیگر مقامات سے بھی شواہد ملتے ہیں۔ مہابھارت ہی میں لکھا ہے کہ پرانوں کی روایت کے مطابق زٹیلی کنیا سے سات رشیوں نے ایک ساتھ بیاہ کیا تھا۔ نیز وارکشی نامی منی کنیا سے پرچیتا نامی دس برہمن بھائیوں نے ایک ساتھ نکاح کیا تھا۔ یہ بھائی ویدوں کے مصنف (رشی) بھی ہیں۔ (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۴۳)

نیز مہابھارت ادیوک پرب ادھیائے ۱۱۱–۱۲۰ میں لکھا ہے کہ

گالب منی اپنے گورو وشوامتر رشی گورو دکشنا دینے کے لئے ہنس کے بیٹے ییاتی راجہ کے پاس کالے کانوں والے آٹھ سو گھوڑے مانگنے کے لئے گئے ییاتی نے ایسے گھوڑے نہ ہونے سے معذور ہو کر اپنی خوبصورت بیٹی مادھوی نامی گالب کے حوالے کر کے کہا کہ میرے پاس تو شیام کرن یعنی کالے کانوں والے آٹھ سو گھوڑے نہیں ہیں اس لئے تو میری بیٹی کو دے کر ایسے گھوڑے لینا۔ گالب پہلے مادھوی کو کاشی کے راجہ ہرکیشو کے پاس لے گیا اور اس سے بیاہ کر کے ۲۰۰ کالے کانوں والے گھوڑے حاصل کئے۔ چنانچہ راجہ ہرکیشو جب مادھوی سے وسومنا نامی بیٹا پیدا کر چکا تو پھر گالب منی نے مادھوی کا بیاہ دیوداس راجہ سے کر کے ۲۰۰ مزید گھوڑے حاصل کئے۔ اور جب راجہ دیوداس بھی مادھوی سے پرتردن نامی بیٹا پیدا کر چکا تھا تب پھر گالب منی نے مادھوی کا بیاہ راجہ اشی نر سے کر کے ۲۰۰ مزید شیام کرن گھوڑے حاصل کئے۔ اور جب راجہ اشی نر بھی مادھوی میں شوی نامی بیٹا پیدا کر چکا تو پھر گالب منی چھ سو شیام کرن گھوڑے اور مادھوی کو اپنے گورو وشوامتر کے پاس لے گیا۔ وشوامتر نے کہا کہ اے گالب! تم نے پہلے ہی اس خوبصورت لڑکی جیسے بیش بہا ہیرے کو مجھے ہی کیوں نہ دیدیا۔ ایسا ہونے سے میں آپ ہی کیوں نہ کل پوتر کرنے والے چار پتروں کو اتپن (پیدا) کر لیتا۔ جو ہو اس وقت ایک ہی بیٹا پیدا کرنے کے لئے اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ بیاہ کرتا ہوں۔" چنانچہ وشوامتر جیسے مرتاض رشی نے بھی مادھوی سے بیاہ کر کے جب اشٹک نامی بیٹا پیدا کر لیا تو پھر اسی مادھوی کا سوئمبر رچنے کے لئے اس کے دونوں بھائی پریاگ (الہ آباد) گئے اور مادھوی کا نکاح ارینہ نامی راجہ سے کر دیا گیا۔ اس طرح مادھوی بنت ییاتی کے پانچ خاوندوں (۱) ہرکیشو (۲) دیوداس (۳) اُشی نر (۴) وشوامتر (۵) ارینہ نامی تھے۔ جن میں سے پہلے چاروں کے بیٹے (۱) وسومنا (۲) پرتردن (۳) شوی (۴) اشٹک پیدا ہوئے۔ (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۳۲–۱۴۱)

※

رامائن کی طرح مہابھارت کے متعلق بھی اب ہندوؤں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ جنگ چچازاد بھائیوں میں تخت و تاج کے جھگڑے پر واقع ہوئی تھی لیکن اسے مقدس جنگ قرار دیا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی مہاتما گاندھی کے اخبار ہریجن (بابت ۱۲/۴۶ ۲۲) میں حسب ذیل سوال و جواب شائع ہوئے ہیں۔

سوال۔ مہابھارت کی جنگ کو دھرم یدھ یعنی مقدس جنگ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ جنگ باہمی خون خرابہ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ یونہی سمجھئے جیسے آج کل سول وار (خانہ جنگی) یا رشتہ داروں کی جنگ ہو جائے۔ کیا اسی

جنگ کو حق و صداقت کی جنگ کہا جا سکتا ہے؟

جواب - مہابھارت کی جنگ ایک خاندانی جھگڑا تھا - جو تخت و تاج کے حق کے سوال پر دو شاہی خاندانوں میں برپا ہوا اور اس زمانہ کے آئینِ جنگ و جدل کے مطابق لڑا گیا ... اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ جو لڑائی اس وقت کے آئینِ جنگ کے مطابق لڑی جائے اسے حق و صداقت کی جنگ کہدیا جائے - یعنی وہ جنگ جو آئین (دھرم) کے مطابق لڑی جائے -

اس سے بھی آگے بڑھئے تو مہاتما گاندھی، مہابھارت کے واقعہ کو تاریخی واقعہ ہی تسلیم نہیں کرتے - وہ لکھتے ہیں -

میرے خیال میں مہابھارت ایک تمثیل ہے، تاریخ نہیں ہے - دروپدی (کے پانچ خاوندوں) سے مراد روح کا حواسِ خمسہ کے ساتھ تمسک ہے - (ہریجن بابت ۲۴/۴/۴۶)

پنڈت جواہر لال نہرو اس باب میں لکھتے ہیں :-

رامائن اور مہابھارت کا زمانہ تصنیف متعین کرنا مشکل ہے ..... اتنا ظاہر ہے کہ انہیں بہت سے مصنفوں نے لکھا اور بعد میں بہت سے زمانوں میں اضافے ہوتے رہے .... مہابھارت میں ویدوں کی شرک کی تعلیم اُپنشدوں کے وحدت وجود، مذہب فطرت (یعنی خدا پر ایمان لیکن وحی سے انکار) کا مسلک تنویت اور توحید ہر قسم کی تعلیم ملتی ہے - اس میں گائے اور بچھڑے کے گوشت سے معزز مہمانوں کی تواضع کا تذکرہ بھی ہے

(The Discovery of India p. 81, 83)

٭٭٭

ہم نے ابھی ابھی لکھا ہے کہ مہابھارت میں بھاگوت گیتا بھی شامل ہے - گیتا کا تذکرہ آج کل آپ نے عام طور پر سنا ہوگا - یہ کتاب سری کرشن جی مہاراج کی طرف منسوب کی جاتی ہے یعنی یہ مجموعہ ہے ان نصائح کا جو سری کرشن جی مہاراج نے میدانِ کارزار میں ارجن کو کیں لیکن ڈاکٹر داس گپتا کی تحقیق کے مطابق گیتا کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اُپنشدوں سے مستعار لیا گیا ہے (داس گپتا - جلد دوم صفحہ ۴۳۷) گیتا کے متعلق یہ طے نہیں ہو سکا کہ یہ کس عہد کی تصنیف ہے - اور جب زمانہ تصنیف کا تعین نہیں ہو سکا تو پھر مصنف کے متعلق بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا - ڈاکٹر داس گپتا کا بیان ہے کہ بھگوت گیتا میں برہم سوتر کا حوالہ موجود ہے - اور برہم سوتر دوسری صدی قبل مسیح کے بعد کی تصنیف قرار دی جا سکتی ہے - تحقیق یہ ہے کہ بھگوت گیتا دراصل (The Ekanti Vaisnavas) کی تصنیف ہے (داس گپتا جلد اول صفحہ ۴۲۱ - ۴۲۲) اس تحقیق کی رو سے سری کرشن جی مہاراج کی طرف اس کا انتساب بھی صحیح نہیں رہتا - گیتا میں عمل اور حرکت کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ اس جمود و تعطل کا ردِ عمل ہے جو یوگ اور ویدانت کے ہندی تصوف کی رو سے

گیتا

ہندو قوم کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ . . . . یہی وجہ ہے کہ اب ہندو قوم اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لئے سری کرشن جی مہاراج ہی کو اپنی زندگی کا نمونہ قرار دے رہی ہے اور گیتا کی تعلیم عام ہو رہی ہے اور دیگر کتب مقدسہ (حتی کہ وید بھی) پس پشت ڈالے جا رہے ہیں۔ لیکن سری کرشن جی مہاراج کے متعلق بھی ان کے ہاں عجیب و غریب روایات ہیں۔ ان میں سے ہم صرف ایک روایت درج کر سکتے ہیں۔ مہابھارت میں ہے

> وشوامتر، کنوا، اور نارد، تینوں رشی دوارکا میں آئے، چند نوجوانوں نے ان رشیوں سے اس طرح تمسخر کیا کہ کرشن جی کے ایک بیٹے سانب کو عورت کا لباس پہنا کر ان کے سامنے لائے اور کہا کہ یہ عورت حاملہ ہے آپ بتائیں کہ اس کے پیٹ سے کیا پیدا ہوگا۔ رشیوں نے ناراض ہو کر غصے کی حالت میں کہا کہ اس سے ایک لوہے کا موسل پیدا ہوگا جس سے جادو بنس (کرشن جی کے خاندان کا نام) کی تباہی ہوگی۔ دوسرے ہی دن سانب سے لوہے کا ایک موسل پیدا ہوا۔ اگرسین نے اپنے خاندان کو اس بربادی سے بچانے کے لئے اس موسل کو توڑ وا کر باریک باریک ذرات بنوائے اور ان کو سمندر میں پھنکوا دیا۔ وہ ذرات سمندر کے کنارے آکر جم گئے جن سے بکثرت جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہو گئے۔ ان ذرات میں ایک لوہے کا ٹکڑا اتفاقاً باریک ہونے سے رہ گیا تھا، اس کو ایک مچھلی نگل گئی۔ مچھلی ایک شکاری کے ہاتھ آئی۔ اس کو مچھلی کے پیٹ میں سے . . . لوہے کا ٹکڑا ملا، اس نے اس سے تیر کا ایک پیکان بنایا۔ چند روز کے بعد تمام جادو بنسی مع کرشن مہاراج سمندر کے کنارے بغرض سیر و تفریح گئے وہاں سب نے شراب پی، شراب کے نشے میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے، کرشن جی نے سمندر کے کنارے سے جھاڑ جھنکاڑ کثیر لے جو ان کے ہاتھ میں آتے ہی، ایک موسل کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ کرشن جی نے اس موسل سے باقی ماندہ جادو بنسیوں کو ہلاک کر دیا، اس کے بعد کرشن جی ایک جھاڑی میں جا بیٹھے، ان کا جسم درختوں میں بالکل چھپ گیا تھا۔ مگر پاؤں کا ایک تلوا دور سے نظر آتا تھا۔ اتفاقاً وہی مذکورہ شکاری اس طرف کو گزرا اور کرشن جی کے تلوے کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ اس جھاڑی میں کوئی ہرن بیٹھا ہے، چنانچہ اس نے تاک کر تیر چلایا۔ تیر نشانے پر صحیح بیٹھا اور کرشن جی کا کام تمام ہوا۔ (مقدمہ تاریخ ہند قدیم صفحہ ۱۳۶)

باقی رہی سری کرشن جی مہاراج کی تعلیم، آپ کی عملی جد و جہد اور اس کے نتائج۔ سو اس کے متعلق خود ہندو لیڈروں کی آراء قابل غور ہیں۔ اخبار تیج کے کرشن نمبر بابت، ستمبر ۱۹۳۹ء میں پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے تحریر فرماتے ہیں:

> ویدک دھرم مٹ چکا تھا اس کا صرف نام باقی تھا . . . . . ایسے وقت میں شری کرشن نے ویدک تہذیب کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لئے جو جد و جہد کی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں دوسری نہیں ملتی۔ یہ سچ ہے کہ کرشن جی کو دھرم کے تھوڑا رکھنے میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ان کی کوشش سے مطابقت رکھ سکے جو گراوٹ

شری کرشن جی کی زندگی سے پہلے شروع ہوئی وہ اب تک جاری ہے۔

اور سوامی دیانند جی لکھتے ہیں۔

مہابھارت کی جنگ میں نہ صرف آریہ کشتری ہی بلکہ آریہ برہمن بھی بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ یہ بات شری کرشن جی کی آخری سوانحعمری سے بھی واضح ہو جاتی ہے...... لیکن آریہ جاتی کے اپنے اندرونی نقائص محض جنگی فتح سے دور نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے تو ایک معقول مدبرانہ علاج کی ضرورت تھی۔ اس وقت ایسا ڈاکٹر آریہ جاتی کو نصیب نہ ہوا اور شری کرشن جی اپنا کام پورا کئے بغیر ہی اس جہان سے کوچ کر گئے۔ اگر ان کی ابتدائی کوشش یدھشٹر اور دریودھن میں مصالحت پیدا کر سکتی تو وہ ویدک تہذیب کو از سرِ نو قائم کرنے کا تعمیری کام کر سکتے...... اور مہابھارت کی جنگ اتنی عظیم جنگ ہوئی کہ یدھشٹر کی عالی شان فتح آریہ جاتی کو اس کی شکست سے بھی زیادہ مہنگی پڑی۔

سری کرشن جی مہاراج کو بھی خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ انہیں بھی انسان سمجھا جانے لگاہے۔ ہرجن میں ایک صاحب نے سوال کیا ہے کہ جب جنگ مہابھارت میں کرشن جی نے قسم اٹھائی تھی کہ وہ ہتھیار کا استعمال نہیں کریں گے تو پھر انہوں نے بھیشم کے خلاف سدرشن چکر کیوں چلایا۔ اس کے جواب میں لکھا ہے۔

اگر قسم توڑنے کا یہ واقعہ صحیح ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کرشن جی، اتنی بڑی ہستی ہونے کے باوجود، انسان ہی تھے اور غلطی کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مہابھارت میں یہ بھی لکھا ہے کہ کرشن جی کی اُس فروگذاشت پر بھیشم نے انہیں شرم دلائی اور اُن کے شاگرد اور دوست ارجن نے انہیں اس سے بروقت روک دیا۔ (ہرجن بابت ۲۴/۴۴)

گیتا کی تعلیم کے متعلق پنڈت جواہرلال نہرو لکھتے ہیں۔

آج ہر فلسفہ اور فکر کے مختلف مدعی گیتا ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے مطلب کے مطابق اس کی تفسیر کر رہا ہے (حتیٰ کہ گاندھی جی (اگر) اپنے عقیدہ اہنسا کی بنیاد گیتا پر رکھتے ہیں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو ہنسا (تشدد) اور جنگ کا جواز بھی اسی سے ثابت کرتے ہیں۔

(The Discovery of India p. 83)

⁂

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ہندوؤں کے آستک گروہ سے متعلق ہے جو ویدوں کو مانتا ہے دوسرا گروہ ناستک ہے جو نہ خدا کو مانتا ہے نہ ویدوں کو (لیکن بایں ہمہ یہ بھی ہندو ہی ہیں) ان میں بدھ اور جین زیادہ مشہور ہیں۔

بدھ مت

بدھ مت کے بانی مہاتما گوتم بدھ (قریب ۵۶۰ ق۔م میں پیدا ہوئے۔ ان کا مذہب درحقیقت

ردِ عمل تھا۔ برہمنوں کے استبداد اور ان کے رسم و رواج پر مبنی مذہب کے خلاف۔ تقریب اسّی سال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی۔ آپ کی سب تعلیم زبانی تھی اس لئے اپنی وفات کے وقت انہوں نے کوئی کتاب (تحریری) نہیں چھوڑی ان کی تعلیم ان کی وفات کے سینکڑوں سال بعد تک بھی مدون نہیں ہوئی۔ بدھ مت کا لٹریچر پالی زبان میں ہے اور تین مجموعوں پر منقسم۔ (۱) سُتّہ (Sutta) معتقدات سے متعلق۔ (۲) ونایا (Vinaya) بھکشوؤں کی زندگی سے متعلق آئین و ضوابط۔ اور (۳) ابھی دھما (Abhi Dhamma) معتقدات سے متعلق فنی اور عملی انداز کا مجموعہ۔ بدھ مت کی تاریخ کے علماء و محققین ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس لٹریچر کی تدوین و ترتیب کا زمانہ کونسا ہے۔ چنانچہ قیاس ہے کہ یہ مجموعے تیسری صدی ق۔م میں مرتب ہوئے (داس گپتا صفحہ ۲۳، ۲۴) عیسائیت سے متعلقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس مذہب کی کتب مقدسہ کی تدوین و ترتیب کے لئے کونسلیں منعقد ہوتی تھیں۔ یہی بدھ مت کے ساتھ بھی ہوا۔

بدھ کی وفات کے بعد اس کے مشہور شاگردوں کی ایک کونسل مدعو کی گئی تاکہ وہ اس مت کے نصاب اور تعلیم کو منضبط کرے۔ ان میں سے تین شاگرد منتخب کئے گئے تاکہ وہ اس تعلیم کو جو انہوں نے اپنے استاد سے سنی تھی منضبط تحریر میں لائیں۔ پہلے نے ضابطہ زندگی سے متعلق تعلیم کو دہرایا۔ اُپالی نے رسوم و اخلاق سے متعلق حصہ کو بیان کیا۔ انند نے معتقدات سے متعلق اپنے استاد کے ارشادات پیش کئے۔ کونسل سات ماہ تک منعقد رہی اور اس کے بعد بدھ مت کے متعلق تین شاخوں میں منقسم تعلیم معرض وجود میں آگئی۔

بدھ کی وفات کے قریب ایک سو سال بعد ایک اور کونسل منعقد ہوئی تاکہ وہ ان اغلاط و اباطیل کو زائل کرے جو رفتہ رفتہ اس کی تعلیم میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہ تجویز ہوا کہ کھانے پینے۔ منشیات اور دان میں سونا چاندی لینے کے متعلق احکامات میں ترمیم کی جائے۔ اس الحاد کی پاداش میں دس ہزار بھکشوؤں کا تنزل کر دیا گیا اور انہوں نے ایک نیا فرقہ بنا لیا۔

بادشاہ اشوک کے زمانہ میں تیسری کونسل منعقد ہوئی اور انہوں نے ساٹھ ہزار بھکشوؤں کو الحاد کے الزام میں تنزل کر دیا اور انہیں مت سے خارج کر دیا۔

(Ten Great Religions By Rev: J. Freeman)

فرقے

یوں تو بدھ مت میں آج بہت سے فرقے موجود ہیں لیکن ان میں دو فرقے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یعنی شمالی اور جنوبی۔ جنوبی فرقہ کی کتابیں وہی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے شمالی فرقہ کی مقدس کتاب للیتاوستارا ہے۔ یہ فرقے دورِ حاضرہ کی پیداوار نہیں۔ کتاب (Buddhaghosa

کے تصنیف کے وقت (یعنی قریب سنہ ۱۸ء میں) بھی یہ موجود تھے۔ ان کی کتابوں میں باہمی بجد تضاد ہے۔ بدھ مت خدا کی ہستی کا منکر ہے (اسی سے ظاہر ہے کہ جس شکل میں یہ مذہب آج موجود ہے اس کی تعلیم کبھی الہامی نہیں ہو سکتی)، مہاتما بدھ کی طرف منسوب کردہ تعلیم میں بھی عجیب و غریب خلاف عقل اور خلاف واقعہ باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دنیا کے بیچ میں ایک پہاڑ ہے جس کی لمبائی تیرہ لاکھ چالیس ہزار میل ہے (حالانکہ ظاہر ہے کہ ہمارے کرۂ ارض کا تمام محیط ۲۴ ہزار میل سے زیادہ نہیں)، یا مثلاً یہ کہ جب مہاتما بدھ سواکھتی میں مقیم تھے تو ایک دیوتا آسور راہو نامی نے چاند کو پکڑ لیا۔ چاند نے مہاتما بدھ کی دہائی دی۔ بدھ نے راہو کو حکم دیا کہ وہ چاند کو چھوڑ دے۔ چنانچہ راہو نے چاند کو چھوڑ دیا اور اس پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ بھاگ گیا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ بدھ مت کی تعلیم کی رو سے مہاتما بدھ خدا کی ہستی کے منکر تھے۔ لیکن اب ہر جگہ مہاتما بدھ کے بت کی پرستش ہوتی ہے۔ یعنی اب انہیں خود خدا بنا لیا گیا ہے (مزید تفصیل کے لئے معارف القرآن جلد اول ملاحظہ کیجیے)

جین مت جین مت کے بانی مبانی مہاتما مہاویرہ مہاتما بدھ کے ہمعصر تھے اور یہ مذہب بھی برہمنیت کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔ جینیوں کے عقیدہ کی رو سے جین مت ازلی ہے اور یہ پیغام مختلف ادوار میں (Tin Tham Karas) کی معرفت آتا رہا ہے۔ مہاویر آخری ترتھنکر تھے۔ ان سے ۲۵۰ سال پہلے ایک اور ترتھنکر آیا تھا لیکن اس سے پہلا ترتھنکر قریب ۸۴ ہزار سال پیشتر آیا تھا۔ آخری ترتھنکر (یعنی مہاتما مہاویر) اس سلسلہ کی چوبیسویں کڑی تھے۔ جین مت میں خدا کا انکار ہے لیکن ان ترتھنکروں کو خدا سمجھ کر ان کی پرستش ہوتی ہے (دواس گپتا صفحہ ۱۷۱)۔ اس مت کے دو مشہور فرقے ہیں۔ سوتمبر (سفید لباس پہننے والے) اور ڈگمبر (ننگے رہنے والے) سوتمبر کا دعویٰ ہے کہ مہاتما مہاویر کی اصلی تعلیم ان کے پاس ہے۔ لیکن ڈگمبر کہتے ہیں کہ ان کی اصلی تعلیم قرآن کے ساتھ ہی ضائع ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کے مدعی بھی ہیں کہ اصل فرقہ ڈگمبر ہی ہے اور جو معتقدات و رسومات ان کے ہاں جاری ہیں وہ اصل سرچشمہ سے ماخوذ ہیں۔ رفتہ رفتہ ان میں اور فرقے بھی پیدا ہو گئے جن کی تعداد ۸۴ تک بتائی جاتی ہے۔ جینیوں کے نزدیک شروع میں ۱۲ پُروا اور ۱۱ انگ مقدس کتابیں تھیں۔ پر وہ کچھ عرصہ کے بعد بالکل کھو گئیں۔ اب صرف انگ باقی ہے (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ڈگمبر ان کی اصلیت کے بھی منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سوتمبر فرقہ کی خانہ ساز کتابیں ہیں)، اس مت میں سادھو کی زندگی سب سے بہتر زندگی ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ضروریات زندگی سے اپنے پاس کچھ نہ رکھے اور بھیک مانگ کر گذارہ کرے۔ ان کی تمام متاع ستر پوشی کے کپڑے، کمبل، کشکول، جھاڑو اور ایک کپڑے کے ٹکڑے پر مشتمل ہوتی ہے جس سے وہ اپنا منہ ڈھانپے رکھتے

ہیں تاکہ کوئی کیڑا مکوڑا اندر نہ چلا جائے اور اس طرح جیو ہتیا (جاندار وں پر ظلم) ہو جائے۔ ڈگمبر کپڑوں سے بھی بے نیاز رہتے ہیں۔ ان کی ریاضتیں بڑی جاں کاہ ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ دن رات میں صرف تین گھنٹے تک سونے کی اجازت ہے سوامی دیانند جی کا بیان ہے، کہ جینیوں نے اپنی قوت کے زمانہ میں وید وغیرہ کی قسم کی جتنی کتابیں پائیں انہیں تلف کر دیا اور ان کی تعلیم کو بھی برباد کر دیا (ستیارتھ پرکاش)۔ ان کے ہاں بھی توہم پرستی کی عجیب و غریب داستانیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے پہلے تری تھنکر (جن) کا قد پانچسو بانس کا تھا اور اس کی عمر چوراسی لاکھ سال۔ دوسرے تری تھنکر کا قد چار سو بانس رہ گیا اور عمر بہتر لاکھ سال۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تعداد کم ہوتی گئی۔

※

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ ہندو مذہب میں کوئی مقدس کتاب ایسی نہیں جس کے متعلق یہ حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکے کہ یہ من و عن وہی اور ویسی ہی ہے جیسی ان کے مذہب کے بانی نے انہیں دی تھی۔ اور ان کتابوں میں جو کچھ مذکور ہے وہ خود اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ ایسی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں قرار دی جا سکتی[1]، وہ تو خیر پھر بھی پرانے زمانے کی بات ہے ان کے ہاں تو کیفیت یہ ہے کہ آریہ سماج فرقہ دور حاضرہ میں وجود میں آیا ہے۔ اس کے بانی سوامی دیانند جی نے اپنی زندگی میں اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش چھاپ کر ۱۸۷۵ء میں شائع کی۔ اس کے بعد اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں آریہ سماج لاہور کی طرف سے جو (اردو) مستند ایڈیشن شائع ہوا ہے اس میں سیکرٹری آریہ سماج کے قلم سے جو دیباچہ لکھا گیا ہے اس میں تحریر ہے کہ

ستیارتھ پرکاش

اس لئے لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ۱۸۷۵ء کا ستیارتھ پرکاش قطعی مستند ہے۔ اس لئے کہ یہ ستیارتھ پرکاش سوامی دیانند کی حین حیات میں مروج تھا۔ اور کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی سد عانت دشیک اس کی اصلاح کر دی

---

[1] اس سے یہ مراد نہیں کہ ان کتابوں میں کوئی ایک بات بھی درست نہیں۔ ان میں بھی کہیں کہیں نیکی اور سچائی کی تعلیم کے آثار مل جائیں گے۔ اس سے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کسی زمانہ میں آسمانی تعلیم پر مشتمل تھیں تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر باقی رہ جاتی ہے کہ جس شکل میں یہ کتابیں آج ہمارے سامنے موجود ہیں وہ غیر محرف آسمانی تعلیم کی شکل نہیں ہے اس لئے اس قسم کی محرف تعلیم انسانی زندگی کے لئے ضابطۂ عمل نہیں بن سکتی۔ دین کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا ایک ایک حرف منجانب اللہ ہے۔ اور اس میں کہیں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اس قسم کے دینی صحیفہ کی اطاعت، اطاعت خداوندی کہلا سکتی ہے نہ کہ محرف کتابوں کی اتباع۔

نقلی اس کے برعکس جو ستیارتھ پرکاش آج کل آریہ سماج میں مروج ہے وہ کسی صورت میں بھی مستند نہیں مانا جاسکتا اس لئے کہ وہ سوامی دیانند کے مرنے کے بعد شایع ہوا ہے۔ اور اس میں سوامی دیانند کے خیالات کو زیادہ تر دبایا اور قتل کیا گیا ہے۔ جیساکہ دونوں کے پہلو بہ پہلو مطالعہ کرنے سے ثابت ہوگا۔ میں سوامی دیانند کے اصل ستیارتھ پرکاش کو آریہ سماجیوں اور غیر آریہ سماجیوں کے ہاتھ میں دے کر ان سے التماس کرتا ہوں کہ وہ ستیہ کو گرہن کریں اور استیہ کو چھوڑ دیں۔ عقلمندوں کو اشارہ کافی ہے۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے

(دھرم پال سیکریٹری آریہ سماج لاہور)

پھر آخر میں لکھا ہے۔

اس لئے میں صدق دل سے تمام آریہ سماجیوں اور پرتی ندھی سبھاؤں سے یہ پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ مروجہ نقلی ستیارتھ پرکاش کو جو کہ سوامی دیانند کے مرنے کے بعد شایع کیا گیا ہے ایک جگہ ڈھیر لگاکر جلادیں اور اصلی ستیارتھ پرکاش مطبوعہ بنارس ۱۸۷۵ء کے سامنے جو کہ سوامی دیانند کی عین حیات میں مروج تھا اور جس کا اردو ایڈیشن میں ان کے سامنے پیش کرتا ہوں سر تسلیم خم کریں تاکہ تمام جھگڑے فساد دور ہو جائیں اور آریہ سماج کا دامن تمام دھبوں سے پاک ہو جائے۔ کیونکہ اصلی ستیارتھ پرکاش کی موجودگی میں اب نقلی ستیارتھ پرکاش کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

(دھرم پال۔ سیکریٹری آریہ سماج۔ لاہور)

❊

آریوں پر بحث کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ اب تحقیقات جدیدہ کا رُخ کسی اور طرف بھی جارہا ہے مسٹر (E. F. Orton) کا خیال ہے کہ آریہ دراصل سمیری قوم کے قبائل تھے جو کالڈیہ (بابل۔ میسوپٹومیا) میں رہتے تھے۔ اور [illegible] اور [illegible] ق۔م کے قریب وہاں سے منتقل ہو کر سندھ اور جنوبی پنجاب کی طرف آئے۔ دراوڑی بھی وہیں کے قبائل میں سے تھے (دیکھئے (Links with past ages)

آریوں کے متعلق جدید تحقیق

اس باب میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر پران ناتھ صاحب نے اپنی تحقیق کا نتیجہ ایک مسلسل مضمون کی صورت میں ۱۹۳۵ء میں (Illustrated Weekly of India) میں شائع کیا تھا جو ارباب ذوق کے لئے بڑی دلچسپی کا مرکز رہا۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے۔ "رگ وید" ہندوستانی کلچر سے بہت پہلے کی کتاب ہے اور دراصل سمیری قوم کے زمانہ سے متعلق ہے۔ سمیری قوم شمالی ہندوستان سے لیکر مصر تک پھیلی ہوئی تھی اور ایشیائے کوچک۔ فنیشیا وغیرہ میں ان کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں۔ سنسکرت زبان سمیری، شامی اور مصری زبانوں سے

مرکب ہے۔ لہذا رگوید کسی پرانی سمیری تصنیف کا ترجمہ ہے اور برہمنوں کا تمام تمدن شامی اور مصری تمدن ہی ہے۔ چنانچہ رگوید میں سمیری آبادیوں کے تمام بڑے بڑے شہروں کے نام موجود ہیں۔ نیز ان لڑائیوں کے حالات بھی مذکور ہیں جو آریوں اور فارس اور بابل کی سامی اقوام کے درمیان ہوئیں۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ "رگوید کا قریب پانچواں حصہ نیل کی وادیوں سے آیا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ کے مصری ہی آریہ تھے"۔ اس کے بعد وہ رگوید کی زبان پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سیانے پنڈتوں نے جب رگوید کا ترجمہ کیا تو یہ ترجمہ غلط تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ رگوید کوئی ہندوستانی صحیفہ ہے۔ اس لئے اس میں جو مصری اور سمیری الفاظ تھے ان کا ترجمہ بھی سنسکرت کی گرامر کی رو سے کیا گیا اس طرح آریوں کی تاریخ یکسر غلط شاہراہ پر جا پڑی"۔ اپنے مضمون کی آخری کڑی میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے بتایا ہے کہ کس طرح ہندومت کے ماخذ مصری اور بابلی عقائد و نظریات ہیں۔

اس سے بعض لوگوں کا خیال اس طرف بھی گیا ہے کہ آریہ، دراصل بنی اسرائیل کے گم گشتہ قبائل میں سے ہیں۔ ہم داستان بنی اسرائیل میں بتا چکے ہیں کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کیا ہے تو یہودیوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ (بابل) لے گیا تھا۔ یہ وہاں قریب ستر برس تک رہے۔ لیکن بڑی ابتری اور پریشانی کی حالت میں۔ جب بیت المقدس کی از سرِ نو تعمیر ہوئی ہے تو ان بارہ قبائل میں سے صرف دو اہم قبیلے واپس آکر متمکن ہوئے۔ باقی دس قبائل ادھر ادھر منتشر ہو چکے تھے۔ ان قبائل کو تاریخ "گم گشتہ قبائل" قرار دیتی ہے۔ کیونکہ آج تک یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قبائل کہاں گئے۔ بعض ان کا سراغ شمالی امریکہ کے اصلی باشندوں اور میکسیکو تک لگاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ افغانستان اور سرحد کے پٹھان، یہی گم گشتہ قبائل ہیں۔ لیکن اب تحقیق کا رخ اس طرف آ رہا ہے کہ یہ گم گشتہ قبائل ہندوستان کے آریہ ہیں۔ چنانچہ ان دونوں میں بہت سی ذہنی، نفسیاتی، معاشرتی اور مذہبی مماثلت و مشارکت پائی جاتی ہے (حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے واقعہ اور کرشن جی اور کنس کے قصہ کی جزئیات تک مشترک دکھائی دیتی ہیں)۔ چنانچہ مشہور مسلمان صوفی شیخ عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب "الانسان الکامل" (حصہ دوم۔ باب ۶۲) میں لکھا ہے کہ "ہندوستان کے برہمن جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہیں اور اپنے قدیم آبائی مذہب سے برگشتہ ہو گئے ہیں"[1]

بہر حال یہ سب تاریخی قیاسات ہیں۔ نہ ابھی تک یقینی طور پر یہ معلوم ہو سکا ہے کہ آریہ قوم کا اصلی وطن کونسا تھا اور نہ ہی یہ کہ ہندومت کہاں سے چلا اور کب کیا بنتا رہا۔

---

[1] برہمن اپنے آپ کو برہما کی اولاد کہتے ہیں اور بعض محققین کا خیال ہے کہ برہما دراصل براہیم (حضرت ابراہیمؑ) ہی ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دوہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ گذشتہ صفحات میں مذاہب عالم کی کتب مقدسہ اور ان کی تعلیم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے (یا جو کچھ ابھی اور لکھا جائے گا) اس سے مقصود صرف تبیان حقیقت ہے۔ کسی کی تنقیص و تحقیر یا دلآزاری نہیں۔ اس لئے ہم نے اس باب میں خاص حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے کہ ان کتابوں یا ان کی تعلیم کے متعلق اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہ لکھا جائے۔ اور جو کچھ پیش کیا جائے ان ہی مذاہب کی کتابوں سے پیش کیا جائے اور ان ہی مذاہب کے مشاہیر کی سند سے۔ ان مذاہب کے بانیوں کی عزت ہمارے دل میں ہے۔ اس لئے ان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بتانا صرف یہ مطلوب ہے کہ جو تعلیم آج ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے (خود وہ تعلیم اس پر شاہد ہے کہ) وہ ان کی طرف سے پیش کردہ اصلی تعلیم نہیں، بلکہ اس میں بہت کچھ ملاوٹ ہو چکی ہے اور یہ بتانے کے لئے اس کے سوا اور کوئی طریق نہیں کہ اس تعلیم کو بلا کم و کاست سامنے رکھ دیا جائے تاکہ ہر شخص از خود صحیح نتیجہ تک پہنچ سکے۔

۷- اہل چین کے مذاہب

تہذیب و تمدن کے اعتبار سے چین دنیا کے قدیم ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے اس لئے بظاہر انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مذہبی اعتبار سے بھی اسے ایسی ہی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے لیکن تحقیق کے بعد نتیجہ اس سے برعکس مرتب ہوتا ہے چین میں تین مذاہب مروج ہیں

(۱) بدھ مت

(۲) کنفیوشس ازم

(۳) طاؤ ازم

بدھ مت کے متعلق ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ آج اس کی اصلیت کیا باقی رہ گئی ہے۔ باقی دو میں سے کنفیوشس ازم بہت اہم ہے لیکن اس مذہب کا خود ہی یہ دعویٰ نہیں کہ اس کی تعلیم وحی یا الہام پر مبنی ہے۔ باقی رہا طاؤ ازم سو وہ ایک فلسفیانہ مسلک ہے جو مذہب کے تحت بمشکل آسکتا ہے۔ بایں ہمہ چونکہ یہ دونوں "مذاہب" بہت قدیم ہیں اس لئے ان کا اجمالی تعارف بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ پہلے کنفیوشس ازم کو لیجئے۔ پروفیسر میکس مُلر نے "مشرق کی کتب مقدسہ" کو سلسلہ وار شائع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں کنفیوشس ازم کی کتابوں کا ترجمہ (Legge) نے کیا۔ یہ مستشرق اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھتا ہے۔

چین کا سب سے بڑا مذہب کنفیوشس ازم ہے اور اس کا انتساب اس مرد پارسا کی طرف ہے جو پانچویں چھٹی

صدی (ق-م) میں گزرا ہے۔ درحقیقت کنفیوشس اس مذہب کا بانی نہیں۔ نہ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس کے احکام نافذ کئے یا عبادات وغیرہ کی رسوم کی ترویج کی۔ اس نے اپنے متعلق خود کہا ہے کہ "میں اسلاف کا سرمایہ، آگے منتقل کرنے والا ہوں۔ خود کچھ بنانے والا نہیں ہوں۔ مجھے اسلاف سے محبت بھی ہے اور عقیدت بھی"

اسی بناء پر کتاب (Doctrine of mean) میں، جو کنفیوشس کے پوتے کی طرف منسوب ہے لکھا ہے کہ

کنفیوشس نے (Yao) اور (Shun) کے اصولوں کی ترویج کی۔ گویا وہ اس کے اسلاف تھے اور (Wan) اور (Wu) کے احکام کو نافذ کیا جنہیں اس نے اپنے سامنے بطور نمونہ رکھا۔۔۔۔۔ یہ سمجھنا بھی غلطی ہے کہ ان کتابوں میں سے آجاس کے زمانہ میں مروج تھیں، اس نے کتب تاریخ منظوم صحائف یا اسی قسم کی دوسری پرانی کتابوں کو تالیف کیا تھا۔ اس وقت عہد کہن کی کتابوں کا کچھ حصہ تو ضائع ہو چکا تھا۔ جو کچھ باقی تھا اس نے اس کا مطالعہ کیا اور اپنے شاگردوں کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دلائی اس طرح وہ حصہ محفوظ ہو گیا۔۔۔۔ افسوس ہے کہ کنفیوشس کے بعد ان پرانی کتابوں کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا یا مجروح۔۔۔۔ لیکن قارئین کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ چین کی یہ پرانی کتابیں اس امر کی مدعی نہیں کہ الہامی ہیں یا بذریعہ وحی نازل ہوئی ہیں۔ انہیں مورخین۔ شعراء اور دیگر مصنفین نے اسی طرح تصنیف کیا جس طرح یہ باتیں ان کے خیال میں آئیں۔

اس تمہیدی تعارف سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ

(۱) کنفیوشس ازم کے بانی جناب کنفیوشس نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنے وقت کے مروجہ عقائد و رسوم کی ترویج و تنفیذ کی اور ان ہی کو آگے منتقل کیا۔

(۲) جناب کنفیوشس کے زمانہ میں بھی اسی مذہب کی پرانی کتابیں بتمام و کمال موجود نہ تھیں۔

(۳) جناب کنفیوشس کے بعد ان کتابوں کا اور حصہ بھی ضائع ہو گیا۔

(۴) اور اس مذہب نے اپنے الہامی ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کیا۔

لٹریچر

لہٰذا کنفیوشس ازم نہ تو الہامی مذہب ہونے کا مدعی ہے اور نہ ہی ان کے ہاں ایسا لٹریچر ہے جس کے متعلق وہ یقینی طور پر کہہ سکیں کہ وہ اسی شکل میں ان کے پاس موجود ہے جس شکل میں اس کی ابتدا ہوئی تھی اس باب میں (Joseph Edkins) اپنی کتاب (Religion in China) میں لکھتا ہے کہ

اہل چین کے ہاں ایسا لٹریچر موجود نہیں جسے وہ بطور سند پیش کر سکیں جس طرح ہم عیسائیوں کے ہاں ہے۔

(صفحہ ۱۶۳)

عیسائیوں کے ہاں جس قسم کا "مستند" مذہبی لٹریچر موجود ہے اس کا جائزہ ہم "عیسائیت" کے عنوان میں لے چکے ہیں۔ سو جب اہل چین کے ہاں ایسا مستند لٹریچر بھی نہیں جیسا عیسائیوں کے ہاں ہے تو اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اہل چین کا لٹریچر کس قدر قابل اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اہم کتابیں

اس مذہب کی اہم کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) (Shu King) ایک تاریخی کتاب ہے جس میں ۲۴۰۰ ق۔م سے لیکر ۶۱۹ ق۔م تک کے مختلف شاہی خاندانوں کے حالات مذکور ہیں۔

(۲) (Shih King) منظوم کتاب ہے جس میں ۱۷۶۶ ق۔م سے لے کر ۵۸۵ ق۔م تک کے خاندانوں کے منظوم حالات ہیں۔ (Sze Ma Khien) اپنی (Memoirs of Confucious) میں لکھتا ہے کہ شروع میں ان نظموں کی تعداد قریب ۳۰۰۰ تھی کنفیوشس نے ان میں سے ۳۰۵ کا انتخاب کیا اور یہی منتخب حصہ آگے منتقل ہوا۔ اصلی نظموں کے متعلق (Ku Hsi) ۱۱۳۰ء میں لکھتا ہے کہ "جب شاہی انتظام کا خاتمہ ہو گیا تو ان نظموں کی جمع و تدوین کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ جو نظمیں ادھر ادھر فضا میں منتشر ہوئیں ان میں بہت سی غلطیاں تھیں۔ کنفیوشس نے ان ہی منتشر نظموں کو جمع کیا اور ان کی تصحیح کے بعد ان کا انتخاب کیا۔ یہ نظمیں کس قسم کی ہیں؟ اس کا اندازہ پہلی نظم کے پہلے بند سے لگائیے جس میں لکھا ہے۔

کس قدر قابل تعریف اور مکمل ہیں ہمارے ڈھول جو ہم آہنگ بھی ہیں اور بلند بانگ بھی تاکہ ہمارے قابل فخر اسلاف ان کی آواز سے خوش ہوں۔

(۳) (Yi) یعنی کتاب تغیرات۔ یہ وقائع و حوادث کی سب سے پرانی کتاب قرار دی جاتی ہے جس کا سن تالیف ۱۱۴۳ ق۔م کہا جاتا ہے۔ مؤلف کا نام (King Wan) تھا کنفیوشس نے اس پر بہت سی تعلیقات کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کے متعلق کنفیوشس نے کہا تھا کہ "اگر میری زندگی میں کچھ برس کا اضافہ ہو جائے تو میں پچاس برس (Yi) کے مطالعہ کے لئے وقف کر دوں اور اس کے بعد بڑی بڑی غلطیوں سے بچ جاؤں" (Analects - VII; XVI) اس قدر اہم کتاب میں ہے کیا؟ حروف کے نقشے بنا کر فال نامے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً

یہ نقشہ ([illegible]) کا مرتب کردہ ہے جس کے بیان کے مطابق

اس نقشے کے صحیح نکلنے کی صورت میں بڑی ترقی اور کامیابی ہوگی۔ آٹھویں مہینہ میں البتہ خطرہ نظر آتا ہے۔

ساری کتاب اس قسم کے جوتش کے نقشوں پر مشتمل ہے

(۴) (Li Ki) رسومات کی کتاب ہے۔ یہ درحقیقت (Kau) خاندان کی سرکاری کتاب تھی جس میں ان رسومات ومناسک کی تفاصیل درج ہیں جنہیں بادشاہ اور دیگر امراء ادا کیا کرتے تھے۔

(۵) (Khun Khiu) یا "بہار خزاں" کنفیوشس کی اپنی تالیف ہے جس میں اس نے سلطنت لو کے ۷۲۲ء سے ۴۸۱ ق۔م تک کے حالات لکھے ہیں۔

(۶) ان کے علاوہ کنفیوشس کا ایک مختصر سا رسالہ (Hsiao King) ہے جس میں والدین کے حقوق وفرائض کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو بہت وقیع سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنفیوشس ازم کی بنیادی تعلیم والدین کی اطاعت، بلکہ پرستش، ہے۔ اور صرف والدین ہی کی نہیں بلکہ تمام اسلاف کی پرستش۔ اس کا نتیجہ وہ جمود وتعطل ہے جو اہل چین کا امتیاز خصوصی بن کر رہ گیا ہے۔ ہر اسلاف پرست قوم کی طرح۔ ان کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ (Kin Puh Joo Kuo) یعنی "موجودہ زمانہ کے لوگوں کا زمانہ سلف کے لوگوں سے کیا مقابلہ؟" وہی تعلیم جس سے اسلاف پرست اقوام کو اپنا ماضی درخشندہ اور مستقبل ہمیشہ تاریک نظر آیا کرتا ہے!

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ذیل کی چار کتابوں کو بھی مقدس تسلیم کیا جاتا ہے۔ پہلی کتاب (Lun yu) کنفیوشس کے مکالمات ومباحثات پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب (Mencius) کی ہے جو کنفیوشس کے بعد اس مسلک کا سب سے بڑا فلاسفر گذرا ہے۔ تیسری کا نام (Ta Hsio) ہے جو ایک اور فلاسفر (Tang Tze) کی تصنیف ہے۔ اور چوتھی کا نام (Kung Yung) یا (Doctrine of the mean) ہے جو کنفیوشس کے پوتے کی طرف منسوب ہے۔

تعلیم — اس میں شبہ نہیں کہ یہ مذہب عام اخلاقیات میں عمل پر بڑا زور دیتا ہے۔ لیکن عقائد تمام تر توہم پرستی پر مبنی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں آسمان کی پرستش اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے اور مندروں میں کنفیوشس کے نام پر قربانیاں دی جاتی ہیں (تفصیل معارف القرآن جلد اول میں دی گئی ہے)۔

طاؤازم

اب (Taoism) کی طرف آئیے۔ یہ عام طور پر (Lao Tze) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو ۶۰۴ ق م میں پیدا ہوا۔ (لیکن تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ اس مذہب۔ یا صحیح الفاظ میں فلسفیانہ مسلک کا بانی (Lao Tze) نہیں بلکہ یہ مسلک اس سے بہت پہلے موجود تھا) یہ کنفیوشس سے پچاس سال بڑا تھا اور (Lao Tze) کا نام کنفیوشس ہی کا دیا ہوا ہے جس کے معنی "بوڑھا فلسفی" ہیں۔ یہ خاندان (Kaw) میں لائبریرین تھا۔ اس خاندان کے انحطاط سے یہ دل برداشتہ ہو گیا اور اس نے دنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب شہر چھوڑ کر باہر جانے لگا تو دار وغہ نے اسے روک لیا اور کہا کہ مجھے کچھ لکھ کر دیتے جاؤ۔ چنانچہ اس نے (Tao Teh King) کتاب لکھ کر اسے دی جو اس مسلک کی مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب بہت مختصر سی ہے۔ اس کتاب میں خدا (Ti) کا نام صرف ایک جگہ آیا ہے جہاں (Lao)؛ (Taus) کے متعلق لکھتا ہے

"میں نہیں جانتا کہ (Tao) کس کا بیٹا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید خدا سے بھی پہلے موجود تھا۔"

اس مسلک میں (Tao) کو بڑی نمایاں پوزیشن حاصل ہے لیکن ان کی کتابوں سے کچھ متعین نہیں ہو سکتا کہ (Tao) ہے کیا؟ یہ تو اوپر لکھا جا چکا ہے کہ خود (Lao) کے عقیدہ کے مطابق، یہ (Tao) معاذ اللہ خدا سے بھی پہلے موجود تھا!

(Lao) کے بعد اس مسلک کا سب سے بڑا مبلغ (Kwang Tze) گذرا ہے جو چوتھی صدی ق م میں پیدا ہوا۔ اس کی کتابیں، تاریخ پر مشتمل ہیں۔ لیکن (Legge) کی تحقیق کے مطابق (جس نے ان کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے) "اس کے پاس تاریخ کی سند کوئی نہیں ہوتی" (Tao) کے متعلق (Kwan) اپنی چوتھی کتاب میں لکھتا ہے۔

آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ مکمل (Tao) کیا ہوتا ہے؟ اس کا جوہر یکسر تاریکی میں ملفوف ہے۔ اس کی انتہائی بلندی خاموشی اور ظلمت میں ہے۔ وہاں نہ کچھ سننا ہے نہ دیکھنا۔ جب تمہاری آنکھیں کچھ نہ دیکھیں تمہارے کان کچھ نہ سنیں اور تمہارا دل کچھ نہ سمجھے تو (ایسی حالت میں) تمہاری روح تمہارے جسم کو سنبھال لے گی اور جسم بہت زیادہ عرصہ تک زندہ رہے گا۔ جو تمہارے اندر ہے اس پر نگاہ رکھئے۔ اور جو ذرائع تمہیں باہر کی دنیا سے وابستہ رکھتے ہیں انہیں منقطع کر دیجئے۔ زیادہ علم خطرناک ہوتا ہے۔ میں ۲۰۰ سال سے اسی انداز سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اور اس پر بھی میرا جسم ابھی تک روبہ انحطاط نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ (Taoism) باطنیت (یوگ کے گیان دھیان یا عجمی تصوف) کی شکل کی ریاضتوں کا نام تھا اور (Tao) اس حالت کا مظاہرہ جس میں انسان خارجی دنیا سے قطع علائق کر کے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ

ہو جائے اور اس کا نام عالم بالا کی کیفیات رکھ لے۔ نیز اس میں پرانایم (حبس دم) کی مشق سے "زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے" کی بھی کوشش کی جاتی تھی۔ بلکہ اس مسلک کا منتہائے نگاہ یہی تھا۔ چونکہ اس کا تعلق گیان دھیان کے فلسفہ سے تھا اس لئے ان کی کتابوں میں اس قسم کی مجذوبانہ باتیں بھی ملتی ہیں جن کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مثلاً یہ کہ
" Tao کچھ نہیں کرتا اور اس لئے کوئی کام ایسا نہیں جسے وہ نہیں کرتا"۔

بہترین دور

ماضی پرستی ان کے ہاں بھی کنفیوشس ازم سے کچھ کم نہ تھی۔ چنانچہ (Kwang) لکھتا ہے کہ زمانہ قدیم میں جب دنیا پر (Tao) کی حکومت تھی تو یہ دنیا جنت تھی جس کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا کہ

> لوگ عقل کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے اور دانشمند لوگوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ خوراک سادہ۔ لباس سادہ اور طور طریق سادے۔ لوگ ایک دوسرے کے قریب رہتے تھے لیکن باہیں ہمہ تمام عمر ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے۔ یہ تھا وہ زمانہ جب نیکی کا دور دورہ تھا.... جب لوگوں نے علم کی تحصیل شروع کر دی تو پھر یہ دور ختم ہو گیا۔

اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس مسلک کی رو سے انسانی زندگی کا منتہائے کمال کیا ہے؟ علم و دانش سے اس قدر نفرت کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مسلک یکسر جہالت و توہم پرستی کا مجموعہ بن چکا ہے ان کا عقیدہ ہے کہ (Taoism) موروثی طور پر (Kwang) خاندان میں چلی آرہی ہے۔ اس خاندان کے کسی بچہ میں کی روح حلول کر آتی ہے اور اس کے بعد معجزانہ طور پر اس کی جانشینی کا علم ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں تین مجسموں کی پرستش

بت پرستی

خاص طور پر ... ... ہوتی ہے ... ... (Shang Ti) کہا جاتا ہے۔ پہلا مجسمہ تخریب کے دیوتا کا ہے۔ دوسرا (Lao Tze) کا۔ اور تیسرے کے متعلق ابھی یقینی طور پر تحقیق نہیں کہ کس کا ہے غالباً (Tao) کا۔ ان کے علاوہ ان کے مندروں میں دوسرے دیوی دیوتاؤں کے بتوں کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ نیز ستاروں اور جنات کی بھی۔ ان ہی چیزوں کے پیش نظر مسٹر (Edkins) اس مذہب کے متعلق لکھتا ہے۔

> "عام عقائد کے مطابق طاؤازم دنیا کے مذاہب میں سب سے زیادہ نفرت انگیز مذہب ہے"۔

(Religion in China p. 63)

اور (Legge) لکھتا ہے کہ

> خدا کے متعلق اس قسم کی لاادریت اور ان کے اس عقیدہ کے بعد کہ سانس کو ایک طریق سے ضبط کر لینے سے زندگی کو غیر محدود طور پر بڑھایا جا سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ قدیم طاؤازم کو کس طرح ایک مذہب تصور کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے مختصراً چین کے مذاہب کی کیفیت اس لئے ان کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نوع انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے تھے۔

اہل جاپان کا مذہب

شنٹوازم (Shintoism)

زمانہ قبل از تاریخ میں جاپان پر جو قبیلہ حکمران تھا وہ سورج کی دیوی کی پرستش کرتا تھا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ سورج کی دیوی ان کی پرستش کا مرکز تھی جس کے گرد ہزارہا دیوی دیوتا اور بھی تھے۔ ان کے علاوہ اسلاف کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ اسی نے آگے چل کر ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی جسے شنٹوازم (یعنی دیوتاؤں کا راستہ) کہا جاتا ہے۔ اب جاپان میں یہ مسلک مذہب ہی کی حیثیت نہیں بلکہ ان کے قومی تمدن کی بھی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے اس لئے کہ اس کا محور شاہنشاہ جاپان کی پرستش ہے۔ اہل جاپان کے ہاں روایت ہے کہ سورج کی دیوی کے اپنے پوتے (یعنی جاپان کے سب سے پہلے شاہنشاہ) کو آسمانی تحائف (تلوار، آئینہ اور جواہر پارہ) دیئے تھے جو اسی سلسلۂ خاندان میں محفوظ چلے آرہے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں جب بدھ مت جاپان میں آیا تو اس نے وہاں کے شنٹوازم کو بھی متاثر کیا۔ اس سے ایک امتزاجی مذہب پیدا ہوا جسے (Ryo - Bu - Shinto) (یعنی دو طرفہ شنٹو) کہتے ہیں لیکن جب ۱۸۶۸ء میں جاپان میں قومی انقلاب ہوا ہے تو انہوں نے پھر سے اپنے قدیمی مذہب (شنٹوازم) کو ان خارجی اثرات سے منزہ کرنے کی کوشش کی۔

پانچویں صدی عیسوی سے قبل جاپان میں تحریر کا رواج نہ تھا اس لئے شنٹوازم زبانی روایات پر مشتمل تھا جو ملک میں ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں (آٹھویں صدی میں ان روایات کو یکجا کرکے دو کتابیں (Ko ji Ki) اور (Nihongi) مرتب کی گئیں) ان کے ہاں خدا کے لئے لفظ (Kami) ہے لیکن ان کتابوں میں ان تمام چیزوں کو (Kami) ہی کہا گیا ہے جن کی ان کے ہاں پرستش ہوتی ہے۔ خود شاہنشاہ میکاڈو، تمام اسلاف۔ پرندے۔ حیوانات۔ درخت۔ پودے۔ سمندر۔ پہاڑ، بھیڑیا، شیر، لومڑی، سب (Kami) ہیں۔ حیات بعد الممات کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں۔ تخلیق کائنات کے متعلق ان کے ہاں روایت ہے کہ آسمان کے تیرتے ہوئے پل پر ایک جوڑا رہا کرتا تھا نر کا نام (Izanagi) اور مادہ کا

(Izanami) تھا۔ وہ جوڑا زمین کے ایک جزیرے پہ اترا اور وہاں انہوں نے ایک مکان بنایا جس میں ایک بہت بڑا ستون تھا۔ وہ دونوں اس ستون کے گرد گھومے اور جب ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا تو پہلے مادہ بولی۔ اس سے نر کو بہت غصہ آگیا اور اس نے دوبارہ گھومنے کے لئے کہا۔ جب پھر آمنے سامنے آئے تو پہلے نر بولا اور اس نے مادہ سے کہا کہ تو کس قدر خوبصورت ہے۔ اس سے دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اس تعلق کے نتیجہ سے جاپان کے مختلف جزیرے اور بہت سے دیوی دیوتا وجود میں آگئے۔ اس جوڑے سے آگ کی دیوی کی پیدائش کے وقت (Izanami) کی وفات ہو گئی۔ اس پہ نر کو غصہ آیا اور اس نے اس نو مولود (آگ کی دیوی) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جس سے اور بہت سے دیوی دیوتا نمودار ہو گئے۔ اب یہ نر اپنی بیوی کے پیچھے "مردوں کی سرزمین" (Yomi) میں گیا وہاں سے واپسی پر ایک سمندر میں غوطہ لگایا تو اس کی پلکوں سے پانی کے جو قطرے ٹپکے اس سے سورج پیدا ہوا۔ اور ناک کے قطروں سے چاند وقس علی ہذا۔ دونوں مذہبی کتابیں اسی قسم کی روایات پر مشتمل ہیں۔ ان کتابوں میں اخلاق کے متعلق کوئی تعلیم نہیں۔ مندروں میں کنواری لڑکیاں پروہت بنا کر رکھی جاتی ہیں۔ جب ان پر غشی (ہسٹریا) کے دورے پڑتے ہیں تو اس وقت وہ جو کچھ بولتی ہیں اسے الہامی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جادو کا بھی بہت زور ہے۔

یہ ہے جاپان کا مذہب شنٹوازم۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس مذہب کا مرکزی تصور اپنے بادشاہ کی پرستش ہے۔ بادشاہ انسان نہیں بلکہ خدا سمجھا جاتا ہے۔ جاپانی اپنے اس عقیدہ میں اس درجہ... متشدد ہیں کہ وہ اپنے بادشاہ (خدا) کے لئے بلا تامل جان دیدینا ایک کھیل سمجھتے ہیں لیکن گذشتہ عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء ۱۳۶۴ھ میں اہل جاپان کو جو شکست ہوئی ہے اور اس کے بعد ان کے ملک کا نظم و نسق اہل مغرب کے ہاتھ میں آیا ہے تو اس سے ان کا بادشاہ مقام "خداوندی" سے خود بخود نیچے اتر کر عام انسانی سطح پر آگیا ہے۔

بیک گردش چرخ نیلوفری
نہ انجن بماند نہ انجنیری!

نگہ بازگشت

گذشتہ صفحات میں مذاہب عالم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں دنیائے مذاہب کی کیا کیفیت ہو چکی تھی یعنی قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید، کسی مذہب میں بھی ان کی مبینہ آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہ تھی۔ جو کچھ ان مذاہب میں موجود تھا۔ اس کا انسانی ہیئت اجتماعیہ کے لیئے ضابطہ حیات بننا اور اس طرح کاروان زندگی کو اس کی منزل کی طرف لے جانا تو ایک طرف، وہ عام اخلاقی ضابطہ بننے کی بھی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا

تھا۔ خدا کا تصور مذہب کی اساس و بنیاد ہے لیکن ان مذاہب میں جس قسم کا خدا کا تصور پیش کیا جاتا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خدا یکسر ذہن انسانی کا تراشیدہ معبود ہے۔ اور تراشا ہوا بھی ایسا کہ اس میں لطافت ذوق تک کا بھی شائبہ نہیں بلکہ اس کی صورت نہایت گھناؤنی اور مہیب ہے۔ خدا کے بعد رسولوں کا درجہ آتا ہے۔ لیکن ان مذاہب کی شرک آلود نگاہوں نے کسی رسول کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رہنے دیا بلکہ انہیں یا تو الوہیت کے مقام بلند پر پہنچا دیا اور یا انسانیت کی سطح سے بھی نیچے گرا دیا۔ خدا کا وہ تصور رسولوں کی یہ کیفیت اور مذہبی کتابوں کا وہ عالم۔ قلوب و اذہان کی دنیا میں ہر جگہ خلفشار اور ہر مقام پر پریشانی و پراگندگی۔ بس چند ایک رسومات تھیں جو اسلاف سے نسلاً بعد نسل متوارث چلی آتی تھیں اور جن کی ادائیگی کا نام مذہب پرستی تھا۔ ان ہی رسومات سے لوگ ایک خاص مذہب کے دامن سے وابستہ رہتے تھے ورنہ ان کی اجتماعیت و مرکزیت کی کوئی اور شکل نہ تھی۔ تاریکیوں کی اس مہیب فضا میں آپ سمجھتے ہیں کہ انسانیت کا کاروانِ حیات کس طرح امن و سلامتی کی شاہراہ پر چل کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا؟

یہ تھی دنیائے مذہب کی کیفیت۔ اب عالم تہذیب کی طرف آئیے۔

دنیائے تہذیب

(۲)

گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں مذاہب عالم کی کیا کیفیت ہو چکی تھی اور ان میں سے ایک ایک کس طرح اپنی حقیقت کھو کر انسانی خیالات و آراء اور رہنما، توہم پرستی اور جہالت کا مجموعہ بن چکا تھا۔ اگرچہ اس وقت کی دنیا کی عمرانی اور معاشرتی زندگی کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اس لئے کہ کسی قوم کے ذہنی ارتقاء کا تصور اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ قوم کس قسم کے مذہب پر مطمئن ہو چکی ہے۔ لیکن بایں ہمہ، اس انقلاب عظیم کی عظمت و اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لئے جس نے آنے والی دنیا کا نقشہ بدل دیا یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک تیرتی ہوئی نگاہ سے یہ بھی دیکھ لیں کہ اس زمانہ میں دنیا کی تہذیب و تمدن کی عمومی حالت کیا تھی! اس باب میں بھی ہمیں چھٹی صدی عیسوی تک پہنچنے کیلئے ذرا پیچھے سے چلنا پڑے گا۔ کیونکہ کسی خاص زمانہ کی تمدنی زندگی کی پوری تصویر نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتی۔ جب تک اس کا پس منظر بھی پیش نظر نہ ہو۔

تہذیب مصر

تہذیب کے مورخوں کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب کی ابتدا مصر سے ہوئی۔ جب اس ملک کو سکندر اعظم نے فتح کیا ہے تو اس وقت تک تیس خاندان اس پر حکمران ہو چکے تھے۔ اندازہ یہ ہے کہ سب سے پہلے خاندان کی حکومت قریب سنہ ۳۴۰۰ سال ق.م شروع ہوئی۔ لیکن مصر کے اثری انکشافات وہاں کی تہذیب کا سراغ اس سے بھی بہت پیچھے تک لیجاتے ہیں۔ چنانچہ حال کے مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیا میں تقویم (کلینڈر) کی ابتدا مصر سے ہوئی اور سب سے پہلا کیلنڈر سنہ ۴۲۴۱ ق.م میں مرتب ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ملک باقاعدہ خاندانوں کی حکومت سے بھی بہت پہلے تہذیب و تمدن کی زندگی سے آشنا ہو چکا تھا۔

اہرام مصر میں سب سے بڑا ہرم (Great Pyramid) شاہنشاہ خوفو (Khufu) کا مقبرہ ہے جو چوتھے خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا۔ (اگرچہ اس سے پہلے اور بھی اہرام تعمیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ قیاس یہ ہے کہ ان اہرام میں سے (Step pyramid) سب سے پہلا ہرم ہے جسے شہنشاہ زوسر کے لئے اس کے ماہر تعمیر (Imhotep) نے تیار کرایا تھا۔) ہرم عظیم پر، ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق، ایک لاکھ مزدور بیس سال تک کام کرتے رہے جن کے لہسن اور پیاز وغیرہ کے خرچ کا تخمینہ

(History of the World edited by Weech p. 377)

ستر لاکھ روپے سے کم نہیں ہوتا۔ اس زمانہ میں فن تعمیر۔ مصوری۔ طب۔ جراحت وغیرہ کے ماہرین فراعنہ مصر کے درباروں میں موجود تھے۔ اٹھارویں خاندان کے زمانہ میں (جو حضرت موسیٰؑ کا عہد ہے) بادشاہوں کے ساتھ مذہبی پیشواؤں (Priests) کا اقتدار شروع ہو گیا۔ یہ اقتدار بیسویں خاندان کے زمانہ میں اوج کمال تک پہنچ گیا۔ چنانچہ اس وقت حکومت دراصل منادر کے پجاریوں کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ ایوانِ حکومت میں "شمشیر و سنان" کی جگہ "طاؤس و رباب" نے لے لی۔ اور ان پجاریوں کی ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں نے ملک کی جمعیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اکیسویں خاندان (قریب ایک ہزار ق۔م) کے زمانہ سے انحطاط شروع ہو گیا۔ اور جب چھٹی صدی ق۔م میں اہل فارس نے اس پر قبضہ کیا ہے تو اس کے بعد اس ملک کے ہر گوشے پر جمود و تعطل کی افسردگی چھا گئی اور زندگی کی وہ سرگرمیاں جنہوں نے اسے شاہراہ تہذیب پر قیادت کا شرف بخشا تھا۔ ہمیشہ کے لئے سرد ہو گئیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان اہرام کے سوا جو اس کی عظمت رفتہ کے عبرت انگیز نقوش تھے اس ملک کی تہذیب و تمدن کی زندگی میں کوئی شے قابلِ ذکر باقی نہ تھی۔

مصر کے بعد تہذیب کے دھارے کا رُخ دجلہ اور فرات کی وادیوں کی طرف بدل جاتا ہے۔ ازمنۂ قدیمہ میں اس وادی کا شمالی حصہ اکاد (Akkad) کہلاتا تھا جس کا سب سے بڑا شہر بابل تھا اور جنوبی علاقہ سمیر (Sumer) جس میں کالدیہ (یعنی Chaldea) اور اُر (Ur) مشہور شہر تھے۔

کالڈیا کی تہذیب

اثری انکشافات نے اکادی اور کالدی تہذیب کے متعلق حیرت انگیز معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تین ہزار ق۔م سے ان کی تہذیب کے عروج کے آثار دکھائی دینے شروع ہو جاتے ہیں۔ اُر (Ur) کا پہلا خاندان قریب سنہ ۳۱۰۰ ق۔م سے سامنے آتا ہے۔ اس زمانہ کی قبروں سے مصوری اور مرصع کاری کے عجیب و غریب نوادرات نکلے ہیں۔ تیسرے خاندان کا بانی (Ur-Nammu) ۲۲ ق۔م کے قریب) غالباً حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کا نمرود تھا۔ اس کے بارھویں سن جلوس میں تمام اہل سمیر نے اس کے بیٹے (Dungi) کو خدا تسلیم کر لیا تھا۔ اس زمانہ کے بڑے بڑے مندروں کے کھنڈرات، زمین کے تہ خانوں سے باہر نکلے ہیں۔ ان کے مکانات بالعموم دو منزلہ تھے۔ ہر گھر میں قریب ۱۲ یا ۱۴ کمرے، باورچی خانے۔ پختہ آتش دان، غسل خانے، نالیاں، میزیں، پلنگ، تانبے اور مٹی کے برتن۔ قالین کمبل وغیرہ ان کی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ بادشاہ کی بڑی لڑکی، چاند دیوی کے مندر کی پجارن (Head priestess) ہوتی تھی۔ پجاریوں کا اثر وہاں بھی غالب نظر آتا ہے۔ ایک مٹی کی لوح پر کندہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ قبر کے سرہانے دعا پڑھنے کے معاوضہ میں ایک پجاری کو، سات مٹکے شراب ۴۲۰ روٹیاں۔ ۱۲۰ پیمانے غلہ۔ ایک خلعت اور دیگر ضروریات کی چیزیں ملتی تھیں۔

اکادی تہذیب ہیں، بابل کے پہلے خاندان کے چھٹے بادشاہ حمار آبی (۲۱۲۳ سنہ ق۔م) کے قوانین آج تک مشہور ہیں۔ یہ قوانین مٹی کی تختیوں پر کندہ کیے جاتے تھے۔ ان کی وسعت اور پہنائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ زمین دوز کھنڈرات میں سے جو کچھ برآمد ہو سکا ہے ان میں سے قریب تیس ہزار تختیاں برٹش میوزیم میں جمع ہیں۔ اس کے قوانین عدل و مساوات پر مبنی دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر کسی کا نو تعمیر شدہ مکان گر جائے تو معمار کو پھانسی دیدی جائے۔ یا اگر کسی ڈاکٹر کے علاج سے کسی کا نوکر مر جائے تو وہ ڈاکٹر اپنے نوکروں میں سے ایک اس شخص کو دے۔

حمارابی کے قوانین

تہذیب کے اس عروج و کمال کے بعد ان میں بھی ہبوط و زوال شروع ہو گیا۔ شاہی گھرانے عیش پرستی کی سیہ مستیوں میں کھو گئے۔ مندروں کی چار دیواری بد اخلاقی اور خواہش کاری کا اڈہ بن گئی۔ حتیٰ کہ نوبت بایں جا رسید کہ ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق پانچویں صدی ق۔م میں بابل میں ہر نوجوان لڑکی کو اپنے آپ کو مندر میں کسی اجنبی سے ہم آغوش کرنا پڑتا تھا اس کے بعد اس کی شادی ہو سکتی تھی۔ چھٹی صدی ق۔م میں فارس کے مشہور بادشاہ کیخسرو (ذوالقرنین) نے اس ملک پر قبضہ کر لیا اور چھٹی صدی عیسوی میں ان ٹھیکریوں کے سوا، جو اس ملک کی سطوت رفتہ کی داستان گو تھیں، ان کی تہذیب و تمدن کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔

سمیری اور کالڈی تہذیب کے ساتھ ساتھ ان کی ہمسایہ سلطنت اشوریا (Assyrians) بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگرچہ یہ "تہذیب" اپنی سبعیت اور بربریت سفاکی اور خوں ریزی کے لئے دنیا میں مشہور ہے لیکن بایں ہمہ، تاریخ تہذیب کے سلسلہ میں اشوری تہذیب کی کڑی بھی ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے۔ بابل سے قریب دو سو میل جانب شمال، اشور (Asshur) کے شہر میں (قریب ۳۰۰۰ سنہ ق۔م) اس سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ زمانہ عروج میں اس کا دارالسلطنت نینوا تھا۔ (Sargond) جس نے یہودیوں کو تباہ و برباد کیا تھا، اسی سلطنت کا بادشاہ تھا۔ اسی قوم نے بابل کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی۔ اس قوم کے قوانین بڑے سخت اور وحشیانہ تھے جنگ کے دیوتا اسور (Assur) اور زراعت کی دیوی اشتر (Ishtar) کی پرستش خصوصیت سے ہوتی تھی۔ ساتویں صدی (ق۔م) میں اہل مادیا اور بابل کے ہاتھوں اس عظیم الشان سلطنت کی تباہی ہوئی اور اب لندن کے عجائب گھر سے باہر ان کا نشان تک باقی نہیں۔

اشوری تہذیب

یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بابل کو کیخسرو نے فتح کیا تھا اس لئے اب تہذیب کے دھارے کا رخ فارس کی طرف ہونا چاہیئے۔

خطۂ ایران اگرچہ فارس اور مادیا کی الگ سلطنتیں ایک زمانہ سے موجود تھیں لیکن کیخسرو کے زمانہ (۵۵۸-۵۲۹ ق.م) میں یہ دونوں مل کر ایک عظیم الشان سلطنت کی شکل میں صفحۂ تاریخ پر ابھریں۔ جیسا کہ ہم (معارف القرآن) جلد سوم میں دیکھ چکے ہیں۔ کیخسرو (ذوالقرنین) کی شخصیت تاریخ کی ناپیدا کنار پہنائیوں میں شہرت دوام حاصل کر چکی ہے۔ اس کے عہد میں فارس کی دولت اور سطوت نے برق رفتاری سے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ اور دارا کے زمانہ (۵۲۱-۴۸۵ ق.م) میں یہ اپنے انتہائی نقطۂ عروج تک جا پہنچی۔ الواحِ بیستون (Behistun 5) (Telp) اس کی شوکت و ثروت اور اس کی جاہ و جلال کی شاہد ہیں۔ اس کے بعد سکندر اعظم کے حملہ (۳۳۳ ق.م) نے فارس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روک دیا اور رفتہ رفتہ ان میں انحطاط شروع ہو گیا۔ اس سے قریب اکیسو سال بعد (۲۴۹ ق.م) میں پارتھین نے فارس میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت بھی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت لئے نظر آتی ہے۔ لیکن سلطنت روما کے ساتھ ان کے پیہم تصادم و تزاحم نے انہیں بہت کمزور کر دیا۔ ۲۱۲ء میں اردشیر نے، جس کی رگوں میں کیخسرو اور دارا کا خون موجزن تھا، علم بغاوت بلند کیا اور پارتھین سلطنت کو ختم کر کے فارس میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تاریخ کے صفحات پر ساسانی سلطنت کے نام سے مشہور ہے۔ اردشیر نے نہ صرف قدیم فارسی تہذیب و روایات ہی کو زندہ کرنے کی کوشش کی بلکہ مذہب زرتشت کو بھی از سرِ نو رائج کیا۔ لیکن (جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں) یہ زرتشتی مذہب اصل زرتشتی مذہب سے مختلف تھا۔ اب اس میں انسانی خیالات و معتقدات کی آمیزش اس حد تک ہو چکی تھی کہ حقیقی تصویر کے خط و خال پہچان میں ہی نہیں آ سکتے تھے۔ ساسانی خاندان کے زمانہ میں فارس کی سلطنت پھر بہت وسیع ہو گئی۔ مصر کی فتح نے ان کے حوصلے اور بھی بڑھا دیئے۔ خسرو (دوم) کے زمانہ میں ان کی فتوحات کا سلسلہ یروشلم کی مقدس دیواروں تک جا پہنچا۔ (اگرچہ ۶۲۴ء میں ہرقل نے ایران پر صلیب مقدس کی بازیابی کے لئے کامیاب حملہ کیا)۔ ظہور اسلام کے وقت ساسانی خاندان ہی ایران پر حکمران تھا۔ لیکن اس وقت اس کی شوکت و عظمت کے محض افسانے باقی رہ گئے تھے۔ قوت کے انحطاط کے ساتھ ہی وہاں کی معاشرتی اور تمدنی حالت بھی انتہائی پستی تک پہنچ چکی تھی۔ مذہب کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ وہاں نام کو مجوسیت (زرتشتیت) رائج تھی۔ لیکن در اصل یہ وہ مذہب تھا جس کا قوام مانی نے مجوسیت اور مسیحیت کی آمیزش سے تیار کیا تھا۔ اور جس کی بنیادیں رہبانیت یعنی ترکِ علائق، زاویہ نشینی اور گوشہ گیری کی زندگی تھی۔ جس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ خانقاہیں اور آتشکدے، بداخلاقی اور فحش کاری کے مراکز بن چکے تھے۔ عام معاشرتی حالت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ باپ کا اپنی بیٹی کو اور بھائی کا اپنی بہن کو آغوش زوجیت میں لے لینا عام معمول تھا۔ (چنانچہ یزدگرد ثانی نے خود اپنی بیٹی سے شادی کی تھی) وہاں پہلے ہی یہ کیفیت تھی۔ مزدکیت نے سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ دیا۔ اس "مذہب" کی رو سے (اس لئے کہ اسے مذہبی حیثیت

سے ہی رائج کیا گیا تھا، عورت سوسائٹی کی عام ملکیت سمجھی جاتی تھی اور وہ ہر شخص کے ساتھ شب باش ہو سکتی تھی۔ اگرچہ اس قسم کے "مذہب" کی ترویج کچھ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل ایران اخلاق کی جس پستی تک پہنچ چکے تھے اس کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان کی مسخ شدہ نطرت ہی کی صدائے بازگشت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے عیش پرست امراء کے طبقہ میں اس مذہب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور خود بادشاہ (قباد) نے اس کی تنفیذ و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ استبداد کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ اور امراء کی پرستش ہوتی تھی ان کے حضور سجدے کئے جاتے تھے اور ان کی شان میں الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے۔ مستبدانہ اور قاہرانہ انداز حکومت میں حریت و مساوات کا تصور تک جرم عظیم ہوتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی عام ذہنی کیفیت کا انداز لگانا کچھ مشکل نہیں۔ توہم پرستی اور جہالت زندگی کے ہر گوشے پر مسلط تھی۔ اہرمن نے اپنی نظر بد سے ۹۹۹۹۹ چڑیلیں پیدا کر رکھی تھیں جو بیماریوں کے نقاب میں انسانوں پر مسلط ہوتی تھیں۔ غرضیکہ بقول سر جان ملکم ظہور اسلام کے وقت "فارس کی سلطنت عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی تھی۔ اندرونی مناقشات کی وجہ سے انتہائی بدنظمی پھیل چکی تھی۔ بیرونی محاربات نے اسے خستہ اور ناتوان کر دیا تھا، اور اس طرح وہ قعر زوال کی طرف کشاں کشاں جا رہی تھی"[1]۔ یہ تھی چھٹی صدی عیسوی میں ایران اور اس کی اس تہذیب کی حالت جو کسی زمانہ میں تاریخ کے صفحات پر روشنی کے مینار کی طرح چمک رہی تھی۔

تہذیب یونان

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سکندر اعظم نے اپنی سلطنت فارس اور مصر تک پھیلائی۔ اس سے ہم یونانیوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ لیکن یونانیوں کی تہذیب، سکندر کی فتوحات کے زمانہ سے بہت پہلے کی ہے۔ اس کا اولین سراغ قریب ۲۰۰۰ء ق۔م سے ملتا ہے جب کریٹ crete کا جزیرہ ایک ممتاز تہذیب کا گہوارہ تھا۔ ۱۶۰۰ء ق۔م کے قریب وہاں کی تہذیب اپنے نقطۂ عروج تک جا پہنچی تھی۔ ٹرائے (Troy) کا محاصرہ جس کی دلچسپ تفاصیل ہومر کی نظموں سے حیات جاوید حاصل کر چکی ہیں، اسی زمانہ سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد یونانی تہذیب کا مرکز ایتھنز قرار پایا جہاں ۶۰۰ء ق۔م کے قریب سولن (Solon) جیسے مدبر کی اصلاحات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہ تہذیب پانچویں اور چوتھی صدی ق۔م میں اپنے معراج کمال پر پہنچی۔ جب یونان علم و حکمت اور سیاست و فراست کا گہوارہ قرار پا گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں جہاں ایک طرف (Saphocles) جیسا ادیب ڈرامہ کی دنیا میں وہ

[1] تاریخ ایران جلد اول

شاہکار پیش کرتا ہے جو آج تک ایسے ہی شگفتہ و شاداب ہیں جیسے آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے۔ تو دوسری طرف ہمیں (Thucydides) اور (Herodotus) جیسے مورخ دکھائی دیتے ہیں جن کی وقائع نویسی اس زمانہ کی متمدن دنیا کی زندہ ترجمان ہے۔ فن تعمیر میں دیکھئے تو "معبد دوشیزہ" (Temple of virgin) جیسے نادر نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں اور مجسمہ سازی کی طرف آئیے تو ایتھینا کے ہیب، کوہ آسا فلزائی ہیکل سے لیکر حسن کی دیویوں کے نفیس و نازک مرمریں تماثیل تک، نادرہ کاری اور اعجاز نگاری کی خاموش داستانیں دنیا کے سامنے موجود ہیں۔ علم و حکمت کی درسگاہوں میں جائیے تو سقراط (Socrates) (المتوفی ۳۹۹ ق۔م) افلاطون (Platin) (المتوفی ۳۴۷ ق۔م) اور ارسطو (Aristalh) (المتوفی ۳۲۲ ق۔م) جیسی شخصیتیں دکھائی دیتی ہیں جن کی شہرت کو مرور زمانہ ذرا بھی متاثر نہیں کرسکا۔ یونان سے نکل کر مصر کی طرف آئیے تو وہاں سکندر کے سپہ سالار بطلیموس (Ptolemy) نے ایک نئی سلطنت کی طرح ڈالی جو علم و حکمت کے میدان میں بجائے خویش ایک دوسرا یونان بن گئی۔ اقلیدس (Euclid) جیسا ریاضی دان، اور ارشمیدس (Archimades) جیسا سائنسدان اسی دور کی پیداوار ہے۔ اسکندریہ کی لائبریری، جو عیسائی احبار و رہبان کے ہاتھوں نذر آتش ہوئی، اپنی نظیر آپ تھی۔

لیکن یہ سب کچھ پہلی صدی ق۔م سے پہلے پہلے ہوگذرا۔ ۳۱ ق۔م میں یونانی علم و حکمت اور ثروت و سطوت کی شمع فروزاں، قلوپطرہ کی خودکشی کے ساتھ ہی بجھ گئی اور اس کا ترکہ سلطنت روما کی طرف منتقل ہوگیا۔ لہذا چھٹی صدی عیسوی میں، جس تک پہنچنے کے لئے ہم ان تمام وادیوں اور شاہراہوں سے گذر رہے ہیں، یونان کے فلسفہ اور حکمت کے نقوش، کتابوں کی دفتین سے باہر کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

اب ہمیں روم کی طرف چلنا چاہیئے۔ لیکن توسن فکر کا رخ اس طرف موڑنے سے پہلے، یونانی تہذیب کے ایک اور گوشے کو بھی سامنے لے آنا ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یونان میں علم و حکمت کی روشنی اتنی تیز ہے کہ ان سے نگاہوں میں خیرگی پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اس تمام روشنی میں، خدا کا منزہ اور حقیقی تصور کہیں نہیں ملتا۔ عین اس دور میں جب سقراط اور افلاطون، رموز کائنات کی عقدہ کشائیوں میں مستغرق دکھائی دیتے ہیں، پورا یونان ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے معبدوں میں اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے پتھروں کے سامنے سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔ اصنامیات یونان کے دلکش افسانے، ان ہی دیوی دیوتاؤں کی رنگین داستانیں ہیں۔ ۴۳۲ ق۔م میں جب یونان میں حکمت اور تمدن اپنے اوج پر تھا۔ یہ شاہی حکم بھی وہاں موجود تھا کہ "ہر نفس کا پہلا پھل (Elasis) کے مندر پر چڑھاوا چڑھایا جائے"۔ (History of the warled Wech) P. 130

اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ توہم پرستی ہے اس لئے زندگی کا کوئی قدم شگون لئے بغیر نہیں اٹھتا تھا۔ جب یونانیوں کی فوج صقلیہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلی ہے تو اس کا جرنیل اس لئے آگے بڑھنے سے رُک گیا کہ اس رات چاند گرہن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فتح بہت بری شکست میں بدل گئی اور تمام یونان کو تباہی و بربادی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر بھی وہ یونان تھا جس کے افلاطون اور زینو (Zens) نے دنیا کو وہ تصوف دیا جس نے خون رنگ کائنات کو سرد ہی نہیں منجمد کر کے رکھ دیا اور جس کے فلسفہ ترک و تعطل اور تعلیم جمود و تصلب نے انسانوں کی جیتی پھرتی دنیا کو پتھروں کی بستی بنا دیا اور اس کا اثر آج تک بھی کم نہیں ہوا، حتیٰ کہ مسلمانوں جیسی قوم بھی جس کے پاس عمل و حرکت اور قوت و حرارت کا قرآن جیسا چشمہ سرمدی موجود ہے، ان برف کی سلوں کی اثراندازی سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی اور اس موت کو عین حیات سمجھ کر خود فریبی و خود فراموشی کی "کوکناری جنت" میں کھو گئی

مذہبی دنیا سے نیچے اتر کر سیاسی دنیا کی طرف آیئے تو وہاں بھی یونانی تدبر کوئی صحیح راہ زندگی متعین نہیں کر سکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یونان اپنے آئین جمہوریت کے لئے دنیا میں مشہور ہے۔ لیکن یہ وہی جمہوری نظام تھا جس میں غلامی جیسی غیر جمہوری بلکہ غیر انسانی لعنت، زندگی کا عام معمول تھی اور اس کی پہنائیوں کا یہ عالم تھا کہ ایک لاکھ یونانیوں کے لئے تین لاکھ پینسٹھ ہزار غلام موجود تھے۔ "مساوات" کا یہ عالم تھا کہ ارسطو جیسا مصلح اپنی کتاب "سیاست" میں لکھتا ہے کہ

فطرت کا منشاء یہ ہے کہ تمام غیر یونانی، یونانیوں کے غلام ہوں

(Politics Book 1 chapt7)

عام اخلاقیات میں جو حالت تھی اس کا اندازہ (Mahaffy) کے اس ایک ریمارک سے لگ سکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب (Servcy of Greek civil) میں دیا ہے وہ لکھتا ہے

جن اقوام کو ان سے واسطہ پڑا ان میں یونانیوں کی بددیانتی ضرب المثل تھی۔

ان کے اصنامیات میں یوں تو عورتوں کو دیویوں کی حیثیت حاصل تھی، لیکن ان کی سوسائٹی میں عورت کی جو حیثیت تھی اس کے متعلق (G.L Dickinsan) رقمطراز ہے

اس عہد میں عورتوں کا درجہ مردوں سے اس درجہ کمتر تھا کہ عورت کا مقصد سوائے شہوت رانی اور بچہ کشی کے اور کچھ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

(The Greek vice of Life p.169)

پھر جیسا کہ ہر فلسفیانہ تعلیم کا خاصہ ہے حکمت یونان بھی محض نظری مسائل تک محدود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یونان میں کوئی اہم صنعتی ایجاد نہیں ہو سکی ان کے مفکرین کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اپنی اپنی فکرگاہوں کی خلوتوں میں نظری مسائل

کی موشگافیوں میں محو رہتے اور مشاہدات و تجربات کی دنیا سے کچھ واسطہ نہ رکھتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ارسطو جیسا حکیم، باں ہمہ علم و حکمت، اس قسم کے عقائد رکھتا تھا کہ تمام حیوانات میں صرف انسان کا دل حرکت کرتا ہے۔ آدمی کے منہ میں عورت سے زیادہ دانت ہوتے ہیں۔ انڈا سمندر میں تیرتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اسی لئے راجر بیکن، جس نے مسلمانوں سے استقرائی اندازِ تحقیق سیکھا کہا کرتا تھا کہ ارسطو کی تمام کتابیں نذرِ آتش کر دینے کے قابل ہیں۔

اب چلئے رومن تہذیب کی طرف۔ ہمارے موضوع کے اعتبار سے اس تہذیب کو اس لئے خاص اہمیت حاصل ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت یہی تہذیب تھی جس کا مسکن عرب سے ہم کنار تھا۔ قریب سنہ ۱۲۰۰ ق۔م میں جب کریٹ (cret) کی سلطنت کا شیرازہ بکھرا تو وہاں کی آبادی کا ایک حصہ اٹلی کی طرف منتقل ہو گیا۔ جہاں پہنچ کر انہوں نے وہاں کے قدیمی باشندوں سے مل کر ایک

رومۃ الکبریٰ

جدید سلطنت کی بنیاد ڈالی جو بعد میں سماء تاریخ پر رومن امپائر (رومۃ الکبریٰ) کا درخشندہ ستارہ بنکر چمکی۔ وہاں کے قدیم باشندے زراعت پیشہ تھے اس لئے ہندوستان کے قدیم آریوں کی طرح، وہ بھی بارش، ہوا، سورج، آگ وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ سنہ ۷۵۳ ق۔م کے قریب روم کا شہر آباد ہوا۔ جو رفتہ رفتہ رومن تہذیب کا مرکز بن گیا اس سلطنت کی شوکت و اجلال کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے ایک بادشاہ (Caesar) کا نام دنیا کی لغت میں لفظ شاہنشاہ کا مرادف ہو گیا۔ چنانچہ آج جب لفظ قیصر بولا جاتا ہے تو اس سے ذہن سنہ ۴۵ ق۔م کے کسی خاص بادشاہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا بلکہ شاہنشاہ کا مفہوم نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی قیصر کا جانشین شاہنشاہ آگسٹس تھا جس کے مرسخ سیاست پر حسن قلوپطرہ کی داستانِ رنگین کا آخری کھیل کھیلا گیا اور یوں، یونان کی تہذیب کے آثار و بقایا روم کی طرف منتقل ہو گئے۔ یہی وہ عہد تھا جس میں Harace اور (virsil) جیسے شعراء پیدا ہوئے۔ یہیں سے دو قدم آگے بڑھ کر نیرو (Nero) المتوفی سنہ ۶۹ء جیسے مستبد حکمران کا عہدِ آتش بار، عالم سوز سامنے آتا ہے۔

اب ہم پہلی صدی عیسوی تک آپہنچے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں رومن تہذیب کی تاریخ میں ایک بہت بڑا موڑ آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب رومۃ الکبریٰ کا دماغ ایک عالمگیر سلطنت کے حسین تصور سے سامانِ صد ہزار چراغاں کئے ہوئے تھا۔ اور (Phillipsen) کے الفاظ میں انہیں زعم تھا کہ "تمام کرہ ارض کے مالک رومن ہیں"

Internatinal Law 8, Cushian
Vol-1 P. 109

عین اس زمانہ میں پولوس (St. paul) کی مخترع عیسائیت، چپکے سے روم میں داخل ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ اس درجہ اثر انداز ہو گئی کہ سنہ ۳۲۳ء میں شاہنشاہ قسطنطین (Costontine) نے اسے سلطنت کا مذہب قرار دیا۔ سطحی بیں، یا یوں کہئے کہ جذبات سے متاثر مورخ اس واقعۂ عظیم (یعنی عیسائیت کے اثر و نفوذ

کو نہایت مبارک انقلاب قرار دیتے ہیں لیکن جن مورخین کی نگاہیں حوادث زمانہ کو ان کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھتی ہیں وہ اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا تامل نہیں کرتے کہ یہی "مبارک انقلاب" درحقیقت رومتہ الکبریٰ کے انحطاط وسقوط کا باعث ہوا۔ چنانچہ Bri Hault لکھتا ہے کہ

عیسائیت کا اثر روم اپنی ہستی کے بقا کے لئے مشرق کے ساتھ موت و حیات کی لڑائی لڑتا رہا اور یونان کی طرح اس نے مشرق کو بالآخر زیر بھی کر لیا۔ لیکن مشرق بھی اپنا انتقام لئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور یہ انتقام یونان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ نمایاں اور مکمل تھا۔ جس سال روم کو ہنی بال پر فتح عظیم حاصل ہوئی ہے۔ عین اسی سال "خدا کی بادشاہت" کا ہراول دستہ روم کی چار دیواری میں داخل ہو گیا اور وہاں اپنے قدم جما لئے ..... بس اسی دن سے کالڈیا کے نجومی۔ مصر کے شعبدہ باز یہودی علماء اسرار دبواطن۔ ایرانی جادوگر۔ شامی فسوں ساز، ہندی فقیر۔ لشکر در لشکر اور فوج در فوج ...... یورش کرتے گئے تاکہ اس عالم آغوش شہر پر اپنا تسلط جمالیں۔

The Making of himunit P. 155

یہی وہ اجمال ہے جس کی تفصیل آپ کو گبن کی "تاریخ زوال وسقوط سلطنت روما" کی آٹھ مبسوط جلدوں میں ملیگی حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت کی وہ تعلیم جس کی اختراع و ترویج پولوس کی رہین منت ہے، تہذیب و تمدن علم و حکمت شوکت و ثروت، عمرانیت و معاشرت، غرضیکہ انسانیت کے ہر روشن پہلو کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے اور جس معاشرہ میں یہ تعلیم سرایت کر جائے اس کا زوال لابدی اور اس کی موت یقینی ہے۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کی بنا پر یورپ نے مذہب کو ایک الگ محکمہ بنا دیا۔ جسے زندگی کے کسی معاملہ سے کچھ واسطہ نہیں اور اصل تو یہ ہے کہ خود اس مذہب نے اپنی عیسائیت میں اس قدر تبدیلیاں پیدا کر لی ہیں کہ اسے اس قدیم مذہب سے کچھ نسبت ہی نہیں رہی جس کی طرف اسے لفظی طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔

بہر کیف، یہ تھا وہ انقلاب جو پہلی صدی عیسوی میں رومن تہذیب کے حصار میں متعارف ہوا۔ شاہنشاہ قسطنطین روم کو چھوڑ کر بازنطین کی طرف منتقل ہو گیا اور قسطنطینہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیدیا۔ رومن سلطنت کی یہ شاخ دنیا میں بازنطینی حکومت کے نام سے روشناس ہوئی۔ یہی وہ حکومت تھی جو اسلامی انقلاب کے منہ آئی جب اس کی زمام اختیار ہرقل (Heraclius) کے ہاتھوں میں تھی۔ رومتہ الکبریٰ اور بازنطینی حکومت، کے زوال وسقوط کے اسباب و بواعث کے متعلق مورخین نے بڑی کدوکاوش کی ہے۔ اور اس موضوع پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں وجود میں آچکی ہیں۔ لیکن ان تمام تحقیقات و تفصلات کا نچوڑ ایک لفظ میں سمٹ کر آگیا ہے جسے فساد (Camptin) کہا گیا ہے۔ یہ فساد اعیان حکومت اور ارباب مذہب دونوں میں

میں پیدا ہو گیا تھا اور یہی اس کی تباہی و بربادی کا بنیادی سبب ہوا۔ لیکن یہ فساد کہیں باہر سے نہیں آیا تھا بلکہ اس بنیاد میں داخل تھا جس پر اس تہذیب کی فلک بوس عمارت قائم تھی۔ یعنی اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر تھی (Brchoolt کے الفاظ میں۔

فساد

رومۃ الکبریٰ کے زوال و تخریب کا بنیادی سبب کوئی بتدریج بڑھنے والا افساد نہ تھا بلکہ وہ فساد شر، اور حقائق سے عدم توافق کا نقص تھا جو اس تہذیب کی بنیاد اور ہستی میں موجود تھا۔ انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر رکھی گئی ہو، کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کتنے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عوام کے غصب و نہب سے خواص کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبر، خلوص اور دیانت سے چلایا۔ لیکن حسن انتظام کی یہ تمام خوبیاں، بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رورعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔

(The Making of Humant P. 159)

غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کا نتیجہ تھا کہ رومیوں کی ترقی و تصاعد کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی زندگی ایک الجھاؤ بن چکی تھی۔ برق رفتار لیکن بے سکون، نودی تغیرات سے معمور۔ انتہا درجہ تک کی غمناک اندوہگین۔ مبتلائے کشاکش بے پناہ خواہشات اور پھر مایوسیاں اور ناکامیاں (صفحہ ۱۵۵)

یہ تو تھی اصل اور اس کے برگ و بار؟

سرکاری حکام، انتظام سلطنت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے اس لئے کہ پیہم خانہ جنگیوں کی وجہ سے انہیں اپنے مستقبل کے متعلق کبھی اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ وہاں کسی شے کو ثبات ہی نہ تھا۔ لہذا ...... ان کے نزدیک کرنے کا کام صرف یہ تھا کہ قوت یا فریب، جس طرح سے بھی ہو سکے دولت اکٹھی کر لی جائے اور جب تک یہ سلسلہ چل سکے، اسے اپنی کامرانیوں پر صرف کیا جائے۔

(History of The Wrld edited BY weech P. 230)

اس فساد کا نتیجہ یہ تھا کہ

رومن حکومت، مخالفین کی نظروں میں روز بروز کمزور اور خود اپنی رعایا کی نگاہوں میں ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی چلی جا رہی تھی ...... جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے

ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا

O. bloms Decline of all of

اور حالت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ

اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی فنا بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال اور تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ (ایضاً)

یہ تو تھی "مغربی بازو" (سلطنت روم کی حالت! مشرقی بازو (بازنطین تہذیب کے متعلق لکھتا ہے

"اس تہذیب نے انسانیت کے نشوو ارتقا میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ تہذیب ارتقائے انسانیت کی جوئے رواں سے بالکل باہر رہی۔ تہذیب کیا تھی۔ فقط (اسلاف کا) تبرک، ایک حنوط شدہ لقیہ۔ ناکامی کا مجسمہ اس ہزار سالہ عہد میں ترقی اور زندگی کا کوئی خفیف سا شعلہ بھی تو پیدا نہ کر سکی۔ اس کے گرد اگرد انسانوں کا ہجوم تھا جو جہالت کی تاریکیوں سے نکلنے کے لئے المدد المدد پکارتے تھے۔ لیکن اس نے نہ انہیں کچھ سکھایا۔ نہ خود ہی کچھ سیکھا...... اس کے چہرے پر بظاہر تہذیب کا غازہ جلوہ بار تھا۔ لیکن اس کے نیچے پوری وحشت اور بربریت پوشیدہ تھی اور بربریت جو عہد بہ عہد زیادہ سے زیادہ تر ہوتی چلی گئی.........

وحشیانہ مظالم کی یہ کیفیت تھی کہ آنکھیں نکلوا دینا۔ زبان کٹوا دینا۔ مختلف اعضاء کی قطع و برید کر دینا سولی پر لٹکا دینا یا زندہ جلا دینا۔ عام سزائیں تھیں...... باسل دوم نے پندرہ ہزار جنگی قیدیوں کی آنکھیں نکلوا دیں اور صرف ایک فیصدی باقی چھوڑی (تاکہ وہ وحشت و سبعیت کا یہ تماشا دیکھ سکے،

(صفحہ ۱۷۷ و صفحہ ۱۸۱)

یہ تھی وہ تہذیب جو ظہور اسلام کے وقت دنیا کی سب سے درخشندہ اور تابناک تہذیب قرار دی جاتی تھی۔ وہ تہذیب جس نے

"ان ممالک (مثلاً روس اور بلقان) کو جو اس سے متاثر ہوئے وہ عناصر عطائے جو ان کی تہذیب کے نہیں بلکہ بربریت کے اجزا بنے" (ایضاً صفحہ ۱۸۲)

لیکن ان سیاسی اور تمدنی خرابیوں سے کہیں بڑھ کر وجہ فساد وہ خرابیاں تھیں جو وہاں مذہب کے راستے داخل ہوئیں

مذہبی دنیا

یونان کے اصنام و اوثان اور توہمات و مزخرفات، ایک ایک کر کے رومیوں کے ہاں منتقل ہو کر آ چکے تھے۔ جب عیسائیت آئی تو سینٹ پال کی وساطت سے یہ تمام مجموعۂ خرافات اس جدید مذہب کا سرمایہ قرار پا گیا۔ یہ کس طرح ہوا؟ اس کی مختصر سی تفصیل، ڈریپر کے الفاظ میں سنئے۔ وہ لکھتا ہے:-

اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہو چکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنی گون کا سمجھا اسے تخت پر بٹھا دیا۔

لیکن یہ قدرت اسے پھر بھی حاصل نہ ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصال کلی کر سکے۔ دونوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے۔ اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی اور عیسائیت کی شاخیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔ عیسائیت اور اسلام میں اس بات میں بڑا فرق یہ ہے کہ اسلام نے اپنے مدمقابل کو مطلقاً نیست و نابود کر دیا اور اپنے عقائد کو بلا کسی آمیزش کے شائع کیا......... جوں جوں زمانہ گذرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹیلین نے بیان کی ہے ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ اولمپس وہی پہلا سا موجود ہو گیا صرف دیوتاؤں کے نام بدل دیئے گئے۔ عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا...... چنانچہ فاسٹس نے سینٹ آگسٹائن سے برملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا:۔ "تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا۔ اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ تمہاری جماعت علیحدہ ہے اور ان کی جماعت علیحدہ۔ ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی سے ہیں"

(Conflict between Religion and Science)

ذرا آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے

اس مقام پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ عیسائیت کے ساتھ بت پرستی کے شامل کر دینے کی اس چال نے بالآخر لوگوں کو انحطاط عقلی کے کس طبقۂ سافل تک پہنچا دیا۔ بت پرستی کی رسمیں اختیار کر لی گئیں۔ پرستش کے نمائشی اور بھڑک دار طریقے جاری ہو گئے۔ پادریوں نے پر تکلف لباس ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کر دیئے۔ کافوری شمعیں۔ سونے چاندی کے گلدان، مراسم مذہبی کے لوازم میں داخل ہو گئے۔ عبادت میں براتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام نظر آنے لگی۔ قربانی کے ذریعے طہارت ہونے لگی۔ رومی بت پرست کاہنوں کی جادو کی چھڑی عیسائی اسقف کی حکومت ملی کا عصا بن گئی۔ گرجے شہداء کے مزاروں پر بنائے جانے لگے اور ان کی تطہیر و تقدیس ان رسموں کے ذریعہ سے ہونے لگی جو سلف میں بت پرست پجاریوں کے ہاں رائج تھیں۔ جھوٹ سچ جہاں کہیں کسی شہید کے کچھ آثار بہم پہنچ گئے فوراً ان کی یادگار میں میلے اور عرس قایم کر دیئے گئے۔ خدا کے غضب کو فرو کرنے اور آسیب اتارنے کا سب سے بڑا ذریعہ فاقہ کشی قرار دیا گیا۔ بیت المقدس اور شہداء کے مزاروں کی زیارت و طواف کے لئے لوگ ہزارہا کوس چل کر جاتے تھے۔ بیت المقدس سے منوں خاک دھول لا کر لوگ موتیوں کے مول بیچتے تھے اور اس مٹی کو شیطان کے دفعیہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ دم کئے ہوئے پانی کے اوصاف و خواص میں تو کسی کو کلام ہی نہ تھا۔ مورتیں اور تبرکات گرجاؤں کے

لوازم تھے اور خوش عقیدہ لوگ بتوں کی طرح ان کو بھی پوجتے تھے۔ جس طرح زمانۂ سابق میں بت پرستوں نے بعض مقامات کو خوارق عادات اور معجزات کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اسی طرح خاص خاص مقامات عیسائی دنیا میں بھی اعجاز و کرامات کے مرکز قرار دیئے گئے۔ عیسائیوں کی نجات یافتہ روحوں کو حاضرات کے طریقہ پر طلب کیا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ روحیں اطراف عالم میں بھٹکتی پھرتی ہیں یا اپنے مقابر کے اوپر منڈلا رہی ہیں۔ مندروں اور قربان گاہوں کی تعداد خارج از حد شمار تھی۔ توبہ اور ازالۂ معصیت کے لئے خاطی کو جو تکلیف دہ اور ایذا رساں لباس پہننا پڑتا تھا اس کی بہت سی قسمیں تھیں۔ حضرت مریم کی عید تطہیر کا تیوہار اس غرض سے قایم کیا گیا کہ جو بت پرست نئے نئے عیسائی ہوتے تھے۔ ان کے دلوں سے پین دیوتا کے یوم جشن کے منسوخ ہونے کی کھٹک جاتی رہے۔ مورتوں صلیب کے ٹکڑوں، ہڈیوں کیلوں، اور دوسرے تبرکات کی پرستش عام رواج پا گئی گویا اچھی خاصی جماد پرستی رایج ہو گئی۔ ان آثار متبرکہ کی تصدیق کا انحصار دو براہین پر تھا۔ یعنی پادریوں کے حکم یا معجزات کے اظہار پر۔ اولیا کے پھٹے پرانے کپڑوں اور ان کی قبروں کی خاک تک متبرک سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ فلسطین سے کچھ بوسیدہ ہڈیاں لائی گئیں اور ان کی نسبت بوثوق تمام یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت مرقس اور حضرت جمیس اور دوسرے اولیائے عہد سابق کے آثار جسمانی ہیں۔ بت پرستی کے زمانہ میں انسان کو دیوتا بنا دیا جاتا تھا۔ عیسائیوں نے اسے ولی کر دکھایا کہ اس کا تصرف بھی معاملات انسانی میں ربانی مداخلت سے کسی طرح کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ مقامی دیوتاؤں کی جگہ مقامی پیر اور اولیا قایم ہو گئے۔ اس کے بعد عشائے ربانی کی پر اسرار رسم کا ظہور ہوا جس کا مطلب یہ ہے کہ پادری کے عمل سے روٹی اور شراب مسیح کے گوشت اور خون کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مرور قرون نے عیسائیت اور بت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل و مکمل کر دیا نئے نئے تیوہار منائے جانے لگے جن میں سے ایک تو اس برچھے کی یادگار میں قایم کیا گیا تھا جس سے حضرت عیسیٰ کے پہلو میں چرکا دیا گیا تھا۔ ایک ان میخوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے قایم کیا گیا تھا جن سے آپ کا جسم صلیب میں جڑ دیا گیا تھا اور ایک سے کانٹوں کے اس تاج کی یاد کو تازہ رکھنا مقصود تھا جو مصلوب کرتے وقت آپ کو پہنا دیا گیا تھا۔ اگرچہ بیسیوں خانقاہوں میں کانٹوں کا یہ بے بہا تاج موجود تھا لیکن زمانہ کا یہ رنگ تھا کہ کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ سب کے سب تاج اصلی ہوں

گبن اس باب میں رقمطراز ہے:-

ساتویں صدی کی عیسائیت نہایت غیر معقول طریق پر عہد تاریک کی یادگار بن کر رہ گئی تھی۔ وہ پرانے تبرکات اور ان مجسموں سے اپنی مرادیں مانگتے تھے جو مشرق میں کلیساؤں کے لئے باعث عار تھے۔ خدا کے جلال کو

تخت، دیوں، شہیدوں اور فرشتوں کے بادلوں میں گھر چکا تھا جو عوام کی عقیدت کا مرکز تھے تثلیث اور الوہیت کے مسئلے خدا کی توحید کی کھلی ہوئی تردید کر رہے تھے...... چھ سو برس تک بائبل ان کے لئے صداقت اور نجات کا راستہ بنی رہی لیکن اب عیسائیوں نے بائبل کے قوانین اور حضرت مسیحؑ کے مسلک دونوں کو بری طرح فراموش کر دیا۔ (جلد ششم صفحہ ۲۹۶ - ۲۸۷)

یہ تھی وہ "آسمانی روشنی" جو اس زمانہ میں عیسائیت کے نام سے دنیا میں پھیلائی جا رہی تھی۔ اور اس کا مرکزی وہ ملک تھا جس کی حدیں سرزمین عرب سے بالکل ملی ہوئی تھیں۔ فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں نے ان عیسائیوں میں اختلافات و مناقشات کو اس درجہ شدید کر رکھا تھا کہ ذرا ذرا سے اختلاف پر قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔

(Sale) اپنے ترجمۂ قرآن کریم کے مقدمہ میں لکھتا ہے:۔

"گرجا کے پادریوں (Clergy) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے، اور امن محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے۔ اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعث ننگ ہیں مذہبی صورت میں قائم کئے گئے۔ خصوصاً دلیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ نیس کی کونسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا، اور ایرئنس، سبلینس، نسطورنیس، اور یوٹیکنیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں مغربی چرچ میں ڈمیس اور اسیکی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لئے قتل تک نوبت پہنچا دی اور آخر ڈمیس کی فتح ہوئی۔ اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سسی نینس کے گرجا میں ایک روز میں، ۱۳۷ آدمی قتل کئے ہوئے پائے گئے، اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے، اس لئے کہ اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے۔ اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے، اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہو گئی اور ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا، خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست، اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔

عقائد کی خرابی کے علاوہ، روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں۔ شہنشاہ قسطنطین کے

بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لئے مشہور تھے۔ آنحضرت صلعم کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ لوگوں (Goths) نے روند ڈالا تھا .... یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔

صرف قتل و خوں ریزی ہی نہیں، بلکہ یہ "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے" کی تعلیم کے مدعی اپنے مخالفین پر اس قدر انسانیت سوز مظالم برپا کرتے تھے جن کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ ان کی تفصیل گبن اور ڈریپر کے ہاں دیکھئے۔ ایک اسقف اعظم (سینٹ سدل) کا حریف، اریئس نامی ایک پادری تھا ایک روز سر راہ، پادری راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے حامیوں کی باری آئی تو وہ سدل کو تو پا نہ سکے اس کی ایک خاتون دوست کو رستہ میں پکڑ لیا اسے برہنہ کیا گیا اور اسی حالت میں تمام شہر کے گلی کوچوں سے کشاں کشاں کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر اسے پیٹر کے مقدس گرز سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا اور لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے جلا دیا۔ اس قسم کے واقعات وہاں کا معمول بن چکے تھے۔ پھر پوپ اپنی پرستش الگ کراتے تھے۔ بادشاہ (قیصر آگسٹس) الگ پوجا جاتا تھا۔ ان تمام مفاسد سے بڑھ کر فتنۂ خانقاہیت تھا جس نے ان کے دل اور دماغ دونوں کو بیکار کر دیا تھا۔ ان چیزوں کے متعلق

زوال

گذشتہ اوراق میں "عیسائیت" کے عنوان کے ماتحت بہت کچھ آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے یہاں (تجدیداً) بازنطینی حکومت سے متعلق مختصر سا اضافہ کیا جاتا ہے Brn.. Buill لکھتا ہے۔

"اگر ہم بازنطینی حکومت کے جمود و تعطل کے اسباب و علل دریافت کرنا چاہیں تو یہ تین عنوانات کے تابع آجائیں گے۔ سب سے پہلے جاہل اور متعصب راہبوں کا وہ ہجوم جو اس سلطنت کی قوت کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ ہر صوبہ اور ہر قریہ میں ٹڈی دل کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ صرف ایک قسطنطنیہ میں کوئی ایک سو سے زیادہ خانقاہیں تھیں　　　میں قریب ایک ہزار راہب ہوں گے۔ الفوس۔ آئیڈا اولمپس کی پہاڑیاں اور مار مورا کا جزیرہ، خانقاہوں سے پٹا پڑا تھا۔ ہر دس قدم پر آپ کو گیسو دراز، کوتاہ آستین، "راسپوٹین نما" شاعر دکھائی دیتے جن کے گرد معتقدین کا ہجوم ان کی دست بوسی کے لئے حلقہ بنائے رہتا۔ ہر شریف آدمی، ہر سوداگر، ہر دولتمند، ہر نیک خاتون کوئی نہ کوئی خانقاہ بنواتی .... ان فقیروں کا تسلط عوام کے قلوب پر بہت گہرا تھا وہ اپنی کرامات، معجزات اور تذکار اولیا سے لوگوں کو مرعوب کرتے ...... ان کے خوارق و کرامات اور گذشتہ اولیاء کی تماثیل کی پرستش ہوتی۔ ہر مشکل میں ان سے مدد مانگی جاتی تجار

میں کامیابی، متاع گم گشتہ کی بازیافت اور بیماری سے شفا کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جاتا۔ چونکہ ان لوگوں کو عوام کی اندھی عقیدت حاصل تھی اس لئے وہ حکام وقت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے (صفحہ ۱۷)

چوتھی صدی عیسوی میں یہ سلسلۂ خانقاہیت رو بہ ترقی تھا۔ چھٹی صدی میں یہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ جب سینٹ بینڈکٹ (St: Benadict) نے اسے ایک منظم ادارہ کی صورت میں متشکل کر دیا۔ تجرد و خلوت گزینی کی اس زندگی میں وہ اپنے آپ کو طرح طرح کی تکالیف میں مبتلا رکھتے اور اس کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے نہ صرف تکالیف و مصائب بلکہ نہایت گھناؤنی اور نفرت انگیز حرکات، انتہائی عبادت سمجھی جاتیں۔ کوئی قسم کھالیتا کہ تمام عمر غسل نہیں کروں گا۔ کوئی اپنے آپ کو عمر بھر دلدل میں ڈالے رکھتا۔ کوئی غلاظت کے حصار میں بیٹھے رہنے میں عافیت سمجھتا۔ کوئی اندھیری کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ جب زندگی کا تصور اس قدر نفرت انگیز ہو جائے تو حسن ذوق اور احساسات لطیفہ کی جو مٹی خراب ہوگی وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان کی فطرت اس قدر مسخ ہوگئی کہ وہ ہر حسین و لطیف شے سے ابا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ بقول (Inge) "وہ کسی حسین شے کی موجودگی میں خدا کی عبادت ہی نہیں کر سکتے تھے" اور جس جگہ انہیں ذوق سلیم کا کچھ بھی مظاہرہ دکھائی دیتا وہ اسے تباہ و برباد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔

چنانچہ جہاں عیسائی پادریوں (ارباب شریعت) نے یہ اپنا مقدس فریضہ سمجھ رکھا تھا کہ علم و بصیرت کے ہر مظاہرے کو نذر آتش کر دیا جائے وہاں ان احبار و مشائخ نے اسے تزکیۂ نفس اور ارتقائے روح کا ذریعہ قرار دے رکھا تھا کہ دنیا میں کوئی حسین شے دکھائی نہ دے۔ یہی وہ زاویۂ نگاہ تھا جس کا ماتم کرتے ہوئے (Dorsey) لکھتا ہے کہ

ہمارے پاس رومیوں کے حماموں کے متعلق اس لئے معلومات موجود ہیں کہ انہیں آتش فشاں پہاڑ (Vesuvius) کی راکھ نے ڈھانپ دیا تھا لیکن ہم اسپین میں مسلمانوں کے حماموں کے متعلق کچھ نہیں جانتے اس لئے کہ وہاں (بدقسمتی سے) کوئی (Vesuvius) نہ تھا جو انہیں اپنی راکھ سے ڈھانپ دیتا۔ بلکہ وہاں عیسائی فرڈیننڈ اور ازبلا تھے جنہوں نے اپنے احکام شاہی سے ان سب کو مسمار کرا دیا۔"

Civilisation P. 410

اور ان کے حسین و نفیس ظروف ہی کیا؟ ان کی جہالت نے تو دنیا کی ہر مہذب شے کو تباہ اور برباد کر دیا۔ یہی مؤرخ تہذیب دوسرے مقام پر لکھتا ہے۔

دنیائے قدیم کی تہذیب، عیسائی رومیوں کے ہاتھوں ایک ہزار سال کی نیند سو گئی۔ نوع انسانی کی تاریخ میں کسی واقعہ نے اتنی تباہی یا نگاہ کے زاویہ میں ایسی تبدیلی پیدا نہیں کی جتنی عیسائیت نے کی ہے، انسان نے ہزارہا سال کی محنت شاقہ کے بعد جو کچھ بنایا، حتیٰ کہ یہ دنیا اور زندگی کی تمام مسرتیں۔ بیوی۔ گھربار، دولت

صحت۔ خوشی۔ سب ایک نجات دہندہ کے نام پر قربان کر دیئے گئے۔ اور وہ بھی دنیا میں امن نہیں فساد پھیلانے کے لئے۔ (صفحہ ۲۵۵)

علم دشمنی

ان کی علم دشمنی کی یہ کیفیت تھی کہ پوپ گریگری نے (Cicero) اور (Livy) کی ان تمام کتابوں کو جلا دیا جو اس کے ہاتھ لگیں۔ اس نے ایک مرتبہ سنا کہ وتی آنا کے ایک بشپ کو ادب سے کچھ لگاؤ ہے تو اس نے نہایت برافروختہ ہو کر لکھا کہ "ہم نے سنا ہے کہ تم ادب پر لیکچر دیتے ہو۔ ہمیں تمہاری طرف سے یہ سننے کی توقع ہے کہ تمہیں اس قسم کی لغویات سے کچھ تعلق نہیں" اور جیسا کہ خانقاہی نظریۂ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان کے قوائے عملیہ کے اضمحلال اور توہم پرستی کا یہ عالم تھا کہ جب ۴۱۰ء میں (Alanic) نے روم پر چڑھائی کی ہے تو تمام علاقہ تباہی اور بربادی اور آگ اور خون کے چنگل میں تھا۔ اور شہر کے اندر سینٹ آگسٹائن اس "اہم مسئلہ" کے حل میں مصروف تھے کہ اس بربریت میں جن کنواری لڑکیوں کی عصمت دری ہوگی وہ حیات اخروی میں تاج عذارت (Crwn ap uirginland) سے سرفراز ہوسکیں گی یا نہیں!

※

یہ تھی مجملاً اس "تہذیب" کی حالت جو چھٹی صدی عیسوی کی سب سے بڑی "مہذب دنیا" کا طرۂ امتیاز تھی اور جب مہذب دنیا کی یہ حالت تھی تو یورپ کے باقی غیر مہذب علاقہ کی جو کیفیت ہوگی

باقی یورپ

وہ محتاج وضاحت نہیں۔ ہمارے خیال میں ان وحشی قبائل کی زندگی کا تصور پیش کرنے کے لئے (Biaemed) کا ایک اقتباس کافی ہوگا۔ وہ لکھتا ہے:۔

> وہ جنگلات اور دلدل زمینوں پر جھونپڑیوں میں رہتے۔ ان کے پاس چند گھریلو ضروریات کی چیزیں، کچھ آلات کشاورزی اور دیہاتی گیت ہوتے۔ اس کے بعد وہ مدہوش شرابی، خونخوار قاتل۔ غدار اور سخت فحش کار تھے۔ ان کی جہالت انتہائی کمینہ پن اور بیہمانہ انداز کی تھی۔ شراب کے نشہ میں بدمست ہو کر اونچے اونچے چلانا اور خرمستیاں کرنا ان کا سب سے بڑا جشن طرب تھا۔ قتل و غارتگری، سفاکی۔ حیا سوز تشدد، ان کی قوتوں کے مظاہرے تھے۔ اور جب ان چیزوں سے فارغ ہوتے تو بیٹھے آگ تاپتے۔ اور ان کی عورتیں کام کاج کرتیں" (صفحہ ۱۶۷)

یہ تھی یورپ کی حالت۔ وہ حالت جس کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ "اتنے سے عرصۂ تاریخ میں خرابیوں میں زیادتی اور خوبیوں میں کمی اور کہیں نہیں مل سکتی"

※

ہمارا تاریخ تہذیب کا کارواں اب منزل کے قریب آپہنچا ہے۔ اب ہمیں حدود عرب میں داخل ہو جانا چاہیئے لیکن یہ

ہندوستان کی تہذیب

داستان ناتمام رہ جائے گی اگر اس میں ہندوستان کی تہذیبی حالت کا تذکرہ شامل نہ کیا جائے۔ ہندوستان کی تہذیب کے متعلق قدم اٹھاتے وقت پھر اسی دشواری کا سامنا ہو جاتا ہے جو یہاں کے مذاہب کے متعلق گفتگو کرتے وقت گلو گیر ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ یہاں ہر پرانی چیز کو تقدس کا زنار پہنا دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس پر تنقید مداخلت فی الدین قرار دیدی جاتی ہے۔ لیکن اس باب میں بھی ہماری مشکل کشائی ایک ہندو مؤرخ (M. R. C. Dutt) کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ جس کی کتاب A History of Civilisation in Ancin India) پراچین تہذیب پر مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ مسٹر دت نے ہندوستان کی تاریخ کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے اور پانچویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کی آمد تک کا زمانہ "پرانک تہذیب" کا زمانہ قرار دیا ہے۔ چونکہ ہمارے موضوع کا تعلق اسی زمانہ سے ہے اس لئے ہم اس زمانہ کے متعلق مسٹر دت کی شہادات پیش کرتے ہیں تاکہ یہ حقیقت سامنے آجائے کہ اس وقت ہندوستان میں تہذیب کی کیا حالت تھی؟ اس عہد کا تعارف کراتے ہوئے مسٹر دت اپنی کتاب کی جلد دوم کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

> اس زمانہ کے کوائف کو پیش کرتے ہوئے میں نے اس باب میں بالکل تامل نہیں برتا کہ میں نہایت تکرار اور شدت سے اس حقیقت کو واضح کردوں کہ قدیم ہندی اداروں میں جو کچھ صحت بخش، آزاد، غیر مقید اور حیات آور عنصر تھا اس کا کس قدر نقدان ہو چکا تھا۔ یہ وہ صداقت ہے جسے ہم ہندوؤں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے (مقدمہ صفحہ ...)

اب آگے بڑھیئے۔ بت پرستی عام مسلک ہو چکا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> بت پرستی کا رواج عام تھا۔ انسان کے دل پر بت پرستی کبھی شرافت آمیز اثر نہیں چھوڑتی۔ لیکن ہندوستان میں تو بت پرستی کے ساتھ اور بھی بہت سی خرابیاں شامل تھیں .... مندروں کے پجاری (برہمن) لوگوں کی گردنوں میں اپنی پرستش کی زنجیریں بھی ڈالے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مذہب اس قدر پستی کی حالت تک پہنچ گیا کہ مٹی کی مورتیوں اور برہمنوں کی اندھی پرستش کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا (صفحہ ۱۹۵)

مذہب کی عمومی حالت پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ مؤرخ لکھتا ہے

> یہ ہیں وہ افسانوی معتقدات، یہ ہیں وہ مذہبی رسوم و مناسک جو ان اسلاف کے جانشین عمل میں لاتے تھے۔

لہ ہمارے سامنے اس کتاب کا ۱۸۹۳ء کا ایڈیشن ہے۔

جو ویدوں کے منتر گاتے اور اُپ نشدوں کے مسائل میں تجسس و تفحص کرتے تھے۔ (صفحہ ۲۱۲)

تنتر لٹریچر کے متعلق جو اس زمانہ کی نمایاں خصوصیت تھی، مسٹر دت کی رائے سننے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

مورخین کے لئے تنتر لٹریچر ہندو فکر کا کوئی خاص گوشہ پیش نہیں کرتے بلکہ وہ انسانی ذہنیت کی وہ مسخ شدہ صورت پیش کرتے ہیں جو محض اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب قومی زندگی فنا ہو چکی، سیاسی شعور مٹ چکا، اور علم کی شمع گل ہو چکی ہو۔ (صفحہ ۲۱۳)

پیدائش کے اعتبار سے انسانوں کی طبقاتی تقسیم، وحدت خلق اور مساواتِ انسانی کے بنیادی اصول کے خلاف ہے لیکن ہندو سوسائٹی کا مدار ہی اس تقسیم پر ہے، اس لئے کہ ان کے مذہب کا اصل الاصول، نظریۂ تناسخ ہے۔ اور مسئلہ تناسخ کا فطری نتیجہ ذاتوں کی تقسیم ہے۔ یہ غیر فطری تقسیم، مندروں کی چار دیواری سے لیکر عدالت کی انصاف گاہوں تک، زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل اور کارفرما تھی۔ مثلاً لین دین کے معاملات تک میں یہ حالت تھی کہ اگر برہمن قرض لے تو اس سے ۲۴ فیصدی سود لیا جاتا تھا۔ کھشتری سے ۳۶ فیصدی، ویش سے ۴۸ فیصدی اور شودر سے ۶۰ فیصدی (صفحہ ۱۱۱)، یا جرائم کے معاملہ میں ایک ہی جرم کی سزا، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کے لئے مختلف تھی۔ اگر کوئی اچھوت کسی اونچی ذات والے کو چھو بھی لے تو موت کی سزا کا مستوجب ہو جاتا تھا۔ لیکن برہمن کسی کو قتل بھی کر دے تو اسے سزائے موت نہیں دیجا سکتی تھی (صفحہ ۱۱۲) نتیجہ اس کا یہ کہ

ذاتوں کی تقسیم کا، جس نے برہمنوں کے وقار اور مفاد کو بہت بلندی پر پہنچا دیا لابدی نتیجہ یہ تھا کہ اس نے تمام دیانتدارانہ تجارت اور حرفت کو تباہ کر ڈالا، اور فقط برہمنوں کی تجارت باقی رہ گئی…… اس نے نہ صرف یہی کیا کہ قوم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور باہمی تنفر پیدا کر دیا بلکہ اس نے برہمن کے وقار کو بلند کرنے کے لئے قوم کی قوم کو قعرِ مذلت میں گرا دیا۔ (صفحہ ۲۱۹)

اسی ورنوں کی تقسیم کے متعلق ایک دوسرے مقام پر مسٹر دت ان الفاظ میں تنقید کرتے ہیں:

ذاتوں کی تقسیم کا نظریہ، قدامت پسند ہندوؤں کے تخیل اور اعتقاد میں قرنہا قرن سے بہے چلا آرہا ہے۔ ایک اندھی عقیدت، ایک جذبۂ مستحسن کی حیثیت سے، جس پر کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی گئی۔ جسے واقعات کی کسوٹی پر نہیں پرکھا گیا۔ جسے کسی نے کبھی مستفسرانہ دیکھا ہی نہیں۔ اور بایں ہمہ یہ نظریہ جو بظاہر ایسا منظم اور ہمہ گیر، مکمل اور نقائص سے مبرّیٰ دکھائی دیتا ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ جوں ہی اسے تنقید کے ناخن سے چھیڑا جائے تو یہ اس طرح نفنہ میں گم ہو جاتا ہے جس طرح وہ رنگین بلبلے جو بچے صابون اور پانی سے اُچھالا کرتے ہیں۔ (صفحہ ۹۲)

اس معاشرت میں شودروں کا وجود بجائے خویش ایک کھلی ہوئی غلامی کی شکل تھی۔ لیکن مستقل غلامی Slavery

کارواج بھی اس وقت کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ

> امیر آدمیوں کی جائداد اور املاک میں غلام سب سے زیادہ قیمتی متاع تصور کئے جاتے تھے۔ ہندوستان قدیم میں گھر کے غلام کی اسی طرح خرید و فروخت ہوتی تھی جس طرح ازمنۂ قدیمہ میں دیگر ممالک میں (ص۳۱۲) ..... قرضہ لینے والا اپنی لونڈیوں کو قرض دینے والے کے پاس رہن رکھ دیتا تھا (ص۳۱۱) غلاموں کی سات قسمیں ہوتی تھیں جن میں علاوہ دیگر اقسام، جنگ کے قیدی، غلاموں کی اولاد اور زر خرید غلام، سب سے اہم تھیں (ص۳۱۱)

معاشی نظام یکسر سرمایہ دارانہ تھا۔ چنانچہ سوجی دستہ دھرم ستر کے حوالہ سے بیاج کی شرح و آئین کے متعلق تفصیلی احکام بیان کرتے ہیں (ص۳۰۱)۔ راجاؤں کے محلات میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی۔ مندروں اور دیگر مقدس مقامات میں جن انسانیت سوز حرکات کا ارتکاب ہوتا تھا، ان کے بیان سے حیا تھرتھراتی ہے اس لئے اس کی تفصیل کی ہمیں جرأت نہیں۔ اس کے لئے سوامی دیانند کی ستیارتھ پرکاش کا گیارھواں سملاس دیکھئے۔

بہر حال یہ تھی چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان کی تہذیب کی عمومی حالت۔

نگہِ بازگشت

گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نگہِ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ چھٹی صدی عیسوی میں دنیائے تہذیب و تمدن اور جہانِ عمرانیت و معاشرت کی کیا حالت ہو چکی تھی۔ مذہب کی دنیا کو دیکھئے، تو خدائے واحد القہار کا صحیح تصور کسی مقام پر بھی موجود نہ تھا۔ شرک، اپنی جلی اور خفی شکلوں میں ہر جگہ مسلط تھا اور انسان کی وہ پیشانی، جو ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی تھی، اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں، درختوں اور حیوانوں، دریاؤں اور پہاڑوں، اجرامِ سماوی اور عناصرِ ارضی ہر ایک کے حضور سجدہ ریز تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسان اپنے مقام سے یکسر ناآشنا تھا۔ اور وہ جس کے لئے ارض و سموٰت کی ہر شے مسخر کر دی گئی تھی، ارض و سموٰت کی ہر شے سے خائف اور ہراساں، ترساں و لرزاں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ چونکہ یہ اپنے مقام سے بے خبر اور اپنی حقیقت سے ناآشنا تھا اس لئے برہمنیت کی انسانیت سوز لعنت اس کی زندگی کے ہر گوشے پر متغلب تھی۔ جو اس سے ذرا آگے بڑھتے تھے ان کے لئے خانقاہیت کا شجرِ منجمد موجود تھا، جہاں پہنچ کر زندگی کی ہر حرارت افسردگی اور ہر تازگی پژمردگی میں بدل جاتی تھی۔ کہیں افلاطون کا فلسفۂ اعیانِ ناشہود ہر حقیقت کو سراب میں بدل رہا تھا، اور کہیں بدھ مت کا قنوطی تصورِ حیات، اس جہانِ کیف و رنگ کو محبسِ آب و گل بنائے ہوئے تھا۔ کہیں تناسخ کا نظریہ انسان کے ارادہ و

واختیار کو سلب کر کے اسے مجبورِ محض قیدی کی طرح دنیا کے جیل خانہ میں بند کئے تھا جہاں وہ کسی گزشتہ جنم کے موہوم گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے بھیجد یا گیا تھا۔ اور کہیں مزدکیت کا عقیدہ اسے فطری قوانین کی حدود وقیود سے بھی آزاد کر کے شتر بے مہار کی طرح وادیٔ بہیمیت میں بے باکانہ چھوڑے تھا۔ جہالت کی یہ کیفیت تھی کہ ہر وہ معلول (effect) جس کی علت (Cause) ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، مافوق الفطرت قوت سے موسوم ہو کر دیوی دیوتا بن جاتا تھا۔

نظام تمدن وسیاست کی طرف آیئے تو شخصی حکمرانوں کے آہنی پنجوں کی مستبدانہ وقاہرانہ گرفت، حریتِ فکر اور آزادیٔ خیالات کی ہر رمق کا گلا گھونٹ رہی تھی اور اس خیال سے کہ کہیں ان اطواق وسلاسل کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے، بادشاہ کو ایشور کا اوتار، سایۂ یزداں اور خدا کی صفات کا حامل قرار دے رکھا تھا اور یوں اسکی ہر جگہ پرستش ہوتی تھی۔ لغتِ سیاست "انسانی حقوق" کے الفاظ تک سے ناآشنا، اور مساوات شہری کے مفہوم تک سے بے خبر تھی۔ ذاتوں کی تقسیم نے قبائے وحدتِ نوعِ انسانی کی دھجیاں بکھیر رکھی تھیں۔ غلامی اس زمانہ کی معاشرت کا جزو لاینفک بن چکی تھی، اور ارسطو جیسا حکیم اسے انسانی معاشرت کے لئے لابدی خیال کرتا تھا۔

معاشی نظام میں سرمایہ داری کی خباثت معمول قرار پا چکی تھی۔ سود کی شرحیں شاستروں کی رو سے متعین ہوتی تھیں (Seneca) جیسا مصلح جو عمر بھر غریبوں اور مفلسوں کی ہمدردی میں سرد آہیں کھینچتا رہا، قریب ساڑھے چار کروڑ روپیہ کی جائداد چھوڑ کر مرا۔

اخلاق کی دنیا میں شرم ایک طرف سر جھکائے کھڑی تھی تو حیا دوسری طرف منہ چھپائے پڑی تھی۔ فحش کاری کی کوئی حرکت نہ تھی جسے اس زمانہ میں سندِ اباحت نہ مل چکی ہو اور سیہ مستی کی کوئی لغزش نہ تھی جس پر کوئی پابندی باقی رہ گئی ہو۔ شاہی محلات اور امراء کی محافل تو ایک طرف۔ تقدس وعقیدت کے مذہبی مراکز تک شرمناک فواحش کے اڈے بن چکے تھے۔

غرضیکہ یہ تھی وہ دنیا جس میں انسانی فطرت اس درجہ مسخ ہو چکی تھی کہ حقیقت کی کوئی جھلک کہیں سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

بود انساں در جہاں انساں پرست	ناکس و نابود و مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش	بند ہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر	بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت	باج بر کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش	بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرت او دوں شدہ

نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہ تھی وہ دنیا جس کی تفاصیل و اطناب کو قرآن کریم نے ایک مختصر سے ٹکڑے میں اس حسن و خوبی سے سمیٹ کر رکھدیا ہے کہ اس کی جامعیت پر ہر متجسس حقیقت نگاہ وجد آگیں دکھائی دیتی ہے۔ وہ ٹکڑا جو ہمارے اس موضوع کی پیشانی پر کوکب درخشندہ کی طرح چمک رہا ہے۔ یعنی

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

خود عرب کی حالت

:(۳):

گذشتہ اوراق میں ہم دنیا کے مذاہب اور تہذیب پر ایک تیرتی ہوئی نگاہ ڈال چکے ہیں جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں کس طرح ہر شے اپنی اصل سے ہٹ چکی تھی اور بساط عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں فساد برپا نہ ہو چکا ہو۔ لیکن اس تنقید و تبصرہ میں خود عرب[1] کی سرزمین ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئی جسے اس کے بعد شرف انسانیت کی نشو و ارتقاء کا گہوارہ اور نوع انسانی کی فلاح و اصلاح کا مرکز قرار پانا تھا۔

ہم تیسری جلد میں دیکھ چکے ہیں کہ معمار حرم حضرت ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی عزیز ترین متاع یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو فاران کی بے برگ و گیاہ وادی میں، دنیا میں خدا کے پہلے اور آخری گھر کی تولیت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جب حضرت اسماعیلؑ یہاں آکر بسے ہیں تو یہ قطعۂ ارض قریب قریب ویرانہ تھا لیکن اللہ تعالےٰ نے آپ کی حسن نیت میں وہ برکت عطا فرمائی کہ یہی ویرانہ دنیا بھر کی شادابیوں اور آبادیوں کا مرکز بن گیا۔ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے جو تورات کے الفاظ میں بارہ قبیلوں کے سردار تھے (تکوین ۲۵/۱۶)، اس زمانہ میں تجارت کے قافلے یمن سے چلتے اور مکہ کی راہ شام اور مصر تک جاتے۔ بنو اسماعیل نے بھی تجارتی کاروبار شروع کیا اور تھوڑے سے عرصہ

بنو اسماعیل

میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔ ہم حضرت یوسفؑ کے تذکرۂ جمیلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ جس کارواں نے آپ کو کوئیں سے نکالا تھا وہ بنو اسماعیل ہی کا قافلہ تھا۔ حضرت موسٰیؑ کے عہد میں بنو اسماعیل حجاز سے شام تک پھیل چکے تھے۔ اور ان کا شمار دنیا کی نہایت دولتمند قوموں میں ہوتا تھا۔ ان کے مختلف قبائل (بالخصوص بنو قیدار جو قریش کے مورث اعلیٰ تھے) کی عظمت و ثروت اور شان و شکوہ کی داستانیں عہد عتیق کی کتب مقدسہ اور تاریخ و سیر کے صفحات پر نمایاں طور پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ تو تھی ان کی قوت و ثروت کی کیفیت لیکن، جہاں تک آسمانی ہدایت کا تعلق ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے بعد ان کی طرف کوئی اور رسول مبعوث نہیں ہوا۔ اب اندازہ لگائیے ایک ایسے ملک کا جس میں مختلف اقوام و ملل کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو اور اس کی اپنی مرکزی تعلیم کوئی موجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ملک رفتہ رفتہ مختلف مذہبی تصورات کا مجموعہ بن کر رہ جائے گا۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں یہی کیفیت اس خطۂ ارض کی ہو چکی تھی۔ حضرت اسماعیلؑ کے بعد ان کی اولاد کچھ عرصہ تک ملت ابراہیمی (اسلام) پر قائم رہی

---

[1] اس وقت ہمارے پیش نظر پورے عرب کی مذہبی تاریخ کا استقصاء نہیں، بلکہ صرف اس خطۂ ارض کی اجمالی کیفیت بیان کرنا مقصود ہے، جہاں حضرت اسمٰعیلؑ آکر بسے اور جہاں سے پھر اس آفتاب ہدایت و سعادت کا طلوع ہوا جس نے دنیا کی ہر ظلمت کو مبدل بہ نور کر دیا۔

اس کے بعد، جیسا کہ ہم شروع سے دیکھتے چلے آرہے ہیں، ہدایت آسمانی کے بے درد صاف آبگینہ میں ذہن انسانی کی آمیزش شروع ہوئی اور کچھ عرصہ بعد وہ اس قدر مکدر ہو گیا کہ اس کی اصلیت کا نشان تک بھی باقی نہ رہا۔ خانہ کعبہ جسے خدائے واحد کی عبودیت کا مرکز قرار دیا گیا تھا، ان کے نزدیک مقدس تھا۔ جب انسان کی نگاہوں سے حقیقت اوجھل ہو جائے تو مجاز کی پرستش شروع ہو جاتی ہے۔ خانہ کعبہ کا حقیقی مفہوم مستور ہوا تو اس کی چار دیواری کی پوجا شروع ہو گئی جب وہ مکہ میں ہوتے تو ان دیواروں کی پرستش کرتے اور جب وہاں سے کسی اور طرف جانا ہوتا تو اس کا ایک پتھر سا تھ رکھ لیتے۔ رفتہ رفتہ کعبہ کا امتیاز بھی اٹھ گیا اور جو اچھا سا پتھر سامنے آیا اسی کو معبود بنا لیا

بت پرستی

اس طرح اصنام شکن (حضرت) ابراہیمؑ کی اولاد (اور امت) نے پھر سے شیوۂ آذری اختیار کر لیا۔ اہل بابل اور قوم سبا میں اجرام سماوی کی پرستش ہوتی تھی۔ ان کے میل جول سے ان میں بھی ستارہ پرستی آگئی۔ یہودیت بہت پرانا مذہب تھا۔ اس کے اثرات لازمی تھے۔ عیسائیت آخری مذہب تھا۔ اس نے بھی اس سرزمین کو متاثر کیا۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یکسر دہریہ اور ملحد تھے۔ غرضیکہ یہ خطۂ ارض مذہب اور لامذہبیت کے متنوع تخیلات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ خاص خانہ کعبہ میں عدنانی قبیلہ کا سب سے بڑا بت ہبل نصب تھا۔ طائف میں لات کا عظیم الشان ہیکل تھا۔ دوسری طرف مکہ سے تھوڑی دور عزیٰ دیوی کا معبد تھا۔ یہ تو بڑے بڑے بت تھے۔ چھوٹے چھوٹے بت ہر قبیلہ کے الگ الگ موجود تھے صابئیت کے اثر سے قبیلہ قیس، ستارۂ شعریٰ کا پرستار تھا قبیلہ کنانہ چاند کی پرستش کرتا تھا۔ اسد کا قبیلہ عطارد کو پوجتا تھا۔ ان کے علاوہ ارواح خبیثہ، بھوت، پریت پر بھی ان کا اعتقاد تھا جنہیں یہ خدا کا مقرب سمجھ کر پوجتے تھے۔ جنوں اور فرشتوں کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ ایران کی مجوسیت کا اثر گو زیادہ گہرا نہیں تھا، لیکن بایں ہمہ اس کی جھلک بھی کہیں کہیں اجاطم پرستی اور ثنویت کے رنگ میں نظر آتی تھی۔ اس اجمالی کیفیت سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہو گی کہ چھٹی صدی عیسوی میں خود اہل عرب میں مذہب کی کیا حالت تھی۔ اور اس سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجائیگی کہ قرآن کریم نے شرک کے مختلف اور متعدد گوشوں کی جابجا تردید کیوں کی ہے۔

مشرکین۔ یہود۔ نصاریٰ۔ مجوس اور صابئین کے علاوہ اس زمانہ کے عرب میں ایک اور مذہب بھی تاریخ کے طالب علم کو اپنے آپ سے روشناس کراتا ہے جسے حقیقت کہا جاتا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک حنیف حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا۔ لیکن دین حنیفی میں سے ان کے پاس سوائے ختنہ اور حج کی رسوم کے اور کچھ باقی نہ تھا۔ چنانچہ اصطلاحی طور پر حنیف اسے کہتے تھے جو مختون ہو اور اس نے حج بھی کیا ہو۔ لیکن جن حنفاء کا ذکر ہمارے پیش نظر ہے ان میں ان اصطلاحی علامات کے علاوہ کچھ معنوی خصوصیات بھی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی سعید فطرت کی بنا پر ان تمام غلط عقائد اور باطل مسالک سے متنفر تھے جو ان کے گرد و پیش پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں

علوم نہیں تھا کہ صحیح عقائد کیا ہیں اور مسلک حقہ کہاں سے ملیگا۔ یوں سمجھئے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے ماحول سے غیر مطمئن تھے لیکن اس کا علم نہیں تھا کہ اطمینان بخش ماحول کیسے پیدا ہو سکے گا۔ انہیں حق کی تلاش تھی لیکن حق کا سراغ کہیں نہیں پاتے تھے۔ وہ اپنی تشنہ فطرت کی سیرابی کے لئے دشت و صحرا میں مارے مارے پھرتے تھے لیکن انہیں زندگی کے چشمۂ شیریں کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا سلبی تھا۔ ایجابی کچھ نہیں تھا۔ وہ لا آلٰہ کی وادی میں سرگرداں پھر رہے تھے لیکن الا اللہ کی مثبت دنیا انہیں کہیں نہیں ملتی تھی (Hitti) کے الفاظ میں:-

> عرب جاہلیت کا مذہب (مسلک اس نقطہ پر پہنچ چکا تھا، جہاں وہ لوگوں کے روحانی تقاضوں کی تسکین نہیں کر سکتا تھا اس کی وجہ سے وہاں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو اس مسلک سے غیر مطمئن تھے انہوں نے مسلک توحید کے دھندلے سے تصور پیدا کر لئے ان کا نام حنیف تھا۔
>
> History of Arabs P. 108

ان میں کچھ ایسے تھے جو حق کی تلاش میں مضطرب و بیتاب مر گئے (مثلاً زید بن عمرو بن نفیل۔ یا امیہ بن صلت) یا عیسائی ہو گئے (مثلاً قس بن ساعدہ اور ورقہ بن نوفل)

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اور کچھ ایسے خوش بخت اور طالع مند بھی تھے جن کی زندگی میں آفتاب رسالت طلوع ہوا اور ان کی متجسس اور حیران نگاہوں نے اس حقیقت منتظر کو بے نقاب دیکھ لیا جس کی تلاش میں انہوں نے اپنی عمر صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں میں گذار دی تھی (مثلاً عثمان بن حویرث اور قیس بن نشبہ) ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

لیکن یہ تلاش حقیقت کی محض انفرادی تڑپ تھی۔ نہ کوئی خاص مذہب۔ مذہبی حیثیت سے سب سے زیادہ وسعت شرک ہی کو حاصل تھی یا اس سے نیچے اتر کر پھر یہودیت، عیسائیت، مجوسیت[1] کی وہ مسخ شدہ صورتیں جن کا ذکر ہم گذشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔ یا بابل کی صابئیت[2] جو ستارہ پرستی کی شکل میں دنیا کے سامنے تھی۔

جب مذہب کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ حیات اخروی کا بھی ان کے ہاں کوئی متعین تصور نہ تھا۔ حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سرے سے اس کے قائل ہی نہ تھے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (۶/۲۹، نیز ۲۳/۳۷)

اور یہ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم (مرنے کے بعد) اٹھائے نہیں جائیں گے۔

---

[1] مجوس کا لفظ قرآن کریم میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے (۲۲/۱۷) اگرچہ سورۂ نحل میں ان کے عقیدۂ ثنویت کا بھی ابطال ہے (۱۶/۵۱)

[2] صابئین کا ذکر سورۂ بقرہ (۲/۶۲) سورۂ مائدہ (۵/۶۹) اور سورۂ حج (۲۲/۱۷) میں آیا ہے۔

سورۂ رعد میں ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۱۳ پز ۵)

اور اگر ان کا کوئی قول تیرے لئے وجہ تعجب ہے تو یہ کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو پھر بھی ایک نئی پیدائش میں آئیں گے؟

دورِ حاضرہ کے مادہ پرستوں کی طرح وہ بھی کہتے تھے کہ طبعی قوانین کے ماتحت عناصر میں ترتیب پیدا ہو کر زندگی متشکل ہو گئی ہے اور اس کے بعد وقت کے مرور سے یہ اجزا بوسیدہ ہو کر منتشر ہو جائیں گے (دیکھئے ۴۵/۲۴) جب نبی اکرمؐ نے انہیں حیاتِ اخروی پر ایمان کی دعوت دی تو انہوں نے حیرت اور استہزاء کے ملے جلے جذبات سے اس کا استقبال کیا۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے:۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرٰبًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ (۵۰/۳)

کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ زندگی ملے گی؟ یہ تو دور از قیاس سی بات ہے۔

(Hitti) اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

حیاتِ اخروی کے متعلق عربوں کے قدیم مستند لٹریچر میں کسی جگہ بھی کوئی چیز بصراحت نہیں ملتی۔ (صفحہ ۱۰۱)

یہ تھی ان کی مذہبی حالت۔ اب ان کی اخلاقی دنیا کی طرف آیئے جس قوم میں خدا اور آخرت کے متعلق

دنیائے اخلاق

صحیح تصور (ایمان) موجود نہ ہو ان کی اخلاقی حالت کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی تو وہ بنیادیں ہیں جن پر صحیح اخلاقیات کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی قوم باہمی تناصر و تعاون کے تقاضوں سے حسنِ معاملہ اور خوش آئند اخلاق پر زور بھی دیتی ہے تو یہ چیز محض مصلحت کوشی اور حکمتِ عملی (Expediency) کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے جس کا تعلق ظاہری حدود و قیود تک محصور ہوتا ہے۔ قلبِ انسانی جو تمام اعمال و کردارِ حیات کا سرچشمہ ہے، اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس لئے اس قسم کے نظام اخلاقیات کی عمارت ریت کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ پھر جس قوم میں ساتھ جہالت بھی موجود ہو ان کے ذمائمِ اخلاق کی کیفیت اور نوعیت کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔ جہالت کا تو یہ عالم تھا کہ تاریخ نے اس عہد کا نام ہی عہدِ جاہلیت رکھا ہے۔ اس لئے تمدن و تہذیب کی بلند سطح تو ایک طرف روزمرہ کے حوائجِ زندگی میں بھی وحشت و بربریت چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ مثلاً کھانے پکانے میں حلال و حرام تو ایک طرف نفیس و خبیث کی بھی تمیز نہ تھی۔ حشرات الارض ان کی عام غذا تھی۔ چھپکلیوں تک کو کھا جاتے تھے۔ خون کو جما لیتے اور مزہ لے کر کھاتے۔ مردہ جانوروں کو کھا جاتے حتیٰ کہ چمڑہ تک کو بھون کر کھا لیتے۔ درندگی کا یہ عالم کہ زندہ اونٹ کا کوہان اور دنبے کی دم کی چکی کاٹ کر کھا جاتے۔

عائلی زندگی میں عجیب عجیب قسم کی رسوماتِ قبیحہ ان کے ہاں رائج تھیں۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کی تمام بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹے کی وراثت میں آجاتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔ بیویوں کی تعداد کی کوئی حد ہی

نہ تھی۔ عورت بیوہ ہو جاتی تو سال بھر تک اسے تنگ و تاریک کوٹھری میں رہنا پڑتا۔ اس کے بعد کوئی جانور (گدھا وغیرہ) لاتے جس سے مس کرنے کے بعد وہ کوٹھڑی سے باہر نکلتی۔ عارضی نکاح (متعہ) کا عام رواج تھا۔ اس کے علاوہ بدکاری کی اور بھی عجیب عجیب قسمیں تھیں۔ مثلاً شجاعت اور بہادری میں کسی کی شہرت سنتے تو اپنی بیوی اس کے پاس بھیج دیتے تاکہ اس سے شجاع اور بہادر بچہ پیدا ہو۔ زنا کی اولاد کے متعلق عورت جس کی طرف انگلی اٹھا دیتی وہی اس کا باپ قرار پا جاتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ فسق و فجور کی ان فواحشات پر فخر کرتے اور اس کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ امراء القیس کے قصیدہ لامیہ کو اٹھا کر دیکھئے۔ خود اپنی عزیز عورتوں کے ساتھ جو جو بے حیائیاں اس نے کی ہیں کس کس انداز سے ان کا ذکر کرتا ہے اور یہ ان قصائد میں سے ہے جن کے اشعار عرب کے بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔ شرم و حیا کا یہ عالم کہ حج کعبہ میں ہزاروں لوگ جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا سب (مرد و عورت) مادر زاد ننگے ہو کر طواف کعبہ کرتے۔ جب حج کے وقت برہنگی کا یہ عالم تھا تو غسل یا جائے ضرور میں پردہ کی کیا ضرورت تھی! چنانچہ کھلے میدان میں کھلے بندوں نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہوتے۔

شراب، پانی کی طرح بے تکلفی سے پی جاتی تھی۔ گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، اور عورتیں اور بچے ساقی گری کرتے۔ اس کے بعد نشے کے عالم میں جو بدمستیاں ہوتیں ظاہر ہیں۔ شراب سے تو ایام جاہلیت کے عربوں کو عشق سا نظر آتا ہے۔ ان کے شعر کیا ہیں؟ تاکستان کی لچکتی جھومتی شاخیں ہیں کہ ہوا بھی ان کو چھو جائے تو لڑکھڑاتی پھرے۔ لٹریچر میں اس کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ عربی زبان میں شراب کے قریب ڈھائی سو نام ہیں۔ "فردوس بیک خوشۂ انگور فروشم" کی آپ کے نزدیک، ایک مخمور کی ترنگ سے زیادہ حیثیت نہیں۔ لیکن تاریخ نے یہ کیف انگیز واقعہ بھی اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے کہ خانۂ کعبہ کے متولی، ابن غبشان خزاعی نے، خود کعبہ کی تولیت کو قریش کے جد امجد قصیٰ ابن کلاب کے ہاتھوں ایک مشکیزۂ شراب کے عوض بیچ دیا تھا۔

شراب نوشی کے ساتھ قمار بازی کچھ لازم و ملزوم سی نظر آتی ہے۔ عصر حاضر کی غازہ بہ رخسار شام ہو یا ازمنۂ قدیمہ کی کاکل بدوش رات، ہر محفل میں یہ توام بہنیں بکجا رہزن ایمان و ہوش دکھائی دیتی ہیں۔ عربوں کی متاع اذخوش کے گلے تھے۔ وہ فخر سے کہتے کہ ونشرب فی اثمانہا دنقامر (ہم ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں)، جوئے کے بھی عجیب عجیب طریق تھے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مروّج و مشہور تیروں کے ذریعہ قرعہ اندازی کا طریقہ تھا۔ قمار بازی کا شمار بھی ان کے ہاں قومی مفاخر میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان مجالس میں شریک نہ ہونا قومی عار خیال کیا جاتا تھا۔ جو ان مجالس میں شرکت نہ کرتا اسے برم کا خطاب دے دیتے اور جنہیں قوم کی طرف سے یہ خطاب مل جاتا ان سے شادی بیاہ کرنا باعث ننگ و عار خیال کیا جاتا۔ قمار بازی اس طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی کہ وہ اہم معاملات زندگی کا فیصلہ اسی سے کرتے۔ چنانچہ جب وہ کسی بڑے کام یا سفر کا ارادہ کرتے تو بتوں کے

مجاوروں کے پاس فال لینے کیلئے جاتے وہ بے پیکان کے تیروں سے جنہیں ازلام کہتے تھے، فال لیتے اور اسکے مطابق فیصلہ ہو جاتا یہ رسومات اس قدر تقدس حاصل کر چکی تھیں کہ خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے جو بت رکھے تھے ان کے ہاتھوں ہی میں فال کے تیر دے رکھے تھے۔ یہی وہ ازلام ہیں جنہیں قرآن نے شیطانی فعل قرار دیا ہے (لیکن جنہیں مسلمانوں نے پھر اپنے حریم قلب میں سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے اور اپنی مہمات امور کے فیصلے پھر اسی قسم کی فالوں سے لیتے پھرتے ہیں)۔

یہ تو تھی ان کی معاشرتی زندگی۔ معاشی زندگی میں سود خواری جیسی لعنت عام تھی اور اسکی وسعتیں اس حد تک ہمہ گیر ہو چکی تھیں کہ عورتوں اور بچوں تک کو رہن رکھوا لیا جاتا تھا اگر رہن معینہ میعاد کے اندر اندر ہشیار مرہونہ واگزار نہ کرا لیتا تو مرتہن ان کا مالک ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ ظاہر ہے مزدوروں اور کاشتکاروں کا طبقہ سود خواروں کے پنجہ آہنی میں سب سے محکم طور پر گرفتار تھا اور سرمایہ دار طبقہ جن میں اکثر یہود تھے، انسانیت سوز طریقوں سے ان کا خون چوس لیتے تھے معاشی نظام کی اس بنیادی خرابی کا لازمی نتیجہ تھا کہ سرکش طبائع لوٹ مار پر اتر آتیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ملک میں یہ کیفیت پیدا ہو چکی تھی کہ بعض قبائل میں ایسے منظم گروہ موجود تھے جن کا ذریعہ معاش ہی رہزنی اور غارتگری تھا۔ ان پیشہ ور ڈاکوؤں کے علاوہ عام طور پر ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال اور مویشی پر ڈاکہ زنی کیلئے ہر وقت تیار رہتا، حتیٰ کہ ان کی عورتوں اور بچوں تک کو لوٹ کر دوسری جگہ فروخت کر دیا جاتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ ان حرکاتِ مذمومہ کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان "کارناموں" کا تذکرہ بڑے فخر و ناز سے کیا جاتا تھا جو جرأت و بیباکی میں دوسروں سے پیچھے ہوتے وہ علانیہ ڈاکہ کی جگہ خفیہ چوری پر اتر آتے۔ اور تو اور خود کعبہ کے خزانے میں چوری کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ مردوں سے آگے بڑھ کر یہ زہر عورتوں تک میں بھی سرایت کر چکا تھا۔ اسی لئے نبی اکرمؐ عورتوں سے بیعت لیتے تو اس میں ان حرکات سے مجتنب رہنے کا بھی اقرار لیا جاتا۔ (۶۰/۱۲) اس آیت میں چوری کے علاوہ قتل اولاد سے اجتناب کا بھی ذکر ہے آج تو ہم اسکا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن جاہلیت عرب میں یہ سفاکانہ اور سنگدلانہ رسم بھی موجود تھی۔ غرباء کے طبقہ میں اسکا جذبۂ محرکہ افلاس کا خیال تھا۔ قرآن کریم میں ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ..... (۱۷/۳۱ نیز ۶/۱۵۱)

اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف کی وجہ سے قتل مت کرو۔

لیکن شرفا اور امراء کے طبقہ میں جھوٹی عزت کا زعم باطل انہیں اس لرزہ انگیز شقاوت پر آمادہ کر دیتا تھا۔ وہ لڑکیوں کو موجب شرم و عار سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب کسی کو لڑکی کی پیدایش کی اطلاع ملتی تو غم و غصہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا۔ سورۂ نحل میں ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۔ (۱۶/۵۸ نیز ۴۳/۱۷)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو غصہ کے مارے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اس عار سے بچنے کی شکل یہ پیدا کی کہ لڑکیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہ انہیں پہلے مار ڈالیں اور پھر دفن کریں۔ بلکہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، ابا ابا پکارتی بچی کو اپنے ہاتھوں گڑھے میں دھکیل کر مٹی میں دبا دیتے۔ قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب ایمان لائے ہیں

تو انہوں نے خود اقرار کیا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے آٹھ زندہ لڑکیاں دفن کی ہیں۔ پھر تماشا یہ کہ اس قساوت و شقاوت میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ برابر کی شریک تھیں۔ مائیں خود اپنی بچیوں کو بنا سنوار کر زندہ گاڑنے کیلئے انکے باپوں کے حوالہ کرتیں۔ اسی لئے سورہ ممتحنہ میں عورتوں سے بھی اس امر کا اقرار لیا گیا ہے کہ وہ قتل اولاد سے مجتنب رہیں گی۔ حالانکہ ماں کی ممتا ایک مسلمہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن جب انسان کی فطرت مسخ ہو جائے تو کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ یہ کہاں پہنچ کر رُکے گا! چونکہ اس شقاوت کی بنیاد یکسر غلط جذبات پر تھی اسلئے قرآن کریم نے جب اسکی طرف توجہ دلائی ہے تو ایک ایسے دل کش اور موثر انداز میں جذبات کو اپیل کیا ہے کہ اگر سینہ میں فطرت صحیحہ کی کوئی رمق بھی موجود ہے تو وہ پھریری لیکر اٹھ بیٹھے۔ فرمایا کہ

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (۸۱/۸)

اور جب زندہ دفن کی ہوئی بچی (کے بارے میں) پوچھا جائے گا کہ (بالاخر) کس گناہ (کی پاداش) میں اُسے قتل کیا گیا تھا!

غور فرمائیے! فطری جذبات کی پوری دنیا کس طرح سمٹ کر اس ایک ٹکڑے میں آگئی ہے۔

تاریخ کی ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ جس عہد کا ذکر ہمارے پیش نظر ہے اسے عہد جاہلیت کہنا کسقدر صحیح تھا! یہ ایک لفظ (جاہلیت) ان کی سوسائٹی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھدیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب علم کی روشنی مفقود ہو تو فکر انسانی کی نہاں خانے کے ہر گوشے پر تاریکی چھا جاتی ہے اسی تاریکی سے اعتقادات میں توہم پرستی اور اعمال میں غیر صالحیت پیدا ہوتی ہے۔ سب سے بڑی توہم پرستی خود بت پرستی ہے لیکن اس کے متعلقات بھی اس اصل سے کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے۔ اس باب میں عرب جاہلیت میں عجیب عجیب رسومات رائج تھیں مثلاً

بحیرہ۔ اونٹنی کے کان چیر کر اس کو کسی بت کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ پھر نہ اس پر سواری ہوتی تھی نہ اس کی اون تراشی جاتی تھی۔ سوائے فقیروں کے کوئی اس کا دودھ نہیں پیتا تھا۔

سائبہ۔ نذر مانتے تھے کہ بیماری سے شفا یا مصیبت سے نجات مل جائیگی تو بت کے نام پر اونٹ چھوڑیں گے اس اونٹ کو سائبہ کہتے تھے۔ یہ ہندوستانی سانڈوں کی طرح جہاں چاہتا تھا چرتا تھا۔ اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

وصیلہ۔ جو بکری سات بار دو دو مادہ بچے جنتی اور آٹھویں بار صرف ایک نر۔ تو اسے بُت کے نام پر ذبح کر دیتے تھے۔

حام۔ وہ اونٹ جس کی چوتھی نسل پیدا ہو جائے بت کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا۔ اور اس سے پھر کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے توہم پرستی کی ان تمام شکلوں کو شرک قرار دے کر ممنوع ٹھہرا دیا۔ اوہام پرستی کا یہ عالم تھا کہ سفر میں جاتے تو کسی درخت وغیرہ میں تاگہ باندھ کر گرہ لگا دیتے۔ واپس آکر دیکھتے، اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ انکی بیوی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہے۔ قحط پڑتا تو بھیڑ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے بارش

ہو جائے گی۔ سفر میں رستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے رستہ مل جائے گا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرندہ کی شکل میں اڑتی رہتی ہے۔ ارواح خبیثہ، بھوت، پریت، غول بیابانی سب کو مانتے تھے۔ جنات کے متعلق ان کے ہاں عجیب و غریب قسم کے افسانے مشہور تھے۔ (ایسے ہی جیسے ہمارے ہاں جہلاء کے طبقہ میں آج تک مشہور چلے آتے ہیں) آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے والے جنات (جنہیں عامر کہتے تھے) بچوں کو اٹھا کر لے جانے والے جنات (جنہیں روح کہا جاتا تھا) بڑے بڑے سرکش جنات (جو عفریت کہلاتے تھے) صحراؤں اور جنگلوں میں گانے بجانے والے جنات۔ بدوؤں کے ساتھ راتوں کو آگ تاپنے والے جنات۔ بڑے بڑے جنات کے ساتھ زور آزمائیوں کے قصے اور اسی قسم کی دیگر خرافات۔ کہانت کا بازار بھی ان ہی جنات کی بدولت گرم تھا۔ عرب میں ہر مقام پر کاہن موجود تھے جو لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ایک جن رہتا ہے جو ان پر امور غیبی کا القا کرتا ہے۔ (ان ہی جنات کو شیاطین بھی کہا جاتا تھا) یہ کاہن بتکدوں کے پجاری ہوتے تھے، اس لئے کہانت کو مذہبی تقدس بھی حاصل تھا۔ اور جیسا کہ اس قسم کے معاملات میں ہوتا ہے، ان لوگوں کو اپنی مکاریوں کی کامیابی کے لئے عجیب عجیب قسم کے فریب کاری کے جال بچھانے پڑتے تھے۔ کاہنوں کی طرح شاعروں کے متعلق بھی ان کا عقیدہ تھا کہ یہی جنات یا شیاطین ان پر شاعرانہ خیالات کا القا کرتے ہیں۔ شعراء خود اس کا اعتراف کرتے اور اپنے شیاطین جنات کا تذکرہ بڑے فخر و ناز سے کرتے۔

یہ تھی ان کی ذہنی حالت!

خانہ جنگی

لیکن ان تمام خرابیوں سے بڑھ کر ان کے ہاں خانہ جنگی کی خرابی تھی۔ ان میں کوئی اجتماعی نظام تھا۔ نہ ہی کوئی مرکزیت۔ قبائلی زندگی، جس میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ اور ایک شعب دوسرے شعب کے خون کا پیاسا، انتقام کا جذبہ نسلاً بعد نسل وراثتاً منتقل ہوتا چلا جاتا۔ اس لئے ان لڑائیوں کا سلسلہ بھی سالہا سال تک متواتر قائم رہتا۔ گھوڑ دوڑ میں ایک فریق نے کسی قاعدہ کی خلاف ورزی کی تو فریقین کی تلواریں نیام سے باہر آگئیں اور یہ سلسلہ پیکار چالیس سال تک قائم رہا۔ ایک ذنبشنی کا کھتن دوسرے قبیلہ والوں کے تیر سے زخمی ہو گیا اور برسوں تک جنگ کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ عکاظ کے میلے میں کہیں باہمی مناقشہ ہوا اور خون کی ندیاں بہ گئیں۔ جنگ۔ ویسے ہی جنگ ہوتی ہے لیکن جب وہ ایسے فریقین میں برپا ہو جن کی وحشت اور جہالت، سبعیت اور بربریت کا وہ عالم ہو جسے ہم گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ تو ان لڑائیوں میں جس قسم کی سفاکی اور بیرحمی سے کام لیا جاتا ہوگا ان کے تصور سے روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ عربوں میں حضریت (شہری زندگی

اور بدویت (صحرا نشینوں کی زندگی) دو الگ الگ مستقل حیثیتیں رکھتی تھیں[1]۔ ان کی معاشرت اور معیشت کے طریق جداگانہ تھے۔ خانہ بدوش بادیہ نشین قبائل، شہر والوں کی نگاہوں سے دور، صحراؤں اور بیابانوں میں چلتے پھرتے رہتے تھے۔ کبھی اس نخلستان کے قریب، کبھی اس وادی سے پار، کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ اپنی ان ضروریات کے لئے جو صحرا میں میسر نہ آتیں وہ شہر والوں کے دست نگر ہوتے۔ شہر والے ان کی مصنوعات اور صحرائی پیداوار کی اشیاء کے ضرورتمند ہوتے۔ اس طرح ان لوگوں کا کبھی کبھی قریوں اور بستیوں کی طرف آنا ہوتا۔ یہ تو باہمی تمتع کی امن پسندانہ روش تھی۔ لیکن جب ان کی ضرورت سخت اور اشیائے مبادلہ کی قلت ہوتی تو وہ لوٹ کھسوٹ سے بھی باز نہ رہتے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ شہریوں سے زیادہ تند خو اور درشت مزاج ہوتے۔ یہی وہ اعراب ہیں جنہیں قرآن کریم نے "کفر و نفاق میں سخت اور حدود اللہ سے یکسر ناآشنا کہا ہے (دیکھئے $\frac{9}{97}$)[2] عرب میں شہر تو چند ایک تھے۔ آبادی کا زیادہ حصہ انہی شعلہ مزاج۔ درشت خو۔ تند و تیز۔ تہذیب و تمدن کی حدود سے ناآشنا۔ آئین و دساتیر کی قیود سے ناواقف، جاہل اور وحشی قبائل پر مشتمل تھا۔ اب ذرا تصور میں لائیے ایک ایسے ملک کو جس میں کسی منظم حکومت کا نام تک نہ ہو اور آبادی کا بیشتر حصہ اس قسم کے بادیہ نشین قبائل پر مشتمل ہو۔ اس ملک میں امن و عافیت کی جو کیفیت ہوگی اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ شہریوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر تجارت تھا۔ لیکن جب ملک اس قسم کی سرزمین بے آئین ہو تو تجارت کے قافلوں کی حفاظت و صیانت کی ضمانت کیا ہو سکتی ہے؟ عام قافلے تو ایک طرف، ارباب قوت و سطوت کا سامان تجارت بھی ان کی غارتگری سے محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ حیرہ کے بادشاہ شمالی عربستان میں کافی اقتدار کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ بایں ہمہ ان کے کاروان تجارت بھی عکاظ کے بازاروں میں امن و سلامتی سے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اشہر حرم[3] کا عرصہ البتہ ایسا تھا جس میں جنگ و غارتگری کا سلسلہ ملتوی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جن قبائل کا ذریعہ معاش ہی لوٹ اور غارتگری ہو، وہ مسلسل تین ماہ تک بھلا کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے اس لئے وہ کبھی ان مہینوں میں ردوبدل کر دیتے[4] اور کبھی ان کی حرمت کو بالائے طاق رکھ کر عین موسم حج میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دیتے۔ حتیٰ کہ نواح کعبہ تک کو بھی اپنی شورشوں کی جولانگاہ کی حد سے باہر نہ سمجھتے (دیکھئے $\frac{29}{67}$)

---

[1] یہی وہ قرآنی جن و انس ہیں جن کا ذکر معارف القرآن جلد دوم میں جن کے عنوان کے تحت آچکا ہے۔

[2] اعراب کے متعلق مزید اشارات کے لئے دیکھئے $\frac{9}{120\text{،}101\text{-}98}$ ؛ $\frac{48}{16\text{،}11}$: $\frac{49}{14}$

[3] رجب۔ ذیقعدہ۔ ذی الحجہ اور محرم

[4] اسی کو نسی کہتے تھے جسے قرآن کریم نے (کہ وہ دنیا میں امن و سلامتی کا پیغام اور ایفائے عہد کی ضمانت ہے) "زیادۃ فی الکفر" ($\frac{9}{37}$) کہا ہے۔

اسی لئے عملاً ملک سال بھر شورش و اضطراب اور بد امنی اور غارتگری کی آماجگاہ بنا رہتا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرمؐ نے یہ بشارت دی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ ایک خاتون محمل نشین صنعاء سے مکہ تک کا سفر تنہا کرے گی اور خدا کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا[1] تو لوگوں کو اس پر تعجب آتا تھا اور وہ کہنے والے کو معاذ اللہ مجنون یا شاعر کہتے تھے کہ ان کے نزدیک اس قسم کے انقلاب کا تصور کرنے والا یا تو پاگل ہو سکتا تھا یا محض شاعر! ان کا ذہن اس قسم کی تبدیلی کو ممکن ہی نہیں خیال کر سکتا تھا! یہ تھی اس ملک میں امن و انتظام کی حالت[2]!

گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر ایک نگہ باز گشت ڈالئے اور دیکھئے کہ سرزمین عرب میں افکار، کردار کا کونسا زاویہ، اور عقائد و اعمال کا کونسا گوشہ ایسا تھا جس میں چھٹی صدی عیسوی میں فساد رونما ہو چکا ہو! اس دنیا کی کوئی شے اپنی اصل و حقیقت پر قائم نہ تھی (اسی کو قرآن کی اصطلاح میں فساد کہا گیا ہے) جتنے مذاہب متعارف تھے، ان کی حقیقی صورتیں یکسر مسخ ہو چکی تھیں۔ انسان کی گردن، جسے فطری سرفرازی عطا کی گئی تھی۔ اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے مٹی اور پتھروں کے پیکروں یا ان کی کارگاہِ فکر میں ڈھلے ہوئے خیالی معبودوں کے حضور سجدہ ریز تھی۔ علم کی شمعیں خاموش اور وحشت و جہالت کی تاریکیاں بزمِ انسانیت پر مستولی تھیں۔ معاشرتی معاشی، عائلی، تمدنی، غرضیکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کوئی بساط ایسی نہ تھی جس میں غیر فطری سلوٹوں سے تفاوت و فطور نہ آ چکا ہو۔ قتل۔ غارتگری۔ خون ریزی۔ رہزنی۔ سفاکی۔ بے رحمی، ان کی قساوتِ قلبی کے مظاہر اور شراب خوری قمار بازی، فحش کاری، عریاں نگاری، ان کی کثافتِ اخلاقی کے آئینہ دار تھے۔ اور ان معائب و ذمائم نے سوسائٹی میں ایسی ہمہ گیریت حاصل کر رکھی تھی کہ وہ لوگ ان پر نادم و شرمسار ہونے کے بجائے فاخر و نازاں تھے

---

[1] بخاری باب علامات النبوۃ

[2] اس تمام بد امنی اور شورش میں البتہ قریش کے قافلے غارتگری سے محفوظ رہتے اس لئے کہ قریش کعبہ کے متولی لہذا جیران اللہ (خدا کے پڑوسی) سمجھے جاتے تھے۔ اہل عرب کے دلوں میں کعبہ کی عظمت ابھی تک قائم تھی۔ اس لئے وہ جیران اللہ پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا جرم سمجھتے تھے اور اس کے ارتکاب کی کبھی جرأت نہیں کرتے تھے۔ رب کعبہ کا یہی وہ احسان ہے جس کی یاد قرآن کریم نے ان الفاظ میں دلائی کہ۔

لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ۝ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ۝ (۱۰۶/۱-۴)

قریش کو جاڑے اور گرمی کے سفر میں اپنے تجارتی عہد و پیمان کے لئے چاہیے کہ اس خانہ کعبہ کے رب کی محکومیت اختیار کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانا دیا اور خوف سے بچا کر امن و امان بخشا۔

جس معاشرۃ میں عیب عیب نہ رہے بلکہ ہنر بن جائے اس کی اساسی اور بنیادی خرابیاں کسی تصریح کی محتاج نہیں ہوتیں۔

یہ تھی چھٹی صدی عیسوی میں "دنیائے مذاہب" اور جہان تہذیب و تمدن کی حالت!

ہنرش نیز بگو!

(۴)

یہ حقیقت بار بار ہمارے سامنے آچکی ہے کہ رسول کی بعثت ایک ہنگامی واقعہ نہیں ہوتا کہ یونہی اتفاقی طور پر ظہور میں آجائے بلکہ یہ ایک اہم کڑی ہوتی ہے اس عظیم الشان سلسلہ کی جس کی رو سے یہ نظام کائنات ایک بلند و بالا غایت کی طرف بایں نظم و ضبط اور بایں حسن و خوبی رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی واقعہ ایک ایسے مبنی علی الحکمت پروگرام کے مطابق ظہور میں آئے گا تو اس کے متعلقات و تضمنات بھی اسی حکمت پر مبنی ہوں گے حضرات انبیاء سابقہ کے تذکار جلیلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتے، ان کے پیش نظر اسی قوم کی اصلاح و بہبود ہوتی۔ پھر ان کی تعلیم ایک خاص وقت تک نافذ العمل ہوتی۔ اس کے بعد وہ فراموش کردی جاتی یا منسوخ ہو جاتی۔ لہٰذا انبیائے سابقہ کی تعلیم کا دائرۂ اثر و نفوذ زمان اور مکان کی حدود میں گھرا ہوتا۔ لیکن اب ہمارے سامنے ایک ایسی تعلیم آتی ہے جس کی غایت تمام نوع انسانی کی ارتقاء و اصلاح ہے اور جس کا دامنۂ اثر و نفوذ ابدیت سے ہمکنار ہے۔ اس لئے یہ پیغام عارضی امیال و عواطف سے بے نیاز اور وقتی احوال و ظروف سے بلند و بالا ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ کسی انقلاب کی غایات، زمان و مکان کی حدود و ثغور سے بے نیاز ہی کیوں نہ ہوں، اس کی ابتداء ایک خاص زمانہ میں ایک خاص مقام سے ہوگی۔ اور اس کی اولیں مخاطب بھی ایک خاص قوم ہوگی۔ یہ قوم اس عالمگیر انقلاب کے لئے بطور خمیر تیار کی جائے گی کہ اس کے بعد جس آٹے میں جا کر ملے اس میں بھی ایسا ہی خمیر پیدا کرے۔ اس طرح اس انقلاب کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیں گی۔ یہ تو ہم "ظہر الفساد" کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت کس طرح حقیقت (Reality) دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور ہر جگہ فساد ہی فساد برپا ہو چکا تھا اس لئے اس آنے والے انقلاب کے لئے عالمگیر ہونا ضروری تھا

عرب کا انتخاب کیوں؟

یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس زمانہ میں خود عرب کی کیا حالت تھی۔ لیکن یہ سوال ابھی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ اس عالمگیر انقلاب کی تخم ریزی کے لئے عرب کی سرزمین کو کیوں منتخب کیا گیا! عربوں میں کونسی خصوصیات تھیں جن کی بناء پر انہیں اس قابل سمجھا گیا کہ وہ اس ابدیت بآغوش انقلاب کے لئے اولیں خمیر کا کام دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آنے والا انقلاب کوئی معمولی انقلاب نہ تھا۔ بلکہ یہ ساری دنیا کی طاغوتی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ تھا خواہ وہ مذہب کے نقاب میں قلوب و اذہان کو اپنی عقیدت مندیوں کے اغلال و سلاسل میں جکڑے ہوئے تھیں یا جہانداری و جہانبانی کے پردے میں اپنے جذبۂ تحکم و تغلب کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے لئے اجسام و ابدان کو استبداد

کے پنجۂ آہنی میں دبوچے ہوئے تھیں ہر خطۂ ارض اس قسم کے انقلاب کی تربیت گاہ نہیں بن سکتا۔ اس سدرۃ المنتہیٰ کی برومندی کے لئے خاص آب و گل کی ضرورت تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس اہم مقصد کے لئے نگاہِ انتخاب اسی سرزمین پر کیوں پڑی؟ اس سعادت کا اہل اسی قوم کو کیوں سمجھا گیا!

عربوں کی جہالت و وحشت اور سبعیت و بربریت کی تفاصیل ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ ان کے عیوب و نقائص ہم دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی دنیائے انسانیت کے عیوب و نقائص کو اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو غلامی اور محکومی سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو نشۂ قوت کی بدمستی اور جذبۂ تفوق کی بدلگامی کی تخلیق ہوتے ہیں۔ پہلی شق میں دنائت، کمینگی، بے حمیتی، بے غیرتی، دوں ہمتی، پست فطرتی، تنگ نظری، بدعہدی، غداری، دروغ بافی، بہانہ سازی، فریب دہی، مکاری، عیاری، منافقت، تلون مزاجی، بددیانتی، عدم اعتمادی، سہل انگاری، تن آسانی۔ غرضیکہ ضعف خودی اور عدم یقین کے انسانیت کش جراثیم ان کے رگ و پے میں سرایت کرجاتے ہیں۔ نہ ان کی بات کا اعتبار، نہ وعدے کا یقین، نہ ان کے کفر میں پختگی نہ ایمان میں استقلال۔ ادنیٰ سے لالچ پر بڑی سے بڑی متاعِ انسانیت کو بیچ ڈالنے پر آمادہ اور ذرا سا خوف زندگی کے ہر گوشے پر موت طاری کردینے کے لئے کافی یحسبون کل صیحۃ علیھم کہیں کسی پتے میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور وہ لگے کانپنے کہ موت آئی۔ نہ ان کی اطاعت میں کیفیت جاں نثاری نہ ان کی سرکشی میں رنگ خود اعتمادی۔ نہ ان کی اقامت میں شکوہ پرویزی نہ ان کے رکوع میں فطرت روح الامینی۔ کھڑے ہیں تو کٹھ پتلیوں کی طرح کسی دوسرے کی تار کے سہارے۔ اور جھکے ہیں تو جذبۂ تشکر و احسانمندی سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں۔ نہ اس میں صداقت نہ اس میں خلوص۔ یہ بھی خود فریبی وہ بھی خود فریبی۔ نہ اس دنیا میں وقار و تمکین۔ نہ اس دنیا میں عزت و تکریم خسر الدنیا والاخرۃ و ذالک الخسران المبین

دوسری طرف افراط میں جائیے تو نشۂ قوت و حکومت سے استبداد و تغلب، اور استبداد و تمرد کی شعلہ بداماں بدمستیاں پیدا ہوجاتی ہیں جس سے انسان انا الموجود لا غیری کے ابلیسانہ تصور میں اپنے سوا کسی اور کو جینے کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انہیں اگر زندہ رہنے دیا جاتا ہے تو اس لئے کہ ان کا خون انکی عطش حکمرانی اور جوع الارضی کی تسکین کا سامان فراہم کرے۔ اور اگر اس جذبۂ حکومت و استعماریت کے ساتھ دورِ حاضرہ کی مغربی سیاست کی ڈپلومیسی کا بھی امتزاج ہوجائے تو ــــ تو اس کا نتیجہ وہ جہنم ہوتا ہے جس میں انسانیت کا ہر شرف آج اس طرح جل کر خاکستر ہوچکا ہے کانہ لم یکن شیئاً مذکوراً۔

خطۂ حجاز کا عرب نہ کسی کا محکوم تھا اور نہ ہی اس میں ہوسِ ملک گیری پیدا ہوئی تھی۔ یہ خصوصیت ساری دنیا میں اسی سرزمین کو حاصل تھی کہ اس پر جب سے زندگی کی نمود ہوئی کسی غیر نے ان پر ... حکومت نہیں کی دغیرتو

خصوصیت کبریٰ

تو ایک طرف، خود اپنے ہاں بھی کوئی خاص منظم حکومت قائم نہیں ہوتی۔ یمن کی حمیری اور حبشی حکومت۔ ایران کی سلطنت اور رومۃ الکبریٰ کی قوتیں اس ملک پر مختلف اوقات میں حملہ آور ہوئیں لیکن ہمیشہ ناکام لوٹیں۔ جب اسکندریہ میں یونانیوں کی حکومت تھی تو انہوں نے چاہا کہ عرب کو اپنی سلطنت کا مرکزی مقام قرار دیں لیکن اس کا سلطنت یونان کا مرکزی مقام نبنا تو ایک طرف، مشہور جغرافیہ نویس (Strabo المتوفی ۲۴ء) کے بیان کے مطابق عربوں نے اپنا سفیر تک ان کے ہاں نہیں بھیجا (Hitti p. 46)
گبن اس کے متعلق لکھتا ہے

> عربوں کی آزادی یونان اور روم کی نفیس لیکن مصنوعی جمہوریتوں سے بالکل مختلف چیز تھی۔ اس آزادی میں ہر فرد اپنی قوم کے ملکی و سیاسی حقوق میں برابر کا حصہ دار تھا۔ ان کے ہاں قوم اس لئے آزاد تھی کہ فرزندانِ قوم کسی آقا کے سامنے ذلت آمیز اطاعت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے سینے، حوصلے، استقامت اور متانت کے جوہروں سے لبریز تھے۔

Decline and fall vol VI . p. 267

یہ تو تھی دنیائے سیاست میں ان کی آزادی کی حالت، مذہب کی دنیا میں بھی وہ اس سے کم آزاد نہ تھے یعنی وہاں کسی خاص مذہب کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ یہود و نصاریٰ کے کچھ قبائل ضرور موجود تھے لیکن وہ ان سے الگ تھلگ تھے۔ یہ کسی منظم مذہب کے پیرو نہ تھے اپنے ذوقِ بندگی کی تسکین کے لئے انہوں نے کچھ معبود وضع کر رکھے تھے جس طرح جی میں آتا ان کی پرستش کر چھوڑتے تھے۔ لیکن اس پرستش میں بھی وہ اپنے ان معبودوں کے تابع نہیں تھے بلکہ انہیں اپنی خواہشات براری کا ایک ذریعہ قرار دے رکھا تھا۔ جب تک وہ ان کی مرضی کے مطابق چلتا رہا معبود رہا جب اس کے خلاف گیا اٹھا کر دے مارا۔ بت ساز اور توہم پرست قوموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کی حریتِ فکر و آرار کی تمام قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کا خوف، ہر وقت ان کے قلب و دماغ پر مسلط رہتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت عربوں ہی کے حصہ میں آئی تھی کہ بت گری اور توہم پرستی بھی ان کی فطری آزادی پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس باب میں بڑے بڑے دلچسپ واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ امراء القیس کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لئے گھر سے نکلا تو پہلے اپنے بت کے مندر میں گیا تاکہ اپنے معبود سے اس باب میں استصواب کرے، اس استصواب کا طریقہ یہ تھا کہ تیر پھینک کر فال لیا کرتے تھے۔ چنانچہ پہلا تیر پھینکا تو جواب نفی میں نکلا۔ دوسرا پھینکا تو بھی نفی میں اور تیسرا تیر پھینکا تو بھی جواب نفی میں نکلا۔ اس نے ترکش کو اٹھا کر بت کے منہ پر مارا اور کہا کہ ملعون! تیرا باپ قتل کر دیا جاتا تو میں دیکھتا کہ تو کس طرح کہتا کہ انتقام نہیں لینا چاہیئے۔

لہ کتاب الاغانی صفحہ ۸

غور فرمائیے! کیا بندگی میں اس قسم کی آزادی کی مثال آپ کو کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟

پھر چونکہ وہ لوگ تعلیم سے بے بہرہ تھے اس لئے ان کا ذہن خارجی اثرات سے یکسر غیر متاثر تھا۔ نہ ہند و یونان کے فلسفہ نے ان کے دماغ کو خیالی گتھیوں کے سلجھانے میں الجھایا تھا نہ ایرانی بزم آرائیوں نے انہیں نکات آفرینیوں اور موشگافیوں کے فریب میں پھنسایا تھا۔

سیدھے سادے لوگ

وہ سیدھے سادے عملی انسان تھے۔ ان کی زندگی ہر قسم کے تکلفات سے بے نیاز اور تصنعات سے پاکیزہ تھی۔ راتوں کو سفر کرتے تو ستاروں کی مشعلوں سے نشان راہ متعین کر لیتے جو انہیں کبھی دھوکہ نہ دیتے، کہ فطرت کے قائم کردہ نشانات (آیات اللہ) کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا کرتے۔ سارے ملک میں گنتی کی چند بستیاں تھیں۔ باقی تمام لوگ صحراؤں میں زندگی بسر کرتے تھے جہاں "میری اور تیری" کے امتیازات ہی نہ تھے جو ان کی نگاہوں کو خیانتوں اور دلوں کو بددیانتیوں پر آمادہ کرتے۔ جہاں کوئی صاف اور شیریں چشمہ اور کھجوروں کا جھنڈ دکھائی دیا وہی کچھ دنوں کے لئے نشیمن بن گیا۔ جب اٹھ گئے تو کسی ٹوٹی ہوئی طناب اور بجھی ہوئی آگ کے علاوہ کوئی ترکہ ہی پیچھے نہ چھوڑا کہ جس کی کشش آگے جانے سے عناں گیر اور پیچھے لوٹنے کے لئے دامن کش ہو۔ فطرت کے اس سیدھے سادے ماحول نے انہیں اپنے رنگ میں ڈبو رکھا تھا۔ دامنِ صحرا پر ان کی نگاہ اٹھتی تو تا حدِ نظر کوئی رکاوٹ سامنے نظر نہ آتی۔ اس سے ان کی نگاہوں میں کشادگی اور سینے میں فراخی پیدا ہو جاتی۔ مائدۂ فطرت سے انہیں جو کچھ ملتا ہے مزد و معاوضہ ملتا اس لئے اسے کسی اور ضرورتمند کو دے دینے میں اجر اور معاوضہ کا سوال ہی ان کے ذہن میں پیدا نہ ہوتا اس لئے ان کے سینوں میں صحراؤں کی سی وسعت، ان کی نگاہوں میں چشموں کی سی پاکیزگی اور سیر چشمی، ان کے ارادوں میں رطب و نخیل کی سی بلندی، ان کے عزم میں کوہساروں کی سی پختگی اور ان کی پیشانیوں میں متبسم ستاروں کی سی فرخندگی آچکی تھی۔ اسی لئے ان کی مہمان نوازی دنیا بھر میں بطور ضرب المثل مشہور ہے۔ انتہائی غریب آدمی جس کے پاس اپنے اور اپنے بال بچوں کی کفالت کا ذریعہ ایک ہی اونٹنی ہو، اگر اس کے ہاں کوئی مہمان آگیا ہے اور پاس کچھ نہیں تو بلا ادنیٰ تامل اس اونٹنی کو ذبح کر کے نہایت خندہ پیشانی سے مہمان کے سامنے حاضر کر دیتا، بلا امتیاز اس کے کہ مہمان کون ہے؟ کوئی راہ رو جسے شام اس کے ہاں آگئی ہو اس کا مہمان ہے۔

ایفائے عہد

ایفائے عہد کی یہ حالت کہ جان پر بن جائے۔ بیوی بچے قتل ہو جائیں۔ گھر بار تباہ ہو جائے۔ دنیا بھر سے لڑائی مول لینی پڑے۔ ہرچہ بادا باد۔ کیا مجال کہ جسے ایک مرتبہ عہد دیا ہے پھر اس سے پھر جائے کسریٰ (شاہنشاہ ایران)، حیرہ کے حاکم نعمان بن منذر سے کسی بات پر ناراض ہو گیا۔ نعمان قبیلہ بنی شیبان کے رئیس ہانی بن مسعود کے پاس پہنچا۔ ہانی نے اسے پناہ دی لیکن اس نے اس خیال سے کہ اسکی پناہ دہی سے ہانی خود مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا اپنا مال و اولاد ہانی کی

حفاظت میں چھوڑا اور خود کسریٰ کے پاس چلا گیا۔ کسریٰ نے اسے قید کر لیا اور ہانی کو کہلا بھیجا کہ اس کا مال او اولاد دربار میں بھیج دے۔ اندازہ لگائیے کہ شہنشاہ ایران کا یہ حکم ایک معمولی سردار کے نام تھا جو خود اس شاہنشاہ کا جاگیر یافتہ بھی تھا۔ لیکن عرب تھا اس لیے جسے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اسے دوسرے کے حوالہ کس طرح کرتے؟ صاف جواب دیدیا۔ کسریٰ نے فوج کشی کر دی۔ قبیلہ شیبان مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ جنگ ہوئی اور یہ قبیلہ اس بہادری سے لڑا کہ ایرانیوں کو شکست ہو گئی۔

ایک مرتبہ امرا القیس نے اپنی تلواریں اور زرہیں سموال کے پاس بطور امانت رکھیں۔ حارث غسانی نے انہیں سموال سے طلب کیا تو اس نے امانت داری کے خلاف سمجھ کر اس سے صاف انکار کر دیا۔ حارث نے ایک جرار لشکر لیکر چڑھائی کر دی۔ سموال میں تاب مقاومت نہ تھی۔ اس لیے اپنے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اتفاقاً سموال کا بیٹا قلعہ سے باہر رہ گیا تھا۔ حارث نے اسے گرفتار کر لیا اور سموال کو پکارا وہ قلعہ کے برج پر آیا تو اس سے کہا کہ امرا القیس کی زرہیں وغیرہ اب بھی میرے حوالے کر دو ورنہ تمہارے بیٹے کو ابھی قتل کر دوں گا۔ اس نے اس پر بھی صاف انکار کر دیا اور آنکھوں کے سامنے بیٹے کو ذبح ہوتے دیکھنا گوارا کر لیا۔ لیکن جسے عہد دے رکھا تھا، اس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

ایفائے عہد کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ یمامہ کے سردار، عمیر کے یاں بنی کلاب کے ایک شخص نے مع اپنے بھائی کے پناہ لی۔ اتفاق سے اس شخص کے بھائی اور عمیر کے بھائی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور عمیر کے بھائی نے اس کے بھائی کو قتل کر دیا۔ عمیر اس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھر آیا تو اس نے کوشش کی کہ کلابی اپنے بھائی کا خون بہا لیکر راضی ہو جائے۔ اور لوگوں نے بھی اسے سمجھایا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ وہ قتل کا بدلہ قتل چاہتا تھا۔ عمیر کی ماں نے بھی اس سے درخواست کی کہ وہ قاتل کی تمام جائداد لے لے اور اس کی جان بخش دے لیکن وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ غور کیجئے کہ کس کی منت وسماجت ہو رہی ہے؟ ایک ایسے شخص کی جو ان کے ہاں پناہ گزین ہے۔ ان کے رحم وکرم پر ہے۔ مجبوراً عمیر نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑا اور کلابی کو ساتھ لے کر باہر جنگل میں چلا گیا۔ بھائی کو اپنے ہاتھوں کھجور کے درخت سے باندھ دیا اور کلابی سے کہا کہ تم جب قصاص کے سوا کسی چیز پر راضی نہیں ہوتے تو اس کو قتل کر دو لیکن اتنی مہلت دو کہ میں اس وادی سے باہر نکل جاؤں۔ چنانچہ کلابی نے اسے قتل کر دیا اور اپنے قبیلہ میں آگیا۔

کیا اس قسم کی مثال تاریخ کہیں اور بھی پیش کر سکتی ہے۔

دوست کی رفاقت میں وہ اس قدر پختہ تھے کہ جنگ بدر میں رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ کفار کے ساتھ کچھ لوگ ایسے بھی آگئے ہیں جو خوشی سے ہمارے خلاف لڑنے کے لیے نہیں آئے بلکہ جبراً لائے گئے ہیں انہیں قتل نہ کیا جائے۔ ان میں سے ایک شخص ابو البختری بھی تھا۔ مجذر انصاری کی نظر ابو البختری پر پڑی تو اس سے کہا کہ چونکہ

رفاقت

تیرے قتل سے رسول اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس لئے تجھے چھوڑتا ہوں۔ ابو البختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا جو اس زمرے میں نہیں آتا تھا۔ ابو البختری نے کہا کہ کیا میرے اس رفیق کو بھی چھوڑتے ہو! مجذر نے کہا کہ نہیں۔ اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اس پر ابو البختری نے کہا کہ میں عرب کی عورتوں کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابو البختری نے اپنی جان بچانے کے لئے دوست کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر وہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔

احسان شناسی

احسان کا اس قدر پاس رکھتے تھے کہ جب تک اس کا بدلہ ادا نہیں کر لیتے تھے اسے کبھی بھولتے نہیں تھے۔ حدیبیہ کے موقعہ پر قریش (کفار) کی طرف سے عروہ بن مسعود نبی اکرمؐ کی طرف آیا اور کچھ ایسی باتیں کیں جو مسلمانوں کو بڑی گراں گذریں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان باتوں کا سختی سے جواب دیا اس پر عروہ نے کہا کہ ابوبکر! میں بھی ایسی ہی سختی سے تمہاری باتوں کا جواب دیتا، لیکن کیا کروں؟ تمہارا ایک احسان میری گردن پر ہے جسے میں ابھی تک اتار نہیں سکا۔ اس لئے خاموشی کے سوا چارہ نہیں

شجاعت اور بہادری کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ ان کے لئے کھیل کا میدان بن چکا تھا۔ اس لئے ان کے ہاں بیماری سے بستر پر مرنا بڑی ذلت کی موت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کے راستے نکلتی ہے۔ ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت معیوب موت ہے۔ اس لئے وہ بیماری کی موت کو "حتف انف" کہتے تھے (یعنی ناک کی موت) اور ایسی موت کو بڑی ذلت کی موت تصور کرتے تھے۔ عامر بن طفیل اپنے قبیلہ کا رئیس (اور بہت بڑا متقنی تھا) اسے طاعون ہو گیا جس کی وجہ سے اسے بستر پر لیٹنا پڑا۔ لیکن جب موت قریب آئی تو اس نے کہا کہ مجھے گھوڑے پر بٹھا دو۔ گھوڑے پر بٹھا دیا گیا اور اس نے وہیں دم توڑا۔

میدان جنگ میں بھی تیروں کے زخم سے مرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ غزوہ احزاب میں نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گر گیا تو مسلمان مجاہدین نے تیر مارنا شروع کئے۔ اس نے کہا "مسلمانو! میں شریفانہ موت مرنا چاہتا ہوں" حضرت علیؓ نے اس کی درخواست منظور کی اور خندق میں اتر کر تلوار سے اس کا سر کاٹ لیا کہ یہ شریفوں کے شایان شان تھا۔

بے خوفی

ان ہی تصورات کا نتیجہ تھا کہ موت ان کے نزدیک کھیل ہو گئی تھی۔ مرد تو مرد، عورتوں تک کی یہ کیفیت تھی کہ موت سے انہیں کسی قسم کا ڈر ہی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ بنو قریظہ کے کچھ لوگ تھے جنہیں قصاص میں قتل کیا جاتا تھا۔ ایک ایک مجرم کو قتل گاہ میں پکارا جاتا اور موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ان ہی مجرمین میں ایک عورت بھی تھی جو حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ حضرت عائشہؓ کو اس کا علم نہیں تھا، لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ بھی مجرمین میں سے ہے۔ وہ حضرت عائشہ سے بے تکلف باتیں کر رہی تھی اور بات بات پر

ہنستی تھی۔ ایک ایک مجرم کے نام کی آواز اس کے کان میں پڑتی لیکن وہ اسی انداز سے باتوں میں مصروف تھی حتیٰ کہ قاتل نے اس کا نام بھی پکارا اور وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ کہاں جارہی ہو؟ ہنسکر بولی کہ یہ آواز مجھے ہی تو پڑی ہے۔ خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھدیا۔

اس لئے کہ وہ اس بات کو غیرت و حمیت کے خلاف سمجھتے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے۔ نوحے کی اجازت بھی دیتے تو اس وقت جب خون کا انتقام لے لیتے۔ جنگ بدر میں قریش کی شکست کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر صف ماتم بچھ گئی۔ لیکن قریش نے منادی کرادی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے۔ اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے۔ اس کا دل امنڈا آتا تھا لیکن غیرت قومی سے رو نہیں سکتا تھا۔ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی۔ سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دیدی ہے۔ نوکر سے کہا کہ دیکھنا کون روتا ہے! کیا رونے کی اجازت ہوگئی؟ نوکر نے آکر کہا کہ ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے، اس کے لئے رو رہی ہے۔ رونے کی اجازت نہیں مل گئی

احساس برتری لیکن ان تمام چیزوں سے بڑھ کر ایک اور جذبہ تھا جو عربوں کی تمام زندگی پر پوری طرح سے چھایا ہوا تھا۔ اور وہ جذبہ تھا احساس برتری۔ کوئی گوارا نہیں کرتا تھا کہ کوئی دوسرا اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے۔ ایک فرد کو دوسرے فرد سے آگے نکلنے کی تمنا ہمیشہ بیتاب رکھتی تھی۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے منافست کا جذبہ انہیں سب کچھ بھلا دیتا تھا۔ یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر نسلی تفاخر انتہائی شدت، اور قبائلی تفوق غلو تک پہنچ چکا تھا۔ من حیث القوم اپنی فصاحت و طلاقت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ ہر غیر عرب کو عجم (یعنی گونگا) کہتے تھے۔ پھر خود اپنے اندر مختلف قبائل کی یہ حالت تھی کہ اونچے درجے کا قبیلہ، نچلے درجے والے سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ یہ نسلی امتیازات اور نسبی مفاخرات اس قدر محکم گیر اور بنیاد رس ہو چکے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس جذبہ کو ان کے دل سے نہیں نکال سکتی تھی۔ ان ہی امتیازات نے ان کی وحدت قومی کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے اور پوری کی پوری .... پوری کی پوری قوم شعوب اور قبائل کے چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بٹ چکی تھی۔ جن قبائل میں کہیں حلف وفاداری قائم ہو گیا، ان میں تو خیر، ورنہ قبیلہ سے قبیلہ اور گروہ سے گروہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح لڑتا رہتا تھا اور یہ سب کچھ احساس تفوق اور جذبۂ برتری کے خیال سے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے قبیلہ سے وابستگی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس سے غرض ہی نہ تھی کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون، اپنے قبیلہ کا ساتھ دینا، بس یہی حق تھا۔ یہی تھی وہ عصبیت جاہلیہ جس کی بنا پر اگر قبیلہ سے باہر کسی کا قتل کیا جائے تو قبیلہ کا ہر فرد اس کا ذمہ دار بن جاتا تھا۔ لیکن اگر قبیلہ کے اندر قتل ہو جائے تو قاتل کو کوئی شخص پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ عہد جاہلیہ کے شعراء کا کلام اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قبائلی

عصبیت کیا بلا تھی! قبائل کا یہ امتیاز مراتب ان کے ہاں اس قدر مسلم ہو چکا تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف سمجھے جاتے تھے ان کے ایک آدمی کے قتل کے بدلہ میں دوسرے قبیلہ کے دو آدمیوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ زندگی کے اور شعبے تو ایک طرف، میدان جنگ میں ان کی یہ کیفیت تھی کہ غزوۂ بدر میں قریش کی فوج میں سے عقبہ اور شیبہ میدان میں آئے اور مقابلہ کے لئے پکارا تو مسلمانوں کی طرف سے انصار کے دو افراد ان کے مقابلہ کو نکلے۔ اس پر عقبہ نے یہ کہکر لڑنے سے انکار کر دیا کہ انصار قریش کی جوڑ کے نہیں ہیں۔ اس جنگ میں جب ابوجہل انصار کے ہاتھوں مارا گیا ہی تو اسے اس بات کا سخت رنج تھا کہ وہ کاشتکاروں کی قوم کے ہاتھوں کیوں قتل ہوا ہے۔ اس قبائلی تفوق کی انتہا یہ ہے کہ مدینہ میں اوس اور خزرج دو قبیلوں نے جب اسلام قبول کیا ہے تو ان دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا، کیونکہ ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کے پیچھے کھڑا ہونے کو تیار نہ تھا۔[1]

بنوامیہ اور بنو ہاشم ایک ہی درخت (قریش) کی دو شاخیں تھیں۔ لیکن بایں ہمہ، باہمی منافست رقابت انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ ابوجہل سے جب ایک شخص نے پوچھا کہ۔ محمد کی دعوت اسلام کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے،، تو اس نے صاف کہا کہ "میں کیا کہوں؟ محمد کے خاندان نے عزت و شرف میں دعوائے برتری کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں۔ اس کے جواب میں اسی شان کی دعوتیں ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے خوں بہا دیئے۔ ہم نے بھی دیئے۔ انہوں نے بڑی بڑی فیاضیاں کیں۔ ہم نے بھی کیں۔ ہم دونوں خاندان ہم پلہ ہو چکے تھے کہ دفعتہً ان کی طرف سے اب یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی آگئی ہے۔ اب ہم کہاں تک برداشت کریں"۔[2] اسی ابوجہل کا واقعہ ہے (اور سنئے کہ کس قدر دلچسپ واقعہ!) کہ جب بدر کی لڑائی میں ایک مسلمان مجاہد اس کا سر کاٹنے لگا تو اس نے کہا کہ دیکھنا! کہ میری گردن کو بہت نیچے کندھوں کے برابر سے کاٹنا۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ کیوں؟ کہنے لگا کہ جب لڑائی کے بعد مقتولین کے سروں کا نیزوں پر جلوس نکلے گا تو میرا سر باقیوں سے بالشت بھر اونچا ہوگا اور دور سے نمایاں طور پر نظر آئے گا کہ فلاں سردار کا سر ہے۔ غور فرمائیے کہ ان لوگوں کا جذبۂ تفوق و برتری کس حد تک دل کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ عربوں کے اس جذبۂ منافست و مسابقت کے واقعات اس قدر دلچسپ تھے کہ دوسری قومیں انہیں افسانوں کے رنگ میں پیش کیا کرتی تھیں۔ ایک بدو کے ہاں ایک گھوڑی تھی 'برق رفتار' تھی اس کا نام تھا۔ وہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ بدو اسے جان سے بھی عزیز رکھتا تھا

---

[1] یہ ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے جب حضورؐ ابھی مدینہ تشریف نہیں لائے تھے۔

[2] ابن ہشام حصہ اول۔

ایک رات چور آئے اور ملکی کو کھول کر لے گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بدو کو اس کا علم ہو گیا اور وہ ایک دوسرے گھوڑے پر سوار ہو کر چوروں کے تعاقب میں نکلا اور اس نے تھوڑی دور جا کر چور کو دیکھ لیا۔ اب کیفیت یہ تھی کہ چور ملکی پر سوار آگے آگے ہے اور یہ بدو گھوڑے پر سوار اس کے پیچھے۔ حتیٰ کہ کچھ دور اور آگے جا کر بدو چور کے برابر آگیا۔ ضرورت اس کی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر چور کا راستہ روک لے اور اسے گرفتار کرلے۔ دو ہی قدم کے بعد بدو نے دیکھا کہ اس کا گھوڑا ملکی سے آگے بڑھنے والا ہے۔ اس نے چلا کر چور سے کہا کہ کمبخت گھوڑی کا دایاں کان مروڑ۔ اس نے ملکی کا کان مروڑا تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی اور وہ دو سیکنڈ کے اندر یہ جا اور وہ جا۔ اب اس کا گھوڑا اسے کب پا سکتا تھا۔ خاسر و ناکام خیمہ میں واپس آگیا اور سر پکڑ کر رونے لگا۔ دوسروں نے پوچھا کہ کیوں؟ کوئی سراغ نہیں ملا کیا! کہنے لگا نہیں۔ سراغ تو ایک طرف میں نے تو چور کو پالیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ پاگل! جب تو دیکھتا تھا کہ ایک ہی قدم کے بعد تو چور سے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیگا تو اس وقت ملکی کا یہ راز اسے کیوں بتا دیا جس سے وہ برق رفتار ہو گئی۔

کہنے لگا کہ اسے راز نہ بتاتا تو کیا یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا کہ ملکی عمر بھر کسی بڑے سے بڑے گھوڑے کے پیچھے نہیں رہی وہ اس ٹٹو سے مات کھا جاتی؟ میری غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ میں ملکی کو کسی سے پیچھے رہتے نہیں دیکھ سکتا تھا!

غور کیجئے کہ ان کی غیرت کس حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ اور ان کا جذبۂ برتری کن کن شکلوں میں کام کرتا تھا یہی جذبہ تھا جس نے ان کے دلوں کو انتقام کی آگ سے بھر رکھا تھا۔ عرب کا جذبۂ انتقام! الامان والحفیظ! اس انتقام کو ان کے ہاں ثار کہا جاتا تھا اور اس کا سلسلہ صدیوں تک قائم رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں انتقام نہیں لے سکا تو مرتے وقت وصیت کر جاتا تھا کہ قاتل کی اولاد سے انتقام لیا جائے اور یہ سلسلہ جاری رہتا حتیٰ کہ قاتل اور اس کے خاندان تک کا نام و نشان مٹ چکتا۔ لیکن جب تک اس قبیلہ کے کسی آدمی کو قتل نہ کر دیا جاتا آتش انتقام فرو نہ ہوتی۔ ایک ایک قتل پر سینکڑوں سال کی لڑائیاں اسی بنا پر قائم رہتی تھیں۔ ثار کے متعلق ان کے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ مقتول کی روح پرندبن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لے لیا جاتا وہ مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھے پلاؤ میں پیاسی ہوں۔" اس پرند کو صدیٰ یا ہامہ کہتے تھے۔ ثار کا جذبہ ان کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ بعض مواقع پر یہی جذبہ ان کے اسلام قبول کرنے میں مانع ہو جاتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام اس طرح کے انتقام کا سخت دشمن ہے اس لئے جب تک وہ اپنے اس جذبۂ آتشیں کی تسکین نہیں کر لیتے تھے اسلام نہیں لاتے تھے۔ عمرو ابن اقیش اسلام سے متاثر ہوئے اور اسے قبول کرنے پر بالکل آمادہ۔ لیکن ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا۔ جب تک وہ انتقام لے نہیں لیا مسلمان نہیں ہوئے

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور انہیں دعوتِ اسلام دی تو قبیلہ والوں نے کہا کہ بات تو ہمارے بھی جی لگتی ہے لیکن بنو عقیل پر ہمارا تار باقی ہے وہ لے لیں تو پھر مسلمان ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا اور انتقام کا فریضہ" ادا کر لینے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ اس انتقام گیری میں انہیں دیر اس لئے بھی لگتی تھی کہ ان کے ہاں خدع و فریب سے انتقام لینا جائز نہ تھا۔ وہ انتقام لیتے تو کھلے بندوں، للکار کر لیتے۔ بلکہ ان کے اصول مبازرت تو اس سے بھی کہیں بلند تھے۔ وہ جب تک دشمن کو برابر کی پوزیشن نہیں دیدیتے تھے، اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ غزدہ احزاب میں دشمن کی فوج سے عمرو بن عبدود (جو شجاعت و بسالت میں ایک ہزار سپاہی کے برابر سمجھا جاتا تھا) میدان میں بڑھا اور مبازرت طلبی کی۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت علی مقابلہ کے لئے میدان میں آئے اور اس سے کہا کہ آؤ میرے ساتھ نبرد آزمائی کرو۔ تو یہ نوے برس کا بوڑھا سردار استخفاف کی ہنسی ہنسا اور کہا کہ مجھے امید نہ تھی کہ اس آسمان کے نیچے کسی کو یہ جرات بھی ہوگی کہ مجھے دعوتِ مقابلہ دے۔ بہرحال اسے یہ چیلنج قبول کرنا پڑا۔ حضرت علی پیادہ تھے اور وہ گھوڑے پر سوار۔ اس نے کہا کہ پیدل کا سوار سے کیا مقابلہ؟ یہ کہکر اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور سب سے پہلے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ جب دونوں حریف یوں برابر ہو گئے تو پھر مقابلہ کے لئے آگے بڑھا اور حضرت علی کے ہاتھوں وہیں ختم ہو گیا۔ یہ تھے ان کے اصول مبازرت اور یہ تھی ان کی غیرت!

اختصار کی غرض سے ہم انہی نظائر پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ ان کی غیرت و حمیت، جرات و بسالت، ایفائے عہد اور پختگیٔ پیمان، اور دوسری طرف عصبیتِ جاہلیہ اور نار و انتقام کی داستانیں بے شمار ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس قوم میں پہلے ہی سے یہ جوہر موجود تھے ان میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دینا کونسا مشکل کام تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض بڑی سطح بینی پر مبنی ہے اور یہی وہ سطحیت ہے جس کی بنا پر یورپ کے اکثر مستشرقین نے بھی سخت دھوکا کھایا ہے۔ وہ جب اسلام کے پیدا کردہ انقلاب پر تبصرہ کرتے ہیں تو نہایت بے تکلفی سے کہدیتے ہیں کہ یہ سب عربوں کی جغرافیائی پوزیشن اور ان کی طبعی افتاد کی بنا پر تھا۔ رسول عربی (صلعم) نے فقط اتنا کیا کہ ان کی ان بے پناہ قوتوں کو جو ان کے اندر خود موجود تھیں لیکن جو اس سے پہلے خود ان کے اپنے خلاف استعمال ہوتی تھیں ایک محاذ پر مرکوز کر دیا۔ اور اس محاذ کا رُخ اپنوں کی بجائے غیروں کی طرف پھیر دیا۔ بس یہ ہے راز ان کے نزدیک، عربوں کے اس انقلاب کا؛ حتیٰ کہ بیکر جیسے مورخوں نے تو یہاں تک کہدیا کہ ان میں توحید کا تصور بھی صحرا کی یکسانیت نے پیدا کر دیا تھا! (گویا عربوں نے ظہورِ اسلام کے وقت سے صحرا میں رہنا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ روم و یونان کے

۱؎ اصابہ فی احوال الصحابہ

شہروں میں رہا کرتے تھے!!

لیکن جن کی نگاہیں سطح سے نیچے اتر کر حقائق پر پہنچتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ انقلاب کیا تھا جو عربوں میں پیدا ہوا تھا اور اس قوم میں اس قسم کی انقلاب آفرینی کس قدر مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھی! عربوں کا انقلاب اتنا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کر کے ایران و روم کی سلطنتوں کو فتح کر لیا۔ اتنا کچھ تو شاید کوئی چنگیز خاں بھی کر دیتا۔ عربوں کا انقلاب یہ تھا کہ انہوں نے دنیا کی عمرانی و تمدنی زندگی کی تاریخ بدل ڈالی۔ اور چند ہی سال کے عرصہ میں اس دنیا کا بیشتر حصہ، قدیم دنیا کے بجائے بالکل نئی دنیا بن گیا۔

(Pringle Kennedy P. 18)

انہوں نے اشیاء کائنات کی اقدار (Valueas) بدل دیں۔ خیر و شر کے نئے پیمانے دنیا کو دیئے قصر انسانیت کو بالکل جدید بنیادوں پر تعمیر کیا۔ غرضیکہ ایک ایسا انقلاب پیدا کیا جس سے دنیا ایک نئی شاہراہ پر چل پڑی اور آج جب زمانہ مڑ مڑ کر اس انقلاب کی طرف دیکھتا ہے تو اسے صاف صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ انقلاب دنیائے قدیم و جدید میں ایک متمیز حد فاصل ہے۔

لیکن یہ انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا تھا جب تک خود اس قوم کے اندر ایسا بنیادی انقلاب پیدا نہ کیا جاتا جسے خود اس عالمگیر انقلاب کا علمبردار بننا تھا۔ اب آپ غور کیجئے کہ ایک ایسی قوم میں جس کی نفسیاتی کیفیات کا ہم ابھی ابھی مطالعہ کر چکے ہیں اس قسم کا بنیادی انقلاب پیدا کرنا کس قدر کٹھن مرحلہ تھا۔ وہ جن کی خود سری اور انانیت کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کا معبود بھی ان کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے تو وہ اس معبود کو اٹھا کر پھینک دیں ان کے قلوب کو اس قدر تذلل و تعبد کا پیکر اور تسلیم و رضا کا مجسمہ بنا دینا کہ وہ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین[1] کی زندہ تفسیر بن جائیں، کسی چنگیز و اسکندر کا کام نہ تھا۔ وہ جن کے قبائلی تفاخر کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے سے کمتر قبیلہ والے کے ساتھ لڑنا تک بھی باعث عار سمجھتے تھے انہیں اس عظیم الشان اصول کا مبلغ بنا دینا کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم اور صاحب عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کا پابند ہے۔ خواہ پیدائش کے اعتبار سے وہ کوئی ہو) کوئی معمولی بات نہ تھی جن لوگوں کی آتش انتقام سو سو برس تک بھی فرو نہیں ہوتی تھی انہیں اس تعلیم کا پرستار بنا دینا کہ الا لا یجنی والد علی ولدہ[2] (لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا، اس لئے کہ لا تزر وازرۃ وزر اخری (کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا) کوئی آسان کام نہ تھا۔ جن لوگوں نے

---

[1] کہدے کہ میری نماز اور میری قربانیاں، حتیٰ کہ میری زندگی اور موت سب ایک اللہ کیلئے ہے جو رب العلمین ہے۔ [2] دارقطنی جلد دوم

حوالیٔ کعبہ میں سینکڑوں بت نصب کر رکھے تھے انہیں دنیا میں توحید خالص کا علمبردار بنا کر بھیج دینا، فضائے صحرا کی یکسانیت کے اثر سے ممکن نہ تھا۔

اور پھر یہ سب نئے اصول اس قوم کے افراد سے منوانا جن کی کیفیت یہ تھی کہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی محض قومی غیرت کی بنا پر اسلاف کی روش سے ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ خود نبی اکرمؐ کے چچا (ابو طالب) جن کے زیر سرپرستی آپ نے پرورش پائی تھی اور جو آپ کو اپنے جان و دل سے عزیز جانتے تھے، ان کی یہ حالت تھی کہ حضورؐ جب بھی دعوتِ توحید دیتے وہ کہہ دیتے کہ "کیا کروں بزرگوں کے مذہب کو کیسے چھوڑ دوں"۔ جب ابو طالب کا آخری وقت آیا تو اس وقت بھی حضورؐ نے فرمایا کہ "چچا جان! اب تو لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے"۔ لیکن معلوم ہے اس کا جواب چچا کی طرف سے کیا ملا۔ یہ نہیں کہ میں تمہاری اس دعوت کو صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ کہ "بھتیجے جو کچھ تم کہتے ہو میں وہ کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا، لیکن قریش کہیں گے کہ ابو طالب موت سے ڈر کر مسلمان ہو گیا[1]۔ اس لئے مجھے اپنے باپ کے دین پر ہی مرنے دو[2]"۔

یہ تھی وہ قوم جسے آنے والے انقلابِ عظیم کا اولیں خمیر بننا تھا۔ ذرا تاریخ کی اوراق گردانی کیجئے اور غائر نگاہ سے دیکھئے کہ اس وقت دنیا کے کسی اور گوشے میں اس قسم کی کوئی اور قوم بھی آپ کی نگاہوں سے گذری ہے! آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ یہ قوم کسی اور ہی پانی اور مٹی سے بنی تھی۔ اور یہی وہ فولادی پیکر تھے جو اس عالمگیر انقلاب کے حامل ہو سکتے تھے!

آئیے اب دیکھیں کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا۔ پہلے یہ ریت کے ذرے کس طرح بجلیوں کے شرارے بنے اور اس کے بعد انہوں نے کس طرح باطل کے ہر پردے کو جلا کر حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا۔ اور یہ کس کی نگاہوں کے تصدق ہوا۔

---

[1] بخاری کتاب الجنائز و مسلم کتاب الایمان

[2] ذرا اس کیفیت کا مقابلہ فرعون کی اس حالت سے کیجئے کہ جب وہ بنی اسرائیل کے تعاقب میں غرق ہونے لگا ہے تو اس نے چلا کر کہا تھا کہ آمنت برب موسیٰ .... میں موسیٰ کے خدا پر ایمان لاتا ہوں! معلوم ہے اس اقرار و ایمان کا جواب خدائے غیور کی طرف سے کیا ملا تھا! یہی نا کہ آلئن .... (تفصیل جلد سوم باب بنی اسرائیل میں ملاحظہ فرمائیے) ان دونوں واقعات کو سامنے رکھئے۔ عربوں کی ذہنیت کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے آجائے گی۔ پھر اس کے بعد اندازہ لگائیے کہ ایسی قوم کو اس کے آبائی مذہب سے پھیرنا کس قدر مشکل کام تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ اگر ایسی قوم کو آپ ایک مرتبہ قائل کر کے صحیح راستہ پر لگا دیں تو اس کے بعد پھر دنیا کی کوئی قوت انہیں اس راستہ سے برگشتہ نہیں کر سکتی!

ماحصل

گذشتہ اوراق میں دنیا کی جو حالت ہماری نگاہوں سے گذر چکی ہے اس کا نقشہ دورِ حاضر کے ایک ممتاز مورخ تہذیبؒ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ رشید جو چار ہزار سال میں جاکر تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی حالت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے اندازِ کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و دساتیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زریں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی۔ اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلہ حرب و ضرب کے طوفانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔

خطباتِ اقبال

فضائے عالم کی بھیانک تاریکیوں کو آپ دیکھ چکے۔ اب تابانیٔ سحر کا درخشندہ منظر دیکھئے۔

سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

سلہ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں نہ تو اس مورخ کا نام لکھا ہے اور نہ ہی اس کی کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے بعد سعی بسیار اتنا سراغ... مل سکا...... کہ یہ (Denison) کی کتاب (Emotion as The Basis of Civilisation) ہے۔ یہ کتاب مجھے کہیں سے دستیاب نہیں ہوسکی۔ نہ امریکہ سے نہ انگلینڈ سے

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند

شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوع انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا، اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین و ضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمین عرب سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت[1] تھی!

---

[1] یہ اسی مورخ تہذیب کا بیان ہے جس کا ذکر صفحہ ۱۵۶ کے حاشیہ میں کیا جا چکا ہے۔

اولیں دور جہالت سے گذر کر، اب ہم ایک مختلف قسم کے انسانوں اور مذہب کی ایک نرالی دنیا کی طرف آتے ہیں۔ یعنی عربوں میں دین محمدی کے شیوع کی طرف ایک بہت بڑا انقلاب! ایسا انقلاب جس نے نوع انسانی کی عام حالت اور ان کے تصوراتِ زندگی میں عجیب تبدیلی اور محیر العقول رفعت پیدا کر دی۔

اس دور کا ہیرو اپنے ابنائے جنس میں خدا نہیں سمجھا جائے گا بلکہ خدا کا پیغامبر تصور کیا جائے گا۔ یہ بطل پرستی کا دوسرا دور ہے۔ پہلا دور اب کلیۃً ختم ہو چکا ہے اور دوبارہ لوٹ کر نہیں آئیگا۔ تاریخ عالم میں اب کوئی ایسا انسان نہیں آئیگا جسے اس کے ہم جنس خدا بنا لیں۔ اب ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یہ جہالت تھی اور انسانی فہم کی بہت بڑی غلطی۔

(کارلائل ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ)

عربوں کا ظہور ایک داستان ہے اور یقیناً دنیا کی تاریخ میں ایک غیر معمولی واقعہ۔ آئیے اب ہم ذرا ان کی طرف بھی دیکھیں اور ضمناً ان کا وہ حق بھی ادا کریں جو حال ہی میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ یہ حقیقت (کہ دنیائے تہذیب کس حد تک عربوں کی شرمندۂ احسان ہی) اتنے عرصہ تک اس لئے نگاہوں سے اوجھل نہیں رہی کہ مسلمانوں نے ہمیں اپنے قریب نہیں آنے دیا بلکہ اس لئے کہ عیسائی جس کے دشمن ہو جائیں اس کی کوئی خوبی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم یہ تو نہایت آسانی سے کہدیتے ہیں کہ کوپرنیکس نہ ہوتا تو نیوٹن بھی نہ ہوتا۔ لیکن یہ کبھی تسلیم نہیں کرتے کہ عرب ہمیں علم الافلاک نہ دیتے تو کوپرنیکس پیدا ہی نہ ہو سکتا۔ یا ہم یہ بآسانی کہدیتے ہیں کہ یہودیت نہ ہوتی تو عیسائیت بھی نہ ہوتی لیکن اس حقیقت کو بآسانی تسلیم نہیں کرتے کہ عرب نہ ہوتے تو دور حاضرہ کی تہذیب بھی کہیں نہ ہوتی۔

Dorsey- Civilisation: p. 234 & 639

اب ہماری نگاہ اس ناقابل فراموش انقلاب پر مرکوز ہے۔ جس نے اقوامِ عالم (کے قلب) پر ایک نرالا لیکن دائمی نقش ثبت کر دیا۔

GIBBON—

DECLINE AND FALL Vol. II P. 255

وہ روشنی جس سے تہذیب کی شمع دوبارہ جلائی گئی۔ یونانی اور رومی ثقافت کی ان چنگاریوں سے نہیں لی گئی جو یورپ کے کھنڈرات میں سلگ رہی تھیں۔ نہ ہی باسفورس کے کنارے زندہ موت سے۔ یہ روشنی شمال کی طرف سے نہیں بلکہ جنوب کی طرف کے حملہ آوروں سے لی گئی۔ یہ روشنی عرب سے اٹھی۔

Briffaalt—

the Making of Humanity P. 183

میثاق خداوندی

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۳/۸۰)

اور جب ہم نے (اقوام سابقہ سے) انبیاء کے بارے میں عہد لیا تھا اور وہ عہد یہ تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے۔ لیکن ہمارے سلسلۂ ہدایت کا انداز یہ ہے کہ ایک وقت معینہ کے لئے عطا کردہ ضابطۂ آئین تمہاری ابدی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے یہ سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے گا۔ تاآنکہ ہم اسی تدرج وتحول سے دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام کر دیں گے۔ لہٰذا اس سلسلۂ رشد وہدایت کے مطابق جب کبھی ایسا ہو کہ کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس آئے جو اس تعلیم کو سچ کر دکھائے جو اس سے پہلے دی گئی تھی تو تم یہ کہکر اس کا انکار نہ کر دینا کہ ہم ایک سابقہ رسول کے ماننے والے ہیں بلکہ تم اس کو بھی ماننا اور اس کی تائید کرنا۔ اس لئے کہ یہ سب رسول ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ تم تمام رسولوں کی دعوت کو اسی طرح مانتے جانا۔ تاآنکہ وہ رسول آجائے جس پر اس سلسلہ کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس وقت تم سب نے اسے ماننا ہوگا۔

اللہ نے ان اقوام سے پوچھ لیا تھا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو کہ ان رسولوں کو مانتے جاؤ گے اور اس کا ذمہ لیتے ہو کہ ان کی تائید کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا تھا کہ بیشک ہم اقرار کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے فرمایا تھا کہ ہاں اس پر گواہ رہو، اور دیکھو میں خود بھی اس پر گواہ ہوں۔

⁂

دعائے خلیل

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ۲/۱۲۷، ۱۲۹

اور دیکھو وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا جب ابراہیم خانۂ کعبہ کی بنیادیں چن رہا تھا اور اسمٰعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔ (ان کے ہاتھ تو پتھر چننے میں مصروف تھے اور دل وزبان پر یہ دعا، طاری تھی کہ) اے پروردگار! (ہم تیرے دو عاجز بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں تاکہ یہ دنیا میں تیری توحید کا مظہر اور وحدتِ انسانیت کا مرکز بن سکے۔ سو) ہمارے اس عمل کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا (اور دلوں کے ارادوں کا) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے قوانین کے اطاعت گذار) ہو جائیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کر دے جو تیرے ضابطۂ قوانین کی محکوم ومطیع ہو (اور اس کے سوا کسی اور کے حکموں کے سامنے سر نہ جھکائے) خدایا! ہمیں اس محکومیت واطاعت کے صحیح انداز وطرق (نظام دین) بتلا دے۔ اور اس باب میں ہم سے اگر کوئی سہو یا فروگذاشت ہو جائے تو اُسے (دفورِ حسنات کی قوتوں سے) درگذر فرما دے کہ بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگذر کرنے والی ہے۔

اور خدایا! (اپنے بذل وکرم سے) ایسا کیجو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو ان ہی میں سے ہو۔ وہ تیرے احکام سے لوگوں کو آگاہ کرے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ ان کے جوہرِ انسانیت کو بالیدگی عطا کرے۔ یقیناً تو غالب حکمت والا ہے۔

تمنائے کلیم

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۷/۱۵۶-۱۵۷)

اور (جب موسیٰ نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ بارالہا) اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لئے اچھائی لکھدے اور آخرت کی زندگی میں ہمارے لئے اچھائی کر۔ ہم تیری طرف لوٹ آئے۔

اللہ نے فرمایا۔ میرے عذاب کا تو یہ حال ہے کہ وہ میرے قانون مشیت کے مطابق ہی آتا ہے (یونہی نہیں آجاتا)۔ باقی رہی رحمت، سو وہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں اس رحمت کو ان لوگوں کیلئے مقدر کردونگا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور جو میرے قوانین پر ایمان لائیں گے۔ جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمّی ہوگا اور جس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں معروف کا حکم دیگا منکر سے روکے گا۔ طیبات حلال کرے گا۔ خبائث حرام قرار دے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے نیچے وہ دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے وہ نکالے گا جن میں وہ گرفتار ہوں گے۔ سو جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے۔ اور تمام مخالفانہ قوتوں کی روک تھام کریں گے اور (تمکین دین کے لئے) اس کی مدد کریں گے۔ اور اس روشنی کی پیروی کریں گے جو اس کے ساتھ بھیجی جائے گی سو وہی لوگ کامیابی پانے والے ہوں گے۔

تورات میں

خداوند خدا تیرے لئے۔ تیرے ہی درمیان سے۔ تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی پیدا کریگا تم اسکی طرف کان دھریو۔ (استثنا ۱۸/۱۵)

اور خداوند نے مجھ سے کہا۔۔۔ میں ان کے لیئے ان کے بھائیوں (بنی اسمٰعیل) میں سے تجھ سا ایک نبی پیدا کرونگا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اس سے فرماؤنگا وہ سب ان سے کہیگا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتیں جنہیں وہ میرا نام لے کر کہیگا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لونگا۔ (استثناء ۱۸/۱۸-۱۹)

خداوند خدا سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران (مکہ) کے پہاڑوں سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ۔ (استثناء ۳۳/۲)

نوید مسیحا

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (۶/۲۸)

اور جب عیسیٰ ابن مریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا پیغامبر ہوں اور اس تعلیم کو سچ کر کے دکھانے والا، جو تمہارے پاس اس سے پہلے تورات میں آچکی ہے اور میں تمہیں بشارت دینے والا ہوں اس رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا۔

انجیل میں

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیجدوں گا.... مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہیں کہیگا۔ بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہیگا۔ اور تمہیں آیندہ کی خبریں دے گا۔ (انجیل یوحنا۔ $\frac{16}{7-14}$)

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہاری طرف باپ کی طرف سے بھیجونگا. یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے۔ وہ میری گواہی دے گا۔ اور تم بھی گواہ ہو۔ (انجیل یوحنا $\frac{15}{26}$)

اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس سے پھل لائے دیدی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا وہ اسے پیس ڈالے گا۔ (انجیل متی۔ $\frac{21}{43-44}$)

دعوات انقلاب

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝ وَطُورِ سِينِينَ ۝ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۝ (۹۵/۱-۸)

خدا کی وہ دعوت انقلاب جو کبھی جودی کی پہاڑیوں (ستین) پر نوح کی وساطت سے نمودار ہوئی اور کبھی بیت المقدس کی وادیوں (زیتون) میں عیسیٰ کے دم مسیحائی کی صورت میں زندگی بار ہوئی۔ جو کبھی طور کی چوٹیوں پر فراعنۂ مصر کے لیے برق خاطف بن کر چمکی اور پھر جس کا ظہور اب سرزمین پر ہونے والا ہے جو نوع انسانی کے لئے امن و سکون کی ضامن بنے گی وہ دعوت اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ خدا نے انسانی فطرت کو ایک عظیم الشان غایت تک پہنچانے کے لیے نہایت مناسب اور موزوں بنایا ہے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ یہ فطرت صحیحہ کے خلاف روش اختیار کر کے بجائے انسانیت کی بلندیوں کی طرف مرتقی ہونے کے بجائے، بہیمیت کی پستیوں کی طرف گرنا چاہتا ہے۔ اس رجعت قہقری، اس تسفل و تنزل، ان پستیوں اور ذلتوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان اس حقیقت عظمیٰ پر یقین رکھے کہ یہ زندگی یعنی طبعی عناصر کی زندگی نہیں جس کی غایت کھانا پینا اور مر جانا ہے بلکہ اس کی منزل اس سے کہیں آگے ہے۔ اس ایمان کے بعد وہ اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کرے جن سے وہ اس منزل مقصود تک پہنچ سکے جس کی وسعتیں ناپید اکنار ہیں جس کی پہنائیاں حد و فراموش ہیں اور پھر سوچو کہ خدا کے اس اٹل قانون مکافات عمل اور اعمال کے حسنات نتائج کی کوئی مثال کہیں سے ہاتھ آتی ہے؟ سو جب واقعہ یہ ہے کہ اقوام کی بربادی کی پوری تاریخ اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ اقوام عالم کی قسمتوں کے فیصلے اس قانون مجازات کی رو سے طے پاتے چلے آئے ہیں تو کیا اس سے یہ حقیقت کبھی واضح نہیں ہو جاتی کہ خدا کے قانون کے فیصلے ہی سب فیصلوں پر غالب رہتے ہیں۔

اگر گذشتہ اقوام کی داستانیں تمہارے نزدیک اساطیر الاولین قرار پا چکی ہیں اور تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری سطح بین نگاہوں کے لئے عبرت و موعظت کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ تو آؤ۔ اس آخری دعوت انقلاب پر غور کرو جس کا ظہور اس سرزمین پر ہوا۔ جسے خدا کے فیصلوں نے نوع انسانی کی امن و سلامتی کے لئے آخری مرکز قرار دیدیا ہے۔ اور جس کے نقوش تاریخ کے صفحات پر اتنے صاف اور واضح ہیں کہ گویا تمہاری آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔

کتابٌ مّبین

حضرت موسیٰ کی سیرت کو لیجیئے۔ صدیوں تک یہ زبانی روایات اور قصص و اساطیر پر مشتمل رہی اور اس کی آخری صورت آپ کی وفات کے کہیں آٹھ سو یا ایک ہزار سال بعد جا کر متشکل ہوئی۔

گوتم بدھ کو لیجیئے۔ آپ کی وفات کے عرصۂ بعید کے بعد کہیں جا کر اس کی کوشش کی گئی کہ آپ کی زندگی کے نمایاں واقعات کو منضبط کیا جائے۔ لیکن چونکہ ہندی ذہن ہی تاریخ کے لئے مناسب واقع نہیں ہوا اس لئے یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ انہوں نے اپنے باپ کا گھر کیسے چھوڑا اور پھر عرصہ دراز کی جد و جہد کے بعد اس چیز کو پا لیا جسے وہ رازِ زندگی کہتے تھے۔

جنابِ مسیح کو لیجیئے تو ہم بجائے اس کے کہ تاریخی واقعات تک پہنچ سکیں، افسانوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اگرچہ ہم عیسائیت کے بانی کے قریب رسائی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے عہد کے مصنفین کی خاموشی اس تحریک کے ابتدائی ادوار کی تاریخ کے متعلق رازداری اس کے مذہبی نوشتوں کے زمانۂ تحریر کے متعلق شبہات بالخصوص اناجیل کی تصنیف کے متعلق شکوک وغیرہ جنابِ مسیح کی اس زندگی کے متعلق جو ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے بہت سی چیزوں کو تاریکیوں میں چھوڑ دیتی ہیں۔

لیکن حضرت محمدؐ کی سیرت کے متعلق اس قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ آپ کی سیدھی سادی پیدائش۔ بچپن کے ایام کا صحرا نشین بدوؤں کے خیموں میں بسر ہونا۔ آپ کی ایک ایسی بیوہ سے شادی جو عمر میں آپ سے کہیں بڑی تھیں۔ آپ کا مبلغِ توحید کی حیثیت سے دعویٰ نبوت۔ مکہ کا طویل قیام وہاں کے مصائب و نوائب۔ مدینہ کی طرف ہجرت اور اس شہر کے باشندوں کا قبولِ اسلام۔ عرب کے نامور قبائل کا آہستہ آہستہ آغوشِ حق و صداقت میں داخلہ۔ مکہ کی طرف مراجعت اور وفات۔ یہ تمام حالات و واقعات اس طرح متحقق و متعین ہیں جس طرح آج ہمارے لئے فریڈرک اعظم یا آلیور کرامل کے حالاتِ زندگی۔

Arabian Society At the Time of Mohamad-

Pringle Kennedy P. 17-21

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا

صُبحِ بہار

برخیز! کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
این مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

صبحِ بہار

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

جب زمین گرمی کی شدت سے تمتما اٹھتی ہے۔ تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نم زندگی چوس لیتی ہے۔ آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوا انگارہ بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں لالہ کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ پتیاں سوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں سرو و صنوبر آتشدانِ ارضی کے دودکش دکھائی دیتے ہیں۔ تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نور ہو جاتے ہیں۔ مرمریں ندیاں خطِ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ لُو کی دہشت سے سائے کانپتے ہیں راستے ہانپتے ہیں۔ خنکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے۔ وفورِ تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان، زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے کہ کہیں سے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے۔ لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں، حسرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی کے کسی گوشے میں بھی امید کی نمی باقی نہیں رہتی، اور بساطِ کائنات کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و ناامیدی کے اس انتہائی عالم میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دامنِ ارض کو بھرپور کر دیتا ہے۔ زمینِ مردہ میں پھر سے زندگی آ جاتی ہے۔ رگِ کائنات میں نبضِ حیات پھر سے متموج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں

بن جاتی ہے چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے جامِ نور بن جاتی ہیں۔ ندیوں کی بے آب لکیریں بادۂ جاں فزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جان میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خنکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی برودتیں، کنوؤں کی تہوں سے اچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں، خشک پتیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں ازسرِ نو تازگی و شگفتگی آجاتی ہے۔ شگوفے چٹختے ہیں کلیاں مہکتی ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے، سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا—— بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں۔ ہر طرف ایک نئی زندگی، اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ، جھومتی، مسکراتی، مچلتی، لوٹتی، ایک ایسی جنت نگاہ بن جاتی ہے، جس کی ہر روش میں مسرتوں کے چشمے ابلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ (۴۲/۲۸)

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو اپنی نا امیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو کھینچتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ (۷/۵۷)

اسی کی ذات ہے جو (زمین کے جھلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر وہ پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لاتی ہیں، جس سے ہم اجڑی ہوئی بستیوں کو سیراب کرتے ہیں اور زمینِ مردہ سے طرح طرح کے پھل اگلتے ہیں۔

فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ (۳۰/۵۰)

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے ان آثارِ رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدل ہیں یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکان کے اثرات

کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے ماوراء اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح کارفرما اور یہی آئینِ مشیت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے انسانیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید و مہیب تھی جس کا ابھی ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول، وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے۔ لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں اسیر و نامراد انسان ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ متیٰ نصر اللہ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔[1] چنانچہ اس کے لئے اس ربِ ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاول کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلد امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارکباد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور

---

[1] "حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رخ متعین کر لیتی ہے۔ اس کو ہم مذہب کی زبان میں وحی نبوت کہتے ہیں۔" (اقبالؒ)

تیرے خوش نصیب ذروں کو اس ذاتِ اطہر و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالم موجودات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجد انسانیت کی تکمیل ہو گئی، جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، ناسوت و لاہوت، یہ اور وہ، قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ نورانی و حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے۔ جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ ہاں تو آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا نوامیسِ فطرت نے "جنت سے نکلے ہوئے ابنِ آدم" کے اس طالع بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب سے انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمی کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے "جگمگاتا چراغ" کہکر پکارا۔ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا وَّدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی احبار و رہبان کی برہمنیت کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں تقسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔ اور پابند قفس طائر لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا، اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد ولیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی (۳۰ : ۵۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

پھر اس حقیقت باہرہ کو بانداز دگر دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتدا ہوئی۔ ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں کشش و جاذبیت کا وہ تمام نگاہ فریب سامان رنگ و تعطر تھا جو نگارخانۂ طلسم و حیرت کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا اور اس کے دوسری طرف انسانی راہ نمائی کے لئے پیغامِ ازلی جو مبدار فیض کی شانِ ربوبیت سے انسانوں تک پہنچتا رہا عقلِ انسانی طبعیاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی منزل آخری قرار دے کر اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن یہ پیغام ازلی اس کے سامنے طبعیاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیت کی بلند حقیقتوں کو بھی بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لَے ایک تھی۔ حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم کدۂ رنگ و بو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں پیغام ازلی کے اصولوں کی فروعات میں بھی مناسب رد و بدل اور ضروری تغیر و تبدل ہوتا جاتا تھا۔ کہ طبعی ارتقا کے ساتھ ساتھ جوہرِ انسانیت میں بھی تدریج ارتقا ہوتا جائے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کاروان سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان پیغامبرانِ حیاتِ جاوید کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت اٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک نکتۂ آخریں کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ نشان بتا کر جاتا۔ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ بلا تامل و توقف اس کے پیچھے ہو لے اور راہ گم کردہ مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی، سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتاب فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب، کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گلِ سرسبد کے لئے نوید بہار تھیں۔ چنانچہ جب مشیت ایزدی کی تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ذرے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آ گئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی

تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درون پردہ کے معدن لعل و گوہر کو سمولے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے نتر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحن گلستان کائنات پر بہار آگئی ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے چاند مسکرایا ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنّی اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر۔ ایک پیکر محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا صحرائے حجاز کے ذرے جگمگا اٹھے بلد امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبل متین پر حضرت نوح نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکین خاطر بتایا تھا جس کی آمد کی بشارتیں وادی طور سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشت عرب میں حضرت خلیل اکبر اور ذبیح اعظم نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، آیا اور اس شان زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہی کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاء اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اٹھی۔ اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ

اے سوار اشہبِ دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکر و انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگ اذاں

یہ آنے والا رسول کافۃ للناس و رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت

لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیل آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلب محمدیؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی ان ہی پتیوں کی رہین منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغام محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادث ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحن کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا اور مقام محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی مفرطانہ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے اور یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے۔ یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ فطرت انسانی کے تقاضوں کی تسکین اور اس کے شرف و مزیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم تھی جس پر اس ذات اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفےٰ رو

یہ تھا حاصل بہار چمن کائنات، کہ جس کا ظہور صبح بہار کائنات تھا۔

وہ رازِ خلقت ہستی، وہ معنیٔ کونین

وہ جانِ حسنِ ازل وہ بہارِ صبح وجود

وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کنجِ حرا

وہ دل کا نور وہ اربابِ درد کا مقصود

وہ سرورِ دو جہاں وہ محمدؐ عربی

بروحِ اعظم و پاکش درود لا محدود

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۳۳ / ۵۶)

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

قیدار

فہر

الملقب بہ قریش (قریب ۳۲۵ء)

قُصَی ابن کلاب (قریب ۴۷۵ء)

عبد مناف

نوفل — ہاشم — عبد شمس

اُمیہ (خلفائے بنو امیہ)

عبدالمطلب (قریب ۵۰۰ء)

حمزہ رض — ابو طالب — عبداللہ — عباس رض — ابو لہب

حضرت علی رض

گل سرسبد شاخ براہیمی

محمد رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم

طلوعِ آفتاب

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ[۱۲] بیٹے تھے۔ ان میں سے دوسرا بیٹا (قیدار) نہایت نامور ہوا۔ یہ حجاز میں آباد ہوا اور خدا کے اس پہلے گھر کی تولیت کا مقدس فریضہ اس کے حصہ میں آیا جو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوا تھا۔ بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہو گئی۔ ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔

قریش کا مفہوم

قریش، فہر کا لقب تھا۔ عربی میں لفظ قریش کے متعدد معنے ہیں۔ ویل مچھلی کو بھی قریش کہتے ہیں اس لئے اکثر قیاس کا رخ اس طرف گیا ہے کہ فہر نے اپنی قوت اور عظمت کے اظہار کیلئے یہ لقب اختیار کیا تھا۔ قریش میں، قصی ابن کلاب ایک خصوصی شہرت کا مالک ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اس قبیلہ میں ایک سیاسی نظام قائم کیا۔ اس نے ایک طرف انتظام کعبہ کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا۔ مثلاً سقایہ (حجاج کے کھانے پینے کا انتظام)، عمارہ (خانۂ کعبہ کی دیکھ بھال)، رفادہ (حاجیوں کی مالی اعانت کا انتظام) وغیرہ۔ اور دوسری طرف سیاسی امور کی سرانجام دہی کے لئے، ندوہ (عدالت گاہ) اور مشورہ (مشاورت گاہ) جیسے شعبے قائم کئے۔ دارالندوہ کو قریش کا ایوانِ حکومت سمجھئے جہاں ان کے اربابِ بست و کشاد ہر قسم کے اجتماعی امور کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ قصی ابن کلاب کے بعد، قریش میں ہاشم کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ یہ بھی بہت نامور سردار تھا جس نے تولیت کعبہ کے سلسلہ میں اپنے فرائض کو نہایت حسن و خوبی سے سرانجام دیا۔ اس نے قیصرِ روم اور حبش کے بادشاہ نجاشی سے فرامین حاصل کئے کہ تجار قریش کے قافلے جب ان کے حدودِ سلطنت میں داخل ہوں تو ان سے کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔ اس کے بیٹے، عبدالمطلب بھی اپنے قبیلہ کے نامور سردار تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے چاہ زمزم کا، جو ایک مدت سے اَٹ کر گم ہو چکا تھا، سراغ لگایا اور کھدوا کر اُسے نئے سرے سے درست کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی، قبیلۂ زہرہ میں وہب بن عبدمناف کی صاحبزادی آمنہ سے کی جو قریش کے گھرانے

میں ممتاز تھیں۔

آفتابِ عالمتاب

اسی کریم و ممتاز گھرانے میں، موسمِ بہار میں، دوشنبہ کے روز، بتاریخ ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء۔ بوقت صبح، اس نیّرِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس سے دنیا بھر کی تاریکیوں کو کافور ہو جانا تھا۔ دادا نے اپنے مرحوم[1] لختِ جگر کی یادگار کو اپنی گود میں لیا اور خانۂ کعبہ میں جا کر دعا مانگی۔ ساتویں دن تمام قبیلہ کی دعوت کی اور بچہ کا نام محمّد رکھا۔ لوگوں نے ازراہ استعجاب پوچھا کہ آپ نے اپنے خاندان کے مروجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا۔ کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا بچہ دنیا بھر کی ستائش اور تعریف کا شایاں قرار پائے یہ اسم گرامی دادا کی طرف سے تجویز ہوا لیکن والدہ نے احمدؐ نام رکھا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ شرفائے عرب اپنے بچوں کو صحرانشیں بدوؤں کے ہاں بھیجدیتے تھے تاکہ ان کی ابتدائی پرورش اور تربیت کھلی فضا میں ہو اور ان میں فصاحت کا جوہر بھی پیدا ہو جائے جو عربوں کی بہت بڑی خصوصیت تھی۔ اس دستور کے مطابق حضورؐ کی ابتدائی پرورش بنی سعد کے قبیلہ میں جو فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا، دایۂ فطرت کی گود میں ہوئی قریب چھ برس کی عمر تھی کہ حضورؐ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور آپ کی کفالت آپکے دادا نے اپنے ذمہ لے لی جب اُن کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ کو آپکے چچا (ابو طالب) نے اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیا اور اپنے بچوں سے بھی زیادہ محبت کے ساتھ حضورؐ کی پرورش کی۔

زمانہ قبل از نبوت

کتب آثار و روایات میں حضورؐ کے زمانہ پیش از نبوت کی سیرتِ طیبہ کے احوال و کوائف بھی بڑی تفصیل سے مذکور ہیں (اور حقیقت یہ ہے کہ، جیسا کہ غیر مسلموں تک کو اعتراف ہے، یہ خصوصیت بھی نبی اکرمؐ ہی کو حاصل ہے کہ آپکے سوانح حیات کی جزئیات تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں) لیکن قرآن کریم کا مقصد چونکہ اس تعلیم کو پیش کرنا ہے جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی اور جس سے عالمِ انسانیت میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا اس لئے قرآن کریم حضورؐ کے عہدِ رسالت کی زندگی ہی کو بہ تفصیل پیش کرتا ہے زمانۂ قبل از رسالت کی زندگی کے متعلق وہ صرف ایک شہادت پر اکتفا کرتا ہے اور وہ شہادت ایسی عظیم القدر اور جامع ہے کہ اس میں حضورؐ کی پوری حیات

---

[1] حضورؐ کے والد ماجد کا انتقال حضورؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ حضورؐ کی یتیمی کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ "اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی (93/6) (کیا خدا نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہیں دی؟" [2] قرآن کریم نے حضورؐ کے اسم گرامی محمّدؐ کا بھی ذکر کیا ہے اور بشارت حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں احمدؐ کا بھی (دیکھئے 3/144، 33/40، 47/2، 48/29 اور احمدؐ کے لئے 61/6)

مسلم کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اِنَّ لِیْ اَسْمَاءً۔ اَنَا مُحَمَّدٌ وَاَنَا اَحْمَدُ۔۔۔ الخ۔ طبقات ابن سعد میں بھی حضورؐ کے اسم گرامی احمدؐ کے متعلق بہت سی روایات مندرج ہیں۔ نیز حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ نے جو حضورؐ کی مدح و ستائش میں قصائد لکھا کرتے تھے۔ اپنے اشعار میں متعدد جگہ حضورؐ کو اسم احمدؐ سے مخاطب کیا ہے۔

مقدسہ اس طرح سمٹ کر آگئی ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان کا بحر کبود۔ (اس کا ذکر ذرا آگے چلکر آئے گا) جیسا کہ حضرت ابراہیم کے تذکرۂ جلیلہ (جلد سوم) میں تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے۔ مشیت ایزدی کے پیش نظر جس قلب منور کو مہبط وحی اور منزل رسالت بنانا مقدر ہوتا ہے۔ اس کی شروع ہی سے تربیت اس انداز کی ہوتی ہے کہ اس کی فطرت سعید ہر غیر فطری مسلک سے ابا کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم بتکدے کے سب سے بڑے پجاری کے گھر پیدا ہوئے۔ بت پرستی اور ستارہ پرستی کے ماحول میں پرورش پائی۔ لیکن اس رشد و سعادت کی بنا پر جو مبدأ فیض کی طرف سے انھیں شروع ہی سے عطا ہوئی تھی، انھوں نے کسی فانی معبود کے سامنے جھکنا پسند نہیں کیا اور باپ اور قوم کے مسلک کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت کر دی۔ حضور نبی اکرم کی پیدائش اور پرورش بھی اس ماحول میں ہوئی جہاں شرک اور بت پرستی کا مسلک عام تھا۔ جس کعبہ میں عبدالمطلب اپنے چاہیتے پوتے کو دعا کے لئے لے گئے اس کے گرد و پیش سینکڑوں بت نصب تھے۔ اور آپ کا خاندان اس بتکدہ کا کلید بردار تھا۔ اسی ماحول میں آپ کی ساری عمر بسر ہوئی لیکن آپ نے مراسم شرک سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ ایک دعوت میں آپ کے سامنے کھانے میں اس جانور کا گوشت آیا جو کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا[1]۔ مراسم شرک و کفر تو کجا۔ بد اخلاقی کی عام باتیں جن کا عربوں میں بے محابا رواج تھا حضور کے حسن سیرت کو آلودہ نہ کر سکیں۔ مثلاً عربوں کی نگہ جہالت آمیز ننگے ہو جانے میں کوئی عیب نہیں دیکھتی تھی۔ حتی کہ مرد اور عورتیں طواف کعبہ کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے۔ حضور کا بچپن بھی اسی مسموم سوسائٹی میں سانس لے رہا تھا لیکن کیفیت یہ تھی کہ ایک دفعہ خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ آپ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے جس سے کندھے پر رگڑ لگ رہی تھی آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے آپ کا تہبند کھولکر کندھے پر رکھدیا کہ اس کے اوپر اینٹیں رکھی جائیں۔ لیکن ننگے ہونیکے احساس سے آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ اور ہوش آنے پر آپ کی زبان پر تھا۔ میرا تہبند۔ حضرت عباسؓ نے فوراً تہبند باندھ دیا[2]۔ یہی بچپن جب جوانی میں پہنچا ہے تو شرم و حیا کی کیفیت یہ تھی کہ (بقول صحابۂ کرام) كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا (حضور پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے)[3]

ناحق خوں ریزی سے اجتناب

عربوں کی سفاکی اور خون آشامی کی داستانیں گذشتہ اوراق میں ہماری نظروں سے گذر چکی ہیں لیکن ان سب میں مثل سپیدۂ سحر ایک دامن ایسا بھی تھا جسے خون ناحق کے ایک قطرہ نے بھی داغدار نہیں کیا۔ یہ دامن، امن و سلامتی کے شاہزادے کے سوا اور کس کا ہو سکتا تھا؟ قبیلوں کی ان لڑائیوں میں حضور کی عدم شرکت بزدلی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ اس لئے کہ یہ لڑائیاں عصبیت جاہلیہ کی باطل بنیادوں پر اٹھتی تھیں۔ اس تمام عمر میں حضور نے صرف ایک لڑائی میں شرکت کی جو قریش اور قبیلۂ قیس میں ہوئی تھی اور جس میں قریش برسر حق تھے لیکن چونکہ یہ لڑائی بھی ایام الحرام میں پیش آئی تھی

---

[1] بخاری باب المناقب۔ [2] بخاری کتاب الحج۔ [3] بخاری کتاب الادب۔

اس لئے حضورؐ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔[1] اس لڑائی میں حضورؐ کی شرکت بھی ایک طرح موجب صلح و آشتی ہوئی۔ اس لئے کہ لڑائی سے واپسی پر بعض طبائع میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی جن میں پیش پیش حضورؐ کے اہل خاندان تھے۔ چنانچہ انہوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہیں رہنے پائے گا۔[2] حضورؐ اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہد نبوت میں بھی اس کا تذکرہ فخر و مسرت سے فرمایا کرتے تھے۔ بات تھی بھی فخر و مباہات کی کہ عربوں کی تشدد قبائلی عصبیت کے پیش نظر "مظلوم کی حمایت" کا عہد (خواہ مظلوم کوئی ہو) ایک بہت بڑی اصلاح تھی۔ اس معاہدہ کو حلف الفضول کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ معاہدہ بعد میں بیکار ہو گیا اور خود حضورؐ کی مخالفت میں ظالم و مظلوم کا امتیاز بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ بایں ہمہ یہ اصلاح کی ایک مستحسن کوشش ضرور تھی۔ یہ معاہدہ ناکام اس لئے رہا کہ اس کا وجود ایک ہنگامی جذبہ کا رہین منت تھا۔ ان نفوس کی اصلاح نہیں ہوئی تھی جن سے یہ بروئے کار آیا تھا۔ یہ اصلاح نفوس تعلیم و تربیتِ رسالت سے ہی ممکن تھی جس کے لئے ابھی زمانہ کو کچھ وقت اور انتظار کرنا تھا۔

امن و سلامتی کا پیامبر

حضورؐ کے حسنِ تدبر سے کس طرح قریش کی خون آشام تلواریں جو ذرا ذرا سی بات پر برق خاطف بنکر فضا میں چمک اٹھتی تھیں پھر سے زیر نیام ہو جاتی تھیں اس کی مثال وہ یادگار واقعہ ہے جو تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت قد آدم اونچی تھی اور نشیب میں واقع ہوئی تھی اس لئے بارش کا پانی اسے نقصان پہنچایا کرتا تھا، قریش نے فیصلہ کیا کہ اسے از سر نو مستحکم طور پر تعمیر کر دیا جائے چونکہ تعمیر حرم کا کام وجہ عزّ و شرف سمجھا جاتا تھا اس لئے اس میں مختلف قبائل شریک ہوئے اور ہر قبیلہ نے ایک حصہ اپنے لئے مختص کر لیا لیکن جب حجر اسود نصب کرنے کا وقت آیا تو سب میں جھگڑا پیدا ہوا۔ چنانچہ آن کی آن میں تلواریں بے نیام ہو گئیں۔ سردارانِ قبائل نے خون سے لبریز پیالوں میں اپنی انگلیاں ڈبو لیں، کہ یہ جان دینے کی قسم کے مرادف تھا۔ چار دن تک برابر یہ جھگڑا جاری رہا۔ پانچویں دن یہ طے پایا کہ دوسری صبح جو شخص سب سے پہلے آئے وہی ثالث تسلیم کر لیا جائے۔ دوسری صبح سب سے پہلے وہاں وہی ذاتِ گرامی موجود تھی جس کے ذمہ دنیا بھر کے تنازعات اور اختلافات مٹانے کا اہم فریضہ عائد ہونے والا تھا۔ آپؐ نے حجر اسود اپنی چادر میں رکھا اور تمام دعویدار قبائل کے نمائندگان سے کہا کہ وہ اس چادر کو اوپر اٹھائیں۔ جب چادر موقعہ کے برابر آگئی تو آپ نے حجر اسود اٹھا کر نصب کر دیا اور یوں ایک خونریز جنگ کو ہوتے ہوئے روک دیا۔

حسنِ معاملہ

یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قریش کا ذریعۂ معاش عام طور پر تجارت تھا۔ حضورؐ نے اپنے چچا (ابو طالب) کے آغوش رافت میں پرورش پائی تو ان کے ساتھ بچپن میں بعض تجارتی سفر بھی کئے اس کے بعد جب خود سنِ رُشد کو پہنچے تو اپنے لئے بھی تجارت ہی کو ذریعۂ معاش قرار دیا تھوڑے

[1] ابن ہشام [2] طبقات ابن سعد جلد اول

ہی عرصہ میں آپ کے حسن معاملہ اور دیانت داری کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی جس کی وجہ سے ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے سرمایہ میں حضورؐ کو بھی شریک کرلے۔ کتب تاریخ و روایات میں ایسی شہادات بکثرت ملتی ہیں جن سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان تمام معاملات میں آپ کس راستبازی اور دیانتداری سے تمام امور سرانجام دیتے تھے یہی وہ پاکیزگیٔ اخلاق، حسن معاملہ، راستبازی اور دیانتداری تھی جس کی بناپر تمام ملک نے متفقہ طور پر آپ کو آمین کا لقب دیدیا۔ اس زمانہ میں بنک تو ہوتے نہیں تھے۔ جب کوئی کہیں باہر جانے لگتا تو اُسے کسی ایسے گوشے کی تلاش ہوتی جہاں اس کا مال محفوظ رہ سکے۔ تمام گرد و نواح کے علاقہ والوں کے لئے یہ کاشانۂ عافیت اسی "اَمِیْن صَادِق" کا دارالسلام تھا جس کے سپرد وہ بارِ امانت ہونے والا تھا جس کے اٹھانے سے زمین و آسمان کے کندھے بھی عاجز تھے اور جسے نوامیس فطرت صبح ازل سے زمانہ کی پیچ در پیچ تہوں میں لپیٹے اس مستودع مکرم کی آمد کے انتظار میں تھے۔

حضرت خدیجہ رضؓ

یہی وہ راستبازی اور صداقت شعاری تھی جس سے متأثر ہو کر دودمان قریش کی ایک نہایت ممتاز خاتون محترمہ جناب خدیجۃ الکبریٰ رضؓ نے جو اپنی شرافت اور پاکیزگیٔ اخلاق کی بناپر ایام جاہلیت میں طاہرہ کے نام سے پکاری جاتی تھیں حضورؐ کو پیغام نکاح بھیجا۔ ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں اور اب بیوہ تھیں۔ اُس وقت حضورؐ کی عمر پچیس۲۵ سال کی تھی اور جنابہ طاہرہ کی عمر چالیس برس کی۔ اس زمانہ میں عرب میں عورتوں کی کمی نہ تھی۔ اور اگر کمی ہوتی بھی تو بھی خاندان ہاشم کے ایک ایسے بلند اخلاق نوجوان کے لئے جو حسن سیرت و صورت کے اعتبار سے منفرد تھا۔ برابر کے رشتوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی! لیکن حضورؐ نے شرافت و نجابت کے پیشِ نظر اس پیغام رفاقت کو قبول فرمایا اور یوں آپؐ کی عائلی زندگی کی ابتداء ہوئی جو آخیر تک ایسی خوشگوار اور رأفت و مودت اور سکینت و محبت کی آئینہ دار رہی کہ اس کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ حضرتِ خدیجہؓ دولتمند تھیں اسلئے اس سے آپ کے تجارتی کاروبار میں فروغ ہوا اور معاش کی طرف سے آپ کی زندگی مطمئن ہو گئی۔ قرآن کریم نے جہاں فرمایا ہے کہ۔

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى (۹۳/۸)

اور خدا نے تمہیں ضرورتمند پایا تو بے نیاز کر دیا۔

تو اس سے غالباً اسی تبدیلیٔ حالات کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بایں ہمہ آپؐ نے ایک متوسط مرفہ الحال کی زندگی بسر کی۔ رؤسائے قوم میں آپ کا شمار کبھی نہیں ہوا۔ چنانچہ آپکی بعثت کے خلاف مخالفین کی طرف سے یہ بھی اعتراض کیا گیا کہ اس منصب بلند کے لئے مکہ یا طائف کے رؤسا میں سے کسی کو کیوں منتخب نہیں کیا گیا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳/۳۱)

اور لوگ کہتے ہیں کہ دونوں آبادیوں (مکہ و طائف) میں سے یہ قرآن کسی بڑے
درئیس آدمی پر کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟

مجملاً یہ ہیں حضورؐ کے زمانۂ قبل از نبوت کی حیاتِ طیبہ کے جستہ جستہ کوائف و سوانح۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان کوائفِ حیات کی تفاصیل و جزئیات کتبِ تاریخ و سیر میں بکثرت موجود ہیں لیکن قرآن کریم نے ان تفاصیل کو بیان کرنے کے بجائے، اس پوری زندگی پر ایک ایسا تبصرہ کر دیا ہے جس کے بعد تفاصیل کی رُو سے استنباطِ نتائج کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ حضورؐ کے دعوئے رسالت کے بعد عرب کے ہر گوشے سے مخالفت کا ہجوم امنڈ آیا تھا

زندگی! دلیلِ صداقت

لوگ آتے اور اس نئے دعوے کی تائید میں دلیل طلب کرتے آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں حضورؐ کی طرف سے کیا دلیل پیش کی جاتی؟

سنیئے اور غور سے سنیئے کہ اس جامع اور مسکت دلیل کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی! وہ پوچھتے کہ ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ حضورؐ فرماتے کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا ہوں

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)

پھر دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر
ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

میں نے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم میری سابقہ زندگی سے اس امر کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؛ کیا میری زندگی میری صداقت کی زندہ شاہد نہیں؟ کیا تم میری اس چالیس سالہ زندگی میں جس کا ایک ایک لمحہ تمہارے اندر بسر ہوا ہے۔ کوئی ایک واقعہ بھی ایسا پیش کر سکتے ہو جس سے میری صداقت کے متعلق ذرا سا شبہ بھی گذرے؟ کیا میری اس تمام زندگی میں کہیں حرف گیری کی کوئی گنجائش ہے؟

یہ چیلنج پوری کی پوری قوم کو دیا گیا اور اس کے خلاف کسی نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ کسی کی زندگی کے آئینہ صفت ہونے کی اس سے بڑھ کر شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں کے ہجوم میں اس زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کر دیا جائے اور اس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جائیں! یہ شہادت صرف اُس زمانہ کے قریش کے سامنے ہی پیش نہیں کی گئی بلکہ چودہ سو سال سے ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اور اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ آج تک کسی طرف سے بھی اس کو جھٹلایا نہیں گیا بلکہ دشمنوں تک کو اس زندگی کی پاکیزگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ سر ولیم میور جیسا متعصب مصنف بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ

ہماری تمام تصنیفات، محمد (صلعم) کے بارے میں، ان کی عصمتِ اخلاق اور پاکیزگی اطوار پر جو اہل کہ میں کمیاب تھی، متفق ہیں۔

Life of Mohammad

یہ تھا دیباچہ اس کتاب زندگی کا جسے خود زندگی کو ایک نئی تفسیر عطا کرکے دنیا بھر کے انسانوں کے لئے نمونہ بننا تھا۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى

طلسم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگارہ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

عہدِ جاہلیت کی ہنگامہ خیزیاں

قلبِ وادیٔ فاران یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ، ہر عاکف و باد کے لئے مرکز، قلب و نظر بنا ہوا ہے چونکہ ریگِ حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حریم کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے طفلک و برنا و پیر، نزد و دور سے کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپنے والے سجدوں کے نذرانے لئے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجع انام کی طرف چلے آرہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلبِ نیاز، جذبہ ہائے تعبّد و تذلّل سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو علم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے اس کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام اور سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنج گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ اُدھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیان اپنی سحر آفرینوں سے ہر سننے والے کے دل کو اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرہ سے اس کے طرۂ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزمِ شعر خوانی آن کی آن میں رزمگاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفلِ عیش و طرب ہے یا میدانِ جنگ و جدل، ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہمہ اور طنطنہ میں دنیا و ما فیہا سے بے خبر، یوں مستغرق ہو جاتا ہے کہ کوئی کشش اسے ان ہنگامے

سے باہر نہیں لے جاسکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد عورت، سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں گویا یہ چیزیں ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

ایک استثناء!

لیکن مکہ کی ان پر ہجوم گلیوں میں ہمیں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت۔ وضع قطع۔ تراش خراش سب ان ہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جنکی پرورش بطریقِ احسن کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کوئی خلا سا محسوس کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب جو اس کی قوم کا جزوِ زندگی بن چکے ہیں۔ اس کے لئے اپنے اندر کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجود رقصاں لیکر حریمِ کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہ ان تابندہ گوہروں کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ اُسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی کوئی چوکھٹ اس متاعِ گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتی۔ وہ جب انسانوں کی گردنوں کو ان کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے تو محوِ حیرت رہجاتا ہے کہ ——
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہ ہو وہ باعثِ فخر و تکبر بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کیطرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کی فطرتِ سلیم ابا کرتی ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم تک نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن نظر آتے ہیں۔

تلاشِ حقیقت

وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی سامانِ تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء دمشق سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہکر پکارتے ہیں لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے ایسے رنگین فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ آتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کیطرف رخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اُسے تلاش ہے لیکن اسے ان کا ذوقِ تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آجاتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اُکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اُٹھتا ہے کہ ؎

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

تفکر و تدبر وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اُسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و تفکر دیتی ہے اور گاہ ماہِ عالمتاب کی درخشندگی اس کے لئے سامان تدبر و تبصرہ پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہر فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا ہے اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آگیا؟ کون اسے بایں حسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اتنا ہے کہ وہ اس کاوش و اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات۔ بال بچوں کی نگہ پرداخت، رفقا و احباب سے میل ملاقات، معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مدّاح ہیں اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں اور قوم اور خاندان کو اس کی شرافت و اصالت پر ناز ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے اس لئے کہ جن گوشوں کو انھوں نے اپنے لئے وجہ اطمینان اور موجب تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے دل کے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا اور وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بیقرار پاتا ہے جس کا اُسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے۔!

قرآن کریم نے حضورؐ کی تلاش حقیقت میں سرگردانی کی اس کیفیت کو دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھدیا ہے جب فرمایا کہ

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ﴿۹۳ ؍ ۷﴾

ہم نے تجھے تلاش حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

اس تلاش حقیقت میں حضورؐ کا معمول ہو گیا تھا کہ آپ کھانے پینے کا سامان ساتھ لیکر مکہ سے تین میل باہر ایک غار میں جسے حِرا کہتے ہیں تشریف لیجاتے اور ان مسائل حیات پر جو ہر وقت آپ کے لئے وجہ کاوش رہتے غور و فکر کرتے

لہ زمانۂ قبل از نبوت میں حضرت عیسیٰؑ کی اس سرگردانی و بیقراری کے متعلق دیکھئے معارف القرآن جلد سوم صفحہ ۲۹۰ اور مثالیؑ کے اس مفہوم کے لئے دیکھئے جلد سوم، باب بنی اسرائیل صفحہ ۳۵۵

عینی نے اس اعتکاف کو "تفکر و اعتبار" سے تعبیر کر کے حقیقت کیطرف اشارہ کیا ہے۔ اور کارلائل نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔

میں کیا ہوں ؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے۔؟

زندگی کیا ہے۔؟

موت کیا ہے ؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہیئے ؟

مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟

حرا اور سینا کی پہاڑیاں۔ ریت کے ٹیلوں کا سکوت۔ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ چرخ چنبریں اور اس کے درخشندہ ستارے بھی کچھ جواب نہیں دیتے تھے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی اس وحی سے ملتا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنالے۔ Heroes and Hero Worship; p. 49

ہاں ! ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ حقیقت کا انکشاف ناممکن ہے جب تک حقیقت خود اپنے آپ کو کسی پر منکشف نہ کردے۔ مسائل حیات نہیں سمجھے جا سکتے جبتک حیات خود ہی "شارح اسرار حیات" نہ ہو جائے۔ انسان کی فطرت سلیم سے یہ تو ممکن ہے کہ وہ "من دون حقیقت" مقامات کی نگہ فریبیوں کو بھانپ لے اور اس لئے باطل کی ان جاذبیتوں سے منہ موڑ کر چل دے۔ لیکن اس سے یہ ممکن نہیں کہ از خود حقیقت کا مشاہدہ کرلے۔ وہ ہر آفل معبود سے انکار کر سکتی ہے لیکن معبود حقیقی تک از خود نہیں پہنچ سکتی۔ وہ لَآ کی وادیوں میں سرگردان پھرتی ہے لیکن اِلَّا تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے انسان کی آنکھ وحی کی روشنی کی محتاج ہے۔[1] اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت قبل از رسالت حضورؐ کی تھی۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵۲)

[1] تفصیل جلد دوم۔ عنوان وحی میں گذر چکی ہے۔

اور اے محمد! اسی طرح ہمنے (قانون وحی کے مطابق) تیری طرف بھی اپنے حکم سے ایک کتاب (روح) بطور وحی کے نازل فرمائی (جس نے تجھ پر حقیقت کو منکشف کردیا۔ ورنہ) اس سے پہلے تجھے قطعًا معلوم نہ تھا کہ کتاب (الہٰی) کیا ہوتی ہے اور ایمان کس چیز کا نام ہے۔ لیکن (وحی کے بعد) ہم نے اس کتاب کو ایک (عظیم القدر) روشنی بنادیا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں (حقیقت کا) راستہ دکھادیتے ہیں۔ اور (اے پیغمبر! یہ ہماری اس عطا فرمودہ روشنی ہی کا صدقہ ہے کہ) تو (گم کردہ راہ لوگوں کو) سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کررہا ہے۔

نہ جانتے تھے۔ نہ اس کی کوئی توقع ہی تھی۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ (۲۸/۸۶)

اور اے پیغمبر! تجھے کسی طرح یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ (ہماری طرف سے) تجھ پر کوئی کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ تو محض تیرے پروردگار کی ایک رحمت ہے (کہ اس نے تجھے اس عظیم منصب کے لئے منتخب فرمالیا)، تو اب ہرگز ہرگز تو منکرین (حقیقت) کا پشت پناہ نہ بن جائیو!

اس کتاب کے ذریعہ حضور کو ان حقائق کا علم دیا جنکے متعلق آپؐ پہلے کچھ نہیں جانتے تھے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ...... (۴/۱۱۳)

اور (اے پیغمبر) خدا نے تمہیں وہ باتیں سکھلادیں جو پہلے معلوم نہ تھیں

٭

نظامِ فطرت کا ایک گوشہ

ذرا نظام فطرت کے ایک اہم گوشے کی طرف غور کیجئے۔ حرارتِ آفتاب زمین کی تمام رطوبتوں کو جذب کرلیتی ہے۔ شدتِ تمازت سے نبضِ خس ساکت ہوجاتی ہے۔ لہلہاتی شاخوں سے زندگی کی ہر رمق خشک ہوجاتی ہے۔ صحن گلشن میں روئیدگی کی لطافت کا کہیں نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ ہر حساس آنکھ رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی ہے لیکن کہیں اسکی بدلی دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے کہ ابھی جگرِ ارض کی شدتِ تشنگی اس حد تک نہیں پہنچی جہاں وہ دامنِ سحابِ کرم کو ہاتھ بڑھا کر کھینچ لے۔ جب یہ تقاضا اپنی انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو ابرِ بہار بشاشت و شگفتگی کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے اس زمین مردہ کی طرف کشاں کشاں آتا ہے اور اپنی گہر افشانیوں سے کوہ و دامن اور دشت و صحرا کی جھولیاں بھردیتا ہے۔ (تفصیل اس حقیقت کی "صبح بہار" کے عنوان میں گذرچکی ہے)

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۚ حَتّٰى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۚ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۷/۵۷)

اللہ کی ذات وہ ہے جو (زمین کے جُھلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اُسکے سحابِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر وہ پانی سے لدے ہوئے بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لاتی ہیں جن سے ہم اجڑی ہوئی بستیوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اور بادلوں سے جو پانی برستا ہے اس سے قسم قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح ہم موت کے بعد زندگی عطا کرتے ہیں تاکہ تم (ان مثالوں سے) عبرت و موعظت حاصل کر سکو۔

نقاب کشائی حقیقت

رسالت ایک موہبت کبریٰ تھی جس کے لئے حضورؐ کی ذاتِ گرامی کو شروع ہی سے منتخب کر لیا گیا تھا لیکن مبدأ فیض جس قلبِ منور کو وحی کے عظیم القدر متاعِ گرانبہا کا امین بنانا چاہتا ہے اس کی تربیت خاص اہتمام سے کی جاتی ہے۔ یہ تدبر و تفکر کی منزلیں جنھیں ہم گذشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ سوز و گداز۔ یہ تپش و خلش۔ یہ کاوش و کاہش۔ یہ تفحص و تجسس۔ تلاشِ حقیقت میں یہ دشت نوردیاں اور صحرا پیمائیاں دنبالِ محمل میں یہ آبلہ پائی اور تشنہ لبی۔ ادھر یہ ولولۂ شوق اور یہ جوشِ تمنا۔ اور اُدھر یہ سکوتِ صبر آزما اور یہ خامشیٔ جانکاہ۔ یہ سب مراحل جانگداز و جگر سوز اس لئے تھے کہ اس پیکرِ آب و گل میں وہ سیرتِ فولادی پیدا ہو جائے جس سے وہ اس انقلاب آفریں پیغام کے حامل بننے کا اہل ہو جائے جس کے لئے زمانہ اس کے انتظار میں چشم براہ تھا۔ چنانچہ جب یہ طلبِ صادق اپنی شدت میں انتہا تک پہنچ گئی اور مشیت کے اندازوں کے مطابق اس نگہ شوق میں تابِ نظارہ پیدا ہو گئی تو عروسِ حقیقت اپنے حریم قدس سے بصد شانِ زیبائی و رعنائی، نور و نکہت کی ہزاروں دنیائیں اپنے جلو میں لئے حرا کی تاریکیوں میں جلوہ بار ہوئی۔ اور اس کے حسین چہرے سے اسطرح نقاب اٹھا کر اس کے تبسم سے کائنات جگمگا اٹھی (وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا) اور ایک ہی لمحہ میں یہ دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔

یہ حضورؐ کی عمر کا چالیسواں سال تھا، رمضان کا مہینہ (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ۲/۱۸۵) اور رات کا وقت۔ رات اس لئے کہ ساری دنیا جہالت کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی اور طلوعِ سحر کی منتظر۔ یہ رات تاریخِ عالم میں عدیم النظیر اور فقید المثال رات تھی۔ یہ حدِ فاصل تھی دنیائے قدیم اور جہانِ نو میں۔ اس رات، ضمیرِ کائنات نے ایک نئی کروٹ لی جس سے دنیا جاگ اٹھی (وہ دنیا جو اپنے مقام سے بیخبر چلی آ رہی تھی۔ خود نگر و خود شناس ہو گئی۔ تمام نظامہائے کہن جو غیر فطری بنیادوں پر استوار تھے، باطل قرار پا گئے اور دنیا کو ایک نیا آئین عطا ہوا جس میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کی تمام راہیں واضح طور پر سامنے آ گئیں۔ انسان کو حق و باطل کی تمیز کے صحیح پیمانے عطا ہوئے۔ اس لئے یہ رات صحیح معنوں میں

لیلۃ القدر (پیمانوں کی رات) تھی۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَامٌ قف.. هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

(اے پیغمبر!) ہم نے اس قرآن کو عظیم المرتبت (پیمائش کی) رات میں نازل کیا ہے۔ اور تجھے معلوم بھی ہے کہ وہ عظیم المرتبت رات کونسی ہے؟ وہ عظیم المرتبت رات جو ایک ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے جس میں اپنے پروردگار کے حکم سے فرشتے اور کتاب الٰہی (روح) نازل ہوتی ہے جو تمام (انسانی) معاملات (حیات) سے متعلق ہے۔ اُس رات سلامتی ہی سلامتی ہے حتٰی کہ نورِ سحر آئینہ پاش ہو جاتا ہے

ایسے پیمانے (قدر) جو خیر و شر کا معیار تھے۔ جن سے کھوٹا اور کھرا نکھر کر الگ الگ ہو جاتا تھا اور یہ خدا کی رحمت تھی کہ اس نے انسان کو ایسے پیمانے عطا کر دیئے۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۝ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۴۴)

بلاشبہ ہم نے (اے پیغمبر!) قرآن کو ایک بابرکت رات میں نازل کیا ہے۔ کیونکہ ہم درحقیقت ہمیشہ سے (نوعِ انسانی کو اس کے انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والے رہے ہیں (وہ رات ایسی بابرکت رات ہے کہ) اس میں ہر مبنی برحکمت معاملہ کو متمیز کر دیا جاتا ہے (کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ ہو جائے، یہ (کتاب الٰہی) ہماری طرف سے ایک حکم ہے (کیونکہ) ہم ہی (رسولوں، فرشتوں اور کتابوں کو) بھیجنے والے ہیں۔ (اس کتاب کو تجھ پر نازل کر دینا، اے پیغمبر! تیرے پروردگار کی ایک رحمت ہے۔ کیونکہ وہ ہی حقیقۃً (بھٹکنے والوں کی پکار کو) سننے والا اور (مقتضیاتِ انسانی کا) جاننے والا ہے۔

دنیا نے اس رات کی صحیح عظمت کو نہیں پہچانا، اسی لئے وہ ابھی تک تاریکیوں کے جہنم میں ڈوبی ہوئی ہے اور ہزار ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود زندگی کے صحیح راستہ پر گامزن نہیں ہو سکی۔ جس دن یہ حقیقت اس کی سمجھ میں آ گئی کہ کائنات کی شبِ دیجور کی تاریکیاں اس مہر عالمتاب کی ضوفشانیوں سے دور ہو سکتی ہیں جو اس لیلۃ القدر کی صبح کو نمودار ہوا تھا، منزلِ انسانیت کی سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) اس کے سامنے آ جائیگی۔ راستہ اب بھی موجود ہے اور وہ مہر عالمتاب اپنی پوری تابندگی سے نور افشاں بھی۔ صرف اتنی کمی ہے کہ انسان نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں جس سے وہ اس روشنی سے محروم ہے۔ جس دن اس نے

نوعِ انسانی کے لئے جشنِ مسرت

اپنی آنکھیں کھول لیں۔ سیدھا راستہ اسکے سامنے آ جائیگا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کے واقعۂ عظیمہ کو

نوعِ انسانی کے لئے جشنِ مسرت قرار دیا ہے کہ اس سے دنیا کو اس کی چھنی ہوئی بینائی واپس ملی تھی۔ اور کسی اندھے کی زندگی میں اس واقعہ سے زیادہ قابلِ یادگار اور کونسا واقعہ ہوگا جس میں اس کی بصیرتِ رفتہ کی بازیابی ہوئی ہو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ ○ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ (۱۰ / ۵۷-۵۸)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے، دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے، اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں (اے پیغمبر!) تم کہو، یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ کی رحمت ہے پس چاہیے کہ اس پر خوشی منائیں۔ اور یہ اُن ساری چیزوں سے بہتر ہے جسے وہ دنیا کی زندگی میں جمع کرتے رہتے ہیں!

ہاں! تو یہ تھی وہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ جس کی صبح کو یہ آفتابِ ہدایت ورشادت طلوع ہوا۔

ۨ

ادراکِ حقیقت کے بعد

حضورؐ کی زندگی کا یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ہر چند آپؐ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں تھے لیکن ادراکِ حقیقت کے تجربہ سے تو آشنا نہ تھے۔ جب اس مبدأ فطرت کی طرف سے جس کی فیض گستری کا یہ عالم ہے

کہ شعلہ شعلہ بخشد، شرر شرر ندہد

حقیقت اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ یوں بے نقاب ہو کر سامنے آئی تو فرطِ حیرت سے آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی جس کا ہم صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ حقیقت کا براہِ راست مشاہدہ صرف خاصۂ نبوت ہے اس لئے غیر از نبی کوئی بھی اس کیف سے لذت آشنا نہیں ہوسکتا۔ اور جب لذت آشنا ہی نہیں ہوسکتا تو اسے بیان کیا کرسکتا ہے۔ ہم اس کے متعلق صرف اسی قدر سمجھ سکتے ہیں جس قدر لسانِ نبوت سے ہمیں سمجھایا جائے۔

صبح کو آپ مکان پر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اس نادر واقعہ کا ذکر فرمایا۔ یہاں ہمارے سامنے

شاہدِ عادل (۱) بیوی

ایک اور عظیم الشان حقیقت آتی ہے۔ بیوی، مرد کی زندگی کی شکن در شکن تہوں سے واقف ہوتی ہے۔ اس کا کوئی راز اس سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ وہ ساری دنیا کے سامنے نقاب پوش رہ سکتا ہے لیکن بیوی کے سامنے اس کی زندگی بے نقاب ہوتی ہے۔ انسان ساری دنیا کی نگاہوں میں ہیرو بن سکتا ہے کہ زندگی کے بہت سے گوشے دنیا سے چھپائے جاسکتے ہیں لیکن اصلی ہیرو وہ ہے جو اپنی بیویؐ کی نگاہ میں ہیرو ہو۔ حضرت خدیجہؓ نے شب کا ماجرا سنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لہ (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

فوراً اس کی صداقت پر ایمان لے آئیں۔

(۱۱) نوکر اور بچے بیوی کے بعد انسان کی بے نقاب زندگی کا مشاہدہ کرنے والے گھر کے نوکر اور بچے ہوتے ہیں۔ حضرت زیدؓ آپ کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضرت علیؓ ابن ابی طالب حضورؐ کے آغوشِ تربیت کے پرورش یافتہ۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد انھوں نے سنا تو فوراً نگہِ عقیدت جھکا کر ایمان لے آئے۔

(۱۱۱) دوست گھر کے باہر انسان کے کیرکٹر کا صحیح پرکھنے والا اس کا قلبی دوست ہوتا ہے جس کے سامنے اس کی زندگی کا بے تکلف پہلو ہوتا ہے۔ حضورؐ کے یہ دوست حضرت ابوبکرؓ۔ دولتمند فیاض۔ نہایت صائب الرائے۔ اور قریش میں معزز اور تمام شہر میں با اثر۔ صدق و دیانت میں مشہور۔ اپنی پارسائی کیوجہ سے ممتاز۔ جب دوست کے اس نئے دعوے کو سنا تو بلا ادنیٰ تأمل بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

کس قدر ثریا بخت اور فرخندہ اختر تھے یہ حضرات جنھیں قدوسیوں کی اس جماعت میں شرکت کی اولیت بلکہ یوں کہئے کہ اس جماعت کے بنی‌ٔ اساس ہونے کا شرف حاصل ہوا جسے دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کرنا تھا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ اس کے بعد کچھ اور خوش نصیب حضرات اپنے جذبۂ شوق سے باب رسالت تک کشاں کشاں آئے اور متاعِ ایمان و آگہی سے بہرہ یاب ہوئے۔ ان میں سے اکثر وہ حضرات تھے جو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے یہ نئی آواز سنی تو ان کی فطرتِ صالحہ نے اسے فوراً پہچان لیا اور حق و صداقت کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ حضرت عثمانؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، سعد بن وقاصؓ، طلحہؓ، ارقمؓ، سعیدؓ بن زید، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوبکرؓ کی ترغیب سے اس جماعتِ حقہ میں شامل ہوئے۔ یہ سب تبدیلی خاموشی سے ہو رہی تھی کیونکہ اس دعوت کی آواز ابھی بلند نہیں کی گئی تھی۔ یہ ایمان و اقرار، دلوں کا جھکاؤ اور نگاہوں کی تسلیم تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور پختہ عہدِ وفا ہوتا بھی کونسا ہے!

یک نگہ۔ یک خندۂ دزدیدہ یک تابندہ اشک
بہر پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

؎ (۱۱ کا حاشیہ) اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ اس باب میں بیوی کا سلیم الفطرت ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی حالت اس سے پیشتر (جلد دوم اور سوم میں) ہماری نگاہوں سے گذر چکی ہے۔

قُمْ فَأَنْذِرْ

خیز و بخاکِ تشنہ بادۂ زندگی فشاں!

ایک سچا رسول وہ ہے جس کے پاس (نوعِ انسانی کے لئے) کوئی پیغام ہو۔ وہ جس کی روح میں اُس زمانہ کے اہم مسائلِ حیات اضطرابی کیفیت پیدا کردیں اور ان مسائل و مباحث کی اہمیت اسے دعوت اور پکار پر مجبور کردے۔

وہ جس کا پیغمبرانہ الہام اس کے محکم اور پائندہ ایمان اور جذبۂ صادقہ کا فطری اور لابدی مظاہرہ ہو۔

Mohammad - the Man and his faith;
By Tor Andre

حقیقت کا کلی ادراک خاصۂ نبوت ہے اور یکسر وہبی۔ اکتسابی طور پر ادراکِ حقیقت کی جو کوششیں کی جاتی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ اتنا ہو سکتا ہے کہ حقیقت کے کسی ایک پہلو (Aspect) کی جھلک دکھائی دے جائے غیر از نبی اس کو مدارجِ انسانیت کا معراجِ کمال سمجھکر تحیر کی وادیوں میں کھو جاتا ہے۔ اس کا یہ تجربہ یکسر انفرادی ہوتا ہے اور نوعِ انسانی کے لئے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا۔ برعکس اس کے ایک رسول کو حقیقت کا مشاہدہ کرایا ہی اسلئے جاتا ہے کہ وہ ضمیرِ کائنات سے اس پیغام کو اپنے ساتھ لائے جس سے انسانوں کی دنیا میں انقلاب پیدا ہو جائے اور اس صورِ اسرافیل سے مردوں کی بستی میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے۔ تفصیل ان امور کی (جلد دوم) عنوانِ وحی میں گذر چکی ہے۔ مقصدِ پیشِ نظر کی وضاحت کے لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مقام سے علامہ اقبالؒ کے خطبات کا متعلقہ اقتباس یہاں درج کر دیا جائے تاکہ ان تفاصیل کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے اور جن حقائق کو ہم آیندہ سطور میں پیش کرنا چاہتے ہیں ان کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ علامہ اقبالؒ نے تشکیلِ جدید میں اپنے پانچویں خطبہ کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔

"محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچکر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا"۔ یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (حضرت

عبد القدوس گنگوہیؒ کے ہیں۔ تصوف کے لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرہ کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت، تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ' آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحب وحی کے "تجربہ" کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے۔ اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔ (خطبات صہ۱۸۱)

عظیم الشان فریضہ

غارِ حرا کی تنہائیوں میں حضورؐ کی معتکفانہ زندگی ایک انفرادی تجردگاہ کی زندگی تھی لیکن جب حقیقت نے آپؐ پر تماماً و کمالاً اپنا انکشاف کیا تو اس سے مقصود یہ نہیں تھا کہ آپ اس کیف و مستی کے عالم میں جذب ہو کر خلوت گزینی اور زاویہ نشینی کی زندگی اختیار کر لیں۔ رموزِ کائنات کے پردے اٹھ جانے سے آپ پر ایک عظیم الشان ذمہ داری عائد ہو گئی اس لئے ندائے جمال نے آپ کو پکارا اور کہا کہ

یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ (۷۴/۱-۳)

اے (تمام دنیا کے) درست کرنے والے اٹھ اور (نوعِ انسانی کو غیر فطری زندگی کے انجام و عواقب سے) آگاہ کر۔ اور اپنے پروردگار کی کبریائی کا اعلان کر (تاکہ اس انسان میں خود عظمت و کبریائی کے صفات پیدا ہو جائیں)

ل‍ه رَبَّكَ فَكَبِّرْ دائیں سے بائیں طرف اور بائیں سے دائیں طرف، دونوں صورتوں میں رَبَّكَ فَكَبِّرْ پڑھا جاتا ہے۔ یہ صرف ایک لفظی رعایت ہے لیکن معنوی طور پر بھی خدا کی بڑائی میں خود شرفِ انسانیت کی بڑائی مضمر ہوتی ہے ۲ه اِدَّثَرَ کے معنی درست کرنے کے ہیں (منتہی الارب)

اور نمایندۂ عصر کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا حکم تھا۔ آپ کی دعوتِ انقلاب کی ابتدا، ہرچند ایک خاص مقام سے ہوئی تھی (کہ ہر تحریک کی ابتدا کے لئے مقام کا تعین ضروری ہے) لیکن اس تحریک کی وسعتیں حدود فراموش تھیں اور یہ درحقیقت باطل کی ہر روش کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا کہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی بلا تعیین زمان و مکان تمام عالم انسانیت سے استیصالِ باطل اور استحکامِ حق تھا۔

یہ تھا وہ انقلاب آفریں پیغام جسے لیکر آپ حرا کی خلوتوں سے دنیا کی جلوتوں کی طرف تشریف فرما ہوئے وہ پیغامِ حریت آموز جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

زندگی را می کند تفسیرِ نو می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو
بندہا از پا کشاید بندہ را از خداوندی رہاید بندہ را
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را از حرم بیروں کند اصنام را

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۳)

اللہ اسی طرح مردوں کو زندگی بخشتا، اور تمہیں اپنی (قدرت و حکمت کی) نشانیاں دکھلاتا ہے تاکہ فہم و دانش سے کام لو!

پہلی دعوتِ حیات بخش

ذمہ داریوں کی اس دنیا کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے حضورؐ بستی کی طرف تشریف لائے اور صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا یَا صَبَاحَاہ عرب میں یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ پر دفعۃً قتل و غارتگری کیلئے ٹوٹ پڑے۔ یہ لفظ سنکر تمام لوگ چونک اُٹھے اور آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یا مَعْشَرِ قریش!

اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو تم کیا میری اس بات کو سچ مانوگے؟ [۱]

انھوں نے بیک زبان کہا کہ ہم نے آج تک کبھی کوئی غلط بات تمہاری طرف سے نہیں سُنی۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ تو صادق اور امین ہے، اس لئے تمہاری بات کو ضرور سچ مانیں گے۔ اس پر آپ نے فرمایا میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ تمہاری موجودہ روشِ زندگی سے تم پر ایک سخت عذاب آنے والا ہے جسے یوں سمجھو کہ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ اس پر ابو لہب نے نہایت استخفاف سے کہا کہ کیا ہم سب کو اسی لئے جمع کیا تھا؟ یہ کہکر وہ چلا آیا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ یہ قریش کی طرف ایک

---

[۱] بخاری جلد دوم۔

عمومی دعوت تھی۔

مقام نبوّت کی وضاحت

ذرا اس دعوت کے انداز پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ نبی اکرم نے مقام نبوت کی وضاحت کیسے دلنشین انداز سے فرمائی ہے۔

نبی کے معنے ہی ہیں مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔ آپ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ سکتے ہیں۔ مخاطبین کا گروہ پہاڑ کے دامن میں ہے جہاں وہ صرف پہاڑ کے ایک طرف دیکھ سکتا ہے۔ لہذا جو شخص ایسے مقام پر کھڑا ہو جہاں سے پہاڑ کی دوسری سمت بھی نظر آرہی ہو وہ دوسری طرف کے ماجریات و واقعات کو آنکھوں دیکھکر بتا سکتا ہے۔ اور اگر مخاطبین کو اس کی صداقت پہ ایمان ہے تو اس کی کسی بات میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ نبی بھی خدا کی طرف سے ایک ایسے مقام بلند پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ انسانی اعمال کے حال (present) کے ساتھ ساتھ ان کے انجام و عواقب کا مستقبل (Future) بھی دیکھ سکتا ہے۔ سورۂ والنجم کو دیکھئے کس طرح پکار پکار کر اس حقیقت عظمیٰ کو واشگاف کر رہی ہے۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ (۵۳/۱)

ستارہ شاہد ہے! جب وہ نیچے کی طرف جاتا ہے۔

مقام بلند پر پہنچکر ڈوبنے والا ستارہ، جو ہمیشہ تمہارے لئے دلیل[1] راہ بنتا ہے اور اس راہ نمائی میں نہ کبھی خود غلطی کرتا ہے نہ تمہیں دھوکہ دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بے چون و چرا اس راستہ پر گامزن رہتا ہے جو قانون فطرت نے اس کے لئے متعین کر دیا ہے اور اپنی مرضی سے مختلف راستے اختیار نہیں کرتا رہتا۔ اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ (۵۳/۲)

تمہارا رفیق (محمدؐ) نہ غلط راہ چل رہا ہے نہ بہک گیا ہے۔

اس لئے کہ اس نے اپنی راہ اپنے وہم اور اپنی خواہشات کے تابع وضع نہیں کی بلکہ وہ تو اس ستارہ کی طرح خود فطرت کے متعین کردہ راستہ پر چل رہا ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۵۳/۳-۴)

وہ خود اپنی خواہش سے نہیں بول رہا ہے بلکہ وہ تو صرف خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہے (جو وہ تم تک پہنچا رہا ہے)

[1] عرب اور ازمنۂ قدیمہ کی تمام رہ نورد قومیں، ہمیشہ ستاروں سے راہ نمائی کا کام لیتی تھیں۔

قُمۡ۔ اٹھ! کہ تیرے قیام میں نوعِ انسانی کا قیام مضمر ہے۔ اور قیام انسانیت ہی تخلیق کائنات کا مقصود ہے۔ انسانوں کی پوری بستی پر موت کی سی افسردگی طاری ہو چکی ہے۔ دنیا میں زندگی کی کوئی رمق کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اٹھ! اور خونِ رگِ کائنات میں ایک تموج پیدا کر دے۔

خیز و بخاکِ تشنۂ بادۂ زندگی فشاں!

انقلاب! نظام عالم درہم برہم ہو چکا ہے۔ نوعِ انسان، وحدتِ خلق کا بنیادی اصول بھلا کر رنگ، نسل، وطن، زبان کی غیر فطری حدود و ثغور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے جس سے یہ دنیا، انسانوں کی بستی کے بجائے خونخوار درندوں کا بھٹ بن چکی ہے۔ اُٹھ! اور فطرت کا فراموش کردہ آئین پھر ان کی نگاہوں کے سامنے لا۔

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

قبائل و شعوب اور اقوام و ملل ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی ہیں۔ یہ خاکدانِ ارضی جسے امن و سلامتی کی جنت بننا تھا، انسانی سبعیت و بربریت کے ہاتھوں ہلاکت و بربادی کا شعلہ بار جہنم بن رہا ہے۔ اُٹھ! اور اس جہنم کی انسانیت سوز آتش فشانیوں کو، اپنے عالمگیر سحاب اخوت و مودت کے ترشح سے برد و سلامتی کی جنت بنا دے۔

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

ملوکیت اور سرمایہ پرستی کی اغراض ملعونہ نے انسانوں کی گردنوں میں اپنی چیرہ دستیوں کے اطواق و سلاسل پہنا رکھے ہیں۔ احبار و رہبان کی انسان فروش برہمنیت نے خدا اور بندے کے درمیان آسمان بوس دیواریں حائل کر رکھی ہیں۔ ذرّے کو خورشید سے کوئی نسبت نہیں رہی۔ عابد اور معبود میں کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ سنگِ آستانِ حرم سجودِ اہل نیاز سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ قلوب کے رشتے منقطع ہو گئے ہیں۔ تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ چکا ہے۔ اُٹھ! اور دنیا میں ان تمام طاغوتی قوتوں کو پامال کر کے انسان اور انسان اور خدا اور بندے میں فطری اور حقیقی تعلق پیدا کر دے۔

باز ایں اوراق را شیرازہ کن
باز آئینِ محبت تازہ کن

اُٹھ! اور اس انقلاب آفریں دعوتِ حق و صداقت سے کوہ و جبل اور دشت و صحرا کی فضا میں حیات انگیز تحرک پیدا کر دے جس سے تمام نظامہائے کہن کی بنیادیں ہل جائیں اور ان کی جگہ دنیا میں وہ نظام عدل و حریت قائم ہو جائے جس سے انسانیت کو اس فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی ملے اور وہ ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنی معراج

کبریائی تک جا پہنچے جہاں نمایندگان عالم ملکوت، جنت سے نکالے ہوئے آدم کا استقبال اس پیغام تبریک و تہنیت سے کریں کہ

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳)

یہ وہی جنت ہے جس کا تمہیں ان اعمال (صالحہ) کی وجہ سے وارث قرار دیا گیا ہے۔

جو تم (اپنی دنیوی زندگی میں) کرتے رہتے تھے!

مثیل موسےؑ

جلد سوم میں تذکرہ حضرت موسےؑ کو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ جب جلوہ گاہ طور پر جناب کلیم اللہ کو ارشاد ہوا ہے کہ

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۲۴)

فرعون کی طرف جاؤ، کیونکہ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

تو آپ نے اس عظیم الشان مہم کے سر کرنے کے لئے بارگاہ ایزدی سے توفیق اور ہمت کی دعا مانگی اور عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ (۲۰/۲۵-۳۵)

موسیٰ نے عرض کیا "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے (کہ بڑے سے بڑا بوجھ اٹھانے کیلئے مستعد ہو جاؤں) میرا کام میرے لئے آسان کر دے (کہ راہ کی دشواری بھی غالب نہ آسکے) میری زبان کی گرہ کھولدے کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جاؤں، اور) میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے۔ وہ میرے کام میں میرا شریک ہو۔ ہم (دونوں یک دل ہو کر) تیری پاکی اور بڑائی کا بکثرت اعلان کریں۔ تیری یاد میں زیادہ سے زیادہ لگے رہیں۔ اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے (ہم سے کسی حال میں غافل نہیں)

اس درخواست کے جواب میں اس عتبۂ عالیہ سے ارشاد ہوا۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (۳۶)

ارشاد ہوا۔ اے موسےؑ! تیری درخواست منظور ہوئی۔

حضرت موسیٰؑ کو صرف ایک فرعون مصر کی طرف جانے کا حکم ملا تھا لیکن رسول کَآفَّةً لِّلنَّاس کے لئے تمام فراعنۂ دہر

وہ اس کی اپنی آواز نہیں ہے بلکہ خدائی آواز ہے جو اس تک پہنچائی جا رہی ہے اور جو فطرت کے سربستہ رموز و حقائق اس پر وا شگاف کر رہی ہے۔ ان تمام معارف کا سرچشمہ وہ ذات ہے جو شدید القوٰی اور غالب الامر ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ (۵۳/۵-۶)

اس زبردست طاقتوں کے مالک (خدا) نے اُسے تعلیم دی ہے جو قوت و شوکت والا ہے۔

اس علم الٰہی کی بنا پر یہ رسول کائنات کے افق اعلیٰ پر متمکن ہے۔

فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ (۵۳/۶-۷)

چنانچہ اس نے کمال (علم) کو حاصل کر لیا اور (اب) وہ (کائنات کے) بلند ترین مقام پر فائز ہے۔

بلکہ اس سے بھی بلند مقام پر

ثُمَّ دَنَا ۝ (۵۳/۸)

پھر وہ قریب تر ہوتا چلا گیا۔

لیکن مقامات کی ان بلندیوں اور مناصب و مدارج کی ان رفعتوں نے اس کے دل میں تکبر نہیں پیدا کر دیا بلکہ جوں جوں اس کے مراتب بلند ہوتے جاتے ہیں وہ اُس آستانۂ عالیہ کے سامنے اور جھکتا جاتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو پا گیا ہے کہ معراجِ زندگی اپنے آپ کو اس حقیقتِ کبریٰ سے ہم آہنگ کر لینے کا نام ہے۔

فَتَدَلّٰى[1] (۵۳/۸)

پس پست ہوتا چلا گیا۔

اس لئے کہ اپنے مقامات کی بلندی سے ذاتِ خداوندی کی کبریائی اور واضح طور پر اس کے سامنے آتی جاتی ہے اس لئے وہ اور زیادہ جھکتا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ حقیقت کے بہت قریب آگیا بقدر دو کمان۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (۵۳/۹)

چنانچہ وہ دو کمانوں کی مسافت پر رہ گیا بلکہ اس سے بھی قریب تر۔

علم کی ان بلندیوں اور عبودیت کی ان انکساریوں کے بعد وہ اس قابل ہوا کہ اس پر حقائق الٰہیہ کو بے نقاب کیا جائے۔

[1] فتدلیٰ کا دوسرا مفہوم وہ بھی ہے جو عنوانِ زیرِ نظر کی ابتدا میں علامہ اقبالؒ کے اقتباس میں بیان ہوا ہے یعنی رسول کا اپنے کمالات کی تجردگاہ سے انسانی دنیا کی طرف آنا تاکہ اس دنیا میں وہی انقلاب پیدا کر دے جسے اس کی آنکھوں نے دیکھا ہے۔

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؁ (۵۳:۱۰)

چنانچہ (اس مقام پر پہنچکر) خدا نے اپنے بندہ (محمد) کی طرف وہ وحی فرمائی جو وحی فرمائی تھی۔

اور اس نے حقیقت کو اس طرح واضح اور بیّن طور پر دیکھا کہ اس میں اس کے قلبِ سلیم نے قطعاً کوئی دھوکہ نہیں کھایا۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۵۳:۱۱)

(اس مقام پر) جو کچھ محمد نے دیکھا دل نے اُسے سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

تو اے حقیقت سے بیخبر انسانو! جن چیزوں کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تمہارے سامنے بیان کر رہا ہے کیا تم ان کے بارے میں اس سے جھگڑا کر رہے ہو؟ تم خود دیکھتے ہو کہ وہ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہے جہاں سے وہ دوسری طرف کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے جسے تم نہیں دیکھ سکتے۔ اور اسکی صداقت پر خود تمہارا تجربہ شاہد ہے تو اس کے بعد کونسی چیز باقی رہجاتی ہے جس کی بنیاد پر تم اس کی بتائی ہوئی بات پر ایمان نہ لاؤ۔ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ۔ باطل کی جن چیزوں پر تم جمے بیٹھے ہو ان کی اصلیت اس کے سوا کیا ہے کہ تم نے یا تمہارے آباد اجداد نے حقیقت کو تو پایا نہیں اور باطل کا نام حقیقت رکھکر سمجھ لیا کہ ہم حقائق پرست ہیں۔

اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (۵۳:۲۳)

(جن چیزوں کو تم حقیقت سمجھ رہے ہو) یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں (حقیقت کو ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں)

حالانکہ اس کے ثبوت میں تمہارے پاس خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کوئی دلیل نہیں ہے۔

مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۵۳:۲۳)

جس کی خدا نے کوئی سند نہیں اتاری (اور جس کی صاحبِ حقیقت کی طرف سے کوئی سند نہ اتری ہو اس کا حقیقت ہونا معلوم!)

لہذا تم محض ظن کی اتباع اور اپنے خیالات کی پیروی کر رہے ہو۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (۵۳:۲۳)

(اے محمدؐ!) یہ لوگ محض ظن و تخمین اور خواہشات نفسانی کا اتباع کر رہے ہیں۔

لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ جب خدا کی طرف سے ہدایت آجائے تو اس کے بعد اس حقیقت نما طلسم پر یوں اڑے رہنا کیسے روا ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۲۳/۵۳)

حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔

یہ تھی اس دعوت انقلاب کی ابتداء۔ یہ تھی وہ آسمانی آواز جسے سننے کے لئے فضائے عالم ایک مدت سے گوش برآواز تھی۔

دعوت کا جواب!

لوگوں نے اس دعوت کو سنا اور استخفاف کی ہنسی سے اس کا استقبال کرکے واپس چلے گئے۔ لیکن کیا اس سے یہ داعیٔ انقلاب اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوگیا؟ کیا اس نے یہ کہکر اپنے آپ کو مطمئن کرلیا کہ میرے ذمہ جو فریضہ تھا وہ ادا ہوگیا اب اس سے زیادہ میں کیا کرسکتا ہوں؟ ایسا کس طرح سے ہوسکتا تھا؟ آپ کے ذمہ تو اس پیغام کو عملی طور پر متشکل کرنا تھا اور اس کی تشکیل و ترصیص ناممکن تھی جب تک تمام سرکش قوتوں کو مغلوب نہ کرلیا جائے۔ اس لئے اس داعیٔ انقلاب (علیہ التحیۃ والسلام) کے فریضۂ زندگی کو یہیں ختم نہیں ہوجانا تھا۔ یہ تو اس کی ابتدا تھی۔

پہلی دعوت عمومی تھی۔ اب اس کے بعد یہ سلسلۂ دعوت و تبلیغ ایک نظام خصوصی کے مطابق شروع ہوا۔

معارف (جلد سوم) میں ملّت موحدہ کے مؤسّس اول حضرت ابرٰہیم کا تذکرہ جلیلہ ایک مرتبہ پھر وجہ شادابی قلب ونظر بنائیے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ آپ نے اپنی دعوتِ توحید کی ابتدا خود اپنے گھر سے کی اور اپنے باپ سے برملا کہا کہ

يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا (۱۹/۴۲)

ابّا جان! آپ ان چیزوں کی عبودیت (محکومیت واطاعت) کیوں اختیار کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، نہ آپ کے کسی کام آسکتی ہیں؟

یہی مسلک، ملّتِ ابراہیمی کے مجدد، حضور نبی اکرمؐ نے اختیار کیا اور دعوتِ خصوصی کی ابتدا خود اپنے خاندان سے کی جب آپ کو حکم ہوا کہ

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶/۲۱۴)

اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی رشتہ داروں کو (انکار وبدعملی کے نتائج سے) آگاہ کردے!

اہل خاندان کو دعوت

تو آپ نے تمام بنو ہاشم کو کھانے پر بلایا اور ان سے کہا کہ "میں وہ چیز لیکر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بارِ گراں کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟" خاندان کے بڑے بوڑھے سُن رہے تھے اور محوِ حیرت تھے کہ ہماری گود کا کھلایا ہوا بچہ ہمیں کیا

باتیں سُنا رہا ہے؟ جب آپ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا کہ اپنے سیزدہ سالہ فرزند (حضرت) علیؓ کی بات مانا کرو اور جو کچھ وہ کہا کرے اُسے بغور سنا کرو"۔ تو تمام مجمع کھلکھلا کر ہنسا اور ابو طالب سے تمسخر کرنے لگا کہ لو! آج سے بیٹے کا حکم مانا کرو۔

انھیں کیا علم کہ جس بات کو ماننے کیلئے کہا گیا تھا اس میں بیٹے اور باپ کے رشتہ کا کیا واسطہ! وہ تو کلمۂ حق وصداقت کے سامنے جھک جانے کا تقاضا تھا۔ یہ کلمۂ صداقت بیٹے کی زبان سے نکلے تو باپ اس کے سامنے جھک جائے اور باپ کی زبان سے نکلے تو بیٹا جھک جائے۔

لیکن ابھی یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی جنھوں نے سن رکھا تھا کہ باپ کی اطاعت بیٹے پر بہر حیثیت لازم ہے!

سورۂ قصص میں ہے کہ رسول کو ملک کے دار الخلافہ میں مبعوث کیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ تمام آبادی کا مرکز اور مختلف اخبار ومعاملات کا دار الشیوع ہوتا ہے۔ باہر کے لوگ اس مرکزی مقام میں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں اور ویسے بھی یہاں کی تہذیب وتمدن اور مسالک ومشارب سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ؁

اور (اے پیغمبر! یاد رکھ، ہمارا یہ قانون ہے کہ) تیرا پروردگار انسانی آبادیوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک وہ ان کے مرکزی مقام پر کوئی رسول نہ بھیجدے جو ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا رہے۔ اور (یاد رکھ، یہ بھی ہمارا قانون ہے کہ ہم انسانی آبادیوں کو یوں ہی) ہلاک نہیں کیا کرتے مگر یہ کہ ان آبادیوں والے ظالم ہوں۔

اہل مکہ کو دعوت

حضورؐ کی بعثت مقدسہ مکہ میں ہوئی جو نہ صرف حجاز کی اجتماعی زندگی کا مرکز تھا بلکہ تمام عرب کی عقید تمندیوں کا قبلہ تھا اور اپنی اولیت واسبقیت اور اہمیت وجاذبیت کی بنا پر اُمُّ الْقُرٰی (بستیوں کی ماں) کہلاتا تھا۔ اپنے خاندان سے آگے بڑھ کر اب ام القریٰ اور اس کے گرد وپیش تک اس صدائے حق وصداقت کو پہچانے کا حکم ہوا۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ؀ (۶/۹۲)

اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (تورات کی طرح) نازل کیا۔ برکت والی، اور جو کتاب،

اس سے پہلے (نازل ہو چکی ہے) اس کی تعلیم کو سچا کر دکھانے والی، اور اس لئے نازل کی، تاکہ تم ام القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔ سو جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور (ایمان لانے کے بعد ایسے ہو گئے ہیں کہ) اپنی نمازوں کی نگہداشت سے غافل نہیں ہوتے!

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ

اور (اے پیغمبر! جس طرح اور انبیاء پر ہم نے کتابیں نازل کیں) ایسے ہی تمہاری طرف (بھی) ہم نے قرآن کی وحی کی جو عربی زبان میں ہے تاکہ تم ام القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے بُرے نتائج سے) اور (حساب و کتاب کے لئے) جمع ہونے کے دن سے ڈراؤ جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے (اس دن اپنے اپنے اعمال کے مطابق لوگوں کے دو گروہ ہو جائیں گے) ایک گروہ جنت میں ہوگا اور دوسرا گروہ جہنم میں۔

اس وقت اس انقلابی جماعت حقہ، اس حزب اللہ کی تعداد قریب چالیس تک پہنچ چکی تھی۔ آج اس دور میں جبکہ جماعتوں کی کثرت و قلت کا معیار صرف سروں کی گنتی رہ گیا ہے، چالیس نفوس پر مشتمل جماعت کو شاید جماعت کے نام سے بھی موسوم نہ کیا جائے لیکن انھیں کیا معلوم کہ ان چالیس مقدس پیکروں کے سینے میں جو قلوب متحرک تھے ان کی دھڑکنوں میں کتنی قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔ آج جماعت کی قوت کے پیمانے ہاتھوں کا شمار ہیں، اُس وقت قوتوں کا مقیاس ایمان کی حرارت تھی، اور ایمان کی قوت ایسی کوہ شکن اور خارا شگاف ہوتی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

سب سے پہلی شہادت

آپ نے اب خاص حرم کعبہ میں پہنچکر توحید کا اعلان کر دیا۔ مخالفین کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی۔ یہ انکی جمعیت و غیرت کے خلاف سب سے بڑا اعلان جنگ تھا۔ چاروں طرف سے لوگ اس جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ حضورؐ کے ربیب، حارث ابن ابی ہالہ یہ خبر سنکر اپنے گھر سے دوڑے دوڑے آئے کہ آپ کو بچالیں لیکن وہ اس ہجوم اراذل میں گھر گئے اور شہید ہو گئے۔ اعلائے کلمۃ الحق میں یہ سب سے پہلا خون تھا جس سے

یہ زمین رشکِ صد آسماں بن گئی۔ ایسے مقدس خون کے لئے حرم کی سرزمین سے زیادہ اور کونسا مقام موزوں ہوسکتا تھا۔ شجرِ اسلام کو اسی خون کے قطرات کی آبیاری کی ضرورت تھی۔ ملت کی سرخروئی اسی خون کی رنگینی کی دست نگر تھی۔ دنیا میں کونسا انقلاب ہے جس کی کامیابی کی داستانیں خونیں حروف سے نہیں لکھی گئیں؟ کونسی تحریک ہے جو شمشیر وسناں کے سایوں میں پروان نہیں چڑھی؟ حق وباطل کی کونسی آویزش ہے جس کے فیصلے قتل گاہوں میں نہیں ہوئے؟ صدق وعدل کی کونسی آواز ہے جسے دبانے کے لئے ابلیسی نظام استبداد نے دار ورسن سے گریز کیا ہے؟ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہیگا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اہل عرب کی طرف

اہل مکہ کے بعد اس دعوت کو تمام قوم تک پہنچایا گیا۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِىْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ (۱۳)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے تجھے ایک امت کی طرف بھیجا، جس سے پہلے بہت سی امتیں گذر چکی ہیں۔ اور اس لئے بھیجا کہ جو بات تجھ پر اتاری ہے، وہ ان لوگوں کو پڑھ کر سنادے اور ان کا حال یہ ہے کہ سرے سے خدائے رحمٰن ہی کے قائل نہیں۔ تم (ان سے) کہدو "وہی میرا پروردگار ہے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع ہوتا ہوں۔"

تمام نوع انسانی کی طرف

اور اس کے بعد اس آفتاب عالمتاب کی شعاعیں، تمام نوع انسانی کو محیط ہوگئیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۷/۱۵۸)

(اے پیغمبر!) تم لوگوں سے کہو "اے افرادِ نسل انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی ساری بادشاہت اُسی کے لئے ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک

ذات ! وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے ! پس اللہ پر ایمان لاؤ، اور اس کے رسول، نبی اُمّی پر، کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ (کامیابی کی) راہ تم پر کھل جائے۔

[ان مقامات کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی]

آویزش حق و باطل

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ازل سے تا امروز

جلد دوم میں "آویزش ابلیس و آدم" پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ابلیس کی نمود، تخلیق آدم کے ساتھ ہی ہوئی ہے اور اسے قیامت تک کے لئے مہلت بھی دیدی گئی ہے۔ یعنی خیر و شر کا تصادم اور حق و باطل کا تزاحم شروع سے اخیر تک جاری رہیگا۔ جہاں حق کی آواز اٹھیگی، باطل کی فریب کاریاں اور ستیزہ کاریاں اسے دبانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ جہاں کہیں "چراغ مصطفویؐ" نور افشاں ہوگا "شرار بولہبی" اس سے ستیزہ کار نظر آئیگا۔ تغیرات زمانہ سے اس تخالف و تقابل کے انداز بدل جائیں گے لیکن اصل مخالفت اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے گی۔ جنگ کے محاذ بدل جائیں گے۔ آلات حرب و ضرب کی شکلوں اور نوعیتوں میں تبدیلی ہو جائے گی۔ ساز و یراق مبارزت مختلف ہو جائیگا لیکن حریفان پنجہ شکن وہی رہیں گے، "نہ فطرت اسد اللہی" بدلے گی نہ قلب "مرحبی و عنتری" میں کوئی تغیر واقع ہوگا۔ وہی ابن آدم اور وہی جنود ابلیس۔ حضرت نوحؑ سے جناب عیسیٰؑ تک کا سلسلۂ رشد و ہدایت گذشتہ مجلدات میں آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے۔ یہ سلسلۂ دراز کیا ہے؟ ایک داستانِ مسلسل ہے اس تزاحم و تخالف کی جہاں حق و صداقت کی آواز بلند ہوئی ابلیسی جیوش و عساکر اپنی پوری قوتوں کو ساتھ لیکر مقابلہ کے لئے سامنے آگئے۔ ارباب مذہب اپنی مسانیدِ عقیدت و عظمت کے تحفظ کے لئے عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے ایک طرف صف آرا ہوگئے۔ ارکانِ سیاست، سریرِ شوکت و اقتدار کی صیانت کے لئے، استبداد و قہرمانی کے تمام حربات و آلات کو ساتھ لیکر دوسری طرف نبرد آزما ہوگئے۔ مدعیانِ حق کی تکذیب و تذلیل کی گئی۔ ان کی حق پرستی کا مضحکہ اڑایا گیا۔ ان کی دعوت انقلاب کا استقبال استخفاف و استہزاء سے کیا گیا۔ ان کی انسانیت پرور تحریک کو کچلنے کے لئے ہر قسم کی تخویف و ترہیب سے کام لیا گیا کہیں ان سے کہا گیا کہ اگر اپنی اس دعوتِ انقلاب سے باز نہیں آؤ گے تو سنگسار کر دئے جاؤ گے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (۲۶/۱۱۶)

لوگوں نے کہا "اے نوح! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اس دعوتِ انقلاب کو برابر جاری رکھے گا) تو (یاد رکھو) تو یقیناً اُن لوگوں میں سے ہو جائے گا جنھیں سنگسار کر دیا جاتا ہے۔

کسی کو یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اپنی روش نہ بدلو گے تو جلا وطن کر دیئے جاؤ گے۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ (۲۶/۱۶۷)

لوگوں نے کہا "اے لوط! اگر تو باز نہیں آئے گا (اور اس سلسلۂ تنذیر و تذکیر کو بند نہیں کرے گا) تو (یاد رکھ) تو یقیناً شہر بدر کئے ہوئے لوگوں میں سے ہو جائے گا۔"

کہیں قسمیں اٹھا اٹھا کر فیصلے کئے گئے کہ اس جماعت کے تمام افراد کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ یہ ہر روز کی خلفشار ختم ہو۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۲۷/۴۹)

اُن (نو آدمیوں) نے کہا "ایک دوسرے کے سامنے خدا کے نام پر حلف اٹھاؤ کہ ہم اچانک صالح اور اس کے گھر والوں کو رات فنا کے گھاٹ اتار دیں گے اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے ان کے خاندان کو تباہ و ہلاک کر دیا ہے اور یقیناً ہم (اپنے اس بیان میں) سچے ہیں۔"

کہیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر اس انداز کو بدلو گے نہیں تو زندہ آگ میں جھونک دیئے جاؤ گے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۹/۲۴)

تو ابراہیم کی قوم کا (اس کے سوا) کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے (یہ یوں باز نہیں آئیگا) اسے قتل کر ڈالو یا (آگ میں) جلا دو۔ چنانچہ (اُنھوں نے ابراہیم کو سچ مچ آگ میں جھونک دیا۔ مگر) خدا نے اُسے آگ سے بچا لیا (کہ آگ اُسے کوئی گزند نہ پہنچا سکی)۔ بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو (خدا کی امداد و اعانت اور حفاظت و صیانت پر) یقین رکھتے ہیں (بڑی بڑی) نشانیاں (پوشیدہ) ہیں۔

کہیں سرکشی و تمرد کی تمام قوتیں مجتمع ہو گئیں کہ اس انقلابی تحریک کے بانی کا خاتمہ کر دیا جائے جو پکار پکار کر کہتا ہے کہ ربوبیت صرف خدا کے ہاتھوں میں ہے، کسی انسان کے دستِ قدرت میں نہیں۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم بِالْبَيِّنَاتِ مِن رَّبِّكُمْ ۖ وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۖ وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ○ (۲۸/۴۰)

خاندان فرعون میں سے ایک مرد مؤمن نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا "کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے (اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی جرم نہیں) حالانکہ وہ (اپنے اس دعوی کی شہادت میں) تمہارے سامنے تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح دلیلیں بھی پیش کر چکا ہے۔ اور (بالفرض) اگر وہ جھوٹا بھی ہے تو اس (کے جھوٹ) کا وبال اسی پر ہوگا (تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ ہاں) اگر وہ سچا ہے (اور یقیناً سچا ہے) تو تمہیں ان (خداوندی عذابوں میں) سے کچھ نہ کچھ پہنچکر رہیں گے جن سے وہ تمہیں ڈرا رہا ہے (اور اس میں سراسر تمہارا نقصان ہی نقصان ہے) بلاشبہ خدا ایسے آدمی کو کبھی سیدھا راستہ نہیں دکھایا کرتا جو حدود (خداوندی) سے گذرنے والا اور انتہائی جھوٹا ہو۔

اسی قصہ (بنی اسرائیل) میں ساحرین دربار فرعون کے واقعہ کو ایک مرتبہ پھر سامنے لایئے جب ان کی نگہ عقیدت، حق و صداقت کو بے نقاب دیکھ کر، بے تابانہ سجدہ ریز ہو گئی تو فرعونیت و قہرمانیت کی تمام حریت کش قوتیں ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں اور استکبار و انانیت کے مجسمہ (شاہنشاہ) کی تمام شعلہ سامانیاں، رعد آسا کڑک کے ساتھ یوں جہنم بار ہوئیں کہ گویا ایک ہی لپک میں انھیں راکھ کا ڈھیر بنا دیں گی۔

قَالَ آمَنتُمْ لَهُ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُمْ ۖ إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۖ فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ ○ (۷۱/۲۰)

فرعون نے کہا "تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا، دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹوا دوں گا، اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے، اور کس کا عذاب دیرپا ہے!"

اور پھر اسی داستان بنی اسرائیل کے مقطع کے بند کو دیکھئے، جب خدا کی آخری حجت نفس مسیحائی کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تاکہ اگر ان کے عروق مردہ میں کچھ بھی صلاحیت باقی ہو تو ان میں پھر سے خون زندگی دوڑا دیا جائے۔ تو اس مقدس کوشش کے جواب میں یہودیوں کے احبار و رہبان اور بازنطینی شاہنشاہیت کے عمائد و ارکان خرقہ و سجادہ کی

وسیہ کاریوں اور شمشیر و سناں کی آتش باریوں کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اس داعیٔ انقلاب کو حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے۔ غرضیکہ اگر آپ تاریخ کی رصدگاہوں سے نوعِ انسانی کی داستانِ حیات کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اُبھر کر آپ کے سامنے آجائیگی کہ یہ پوری داستان ایک حکایت مسلسل ہے چشمک خیر و شر اور ستیزہ کاریٔ حق و باطل کی۔ جب اور جہاں حق کی آواز بلند ہوئی، طاغوتی قوتیں، ہجوم مخالفت وانبوہِ مخاصمت کے ساتھ چاروں طرف سے امنڈ کر حلقہ گیر ہو گئیں۔

وادیٔ فاران میں

لہٰذا ظاہر ہے کہ جب صدق و عدل کی یہی انقلاب آفریں آواز، فاران کی وادیوں سے بلند ہوئی تو ابلیسی جنود و عساکر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ یورش کر کے مقابلہ کے لئے صف آرا ہو گئے۔ اس مقابلہ کی سختی اور مخالفت کی شدت کا اندازہ کرنے کے لئے عربوں کی ان نفسیاتی خصوصیات کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جن کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے سب سے پہلی چیز جو ان کے لئے قبولیتِ حق کی راہ میں حائل تھی ان کا قومی تفاخر اور قبائلی عصبیت تھی۔ ابوجہل نے برملا کہدیا کہ ہم نے ہر میدان میں بنو ہاشم کی برابری کی ہے اور انھیں کبھی آگے نہیں بڑھنے دیا لیکن اب یہ نبوت کو اپنے گھرانے میں لے آئے ہیں تو ہم سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے اس دعویٰ کو سچا مان کر ان کی عظمت کو تسلیم کر لیں اور یوں ان کے خاندان کو اپنے خاندان سے زیادہ معزز و مکرم بنا دیں لہٰذا ان کی مخالفت، دلائل و براہین کی بنا پر نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ انھوں نے اس دعوتِ انقلاب کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا اور اسے اپنے مسلک سے فروتر پایا اس لئے اس سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار وجحود صرف تکبر کی بنا پر تھا۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ (۳۸/۲)

(کسی معقول بنا پر نہیں) بلکہ جو لوگ انکار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ جھوٹی عزت اور عداوت (کی لعنتوں) میں گرفتار ہیں۔

وجوہاتِ مخالفت

وہ کہتے تھے کہ اس شرف و مجد کے لئے یہی انسان کیوں منتخب ہوا ہے؟

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (۲/۱۰۵)

اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ، اور مشرکینِ مکہ، دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحی الٰہی) نازل ہو (اور اس لئے وہ طرح طرح کے

شکوک پیدا کرکے تمہیں اتباعِ حق سے باز رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اللہ کا قانون اس بارے میں انسانی خواہشوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ وہ) جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے لئے چن لیتا ہے، اور وہ بہت بڑا فضل رکھنے والا ہے!

ان کا اعتراض تھا کہ خدا اس سے باتیں کرتا ہے ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا؟

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۘ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۲/۱۱۸)

اور جو لوگ (مقدس نوشتوں کا علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب) وہ کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہِ راست بات چیت کرے، یا ہمیں کوئی (عجیب و غریب) نشانی ہی بھیجدے۔ تو (دیکھو، گمراہی و جہالت کی) جیسی بات یہ کہہ رہے ہیں، ٹھیک ٹھیک ایسی ہی بات اُن لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اس بارے میں پہلوں اور پچھلوں سب کے دل ایک ہی طرح کے ہوئے (بہرحال، اگر یہ لوگ نشانیوں ہی کے طلبگار ہیں، تو چاہئے نشانیوں کی پہچان بھی پیدا کریں، اور اگر نشانیوں کی پہچان رکھتے ہیں، تو دیکھ لیں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ماننے والے ہیں کتنی ہی نشانیاں نمایاں کردی ہیں (اور وہ ان سے ایمان و معرفت کی روشنی حاصل کر رہے ہیں)!

وہ نہایت تکبر اور غرور اور دوسری طرف نفرت و حقارت سے کہتے کہ اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، ہم پر کیوں نہیں ہوتے

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ أَوْ نَرَىٰ رَبَّنَا ۗ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ۝ (۲۵/۲۱)

اور جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب، جو عقیدۂ آخرت کے قائل نہیں ہیں وہ) کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے، تو) کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ براہِ راست خود ہم پر فرشتے اتار دیئے جائیں (جو خدا کی تعلیم ہم تک پہنچادیں)، یا ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں (اور جو کچھ اُسے ہم سے کہنا ہے وہ بلا واسطہ ہم سے کہدے)۔ بلاشبہ ان کے دلوں میں بڑائی سما گئی ہے۔ (جو ایسے ناگفتنی کلمات اپنے منہ سے نکالتے ہیں) اور سخت قسم کی سرکشی و بغاوت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

اس آیۂ جلیلہ کے آخری ٹکڑے پر غور کیجئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وہ یہ تمام اعتراضات محض تکبر کی بنا پر کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کے فرد تھے، اس لئے ان کے اس تکبر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شرفِ نبوت ذلیل خاندان کے حصہ میں کیوں آیا ہے بلکہ یہ کہ قریش کے مختلف گھرانے اپنے میں سے کسی کو بڑا نہیں سمجھتے تھے اس لئے اس امر کا تصور بھی انھیں سخت گراں گذرتا تھا کہ انھیں میں سے ایک خاندان اس طرح باقیوں پر سبقت لیجائے

یہ تھا وہ جذبۂ نخوت جو قبول حق کی راہ میں اس درجہ عناں گیر ہو رہا تھا۔

أَؤُنزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِن بَيْنِنَا ۚ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّن ذِكْرِي ۖ بَل لَّمَّا يَذُوقُوا عَذَابِ ۝ (۳۸)

(وہ لوگ ازراہِ عناد کہتے ہیں) کیا ہمارے درمیان میں سے (سب کو چھوڑ کر) صرف اسی پر ذکر و موعظت (قرآن) نازل کیا گیا ہے؟ یا کیا وہ میرے ذکر و موعظت (قرآن) کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا ہیں (ہرگز نہیں) یا یہ بات ہے کہ انھوں نے ابھی تک میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا؟ (اسلئے منہ زور ہو رہے ہیں کہ جو کچھ منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں!)

قبائلی تفاخر کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مال و دولت بھی وجہ عزت و باعث افتخار سمجھا جاتا تھا اور جیسا کہ پہلے سامنے آچکا ہے، حضورؐ کا شماران کے رؤسا میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اس چیز پر بھی اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ۝ (۴۳)

اور وہ لوگ (ازراہ اعتراض یہ بھی) کہتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف کے سرداروں) میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کر دیا جاتا (جو دولت و ثروت کے لحاظ سے معزز و مفتخر ہوتا)

انقلابی تحریک حقہ کا ایک خاصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ غریبوں کا طبقہ سب سے پہلے اُسے قبول کرتا ہے۔ اس لئے کہ یہ دعوت، مستبد قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہوتی ہے، اس لئے مظلوم طبقہ اسے آیۂ رحمت سمجھتا ہے۔ قرآن کی بیان فرمودہ سب سے پہلی تحریکِ انقلاب کو دیکھئے۔ حضرت نوحؑ کی اولین جماعت کے متعلق سردارانِ قوم کا یہ حقارت آمیز طعن ہمارے سامنے موجود ہے کہ

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ ۚ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ۝ (۱۱)

اس پر قوم کے اُن سرداروں نے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو، اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں کمینے ہیں، اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ سمجھتے ہیں، تم جھوٹے ہو۔

نفرت و حقارت

یہی کیفیت قرآنی تحریک انقلاب کی تھی۔ جو سعید روحیں سب سے پہلے جماعت مؤمنین میں شامل ہوئیں ان میں اکثریت غرباء ہی کی تھیں اس لئے اکابر قریش انھیں بنگاہِ حقارت دیکھتے اور تعریضاً کہتے کہ

اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (۶/۵۳)

کیا یہی ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ نے ہم میں سے اپنے بذل و احسان کے لئے چن لیا ہے؟

نہ صرف ذلیل ہی بلکہ انھیں سَفِیْہ (بیوقوف) بھی کہتے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ (۲/۱۳)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے (اپنی مفسدانہ روش سے باز آجاؤ، اور راست بازی کیساتھ) ایمان کی راہ اختیار کرو، جس طرح اور لوگوں نے اختیار کی ہے، تو کہتے ہیں، کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح (یہ) بیوقوف آدمی ایمان لے آئے ہیں (یعنی جس طرح ان لوگوں نے اپنے دنیوی سود و زیاں کی کچھ پرواہ نہ کی، اور بے سر و سامانی و مظلومی کی حالت میں دعوتِ حق کا ساتھ دیدیا، اسی طرح ہم بھی بیوقوف بنکر ساتھ دے دیں؟) یاد رکھو، یہی دانشمندی کی ڈینگیں مارنے والے) فی الحقیقت بے وقوف ہیں اگرچہ جہل و غرور کی سرشاری میں) اپنی حالت کا شعور نہیں رکھتے!

بشریت پر اعتراض

یہ تو ان کے "شرفاء" اور "اکابر" کی حالت تھی۔ عوام کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ انہی جیسا ایک انسان، رسول کیسے ہوسکتا ہے! یعنی وہی استعجاب جو ہر رسول کے زمانہ میں قبولِ حق کی راہ میں دامن گیر ہوتا رہا!

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْھُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَھُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ڼ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ ھٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہوا کہ انہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردے، اور ایمان والوں کو خوش خبری دیدے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے؟ کافروں نے کہا بلاشبہ یہ شخص جادوگر ہے، کھلا جادوگر!

دوسری جگہ ہے۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ز وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸:۴)

اور لوگوں کو اس بات پر اچنبا ہو رہا ہے کہ ان کے پاس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا (رسول) انہی میں سے (کیسے) آگیا؟ اور (اس بنا پر) منکرین دعوت کہتے ہیں کہ یہ شخص جادوگر ہے اور بہت ہی جھوٹا ہے۔

سورۂ قٓ میں ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (۵۰:۲)

(یہ لوگ کسی دلیل و برہان سے انکار نہیں کر رہے ہیں) بلکہ انھیں اس بات پر اچنبا ہو رہا ہے کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) انہی میں سے (کیسے) آگیا۔ چنانچہ منکرین دعوت کہتے ہیں کہ یہ تو بہت ہی عجیب چیز ہے (جو ہماری تو سمجھ میں نہیں آتی)

اُسی کہنہ اعتراض کی صدائے بازگشت کہ رسول مافوق البشر ہونا چاہیئے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷:۹۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی، تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہو کر) کہنے لگے "کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیجدیا؟"

مخالفین کے سرغنے خفیہ سازشوں میں اسی اعتراض کو پیش کر کے عوام کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ط وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ق الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ق هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ج اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (۲۱:۳)

ان کے دل ہیں کہ یک قلم غافل۔ اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھکر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں؟"

یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ رسول کو تو "خدا کا اوتار" اور "الوہیت کا مظہر" ہونا چاہیئے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا (۲۵:۷)

اور لوگوں نے (اچنبھے سے) کہا "اس رسول کو کیا ہو گیا کہ وہ (عام انسانوں کی طرح) کھانا کھاتا ہے اور

بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ (اس میں اور عام انسانوں میں فرق ہی کیا ہے؟) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ اُترتا جو اس کے ساتھ ساتھ (لوگوں کو انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا ہوتا؟

وہی اسلاف پرستی!

یہ تو تھا رسول کے متعلق۔ باقی رہا اس کا پیغام۔ سو اس کی مخالفت میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لئے کہ ہزار دلیلوں کی ایک دلیل اور لاکھ براہین کی ایک برہان یہ تھی کہ یہ تعلیم ہمارے آبا و اجداد کے مسلک کے خلاف ہے۔ وہی "دلیل" جس نے نوعِ انسانی کو علم و بصیرت کی راہوں پر گامزن ہونے سے ہمیشہ روکا۔ وہی "برہان" جس کی وجہ سے انسان کے تفکر و تدبر کی قوتوں پر ہمیشہ جمود و تعطل کا فالج گرتا رہا۔ وہی تقلید اعمیٰ (بریفالٹ کے الفاظ میں Custom Thought) جس نے انسانیت کو ارتقائی مدارج طے کرنے سے ہمیشہ باز رکھا۔ وہ جذام جس کے مہلک جراثیم، دین و دانش کے جسدِ صالح کی تضعیف و استہلاک میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ وہ نگہ فریب شخصیت پرستی جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان حجابِ اکبر بنکر حائل رہی۔ یعنی ابلیس کا وہ حربہ جس سے اس نے ابن آدم کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانے والے صراط مستقیم سے ہمیشہ گمراہ کیا۔ قرآن، علم و بصیرت اور عقل و دانش کی دعوت تھی لیکن انکے نزدیک آنکھیں بند کرکے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلتے جانا ہی مسلکِ حق و صداقت تھا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ ..... (۲/۱۷۰)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو (اور خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لو) تو کہتے ہیں، نہیں، ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے، جس پر اپنے بڑے بوڑھوں کو چلتے دیکھ رہے ہیں (افسوس ان کے بے دانشی و جہالت پر!) کوئی ان لوگوں سے پوچھے، اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں، تو تم بھی عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے۔

سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ (۵/۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (عقل و بصیرت کی، اس بات کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے۔ نیز اللہ کے رسول کی طرف رجوع ہو تو کہتے ہیں "ہمارے لئے تو وہی طریقہ بس کرتا ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے" (ان سے پوچھو کہ) اگر ان کے باپ دادا کچھ جانتے بوجھتے نہ ہوں اور راہ راست پر بھی نہ ہوں (تو کیا وہ پھر بھی انہی کی اندھی تقلید کرتے رہیں گے ؟)

انھیں کچھ علم نہیں تھا کہ کن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ انھیں فقط اتنا معلوم تھا کہ ان کے آباؤ اجداد یہی کچھ کیا کرتے تھے لہٰذا انھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

مَا يَعْبُدُونَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ (۱۱/۱۰۹)

یہ اسی طرح پرستش کر رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا کرتے رہے ہیں۔

وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے (اور مسلک تقلید میں اس کی ضرورت سمجھی ہی نہیں جاتی) کہ جس ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اس کے متعلق کبھی اتنا تو سوچ لیا جائے کہ یہ فلاح و سعادت کی جنت کی طرف لئے جا رہا ہے یا ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱/۲۱)

اور (دیکھو) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (ہدایت) کی پیروی کرو جو اللہ نے (اپنے رسول پر) نازل کی ہے تو کہتے ہیں (نہیں)، بلکہ ہم تو اس راہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو چلتے ہوئے پایا ہے (ان سے پوچھو کہ، اگر (اس طرح) شیطان انھیں جہنم کے عذاب کی طرف بلاتا رہے (حتیٰ کہ وہ جہنم کے یقینی مستحق ہو جائیں) تو کیا پھر بھی وہ اسی راہ پر چلتے رہیں گے ؟)

ان کے نزدیک تو بس اتنا کافی تھا کہ

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۲/۲۱)

یا کیا اُن کے کچھ ایسے ساتھی ہیں جنھوں نے (اپنی مرضی سے) ان کے لئے کوئی نظام زندگی تجویز کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی ؟ (یقیناً ایسا ہی ہے) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ فیصلے کے متعلق خدا کا حکم صادر ہو چکا ہے (کہ وہ مقررہ وقت پر ہوگا۔ تو) اُن کے درمیان (ابھی ابھی) فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور (یاد رکھو) یقیناً ان ظلم کرنے والوں ہی کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

حالانکہ ان کے اسلاف کے نقوش قدم انھیں سیدھا تباہیوں کے جہنم کی طرف لئے جا رہے تھے۔

ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ ۝ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ۝ فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ ۝ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ۝ (۳۷: ۶۸-۷۱)

پھر یقیناً (اس دنیا سے) ان کی واپسی جہنم ہی کیطرف ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بڑے بوڑھوں کو (راہ ہدایت سے) بھٹکا ہوا پایا اور (انکی کورانہ تقلید میں) یہ لوگ انہی کے نقوش قدم پر سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں اور (یہ گمراہی کی وہ گھاٹی ہے، جہاں) ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ بھٹک چکے ہیں۔

علم و بصیرت کو الگ رکھ چھوڑنے سے ان کی حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ وہ فواحش تک کی سند میں اپنے آباء کا مسلک پیش کر دیتے تھے۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۷: ۲۸)

اور یہ لوگ (یعنی مشرکین عرب) جب بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں، تو کہتے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور (چونکہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں اسلئے) خدا نے ایسا ہی کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے (اے پیغمبر!) تم کہدو کہ خدا کبھی بھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے گا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ جن لوگوں کی فطرت اس درجہ مسخ ہو چکی تھی اُنھیں عقل و فکر کی دعوت دے کر ایک نئے مسلک کی طرف بلانا کس قدر مشکل کام تھا۔

لیڈروں کے حربے

آپ تاریخ کے صفحات پر نگاہ ڈالئے یا اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ سوسائٹی میں ایک طبقہ تو عوام (Masses) کا ہوتا ہے اور دوسرا خواص کا، جسے آج کی اصطلاح میں (Intelligentsia) کہہ لیجئے۔ قوت، عوام میں ہوتی ہے لیکن اُن کی مہار، خواص کے ہاتھوں میں۔ خواص کی ذہانت و فطانت کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ عوام کو کس حد تک اپنے ہاتھوں میں رکھ سکتے ہیں۔ بس یہی خواص کی کاریگری اور ہوشیاری ہے۔ سورج کی آنکھ نے جو کچھ اس کرۂ ارض پر دیکھا ہے اگر اس کی فلم تیار ہو سکے تو آپ دیکھیں گے کہ عقل انسانی کی تمام تگ و تاز اسی میں صرف ہوتی رہی ہے کہ عوام کو کس طرح قابو میں رکھکر اپنی اغراض و مقاصد کے حصول و استبقار کا آلۂ کار بنایا جائے۔ جو اس فن میں زیادہ ماہر ہے وہی صاحب اقتدار و ذی وجاہت ہے۔ عوام کو ہاتھ میں رکھنے کے لئے ذہن انسانی کی ابلیس کاری نے عجیب و غریب حربے ایجاد کئے

ہیں۔ کہیں استبدادِ شاہنشاہیت کا وہ آہنی پنجہ جو جسم اور دماغ دونوں کی آزادی کا بوسیانہ طور پر گلا گھونٹ دے اور کہیں تقدس برہمنیت کا وہ کچا دھاگہ (زُنّار) کہ جس کی گرفت فولادی زنجیروں سے بھی زیادہ پائیدار اور گراں نشین ہو۔ کہیں سلطانی کی "ظلِ الٰہیت" اور کہیں درویشی کی "عرش آشیانیت"۔ کہیں مفلسوں اور ناداروں کی غربت و فلاکت کا درماندہ گیں اور کہیں ان کی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا نقابِ عقیدت آفریں۔ اور ان تمام دلکش و حسین پردوں کے پیچھے کارفرما جذبہ، وہی حصولِ جاہ و حکومت اور فروغ اقتدار و سطوت۔ اسلام جس تحریک انقلاب کا داعی ہے وہ اس قسم کے طبقۂ خواص کے لئے پیغامِ موت ہے۔ اسلئے کہ وہ حکومت و اقتدار کی تمام کنجیاں اُن کے ہاتھوں سے چھین لیتا ہے۔ لہٰذا اس تحریک کی سب سے بڑی مخالفت اسی طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے وہ وہی حربے استعمال کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی وہ عوام کو طرح طرح سے بھڑکاتے اور ان کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں تاکہ وہ سیلاب بلا کی طرح اٹھیں اور اس تحریک کو اپنی طغیانیوں میں بہا کر لیجائیں۔ اور چونکہ عقائد انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اسلئے وہ عوام کو مشتعل کرنے کے لئے سب سے پہلے ان کی اسی دُکھتی رگ کو پکڑتے ہیں۔ وہ نہایت مصلحانہ انداز اور دردمندانہ پیرایہ میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ شخص تمہیں اس دین سے برگشتہ کر رہا ہے جو تمہارے بزرگانِ کرام اور اسلافِ عظام کی طرف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اگر اسکی قوت بڑھ گئی تو تمہارا مذہب خطرہ میں پڑجائے گا۔ تم مرتد ہو جاؤ گے۔ الحاد و بے دینی کی موت مرو گے۔

یہی فرعون نے کیا قصۂ آویزش سطوتِ فرعونی اور ضربِ کلیمی میں دیکھئے۔ فرعون اتنی بڑی قوت کا مالک تھا لیکن اس کے باوجود اُسے عوام کے اسی کمزور پہلو سے فائدہ اٹھانا پڑا۔ اس نے ان سے کہا کہ

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّہٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝ (۴۰/۲۶)

اور فرعون نے (اہل دربار سے) کہا "تم مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو۔ وہ (اپنی امداد کے لئے) اپنے پروردگار کو پکارے! مجھے ڈر ہے کہ (اگر اسے یوں ہی زندہ چھوڑ دیا گیا تو) وہ تمہارے دین کو بدل دے گا یا پھر (سر) زمین (مصر) میں فساد برپا کر دے گا (جسے بعد میں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا)۔

اور یہی اکابر مکہ نے یہی حربہ سرزمین عرب کے فراعنہ نے استعمال کیا۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّکُمْ عَمَّا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُکُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْکٌ مُّفْتَرًی ۭ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۳۴/۴۳)

اور (دیکھو) جب اُن کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو یہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ شخص (محمدؐ) اس کے

سوا کیا ہے کہ (ہماری ہی طرح کا) ایک آدمی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ (اے لوگو!) تمہیں ان معبودوں کی پرستش سے روک دے جنہیں تمہارے آباؤ اجداد پوجتے آئے ہیں؟" اور کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ (کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خدا کا حکم ہے) اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ (خدا کے نام پر) تہمت باندھا ہوا ایک جھوٹ ہے۔ اور وہی لوگ جو انکار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں حق کے بارہ میں جب وہ اُن کے سامنے آگیا یہ کہتے ہیں کہ یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

یہ ہیں "اکابر مجرمین" کی وہ چالیں جو اس انسانیت بخش تحریک کے خلاف چلی جاتی ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ؀ (۶/۱۲۳)

اور (دیکھو، جس طرح آج مکہ کے رئیس دعوت حق کی مخالفت میں سرگرم ہیں) اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سردار پیدا کر دیئے تاکہ وہاں مکر و فریب کے جال پھیلائیں (یعنی جمعیت بشری کی حالت ایسی ہی واقع ہوئی ہے کہ ہر آبادی میں کوئی نہ کوئی مفسدوں کا سردار پیدا ہو جاتا ہے) اور فی الحقیقت وہ مکر و فریب نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ (کیونکہ کاروبارِ حق کو تو نقصان پہنچا سکتے نہیں اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں) لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔

ہر جگہ اور ہر زمانہ میں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ؀ (۲۵/۳۱)

اور (دیکھو، جس طرح آج مکہ کے بدکردار دشمنی پر کمربستہ ہیں) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے کچھ بدکردار دشمن پیدا کر دیئے (جو اپنی عداوت سے خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ دعوتِ حق کو کوئی گزند نہیں پہونچا سکتے) اور (اے پیغمبر!) تجھے تیرا پروردگار ہی رہنمائی اور امداد کے لئے کافی ہے!

مال کی فراوانی اور افرادِ خاندان کی اکثریت کے زعمِ باطل میں۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ؀ (۶۸/۱۴)

یہ تمام سرکشی (وعدوان) اس وجہ سے ہے کہ وہ مال اور اولاد والا تھا۔

قوت و دولت کے نشہ میں

یہ سمجھتے ہوئے کہ جس کے پاس قوت و ثروت کے ایسے سرچشمے موجود ہوں اس کی طرف کون آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکتا ہے!

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ؀ (۳۴/۳۵)

اور ان لوگوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہمارے پاس بہت زیادہ مال و دولت اور کثیر تعداد اولاد ہیں (جن سے

ہم اپنی مدافعت کرسکتے ہیں) اور ہمیں کوئی عذاب نہیں دیا جاسکتا۔

مترفین کا گروہ

یہی ہے "مُتْرَفِیْن" کا وہ گروہ جن کا تفصیلی تذکرہ انبیائے سابقہ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں (جلد دوم اور سوم میں) آپ کے سامنے آچکا ہے۔ "مُتْرَفِیْن" سہل انگار، تن آسان، عشرت پسند۔ دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والے۔ خواہ وہ امراء و رؤساء کا طبقہ ہو کہ جسکے قصرِ تعیش کی رنگینی کا سامان، مزدور کے پسینہ اور خون سے بہم پہنچتا ہے اور خواہ ارباب مذہب و "روحانیت" کا حلقہ کہ جسکی مسند معبودیت و الوہیت کے پائے سادہ لوح عوام کے جذبات اطاعت وانقیاد کے کندھوں پر استوار ہوتے ہیں۔ یہی ہے وہ طبقہ جو سب سے پہلے اس انقلابی تحریک کی مخالفت کرتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ (۳۴)

اور (دیکھو) ہم نے (کبھی) کسی انسانی آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) نہیں بھیجا مگر ہمیشہ (اس بستی) کے عافیت کوش طبقہ کی طرف سے یہی کہا گیا کہ جس دین کو تمہیں دیکر بھیجا گیا ہے ہم اُسے ماننے والے نہیں ہیں۔

اور اس مخالفت میں دلیل وہی عوام فریبی کی پیش کرتا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (۴۳)

اور (اے پیغمبر! جس طرح آج اہل مکہ کے سردار تیری مخالفت میں سرگرم ہو رہے ہیں) اسی طرح تجھ سے پہلے بھی ہم نے کسی (انسانی) آبادی میں کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) نہیں بھیجا مگر ہمیشہ (اس) کے سہل انگار طبقہ نے یہی کہا کہ ہم (اس نئے دین کو نہیں مانتے۔ ہم) نے تو اپنے بڑے بوڑھوں کو ایک طریقہ پر عمل کرتے پایا ہے اور یقیناً ہم انہی کے نقوش قدم کی پیروی کرنے والے ہیں!

تقدیر کا بہانہ

اور اگر کہیں ایسے گھر جاتا ہے کہ اس دلیل سے بھی فرار کی راہ نہیں نکلتی تو پھر تقدیر کا بہانہ سامنے لے آتا ہے۔

وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُم ۗ مَّا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۴۳)

اور (دیکھو! جب وہ ہر طرف سے بند ہوجاتے ہیں تو) کہنے لگتے ہیں کہ اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم ان معبودوں کی عبودیت (محکومیت واطاعت) اختیار ہی نہ کرتے (اس نے چاہا جب ہی تو ہم نے کیا) اُنہیں اس بات کا کچھ

بھی علم نہیں (کہ خدا کی مشیت اس کی ذمہ دار نہیں بلکہ ان کا ارادہ اور عمل اس کا ذمہ دار ہے) اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ لوگ اٹکل پچو قیاسی گھوڑے دوڑا رہے ہیں!

اور اس قسم کے ظنون فاسدہ اور تلبیسات متخالفہ سے اپنے آپ کو بھی فریب دیتا ہے اور دوسروں کو بھی۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (۱۴۸)

جن لوگوں نے شرک کا شیوہ اختیار کیا ہے، وہ اب کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو (اپنے خیال کے مطابق) حرام ٹھہراتے" سو دیکھو! اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا۔ (اے پیغمبر!) تم کہو، کیا تمہارے پاس (اس بارہ میں) کوئی علم و یقین ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ (اگر ہے تو پیش کرو!) اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے مگر محض وہم و گمان کی، اور تم (اپنی باتوں میں) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بناتے ہو!

تکذیب

معرکۂ حق و باطل میں، طاغوتی قوتوں کی مخالفت کی تفاصیل کس قدر طول طویل کیوں نہ ہوں، اس کی اساس و بنیاد اسی نقطہ پر ہوتی ہے کہ وہ اس صدائے حق کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ تسلیم کرلیں کہ ہم اس دعوتِ انقلاب کو سچائی پر مبنی سمجھتے ہیں تو پھر اس سے انکار کی کوئی وجہ ان کے پاس باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا اگر وہ دل سے اس تحریک کی صداقت کے قائل بھی ہوں تو بھی علانیہ اس کی تکذیب کرتے جائیں گے۔ اس لئے عملی طور پر سچائی کتنی ہی کمیاب (بلکہ بعض اوقات نایاب) کیوں نہ ہو جائے اس کی گرفت ایسی محکم اور عالمگیر ہے کہ ایسی مثال آپ کو شاید ہی کہیں نظر آئے کہ کوئی شخص دھڑلے سے یہ کہے کہ ہاں! میں اس بات کو بالکل سچا سمجھتا ہوں لیکن اس کے باوجود اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ لہٰذا سرکش قوتوں کی طرف سے جب حق کی آواز کی مخالفت ہوگی تو اس کا مستقل مظاہرہ تکذیب کی صورت میں ہوگا۔ لیکن نبی کریمؐ کے باب میں اس تکذیب کی بھی ایک عجیب صورت تھی۔ عرب کا بچہ بچہ حضورؐ کی صداقت اور امانت کا قائل تھا۔ آپ کی موجودگی ہی میں نہیں بلکہ غیبوبت میں بھی وہ اس کے معترف تھے۔ حتیٰ کہ ہرقل کے دربار میں ابوسفیان جیسے متشدد دشمن کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس مدعیٔ نبوت نے اپنی ساری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن اس کے باوجود وہ آپؐ کے دعوائے نبوت کی تکذیب کرتے تھے۔ خود قرآن کریم

میں ہے کہ

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (۶:۳۳)

(اے پیغمبر!) ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ (انکار و تعصب کی) جیسی کچھ باتیں کہتے ہیں، وہ بلاشبہ تمہارے لئے آزردگی کا موجب ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ تمہیں نہیں جھٹلاتے (یعنی تمہیں جھوٹا کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے کیونکہ تمہاری راست گوئی سب کو معلوم ہے) لیکن یہ ظالم دیدہ و دانستہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں!

ذرا غور کیجئے کہ یہ صورت حال کس قدر تعجب انگیز اور تحیر خیز ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپؐ نے ساری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن بایں ہمہ، اس ایک بات میں آپؐ کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے! صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ تکذیب محض بربنائے مخالفت تھی، حقیقت پر مبنی نہ تھی۔ نہ ہی اس بات پر کہ وہ اس دعوے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ یہ دعویٰ سچا نہیں ہے۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ یہ دعوت ہے کیا (اسلئے کہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے تھے) لیکن اس کی تکذیب کئے جا رہے تھے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۱۰:۳۹)

نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر وہ اپنے علم سے احاطہ نہ کرسکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا، اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہوگئے۔ ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ تو دیکھو، ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے!

حالانکہ اگر وہ ذرا غور و فکر سے کام لیتے تو یہ حقیقت ان پر واشگاف ہو جاتی کہ اس صداقت مجسم کا یہ دعویٰ بھی یکسر حقانیت پر مبنی ہے کہ یہ دعوت خود حق کی دعوت ہے۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ (۶:۶۶)

اور (اے پیغمبر!) تیری قوم نے اسے جھٹلایا ہے حالانکہ وہ حق ہے (یعنی قرآن کو جھٹلایا ہے اور وہ حق ہے، تو ضرور ہے کہ اس کا نتیجہ اس کے آگے آئے۔ بس) تم کہدو (اگر تم جھٹلاتے ہو تو جھٹلاؤ) میں تم پر کچھ نگہبان نہیں ہوں کہ تمہیں قبول حق پر مجبور کر دوں۔

افترا کا الزام

لیکن وہ برابر پروپیگنڈا کئے جاتے تھے کہ یہ ایک افسانہ طرازی ہے۔ یہ (معاذ اللہ) خود ہی کچھ فقرے وضع کرلیتا ہے یا کسی اور سے لکھوا لیتا ہے اور انہیں پھر اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ

فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۚ (۲۵/۴)

اور (دیکھو) جو لوگ (دعوت حق سے) انکار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) اس کے سوا کیا ہے کہ ایک جھوٹ ہے جسے محمد نے گھڑ لیا ہے اور اس سلسلہ میں کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی امداد کی ہے۔ تو (اے پیغمبر!) حقیقت یہ ہے کہ (اس قسم کی باتیں بنا کر) وہ ایک (بہت بڑے) ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

سورہ سجدہ میں ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ (۳۲/۳ نیز ۳۴/۴۳ ، ۴۶/۱۱)

یا کیا وہ (مشرکین عرب) یہ کہتے ہیں کہ محمد نے قرآن کو خود ہی گھڑ لیا ہے (ہرگز نہیں۔ اے پیغمبر!) بلکہ وہ (قرآن) تو تیرے پروردگار کی طرف سے حق ہے (جو اس لئے نازل کیا گیا ہے) تاکہ ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تم سے پہلے کوئی (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا نہیں آیا (اس قرآن کے ذریعے) تم انکو ڈراسکو کہ ممکن ہے (تمہاری کوششوں سے) وہ راہ راست پر آجائیں۔

اسے کوئی اور سکھا جاتا ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۝ (۴۴/۱۴)

پھر (یاد تو کرو) وہ (ہمارے) رسول سے منہ موڑ کر (اعراض کر کے) چلتے بنے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا پاگل ہے!

کبھی کہتے کہ اس قرآن میں ہے ہی کیا؟ بس اگلے لوگوں کے کچھ قصے کہانیاں ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۶۸/۱۵ نیز ۶/۲۵ ، ۸/۳۱ ، ۲۳/۸۳)

جب اس کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو (بہت ہی لاپروائی سے) کہتا ہے "اونہہ! پرانے پچھلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں!"

کہیں سے لکھی لکھائی مل گئی ہے، اُسی کو ہمیں سناتا رہتا ہے۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (۲۵/۵)

اور (ساتھ ہی) وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تو پچھلے پرانے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جو اس نے (اپنے پاس) لکھ رکھی ہیں چنانچہ وہی قصے کہانیاں صبح شام اُسے لکھوا دی جاتی ہیں (اور وہ انھیں لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنا دیتا ہے)۔

باقی رہے اس کے دوسرے مضامین، سو وہ بجز این نیست کہ خوابوں کی باتیں اور واہمہ کے افسانے ہیں۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ○ (۲۱/۵)

(اتنا ہی نہیں) بلکہ انھوں نے کہا کہ یہ محض خواب و خیال کی باتیں ہیں بلکہ من گھڑت دعویٰ ہے۔ نہیں، بلکہ یہ شاعر ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی (نزول ہلاکت کی) نشانی ہمیں لا دکھائے۔ جس طرح اگلے وقتوں کے لوگ نشانیوں کے ساتھ بھیجے جا چکے ہیں۔

ساحر و کذّاب

اس کی نصیحت و موعظت، ہمارے مسلک زندگی کے نتائج و عواقب سے تنذیر، یہ دھمکیاں اور یہ ڈراوے، یہ تخویف یہ ترہیب، یہ سب جھوٹ ہے اور کھلا ہوا جھوٹ[۱]۔

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ (۴۳/۳۰) نیز (۲/۳۴؛ ۳۴/۴۳؛ ۱۵/۵۳؛ ۶/۷؛ ۴۶/۷)

اور (دیکھو) جب حق (قرآنی ہدایت) اُن کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو جھوٹ ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم اس سے انکار کرنے والے ہیں۔

اس لئے آپ (پناہ بخدا) ساحر و کذاب ہیں۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سِحِرٌ كَذَّابٌ ○ۖۚ (۳۸/۴ نیز ۱/۲)

اور (دیکھو) انھیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ان کے پاس (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا یعنی رسول، انہی میں سے دیکھیے آگیا اور (ان منکرین نے (یہاں تک) کہہ دیا کہ یہ (پیغمبر) تو جھوٹا، بہت بڑا جھوٹا ہے۔

قرآن کو مت سنو

وہ زبان سے یہ سب کچھ کہتے تھے لیکن دل میں خوب سمجھتے تھے کہ اس پیغام حق و صداقت کا اثر کس قدر سریع اور کیسا دلنشین ہے۔ یہ کتنی جلدی دل کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے جس کے کان میں اس کی آواز پڑ جاتی ہے وہ کس طرح والہانہ انداز سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُسے سحر (جھوٹ) کہتے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی خوب جانتے تھے کہ اس کا اثر بڑے سے بڑے سحر (جادو) سے زیادہ تیز اور گراں نشیں ہے۔ اس لئے وہ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ایسا اہتمام کرتے کہ کوئی اُسے سننے ہی نہ پائے۔ اس کیلئے وہ کہتے کہ جہاں قرآن کی تلقین ہو رہی ہو اتنا شور مچاؤ، ایسا ہنگامہ برپا کرو کہ کوئی اسے سُن ہی نہ سکے۔

---

[۱] سحر بمعنی جھوٹ کیلئے دیکھئے جلد سوم۔ داستان بنی اسرائیل۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ○ (۴۱/۲۶)

اور (دیکھو) جو لوگ (قبولِ حق سے) انکار چکے ہیں انھوں نے کہا "اس قرآن کو نہ خود سنو نہ دوسروں کو سننے دو) جہاں اس کی تعلیم ہو رہی ہو وہاں شور مچاؤ۔ شاید تم اس طرح غالب آسکو"

اور اگر کہیں ایسا اتفاق ہو جائے کہ سنے بغیر چارہ نہ ہو تو بالکل بے توجہی سے سنو۔

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۴۷/۱۶)

اور (اے پیغمبر!) ان منکرینِ حق میں ایسے لوگ بھی ہیں جو (بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) تیری طرف کان لگائے ہوئے ہیں (مگر ان کے دل کہیں اور ہوتے ہیں۔ وہ تیری باتوں کو توجہ سے نہیں سنتے) حتیٰ کہ جب وہ تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں علم (و معرفت کا کچھ حصہ) دیا گیا ہے (یعنی مؤمنین صادقین سے) پوچھتے ہیں "اس (پیغمبر) نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟" حقیقت میں یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے (کیونکہ وہ اپنی بد اعمالیوں اور بدکرداریوں سے قبولِ حق کی صلاحیت ہی کھو چکے) اور اپنی کمینہ خواہشات کی پیروی کے عادی ہو چکے ہیں!

ولید کا واقعہ

اس کے علاوہ، وہ اپنے میں سے معتمد علیہ سرغنوں کو سازشاً بھی محفلِ نبوی میں بھیجا کرتے تھے کہ وہ آکر لوگوں میں پروپیگنڈا کریں کہ "ہم نے قرآن کو خود سنا ہے۔ اس میں جھوٹ کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے"۔ اسی قسم کا واقعہ سورۂ مدثر میں مذکور ہے۔ سردارانِ قریش میں سے ایک شخص (تاریخ جس کا نام ولید بن مغیرہ بتاتی ہے) کثرتِ مال اور اولاد کی بنا پر بیحد مغرور اور متکبر تھا۔

وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ○ وَبَنِينَ شُهُودًا ○ (۷۴/۱۲-۱۳)

اور میں نے اسے فراواں دولت اور (کثیر تعداد) بیٹے دیئے تھے جو اس کے سامنے موجود تھے (یعنی سب زندہ تھے)

اور آیاتِ خداوندی کا بدترین دشمن۔

وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ○ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ○ كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ○ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ○ (۷۴/۱۴-۱۷)

اور میں نے (معاملات دنیوی کو) اس کے لئے خوب اچھی طرح سے درست کر دیا۔ پھر اس کے بعد بھی اسکو یہ حرص ہوتی ہے کہ میں کچھ اور زیادہ دیدوں۔ ہرگز نہیں (اب ڈھیل اور استدراج کی حدیں ختم ہوگئیں) حقیقت یہ ہے کہ وہ ہماری آیتوں سے (بلاوجہ) عناد رکھنے والا ہے۔ اب میں اُسے رسوا کن عذاب دوں گا جو اسپر چھا جائیگا!

وہ ایک روز اسی طرح بزم رسالتؐ میں پہنچا۔ دل میں بغض و عناد کی سینکڑوں کدورتیں لئے ہوئے اور دماغ میں مخالفت و مخاصمت کے ہزاروں منصوبے باندھے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر کچھ آگے کو جھکا۔ قرآن کی آیات کو سُنا۔ ان میں تو (بقول کفار) جادو تھا۔ کچھ سوچا۔

إِنَّهُ فَكَّرَ (۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اس نے کچھ سوچا۔

کہ یہ تو شاعروں اور کاہنوں کی باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن پھر جس مہم کے لئے آیا تھا اس کا اور اس تبدیلی سے اپنے مستقبل کا اندازہ کیا۔

وَقَدَّرَ (۱۸)

اور کچھ اندازہ کیا۔

اور اس کی بدبختی کہ اندازہ بہت غلط کیا۔

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ (۱۹)

اس کی بدبختی کہ اس نے کیسا (غلط) اندازہ کیا!

ایسا غلط کہ اس میں اس کی تباہی و بربادی کا جہنم چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس نے اندازہ لگایا کہ اگر میں نے اس دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا تو ذاتی ریاست اور وجاہت اور قبائلی سیادت و امارت، سب کچھ چلا جائیگا۔ لیکن نہ سوچا کہ اس کے بدلے میں جو کچھ ملے گا وہ کس قدر گراں بہا اور حیات آور ہے۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ (۲۰)

پھر اس کی بدبختی کہ اس نے کیسا (غلط) اندازہ کیا۔

اس طرح اس کا سینہ کشمکش حق و باطل کی آماجگاہ بن رہا تھا ——— ایماں مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے کفر ——— اس لئے ایک بار پھر دیکھا۔

ثُمَّ نَظَرَ (۲۱)

اس کے بعد اس نے پھر دیکھا۔

لیکن بالآخر ہوس جاہ پرستی، قبولیت حق پر غالب آگئی۔ اس کے سینہ کا تلاطم اس کے ماتھے کی شکنوں کی صورت میں ابھر کر باہر آگیا۔ اس نے تیوری چڑھائی۔ منہ بنایا۔

ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ (۷۴/۲۲)

اس کے بعد اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا۔

پیٹھ پھیری۔

ثُمَّ أَدْبَرَ (۷۴/۲۳)

پھر پشت پھیری (یعنی لوٹ گیا)۔

اور متکبرانہ انداز میں واپس آگیا۔

وَاسْتَكْبَرَ (۷۴/۲۳)

اور غرور کیا۔

خلوت کی محفلوں میں تو اقرار کیا کہ ——— ایں کتاب نیست چیزے دیگر است ——— لیکن باہر مجمعوں میں یہی اعلان کرتا رہا کہ[1]

فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۝ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ (۷۴/۲۴-۲۵)

پھر اس نے کہا کہ یہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ایک جھوٹ ہو جو (دوسروں سے سنکر) نقل کر دیا جاتا ہے۔

(بہر حال) یہ کچھ بھی نہیں ہے مگر صرف انسانی کلام ہے (اور بس)۔

سورۂ جاثیہ کی مندرجہ ذیل آیات میں بھی اسی شعار کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ (۴۵/۷-۹)

(یاد رکھو) ہر جھوٹے مجرم کیلئے تباہی ہی تباہی ہے۔ (وہ مجرم) جو اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے جو اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں اور پھر متکبرانہ طور پر (ان سے انکار پر) اصرار کرتا ہے گویا کہ اس نے وہ آیتیں سنی ہی نہیں (اور وہ کچھ جانتا ہی نہیں) لہذا (اے پیغمبر!) تم ایسے آدمی کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری دیدو!

(ایسے لوگوں کی حالت یہ ہے کہ) جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کو جان (اور سمجھ بھی) لیتے ہیں تو (پھر) اس کو مذاق بنا لیتے ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی لوگ ہیں جنکے لئے توہین آمیز عذاب ہوگا!

---

[1] اس واقعہ کی اصل تو قرآن میں ہے لیکن جزئیات مختلف روایات میں مختلف انداز سے مذکور ہیں۔

استہزاء لیکن تکذیب و تنقیص کے ان حربوں سے کہیں زیادہ دور رس اور تکلیف دہ وہ حربہ ہے جو مخالفین کی طرف سے استہزاء کی شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ آپ سے ایک شخص کسی معاملہ میں اختلاف کرتا ہے۔ آپ اُسے دلائل و براہین سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ، بجائے اس کے کہ آپ کے براہین و حجج کے مقابلہ میں قاطع دلائل پیش کرے، آپ کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ آپ کی ہر بات کو ہنسی میں ٹال دیتا ہے۔ مزاح کرتا ہے۔ گلی محلے کے لڑکے پیچھے لگا دیتا ہے کہ وہ آپ کا تمسخر اڑائیں۔ کہئے کہ اس حربہ کا جواب آپ کیا دیں گے! اور اس اسلوبِ مخالفت سے آپ کس قدر کبیدہ خاطر اور اندوہگیں ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کا یہ مخالف شمشیر بکف آپ کے سامنے آجائے تو آپ کو کبھی اتنی تکلیف نہ ہو جتنی اس کے اس اندازِ مخالفت سے ہوتی ہے۔ سنانِ زبان کی جراحت یقیناً نوکِ شمشیر کے زخم سے کہیں زیادہ کرب انگیز اور صبر آزما ہوتی ہے۔ تکذیب و تنقیص کے ساتھ مخالفین عرب تضحیک و تشنیع کے ان روح فرسا حربوں پر بھی اتر آئے۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۲۱/۳۶)

اور (اے پیغمبر!) جب تجھے وہ لوگ دیکھتے ہیں جنھوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کی ہے، تو انھیں اور تو کچھ سُوجھتا نہیں، بس تجھے اپنی ہنسی ٹھٹھے کی بات بنا لیتے ہیں۔ "کیا یہی وہ آدمی ہے جو ہمارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے"؟ اور ان کا حال یہ ہے کہ خدائے رحمان کے ذکر سے یک قلم منکر ہیں!

سورۂ فرقان میں ہے۔

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا (۲۵/۴۱)

اور (اے پیغمبر!) جب تجھے وہ لوگ دیکھتے ہیں انھیں اور تو کچھ سوجھتا نہیں، بس تجھے اپنی ہنسی ٹھٹھے کی بات بنا لیتے ہیں: "کیا یہی وہ آدمی ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟"

وہ لوگوں کو بلاتے اور نہایت تحیر آمیز انداز سے کہتے کہ دیکھو! یہ ہے وہ شخص جو کہتا ہے کہ مرنے کے بعد جب تمہاری ہڈیاں تک گل سڑ جائیں گی تم مکافاتِ عمل کے لئے پھر سے اٹھائے جاؤ گے!

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ اَفْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ (۳۴/۷-۸)

اور (دیکھو) جن لوگوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کی ہے وہ (باہر سے آئے ہوئے اجنبی لوگوں کو یوں بہکاتے

(اور) کہتے ہیں "کیا ہم تمہیں ایسا آدمی بتلائیں جو تمہیں یہ بتاتا ہے کہ جب تم (مر گل کر) پوری طرح ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو اس کے بعد تم کو ایک نئی پیدائش حاصل ہوگی؟ معلوم نہیں وہ خدا کے نام پر جھوٹی تہمت باندھ رہا ہے یا کچھ پاگل ہو گیا ہے"؟ (اے پیروانِ دعوتِ حق! یاد رکھو! نہ ہمارا پیغمبر ہمارے نام پر تہمت باندھ رہا ہے اور نہ وہ پاگل ہے) بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہی عذاب میں مبتلا ہو گئے اور وہ (یہاں) بڑی دور کی گمراہی میں گرفتار ہیں۔

اسی طرح وہ قرآن کریم سے تمسخر کرتے ہیں۔

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ۝ (۲۱/۲-۳)

ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نصیحت کی باتیں پیہم آتی رہیں مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ انھوں نے جی لگا کر سُنا ہو۔ وہ سنتے ہیں مگر اس طرح کہ کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں اور دل ہیں کہ یک قلم غافل۔ (اور دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں "یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے؟ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں؟"

وہی "أَفَّاكٍ أَثِيمٍ" جن کا ذکر پہلے آچکا ہے! قوانین خداوندی سے مزاح کرتے۔

وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ (۴۵/۹)

اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کو جان (اور سمجھ بھی) لیتے ہیں تو (پھر بھی) اس کو مذاق بنا لیتے ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لئے توہین آمیز عذاب ہوگا!

اس انقلابی جماعت کا مضحکہ اڑاتے۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۲/۲۱۲)

منکرینِ حق کی نگاہوں میں تو صرف دنیا کی زندگی ہی سمائی ہوئی ہے۔ وہ ایمان والوں کی (موجودہ بے سروسامانی دیکھ کر) ہنسی اڑاتے ہیں۔ حالانکہ (عزت کی اصل چیز دنیوی مال و جاہ نہیں ہے، ایمان و عمل کی دولت ہے) جو لوگ متقی ہیں، قیامت کے دن وہی ان منکروں کے مقابلہ میں بلند ہوں گے (اور یہ خاک مذلت پر لوٹ رہے ہوں گے)، اور (پھر قطع نظر اس کے، یہ منکرینِ حق نہیں جانتے کہ جو لوگ آج مال و جاہ دنیوی سے تہی دست ہیں، یہی کل کو اللہ کے فضل سے مالا مال ہو سکتے ہیں۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے

اپنے رزق بے حساب سے مالا مال کر دیتا ہے!

سورۂ مومنین میں جہنمیوں کی اسی قسم کی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے ان سے کہا گیا ہے۔

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ (۲۳)

سو (اے اہلِ جہنم!) تم نے ان (خستہ حال مومنین) کو ایک مذاق کی چیز بنا لیا تھا حتیٰ کہ (اُن کی خستہ حالی نے تمہیں اسقدر مغرور اور غافل کر دیا کہ) انھوں نے تمہیں میری یاد بھی بھلا دی اور تم (آخر دم تک) اُن سے ہنستے ہی رہے۔

نبی اکرمؐ انھیں متنبہ کرتے کہ ان کی خلافِ فطرت روشِ زندگی انہیں تباہی و بربادی کے عذاب میں مبتلا کر دے گی تو وہ استہزاءً کہتے کہ "لاؤ ذرا دکھاؤ تو سہی کہ وہ عذاب ہے کہاں؟" اور جب خدا کا قانونِ مہلت ظہورِ نتائج میں اپنا وقت لیتا تو وہ مذاق اڑاتے کہ "بس یونہی دھمکیاں دیتے ہو!"

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۱۱)

اگر ان پر عذاب کا نازل کرنا ایک مقررہ مدت تک ہم تاخیر میں ڈال دیں، تو یہ ضرور کہنے لگیں "کونسی بات ہے جو اسے روک رہی ہے؟" سو سن رکھو، جس دن عذاب ان پر آئیگا تو پھر کسی کے ٹالے ٹلنے والا نہیں اور جس بات کی یہ ہنسی اڑایا کرتے تھے، تم دیکھو گے کہ، وہی انہیں آلگی!

یہ اس قسم کی باتیں کرنے والے کون تھے؟ وہی گروہ "مترفین" جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ؕ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ (۲۳/۶۴-۶۶)

حتیٰ کہ (دیکھو) جب (گروہ منکرین میں سے) ان کے عشرت کوش طبقہ کو ہم عذاب کے ساتھ پکڑیں گے تو یکایک وہ مدد کے لئے چلانے لگیں گے۔ (مگر ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی بلکہ صاف کہہ دیا جائیگا) "آج کسی امداد کے لئے نہ چلاؤ۔ دراصل ہماری طرف سے تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائیگی (کچھ یاد ہے کہ) تمہارے سامنے میری آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو تم (اُنھیں قبول تو کیا کرتے، ان سے اعراض اور استہزاء کرتے ہوئے) اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جایا کرتے تھے؟"

منافقین

اور پھر منافقین۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ؁ (۹/۶۴)

منافق اس بات سے (بھی) ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو، ان کے بارے میں کوئی سورت نازل ہو جائے اور جو کچھ اُن کے دلوں میں (چھپا) ہے، وہ اُنہیں (علانیہ) جتا دے۔ (تو اے پیغمبر!) تم ان سے کہہ دو "تم (اپنی عادت کے مطابق) تمسخر کرتے رہو۔ یقیناً اللہ اب وہ بات (پوشیدگی سے) نکال کر ظاہر کر دینے والا ہے جس کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے۔"

مجنون! طنز و استہزاء کے ضمن میں یہ بھی تھا کہ وہ آپ کو مجنون (پاگل) کہتے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؀ اَفْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ؀ (۳۴/۷-۸)

اور جن لوگوں نے انکار حق کی راہ اختیار کی ہے، وہ (باہر سے آئے ہوئے اجنبی لوگوں کو بہکانے کے لئے) کہتے ہیں "کیا ہم تمہیں ایسا آدمی بتلائیں جو تمہیں بتاتا ہے کہ جب تم (مر گل کے) پوری طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے تو اس کے بعد پھر تمکو ایک نئی زندگی دی جائے گی؟ (جس کے بعد مکافات عمل کے لئے تمہیں خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہوگا) معلوم نہیں وہ خدا کے نام پر جھوٹی تہمت باندھ رہا ہے یا اُسے جنون ہو گیا ہے۔" (اے مخالفین حق و صداقت یاد رکھو، نہ ہمارا پیغمبر کوئی جھوٹی تہمت باندھ رہا ہے اور نہ ہی اُسے جنون ہو گیا ہے) بلکہ حقیقت یہی ہے کہ جو لوگ آخرت (کے دن اور مکافاتِ عمل) پر یقین نہیں رکھتے وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہوں گے اور (اپنی اس بے یقینی کی وجہ سے) وہ بڑی دور کی گمراہی میں گرفتار ہیں!

صرف قیامت کے متعلق ہی نہیں بلکہ دعوت توحید پر بھی یہی کہتے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ؀ وَيَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ؀ (۳۷/۳۵-۳۶)

(دیکھو) یہ حقیقت ہے کہ جب ان سے کہا جاتا تھا (خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔" تو وہ غرور سے تن جاتے تھے اور کہا کرتے تھے "کیا ہم ایک پاگل شاعر کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں گے؟ (ہرگز نہیں)"

خود قرآن کریم کے متعلق بھی ایسا ہی کہتے۔

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ (۴۴/۱۴)

اس کے بعد بھی وہ (ہمارے) پیغمبر سے پیٹھ موڑ کر چل دیتے ہیں اور کہتے ہیں "وہ تو سکھایا پڑھایا ہوا پاگل ہے"۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۝ (۶۸/۵۱)

اور (اے پیغمبر!) جن لوگوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کی ہے وہ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بعید نہیں (شاید) تجھے اپنی آنکھوں آنکھوں میں کھا جائیں گے۔ (چنانچہ) جب وہ خدا کے ذکر (قرآن) کو سنتے ہیں تو (جب اور کچھ بن نہیں پڑتا تو) کہنے لگتے ہیں "سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ پاگل ہو گیا ہے"۔

مسحور ہے

عربوں میں (اور ازمنۂ قدیمہ میں ہر جگہ) جادو پر بڑا اعتقاد تھا۔ چنانچہ وہ یہ بھی کہتے کہ حضورؐ پر کسی نے جادو کر رکھا ہے اسی لئے یہ اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ۝ (۱۷/۴۷)

(اے پیغمبر!) جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جو کچھ ان کا سننا ہوتا ہے، اسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور جب یہ ظالم باہم سرگوشیاں کرتے ہیں، اور سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے ہیں "تم جس آدمی کے پیچھے پڑے ہو، وہ اس کے سوا کیا ہے کہ جادو سے مارا ہوا ہے" تو اس سے بھی ہم بےخبر نہیں ہیں!

سورۂ فرقان میں ہے۔

أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ۝ (۲۵/۸)

(اور دیکھو وہ منکرینِ حق کہتے ہیں کہ یہ رسول ہماری ہی طرح کا ایک انسان کیوں ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ جلو میں فرشتے کیوں نہیں چلتے) یا ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ (آسمان سے) اس کی طرف کوئی خزانہ ڈال دیا جائے یا (مکہ کی پتھریلی زمین میں) اس کے لئے کوئی باغ لگ جائے جس سے وہ کھایا کرے"۔ اور یہ ظالم تو یہاں تک کہہ گذرتے ہیں کہ "(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جس آدمی کے تم پیچھے ہو لئے ہو وہ اس کے سوا کیا ہے کہ ایک جادو کا مارا ہوا شخص ہے"۔

شاعر ہے!

عربوں میں شعراء کے متعلق عقیدہ تھا کہ ان کے پاس جن آتے ہیں جو اُنہیں اس قسم کی باتیں سکھا جاتے ہیں۔ حضورؐ کے متعلق بھی وہ کہتے کہ یہ شاعر ہے جو تخیلات کی دنیا میں بیٹھا افسانہ طرازی

کرتا رہتا ہے۔

بَلْ قَالُوْا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَا اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (۲۱/۵)

(اتنا ہی نہیں)، بلکہ انھوں نے کہا "یہ محض خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ بلکہ من گھڑت دعویٰ ہے۔ نہیں، بلکہ یہ شاعر ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی (نزول ہلاکت کی) نشانی ہمیں لا دکھائے۔ جس طرح اگلے وقتوں کے لوگ نشانیوں کے ساتھ بھیجے جا چکے ہیں"۔

اس لئے وہ کہتے کہ کیا ہم ایک ایسے شخص کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷/۳۶)

اور (دیکھو) وہ (منکرین حق) کہتے ہیں کہ کیا ہم ایک پاگل شاعر کے لئے اپنے معبودوں (اور دیوتاؤں) کو چھوڑ دیں؟ (ہرگز نہیں)

سورۂ طور میں ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰)

بلکہ وہ منکرین حق (یہاں تک) کہہ گذرتے ہیں کہ وہ (محمد) تو شاعر ہے (جسکے تخیل کی بلند پروازیاں خاص وقت تک کے لئے ہیں)، ہم (اور شاعروں کی طرح) اس کے لئے بھی زمانہ کے کسی بڑے حادثہ کا انتظار کر رہے ہیں (جس سے اس کے تخیل کی بلند پروازی فنا ہو جائے گی)

اہل کتاب کی مخالفت

انہیں مخالفین میں ایک گروہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا بھی تھا۔ ان کی آسمانی کتابوں میں (جیسی کچھ بھی وہ ان کے پاس رہ گئی تھیں) ایک آنے والے نبی آخرالزمان کی بشارات موجود تھیں اور وہ اس موعودہ رسول کے انتظار میں تھے۔ نبی اکرمؐ میں اس آنے والے کی تمام علامات موجود تھیں اس لئے وہ حضورؐ کو اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ (۲/۱۴۶)

اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (یعنی اہل کتاب کے علماء) اُن پر حقیقت حال پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ پیغمبر اسلام کو ویسے ہی پہچان گئے ہیں، جس طرح اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو دیدہ و دانستہ سچائی کو چھپاتا ہے، (اور اس کا

اعتراف نہیں کرتا۔ پس جن لوگوں کی حق فراموشیوں کا یہ حال ہو، اُن سے اعتراف حق کی کیا امید ہو سکتی ہے؟!

سورۂ انعام میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (۶/۲۰)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (یعنی یہود و نصاریٰ، وہ حقیقت حال سے بےخبر نہیں ہیں) وہ اس کی سچائی (یعنی پیغمبر اسلام کی سچائی) کو اسی طرح پہچان گئے ہیں، جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں (کہ کسی طرح کا بھی اس میں شک و شبہ نہیں ہوتا لیکن) جن لوگوں نے (اپنے ہاتھوں) اپنے کو تباہ کر لیا ہے، وہ کبھی یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

لیکن انھوں نے اپنی کتابوں کو پس پشت ڈال دیا اور قبولیت حق سے انکار کر دیا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۲/۱۰۱)

چنانچہ (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اللہ کا ایک رسول اس کتاب کی تعلیم کو سچ کر کے دکھاتا ہوا آیا جو پہلے سے اُن کے پاس موجود تھی تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے جو کتاب الٰہی کے حامل تھے، کتاب الٰہی اس طرح پس پشت ڈال دی، گویا اُسے جانتے ہی نہیں!

اس انکار و جحود کی وجوہات بھی قریب قریب وہی تھیں جو کفار عرب کے کفر و تکذیب کا باعث ہوئی تھیں۔ یہود اپنے آپ کو اَبْنَآءُ اللّٰہ کہتے تھے اس لئے وہ کسی غیر بنی اسرائیل کی اطاعت میں ذلت محسوس کرتے تھے۔ اس لئے یہی قومی تفاخر اور نسلی عصبیت ان کے قبول حق کی راہ میں عناں گیر ہو گئی۔ اور انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ غیر بنی اسرائیلی کو شرف رسالت کے لئے کیوں منتخب کر لیا گیا ہے؟

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ (۲/۸۹-۹۰)

چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لئے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تعلیم کو سچ کر کے دکھانے والی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود تھی، تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے ظہور کے منتظر تھے، اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لیکر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے، لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی تو صاف انکار کر گئے (اور اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی) پس ان لوگوں پر جو (دیدہ و دانستہ) کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے۔ (اور اس کا قانون یہی ہے کہ ایسوں پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی!) (افسوس ان کی شقاوت پر!) کیا ہی بری قیمت ہے جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کا سودا چکایا! انھوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی سچائی سے (دیدہ و دانستہ) انکار کیا اور صرف اس لئے انکار کیا کہ وہ جس کسی پر چاہتا ہے، اپنا فضل نازل کر دیتا ہے (اس میں خود ان کی نسل و جماعت کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے پہلے ہی ذلیل و خوار ہو چکے ہیں، لیکن اس نئے انکار سے اور زیادہ ذلت و خواری کے مستوجب ہوئے) پس اللہ کا غضب بھی یکے بعد دیگرے اُن کے حصے میں آیا، اور اس کا قانون یہی ہے کہ انکار حق کرنے والوں کیلئے (ہمیشہ) رسوا کن عذاب ہوتا ہے!

مذہبی سیادت کی وجہ سے

اس نسلی عصبیت کے بعد ان کے سامنے مذہبی سیادت کا سوال تھا۔ قرآن اس برہمنیت (Priesthood) کے استیصال کے لئے آیا تھا جسے انھوں نے بطور "خدائی استحقاق" اپنے لئے مختص کر رکھا تھا، اور جس کی رو سے وہ تمام قوم کے قلوب و اذہان پر حکومت کرتے تھے۔ قرآن پر ایمان لانے سے یہ سیادت و ریاست ختم ہو جاتی تھی اس لئے وہ کہتے کہ اگر اس تعلیم کو ہماری مرضی کے مطابق بدل دو تو ہم ایمان لے آئیں گے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۰:۱۵)

اور (اے پیغمبر!) جب تم ہماری واضح آیتیں انھیں پڑھکر سناتے ہو، تو جو لوگ (حیات دنیوی میں مست ہو کر مکافات عمل کو بھلا بیٹھے ہیں کہ گویا مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں "اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن لا کر سناؤ، یا اسی کے مطالب میں کچھ رد و بدل کر دو۔" (اے پیغمبر!) تم کہدو "میرا یہ مقدور نہیں کہ اپنے جی سے اس میں رد و بدل کر دوں، میں تو بس اُسی حکم کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی کیا

جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کروں تو عذاب کا ایک بہت بڑا دن آنے والا ہے!"

اس مطالبہ کا محرک جذبہ تو وہی اپنے "خدائی حقوق" کا تحفظ تھا لیکن اسے وہ اس مقدس نقاب میں چھپاتے تھے کہ قرآن کی تعلیم ہماری کتاب کی تعلیم کے خلاف جاتی ہے۔ اور اس دعوے کے اثبات میں وہ یونہی آکر کہہ دیتے کہ ہمارے ہاں یہ لکھا ہے اور وہ لکھا ہے۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۷۸)

اور (دیکھو) اہل کتاب میں (ان کے عالموں اور پیشواؤں کا) ایک گروہ ہے جو کتاب اللہ پڑھتے ہوئے اس میں الٹ پھیر کرتے (اور اس کا مطلب کچھ سے کچھ بنا دیتے) ہیں تاکہ تم خیال کرو کہ جو کچھ یہ سنا رہے ہیں، کتاب اللہ میں سے ہے، حالانکہ وہ قطعاً کتاب اللہ (کے احکام میں) سے نہیں ہوتا، اور وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ جو کچھ تمہیں بتایا گیا ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کے نام سے جھوٹ بولتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں!

حالانکہ درحقیقت وہ چاہتے یہ تھے کہ حضورؐ خود ان کے مذہب کے تابع ہو جائیں اور انہی کے جذبات و مقاصد کی تائید کرنے لگ جائیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ (۲/۱۲۰)

اور حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی کتنی ہی نشانیاں پیش کرو، لیکن یہود اور نصاریٰ تم سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو صرف اسی حالت میں خوش ہو سکتے ہیں کہ تم ان کی (بنائی ہوئی) ملتوں کے تابع ہو جاؤ۔ پس تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ خدا کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ہدایت کی حقیقی راہ ہے (نہ کہ تمہاری خود ساختہ ملتیں۔ اور میری راہ وہی حقیقی ہدایت کی راہ ہے) اور یاد رکھو، اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آ چکی ہے، تو (یہ ہدایت الٰہی کی صریح خلاف ورزی ہوگی، اور پھر) اللہ کی دوستی اور مددگاری سے یکسر محروم ہو جاؤ گے!

منافقانہ انداز سے

جیسا کہ ہم جلد سوم (قصہ بنی اسرائیل) میں دیکھ چکے ہیں، یہودیوں کے جوہر انسانیت ایک ایک کرکے سب مٹ چکے تھے اس لئے جہاں ان کی دوستی ناقابل اعتماد تھی وہاں ان کی دشمنی بھی شمشیر عریاں کے بجائے خنجر درآستین منافقت کے نقاب میں مستور تھی۔ یہ لوگ منافقانہ طور پر ایمان لے آتے اور یوں اس جماعت کے اندر آکر ان میں تشتت و افتراق اور مداہنت و ارتداد کی ناکام کوششیں کرکے اپنی آتش حسد کے ٹھنڈا کرنے کا سامان فراہم کرتے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۲/۱۰۹)

یاد رکھو، اہل کتاب میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو چاہتے ہیں، تمہیں ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا دیں، اور اگرچہ ان پر سچائی ظاہر ہو چکی ہے، لیکن پھر بھی اس حسد کی وجہ سے جس کی جلن ان کے اندر ہے، پسند نہیں کرتے کہ تم راہ حق پر ثابت قدم رہو۔ پس چاہیئے کہ (ان سے لڑنے جھگڑنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، اور) عفو و درگذر سے کام لو۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے (اور وہ حق کو فتح مند کرکے بتلا دے کہ کون حق پر تھا اور کس کی جگہ باطل پرستی کی جگہ تھی!) اور بلاشبہ وہ ہر بات پر قادر ہے!

وہ باہمی سازشیں کرتے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت کے اندر گھس کر ان کے نظام ضبط (Morale) میں انتشار پیدا کرنا چاہیے۔

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَن يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (۳/۷۲-۷۳)

اور (دیکھو) اہل کتاب میں ایک گروہ ہے جو کہتا ہے (مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے، ایسا کرو کہ) صبح ان کی کتاب پر ایمان لے آؤ، شام کو انکار کردو۔ اس طرح عجب نہیں وہ (لوگوں کو اسلام سے پھرتے ہوئے دیکھ کر خود بھی) پھر جائیں۔ اور وہ (آپس میں کہتے ہیں) "دیکھو ان لوگوں کے

؎ تفصیل اس اجمال کی "منافقت" کے عنوان میں آجائے گی۔

سوا جو تمہارے دین کی پیروی کرنے والے ہوں، اور کسی کی بات نہ مانو اگرچہ وہ کتنی ہی اچھی بات کیوں نہ کہتا ہو" اے پیغمبر! تم ان سے کہدو، "ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے اور وہ کسی خاص گروہ اور نسل ہی کی میراث نہیں ہے کہ اور کسی کا اس میں حصہ نہ ہو۔ جو انسان بھی اس پر چلے گا، ہدایت یافتہ ہوگا۔ خواہ کسی گروہ و نسل سے تعلق رکھتا ہو" اور (وہ کہتے ہیں) "یہ بات بھی نہ مانو کہ جیسا کچھ دین تمہیں دیا گیا ہے، ویسا کسی دوسرے انسان کو ملا ہو، یا یہ کہ تمہارے پروردگار کے حضور تمہارے خلاف کسی کی حجت چل سکتی ہو" (اے پیغمبر!) تم ان لوگوں سے کہو "(یہ کیا زعم باطل ہے جس میں تم مبتلا ہو گئے ہو؟) فضل و بخشش تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے مالا مال کر دیتا ہے۔ وہ بڑی ہی وسعت رکھنے والا اور (اہل نا اہل کو) جاننے والا ہے" ا

ہجوم مخالفت

یہ تھیں مخالفین و معاندین کی سرکشی و طغیان کی وہ آندھیاں جو حق و صداقت کی اس شمع فروزاں کو بجھانے کے لئے ہجوم کر کے اٹھیں اور اللہ کے اس ایک بندے کو جو دنیا کے ہر معیار و قیاس کے مطابق بالکل بے یار و مددگار اور بیکس و لاچار تھا، بگولے کے سے عفریتی جوش و خروش کے ساتھ چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انھوں نے جوش مخالفت میں ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے لئے کیا کیا صبر آزما اور ہوش ربا حربے استعمال کئے، کتب روایات و سیر نے ان کی تفصیل کو اپنے دامن میں محفوظ رکھا ہے تاکہ وہ ہر اس داعی انقلاب کے لئے جو نوع انسانی کے اس مبلغ اعظم کے نقوش قدم کی اتباع میں حق و صداقت کی آواز بلند کرنا چاہے وجہ تثبیت قلب اور باعث تسکین روح ہوں اور راستہ کی سختیاں اس کے پائے استقلال میں لغزش اور عزم و استقامت میں تزلزل نہ پیدا ہونے دیں۔ اور یہ سب ہجوم بلا اور انبوہ تکالیف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف کیوں بلاتا ہے۔ قرآن کریم نے ان تفصیلی واقعات کا ذکر کئے بغیر اس حقیقت کو اپنی معجزانہ بلاغت سے ایک آیت میں مصور کر دیا ہے۔ سابقہ عنوان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ کو ارشاد ہوا تھا کہ

قُمْ فَأَنْذِرْ (۷۴: ۲)

اٹھ اور ان لوگوں کو ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کر!

سورہ جن میں ہے

وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ (۷۲: ۱۹)

اور جب اللہ کا یہ بندہ خدا کو پکارنے کے لئے اٹھا تو

تو

كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۱۹:۷۲)

مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اسے پسٹ گئے۔

مخالفت و مخاصمت کی تمام جزئیات اور عناد و انتقام کی جملہ تفاصیل اس اجمال کے اندر آگئیں۔

قریش جیسی شعلہ صفت قوم کے لئے یہ مشکل نہ تھا کہ جوش مخالفت میں اٹھتے اور اس داعیٔ انقلاب کو قتل کر دیتے لیکن انھیں یہ معلوم تھا کہ بنو ہاشم اپنے قبیلہ کے خون کا انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور پھر چونکہ قریب قریب ہر ایک قبیلہ سے دو ایک آدمی اسلام لا چکے تھے اس لئے اغلب تھا کہ قتل و انتقام قتل کا یہ سلسلہ حد و د فراموش ہو جاتا۔ قریش اس عالمگیر خوں ریزی کو بھی مول لے لیتے لیکن وہ مسلسل خانہ جنگیوں سے اس قدر تھک چکے تھے کہ وہ اپنے اندر اس قسم کی جنگِ عمومی میں الجھنے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے قتل و خوں ریزی کے بجائے ایذا رسانی اور تکلیف دہی کا شیوہ اختیار کیا اور اس درندگی میں بھی پہل ان مسلمانوں سے کی جو غریب و نادار اور بے یار و مددگار تھے یا جن کے قبیلے کمزور سمجھے جاتے تھے۔ ذرا مئی اور جون کے مہینوں میں صحرائے عرب کی چلچلاتی دھوپ اور تپتی ریت کا اندازہ لگایئے۔ طائرِ نگاہ اس تصور سے کاشانۂ چشم میں چھپ جاتا ہے۔ اس عالم سوز تپش میں وہ ان کمزور مسلمانوں کو پکڑتے، بھٹی کی طرح جلتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے اور چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں۔ بدن پر گرم گرم بالو بچھاتے۔ اس پر بھی صبر نہ آتا تو لوہا گرم کرتے۔ اس سے داغتے۔

ایذا رسانی کے انوکھے انداز

بلا کشانِ محبت

حضرت خبابؓ قبیلۂ تمیم سے تھے اور جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے تھے۔ ابتدائی زمانہ میں ہی سعادتِ ایمان سے مشرف ہو گئے۔ قریش انھیں طرح طرح کی جانگسل اور روح فرسا تکالیف دیا کرتے تھے۔ ایک دن دہکتے ہوئے انگارے زمین پر بچھائے اور ان پر انھیں چت لٹا دیا اور ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں۔ مدتوں بعد آپ نے حضرت عمرؓ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی جو کھال اُدھڑ جانے سے برص کے داغوں کی طرح سفید ہو رہی تھی۔[۵]

حضرت بلالؓ۔ ہاں وہی بلالؓ کہ جس کے نام سے رگِ محبت میں تحرک اور نبضِ عشق میں تموج پیدا ہو جاتا ہے حبشی النسل اور امیہ ابن خلف کے غلام تھے۔ ٹھیک دوپہر کے وقت امیہ انھیں جلتی ریت پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا۔ اس سے بھی جی نہ بھرتا تو گلے میں رسی باندھ کر لڑکوں کے حوالے کر دیتا جو انھیں شہر کے گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے۔

حضرت یاسرؓ۔ یمن کے رہنے والے۔ مکہ کے غرباء سے متعلق لیکن سارا گھرانا خود، بیوی حضرت سمیہؓ اور بیٹا

---

[۵] یہ تمام واقعات طبقات ابن سعد میں مذکور ہیں۔

حضرت عمارؓ) دولت اسلام سے مالا مال، خود اذیتیں اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہوگئے۔ بیوی کو ابوجہل کی برچھی نے جنت میں پہونچادیا اور حضرت عمارؓ پیہم تکالیف کا نشانہ بنتے رہے۔

انہی بلاکشانِ محبت میں حضرت صہیب رومیؓ اور ابو فکیہہؓ، قریش کے غلام اور لُبینہؓ۔ زنیرہؓ۔ ہندیہؓ۔ اور ام عبیسؓ ان کی کنیزیں تھیں۔ ان پر اس قدر مظالم توڑے جاتے کہ انھیں دیکھ کر فضا تھرتھرا اُٹھتی۔ لیکن جہاں یہ مظالم اپنی قساوت اور سفاکی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے وہاں یہ حقیقت بھی اپنی مثال نہیں پیش کرسکتی کہ ابتلاء و آزمائش کے اس طویل اور صبر آزما عرصہ میں کوئی ایک متنفس (مرد یا عورت) ایسا نہ تھا جس نے زبان سے کہنا تو ایک طرف، دل کی گہرائیوں میں بھی اس امر کا ہلکا سا خیال کیا ہو کہ چلو! اِن کی سی کہکر جان تو بچالو۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان پر جس قدر سختیاں زیادہ ہوتیں اسی قدر ان کے ایمان میں پختگی، ہمت میں استواری، حوصلوں میں بلندی، عزم میں ثبات اور ارادوں میں استحکام پیدا ہوجاتا۔ ہر آنے والی مصیبت ان کی نگاہوں میں چمک اور روح میں بالیدگی پیدا کردیتی۔ وہ ان کی قصابانہ بے رحمیوں اور سفاکانہ سختیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے اور ان کے خون کا ایک ایک قطرہ دربار فرعون کے ساحرین کی ہمنوائی میں پکار پکار کر کہتا کہ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ۔ آسمان کے فرشتے اس عبرت انگیز منظر پر محوِ حیرت تھے اور بارگہ صمدیت میں سجدہ کناں اعتراف کرتے تھے کہ بارالٰہا! تونے سچ کہا تھا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ آب و گِل کے ہیولیٰ، آدم میں اس قسم کے فولادی جوہر بھی مضمر ہیں کہ زمین و آسمان کی گردشیں ملکر بھی اُنھیں پیس نہ سکیں۔ کسی انقلابی تحریک کے لئے یہ واقعہ کچھ کم باعث فخر و مباہات نہیں کہ اس جماعت کے کسی ایک فرد نے نہ کبھی غداری کی نہ خود اس سے پھرا۔ بلکہ بلاؤں کا ہجوم اور سختیوں کا انبوہ اُن کے نصب العین کی صداقت کے یقین کو پختہ سے پختہ تر کرتا چلا گیا اور ان کے سینے تسکین و طمانیت کی جنت گاہ بنتے چلے گئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ (۴۱: ۳۰-۳۲)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! دیکھو) حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے (زبان سے) کہا کہ ہمارا پروردگار (صرف) اللہ ہے اور دل کے ارادہ اور عمل سے اس پر جم کر کھڑے ہوگئے تو خدا کی طرف سے ان پر سکون و طمانیت کی بارشیں ہوتی ہیں یعنی اس کے) فرشتے ان کے پاس (یہ بشارات الٰہی لیکر) اترتے ہیں کہ نہ تم ڈرو اور نہ غمگین ہو (آزمائش کی گھڑی پوری ہونے والی ہے) اور اس جنت کی خوشخبری حاصل کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ دنیوی زندگی اور آخرت میں (دونوں جگہ) ہم تمہارے مددگار ہیں اور اخروی زندگی

میں تمہارے لئے وہ تمام چیزیں مہیا ہوں گی جنکی تمہیں خواہش ہوگی اور جن کی تم فرمائش کروگے۔ وہاں تمہاری
میزبانی وہ خدا کریگا جو بڑا ہی بخشش کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے!

ان کی اسی استقامت و عزیمت سے ان جیسی اور سعید روحیں بھی متأثر ہوتیں اور آگے بڑھ کر ان کی جماعت میں شامل ہو جاتیں اور اسی طرح اس انقلاب کی لہروں کی وسعت اور بڑھتی چلی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ حق و صداقت کا فروغ اس کے پیروؤں کے یقین و ثبات کی نسبت سے ہوتا ہے۔ ان کا ایمانِ محکم اس جہانِ کاخ وکُو میں زلزلہ پیدا کر دیتا ہے

ایمان کی بے پناہ قوت

طرح نومی افگند اندر ضمیر کائنات
نالہ ہا کز سینۂ اہل نیاز آید بروں

قوموں کی موت و حیات کا مدار ان کی قوت ایمانی پر ہے۔ اگر انھیں اپنے مسلک زندگی کی صداقت پر یقین ہے اور وہ یقین دل کی گہرائیوں میں پیوست، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انھیں ان کے مقام سے نیچے نہیں گرا سکتی۔

ثباتِ زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں

لیکن جہاں ان کے یقین کی قوت کمزور ہوتی ہے موت کا پنجہ انھیں فوراً دبوچ لیتا ہے —— آدم ہمیر داز بے یقینی —— مردانِ مؤمن کی وہ جماعت قدسیہ جن کا ذکر اس وقت ہماری کشت قلوب کے لئے وجہ آبیاری ہے' اسی قوت ایمانیہ کو لئے ہوئے تھی جس کی وجہ سے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت اور سخت سے سخت تکلیف ان کے نزدیک ہیچ تھی۔ ہم "مردم شماری کے رجسٹر" کے مسلمان آج کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ایمان کی قوت انسان کے اندر کیا تبدیلی پیدا کر دیتی ہے؟
آج کا مسلمان نہ ایمان کے ذوق سے بہرہ یاب نہ عمل کی چاشنی سے لذت گیر۔ اسے کون بتائے کہ

یقیں اللہ مستی خود گزینی — یقیں مثل خلیل آتش نشینی
غلامی سے بتر ہے بے یقینی — سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار

خود اپنوں کے ہاتھوں

یہ تھے وہ لوگ جو قریش کی نگاہ میں بے یار و مددگار تھے اور ان کے قبیلے کمزور شمار کئے جاتے تھے لیکن طاقتور قبیلوں کے افراد بھی اس اذیت رسانی سے محفوظ نہ تھے۔ وہ غیروں کے ہاتھوں ستائے نہیں جاتے تھے بلکہ خود ان کے اعزا و اقربا انھیں تنگ کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ قریش میں صاحب عزت و ثروت تھے اور ممتاز قبیلے کے فرد۔ جب وہ اسلام لائے ہیں تو خود اُن کا چچا انھیں رسی سے باندھ کر مارا کرتا تھا (حالانکہ وہ بچے نہیں تھے، سن رسیدہ تھے) اسی طرح حضرت زبیرؓ ابن العوام کو بھی ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر دھواں دیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی اور بہنوئی سعید بن زیدؓ ایمان لائے تو حضرت عمرؓ نے (جو اس وقت تک حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے) انھیں رسیوں سے باندھ دیا۔ حتی کہ خود اپنی بہن

(فاطمہؓ) کو بھی زد و کوب کیا کہ وہ بھی ایمان لے آئی تھیں۔

حبش کی طرف ہجرت

جب نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جو مسلمان کمزور تھے اُنھیں ہر مستبد و سرکش ہدفِ مظالم بنا رہا تھا اور جو صاحب عزت و ثروت تھے انھیں ان کے اہل خاندان ایذا پہنچاتے تھے تو آپؐ نے تجویز فرمایا کہ یہ لوگ حبش کی طرف ہجرت کر جائیں۔ حبش سے قریش کے تاجرانہ تعلقات تھے اس لئے وہ ملک ان کے لئے نامانوس نہیں تھا۔ سب سے پہلے (ماہ رجب ۵ نبوی میں) حضورؐ کے ایماء سے گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن میں حضرت عثمانؓ اور ان کی حرم محترمہ حضرت رقیہؓ (حضورؐ کی صاحبزادی) بھی شامل تھیں۔ اس ہجرت کا اولین سبب تو وہی نظر آتا ہے جو اوپر مذکور ہے لیکن جب ہم مہاجرین کی فہرست پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں اکثریت ان حضرات کی نظر آتی ہے جو صاحبانِ ثروت و اقتدار تھے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس پہلی ہجرت سے مقصود صرف مظلومین کے لئے حفاظت گاہ کی تلاش نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پیغام اسلام کو عرب کی چار دیواری سے باہر پہنچانا بھی تھا۔ حبش کے بادشاہ نجاشی نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور یہ وہاں امن و عافیت سے زندگی بسر کرنے لگے لیکن قریش کا جذبۂ انتقام انھیں کب چین سے بیٹھنے دیتا تھا! انھوں نے باہمی مشورے کئے اور بالآخر یہ قرار پایا کہ نجاشی کے پاس سفیر بھیجے جائیں۔ اس سفارت کا امیر عمرو بن العاص تھا (یہ وہی حضرت عمرو بن العاصؓ ہیں جو لوائے اسلام کے سائے میں فاتح مصر کی حیثیت سے دنیا میں متعارف ہوئے) یہ سفارت بڑے طمطراق سے جانب حبش روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچکر یہ پہلے نجاشی کے اہل دربار سے ملے۔ ان کی خدمت میں نذرانے پیش کئے پھر انہیں ورغلایا کہ یہ لوگ جو یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں انھوں نے ایک نیا فتنہ اٹھایا ہے۔ ہم ان کی بازیابی کے لئے نجاشی سے درخواست کرنے آئے ہیں، آپ بھی ہماری تائید کیجئے گا۔ دوسرے دن یہ سفارت نجاشی سے ملی اور اپنی درخواست پیش کی۔ اہل دربار نے ان کے مطالبہ کی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے کونسا نیا مذہب ایجاد کیا ہے جو عیسائیوں اور عربوں (دونوں) کے مذہب کے خلاف ہے۔

نجاشی کے دربار میں

ذرا اس واقعہ کے احوال و ظروف پر غور کیجئے۔ چند گنتی کے مسلمان، اپنوں کے ستائے ہوئے، غیر ملک میں پناہ گزین ہیں۔ دشمن وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بادشاہ غیر قوم سے ہی متعلق نہیں بلکہ غیر مذہب (عیسائیت) سے بھی۔ سفارت، عرب کے ارباب ثروت و اقتدار کی نمائندگی کر رہی ہے جن سے اہل حبش کے تاجرانہ تعلقات ہیں جنھیں وہ بہرحال استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ کو ان پناہ گزین مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ وہ ان سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو دربار

ملہ بے یار و مددگار لوگوں میں اکثریت ان کی تھی جو ابھی تک مشرکین کی غلامی سے رستگاری حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لئے وہ اس ہجرت میں شریک نہ ہو سکے۔

میں بلاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ تم نے کونسا مذہب ایجاد کیا ہے جو نصرانیت کے بھی خلاف ہے۔ ذرا غور کیجئے موقعہ کی نزاکت پر! مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفر رضؓ آگے بڑھے اور کہا۔

اَیُّھَا الْمَلِكُ! ہم ایک جاہل قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے۔ نجاست میں آلودہ تھے۔ مردار کھاتے تھے، بیہودہ بکا کرتے تھے ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کیا کرتے تھے۔ ہم میں انسانیت کا نشان نہ تھا۔ کوئی قاعدہ اور قانون نہ تھا۔ طاقتور لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ ایسی حالت میں ہم میں اللہ نے ایک شخص کو پیدا کیا جس کی صداقت اور دیانت، شرافت اور راستبازی سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہمیں تمام باتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کے سامنے جھکنے کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم سچ بولا کریں۔ خوں ریزی سے باز آئیں۔ غریبوں اور یتیموں کا مال نہ کھایا کریں۔ ہمسایوں کو آرام دیں۔ کسی کی عفت پر داغ تہمت نہ لگائیں۔ برائیوں سے بچیں۔ نماز پڑھیں۔ غریبوں کی امداد میں مال خرچ کریں۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک چھوڑا۔ تمام اعمال خبیثہ سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی۔ ہمیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ جب ہم مجبور ہوگئے تو آپ کے ملک میں آکر پناہ لی۔ اب یہ یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے اور مجبور کرتے ہیں کہ ہم پھر اسی گمراہی میں واپس چلے جائیں۔

حضرت جعفرؓ یہ تقریر کر رہے تھے اور دربار پر سناٹا چھا رہا تھا۔ نجاشی نے کہا کہ جو کلام تمہارے پیغمبر پر اترا ہے مجھے اس میں سے کچھ سناؤ۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کی۔ ایک تو قرآن اور پھر پڑھنے والے اس صدق و اخلاص کے پیکر!

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر، جو تھا رازداں اپنا

نجاشی پر ایسا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سر اٹھایا اور کہا کہ "خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی شمع کی کرنیں ہیں۔" یہ کہکر سفرائے قریش سے کہا کہ جاؤ۔ میں ان مظلوموں کو واپس نہیں دوں گا۔

سفارت قریش اس جواب سے بہت مایوس ہوئی لیکن ابھی انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اب انھوں نے نجاشی کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ ڈالنا چاہا۔ دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا کہ آپ کو معلوم بھی ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو پھر بلا بھیجا۔

اب ایک مرتبہ پھر اس موقعہ کی نزاکت کو سامنے لایئے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا یا کم از کم خدا کا بیٹا

مانتے تھے اور اسلام کھلے لفظوں میں الوہیت اور ابنیت کے اس عقیدہ کا ابطال کرتا ہے۔ سفرائے قریش اس حقیقت حال سے واقف تھے۔ اسی لئے انھوں نے یہ چال چلی تھی۔ ان حالات میں دورحاضر کی مصلحت آمیز "پالیسی" کا جو کچھ تقاضا ہوسکتا تھا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن ایمان کا تقاضا کچھ اور تھا۔ حضرت جعفرؓ نے نہایت بے باکانہ کہا کہ ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے اور بس۔ یہ سن کر دربار کے اساقف وبطاریق کے چہرے جوش غضب سے تمتما اٹھے۔ سفرائے مکہ جی میں خوش ہوئے کہ تیر نشانہ پر لگا۔ لیکن نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ "واللہ۔ جو کچھ تم نے کہا (حضرت) عیسٰیؑ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں"۔ اس طرح قریش کی سفارت خاسر ونامراد واپس آگئی[۱]۔

خود حضورؐ کے مخالف

یہ تو وہ ہجوم زلازل تھا جن سے جماعت مسلمین کو گھیرا جاتا تھا۔ لیکن جن مصائب وآلام کا نشانہ خود حضورؐ کی ذات اقدس کو بنایا جاتا تھا وہ اپنی شدت اور سختی میں ان سے کچھ کم نہ تھے۔ مخالفین آپ کے قبیلہ کی حصانت وحفاظت کے پیش نظر آپ پر دست درازی نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے وہ کمینہ حرکات پر اتر آئے۔ وہ آپؐ کے راستوں میں کانٹے بچھاتے۔ نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے۔ حضورؐ سجدہ میں جاتے تو نجاست کا ڈھیر اوپر ڈالدیتے۔ باہر تشریف لیجاتے تو شریر لڑکوں کا غول پیچھے لگادیتے۔ آپ کسی مجمع میں دعوت اسلام دیتے تو ابولہب برابر چلاتا جاتا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، یہ لوگ حضورؐ کی زندگی پر ہاتھ ڈالنے میں بھی کبھی توقف نہ کرتے لیکن آپ کے قبیلہ کی حمایت کا خیال ان کی راہ میں مانع تھا۔

یہ ابوطالب کے پاس پہنچے

بنو ہاشم میں اس وقت ابوطالب سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ اور اسی چچا کی حفاظت آپؐ کو حاصل تھی۔ جب رؤسائے قریش نے دیکھا کہ ان کی عام ایذارسانیوں کا آپؐ پر کچھ اثر نہیں ہوتا تو ان سب کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کو اتنا سخت سست کہتا ہے کہ ہم میں سننے کی تاب نہیں رہتی۔ ہم اب تنگ آچکے ہیں اس لئے یا تو تم اس کی پشت پناہی سے الگ ہوجاؤ یا میدان میں اُتر آؤ کہ اس تمام کشمکش وآویزش کا ایک دن میں فیصلہ ہوجائے۔ ابوطالب نے حالات کا جائزہ لیا، معاملہ کی نزاکت پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس میں سارے قریش سے عداوت مول لینے کی ہمت نہیں۔ وہ اکیلا ان سب کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔

---

[۱] یہ واقعات سیرت ابن ہشام میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔ یہ مہاجرین بعد میں واپس آگئے تھے۔

اس نے بھتیجے کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ جان پدر! میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈال کہ میں اُسے اٹھا نہ سکوں۔

غور کیجئے کہ اس مختصر سے فقرے میں حضورؐ کے لئے بیکسی و بے بسی اور عاجزی و بے چارگی کی کتنی غمناک قیامتیں پوشیدہ تھیں۔

عرب کا سا وحشی ملک۔

سرداران قریش کا پورے کا پورا گروہ جن کے دلوں میں آتش انتقام و عناد کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ مخالفت و ناسا عدت کے اس تلاطم خیز طوفان میں، دنیا کے ہر معیار اور عالم اسباب کے ہر قیاس کے مطابق صرف چچا کا ایک آسرا۔

اور وہ آسرا اس طرح سے ٹوٹ رہا ہے!

لیکن آپؐ نے کیا کہا؟

کیا یہ کہ چچا جان! میں تو آپ ہی کے بھروسے پر ان کی مخالفتیں مول لے رہا تھا۔ جب آپ ہی میری حفاظت و پاسبانی سے الگ ہوتے ہیں تو میری کیا مجال کہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان تک لاؤں؟

معاذ اللہ! یہ جواب اس کی طرف سے کیسے ہو سکتا تھا جس نے حقیقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ لیا ہو اور جو ساری دنیا کو یہ سکھانے آیا ہو کہ حق و صداقت کا بول بالا کرنے کے لئے دنیا میں کیا کیا مصیبتیں جھیلنی اور کون کونسی قیامتیں اٹھانی پڑا کرتی ہیں!

آپؐ نے رؤسائے قریش کے اس قشون قاہرہ کا استخفاف کی ہنسی سے استقبال کیا، پھر چچا کی بے بسی کی طرف دیدۂ پُرآب سے دیکھا۔ اور کمال سکون و طمانینت کے ساتھ، جس میں عزم و استقلال کا کوہ آسا استحکام جھلک رہا تھا، فرمایا۔

خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر رکھدیں تب بھی میں اپنے فریضہ کی سرانجام دہی سے باز نہ آؤں گا۔ یا تو اللہ میرے اس مشن کو کامیاب کرے گا، اور یا میں اس پر تصدق ہو جاؤں گا۔

آفتاب و ماہ و انجم می تواں دادن ز دست
در بہائے آں کف خاکے کہ دارائے دل است

عزیمت و استقامت کی یہ صدائے ہوش ربا کہ جس کے ارتعاش میں بجلیوں کا سا تحرک تھا، سیدھی چچا کے دل میں اُتر گئی۔ بھتیجے سے کہا کہ

جان عم! جاؤ۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا! (بحوالہ سیرت ابن ہشام)

بنو ہاشم کا مقاطعہ و محاصرہ

قریش کے غم و غصہ کی اب انتہا نہ تھی جس سے ان کی سفارت بے نیل مرام واپس آگئی۔ ابو طالب نے یہ جواب دیا۔ ان کی مسلسل مخالفانہ مساعی کے باوجود یہ تحریک انقلاب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ انھوں نے مجلس مشاورت میں بیٹھکر ابو طالب کے اس جواب پر غور کیا اور بالآخر فیصلہ کیا آپؐ کو اور آپؐ کے خاندان کو محصور کر کے برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے بالاتفاق ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص خاندان بنو ہاشم سے نہ رشتہ ناطہ کرے، نہ خرید و فروخت۔ نہ ان سے ملے جلے، اور نہ انھیں کھانے پینے کا کوئی سامان دے۔ اور اس طرح ان کا مکمل مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے۔ یہ معاہدہ لکھکر کعبہ پر لٹکا دیا گیا۔ اب ابو طالب مجبور ہو گئے کہ اپنے افراد خاندان کو لیکر پہاڑ کے ایک درہ (شعب ابو طالب) میں محبسانہ زندگی بسر کریں۔ یہ ۷ سنہ نبوی کا واقعہ ہے۔ تین برس تک نبی اکرمؐ اور اُن کے ساتھ تمام خاندان بنو ہاشم قیدیوں کی سی حالت میں رہے۔ چونکہ قریش نے اشیائے خورد و نوش کا جانا بھی روک دیا تھا اس لئے یہ محصور خاندان درختوں کی پتیاں کھا کھا کر گذران کرتا تھا۔ ان کے بچے بھوک سے بلک بلک کر رو دیتے تو روسائے قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ تین برس تک اس قید و بند کا سلسلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ خود قریش میں سے بعض نیک فطرت لوگوں کو بنی ہاشم کی اس کرب و صعب کی زندگی پر رحم آیا اور انھوں نے رفتہ رفتہ اپنے ہم خیال پیدا کر کے درِ کعبہ پر لٹکی ہوئی اس دستاویز کو چاک کر دیا اور خود جا کر خاندان بنو ہاشم کو اس پہاڑ کے درہ سے نکالکر ان کے گھروں میں واپس لائے۔

دو چچا

اس مقام پر ذرا انسانی طبائع کی بوقلمونی پر غور کیجئے۔ ایک چچا (ابو طالب) ہے کہ اگرچہ مسلمان نہیں ہوا اور اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم ہے لیکن اپنے بھتیجے کا اس طرح ساتھ دیتا ہے کہ تین برس تک چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت اس محبس تنگ و تار میں مصیبتوں کے دن نہایت خندہ پیشانی سے گذار لیتا ہے۔ دوسرا حقیقی چچا ابو لہب ہے کہ اس نے سب کام کاج چھوڑ کر زندگی کا مقصد ہی یہ بنا لیا ہے کہ اس حق و صداقت کے مجسمہ بھتیجے کی مخالفت کی جائے اور اس جوش مخالفت میں اور تو اور صلۂ رحمی تک کو بھی بالائے طاق رکھدیا جائے، حالانکہ یہ وہ خصوصیت تھی جو عربوں کا قومی جوہر بن گئی تھی اور وہ اس پر نہایت فخر کیا کرتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے حضورؐ کہا کرتے تھے کہ کمبختو! میں تم سے کچھ مانگتا نہیں لیکن ان خاندانی تعلقات اور رحم کی پاسداری کا تو خیال کرو جو تمہاری قومی خصوصیت ہے اور جس پر تم دنیا کے سامنے اس قدر ناز کرتے ہو۔

ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی ؕ وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۝ (۴۲/۲۳)

۱؎ جوش نسل پرستی کے جذبہ نے اس آیۂ مقدسہ کو کیا کیا معنے پہنائے ہیں اس کا ذکر ذرا آگے چلکر آئیگا۔

یہ نعیم ابدی ہے جس کی خدا اپنے ان بندوں کو خوشخبری دیتا ہے جو دعوتِ حق پر یقین رکھتے اور نیک کام کرتے ہیں (اے پیغمبر!) تم (معاندین قریش سے) کہو کہ میں اپنی اس دعوتِ حق پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ مگر پوچھتا ہوں ظالمو! قرابت باہمی کی محبت و شفقت بھی کہاں غارت ہوگئی؟ اور (یاد رکھو) جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم آخرت میں اُسے زیادہ بھلائی دیں گے۔ بلا شبہ اللہ بڑا ہی بخشش کرنے والا اور (نیک اعمال کی) قدر کرنے والا ہے۔

یہ آسرے بھی ٹوٹ گئے

اسارت شعب ابوطالب سے رہائی ملی تو امید تھی کہ کچھ دن آرام سے گذر جائیں گے لیکن مشیت کو یہ منظور تھا کہ جب یہ جنود مخالفین کھلے بندوں مقابلہ کے لئے میدانِ کارزار میں آجائیں تو اس وقت دنیاوی علائق میں سے کوئی علاقہ اور ان قریبی اسباب میں سے کوئی سبب پشت پناہی کے لئے موجود نہ ہو تاکہ دنیا دیکھ لے کہ اکیلا حق (بغیر اس قسم کے بھروسوں کے) کس طرح باطل پر غالب آتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۰ نبوی میں آپ کے چچا ابوطالب کا انتقال ہوگیا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ نے وفات پائی۔ ان غمگساروں کے اُٹھ جانے سے آپؐ تو تنہا نہیں رہ گئے کہ آپ کو اس کی رفاقت میسر تھی جو ہمیشہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا لیکن اس سے قریش کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ اور اب انھوں نے ایذا رسانی اور تکلیف دہی میں اور بھی شدت اختیار کرلی۔

اہلِ طائف کی طرف

اب آپؐ اہل مکہ سے ناامید ہو چکے تھے اس لئے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ اہلِ طائف کو بھی مخاطب کرکے دیکھ لیا جائے تاکہ حق و باطل کے فیصلہ کے آخری دن سے پہلے ہر طرف سے اتمام حجت ہوجائے۔ چنانچہ آپ طائف تشریف لیگئے اور وہاں کے رؤسا کو اسلام کی دعوت دی۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ وہ بھی فراعنہ و نماردہ کی بستی ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک ساتھی زیدؓ ابن حارثؓ کی معیت میں مخالفین کے اس نرغہ میں از خود چلے جانا اعتماد علی النفس کی ایسی مثال ہے جس کا اعتراف غیر مسلموں تک کو کرنا پڑا ہے[۵۷]۔ آپ نے انھیں دعوت توحید دی لیکن انھوں نے اس دعوتِ راستبازی کا جواب جس کجروی سے دیا تاریخ کا دیدۂ عبرت اسپر آجتک خوں فشاں ہے۔ انھوں نے نہایت استہزاء آمیز اور حقارت انگیز انداز سے گفتگو کی اور جب آپؐ نے واپسی کا ارادہ کیا تو طائف کے بازاری لوگوں اور اوباشوں کو ابھارا کہ اس ذاتِ اقدس کو جسپر دنیا بھر کا شرف و مجد نثار تھا، اپنی دنائت و سفاہت کا نشانہ بنائیں۔ چنانچہ شقاوت و قساوت

---

۵۷ سر ولیم میور نے "لائف اوف محمدؐ" میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

کے یہ مجسمے بازار میں دو رویہ کھڑے ہو گئے اور جب حضورؐ ادھر سے گذرے تو آپؐ پر پتھر برسانے شروع کر دیئے یہانتک کہ آپ کے جوتے لہو سے بھر گئے۔ جب آپ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھتے تو وہ بازو پکڑ کر اٹھا دیتے اور پھر سنگباری شروع کر دیتے اور اس کے ساتھ گالیاں دیتے، تالیاں بجاتے اور شور مچاتے۔

اور ادھر سے جواب

وہ اس تماشے میں محو تھے اور ان کی قضا ایک گوشے میں کھڑی ان پر ہنس رہی تھی۔ آپ نے شہر سے باہر نکلکر عقبہ ابن ربیعہ کے تاکستان میں پناہ لی جو نسبۃً شریف النفس تھا۔ آپ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ زخموں سے خون صاف کیا۔ گرد و پیش کے حالات پر نگاہ ڈالی۔ پیچھے طائف تھا جہاں سے اس حالت میں نکالے گئے تھے۔ سامنے مکہ تھا جہاں اب (دنیاوی اندازوں کے مطابق) کوئی سرپرست باقی نہ تھا۔ اور راستہ کی تنہائیوں میں اللہ کا یہ بندہ، زخموں سے چور، سستانے کے لئے بیٹھا تھا۔ دنیا بھر سے جنگ اور یہ عالم بے چارگی! جن و انس سے مبارزت اور یہ بے سروسامانی! بیکسی و درماندگی کے اس حزن انگیز عالم میں گوشۂ چشم آرزو کسی دنیاوی قوت سے استمداد و استعانت کے لئے نہیں وا ہوا بلکہ نگہ التجا اس باب صمدیت کی طرف اٹھی جو ہر بیکس و ناتواں کا سہارا اور ہر عاجز و درماندہ کا تکیہ ہے۔ عرض کیا کہ

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ۔ یَا اَرْحَمَ الرّٰاحِمِیْنَ۔ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ۔ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ۔ اِلٰی بَعِیْدٍ...... الخ

بارالٰہا! میں اپنی کمزوری اور بے سروسامانی اور اس کے خلاف لوگوں کے اس حقارت آمیز سلوک کی تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ تو ارحم الرحمین ہے۔ تو ہی درماندوں اور عاجزوں کا سہارا ہے۔ اور تو ہی میرا مالک ہے۔

مجھے کس کے سپرد کیا جا رہا ہے؟ کیا ترش رو بیگانوں (اہل طائف) کے یا ان اپنوں (اہل مکہ) کے جو اپنی تدبیر پر قدرت رکھتے ہیں؟ لیکن جب تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے اس کی کیا پروا ہے۔ اس لئے کہ تیری عافیت کا گوشہ میرے لئے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے دامن انوار میں پناہ لیتا ہوں جن سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور حال اور مستقبل کے تمام امور مہمہ درست ہو جاتے ہیں۔ مجھے تیری مشیت سے ہم آہنگی درکار ہے کہ تمام قوتوں کا سرچشمہ تیری ہی ذات ہے[۵]۔

اس دعا پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔

شاید کہ خود را باز آفرینی

---

[۵] بحوالہ طبری۔

یہ مخالفت کیوں تھی؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ان لوگوں سے کیا کہتے تھے جس کی وجہ سے یہ پوری کی پوری قوم نعل در آتش ہو رہی تھی؟ وہ کیا پیغام تھا جس کی وجہ سے جوش انتقام اور شدت عداوت سے ان پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا؟ وہ کیا دعوت تھی جس کی مخالفت میں ان کے جنود و عساکر کی تمام قوتیں ایک محاذ پر مجتمع ہو گئی تھیں؟ وہ کیا تحریک تھی جس کو دبانے کے لئے وہ اپنی جانوں تک کے دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تو اس وقت سامنے آئیگا جب ہم یہ بتائیں گے کہ اسلام کیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ قرآن دنیا میں کیا پیش کرتا ہے؟ وہ عالم انسانیت میں کیا تغیر چاہتا ہے؟ وہ دنیا کے تمدنی، عائلی، معاشی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی نظام کو کن جدید بنیادوں پر استوار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ انسانی زندگی کا مقصد کیا قرار دیتا ہے؟ اسوقت تک یہ حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی کہ دنیا بھر کی قوتیں اس کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو جاتی ہیں؟ انھیں یہ پیغام کیوں خوش نہیں آتا؟ اس تحریک کی کامیابی میں انکا نقصان کیا ہوتا ہے؟ انھیں کیوں اس کی زندگی کے آئینے میں اپنی موت دکھائی دیتی ہے؟ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ رسول اللہ نے جو پیغام ان لوگوں تک پہنچایا وہ کوئی نیا پیغام نہیں تھا بلکہ وہی پیغام تھا جو اس وقت سے دنیا کے سامنے آتا رہا جس وقت سے دنیائے فکر و عمل کو رشد و ہدایت کی ضرورت ہوئی۔ وہی پیغام جو حضرت عیسیٰ تک مختلف ادوار و اعصار اور متعدد دیار و امصار میں دہرایا جاتا رہا اور جس کی تاریخ جلد دوم اور سوم میں ہمارے لئے وجہ بصیرت و موجب عبرت بن چکی ہے۔ وہی پیغام جس کے متعلق فرمایا۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۝ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ (۱۶۵-۱۶۳)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح پر اور ان نبیوں پر جو نوح کے بعد ہوئے بھیجی تھی اور جس طرح ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر بھیجی۔ اور داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا۔ اور اسی طرح اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمام رسول اعمال صالحہ کے نتائج کی خوشخبری دینے والے اور انکار حق کے

نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور میں پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور (خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے۔ اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

قیامِ دین کا مفہوم

اس وحی کی غایت کیا تھی؟ قرآن کریم نے اسے دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی "قیامِ دین"، اس نظام زندگی کا قیام جس میں انسانیت اپنے مقصود تک جا پہنچے۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ٥ (۴۲)

(اے افرادِ نسلِ انسانی!) خدا نے تمہارے لئے وہ نظامِ زندگی تجویز کیا ہے (جو کوئی نیا نظام نہیں ہے بلکہ اب سے بہت پہلے) جس کی نوح کو بھی ہدایت کی جا چکی ہے اور جس کی (اے پیغمبر اسلام! اب) ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور (تم سے پہلے اسی نظام کو قائم کرنے کی) ہم نے ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ کو بھی ہدایت فرمائی ہے (وہ ہدایت کیا ہے؟) یہی کہ (وحی کے متعین فرمودہ) نظام زندگی کو قائم کرو اور (پھر یکدلی کے ساتھ اس پر جم جاؤ، یعنی) اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرو (اے پیغمبر اسلام!) مشرکین پر اس نظام زندگی کا قیام جس کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو بڑا ہی گراں گذرتا ہے (مگر تم اس کی فکر نہ کرو۔ کیونکہ) خدا صرف انہی لوگوں کو اپنے شرف اجتبا سے نوازا کرتا ہے جنہیں وہ چاہتا ہے (یعنی جو اس کے قانونِ مشیت کے مطابق قبولِ حق کی صلاحیت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں) اور انہی لوگوں کو صحیح راستہ دکھاتا ہے جو (اپنے ارادہ اور عزم سے) اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں!

اوپر کی آیت کے اس ٹکڑے پر پھر غور کیجئے کہ اس نظام کا قیام "مشرکین" پر گراں گذرتا ہے اس لئے کہ وہ خدا کے سوا اوروں کا بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کے لئے نظام وضع کریں۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥ (۴۲)

یا کیا ان کے کچھ ایسے ساتھی بھی ہیں جنہوں نے (اپنی مرضی سے) اُن کے لئے کوئی نظام زندگی تجویز کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی؟ (یقیناً ایسا ہی ہے) اگر یہ بات نہ ہوتی کہ فیصلے کے متعلق خدا کا حکم صادر ہو چکا ہے،

(کہ اس کا ظہور ایک مقررہ وقت میں ہوگا۔ تو) ان کے درمیان (ابھی ابھی) فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور (یاد رکھو) یقیناً ان ظلم کرنے والوں ہی کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

لیکن پیغامِ خداوندی، خدا کے سوا کسی اور کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک خدا کے سوا کوئی اور قوت ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ اس کے نظام کی بنیاد اس حقیقت کبریٰ پر ہوتی ہے کہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائےؑ۔ اس لئے کہ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۲/۱۶۵) قوت صرف خدا کے لئے ہے کسی اور کو قوت حاصل ہی نہیں۔ اور جب کسی اور کو قوت ہی حاصل نہیں تو اس کے سامنے جُھکنا کیسا!؟ اور جب کسی انسان کا دوسرے انسان کے سامنے جھکنا ہی خلافِ حقیقت ہے تو پھر ایک انسان کو دوسرے انسان پر برتری اور فوقیت کیسی؟ فطرۃً سب انسان، بحیثیت انسان برابر ہیں۔ فوقیت صرف اس کو ہے جو قوانین خداوندی کا سب سے زیادہ اتباع کرنے والا اور اس طرح ان قوتوں کے سرچشمہ سے زیادہ قریب ہے اس لئے ہر وہ انسان جو (اس معیار کے علاوہ) کسی نہ کسی طور پر اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے اس نظام کے قیام کی مخالفت کرتا ہے۔

ارباب اقتدار کی مخالفت

ارباب حکومت مخالفت کرتے ہیں کہ اس نظام کی رو سے کسی انسان کو حق حاصل نہیں رہتا کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ وہ حکومت واقتدار کے تمام خزانوں کی کنجیاں ان سے چھین کر، حکومت واقتدار کے حقیقی مالک کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

ارباب دولت وثروت اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ اس نظام کی رو سے سرمایہ داری (اکتناز واحتکار) جسدِ انسانیت پر جذام سے بڑھ کر لعنت ہے۔

ع۵ اس جھکنے سے مطلب یہ نہیں کہ جس طرح ایک مستبد حاکم کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے اسی طرح خدا کی اطاعت اختیار کی جائے۔ خدا کی ذات اُن صفاتِ عالیہ کا سرچشمۂ مطلق ہے جن کا اخذ وارتسام انسان کی تکمیلِ ذات کا موجب ہے۔ یہ جس قدر ان صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا جاتا ہے اُسی قدر اس سرچشمۂ حق وخیر سے ہم آہنگ ہوتا جاتا ہے۔ اسی ہم آہنگی اور رفاقت کو قربِ الٰہی کہتے ہیں۔ صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرنے کا نام اطاعتِ الٰہیہ ہے۔ یہ انعکاس وارتسام انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ کائنات کا یہ وسیع وعریض سلسلہ اجتماعی انداز سے چل رہا ہے۔ بیج کو درخت بننے کے لئے ہزارہا عناصر کے تعاون کی ضرورت اور احتیاج ہوتی ہے۔ انفرادی طور پر وہ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو کبھی بروئے کار نہیں لا سکتا۔ دنیائے انسانیت میں اس اجتماعی نظام کا نام دین ہے۔ (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)

ارباب مذہب اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ یہ انھیں ان کی "خدائی مسندوں" سے نیچے اتار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک بندے اور خدا کے درمیان کسی انسانی وسیلہ کی ضرورت ہی نہیں۔

ارباب مشیخت مخالفت کرتے ہیں کہ یہ انھیں ان کی خوانق و صوامع کی خلوتوں سے نکالکر میدان عمل میں لاتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک یہ انسان کی سب سے بڑی شکست ہے کہ وہ باطل کی قوتوں کو کھلا چھوڑ کر خود گوشوں اور زاویوں میں جا چھپے۔

ارباب حسب و نسب مخالفت کرتے ہیں کہ وہ پیدائش کی رُو سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک تمام انسانوں کی تخلیق "نفس واحدہ" سے ہوئی ہے۔

یہی ہیں وہ "ارباب" جنھیں قرآن اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" قرار دیتا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِہٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَکُمْ اِلَی النَّارِ ○ (۱۴/۳۰)

اور (دیکھو) لوگوں نے اللہ کے لئے بہت سے اس کے ہم درجہ معبود گھڑ رکھے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو اس کی راہ سے بھٹکائیں۔ (اے پیغمبر!) تم کہدو "اچھا، (زندگی کے چند روزہ) فائدے برت لو۔ پھر بالآخر تمہاری راہ آتش دوزخ ہی کیطرف ہے"!

ان میں سے ہر ایک کی طرف سے مخالفت ہوتی ہے۔ اور ان میں کتنے ہی باہمی اختلافات کیوں نہ ہوں، اس مخالفت میں سب ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔

باقی رہے عوام۔ تو، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وہ "خواص" کے تابع ہوتے ہیں اور ان کے آلۂ کار۔ علاوہ ازیں وہ اس نظام جدید کی اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ یہ انھیں ان کے آباؤ اجداد کی روش باطل سے ہٹا کر حق پرستی کے صراطِ مستقیم کیطرف آنے کی دعوت دیتا ہے یعنی انھیں تقلید کی تاریکیوں سے نکالکر علم و بصیرت کی روشنی کی طرف لاتا ہے، اور چونکہ وہ اندھیرے میں رہتے رہتے شپرہ چشم ہو جاتے ہیں اس لئے روشنی انھیں بری معلوم ہوتی ہے۔

پیغام توحید

رسول اللہؐ بھی اسی نظام کا قیام چاہتے تھے اسلئے تمام "اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" اور عوام کی طرف سے اس کی مخالفت ضروری تھی۔ حضرات انبیاء سابقہ کے کوائف احوال (گذشتہ مجلدات میں) آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ مقتضیات زمانہ کے پیش نظر ان کی تعلیم کے جزئیات و اسالیب میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو ان کی تعلیم کی اصل ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ایک ہی تھی۔ یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ یہی دعوت نبی اکرمؐ نے آکر دی جب آپ نے فرمایا کہ

قُلْ إِنَّمَا يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (۲۱/۱۰۸)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو "مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا حاکم ایک ہی تنہا حاکم ہے (اس کے سوا کوئی نہیں) پس بتلاؤ، تم اس کے آگے سر جھکاتے ہو یا نہیں؟"

آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ محکومیت خالصۃً اللہ کی ہوگی اس میں کسی اور کی محکومیت کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔

قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِينِي ۝ فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُم مِّن دُونِهِ ۗ قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ۝ (۳۹/۱۴-۱۵)

(اے پیغمبر اسلام! ان مخاطبینِ دعوتِ حق سے) کہدے کہ میں تو اپنے نظام زندگی کو خالص (قانون خداوندی کے تابع) کرتے ہوئے اللہ ہی کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرتا ہوں (اگر تم کسی طرح بھی نہیں مانتے) تو (جاؤ جہنم میں) جس کی تمہارا جی چاہے خدا کے سوا عبودیت (یعنی محکومیت و اطاعت) اختیار کرلو۔ (اور) کہدے (کہ شاید اس دنیوی زندگی میں تمہیں اس کا نقصان محسوس نہ ہو۔ مگر) حقیقت یہ ہے کہ واقعی نقصان اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن (مکافاتِ عمل کے وقت) اپنی جانوں اور اپنے اہل و عیال کو نقصان میں مبتلا کردیں۔ یاد رکھو! یہی ہے نقصان (سب سے بڑا) کھلا ہوا نقصان!

جنھیں جتنے ارباب قوت و اقتدار سمجھ رکھا ہے میں ان میں سے کسی کے حق حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِيَ الْبَيِّنَاتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۴۰/۶۶)

(اے پیغمبر اسلام!) کہدے کہ مجھے (میرے خدا کی طرف سے) منع کردیا گیا ہے کہ میں ان معبودوں کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) تسلیم کروں جنھیں تم لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہو (خصوصاً) جبکہ میرے پاس اس باب میں میرے پروردگار کی طرف سے کھلی کھلی دلیلیں بھی آچکی ہیں۔ اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں (اپنی ہر حرکت اور ہر عمل میں) تمام جہانوں کے پروردگار (اللہ) کی اطاعت کروں۔

یہ سب جو اپنی حکومت تم سے منواتے ہیں اور تم سب جو اپنے مقام کو بھولکر ان کے اس حق باطل کو تسلیم کیے ہوئے ہو، سب بربادی اور تباہی کے جہنم کا ایندھن ہو۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ۝ (۲۱/۹۸)

تم اور وہ تمام چیزیں جنکی اللہ کو چھوڑ کر عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرتے ہو، سب دوزخ کا ایندھن

ہیں۔ تم سب وہاں پہنچنے والے ہو!

اس لئے کہ ان کی قوت و سطوت کے خوف سے تم ان کے سامنے جھک رہے ہو، اور جنت وہ مقام ہے جہاں خدا کے سوا کسی اور کا خوف و حزن نہ ہو۔

أَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ (۷:۴۹)

دیکھو، کیا یہ وہی لوگ نہیں ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ خدا کی رحمت سے انہیں کچھ ملنے والا نہیں؟ (لیکن انھیں تو آج رحمت الٰہی پکار رہی ہے) "جنت میں داخل ہو جاؤ۔ آج تمہارے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہے نہ کسی طرح کی غمگینی"!

اور یہ مقام امن و سلامتی صرف اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو خدا کے سوا کسی اور کے حق حکومت کو تسلیم نہ کرے نہ اس کو جو ہر بڑی چوکھٹ پر خوف سے سجدہ ریز ہو جائے۔

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۸۲-۶:۸۱)

اور (دیکھو) میں ان ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے، جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لئے اس نے کوئی سند و دلیل تم پر نہیں اُتاری؟ بتلاؤ، ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن کی راہ ہوئی اگر علم و بصیرت رکھتے ہو؟ جن لوگوں نے خدا کو مانا، اور اپنے ماننے کو ظلم (یعنی شرک سے) آلودہ نہیں کیا، تو انہی کے لئے امن ہے، اور وہی ٹھیک راستہ پر ہیں!

یہ تھی وہ دعوت جو قریش کو دی گئی۔ اب ذرا اس عنوان کو ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے لائیے جس میں عربوں کی خصوصیات کا ذکر ہوا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ تکبر و نخوت۔ خودستائی و خود پسندی۔ دعوائے افضلیت و فوقیت جذبۂ مسابقت و منافست ان کی رگ رگ میں موجزن تھا۔ ہر عرب اپنے آپ کو عجمی سے فائق سمجھتا تھا، پھر عربوں میں سے قریش اپنے آپ کو سب قبائل سے افضل تصور کرتے تھے۔ قریش میں سے بنو ہاشم اور بنو امیہ کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ دنیاوی وجاہت کے علاوہ، کعبہ کے کلید بردار اور مجاور ہونے کی حیثیت سے

انھیں مذہبی تقدس وعظمت بھی حاصل تھی جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہ تھا۔ ان میں بڑے بڑے دولتمند بھی تھے کہ انہی جیسے سینکڑوں انسان۔ غلاموں اور کنیزوں کی صورت میں ان کے دروازوں پر بلا زنجیر بندھے رہتے تھے جن پر انھیں ہر قسم کا تصرف حاصل تھا۔ ان سے یہ کہنا کہ

نسلی اور قبائلی غرور و افتخار سب باطل، کہ خلقت کے اعتبار سے سب انسان برابر ہیں۔ عرب کو عجم پر اور قریشی کو حبشی پر کوئی فضیلت نہیں۔

جاہ و منصب کا تکبر غلط، کہ تمہیں حق حاصل نہیں کہ کسی اور پر اپنا حکم چلاؤ۔

مجاورت کعبہ کی اجارہ داری کا تصور بے بنیاد، کہ خدا اور انسان کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔

غلام اور آقا کا امتیاز، باعث ننگ انسانیت، کہ آقا اور مولا خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔

یہ مٹی اور پتھر کی مورتیں جنھیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے خدا بنا کر جوار کعبہ میں نصب کر رکھا ہے تمہاری جہالت کی دلیل اور حماقت کا ثبوت ہیں۔ ان میں تو اتنی بھی قوت نہیں کہ خود اپنی مگس رانی کر سکیں چہ جائیکہ تمہیں فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں۔

نوحۂ ابوجہل

ان سے یہ کہنا ان کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں تھا تو اور کیا تھا؟ وہ اس تعلیم کے فروغ میں اپنی موت مضمر دیکھتے تھے اس لئے وہ اُسے آسانی سے کس طرح قبول کر لیتے؟ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے ان کی روح کانپتی تھی۔ اسی لئے ابوجہل غلاف کعبہ تھام تھام کر فریاد کرتا تھا۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ ❊ از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ

ساحر و اندر کلامش ساحری است ❊ ایں دو حرف لاالٰہ خود کافری است

تابساطِ دینِ آبا در نورد ❊ با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد

وہ چلاتا تھا کہ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب ❊ از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست ❊ با غلامِ خویش بریک خواں نشست

اس کے نزدیک یہ سانحہ قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ ❊ با کلفتانِ حبش در ساختہ

احمراں با اسوداں آمیختند ❊ آبروئے دودمانے ریختند

اس لئے وہ حجر اسود کو پکار کر کہتا تھا۔

باز گو اے سنگِ اسود باز گو ❊ آنچہ دیدیم از محمد باز گو

اور کبھی کعبہ کے سب سے بڑے "خدا" سے فریاد کرتا تھا۔

اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر ∴ خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

گلۂ شاں را بگرگاں کن سبیل ∴ تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل

اور اس نالہ و فریاد اور سب و شتم سے اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرتا تھا۔

یہ تھے اس مخالفت و مخاصمت کے وجوہ اور یہ تھے اس تزاحم و تصادم کے اسباب، یعنی وہی وجوہ جو روز ازل سے حق و باطل کی کشمکش کے لئے وجہ و کوشش رہے ہیں اور وہی اسباب جو قیامت تک ابلیس و آدم کی چشمک کے لئے شعیل بنتے رہیں گے۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ شکن نئے

وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

اِستقامت

فَاسْتَقِمْ بِمَا اُمِرْتَ

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی

مزی چو خس کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

قوم کی طرف سے اس دعوتِ حق و صداقت کا جواب جس طرح اینٹ اور پتھر سے دیا گیا اس کا اجمالی ساخاکہ گذشتہ باب میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مخالفت و مخاصمت کے اس ہجوم اور مصائب و نوائب کے اس طوفان میں اس داعیٔ انقلاب کی کیا روش رہی؟ کیا آپؐ نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیا کہ میرے ذمہ جو فریضہ تھا وہ ادا ہوگیا۔ اب مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں؟ میں ان کے بھلے کی کہہ رہا ہوں اور یہ سامنے سے اس طرح پیش آرہے ہیں۔ نہیں مانتے تو جائیں جہنم میں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ انکی خاطر اس قدر تکلیفیں اٹھاؤں اور وہ بھی پھر انہی کے ہاتھوں!

ایک عام انسان ایسے حالات میں یہی کچھ کہتا اور ایسا ہی کچھ کرتا۔ لیکن جس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو کر آگئی ہو۔ جو جانتا ہو کہ انسانی زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا۔ جو دیکھ رہا ہو کہ اندھا کنوئیں کے کنارے پر پہنچ چکا ہے اور اب اگر اس نے ایک قدم بھی اور اسی راستہ پر اٹھایا تو اس کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی ہوگا۔ وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتا وہ اس تباہ ہونے والے کو للکارے گا اور اگر وہ اس للکار پر بھی اپنی روش سے نہیں رکتا تو یہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑے گا اور اسے ہلاکت کے عمیق گڑھے میں گرنے نہیں دے گا۔ اسی طرح جب ایک دیدۂ بینا دیکھتا ہے کہ باطل کی سرکش قوتیں انسانیت کے ہر شعبہ پر مسلط ہو رہی ہیں اور آواز دینے پر وہ اپنی روش سے باز نہیں آتیں تو وہ اس فریب سے اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دیکر خلوت گزیں نہیں ہو سکتا کہ میرا فریضہ اتنا ہی تھا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے میدان سے منہ موڑ لیا تو باطل، حق پر غالب آجائیگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانوں کی بستیوں میں فساد ہی فساد برپا ہو جائیگا اور اس طرح شجرِ انسانیت مرجھا کر گر جائیگا اس لئے وہ اس کی پرواہ ہی نہیں کرتا کہ سامنے سے جواب کیا ملتا ہے۔ وہ اپنی پکار کو برابر جاری رکھتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کو دُہرائے چلا جاتا ہے

جو کچھ اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں وہ دوسروں تک پہنچائے چلا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۵/۹۴)

بس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے، لوگوں پر آشکار کر دو، اور مشرکوں کی کچھ پرواہ نہ کرو۔

استقامت

"کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اُسے دوسروں کے سامنے واشگاف کرتا چلا جا اور اس کی پرواہ مت کر کہ یہ نہ ماننے والے مشرکین کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔" قرآن کریم کے صفحات پر نگاہ ڈالئے۔ شروع سے اخیر تک اس حقیقت کو مختلف انداز اور متنوع پیرایوں سے دُہرایا گیا ہے۔ دعوت، تبلیغ، تبشیر، تنذیر، سب اسی حقیقت کے تبیان کے مختلف اسالیب ہیں۔

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲۲/۶۷)

اپنے رب کی طرف دعوت دیتے رہو۔ یقیناً تم فطرت کے سیدھے راستہ پر ہو!

آگے بڑھنے سے پہلے اس آیت کے آخری الفاظ پر بنگاہ تعمق غور کیجئے۔ کسی تحریک کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ داعی تحریک کو اپنی دعوت کی صداقت پر پورا پورا یقین ہو۔ اور دوسرے یہ کہ جو شخص اپنے آپ کو حق پر سمجھے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حق کو دوسروں تک بھی پہنچائے۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ خود اس مسلک حق و صداقت پر جمکر کھڑا ہو اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتا جائے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ (۴۲/۱۵)

چنانچہ (اے پیغمبر!) اسی (تعلیم) کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہو! اور جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے (کوہ آسا) جمکر کھڑے رہو اور لوگوں کے جذبات و خیالات کی ہرگز ہرگز پیروی نہ کرو۔

دلکش انداز میں تبلیغ

اپنے دعویٰ کی صداقت کے ثبوت میں دلائل و براہین پیش کیجئے اور دعوت کو نہایت دلکش و دل آویز اسلوب سے بطریق احسن دوسروں تک پہنچائیے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۱۶/۱۲۵)

(اے پیغمبر!) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ اس طرح، کہ حکمت کی باتیں بیان کرو، اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو۔ اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے۔

ایسے پیرایہ میں جو سیدھا ان کے دل تک اتر جائے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ۝ (۶۳)

(اے پیغمبر!) یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ہی جانتا ہے، ان کے دلوں میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔ بس چاہئے کہ ان کے پیچھے نہ پڑو، اور ان کی ایمان فراموشیوں پر انہیں پند و نصیحت کرتے رہو۔ تم انہیں (پند و نصیحت کی) ایسی باتیں کہو کہ ان کے دلوں میں اتر جائیں۔

اس سے ہوگا یہ کہ جن قلوب میں قبولِ حق کی کچھ بھی صلاحیت باقی ہے وہ اپنی غلط روش کے انجام و عواقب سے آگاہ ہو جائیں گے اور اس طرح آنے والی تباہی و بربادی کے جہنم سے بچ جائیں گے۔

وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)

اور کلام الٰہی کے ذریعہ پند و وعظ کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔

اور باقی وہی رہ جائیں گے جن کے دل انکار و جحود کی سرکشی اور تقلید و جمود کے تعطل سے مردہ ہو چکے ہیں اور زندگی کی کوئی رمق ان میں باقی نہیں رہی۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۝ وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ۝ (۲۷/۸۰-۸۱، نیز ۳۰/۵۲)

(اے پیغمبر اسلام!) تم (اپنی پند و نصیحت) مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ ہی اپنی پکار بہروں کو سنا سکتے ہو (خصوصاً) جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر اعراض کر کے بھی چلتے بنیں (اور سننے کا ارادہ ہی نہ کریں) اور اسی طرح تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے رہنمائی نہیں کر سکتے، (ہاں) تم صرف ان لوگوں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں چنانچہ وہی لوگ مطیع ہو جانے والے بھی ہیں۔

سورہ یٰسین میں حقیقت کے ان دونوں پہلوؤں کو ایک ہی ٹکڑے میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ (۳۶/۷۰)

(یہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے) تاکہ پیغمبر اسلام (اس کے ذریعے) ان لوگوں کو جن میں زندگی کی کچھ بھی رمق ہو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرا دے اور منکرین حق (جو بالکل مردہ ہو چکے ہیں) پر حجت قائم ہو جائے!

تنذیر کا مفہوم یہ تنذیر بھی تبلیغ ہی کا دوسرا نام ہے یعنی غلط روش زندگی کے انجام و عواقب سے آگاہ کرنا۔ سنکھیا کھانے پر آمادہ ہونے والے کو بتا دینا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ محکمۂ آب و ہوا Meteorological Department کے منذرین Warners کی طرح، دریا کے کنارے بسنے والوں کو آگاہ کر دینا کہ بہت بڑا طوفان امنڈے چلا آرہا ہے، اپنی اپنی حفاظت کا انتظام کر لو اور کسی "اونچے ٹیلے" پر چلے جاؤ (صمد کے یہی معنے ہیں)

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ۚ مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝ (۳۴/۴۶)

(اے پیغمبر! ان مخاطبین دعوت ایمانی سے) کہو، میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں (اور وہ یہ) کہ خدا کیلئے تم دو دو کر کے یا ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہو (اور) پھر (ٹھنڈے دل سے) غور کرو۔ (یاد رکھو) تمہارے اس رفیق (پیغمبر) کو جنون نہیں ہو گیا ہے۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک سخت ترین عذاب سے پیشتر تمہیں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ایک ڈرانے والا ہو۔ اور بس!

یہی نزول قرآن کا مقصد ہے۔

قَيِّمًا لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّن لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا ۝ وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۝ (۱۸/۲-۴)

بالکل سیدھی بات! (ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک!) اور اس لئے اتاری کہ لوگوں کو خبردار کر دے، اللہ کی جانب سے ایک سخت ہولناکی ان پر آسکتی ہے اور مومنوں کو جو اچھے اچھے کام کرتے ہیں خوشخبری دیدے کہ یقیناً ان کے لئے بڑی ہی خوبی کا اجر ہے۔ ہمیشہ اس میں خوش حال رہیں گے! نیز ان لوگوں کو متنبہ کر دے جنہوں نے (ایسی سخت بات منہ سے نکال کر کہا، اللہ بھی اولاد رکھتا ہے!

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ۝

(۴۲/۷ نیز ۲۶/۱۹۴ ، ۶/۹۲)

اور (اے پیغمبر! جس طرح دوسرے پیغمبروں کی طرف ہم وحی کر چکے ہیں) اسی طرح ہم نے تیری طرف بھی اس

قرآن کی وحی کی ہے جو عربی زبان میں ہے تاکہ تم (اس کے ذریعہ سے) باشندگان ام القریٰ (یعنی مکہ) اور جو آبادیاں اس کے چاروں طرف ہیں ان کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراؤ اور (ساتھ ہی مرنے کے بعد مکافاتِ عمل کے لئے) اکٹھے ہونے کے دن سے ڈراؤ جس میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ (جس دن حساب وکتاب سے فارغ ہوکر) ایک فریق جنت میں پہنچ جائیگا اور دوسرا فریق جہنم میں!

اسی لئے رسول کو نذیر کہا گیا ہے۔

یَاۤ اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاۙ

(۳۳/۴۵ نیز ۴۸/۳۴؛ ۳۸/۶۵؛ ۴۶/۹؛ ۴۸/۸؛ ۵۱/۵۱؛ ۵۳/۵۶)

اے نبی! ہم نے تجھے گواہ بنا کر اور (ایمان و اعمال صالحہ کے نتائج کی) خوشخبری دینے والا اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے!

کیونکہ رسول کا مشن ہی انذار ہوتا ہے۔

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ○ (۱۶/۲ نیز ۵۶/۱۵؛ ۴۰/۱۵)

وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس غرض سے چن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے فرشتے الروح (وحی) کے ساتھ اس پر بھیجے اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کردو۔ "میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس مجھ سے ڈرو" (اور انکار و بدعملی سے باز آجاؤ)

اور یہ تنذیر قرآن کے ذریعہ ہوتی ہے۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ○ (۷/۲ نیز ۱۴/۵۲؛ ۷/۴۶)

(اے پیغمبر!) یہ کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی، اس لئے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کی پاداش سے) خبردار و ہشیار کردو، اور اس لئے کہ ایمان رکھنے والوں کے لئے بیداری و نصیحت ہو۔ پس دیکھو ایسا نہ ہو کہ اس بارے میں کسی طرح کی دل تنگی تمہارے اندر راہ پائے۔

لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس تنذیر کا فائدہ بھی دلِ آگاہ کو ہوتا ہے جس دل میں زندگی کی حرارت باقی نہ رہے وہ تنذیر سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْیِ ۖ٘ وَ لَا یَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا یُنْذَرُوْنَ ○

(۲۱/۴۵ نیز ۳۵/۱۸؛ ۳۶/۷۰؛ ۷۹/۴۵)

(اے پیغمبر!) تو کہدے "میری پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی وحی سے علم پا کر تمہیں متنبہ کر رہا ہوں" اور (یاد رکھ) جو بہرے ہیں، اُنھیں کتنا ہی خبردار کیا جائے، کبھی سننے والے نہیں!

تبشیر

تنذیر کا دوسرا پہلو تبشیر ہے۔ یعنی جب آپ کسی سے کہتے کہ اس کی غلط روشِ زندگی اُسے بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے تو اس کا مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ صحیح اسلوبِ حیات اُسے کامیابی اور کامرانی کی جنت کی طرف لے جائیگا یہی بشارت ہے۔ یعنی اعمالِ صالحہ کے صحیح نتائج کی خوش خبری۔ لہٰذا تنذیر اور تبشیر[1] ایک ہی بیت کے دو مصرعے اور ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۴۶/۱۲)

اور دیکھو اس سے قبل موسیٰ کی کتاب (تورات) آچکی ہے جو رہنمائی کا ذریعہ اور رحمتِ خداوندی کا باعث تھی اور (اسیطرح) یہ کتاب (قرآن) بھی ہے جو پچھلی تمام کتابوں کی تعلیم کو سچ کر دکھانے والا ہے۔ عربی زبان میں ہے۔ تاکہ ہمارا پیغمبر (اس کے ذریعے) ان لوگوں کو جو (اپنی جانوں پر اس غیر فطری زندگی کے) ظلم کرتے رہے ہیں اُنھیں (ان کے اعمال کے نتائج سے) ڈرا دے اور تاکہ یہ کتاب نیکوکار لوگوں کے لئے خوشخبری کا باعث بن جائے (کہ اس سے وہ اپنے ایمان و اعمالِ صالحہ کے عمدہ نتائج معلوم کرکے بشارت حاصل کر سکیں!)

اسی لئے حضرات انبیاؑء کرام کو مبشرین و منذرین کہا گیا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲/۲۱۳ نیز [illegible])

---

[1] قرآن کریم میں مطلق "آگاہی" کے لئے بھی بشارت کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (۳/۲۱)

جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور اس کے نبیوں کے ناحق قتل میں بے باک ہیں۔ نیز ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو حق و عدالت کا حکم دینے والے ہیں (تو ایسے بداعمال لوگوں کیلئے اسکے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ) انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دو!

چونکہ نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنکر رہنا تھا (کہ مدنیت و اجتماعیت کی زندگی انسان کی فطرت کا تقاضا ہے اور تمدنی زندگی کا لازمی نتیجہ باہمی مفاد کا تصادم ہے۔ اس لئے) اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ (نظام فطرت کے مطابق حیات اجتماعیہ کی برکات کی) بشارت دیتے اور اس نظام سے انکار و بد عملی کے نتائج سے، ڈراتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگیں ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہ حق پر متحد کر دے) اور یہ جو لوگ باہد گر مختلف ہوئے، تو اس لئے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ نہیں، وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے (اور ان میں تفرقہ و اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی)، مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگتے تھے (اور دین کی ایک راہ پر مجتمع رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ جاتے تھے) بالآخر اللہ نے ایمان لانے والوں کو دین کی وہ حقیقت دکھا دی، جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے (اور ایک دوسرے کو جھٹلا رہے تھے) اور اللہ جسے چاہتا ہے، دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے!

بشیر و نذیر لہٰذا نبی اکرمؐ بھی بشیر و نذیر تھے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝ (۲/۱۱۹ نیز ۳۵/۲۴ ز ۴۸/۸)

(اے پیغمبر!) یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں اس لئے بھیجا ہے کہ (خلق اللہ کو ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دو، اور (انکار حق کے نتائج سے) ڈراؤ۔ جو لوگ (اپنی محرومی و شقاوت سے) دوزخی گروہ ہو چکے ہیں، تم ان کے لئے اللہ کے حضور جوابدہ نہیں ہو گے (تمہارا کام صرف پیغام حق پہنچا دینا ہے)۔

اور قرآن اسی لئے بشارت ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِم مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ۝ (۱۶/۸۹ نیز ۱۲/۱۰۲ ز ۱۴/۹ ز ۱۴/۲ ز ۳۶/۱۱ ز ۳۹/۱۷ ز ۴۱/۳ ز ۳۲/۲۲)

اور وہ (آنے والا) دن، جب ہم ہر ایک امت میں ایک گواہ (یعنی پیغمبر) اٹھا کھڑا کریں گے جو انہیں میں سے ہوگا (اور جو بتلائے گا کہ کس طرح اس نے پیغام حق پہنچایا، اور کس طرح لوگوں نے اس کا جواب دیا) اور (اے پیغمبر!) تجھے ان لوگوں کے لئے (جو آج تجھے جھٹلا رہے ہیں)، گواہ بنائیں گے (یہی بات ہے کہ) ہم نے تجھ پر الکتاب نازل کی (دین کی)، تمام باتیں بیان کرنے کے لئے، اور اس لئے کہ حق کے سامنے جھک

جاننے والوں کے لئے راہنمائی ہو، اور رحمت، اور خوشخبری!

اور بشارت ہے ان کے لئے جو اپنی زندگی کو قوانین الٰہیہ کے تابع رکھتے ہیں۔ لہلہاتی کھیتی کی خوشخبری اس کو نصیب ہو سکتی ہے جو اپنے کھیت کو نہر کی سطح سے نیچے بنائے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝ (۹/۲۰-۲۱ نیز ۲/۲۱۸ ؛ ۱۰/۶۴ ؛ ۱۹/۹۶ ؛ ۲۲/۳۴ ؛ ۲/۲۷)

جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہے، اور وہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں! ان کا پروردگار انھیں اپنی رحمت اور کامل خوشنودی کی بشارت دیتا ہے، نیز ایسے باغوں کی جہاں اُن کے لئے ہمیشگی کی نعمت ہوگی۔

سفینۂ برگِ گل

وہ تھی روش مخالفین کی اور یہ تھا انداز اس داعیٔ حق و صداقت کا، جس قدر مخالفت کی سختی بڑھتی جاتی تھی اسی قدر اس دعوت و تبلیغ اور تنذیر و تبشیر کی شدت زیادہ ہوتی جاتی تھی — کہ — حُدی را تیز تر می خواں چو محمل راگراں بینی — صعوبات و مصائب کا بحر ذخار و متلاطم تھا اور اس میں مور ناتواں کے قافلہ کا "سفینۂ برگِ گل"۔ چاروں طرف سے کف بدہاں موجوں کے تھپیڑے اُسے ہر آن الٹ دینے کے لئے مضطرب و بیقرار تھے۔ بادِ مخالف کا جھکڑ، سرکش عفاریت کی طرح ہر سمت سے اسے محیط تھا۔ مستبد قوتوں کے اژدر دہنگ سطح آب سے اُبھر اُبھر کر اس جوش و خروش سے جھپٹتے تھے کہ گویا ایک ہی وار میں اس پورے کے پورے قافلے کو لقمۂ اجل بنا دیں گے۔ جہالت اور تعصب کی گھٹائیں چاروں طرف سے منڈلا رہی تھیں جس سے اندھیرے پر اندھیرے کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (۲۴/۴۰)

یا ان تاریکیوں کی طرح جو کسی عمیق سمندر میں طاری ہوتی ہیں کہ سمندر کی سطح کو موج ڈھانپ لیتی ہے اور اس موج پر ایک دوسری موج ہوتی ہے اور پھر اس دوسری موج پر بادل کی تاریکی ہوتی ہے (غرضکہ) ایک پر دوسری اور دوسری پر تیسری تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو (نظر آنا تو درکنار) نظر آنے کے قریب بھی نہیں ہوتا (اس جہان تاریک میں)، بجز اس کے جسے خدا ہی اپنے نور کا

کچھ حصہ عطا نہ فرما دے کسی کو روشنی میسر نہیں آسکتی۔

لیکن اس طوفان و ظلمات میں یہ "سفینۂ برگِ گل" آسمانی ستاروں کی دھوکہ نہ دینے والی قندیلوں کو دلیل راہ بناتا نہایت سکون و اطمینان سے جانب منزل رواں دواں چلے جا رہا تھا کہ خدائے سفینہ نے انھیں اطمینان دلا رکھا تھا کہ وہ انھیں ہر موجِ بلا سے محفوظ رکھے گا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (۵: ۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی پروا نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) تم نے خدا کا پیغام نہیں پہونچایا (یعنی ادائے فرض رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔ وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے انکار حق کی راہ اختیار کی ہو!

اور انھیں یقین تھا کہ جس کے ساتھ اُس کی حفاظت کا وعدہ شامل ہو اسے دنیا کی کوئی بلا گزند نہیں پہنچا سکتی۔

معارف القرآن (جلد سوم) کے آخری باب (تِلْكَ أُمَّةٌ) کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے اور دیکھئے کہ قرآن کریم نے احوال امم سابقہ اور واقعاتِ ملل گذشتہ کو کس شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور ان تاریخی نظائر و شواہد پر غور و فکر کی دعوت کس شد و مد سے دی ہے۔ اس لئے کہ یہ حقیقت ہر داعئ حق و صداقت کے سامنے واضح طور پر آجائے کہ جو کچھ اس کی دعوتِ انقلاب کے ساتھ ہو رہا ہے وہ کوئی نیا تجربہ نہیں۔ دنیا میں تمام معارکِ حق و باطل اور مجادلِ خیر و شر میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ جہاں اور جب بھی حق کی آواز بلند ہوئی ہے، باطل کی قوتیں اسے دبانے کے لئے ہر طرف سے یورش کر کے آگئی ہیں۔ اس لئے اس قسم کے سیلاب مخالفت و طوفان مجادلت سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ داعئ انقلاب کو ایک محکم چٹان کی طرح جم کر کھڑا رہنا چاہئے کہ حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے اس سے آکر ٹکرائیں اور سر پھوڑ کر واپس چلے جائیں۔

تاریخی شواہد

ان تاریخی شواہد میں تحریک حق و صداقت کی علمبردار جماعتوں کے لئے سامانِ تثبیتِ قلب اور اسباب تقویت روح ہوتا ہے اور اسی غرض سے قرآن نے انھیں بیان بھی کیا ہے۔ چنانچہ اس معرکۂ خیر و شر میں بھی جو اس وقت ہمارے لئے وجہ بالیدگیٔ ایمان و یقین ہے انبیائے سابقہ و ملل گذشتہ کے اساطیر و سائیر کی طرف خاص طور پر توجہ منعطف کرائی گئی اور نبی اکرمؐ اور آپؐ کی وساطت سے اس جماعت حقہ سے کہا گیا جو اس تحریک انقلاب کی اولین علمبردار تھی، کہ ان احوال و وقائع پر غور کرو اور سوچو کہ داعیانِ حق و صداقت کے ساتھ دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا رہا

لیکن بالآخر کامیابی و سرخروئی انہی کے حصہ میں آتی رہی۔ سورۂ ہود میں تمام انبیائے سابقہ اور ان کی مخالف جماعتوں کی آویزش و کشمکش کی داستانیں دہرانے کے بعد فرمایا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِۦ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِى هَٰذِهِ ٱلْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ○ (۱۱/۱۲۰)

اور (اے پیغمبر!) رسولوں کی سرگذشتوں میں سے جو جو قصے ہم تجھے سناتے ہیں (یعنی جن جن اسلوبوں سے ہم سناتے ہیں) تو ان سب میں یہی بات ہے کہ تیرے دل کو تسکین دیدیں۔ اور پھران کے اندر تجھے امر حق ملگیا (یعنی سچائی کی دلیلیں مل گئیں) اور موعظت (کہ نصیحت پکڑنے والے نصیحت پکڑیں گے) اور یاد دہانی ہوئی مومنوں کے لئے!

ایسا ہی ہوتا رہا ہے

کہا گیا کہ ان معارک حق و باطل پر غور کرو تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ موجودہ کشمکش صرف اصول میں ہی نہیں بلکہ جزئیات تک میں اُنہی کے دوش بدوش چل رہی ہے اور یہ لوگ ذرع بہ ذرع اور شبر بہ شبر وہی کچھ کر رہے ہیں جو ان کے پیشرو کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ آپکی تکذیب کرتے ہیں، تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ سب انبیاء کی تکذیب ہوتی چلی آئی ہے۔

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ جَآءُو بِٱلْبَيِّنَٰتِ وَٱلزُّبُرِ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلْمُنِيرِ ○ (۳/۱۸۳)

(اے پیغمبر اسلام!) یہ لوگ اگر آج تمہیں جھٹلا رہے ہیں (تو کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے کتنے ہی رسول ہیں جو (اسی طرح) جھٹلائے گئے۔ باوجودیکہ سچائی کی روشن دلیلیں، (حکمت و موعظت کے) صحیفے، اور (شریعت کی) روشن کتاب ان کے ساتھ تھی۔

یہ درست ہے کہ تکذیب و تعریض آپ پر گراں گذرتی ہے (اور ہر قلب حساس پر گراں گذرنی چاہیئے) لیکن ہر پیغام حق و صداقت کی تکذیب اسی طرح ہوتی رہی ہے اس لئے اس سے محزون و دلگیر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس لئے کہ آخر الامر فتح و کامیابی تو اسی انقلاب کے لئے مقدر ہے[1]۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُۥ لَيَحْزُنُكَ ٱلَّذِى يَقُولُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ ٱلظَّٰلِمِينَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ يَجْحَدُونَ ○ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ

---

[1] یہاں سے اسلوب بیان میں قرآنی انداز کا تتبع کیا گیا ہے کہ یہی انداز اس باب میں بہترین اسلوب ہے یعنی متکلم خود ذات باری تعالیٰ اور مخاطب حضورؐ نبی اکرم۔

فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۶ - ۳۴-۳۳)

(اے پیغمبر!) ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ (انکار و تعصب کی) جیسی کچھ باتیں کہتے ہیں، وہ بلاشبہ تمہارے لئے آزردگی کا موجب ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ تمہیں نہیں جھٹلاتے (یعنی تمہیں جھوٹا کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے کیونکہ تمہاری راست گوئی سب کو معلوم ہے) لیکن یہ ظالم دیدہ و دانستہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں! اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے۔ سو انھوں نے لوگوں کے جھٹلانے اور اذیت دینے پر صبر کیا (اور اپنے کام میں لگے رہے) یہاں تک کہ (بالآخر) ہماری مدد آ پہنچی، اور (یاد رکھو، یہ اللہ کا مقررہ قانون ہے) کوئی نہیں جو اس کی (ٹھہرائی ہوئی) باتوں کو بدل دینے والا ہو۔ اور رسولوں کے حالات میں سے بعض کے حالات تو تم تک پہنچ ہی چکے ہیں۔

جو کچھ یہ کر رہے ہیں ہر ایک قوم نے یہی کچھ کیا تھا۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۙ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۙ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝ (۲۲ - ۴۴-۴۲ نیز ۳۵ - ۲۵)

اور (اے پیغمبر!) اگر یہ منکر، تجھے جھٹلائیں، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) ان سے پہلے کتنی ہی قومیں اپنے اپنے وقتوں کے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں: قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، اصحاب مدین اور موسیٰ کو بھی جھٹلایا گیا اور ہم نے (ہمیشہ ایسا ہی کیا کہ) پہلے منکروں کو (کچھ عرصے کے لئے) ڈھیل دیدی، پھر (مواخذہ میں) پکڑ لیا۔ تو دیکھ! ہماری ناپسندیدگی ان کے لئے کیسی سخت ہوئی!

ان کی یہ مکذبانہ روش قوت اور زور کے گھمنڈ پر ہے۔ لیکن ان لوگوں کے پاس تو اُن قوتوں کا عُشرِ عشیر بھی نہیں جو ان کی پیش رو اقوام کے پاس تھیں۔

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ۝ (۳۴ - ۴۵)

---

[1] سورہ عنکبوت میں دیکھئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی مخالفین سے یہی کہا تھا۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (۲۹ - ۱۸)

اور (ابراہیم نے اپنی قوم سے کہا) اگر تم (مجھے) جھٹلا رہے ہو، تو (کچھ نئی بات نہیں) بہت سی قومیں تم سے پہلے (اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلا چکی ہیں۔ (تم مانو یا جھٹلاؤ، میں اپنا کام کرتا ہونگا) اور رسول کے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ (پیغام الٰہی کو قوم تک) واضح طور پہنچا دے۔

(اور دیکھو) ان قوموں نے بھی جو ان سے پہلے گذر چکی ہیں دعوتِ حق کو جھٹلایا تھا۔ اور یہ لوگ تو اس قوت و حشمت کا عشر عشیر بھی نہیں رکھتے جو ہم نے ان پہلی قوموں کو دے رکھی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بھی میرے پیغمبروں کو جھٹلایا (اور پھر اس کا مزہ بھی اچھی طرح چکھا، جو دنیا کو معلوم ہے) تو دیکھ لو، ہماری ناپسندیدگی ان کے لئے کیسی سخت رہی؟

اس لئے دیکھنے کی یہ بات نہیں کہ یہ لوگ کس شد و مد سے تکذیب حق کر رہے ہیں بلکہ یہ کہ ان سے پیشتر ان مکذبین کا انجام کیا ہوا جو طاقت اور مال میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (۴۳/۲۵)

چنانچہ انتقام میں ہم نے ان پر عذاب نازل کر دیا۔ پھر دیکھ لو، اُن جھٹلانے والوں کا انجام کیسا کچھ ہوا۔ وہ سب تباہ ہو گئے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝ (۵۰/۱۲-۱۴)

(دیکھ لو) ان سے پہلے (بے شمار قومیں) دعوتِ حق کی تکذیب کر چکی ہیں: قوم نوح، اصحاب الرس، قوم ثمود، قوم عاد، قوم فرعون، برادرانِ لوط، اصحاب الایکہ، قوم تُبّع۔ غرضکہ سب نے ہی ہمارے رسولوں کو جھٹلایا چنانچہ (وقفۂ مہلت گذر جانے کے بعد) ہماری دھمکی (تباہی و بربادی) واقع ہو کر رہی!

اس لئے کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ سنکھیا نہ کھانا، ہلاک ہو جاؤ گے، لیکن وہ کہے کہ تم جھوٹ کہتے ہو اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا، اور سنکھیا کھا لے، تو اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہوگا۔ اس لئے مکذبین (حقیقت کو جھٹلانے والوں) کا انجام ہلاکت ہے۔ جب امم سابقہ کے ساتھ یہی کچھ ہوا، تو ان مخالفین کے ساتھ وہی کچھ کیوں نہیں ہوگا؟ نہ سنکھیا کی خاصیت بدل گئی ہے نہ انسانی طبیعت۔ وہ ہلاک ہوئے تھے تو یہ بھی ہلاک ہوں گے۔ اور جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، وہ لوگ تو ان سے بھی زیادہ صاحب قوت و اقتدار تھے۔

فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۴۳/۸)

چنانچہ (دیکھو) ہم نے ان قوموں کو بھی ہلاک کر دیا جو ان لوگوں سے گرفت میں کہیں زیادہ مضبوط تھیں (کیونکہ انھوں نے دعوتِ حق کی تکذیب کی تھی) اور پچھلے لوگوں کا جو کچھ حال ہوا وہ گذر چکا ہے (جنکی نشانیاں عبرت پکڑنے والوں کے لئے آجتک موجود ہیں)

اس لئے ان مکذبین کے انجام و عواقب کو ہمارے قانونِ غیر متبدل کے حوالے کر دو اور تم اپنے کام میں جمعیت خاطر سے مصروف رہو۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ○ إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ○ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ○ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ○ (۷۳/۱۱-۱۴)

(اے پیغمبر اسلام!) ان (دعوتِ حق کی) تکذیب کرنے والے صاحبانِ دولت و ثروت کو مجھ پر چھوڑ دو۔ کچھ تھوڑی سی انہیں مہلت دو۔ (اس کے بعد دیکھنا) یہ واقعہ ہے کہ ہمارے پاس (ان لوگوں کے لئے) بھاری بھاری بیڑیاں، شعلہ فگن آگ، گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب (تیار) ہے۔ جس دن زمین اور پہاڑ تک بھی زلزلا جائیں گے اور بڑے بڑے پہاڑوں کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے ریت کے ڈھیلے ڈھالے ٹیلے ہوتے ہیں۔

تضحیک بھی ہوتی رہی ہے

یہ بھی درست ہے کہ یہ لوگ اس پیغامِ صداقت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی تضحیک کرتے ہیں۔ اس کا استقبال استہزاء اور تمسخر سے کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی کوئی انوکھی چیز نہیں۔ اس سے پہلے بھی یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○ (۶/۱۰ نیز ۲۱/۴۱ نیز ۱۳/۳۲ ز ۳۶/۳۰)

اور (اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی رسولوں کی ہنسی اڑائی گئی (جیسی آج تمہاری ہنسی اڑائی جا رہی ہے) تو جن لوگوں نے ہنسی اڑائی تھی، وہ جس بات کی ہنسی اڑاتے تھے، وہی بات اُن پر آ پڑی (وہ اس بات کی ہنسی اڑاتے تھے کہ اعمالِ بد کا نتیجہ بد ہے، تو وہی اُن کے آگے آگیا!)

بلا استثناء، ہر ایک کے ساتھ۔

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○ (۱۵/۱۱ نیز ۱۸/۵۶ ز ۴۳/۷)

ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی گروہ میں کوئی پیغمبر آیا ہو اور لوگوں نے اس کی ہنسی نہ اڑائی ہو (یہ پہلے سے ہوتا آیا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے)

آپ ان سے کہہ رہے ہیں کہ

جو شاخِ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اور یہ اس انذار کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ ان سے اس ہنسی کے متعلق کچھ نہ کہئے۔ ذرا آندھی کا طوفان آنے دیجئے! اس کے بعد یہ خود دیکھ لیں گے کہ اس آشیانے کے تنکے کہاں کہاں بکھرے ملتے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۤءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ([illegible])

چنانچہ جب سچائی اُن کے پاس آئی (یعنی قرآن کی دعوت نمودار ہوئی) تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔ سو جس بات کی یہ ہنسی اڑاتے رہے ہیں، عنقریب اسکی حقیقت انھیں معلوم ہو جائے گی!

اس وقت نتائج ایسے واضح طور پر سامنے آجائیں گے کہ آپ کی اس تنذیر کی تصدیق کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ([illegible])

اور (دیکھو) جو کچھ انھوں نے (برے) اعمال کئے تھے اُن کے برے نتائج ظاہر ہو چکے اور جس بات کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے (یعنی اس کا کہ اعمالِ بد کا نتیجہ بد ہے) وہ ان پر واقع ہو چکی!

لہذا آپ ان حقائق کو، جو آپ پر منکشف کئے گئے ہیں، ان سے واضح طور پر کہے جایئے اور انجام کی فکر نہ کیجئے۔ اس کے لئے ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل کافی ہے۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ([illegible])

یہ واقعہ ہے کہ (اے پیغمبر!) تیری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں کو کافی ہیں۔

مجنوں کہا جاتا تھا

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب آپ ان سے کہتے ہیں کہ تم اس حق و صداقت کی آواز کا ساتھ دو پھر دیکھو کہ تم کس طرح قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کے مالک بنا دیئے جاتے ہو؟ تو یہ ہنستے ہیں اور تمہیں دیوانہ کہتے ہیں! اس لئے کہ اس وقت ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ ایک اونٹ چرانے والی صحرانشین قوم ایران و روم کی قوت و حشمت کی مالک کیسے بن سکتی ہے؟ یہ حق کی قوت سے ناآشنا ہیں۔ یہ ایک مردِ مومن کے زورِ بازو کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ جس کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ان سے صرف یہ کہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں زیادہ نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے اسے لیکر اٹھ کھڑے ہو، اور پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ دیوانہ کون ہے؟

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۣ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ([illegible])

(اے پیغمبر اسلام! ان سے) کہہ دو، میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، خدا کے دین کی سربلندی کیلئے دو دو ایک ایک کرکے کھڑے ہو جاؤ، (اور) پھر غور کرو (اُس وقت تم پر یہ بات اچھی طرح روشن ہو جائیگی کہ) تمہارے رفیق (پیغمبر اسلام) کو کچھ جنون نہیں ہو گیا ہے، وہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ایک سخت عذاب (خداوندی کے آنے) سے پہلے تمہارے لئے (انکار اور بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا ہے! (اور دیکھیں [illegible])

لیکن اگر یہ اس پر آمادہ نہ ہوں اور اپنی ضد اور جہالت کی بنا پر آپ کو دیوانہ اور مجنون کہتے چلے جائیں تو اس سے کبیدہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں، ہر ایک رسول سے یہی کچھ کہا جاتا رہا ہے۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ○ (۵۱/۵۲)

(اے پیغمبر! جیسا کچھ تمہارے متعلق کہا جا رہا ہے) ایسے ہی ان قوموں کے پاس بھی جو ان سے پیشتر گذر چکی ہیں (خدا کا) کوئی پیغمبر نہیں آیا مگر سب نے (اپنے اپنے زمانہ میں اپنے اپنے پیغمبر کے متعلق) یہی کہا کہ یہ ساحر ہے یا پھر پاگل ہے!

ان کے جی میں جو کچھ آئے یہ کہتے رہیں، ہم تو جانتے ہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو عین عقل و ہوش پر مبنی ہے۔ جنون اور کہانت نہیں حق و یقین ہے۔ ظن و قیاس نہیں، قوانین خداوندی کے اٹل نتائج کا بیان ہے۔ یاوہ گوئی نہیں۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ○ (۵۲/۲۹ نیز ۸۱/۲۲)

(اے پیغمبر!) تم (دین حق کی) یاد دلاتے رہو۔ تم اپنے پروردگار کے فضل اور مہربانی سے نہ کاہن ہو اور نہ پاگل!

لہٰذا ان سے فقط اتنا کہئے کہ بہت اچھا! تم اسے جنون و کہانت کہہ رہے ہو اور میں حق و صداقت۔ اس بیج کو بڑھ کر درخت بنتے دو، پھل خود بتادے گا کہ کون سچا ہے۔

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ○ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ○ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ○ (۶۸/۲-۵)

(اے پیغمبر!) تم اپنے پروردگار کے فضل اور مہربانی سے پاگل نہیں ہو (بلکہ پاگل وہ ہیں جو تمہیں پاگل کہتے ہیں) اور حقیقت یہ ہے کہ تمہیں (کامیابی کی صورت میں اپنی ان قربانیوں کا پھل اور) اجر ضرور ملے گا، جس کے لئے تم کسی کے شرمندۂ احسان نہیں ہوگے۔ یہ واقعہ ہے کہ تم خلق عظیم (کی بلندی) پر (فائز) ہو۔ چنانچہ (وہ وقت آرہا ہے کہ) بہت جلد تم بھی دیکھ لوگے اور وہ لوگ بھی دیکھ لیں گے (کہ کس کے حصہ میں کامیابی و کامرانی رہتی ہے اور کسے ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے)

رجل مسحور بھی

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ نہیں، اسے جنون تو نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کی فہم و فراست اور دانش و بینش کی زندہ شہادت تو خود اس کی زندگی ہے جو ہمارے اندر گذری ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جو یہ اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ○ (۲۵/۸)

اور (دیکھو، پیروانِ دعوتِ ایمانی کو ورغلانے کے لئے) ظالموں نے یہاں تک کہا، "تم لوگ تو ایک ایسے آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو جو اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جادو کا مارا ہوا شخص ہے!"

ان کا یہ اتہام بھی کچھ نیا نہیں۔ حضرت صالحؑ سے ان کی قوم نے یہی کہا۔

قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ۝ (۲۶/۱۵۳)

لوگوں نے کہا، "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔

یہی کچھ حضرت شعیبؑ سے کہا گیا۔

قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ۝ (۲۶/۱۸۵)

لوگوں نے کہا "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے"۔

یہی فرعون نے حضرت موسےٰؑ سے کہا۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ۝ (۱۷/۱۰۱)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے موسیٰ کو نو آشکارا نشانیاں دی تھیں جب وہ بنی اسرائیل میں ظاہر ہوا تھا تو بنی اسرائیل سے دریافت کر لے (کہ کیا ماجرا گذرا ہے) فرعون نے اس سے کہا تھا کہ "اے موسیٰ! میں خیال کرتا ہوں، ضرور تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے"۔

اور ساحر بھی

ایسے لوگ بھی ہیں جو آپ کو مسحور نہیں بلکہ ساحر کہتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نیا الزام نہیں۔ ہر رسول سے ایسا ہی کہا گیا۔

كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ (۵۱/۵۲)

(اے پیغمبر! جیسا کہ تمہارے ساتھ کیا جا رہا ہے) ایسے ہی ان قوموں کے پاس بھی جو ان سے پیشتر گذر چکی ہیں (خدا کا) کوئی پیغمبر نہیں آیا مگر سب نے (اپنے اپنے زمانہ میں اپنے اپنے پیغمبر کے متعلق) یہی کہا کہ یہ تو ساحر ہے یا پھر پاگل ہے!

نیز شاعر!

اور ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شخص تصورات کی دنیا میں بیٹھا ہوائی قلعے بناتا رہتا ہے۔ کبھی کسریٰ کے ایوان گراتا ہے اور کبھی قیصر کا تخت الٹتا ہے۔ یہ محض شاعری ہے۔ حقیقت سے اس کا کیا تعلق؟ ان سے کہو کہ کمبختو! جو کچھ میں کہتا ہوں

حقیقت ہے۔ نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

لہ عنوان کے آخر میں "استدراک" دیکھئے۔

یہ زندگی کے ٹھوس حقائق ہیں۔ عالم تصورات کے حسین خواب نہیں۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝ (۶۹/۴۱)

اور (یاد رکھو) یہ قرآن کسی شاعر کا قول نہیں بلکہ (فطرت کے اٹل قوانین کا بیان ہے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ) بہت ہی تھوڑی سی باتیں ہیں جن پر تم یقین لائے ہو!

تخیلات کی وادیوں میں لطائف آفرینی، ایک داعیٔ انقلاب کا کام نہیں ہوتا۔ یہ اس کے مقصد زندگی کے خلاف اور منصب حیات کے منافی ہے۔ اسے شاعری[1] کرنا زیب ہی نہیں دیتا۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۳۶/۶۹)

اور (یاد رکھو) ہم نے محمد کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ کام اس کے لئے مناسب ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب (جو ہم نے اس پر نازل کی ہے) اس کے سوا کچھ نہیں کہ (قوانین فطرت کی) یاد دہانی اور ایک واضح کتاب (یعنی) قرآن ہے!

کیا شاعروں کو تم نے نہیں دیکھا؟ کبھی تصورات کی اس وادی میں بھٹک رہے ہیں کبھی تخیلات کے اس صحرا میں سرگرداں ہیں۔ نہ زندگی کی کوئی متعین منزل۔ نہ اس منزل تک پہنچنے کی دل میں تڑپ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ (۲۶/۲۲۵)

اے پیغمبر! کیا تم نے شاعروں کو نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

اسی لئے

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۶/۲۲۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں۔

ساری زندگی لفظی اتار چڑھاؤ میں گزر جاتی ہے۔ عمل کی ایک جھلک بھی ان کے نصیب میں نہیں ہوتی ان کے برعکس ایک میں ہوں کہ تمہارے سامنے زندگی کا ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین متعین کر کے رکھ رہا ہوں اور اس نصب العین کے حصول کے لئے تمہاری تمام خفتہ حیات اور خوابیدہ قوتوں کو یوں بیدار کر رہا ہوں جس طرح مضراب کی جنبش سے رگ ساز میں پوشیدہ نغمے تڑپ کر باہر آجائیں اور زندگی کی خاموش فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر کے روح میں بالیدگی اور خون میں حرارت پیدا کر دیں۔ میں تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہوں جس سے تمہارے عروق مردہ میں خون زندگی دوڑ جائے۔

[1] شاعری کیا ہے اور رسول شاعر کیوں نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اسی عنوان کے آخر میں "استدراک" دیکھئے۔

جو مردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک دے۔ میں تم سے فقط اتنا کہتا ہوں کہ زندگی کو میرے حیات آور پیغام کے قالب میں ڈھالو اور پھر دیکھو کہ ساری دنیا کی بادشاہتیں تمہارے قدم چومتی ہیں یا نہیں؟ اور اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر سب سے پہلے خود عمل کرتا ہوں (وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ)

کیا یہ شاعری ہے؟ کیا جذبات کی قوس قزاحوں میں تصورات کے جھولے جھولنے والے شاعر یہی کچھ کیا کرتے ہیں؟ اگر اب بھی تم اس پیغام انقلاب کو شاعری سمجھتے ہو تو اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ. تف ہے تمہاری سمجھ برادران برجن کے سمجھانے سے تم یہ کچھ کہتے ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (۲۴/۸)

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں (موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے اور جان لو کہ (بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ) اللہ (اپنے ٹھہرائے ہوئے قوانین و اسباب کے ذریعہ) انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، اور جان لو کہ (آخر کار) اسی کے حضور جمع کئے جاؤ گے!

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۵۵/۲۴)

(دیکھو) اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے ہیں کہ خدا انہیں ضرور زمین میں (دوسری قوموں کا) جانشین بنا دے گا جیسا کہ ان لوگوں کو بنا چکا ہے جو ان سے پہلے (ایمان و اعمال صالحہ کے ساتھ) گذر چکے ہیں اور ان کے نظام زندگی کو جسے خدا نے انکے لئے پسند کیا ہے (زمین میں) غلبہ اور تسلط عطا فرمائے گا۔ نیز ان (کی زندگی) کو خوف کے بعد امن و آسائش میں تبدیل کر دے گا۔ وہ لوگ میری عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرتے ہیں اور (اس باب میں) کسی چیز کو میرے ساتھ شریک نہیں کرتے (لہذا ان کی مدد کرنا ہمارا حق ہے) اور (یاد رکھو) جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کی راہ اختیار کرتے ہیں تو درحقیقت یہی لوگ ہیں جو نافرمانی کرنے والے ہیں (اور خدا نافرمانوں کی کبھی مدد نہیں کیا کرتا۔

ثابت قدمی کے لئے

ان تاریخی شواہد و امثال کے بیان اور حقائق و حکم کے اظہار سے نبی اکرمؐ اور آپ کی جماعت قدسیہ کی تثبیت قلب کا سامان بہم پہنچایا جاتا اور آپ سے کہا جاتا کہ ان لوگوں کی ان حرکات سے شکستہ خاطر نہ ہوں بلکہ نہایت عزم و استقلال سے اپنے مشن کو پورا کرتے چلے جائیں۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ (۱۶/۱۲۷-۱۲۸)

(اے پیغمبر!) عزم و استقلال سے کام کئے جاؤ اور تمہارا عزم و استقلال نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے۔ اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھاؤ، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ انہی کا ساتھی ہے۔ جو متقی ہیں اور نیک عمل میں سرگرم رہتے ہیں!

اُن مصائب و آلام سے ہمت نہ ہار دیں۔ خدا کا یہ وعدہ کہ آخر الامر فتح و کامرانی حق کے لئے مقدر ہے، بالکل سچا ہے۔ ایسا ہی ہو کر رہے گا۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ۝ (۳۰/۶۰)

(اے پیغمبر! اپنے مشن کی انجام دہی میں) استقلال سے جمے رہو۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کا وعدہ (کہ آخر غالب ہوگے) سچا ہے۔ اور خیال رکھو۔ (ایسی کوئی بات سرزد نہ ہوجائے کہ) جو لوگ ایمان و یقین کی دولت سے محروم ہیں (یعنی منکرین دعوت حق) تمہیں ہلکا سمجھنے لگ جائیں!

تکالیف و صعوبات میں کس طرح مستقل مزاج اور ثابت قدم رہا کرتے ہیں اس کے متعلق انبیائے سابقہ کے احوال و سوانح پر نگاہ ڈالو، ذرا دیکھو کہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ کیسا ہوا تھا۔

اِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۝ (۳۸/۱۷)

لہ صبر کے معنے ہیں جم کر بیٹھ جانا [illegible]۔

إِن كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝ (۲۵/۴۲)

(اے پیغمبر اسلام! وہ لوگ کہتے ہیں) "یہ واقعہ ہے کہ یہ پیغمبر ہمیں تقریباً ہمارے معبودوں سے کھو چکا تھا اگر ہم ان پر استقلال سے جم کر نہ بیٹھے رہتے۔" (گھبراؤ نہیں۔ نتائج اعمال کے ظہور کا وقت قریب ہی آگیا ہے) کچھ ہی عرصہ میں جب وہ عذاب (الٰہی) کو دیکھیں گے، تو (اچھی طرح) جان لیں گے کہ (در حقیقت) سچائی کے راستہ سے بھٹکا ہوا کون ہے؟ (وہ جو اپنے معبودوں پر جمے بیٹھے رہے یا وہ جو انکے بقول اپنے ان معبودوں سے کھوئے گئے؟)

(اے پیغمبر!) جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں ان (کی باتوں) پر استقلال و استقامت کو ہاتھ سے نہ دو اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو (بڑی) طاقتوں والا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ (تمام مشکلات و مصائب کے باوجود اپنے خدا کی طرف) بڑا ہی رجوع ہونے والا تھا۔

اس لئے ایسی عزیمت و استقامت دکھاؤ جیسی ان داعیان حق و صداقت نے دکھائی تھی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (۴۶/۳۵)

چنانچہ (اے پیغمبر!) عزیمت و استقامت کا ثبوت دو! جیسا کہ دوسرے (بڑے بڑے) صاحبانِ عزیمت پیغمبروں نے استقامت کا ثبوت دیا ہے اور ان کے لئے (نتائج اعمال کے ظہور میں) جلدی نہ کرو (وہ اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہو کر رہیں گے) اور جس دن وہ ان نتائج اعمال کو دیکھ لیں گے جن سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے (تب وہ اس چند روزہ زندگی کی حقیقت کو پہچانیں گے۔) گویا وہ اس دنیا میں محض دن کے ایک گھنٹہ کے بقدر رہے ہیں۔ یہ (اس احساس کی صحیح) تفسیر و تشریح ہے۔ پس (یاد رکھو) ہلاک نہیں کئے جائیں گے مگر وہی لوگ جو نافرمان ہوتے ہیں!

یہ کفر و معصیت اور سرکشی و طغیان پر جمے ہوئے ہیں۔ تم احکام الٰہیہ پر پختگی سے جمے رہو۔ ان ہر دو اسالیب زندگی کے نتائج خود بخود سامنے آجائیں گے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (۱۱/۱۱۲)

پس چاہیئے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے (تم، اور وہ سب، جو توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں (اپنی راہ میں) استوار ہو جائیں۔ اور (دیکھو) حد سے نہ بڑھو۔ یقین کرو، تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔

اپنے مسلک پر محکم و استوار رہو اور انہیں اس طرف آنے کی دعوت دیتے جاؤ۔ یہی فلاح و سعادت کی راہ ہے۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝ (۴۲/۱۵)

پس (اے پیغمبر!) اس نظامِ زندگی کی طرف ان کو دعوت دیتا رہ اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت و

عزیمت سے راس پر) جارہ، اور اس سلسلہ میں) ان کے پست خیالات کی پیروی نہ کر، اور کہدے
اللہ نے جو کتاب نازل فرمائی ہے میں اس پر یقین رکھتا ہوں اور مجھے رمیرے پروردگار کی طرف سے)
حکم دیا گیا ہے کہ عدل و مساوات رکا ایک خدائی نظام) تمہارے درمیان قائم کردوں رجس کا بنیادی
اصول یہ ہے کہ) اللہ ہی ہمارا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے ردولت رعزت کے خزانے اسی کے قانون سے وابستہ ہیں
انسانوں کا باہمی فرق و امتیاز محض ان کے اعمال کی بنا پر ہے۔ چنانچہ) ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور
تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ (اس میں) ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت بازی نہیں ہونی چاہیئے
رایک دن) اللہ ہم سب کو رمکافات عمل کے لئے) جمع کرے گا۔ اور ربالآخر) اسی کی طرف رسب کو)
لوٹنا ہے!

زندگی کی جو واضح شاہراہ آپ کے سامنے کھول دی گئی ہے ریعنی وحی) اس پر سیدھے چلتے جاؤ اور پھر دیکھو کہ خدا کے فیصلے کیا ہوتے ہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ٥ (۱۰/۱۰۹)

راے پیغمبر!) جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے، اس پر چلتے رہو، اور اپنی راہ میں جمے رہو۔ یہاں تک کہ اللہ فیصلہ
کردے، اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

خدا کے وعدے سچے ہیں۔ اس کے قوانین اٹل ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ عمل اور اس کے نتیجہ کی برآمدگی میں ایک وقفہ ہوتا
ہے۔ اس مہلت کے زمانے کو اسی طرح استقلال سے گزارنا چاہیئے جس طرح ایک کسان تخم ریزی کے بعد
فصل کاٹنے تک کا عرصہ کامل سکون و اطمینان (لیکن اس کے ساتھ ہی انتہائی جدوجہد کے ساتھ گزارتا ہے۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ
نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ٥ (۴۰/۷۷)

چنانچہ راے پیغمبر!) تم راپنے مشن کی سرانجام دہی میں) جمے رہو اور یقین رکھو، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پھر یا تو
کچھ وہ باتیں جن کی ہم منکرین حق کو دھمکی دے رہے ہیں آپ کو اسی زندگی میں دکھا دیں گے رکہ وہ کس طرح پوری
ہو کر رہیں) اور یا ران کے ظہور میں آنے سے پہلے) ہم تمہیں اپنی طرف اٹھالیں گے راور آپ کے بعد وہ باتیں
ظہور پذیر ہوں گی) (بہر حال وقت کی تعیین کے متعلق ہم کوئی واضح اظہار نہیں کرنا چاہتے کہ اس سے انسان
کی آزادیٔ عمل پر زد پڑتی ہے جو ہمارا منشا نہیں) اتب وہ سب ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے راور آخرت
میں ہمارے وعدوں کی سچائی تمہارے سامنے آجائے گی!)

اسی کا نام صبر جمیل ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ٥ إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ٥ وَنَرَاهُ قَرِيبًا ٥ (۷۰/۵-۷)

لہٰذا (اے پیغمبر!) عمدہ استقلال کے ساتھ (اپنے مشن کی سرانجام دہی میں) جمے رہو۔ یہ واقعہ ہے کہ منکرین دعوت اس (مکافات عمل) کو بہت دور سمجھ رہے ہیں حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ بہت ہی قریب ہے۔

عبودیت میں پختگی

اس تمام زمانہ میں، جبکہ معاندین، اس انقلابی تحریک کو کچلنے کے لئے اتنا کچھ کر رہے تھے نبی اکرمؐ نے اپنی جماعت کے لئے کیا پروگرام مرتب فرمایا تھا، اس کی تفصیل آئندہ چلکر آئے گی۔ قرآن کریم نے اس تمام تفصیل کو اس ایک نقطہ میں سمیٹ کر بیان کر دیا ہے جو اس تمام تحریک کا مرکز ثقل اور اس تمام جد و جہد کا اصل الاصول ہے۔ یعنی خدا کی محکومیت میں پختگی اختیار کرتے چلے جانا۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۱۹/۶۵﴾

آسمان اور زمین کا پروردگار، اور ان سب کا پروردگار جو آسمان و زمین میں ہیں، سو (اے پیغمبر!) اسی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کر اور اس کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) کی راہ میں جو کچھ پیش آئے مستقل مزاجی سے جھیلتا رہ۔ کیا تیرے جانتے کوئی دوسرا بھی اس کا ہم نام ہے؟ (یعنی اُس جیسا)

قیام صلوٰۃ

اور اس کا عملی طریقہ ہے "قیامُ صلوٰۃ"۔ اس لئے نظام صلوٰۃ کے قیام کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۝ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۝ (۲۰/۱۳۰-۱۳۲)

پس چاہئے کہ ان ساری باتوں پر صبر کر جو منکرین حق کہتے ہیں، اور اپنے پروردگار کی حمدیت میں سرگرداں ہو صبح کو سورج نکلنے سے پہلے، شام کو ڈوبنے سے پہلے، رات کی گھڑیوں میں بھی اور اطراف انہار بھی۔ بہت ممکن ہے کہ تو بہت جلد (ظہور نتائج سے) خوشنود ہو جائے۔ اور یہ جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیوی زندگی کی آرائشیں دے رکھی ہیں، اور ان سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، تو تیری نگاہیں ادہر نہ جمیں (یعنی یہ بات تیری نگاہ میں نہ جچے) یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالا ہے

۵؎ قرآنی نظام کا صحیح پروگرام کس طرح "قیام صلوٰۃ" کے نگینہ میں مرتسم ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر ملے گی۔

اور جو کچھ تیرے پروردگار کی بخشی ہوئی روزی ہے، وہی تیرے لئے بہتر ہے - اور (باعتبار نتیجہ کے) باقی رہنے والی!

اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دے، اور اسی پر جو حکم کے ساتھ جم جا ہم تجھ سے روزی کا سوال نہیں کرتے تو ہم سے

سائل ہے - ہم بخشنے والے ہیں - اور انجام کار تقویٰ ہی کے ہاتھ ہے!

اسی کو دوسری جگہ تسبیح و تحمید کے نام سے پکارا گیا۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (۴۰ / ۵۵)

پس (اے پیغمبر!) استقامت و استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہ - بلاشبہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور اپنی کوتاہی کے لئے خدا سے بخشش طلب کرتا رہ، اور اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کی پکار میں شام اور صبح لگا رہ۔

سورۂ قٓ میں ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ (۵۰ / ۳۹)

پس چاہئے کہ ان تمام باتوں پر صبر کر جو منکرین حق کہتے ہیں، اور اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کی پکار میں لگا رہ۔

صبح کو سورج نکلنے سے پہلے اور شام کو ڈوبنے سے پہلے!

مخالفین بھی جانتے تھے کہ اس صلوٰۃ کے اندر کتنی قیامتیں پوشیدہ ہیں۔ اس لئے وہ اس کے راستہ میں ہر ممکن رکاوٹ ڈالتے تھے۔

اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝ (۹۶ / ۱۰)

(اے پیغمبر!) تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو خدا کے بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے روکتا ہے!

اس طرح سے یہ دونوں جماعتیں (حزب الشیطان اور حزب اللہ) اپنی اپنی جد و جہد میں متوازی جا رہی تھیں، دونوں سرگرم عمل اور اپنی تگ و تاز اور سعی و کاوش کے نتیجہ کی منتظر۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (۱۱ / ۱۲۲)

اور (اے پیغمبر!) جو لوگ دعوت حق پر یقین نہیں رکھتے (صاف صاف) کہہ دے تم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو، ہم بھی (اپنی جگہ پر) عمل کر رہے ہیں اور (ظہور نتائج کا) انتظار کرو، یہ واقعہ ہے کہ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں

---

[1] تفصیل جلد اول میں گذر چکی ہے۔

دنیا میں طاغوتی قوتوں کے حیل و مکائد پر غور کیجئے۔ جب وہ دیکھتی ہیں کہ تخویف و ترہیب سے کام نہیں نکلتا تو ترغیب و تحریص پر اتر آتی ہیں۔ ابلیس نے آدم کو لالچ دیکر ہی جنت سے نکالا تھا، اس لئے امید و رجا کی گھاٹی میں، بیم و خوف سے بھی زیادہ لغزش کے امکانات ہوتے ہیں۔ جہاں لوہے کی ہتھکڑیاں

طمع اور لالچ

ٹوٹ جاتی ہیں وہاں سونے کی زنجیریں کام میں لائی جاتی ہیں حق و صداقت کی آواز کا گلا گھونٹنے کے لیے طلائی دستانے فولادی پنجوں سے کہیں زیادہ محکم گیر ثابت ہوتے ہیں۔ آپ تاریخ کے صفحات پر غور کیجئے، کتنے اولوالعزم سینے تھے جو جاہ و دولت کے انسانیت کش زلزلے سے دھڑکنے والے دلوں کے مدفن بن کر رہ گئے اور کتنی درخشندہ آنکھیں تھیں جو ریاست و سیادت کی برقِ خاطف سے "روزن دیوار زندان" ہو گئیں۔ قریش ستم رانیوں اور ایذا رسانیوں سے تھک گئے تو انہوں نے بھی یہی حربہ استعمال کرنا چاہا۔ چنانچہ عتبہ بن ربیعہ، سرداران قریش کے نمائندہ کی حیثیت سے حضورؐ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ

"محمدؐ! کیا چاہتے ہو؟

مکہ کی ریاست!

بڑے سے بڑے گھرانے میں شادی!!

دولت کا انبار!!!

جو کچھ مانگو تمہارے لئے حاضر ہے۔ لیکن اپنے اس مسلک کو چھوڑ دو۔"

آپ نے عتبہ کی طرف دیکھا اور اس آواز سے جو ضمیر انسانی کی گہرائیوں سے نکلا کرتی ہے قرآن کریم کی چند آیتیں پڑھیں۔ عتبہ محو حیرت کھڑا سن رہا تھا۔ جب واپس ہوا تو عتبہ کچھ اور تھا۔ اس نے قریش سے جاکر کہا کہ "محمدؐ جو کلام پیش کرتا ہے خدا کی قسم وہ شاعری نہیں۔ وہ ماورائے شاعری کچھ اور ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگیا تو یہ تمہاری ہی عزت ہے۔ اور اگر ناکام رہا تو عرب خود اسے فنا کر دے گا۔" لیکن قریش اس مشورہ کو کب ماننے والے تھے۔

قریش کی نگاہیں اس سے آگے جا نہیں سکتی تھیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا انتہائی مقصد حصول مال و دولت اور جلب منصب و شہرت تھا (اور یہی مقصد آج بھی سمجھا جا رہا ہے) وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ انسانیت کا مقصد اس سے کچھ بلند بھی ہو سکتا ہے۔

کارلائل کی شہادت

کارلائل، ان کو، اور ان جیسے اور معترضین کو مخاطب کر کے لکھتا ہے۔

جذبۂ جاہ پرستی؟

نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس سیاہ چمکیلی آنکھوں اور گہرے اور کشادہ قلب والے فرزند صحرا کے دل میں جو جذبات موجزن

تھے وہ جاہ پرستی سے بالکل الگ تھے۔

ایک خاموش روح عظیم!

وہ ان میں سے تھا جو صداقت مجسم ہوتے ہیں۔ وہ جنہیں خود فطرت صداقت کیلئے منتخب کرتی ہے جبکہ ساری دنیا روایات کہن اور نظری اعتقادات کی وادیوں میں گامزن نظر آتی ہے اور ان ہی فرسودہ روایات میں اپنا اطمینان پا لیتی ہے، اس قسم کا انسان اپنے آپ کو اس جھوٹے اطمینان کے نقاب میں چھپانا نہیں چاہتا۔ وہ اس تمام ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اور اس کی رفیق اس کی اپنی روح یا تلاش حقیقت کی تڑپ ہوتی ہے۔ ایسے شخص کا پیغام، قلب فطرت کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس کے پیغام پر کان دھرنا چاہیئے۔ کسی اور آواز پر نہیں۔ اس کے مقابلہ میں اور سب کچھ یونہی ہوائی ہوتا ہے۔

(Heroes. p. 49)

مصالحت کی کوشش

تحریص و ترغیب کی ناکامی کے بعد آخری حربہ مصالحت و مفاہمت کی کوشش ہوتی ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو مصالحت کی کوشش بھی، تحریص و ترغیب ہی کی ایک شکل ہوتی ہے۔

مصالحت (Compromise) ایک ایسا ہم رنگ زمیں دام فریب ہے جسے بڑی سے بڑی عقابی نگاہ بھی بمشکل بھانپ سکے۔

بظاہر دریا کی پرسکوت روانیوں کی طرح بالکل بے خطر اور جاذب قلب و نگاہ، لیکن سطح آب سے نیچے ایسے ایسے مہیب اور پرخطر نہنگ واژدر کہ پیکران حق و صداقت کو پورے کا پورا نگل جائیں اور کانوں کان کسی کو خبر تک نہ ہو۔

بہت بڑا فریب

ایک ایسا رنگین چشمہ کہ جس میں جھوٹ، سچ اور سچ، جھوٹ بن کر دکھائی دے۔ ایک ایسا نگاہ فریب نقاب جس میں گرگ درندہ، برۂ معصوم اور برۂ معصوم گرگ درندہ نظر آئے۔

اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کہتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اور آپ کا فریق مقابل کہتا ہے کہ نہیں، دو اور دو تین ہوتے ہیں۔ اس اختلاف پر آپ میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ادھر اُدھر کے لوگ بیچ بچاؤ کرنے کے لئے آجاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہر شخص ان میں سے یہی کہے گا کہ صاحب! مصالحت کی تو یہی صورت ہو اکرتی ہے کہ کچھ تم گھٹو۔ کچھ یہ بڑھے، اور اس طرح بیچوں بیچ کچھ فیصلہ ہو جائے۔ اگر تم دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے رہے تو مصالحت کیسے ہو سکتی ہے؟ اب فرض کیجئے کہ آپ کا فریق مخالف نہایت "کشادہ ظرفی" کا ثبوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ صاحب میں تو جھگڑا پسند نہیں کرتا۔ چلیئے میں ان کی خاطر روپے میں سے بارہ آنے چھوڑتا ہوں اور یہ مان لیتا ہوں کہ دو اور دو تین نہیں، پونے

چار ہوتے ہیں۔

اگر آپ اس پر بھی نہیں مانتے تو ساری دنیا آپ کے خلاف ہو جاتی ہے کہ دیکھئے صاحب! اُس کی "شرافت" ملاحظہ ہو کہ اس نے ہمارا کہنا نہیں ٹالا اور جھگڑا نپٹانے کے لئے بارہ آنے چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا ہے اور اس کی "ضد" دیکھئے کہ یہ چار آنے بھی پیچھے نہیں اترتا۔ بھلا اس قسم کی ہٹ دھرمی سے دنیا میں کام چل سکتا ہے؟

اور اگر آپ اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ دو اور دو پونے چار ہوتے ہیں تو کہئے! اس میں فتح کس کی ہوئی؟ حق کی یا باطل کی؟

یہ ہے وہ مہیب فریب جسے معرکۂ حق و باطل میں مصالحت (Compromise) کہا جاتا ہے۔

حق کسے کہتے ہیں

حق کہتے ہی اسے ہیں کہ جو اپنی جگہ پر اٹل ہو۔ امٹ ہو۔ دو اور دو چار کی طرح، کوہ آسا محکم کھڑا ہو۔ اگر یہ اپنے مقام سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر سرک جائے تو باطل ہو جائے۔ برعکس اس کے اگر باطل اپنے مقام سے سَو قدم بھی پیچھے ہٹ جائے تو بھی اپنے مقام پر قائم ہے۔ پیچھے تو وہ ہٹے جو حد سے بڑھا ہوا ہو۔ جو پہلے ہی آخری حد پر کھڑا ہو وہ پیچھے کیسے ہٹ جائے۔ حق اپنے مقام سے آگے نہیں بڑھا ہوتا اس لئے وہ پیچھے ہٹ نہیں سکتا۔ قیمت وہ کم کرے جو زیادہ دام مانگ رہا ہو۔ جو پہلے ہی پوری قیمت مانگ رہا ہو وہ کم کس طرح کر دے؟ حق و باطل کی کشمکش میں، باطل یہی پرفریب حربہ استعمال کرتا ہے اور ساری رائے عامہ کو یہ کہکر بر سرِ حق فریق کے خلاف کر دیتا ہے کہ دیکھو لو! یہ شخص کس قدر ضدی ہے کہ تم میں سے کسی کی بات مانتا ہی نہیں!

لیکن سوچئے کہ اگر حق (Truth) لوگوں کے جذبات و آراء کے تابع ہو کر اپنے مقام سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو اس کائنات کا کیا حشر ہو؟

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۲۳/۷۱﴾

اور اگر ایسا ہوتا کہ حق ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا، تو یقیناً آسمان و زمین اور وہ سب جو ان میں ہے یک قلم درہم برہم ہو جاتا۔ ہم نے ان کے لئے ان کی نصیحت کی بات مہیا کر دی، تو یہ اپنی نصیحت کی بات سے گردن پھیرے ہوئے ہیں؟

اگر سورج لوگوں کے کہنے سے اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی کمی کر دے۔ اگر زمین اپنی جذب و کشش میں ذرہ برابر بھی فرق پیدا کر دے۔ اگر ستارے اپنے راستوں میں ایک انچ کا بھی رد و بدل کر لیں۔ تو اس کا انجام سمجھ لیجئے کہ کیا ہو؟ یہ عالم آفاق کے مظاہر ہیں جنہیں ہماری محسوسات کی خوگر نگاہیں بغیر دقت بھانپ لیتی ہیں لیکن عالم انفس کی کائنات بھی تو اسی طرح حق پر مبنی ہے اور اس کا دار و مدار بھی اسی قسم کے ضبط و اتقان اور نظم و ترتیب پر ہے۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر سورج، حق کی راہ سے اِدھر اُدھر ہٹ جائے تو فساد برپا ہو جائے لیکن اگر انسانیت جادۂ حق و صداقت سے منحرف ہو جائے تو عالم انفس کا کچھ بھی نہ بگڑے؟

یہ نگاہ کی بھول اور دل کا فریب ہے۔ اس سے عالم انفس میں اس سے بھی کہیں زیادہ فساد برپا ہو جاتا ہے جتنا عالم آفاق میں ہوتا ہے لیکن ہماری سر کی آنکھیں ان مستور حقیقتوں کو دیکھ نہیں سکتیں اور دل کی آنکھیں، نورِ بصیرت کے فقدان سے اندھی ہو چکی ہوتی ہیں۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝ (۲۲/۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے، تو آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں (جو سروں میں ہیں) بلکہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں!

حق و صداقت کی تحریک انقلاب میں، تلبیس حق و باطل، ایک کھلا ہوا شرک ہے اور اس توحید کے یکسر منافی جو اس تحریک کی بنیاد و اساس ہوتی ہے۔ اسلئے ایک داعی حق و صداقت کے سامنے یہ حقیقت ہر وقت بے نقاب رہتی ہے کہ

باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

باطل سے مصالحت کیسی؟

قریش نے بھی بالآخر اسی قسم کی مصالحت کی کوششیں شروع کیں حضورؐ کو اور آپ کی وساطت سے جماعت مومنین کو ان کوششوں کی تباہ کاری اور ہلاکت انگیزی سے آگاہ کیا گیا۔ سورۂ قلم میں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۶۸/۷)

(اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ تیرا پروردگار اس کا زیادہ علم رکھتا ہے کہ کون (سچائی کے) راستہ سے بھٹک گیا ہے اور کون صحیح راستہ پر چل رہا ہے؟

اس لئے

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (۶۸/۸)

لہٰذا تم ان لوگوں کی ہرگز پیروی نہ کرنا جو (حقیقت کو) جھٹلانے والے ہیں۔

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ کچھ یہ جھک جائیں کچھ تم جھک جاؤ۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ (۶۸/۹)

ان کی یہ خواہش ہے اگر تم کچھ مداہنت سے کام لینے لگو تو وہ بھی مداہنت سے کام لینے لگیں!

لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اس ذرا سے جھکاؤ میں کائنات کی دیواریں ہل جاتی ہیں۔ اسلئے

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ (۶۸/۱۰)

اور (اے پیغمبر!) یاد رکھ کسی ذلیل کمینے اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے کی پیروی نہ کرنا!

تم اپنے مقام صدق و عدل پر جمے رہو اور ان کے ایسال و حوالف کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ؕ (۴۲/۱۵)

پس (اے پیغمبر!) اسی (پیغام الہیٰ) کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا رہ، اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اپنی پختگی کے ساتھ جم جا اور لوگوں کے خیالات کی پیروی نہ کر اور (صاف صاف) کہدے کہ میرے خدا نے جو کتاب نازل فرمائی ہے میں اس پر یقین رکھتا ہوں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (اس کتاب الہیٰ کے مطابق) تمہارے درمیان عدل (ومساوات) کا ایک نظام قائم کردوں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے (کیونکہ عزت و دولت سب اس کے قانون کے ساتھ وابستہ ہیں) ہمارے اعمال ہمارے کام آئیں گے اور تمہارے اعمال تمہارے کام آئیں گے۔ اس بارہ میں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت بازی کی ضرورت ہی نہیں۔ (جب مکافات عمل کا وقت آئے گا، تو) خدا ہم سب کو اکٹھا کردے گا۔ اور (بالآخر سب کو) اس کی طرف لوٹنا ہے۔ (اس وقت حقیقت حال واضح طور پر نتائج کی شکل میں سامنے آجائے گی!)

حق پر استقامت گزینی ہی بر سر حق ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے باطل کی اطاعت کیسی؟

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ (۷۶/۲۴)

لہذا (اے پیغمبر!) اپنے پروردگار کے حکم پر استقلال و استقامت کے ساتھ جمے رہو اور ان میں کسی نافرمانی یا سچائی کا انکار کرنے والے کی پیروی نہ کرو!

اطاعت تو ایک طرف، ان کی طرف ذرا سا جھکو بھی نہیں کہ اس میلان میں بھی ملابستِ حق و باطل کی جھلک پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (۱۱/۱۱۳)

اور ایسا بھی نہ کرنا کہ ظالموں کی طرف جھک پڑو اور (قریب ہونے کی وجہ سے) آگ تمہیں بھی چھو جائے۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی رفیق نہیں۔ پھر (اگر اس سے بچھڑے تو) کہیں مدد نہ پاؤ گے!

ان سے برملا کہدو کہ اگر تمہیں اس نظام زندگی کے برسرحق ہونے میں شبہ ہے جسے میں پیش کر رہا ہوں تو یہ مت سمجھو کہ تمہاری خاطر میں کوئی اور نظام اختیار کرلوں گا۔ "ایں خیال است و محال است و جنوں"

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ

تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلٰکِنۡ اَعۡبُدُ اللّٰہَ الَّذِیۡ یَتَوَفّٰکُمۡ ۚۖ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ﴿۱۰/۱۰۴﴾

(اے پیغمبر!) تم کہدو! "اے لوگو! اگر تم میرے (پیش کردہ) نظام زندگی کے بارے میں کسی طرح کے شبہ میں ہو، تو میں بتلا دیتا ہوں کہ تمہارے اس شک وشبہ کی وجہ سے تو میں ان چیزوں کی عبودیت (محکومیت واطاعت) اختیار کرنے سے رہا جن کی تم خدا کے سوا عبودیت (محکومیت واطاعت) اختیار کئے ہوئے ہو۔ بلکہ میں تو اسی اللہ کی عبودیت (محکومیت واطاعت) اختیار کروں گا جس کے قبضۂ قدرت میں یہ بھی ہے کہ وہ تم پر موت طاری کردے (یعنی جو مالک موت وحیات ہے) اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مؤمنوں کے زمرہ میں سے ہوں"۔

میں تو تمام دنیا سے کٹ کر اسی ایک راہ پر چلتا جاؤں گا جو اقوم الطریق اور اوضح السبیل ہے۔

وَ اَنۡ اَقِمۡ وَجۡہَکَ لِلدِّیۡنِ حَنِیۡفًا ۚ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰/۱۰۵﴾

"اور نیز مجھے کہا گیا ہے کہ ہر طرف سے ہٹ کر اپنا رخ اللہ کے دین کی طرف کرلے، اور ایسا ہرگز نہ کیجیو کہ شرک کرنے والوں میں سے ہو جائے!"

میں تمہاری خاطر قرآن نہیں چھوڑ سکتا۔

فَلَعَلَّکَ تَارِکٌۢ بَعۡضَ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَ ضَآئِقٌۢ بِہٖ صَدۡرُکَ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ کَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَہٗ مَلَکٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِیۡرٌ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ﴿۱۱/۱۲﴾

تو (اے پیغمبر!) کیا یہ ممکن ہے کہ لوگوں کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ "اس پیغمبر پر (آسمان سے) کوئی خزانہ کیوں نہ اترآیا۔ یا اس کے جلو میں کوئی فرشتہ کیوں نہ آگیا؟" تم کتاب اللہ کے کچھ حصہ کو جو تم پر وحی کیا جاتا ہے چھوڑ دوگے اور اس کی وجہ سے دل تنگ ہوگے؟ (ظاہر ہے کہ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ پھر جو کام تم نے کرنا ہی نہیں اس کی وجہ سے متفکر ومغموم رہنے سے فائدہ؟) اے پیغمبر! (یاد رکھو) تم تو صرف (اقوام عالم کو، انکی بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والے ہو (اور بس۔ حق کو منوانا اور اس پر عمل کرانا تمہارا کام نہیں) اور ہر چیز پر اللہ ہی نگہبان ہے!

اے منکرینِ حقیقت! اگر تم شرف انسانیت کی اس سیدھی راہ کو اختیار نہیں کرنا چاہتے تو کچھ عرصہ بعد تم خود دیکھ لوگے کہ تمہاری راہ تمہیں کس طرف لے جاتی ہے؟ میں دیکھتا بوجھتا تمہاری راہ کیسے اختیار کرلوں؟

فَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقُلۡ لِّیۡ عَمَلِیۡ وَ لَکُمۡ عَمَلُکُمۡ ۚ اَنۡتُمۡ بَرِیۡٓـــُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰/۴۱﴾

اور اگر یہ اسقدر سمجھانے پر بھی تجھے جھٹلائیں، تو کہہ میرے لئے میرا عمل ہے، تمہارے لئے تمہارا۔ میں جو کچھ کرتا ہوں، اس کی ذمہ داری تم پر نہیں، تم جو کچھ کرتے ہو، اس کے لئے میں ذمہ دار نہیں۔" (ہر شخص کے لئے اس کا عمل ہے۔ اور عمل کے مطابق نتیجہ۔ پس تم اپنی راہ چلو مجھے اپنی راہ چلنے دو، اور دیکھو، اللہ کا فیصلہ کیسا ہوتا ہے)

"مصالحت" کی طرف آمادگی کا جذبہ محرکہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس سے ان کی ایذا رسانی سے محفوظ ہو جاؤ، سو ان کی اس دھمکی کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔ اللہ کی حفاظت کافی ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (۳۳/۴۸)

اور (اے پیغمبر!) منکرین حق اور منافقین کی اطاعت نہ کرو۔ ان کی ایذا دہی کے خیال) کو چھوڑ دو اور خدا پر بھروسہ رکھو، خدا کی نگرانی اور حفاظت (تمہارے لئے) کافی ہے۔

ان کی تمام شرارتوں اور سازشوں سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے حصار عافیت میں لے آیئے۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۴۱/۳۶)

اور کبھی شیطان کی دخل اندازی تمہیں پریشان کرے تو اللہ کی پناہ طلب کر۔ بلا شبہ وہ بڑا ہی سننے والا اور خوب جاننے والا ہے!

جو اللہ کی محکومیت اختیار کر لیتا ہے۔ اللہ کی حفاظت اس کے لئے کافی ہوتی ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ (۳۹/۳۶)

(اے پیغمبر!) کیا خدا اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں! (ضرور کافی ہے)، اور یہ لوگ تمہیں ماسوائے خدا سے ڈراتے ہیں۔ (حالانکہ تمام طاقتوں کے سرچشموں کا مالک صرف خدا ہی ہے) اور جسے اللہ (راہ حق) سے گم کر دیتا ہے اسے کوئی راہنما نصیب نہیں ہوتا (ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔)

حفاظت کی ذمہ داری

دنیا کے چھوٹے چھوٹے نظامہائے حکومت کی یہ کیفیت ہے کہ ہر حاکم اپنی رعایا کی حفاظت کرتا ہے۔ تو کیا وہ احکم الحاکمین جو نظامہائے کائنات کے مرکز اعلیٰ پر مستوی ہے، اپنے عباد کی حفاظت کے لئے کافی نہیں؟

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ڶ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ (۹/۱۲۹)

اے پیغمبر! اگر اس پر بھی یہ سرتابی کریں، تو ان سے کہہ دو "میرے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ کوئی معبود (ایسا وجود جسکی اطاعت کی جائے) نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات۔ میں نے اسپر بھروسہ کیا، وہ (تمام عالم ہستی کی جہانداری کے) عرش عظیم کا خداوند ہے!"

وہ تو حق وصداقت کے پیغام پہنچانے والوں کی حفاظت کے لئے دائیں بائیں سے پہرے دار مقرر کردیتا ہے۔

إِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَإِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّیَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَأَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۝ (۷۲: ۲۷-۲۸)

(خدا اپنے غیب پر) سوائے ان لوگوں کے جنہیں رسالت کے لئے منتخب کرلیتا ہے (کسی کو مطلع نہیں کرتا) پھر حقیقت ہے کہ ان رسولوں کے آگے اور پیچھے خدا کی طرف سے محافظ (فرشتے) رہتے ہیں۔ تاکہ خدا کو معلوم ہو جائے کہ رسولوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کو بے کم وکاست مخلوق تک پہنچادیا ہے۔ اور جو حالات انکے آس پاس وپیش ہیں ان کا احاطہ کرسکے اور ہر چیز کے شمار کو محفوظ رکھ سکے۔

اس لئے ان کی مخالفت سے مت گھبراؤ۔ ہم تمہاری حفاظت سے بے خبر نہیں۔ تم تو ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْیُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۝ (۵۲: ۴۸)

اور (اے پیغمبر!) اپنے پروردگار کے حکم پر (استقامت واستقلال کے ساتھ) جمے رہو اور (لوگوں کی مخالفت کی مطلق پرواہ نہ کرو) یہ واقعہ ہے کہ تم (ہر وقت) ہماری آنکھوں کے سامنے ہو اور جب بھی اٹھو اپنے پروردگار کی حمد وثنا کی پکار میں لگے رہو!

اور یہ تم خوب جانتے ہو کہ یہ "آنکھیں" وہ ہیں جن میں نہ کبھی نیند آتی ہے اور نہ اونگھ۔ لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ اس سے ان لوگوں کی مخالفانہ روش اور معاندانہ میل کی کچھ پرواہ نہ کرو اور حق کی آواز کو بلند سے بلند تر کرتے جاؤ کہ باطلانہ روباہ بازی محض بھبکی ہوتی ہے، اس کی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔

ضیق صدر

ذرا فاران کی وادیوں سے تجلی گاہ طور کی طرف چلئے۔ جب حضرت موسےٰ کو حکم ملا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور بنی اسرائیل کو اس کے دست تظلم واستبداد سے نجات دلاؤ، تو یہ مہم اسقدر صبر آزما تھی کہ آپ نے عرض کیا

قَالَ رَبِّ إِنِّیْ أَخَافُ أَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ۝ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ

فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ ۝ (۲۶ ۱۲-۱۳)

(موسیٰ نے کہا "اے پروردگار! مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگ میری تکذیب کریں گے (جسے میں برداشت نہیں کر سکوں گا)

اور (اس وجہ سے مجھے دل تنگی ہوگی اور میری زبان بھی نہ چل سکے گی لہٰذا (میری مدد کیلئے) ہارون کی طرف اپنا پیغام بھیج دے۔

آنے والے خطرات اور فریق مقابلہ کی بے اصول سرشت کے تصور سے حضرت موسیٰؑ کے قلب پر جو کیفیت طاری ہوئی اسے "ضیق صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان خطرات کے پیش نظر آپ نے بحضور رب العزت درخواست پیش کی کہ

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ (۲۰ ۲۵-۲۶)

(موسیٰ نے) کہا "اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے اور اس میرے کام کو میرے لئے آسان فرما دے۔"

اس سے واضح ہو گیا کہ "ضیق صدر" اور "شرح صدر" کا مفہوم کیا ہے؟

غور کیجئے کہ ایک رسول کے سامنے کس قدر عظیم الشان مہم ہوتی ہے جسے سر کرنے کیلئے اسے قسم قسم کی صبر آزما اور جگر گداز وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کی دعوتِ انقلاب ہر طاغوتی مستبد قوت کے خلاف اعلان جنگ ہوتی ہے اور وہ تنہا ان سب کی مخالفت و معاندت کا مقابلہ کرتا ہے۔ پھر اس کشمکش میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ فریق مقابل ہر قسم کی بے اصولی پر اتر آتا ہے۔ وہ بددیانتی اور فریب کاری کی روباہ بازیوں اور دنائت و کمینگی کے سوقیانہ حملوں تک سے بھی احتراز نہیں کرتا۔ اس کے برعکس، یہ داعیِ حق و صداقت ان حملوں کے مقابلہ میں اصول و آئین پرستی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا اور ان کی طرف سے کید و حیل اور مکر و دجل کے کسی میدان میں بھی اپنے مقام راستبازی سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ ان کی یہ حرکات یقیناً ایک شریف النفس انسان پر گراں گزرتی ہیں۔ یہی تھی وہ کیفیت جس کے پیش نظر نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ (۱۶ ۱۲۷-۱۲۸)

(اے پیغمبر!) صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے، اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ ان ہی کا ساتھی ہے جو متقی ہیں اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں!

سورۂ نمل میں ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ (۲۷ ۷۰)

اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا اور نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو!

دوسرے مقام پر ہے۔

ؔ تفصیل جلد سوم۔ ذکر بنی اسرائیل۔ باب پنجم میں گزر چکی ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ (۱۵/۹۷-۹۹)

ہم اس سے بے خبر نہیں کہ ان لوگوں کی باتوں سے تمہارا دل رکنے لگتا ہے۔ سو چاہیئے کہ اپنے پروردگار کی ستائش کو (شب و روز) ورد زبان کرلو۔ اس کے حضور سجدے میں گرے رہو۔ اس کی عبودیت پر جمے رہو۔ یہانتک کہ یقین تمہارے سامنے آجائے!

سورۂ ہود میں ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (۱۱/۱۲)

تو (اے پیغمبر!) کیا یہ ممکن ہے کہ لوگوں کے اس کہنے کی وجہ سے کہ "اس پیغمبر پر (آسمان سے) کوئی خزانہ کیوں نہ اُتر آیا، یا اس کے جلو میں کوئی فرشتہ کیوں نہ آگیا؟" تم کتاب اللہ کے کچھ حصہ کو جو تم پر وحی کیا جاتا ہے چھوڑ دوگے اور اس کی وجہ سے دل تنگ رہو گے؟ (ظاہر ہے کہ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ پھر جو کام تم سے نہیں ہوسکتا اس کی وجہ سے متفکر و مغموم رہنے سے فائدہ؟) اے پیغمبر! یاد رکھو! تم تو صرف (اقوام عالم کو، انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والے ہو۔ (اور بس۔ حق کو منوانا اور اس پر عمل کرانا تمہارا کام نہیں) اور ہر چیز پر اللہ ہی نگہبان ہے!

صعب و کرب اور حزن و ملال کی ان تنگناؤں سے مردانہ وار گذر جانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی نگاہوں میں وسعت حوصلہ میں بلندی اور ہمت میں رفعت پیدا ہو۔ اسی کا نام شرح صدر یعنی سینہ کی کشادگی ہے۔

اور شرح صدر

ایسی کشادگی کہ دنیا بھر کے مصائب و آلام اور خطرات و احوال اس کے اندر سما جائیں یہی تھی مبدأ فیض کی وہ گراں بہا بخشائش جسکی یاد حضورؐ کو ان الفاظ میں دلائی گئی۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (۹۴/۱-۴)

(اے پیغمبر!) کیا ہم نے تمہارا سینہ نہیں کھولدیا اور تم سے تمہارا وہ (گرانبار) بوجھ دور نہیں کردیا جو تمہاری کمر توڑے ڈالتا تھا اور کیا ہم نے تمہارا آوازہ بلند نہیں کردیا؟

ذمہ داریوں کا وہ بوجھ جس سے آپ کی کمر بہت ٹوٹ سکتی تھی اُسے عزم و استقلال کے بازوؤں سے اٹھا کر دور پھینکدیا گیا اور اس کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مخالفین و معاندین سرنگوں ہوگئے۔ اور کلمۃ الحق جس کے اعلاء (بلند کرنے)

کے لئے آپ اٹھے تھے ایسا بلند ہو کر رہا کشجرۃٍ طیبۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ جو ضیق اور تنگی کے صبر آزما مراحل میں ہمت نہیں ہارتا، وسعت اور کشادگی اسی کے حصہ میں آتی ہے۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝ (۹۴/۵-۶)

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔ بلاشبہ تنگی کے ساتھ فراخی ہے!

اور پھر فتح و کامرانی کے بعد سہل انگاری اور تن آسانی نہیں کہ "شمشیر و سناں اول۔ طاؤس و رباب آخر" ان کا مسلک ہے جو کوئی مقصد زندگی اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ اس لئے

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ ..... (۹۴/۷)

لہٰذا (اے پیغمبر!) جب تم ایک مہم سے فارغ ہو جاؤ تو (دوسری مہم کیلئے) محنت و مشقت کرو۔

وہ محکم مقصد زندگی کیا ہے جس کے لئے یہ سب کچھ کرنا ہے۔ رَجعتٌ اِلَی اللہ[1]۔

وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ۝ (۹۴/۸)

اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جایا کرو۔

ذمہ داری کا یہی پاس اور مہم پیش نظر کی گراں باری کا یہی احساس تھا جو آپ کو راتوں کو سونے نہیں دیتا تھا۔ دن بھر اس تگ و تاز اور جد و جہد میں مصروف عمل رہتے اور رات کو، جب سارا عالم سو جاتا، تو آپ اپنے پروگرام کا نیا

رات کی تنہائیوں میں

ورق الٹتے۔ رات کی تنہائیوں میں آپ کیا کرتے؟ غور و فکر، سوچ بچار، اپنی مہم کی کامیابی کی تدابیر و تجاویز۔ اور ان سب سے بڑھ کر تبتّل[2] الی اللہ[3] پہلی سب چیزیں تو ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں لیکن آخری چیز آج بمشکل سمجھ میں آسکے گی، اس لئے کہ آج مادیت کی فضا ساری دنیا کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے کہ جو لوگ بظاہر خدا پر ایمان کے مدعی بھی ہیں ان کی سمجھ میں بھی یہ بات بآسانی نہیں آتی کہ معاملات کی درستی اور کامیابی کے سلسلہ میں "خدا" کہاں آتا ہے؟ لیکن جن پر حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ سلسلۂ علت و معلول کی کڑیوں میں نصرت خداوندی کس طرح بجلیوں کا اثر دوڑا دیتی ہے اور فطرت انسانی کو فطرت اللہ کے رنگ میں رنگ لینے اور اس طرح اس "رفیق اعلیٰ" سے ہم آہنگی پیدا کر لینے سے اولی الذکر کے جوہر خوابیدہ کس طرح بیدار ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام تبتّل، انابت اور رجعت الی اللہ[1] ہے۔ رسول اکرمؐ کی حالت یہ تھی

---

[1] اس کی تشریح آئندہ چلکر ملیگی جہاں یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائیگی کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ میں کتنا عظیم الشان مقصد زندگی مضمر ہے۔ اور وہ آیت جو ہماری کوتاہی قسمت سے نوحہ ماتم بنگئی ہے کیسے نغمات شادی و نشید کامرانی کی آئینہ دار ہے۔

[2] ضیق اور شرح صدر کے ضمن میں ان آیات کو بھی دیکھ لیجئے۔ مطلب اور واضح ہو جائے گا۔ ۶/۱۲۵ ؛ ۱۲/۱۰۶ ؛ ۳۹/۲۲

[3] تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

کہ جوشِ اخلاص اور شدتِ عمل میں سارے دن کی سعی و کاوش کے بعد راتیں اسی تفکر و تبتّل میں گذار دیتے تھے اور اس جذب وانہماک اور محویت و استغراق میں اس امر کا خیال تک بھی نہیں آتا تھا کہ اس کا صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس لئے

کچھ سونا بھی چاہیئے

آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی اور کہا گیا کہ اس عظیم الشان مہم کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ رات کا کچھ حصہ سونے کے لئے بھی رکھا جائے۔

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ ...... (۷۳/۱)

اے وہ کہ جس کے سر پر ذمہ داریوں کا اتنا بڑا بوجھ ہے۔

قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ (۷۳/۲-۳)

رات کو (نماز کے لئے) اٹھا کرو مگر تھوڑا سا حصہ (سونے کے لئے بھی رکھو۔ یعنی) رات کے آدھے حصہ میں قیام کرو بلکہ تھوڑا سا اس میں سے بھی کچھ کم کر دیا کرو۔۔۔۔!

اور اس قیام میں نہایت غور و تدبر سے قرآن کی تلاوت کرو۔

أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ (۷۳/۴)

یا اس پر کچھ اضافہ کر لیا کرو (اور اس قیام میں) آہستہ آہستہ (تدبر و تفکر کے ساتھ) قرآن کی تلاوت کیا کرو!

شب بیداری میں یہ کمی اس لئے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے کام اتنا ہی نہیں۔ ابھی تو بڑا راستہ باقی ہے۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ (۷۳/۵)

یہ واقعہ ہے کہ ہم جلد ہی تم پر ایک بوجھل بات ڈالیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ رات کی سکوت افزا فضا میں یکسوئی اور دلجمعی کا پورا پورا سامان ہوتا ہے۔

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ (۷۳/۶)

بلاشبہ رات کو اٹھنا (برائیوں کے لئے) سخت ترین روند ڈالنے والی اور قول کو درست ترین کر دینے والی چیز ہے۔ (یعنی رات کو جاگنے سے انسان میں دو طاقتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ برائیوں کو مٹا ڈالنے کی اور کردار کو گفتار کے مطابق کرنے کی قوت)

لیکن تمہارے لئے دن میں بھی تو کچھ کم کام نہیں ہوتا۔

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ (۷۳/۷)

یہ بھی واقعہ ہے کہ تمہارے لئے دن کے اوقات میں بھی طویل مشاغل ہوتے ہیں!

ہم تمہاری بے تابیٔ تمنا سے واقف ہیں لیکن تمہاری مہم بہت صبر طلب واقع ہوئی ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس مہم کو سامنے رکھو اور ہر طرف سے یکسوئی اختیار کر کے قوتوں کے اس سرچشمہ سے ہم آہنگی پیدا کئے جاؤ۔ منزل کھنچ کر

قریب آجائے گی۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝ (۷۳/۸-۹)

اور اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرتے رہو اور اس کی طرف اچھی طرح سے متوجہ رہو۔ وہی مشرق و مغرب کا پروردگار (مالک) ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ لہٰذا (اے پیغمبر!) اسی کو نگران و محافظ بنا لو!

باقی رہے یہ مخالفین۔ سو ان کی باتوں کی پرواہ نہ کرو۔ اور حسن انداز سے ان کی لغویتوں سے کنارہ کش ہوتے جاؤ!

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝ (۷۳/۱۰)

اور جو کچھ وہ (ایذا رسانی کی باتیں) کہتے ہیں ان پر صبر کرو اور ان کو مناسب طور پر چھوڑ دو (ان سے کوئی غرض نہ رکھو)

اور یہ جو مال و دولت کے گھمنڈ پر یوں حق کی مخالفت کر رہے ہیں انھیں ہمارے قانون مجازات کے حوالے کر دو اس قانون میں مہلت کا وقفہ ضرور ملتا ہے۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝ (۷۳/۱۱)

اور مجھے اور ان حق کے جھٹلانے والے دولتمندوں کو چھوڑ دو (میں آپ ان سے سلٹ لوں گا) البتہ تھوڑی سی انھیں مہلت دو (کہ ہمارے قانون کے مطابق عمل کو نتیجہ تک پہنچنے کا وقفہ مل جائے)

اور جب ظہور نتائج کا وقت آجاتا ہے تو بربادی اور تباہی کا جہنم شعلہ بار اور آتش ریز آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ۝ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۝ (۷۳/۱۲-۱۴)

یہ واقعہ ہے کہ ہمارے پاس (ان لوگوں کیلئے) بھاری بھاری بیڑیاں اور بیڑیاں، شعلہ فگن آگ، گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب (تیار) ہے جس دن زمین اور پہاڑ تک بھی زلزلا جائیں گے اور بڑے بڑے پہاڑوں کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے ریت کے ڈھیلے ڈھالے ٹیلے ہوتے ہیں۔

ذرا اس مہم پر غور کرو جو اس سے پیشتر حضرت موسیٰ کے سپرد کی گئی تھی۔ فرعون نے کس قدر استبداد اور سرکشی سے اس دعوت انقلاب کی مخالفت کی لیکن اس کا انجام اس کی ہلاکت کے سوا اور کیا ہوا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝ (۷۳/۱۵-۱۶)

(اے مخالفین حق و صداقت) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح ایک پیغمبر کو شاہد بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ (اس سے پہلے) فرعون کی طرف ایک پیغمبر (موسیٰ) کو بھیج چکے ہیں۔ سو (دیکھ لو) فرعون نے (ہمارے) پیغمبر کی نافرمانی (اور مخالفت) کی چنانچہ (اس کا نتیجہ کیا رہا؟) نتیجہ یہ رہا کہ ہم نے اسے سخت گرفت کے ساتھ پکڑ لیا۔

یہی انجام ان کا ہونے والا ہے۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۝ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ۝ (۷۳/۱۷-۱۸)

(اے افراد نسل انسانی) اگر تم نے دعوتِ حق سے انکار کر دیا تو (ظاہر ہے کہ) اس دن (کی ہولناکیوں) سے کیسے بچ سکتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا۔ اور آسمان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پھٹ جائیگا (یعنی مکافات عمل کے دن سے) اور (یاد رکھو) خدا کا وعدہ ہمیشہ پورا ہو کر رہتا ہے۔

ان باتوں کی یاد ہم اس لئے دلاتے ہیں کہ جس کا جی چاہے اپنے خدا کی راہ پر ہولے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ (۷۳/۱۹)

بلاشبہ یہ (محض) ایک یاد دہانی ہے۔ (جبر و اکراہ نہیں) پھر جس کا جی چاہے وہ اپنے پروردگار کی طرف کی راہ اختیار کرلے (اور جس کا جی چاہے شیطان کیطرف کی!)

پھر اس شب بیداری کے انہماک و استغراق میں حضورؐ تنہا نہیں ہوتے تھے بلکہ قدسیوں کی وہ جماعت بھی ساتھ ہوتی تھی جسے اس عظیم الشان انقلاب کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ رات کی ان تنہائیوں میں، اس طائفہ مجاہدین پر حقائق و اسرار کائنات واشگاف کئے جاتے۔ شرف انسانیت کے رموز و بواطن کی تعلیم دیجاتی۔ انابت الی اللہ میں پختگی کے درس دیئے جاتے۔ اور اس طرح انھیں آنے والے نظام الٰہیہ کے قیام و بقاء کا اہل بنایا جاتا۔ اس لئے اس سورۃ کی آخری آیت میں فرمایا گیا۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ

عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲۰/۷۳)

(اے پیغمبر!) بلاشبہ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ مومن لوگوں کی ایک جماعت بھی راتوں کو دو تہائی رات تک اور کبھی آدھی رات تک اور کبھی کبھی ایک تہائی رات تک (نمازوں میں) کھڑے رہتے ہو۔ اور اللہ ہی دن اور رات کا اندازہ مقرر کرتا ہے (اس لئے اُسے خوب معلوم ہے کہ تم کتنی رات تک کھڑے رہے) مگر خدا یہ بھی جانتا ہے کہ تم سب (بنا برصحت) اس پر ہمیشہ کاربند نہ رہ سکوگے لہٰذا وہ (اپنی مہربانی سے) تم پر متوجہ ہوا (اور اس نے تمہارے لئے آسانی کر دی) لہٰذا حکم یہ ہے کہ (وقت کی کوئی قید اور پابندی نہیں) جتنا قرآن سہولت سے ہو سکے (رات کو نماز میں) پڑھ لیا کرو۔ اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ لوگ بیمار بھی ہو سکتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو (تجارت وغیرہ کی غرض سے) خدا کے فضل کی تلاش میں زمین پر سفر کریں گے۔ نیز کچھ دوسرے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو خدا (کے دین) کی راہ میں جہاد کریں گے (اور راتوں کو جہاد کی تیاری میں مشغول رہیں گے) لہٰذا (تمام قسم کے لوگوں کے لئے وقت کی کوئی تحدید ناممکن العمل بن سکتی ہے۔ اس لئے) جتنا کچھ سہولت سے ہو سکے قرآن پڑھ لیا کرو اور نماز (کے نظام) کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور (زکوٰۃ کے علاوہ بھی) اللہ[1] کو (ملت کے مفاد عامہ کے لئے) قرض حسنہ دو۔ اور جو کچھ تم اپنے نفسوں کے لئے آگے بھیجدو گے وہ تمہیں (آخرت میں) اللہ کے پاس ملجائیگا جو بدلہ دینے میں سب سے بہتر اور سب سے بڑا بدلہ دینے والا ہے۔ اور (اپنی کوتاہیوں سے) بخشش طلب کرتے رہا کرو۔ بلاشبہ اللہ بہت ہی بخشش کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے!

لیکن یہ تبتّل الی اللہ ایک راہب کے ترک علائق کا گوشۂ عزلت نہیں جہاں وہ اپنے خیالات کی دنیا میں مست انسان سے، سانس لینے والا پتھر بن جاتا ہے بلکہ یہ مجاہدین کی تربیت گاہ تھا جہاں وہ اپنی شمشیر خودی کو فسانِ توحید سے تیز سے تیز تر کرتے ہوئے باہر نکلتے تھے تاکہ کلمۃ الحق کی بلندی اور نظامِ خداوندی کے غلبہ و تسلّط کے لئے دنیا کی ہر طاغوتی قوت کے سر پر برقِ خاطف بنکر گریں اور اسے انسانیت کی راہ سے ہٹا کر کاروانِ حیات کو اس کی منزلِ مقصود تک رواں دواں لے چلیں۔

---

[1] قرآن میں ملت کے مفاد عامہ کے کاموں کو اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ اس ملت کا وجود اور قیام ہی مشیت خداوندی کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ چنانچہ یہاں بھی ملت کے مفاد مشترکہ کے لئے رقم دینے کو حسنہ کا قرض دینا کہا گیا ہے۔ تفصیل اپنے مقام پر ملے گی۔

آپ ایسا کیوں کرتے تھے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ یہ تمام صعوبات وتکالیف کیوں برداشت کر رہے تھے؟ وہ دن اور رات اسی ایک فکر میں غلطاں و پیچاں کیوں رہتے تھے؟ یہ تمام تگ و تاز کس لئے تھی؟ یہ سب جد و جہد کیوں تھی؟

اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے تھا! لیکن یہ جواب بجائے خویش ایک سوال ہے کہ اس مشن کی کامیابی میں آپکی غرض کیا تھی؟

آپکی غرض کیا تھی؟ یہ ہے وہ سوال جو تیرہ سو برس میں ہر اس شخص کے سامنے آیا جسے تاریخ عالم کے اس حصہ سے کچھ بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا جواب مختلف ذہنیتوں کی طرف سے مختلف ملا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی جذبۂ محرکہ ہوتا ہے۔ یہی جذبہ اس عمل کی غرض کہلاتا ہے۔ "من وتو" کے امتیازات میں گھرا ہوا انسان، کسی عمل کے لئے ذاتی غرض سے آگے کسی جذبۂ محرکہ کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ اسلئے ہر عمل کی بنیاد و اساس کے لئے اسکی نگاہ کسی ذاتی غرض کی تلاش میں نکلتی ہے۔ یورپ کے مؤرخین بھی جب تاریخ عالم کے اس انقلابی دور پر پہنچتے ہیں تو ان کی نگاہیں کسی "ذاتی غرض" کے تجسس میں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ اور جب وہ اپنی اس سعی و کاوش

یورپ کے متعصب مؤرخین

میں کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہنچتے (اس لئے کہ جس مفروضہ کی بنیاد پر وہ یہ عمارت قائم کرنا چاہتے ہیں وہ بنیاد ہی غلط ہوتی ہے) تو پھر اپنے ذہن سے اس قسم کے اغراض و مقاصد تراشتے ہیں جن پر علم ہنسے اور عقل ماتم کرے۔ ان کا متشدد طبقہ، جو ان وقائع و حوادث کا تجزیہ مؤرخانہ دیانت سے نہیں بلکہ متعصبانہ دنائت سے کرتا ہے۔ اس تمام سعی و کاوش اور جد و جہد کو ہوس رانی و کامجوئی کے پست مقاصد پر محمول کرتا ہے۔ چونکہ زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے دنیا کی ہر شئے اپنے اصلی مقام سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے اور رنگین چشمے کا تقاضا ہے کہ کوئی چیز اپنے حقیقی رنگ میں دکھائی نہ دے، اس لئے ان مورخین کی معاندانہ احول چشمی انھیں کبھی صحیح نتائج تک پہنچنے نہیں دیتی۔ علمی دیانت داری کے بازار میں یہ جنس کاسد اس قابل ہی نہیں کہ اسے درخور اعتناء سمجھا جائے۔

اس سے نیچے اتر کر مستشرقین مغرب کا ایک دوسرا طبقہ آتا ہے جو اس سوال کے حل کی تلاش دیانتدارانہ کرنا چاہتا ہے لیکن چونکہ وہ بھی مقام رسالت سے آشنا نہیں ہوتا اس لئے وہ نبی اکرمؐ کو ایک قومی ریفارمر کی حیثیت دیتا ہے۔

غیر متعصب مستشرقین

اس سے آگے اس کی نگاہ بھی نہیں جاسکتی۔ ان کی تنقیب و تفحیص کا ماحصل یہ ہے کہ عربوں کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر آپ نے ان کی ان منتشر قوتوں کو جو باہمی خانہ جنگی میں ایک دوسرے کی گردن زنی میں صرف ہو جاتی تھیں، ایک نقطہ پر مرکوز کیا اور اس طرح بیرونی قوتوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر کے ان صحرانشینوں کو وارثِ تخت و تاج بنا دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی ان معاشرتی برائیوں کی بھی اصلاح کر دی جنکی وجہ سے ان کی قوت رائیگاں جا رہی تھی۔

دوسری طرف ہمارا مذہب پرست طبقہ ہے۔ وہ بھی حقیقت کو بالعموم جس انداز سے پیش کرتا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ حقیقت کما حقہٗ سامنے نہیں آتی بلکہ ان کے بیان سے جو تصویر ذہن میں مرتسم ہوتی ہے اس سے رسول کا صحیح مقام

مذہب پرست طبقہ

نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ آپ مامور من اللہ تھے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتا تھا آپ اس کی تعمیل کرتے تھے اس لئے آپ کے تمام اعمال بے غرض اور بے لوث تھے۔ حقیقت تو یہی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا جو مفہوم بالعموم سامنے لایا جاتا ہے، وہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی "اپنے" مقصد کے لئے آپ کو منتخب کیا اور اس مقصد کے حصول کے لئے مسلسل و متواتر احکامات و ہدایات دیتا رہا۔ آپ ان احکامات کی بلا چون و چرا تعمیل کرتے رہے اور اس تعمیل احکام میں جس قدر تکالیف سامنے آتی رہیں انھیں برداشت کرتے رہے اس لئے کہ ایک رسول کے لئے خدا کے احکام کی اطاعت ضروری ہے اس سے اُسے مفر نہیں۔

غور کیجئے کہ اس تصور سے کس قسم کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے؟ ایسا ہی گویا ایک بادشاہ اپنی کسی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے، اپنے قصر معلیٰ میں بیٹھا، اپنے غلاموں اور ملازموں کو مختلف حکم دے رہا ہے اور وہ سب ان احکامات کی تعمیل میں کمربستہ سرگرم عمل ہیں۔ اس تعمیل احکام اور اطاعت ارشاد میں ان کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہیں۔ چونکہ یہ اس بادشاہ کے غلام اور فرمانبردار ملازم ہیں اس لئے انھیں ان احکامات و صادرات کی تعمیل کرنی ہی ہے۔ احکام کی اطاعت ان کا فریضہ ہے۔ یعنی یہ ایک مشین کے پرزے ہیں جو انجینئر کے اشاروں کے ماتحت صبح سے شام تک سرگرداں رہتے ہیں۔ اس سے انھیں غرض نہیں کہ ان کی اس حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا ماحصل کیا ہے؟ مذہب کی اصطلاح میں اس کا نام رکھا جاتا ہے للہیت! للہیت کے اسی مفہوم کا اثر ہے کہ آپ مذہب پرست طبقہ کے عوام ہی نہیں بلکہ خواص تک سے پوچھئے کہ وہ مذہبی احکام کی تعمیل کیوں کر رہے ہیں تو ان کے پاس اس کا جواب بالعموم اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا کہ یہ اللہ کا حکم ہے جس کی اطاعت فرض ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے تمام اعمال میکانکی (Mechanical) حرکات بنکر رہجاتے ہیں اور داخلی یا خارجی کسی دنیا میں بھی کوئی زندگی بخش نتیجہ مرتب نہیں کرتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ خدا اور رسول کا صحیح قرآنی تصور ہمارے سامنے ہو۔ پھر معلوم ہوگا کہ احکامات خداوندی سے مفہوم کیا ہے۔ رسول ان کی کس طرح اطاعت کرتا ہے۔ مامور من اللہ کسے کہتے ہیں اس کا نصب العین حیات کیا ہوتا ہے۔ اور وہ اس نصب العین کے حصول میں کیوں اپنی جان تک جوکھوں میں ڈالدیتا ہے۔ یہیں سے اس سوال کا صحیح جواب مل سکیگا جس سے اس عنوان کی ابتداء ہوئی ہے۔

اصل حقیقت

جلد دوم میں وحی کے عنوان پر غور کیجئے جہاں یہ حقیقت بالوضاحت پیش کی جاچکی ہے کہ جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی یہ معمہ اس کے لئے وجہ غور و فکر رہا کہ خیر (Good) کیا ہے؟

حق (Truth) کسے کہتے ہیں؟ حقیقت (Reality) کا ادراک کیسے ممکن ہے؟ خیر۔ حق۔ یا حقیقت الفاظ مختلف ہیں بمقصود ان سب سے ایک ہی ہے۔ یہی وہ سوال ہے جس کے حل کی تلاش میں فلسفہ اپنی درسگاہوں میں محو تفکر، باطنیت، کنج تنہائی میں سر بزانو، تاریخ، زمانہ کی ریت پر کاروانِ حیات کے نقوش قدم کے مطالعہ میں جذب، طبیعیات، اپنے معمل میں مادیات کے تجزیہ و تحلیل میں منہمک، فلکیات، رصدگاہوں میں مصروف اختر شماری رہا ہے، لیکن انسان اپنی ان کوششوں سے آج تک زیادہ سے زیادہ اضافی حق (Relative Truth) معلوم کر سکا ہے مطلق حق (Absolute Truth) کا احاطہ نہیں کر سکا۔

رسول، خیر اور مطلق حق کو پالیتا ہے، اسے حقیقت کلی کا ادراک ہو جاتا ہے۔ اور یہ سرِ نہاں اس پر منکشف ہو جاتا ہے کہ الحق (The Truth) وہی ہے جسے ذاتِ خداوندی کہتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۲۲)

نیز اس لئے بھی کہ حق اللہ ہی کی ہستی ہے، اور جن ہستیوں کو اس کے سوا پکارتے ہیں باطل ہیں اور پھر اس لئے بھی کہ اللہ ہی کی ہستی بلند مرتبہ ہے، بڑائی والی!

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس پر بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق حق پر ہوئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ (۶)

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اور (اس کی قدرت کا یہ حال ہے کہ) جس آن وہ کہدے "ہو جا" تو (جیسا کچھ اس نے چاہا) ویسا ہی ہو جائے!

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود فطرت انسانی اسی الحق (حق مطلق) کی فطرت کے قالب میں ڈھالی گئی ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۰)

لہذا (اے پیغمبر!) تمام نظامہائے زندگی سے منہ موڑ کر اس نظام الٰہی کے لئے اپنے کو وقف کر دو (وہ نظام الٰہی کیا ہے؟) اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے نوعِ انسانی کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ یہی صحیح نظامِ زندگی ہے۔ مگر (افسوس کہ) اکثر لوگ اسے جانتے نہیں!

لہذا جب رسول، حق مطلق اور حقیقت کلی کو پالیتا ہے تو وہ اپنی ذات (یعنی فطرت انسانی) کی حقیقت کو بھی پالیتا ہے۔ گویا خدا کی تلاش میں اُسے اپنا آپ ہاتھ آجاتا ہے۔ (Dickenson) اپنی مشہور کتاب (The Meaning of Good) میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اندر نامکمل سی آنکھ کی طرح ایک حس ہے جس کی فطرت یہ ہے کہ وہ خیر مطلق سے ستیز ہو جس طرح ہماری جسمانی آنکھ خارجی روشنی سے ستیز ہوتی ہے لیکن روح کی یہ آنکھ چونکہ نامکمل سی بنی ہوئی ہے اس لئے وہ خیر مطلق کا ادراک واضح اور غیر مبہم طور پر نہیں کرسکتی بلکہ اس کا ادراک دھندلی سی نامکمل صورت میں ہوتا ہے۔ وہ کبھی اس کے ایک پہلو کو دیکھتی ہے کبھی دوسرے کو لیکن اس نامکمل مشاہدہ سے اسے اطمینان نہیں ہوتا اور اس کا جذبۂ محرکہ اسے خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے۔ اس تجسس اور سرگردانی میں یہ احساس ہر وقت اس کے دل میں تپش افروز رہتا ہے کہ وہ اپنے مقصود کی تلاش میں خود اپنی فطرت کو تلاش کر رہی ہے اور وہ مکملیت کی حالت تک کبھی نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ اس خیر مطلق کو بے حجاب اپنے سامنے نہیں دیکھ لیتی...... اسی طرح خود آگہی کا جذبہ اسے کشاں کشاں لئے پھرتا ہے اس لئے کہ نامکملیت میں اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ اسی تلاش میں اپنے لئے نئی نئی دنیاؤں کی تخلیق کرتی ہے تاکہ وہ انسان اور کائنات اور افراد انسانی کا باہمدگر صحیح ربط اور تعلق معلوم کرسکے۔ وہ ایک دنیا کی تخلیق کرتی ہے اور اسے نامکمل پاکر منہدم کر دیتی ہے تاکہ اس کی خاکستر سے ایک اور دنیا پیدا کرے۔ تعمیر و تخریب کے اسی غیر منقطع سلسلہ سے وہ مضطرب و بیقرار آگے بڑھتی جاتی ہے تاکہ وہ تصورات کی حدود سے ماورا اس مقام تک پہنچ جائے جہاں اس کی فطرت بیقرار کو تسکین مل جائے۔ اس مقام پر جہاں وہ خیر مطلق کو پالیتی ہے اسے اطمینان کلی نصیب ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہاں پہنچکر وہ نہ صرف اس مقصود کو پالیتی ہے جس کی تلاش میں وہ یوں سرگرداں پھر رہی تھی بلکہ وہ خود اپنی ذات کو بھی پالیتی ہے۔

(PP. 80—81)

آگے چلکر یہ فاضل مصنف لکھتا ہے کہ اطمینان کلی کا آخری مقام تصور میں تو آسکتا ہے لیکن اس کا حصول ناممکن سا نظر آتا ہے۔ اے کاش! اس کے سامنے قرآن ہوتا تو یہ دیکھ لیتا کہ وہ نفس انسانی کو ارتقائی منازل طے کرا کر اس مقام تک لیجانے کی کیا راہیں بتاتا ہے جہاں پہنچکر اس سے کہدیا جائے گا کہ

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ○ وَادْخُلِي جَنَّتِي ○ (۸۹/۲۷-۳۰)

اے مطمئن روح! تو اپنے پروردگار کیطرف خوش بخوش ہوکر پسندیدگی کے ساتھ لوٹ، پھر میرے (خاص) بندوں میں داخل ہوکر میرے (نعیم ابدی کے) باغات میں داخل ہو جا!

رسول اس مقام پر پہنچ چکا ہوتا ہے جہاں وہ حق مطلق کے مشاہدہ سے خود اپنی ذات کا ادراک کر لیتا ہے۔

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ

(۱) خدا حق ہے۔

(۲) کائنات کی بنیاد حق پر ہے۔ اور

(۳) انسانی فطرت کی اساس فطرت اللہ یعنی حق پر ہے۔

ہم ان تینوں میں کوئی ربط و تعلق نہیں دیکھتے۔ ہمارے ناقص تصور میں خدا عرش کی بلندیوں پر کہیں الگ تھلگ بیٹھا ہے

خدا، کائنات اور انسان

کائنات، اس فضا کی پہنائیوں میں الگ معلق کھڑی ہے۔ اور انسان اس صفحۂ ارض پر الگ، مارا مارا پھر رہا ہے کہ فکر معاش میں سر کھپاتے کھپاتے مرجائے۔ لیکن رسول جو حق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے وہ اس ربط و تعلق کو ایک زندہ حقیقت کی شکل میں اپنے سامنے موجود پاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہی حق جو خونِ رگ کائنات میں حرارت بنکر جاری و ساری ہے خود فطرت انسانی کے اعماق قلب میں برقِ تپاں کی طرح تپش انگیز، اور لہٰذا اس کی رگِ حیات سے بھی زیادہ قریب ہے (نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ) اس مشاہدۂ حق کے بعد جو کچھ اس کی زبان پر آتا ہے وہ اس کے قلبی رجحانات اور ذہنی میلانات کا نتیجہ نہیں ہوتا (مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى) بلکہ عین حق ہوتا ہے (اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى) یعنی وہی حق جو پہلے مستور تھا اب الفاظ و حروف کے پیکر (قرآن) میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۳:۱)

الف۔ لام۔ میم۔ را۔ یہ الکتاب کی آیتیں ہیں۔ اور (اے پیغمبر!) جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ الحق ہے لیکن (افسوس کہ) اکثر لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے!

لہٰذا قرآن خود حق ہے، اور اس لئے انسانی فطرت کی آواز اور ضمیر کائنات کا ترجمان۔ کہ ان دونوں کی اساس حق پر ہے۔ بنا بریں، رسول کے لئے قرآنی احکام (یا احکامات خداوندی) خارج سے عائد شدہ (Super imposed) نہیں ہوتے بلکہ خود اپنی فطرت کی گہرائیوں سے ابھرے ہوئے ولولے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی تعمیل میں وہ اپنی فطرت صحیح کے تقاضوں کی تسکین پاتا ہے

احکام خداوندی کا مفہوم

انسان کے جذباتی رجحانات اسے فطرت کی اس آواز کے خلاف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن رسول ان رجحانات کو اس حق کی آواز کے تابع رکھتا ہے۔ اسی کا نام عبودیت یا مسلمیت ہے۔ یہ کیفیت اس کی ذات میں تکمیل تک پہنچی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ عبد کامل اور مسلم اول ہوتا ہے۔ یہ احکام چونکہ خود فطرت انسانی کے تقاضے ہیں اس لئے ان کی اطاعت میں کوئی تنگی اور گرانی نہیں ہوتی (تفصیل جلد دوم عنوان وحی میں گزر چکی ہے)۔

وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِی الدِّيْنِ

مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (۲۲/۷۸)

اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو۔ اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے، پوری طرح ادا کرو، اس نے تمہیں برگزیدگی کے لئے چن لیا۔ تمہارے لئے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔ وہی طریقہ تمہارا ہوا جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا۔ پچھلے وقتوں میں بھی اور اس (قرآن) میں بھی۔ اور یہ اس لئے کیا، تاکہ رسول تمہارے لئے (حق کا) گواہ ہو (یعنی معلم ہو) اور تم تمام انسانوں کے لئے۔ پس نماز کا نظام قائم کرو، زکوٰۃ کی ادائیگی کا سامان کرو۔ اللہ کا سہارا مضبوط پکڑ لو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا کارساز ہے اور کیا ہی اچھا مددگار!

یہی وہ کیفیت ہے جس کے متعلق (Principal Caird) لکھتا ہے کہ

صداقت مطلق کی زندگی کوئی اجنبی زندگی نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہم سے کہیں باہر ہوتی ہے تو خود ہمارے اندر بھی وہی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے جھک جانے سے ہم کسی خارجی مستبد قانون یا کسی بیرونی قوت کی حکومیت اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک ایسے قانون کی اطاعت کرتے ہیں جو خود ہماری فطرت کا قانون ہوتا ہے۔ یعنی یہ اطاعت ایک ایسے حکمران کی اطاعت ہوتی ہے جس کا تخت حکومت خود ہمارا عمق قلب ہوتا ہے۔

Introduction to the
Philosophy of Religion;
P. 237

اب آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جو رسولؐ کو ایسے بے پناہ عمل پر ابھارتا ہے اور وہ کونسی "غرض" ہے جس کے لئے وہ ایسی ایسی جانکاہ اور جگر گداز مصیبتیں جھیلتا اور تکلیفیں برداشت کرتا ہے اور اس کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑتا۔

سلسلۂ کائنات بے مقصد نہیں

ادراکِ حقیقت سے دوسری چیز رسولؐ کے سامنے یہ آتی ہے کہ یہ ناپیدا کنار اور حدود فراموش سلسلۂ کائنات یونہی بلا مقصد نہیں پیدا کیا گیا۔ اس کی ایک عظیم الشان غرض و غایت ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (۴۴/۳۸)

اور دیکھو، ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان تمام چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان ہیں محض (یوں ہی) کھیل کود کے طور پر پیدا نہیں کیا۔

[حقیقت یہ ہے کہ یہ شق دراصل شق اول ہی کی ایک فرع ہے۔ یعنی جب کائنات کی اساس و بنیاد حق پر ہے تو اس کی تخلیق باطل (غیر حق) ہو ہی نہیں سکتی] اور اس کے بعد یہ کہ خود انسان کی تخلیق بھی بلا مقصد نہیں۔ سورۂ مومنون میں اس حقیقت کبریٰ کو نہایت بصیرت افروز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ (۲۳/۱۱۵)

کیا تم خیال کرتے ہو، ہم نے تمہیں بیکار کو پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟

تخلیق انسانی بلا مقصد نہیں

اس سے اگلی آیت میں اس کی علت بیان کر دی کہ وہ ذات حق مطلق ہے اور چونکہ انسانی فطرت خود اسی حق کی فطرت پر متفرع ہے، اس لئے ہو نہیں سکتا کہ انسان کی تخلیق باطل (اور بلا مقصد) ہو۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ○ (۲۳/۱۱۶)

اللہ کہ ملک الحق ہے، ایسی بات کرنے سے پاک و بلند ہے۔ وہ، کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اُسی کی ایک ذات، جہانداری کے تخت عزت کا مالک!

لہٰذا عالم انفس و آفاق، دونوں عظیم الشان مقصد لئے ہوئے ہیں۔ عالم آفاق کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہ جائے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۴۵/۲۲)

اور (دیکھو) خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اسلئے پیدا کیا ہے تاکہ ہر نفس جو کچھ عمل کرتا ہے اسے اس کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو۔

اور انسان کا مقصد؟ اس کے لئے سورۂ مومنون کی مندرجہ صدر آیت

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ (۲۳/۱۱۵)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار کو پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹنے والے نہیں؟

پر ایک مرتبہ اور غور کیجئے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا؟ یہ اس سوال کا سلبی پہلو ہے۔ اس کا ایجابی پہلو اگلے ٹکڑے میں ہے کہ (اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ) تو گویا مقصد تخلیق انسان ہے رَجْعَتْ اِلَی اللّٰهِ (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) رَجْعَتْ اِلَی اللّٰهِ سے مفہوم یہ ہوا کہ اس حق مطلق (Absolute Truth) سے تطابق و توافق پیدا کیا جائے۔ یعنی جس فطرت اللہ پر انسان کی فطرت متفرع ہے اس سے ہم آہنگی پیدا ہو۔ پس فطرت انسانی کا فطرت اللہ پر متفرع ہونا۔ یہ ہے مبداء اور اس کا اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لینا۔ یہ ہے معاد۔ مبداء اور معاد

کے نقاط کو ملانے والا خط ہے صراطِ مستقیم جس پر ساری کائنات چل رہی ہے اس لئے کہ خود خدا (حق مطلق) صراطِ مستقیم پر ہے۔ (اِنَّ رَبِّی عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۱۱/۵۶)

"صراطِ مستقیم" سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ کائنات کی حرکت دَوری (Cyclic) نہیں بلکہ ایک خطِ مستقیم کی ہے جس میں ہر نیا قدم پچھلے قدم سے آگے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کائنات اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی جارہی ہے۔ ان ارتقائی منازل میں انسان اس شجرِ نمود کا گلِ سرسبد ہے اسلئے اب انسان کو بھی ارتقائی منازل طے کرتے، اس خطِ مستقیم پر اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتے جانا چاہئے۔ اس کا مسلسل بڑھتے جانا ہی اس کی دلیلِ حیات ہے (اسی کو جہاد کہتے ہیں۔ مسلسل جدوجہد) جہاں یہ رُک گیا اس پر موت طاری ہوگئی۔ چونکہ اس صراطِ مستقیم کی جادہ پیمائی میں خدا (حق مطلق) اس سے آگے آگے ہے اس لئے اس کا مطمحِ نگاہ اسی کے "نقوشِ قدم" (شیئون الٰہیہ) ہونے چاہئیں۔ اسی کا نام ارتقاءِ مدارجِ انسانیت ہے۔ ارتقاء (بلندی) اس لئے کہ اس کا رب "ذی المعارج" (سیڑھیوں والا) ہے۔ اور سیڑھی ہمیشہ اوپر کو لے جاتی ہے۔ اسی سیڑھی کا آخری زینہ معراج ہے جہاں شرفِ انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

اب سلسلۂ کائنات پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا ایک ایک ذرہ اپنی نمود اور ارتقاء کے لئے ایک خاص قانون (صراطِ مستقیم) کے تابع تگ و تاز اور مصروفِ جدوجہد ہے لیکن کائنات کی کسی شے میں بالیدگی اور ارتقاء پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اور بہت سے عناصر اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام نظامِ کائنات، مختلف اجزاء کے باہمی تعاون و تناصر سے مربوط ہے۔ غور کیجئے کہ ایک دانۂ گندم کو مٹی میں ملکر خوشۂ گندم بننے تک کتنے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اور ہر مرحلہ میں کتنے مختلف عناصر ہیں جو اسکے نشو و نما میں معاونت کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوگا گویا مٹی۔ پانی۔ ہوا۔ روشنی۔ حرارت یعنی زمین کے اس تودۂ خاک سے لیکر سورج کے عظیم المرتبت کرۂ آتش فشاں تک، ہر ایک اس ذرۂ ناچیز کی پرورش اور حفاظت کی فکر میں سرگرداں ہے۔ اس سے واضح ہے کہ کائنات کو اس صراطِ مستقیم پر چلنے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے نظام کی ضرورت ہے یہی کیفیت عالمِ انسانیت کی ہے۔ انسانوں کو بھی اس صراطِ مستقیم پر چلنے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے (یعنی رجعت الی اللہ) کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہے چونکہ رسول اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے اور انسانیت کو صراطِ مستقیم پر چلا کر اس کی منزل تک لیجانا خود اس کی فطرت کا تقاضا ہوتا ہے، اس لئے وہ ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں فطرتِ انسانی اپنے حقیقی تقاضوں کی تسکین پالے اور اس طرح عالم انفس و آفاق کے ہمہ گیر توافق و تطابق سے کاروانِ حیات اپنے

نظامِ حکومتِ الٰہیہ

منتہیٰ (معاد) کی طرف جادہ پیما ہو۔ اس نظام کا نام ہے "نظامِ حکومتِ الٰہیہ"۔ وہ نظام جس میں کوئی کسی کا غلام اور محکوم نہیں ہوتا اور انسانی فطرت کا شہباز،

ممکنات زندگی کی بسیط فضاؤں میں آزادانہ بال کشا ہوتا ہے۔ یہی وہ صحیح حریت اور اصلی آزادی ہے جو توحید کا قرآنی تصور انسان کو عطا کرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

> اسلام بحیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریق ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے۔ اور چونکہ ذات باری تعالیٰ تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے اس لئے اس کی اطاعت کینی کا درحقیقت مطلب یہ ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔
>
> (تشکیل جدید صـ۱۲۰)

رسول کے سامنے اسی نظام کا قیام ہوتا ہے۔ غیر حق (باطل) کی قوتیں اس نظام کے قیام و بقاء میں حائل ہوتی ہیں جو حق و باطل میں تزاحم و تصادم کا موجب بنتا ہے۔ رسول ان تمام رکاوٹوں کو انسانیت کی راہ سے ہٹاتا ہے۔ اس جدوجہد کا نام جہاد ہے اور اس کا نتیجہ غلبۂ حق یا اعلائے کلمۃ الحق۔ یعنی اس نظام کا قیام جس میں فطرت انسانی الحق سے یکرنگی پیدا کر سکے (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً)

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جب نبی اکرمؐ ان لوگوں سے کہتے تھے کہ

لَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۶/۹۰)

میں جس نظام پر تمہیں چلانا چاہتا ہوں اس کے معاوضہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا!

رسول اجر رسالت نہیں مانگتا

تو اس سے مفہوم کیا تھا اور یہ تمام جدوجہد اور سعی و کاوش کس طرح یکسر بے غرض اور بے لوث تھی۔ اس تمام تگ و تاز سے مقصود یہ تھا کہ انسانیت کسی طرح اپنی فطرت صحیحہ کی راہ پر لگ جائے تاکہ زندگی اپنے مقصود کو پالے۔ اسی لئے فرمایا کہ

قُلْ مَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۵/۵۷)

(اے پیغمبر!) تم کہدو کہ میں اس کے سوا کہ جو شخص چاہے اپنے پروردگار کیطرف کا راستہ اختیار کرے تم سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا!

سورۂ سبا میں اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؀ (۳۴/۴۷)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو کہ جو کچھ میں نے تم سے معاوضہ مانگا ہے (یعنی اپنے پروردگار کیطرف راستہ بنا لینا) وہ (کچھ میرے لئے مفید نہیں، بلکہ) خود تمہارے واسطے فائدہ مند ہے، (ویسے) میرا معاوضہ تو

سوائے خدا کے کسی کے ذمہ بھی نہیں ہے۔ اور وہی ہر چیز پر گواہ ہے!

یعنی جو کچھ میں تم سے چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ تم ایک نظام کی اطاعت کرو۔ اور اس نظام کا ماحصل بھی تمہارے ہی لئے ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق غالب آجائیگا اور باطل کو شکست ہوگی۔ تو یہ فتح خود تمہاری ذات کی فتح ہوگی۔ اور حق کا غالب آجانا میری محنتوں کا معاوضہ ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ ۝ (۳۴/۴۸-۴۹)

(اے پیغمبر!) تم کہدو کہ میرا پروردگار صرف حق بات کہتا ہے (کیونکہ) وہ اُن دیکھی باتوں تک کو جاننے والا ہے۔ (اے پیغمبر!) کہدو کہ حق آگیا، اور باطل (اب) سر نہیں نکال سکے گا اور نہ ہی دوبارہ لوٹ سکیگا!

اسی حقیقت کو دوسرے انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝ (۵۲/۴۰ نیز ۶۸/۴۶)

یا (اے پیغمبر!) یہ بات ہے کہ تم ان سے (دعوتِ حق کا) کوئی معاوضہ مانگ رہے ہو جس کے تاوان کے بوجھ سے وہ دبے جا رہے ہیں؟

آپ کے لئے تو ایسا اجر ہے جو کبھی منقطع ہی نہیں ہوگا۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ (۶۸/۳)

اور (اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ (خدا کے نزدیک) ضرور تمہیں ایسا اجر ملیگا جس میں کبھی کوئی کتر بیونت نہیں ہوگی!

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ ۝ (۲۰/۴۱)

میں نے تمہیں اپنے لئے تیار کیا ہے!

تو اس "اپنے لئے" سے کیا مفہوم تھا۔ اور اسی طرح جب نبی اکرم سے کہا گیا کہ

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ (۷۴/۷)

اس جانگسل مہم میں اپنے رب کے لئے استقامت پذیر رہو!

تو اس سے کیا مراد تھی؟ یعنی جب قرآن لِلّٰهِ، "اللہ کے لئے" یا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ "اللہ کی راہ میں" کہتا ہے تو اس کا صحیح مفہوم کیا ہوتا ہے۔

---

(۱) جلد سوم۔ باب۔ بنی اسرائیل ص ۲۰۶

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی اکرمؐ کا اپنے مخالفین کے ساتھ تعلق کس نوعیت کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ مخالفین آپ کے کھلے دشمن تھے اس لئے آپ سے ان کا تعلق عناد اور عداوت، انتقام اور مخالفت کا تھا۔ لیکن اس کے

رسول کا مخالفین سے تعلق

برعکس آپ کا ان سے ایسا ہی تعلق تھا جیسا کسی طبیب مشفق کا مریض سے ہو آپ دیکھتے تھے کہ ان کی فطرت مسخ اور ان کی انسانیت مجروح ہو چکی ہے۔

اس لئے آپ چاہتے تھے کہ ان کا علاج ہو جائے لیکن ان کی ضد، دوا کو زہر بنا کر دکھاتی تھی اس لئے وہ اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ یہ طبیب مشفق جانتا تھا کہ ان کا مرض انھیں کس طرح ہلاکت اور تباہی کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے اس لئے ان کی اس ضد پر آپکا دل کڑھتا تھا اور ان کے مآل کا غم آپ کو بے چین کئے دیتا تھا اور یہ شدت احساس اس حد تک تھا کہ سورۂ شعراء میں ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (۲۶/۳)

(اے پیغمبر!) شاید تم اس رنج و غم میں اپنی جان ہی کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں میں سے کیوں نہیں ہو جاتے!

دوسری جگہ ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ۝ (۱۸/۶)

(اے پیغمبر!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ یہ (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان (کی ہدایت) کے پیچھے مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے (حالانکہ یہ لوگ ماننے والے نہیں)

ان کا غم آپ کی جان کو گھلائے جا رہا تھا۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝ (۳۵/۸)

(اے پیغمبر!) دیکھو ان لوگوں پر حسرتوں کے مارے تمہاری جان ہی نہ چلی جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اسے خدا (اچھی طرح) جاننے والا ہے!

کہا جا سکتا ہے کہ اگر مخالفین سے آپؐ کے تعلقات منتقمانہ نہیں بلکہ مشفقانہ تھے تو پھر ان سے وہ سلسلۂ جنگ و قتال کیوں جو بعد میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ لڑائیاں کیوں واقع ہوئیں اور ان کی حقیقت کیا تھی؟ اس کی تفصیل آئندہ عنوان میں ملے گی۔ اس وقت صرف اتنے اشارے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ یہ جنگ بھی منتقمانہ

پھر وہ سلسلۂ جنگ و قتال کیوں؟

قتل و غارتگری نہیں تھی بلکہ ایک طبیب کی مشفقانہ قطع و برید تھی جو اس علاج میں ناگزیر ہو گئی تھی۔ اگر آپ کی کسی انگلی پر ناسور ہے

تو ڈاکٹر کوشش کریگا کہ وہ مرہم سے اچھا ہو جائے۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ زخم لاعلاج ہو چکا ہے اور اس کا زہر بڑھتا چلا جا رہا ہے تو باقی جسم کی حفاظت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس لاعلاج حصہ کو کاٹ کر پھینک دیا جائے انسانی افراد، جسدِ انسانیت کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں۔ اگر بعض افراد کی فطرت مریض ہو جاتی ہے تو رسول انتہائی کوشش کرتا ہے کہ ناصحانہ حکمت و موعظت اور مشفقانہ انداز و تبشیر سے اس کا علاج ہو جائے۔ لیکن اگر مریض کی ضد اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اُسے دوائی پینے سے انکار ہے اور بد پرہیزی پر اصرار، تو بعض اوقات یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ باقی جسدِ انسانیت کی صحت و صالحیت کے لئے اس لاعلاج اور زہر فشاں حصہ کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں نظامِ حق و عدل کے قیام کے لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ سو اگر اس انگلی کا کاٹ کر پھینکدینا جس کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے ڈاکٹر کی مشفقانہ حکمت ہے نہ کہ منتقمانہ جلادیت تو ایسے مواقع پر ایک رسُول کا عملِ جراحی، کبھی معاندانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے وہ ان افراد کی اصلاح کی کوشش میں اپنے دل کو پگھلاتا اور اپنی روح کو انڈھیلتا ہے۔ ان کی ہلاکت اور تباہی کا تصور اس کے قلبِ حساس میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ان کی صحت کے لئے دوائیں کرتا اور دعائیں مانگتا ہے۔ ان کے مرض کی شدت اور اس کے انجام کے خیال سے اس کا جگر گداز ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی ہٹ دھرمی اور علاج سے انکار سے اُسے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ان لوگوں کے انکار وجحود اور ضد اور ہٹ دھرمی سے رنجیدہ خاطر ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ان کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے ان کی فطرت اس حد تک مردہ ہو چکی ہے کہ اس میں زندگی پیدا ہی نہیں کیجا سکتی۔ اس لئے ان کے انجام و عواقب پر دلگیر نہیں ہونا چاہئے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ○ (۲۷/۷۰) (نیز ۱۵/۸۸؛ ۱۰/۶۵؛ ۳۱/۲۳؛ ۳۶/۷۶)

اور (اے پیغمبر!) ان کے اوپر غم کھاؤ اور جو کچھ یہ لوگ خفیہ تدبیریں کرتے ہیں ان کی وجہ سے دل میں تنگی محسوس نہ کرو!

تمہارا کام یہ ہے کہ اس پیغامِ حیات آور کو عام کرتے جاؤ۔ جن قلوب میں زندگی قبول کرنے کی ذرا سی بھی استعداد موجود ہے وہ زود یا بدیر اس پر توجہ دیں گے اور اپنے علاج پر مائل ہو جائیں گے لیکن وہ جن کے دل بالکل مردہ ہو چکے ہیں، اس طرف کا رُخ کبھی نہیں کریں گے۔ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے لئے ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔ ان کے دق کا مرض چوتھے درجہ میں پہنچ چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی دماغ ایسا مفلوج ہو چکا ہے کہ یہ عیب کو ہنر، دوست کو دشمن اور تریاق کو زہر سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے ان کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی حالت پر آنسو بہانا بیکار ہے اور تدابیر سوچنا لاحاصل۔ علاج زندوں کا ہو سکتا ہے، مُردوں کا

اصلاح زندوں کی ہو سکتی ہے

نہیں۔ مُردوں میں زندگی پیدا کرنا آپ کے امکان میں نہیں اس لئے آپ کے دائرۂ فرائض سے باہر ہے تو ان پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا کہ مار مار کر انھیں علاج پر آمادہ کرے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ط إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلٰغُ ط وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ج وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنْسَانَ كَفُورٌ ٥ (42/48)

لہذا (اے پیغمبر!) اگر وہ گردن پھیر کر چلدیں (تو جانے دو) ہم نے تمہیں کوئی محافظ بنا کر نہیں بھیجا (کہ زبردستی بھی اُنہیں راہِ حق پر لے آؤ) تمہارے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم (پیغامِ حق کو) اُن تک پہنچا دو! (اور بس) اور (یہ تو انسان کی ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ) جب ہم اُسے اپنی طرف سے رحمت و عنایت (کا مزہ) چکھاتے ہیں تو وہ پھولا نہیں سماتا اور جب خود اس کے اعمال کی وجہ سے اسے کوئی بُرائی پہنچتی ہے تو یہ بڑا ہی ناشکرا بن جاتا ہے۔

آپ انھیں ان کی روش زندگی کے انجام و عواقب سے آگاہ کرتے جائیے۔ یہی آپ کا فریضہ ہے۔

فَذَكِّرْ قف إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ٥ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ٥ (88/21-22)

چنانچہ (اے پیغمبر!) تم یاددہانی کرتے رہو۔ کیونکہ تم یاددہانی کرنے والے ہی ہو۔ کچھ تمہیں لوگوں پر نگراں مقرر نہیں کیا گیا ہے!

لیکن یہ تنذیر اُسے ہی فائدہ دے سکتی ہے جو ان نتائج و عواقب سے ڈرے۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ قف فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيدِ ٥ (50/45)

(اے پیغمبر!) جو کچھ وہ لوگ باتیں بناتے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں۔ تم کو ان پر زبردستی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم اس قرآن کے ساتھ ان لوگوں کو (پیغامِ حق) کی یاددہانی کراتے رہو جو ہماری دھمکی سے ڈرتے ہیں!

آپ کا کام ان تک دوائی پہنچا دینا ہے تاکہ کوئی جان فقدانِ علاج و عدمِ تدبیر کی وجہ سے ضائع نہ ہو جائے۔

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ق لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيعٌ ج وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ط أُولٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ج لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَّعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ٥ (6/70)

اور (اے پیغمبر!) جن لوگوں نے نظامِ زندگی کو کھیل تماشا بنا لیا ہے اور دنیا کی زندگی نے اُنھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، تو ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اور کلام الٰہی کے ذریعہ پند و وعظ کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے (کیونکہ اگر چھوڑ دیا گیا، تو) اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اس کا مددگار ہو گا۔ یا اس کی شفاعت کر کے اُسے بچا لیگا۔ اگر وہ (بدعملیوں کے بدلے میں، جس قدر بدلے بھی ہو سکتے ہیں) دیدے تو بھی اس سے نہ لیا جائے (کہ بدعملی کے نتیجہ سے کوئی فدیہ اور معاوضہ نہیں بچا سکتا)، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بدعملیوں کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیئے گئے، ان کے لئے کھولتا ہوا پانی پینے کو ہوگا اور انکارِ حق کی جزاء میں عذاب دردناک!

یہ تھا رسول اکرمؐ کا مشن اور یہ تھی اس مشن کی غرض و غایت۔ وہ غرض و غایت جسے قرآن نے ایک جامع آیت میں ایسے درخشندہ الفاظ میں بیان فرما دیا جس سے کسی کو شک و شبہ نہ رہے کہ دنیا میں قرآنی ملت کی زندگی کا منتہیٰ اور اس کی تگ و تاز کی غرض و غایت کیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۱۶۲-۱۶۳/۶)

کہدو، میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا۔ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے، مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے، اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار ہوں!

اس لِلّٰهِ سے مراد کیا ہے اس کے لئے اس حصہ کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آیئے جو گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے۔

استدراک

عنوان زیر نظر میں دو تین باتیں ایسی آئی ہیں جو ذرا توضیح طلب ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ مخالفین حضورؐ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپ ایک شاعر ہیں اس لئے آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ

(۱) شاعری کیا ہے؟

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۶۹/۳۶)

اور (دیکھو) ہم نے محمدؐ کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری اس کے لئے مناسب ہو سکتی ہے، یہ (کتاب)

اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ (پیام حق کی) یاد دہانی اور واضح قرآن ہے!

یعنی یہ کہ آپ شاعر نہیں اس لئے کہ شاعری ایک پیغمبر کے شایانِ شان ہی نہیں۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے شعر و شاعری کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مسلکِ پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے قرآن کی آیات سے یہ استنباط وضاحت طلب ہے۔

زبان، اظہار مدعا کا ذریعہ ہے اور نوع انسانی کے لئے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہار مدعا کے لئے انسانوں نے دو انداز اختیار کئے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں ہم روزمرہ باتیں کرتے ہیں۔ اسے نثر کہتے ہیں، دوسرے شعر۔ شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نثر اور نظم، الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں۔ قرآن کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے ایسی نچی سطح پر نہیں اتر سکتا کہ ان دو اسالیب بیان میں سے ایک کی ایسی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایانِ شان ہی نہ رہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ شاعری رسول کے شایانِ شان نہیں تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ خاص ترتیب نہیں جس سے شعر موزوں ہو جاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے جسے اس نے "شاعری" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت یا مسلکِ حیات کیا ہے؟ اس کی قرآن نے خود ہی دوسرے مقام پر تشریح کر دی ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ایک خاص نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی تمام جد و جہد کا مقصود۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے نزدیک سفرِ زندگی میں صحیح منزل کی تعیین کا نام ہے ایمان، اور اس منزل تک پہنچنے کی کوششوں کا نام اعمالِ صالحہ۔ ایمان و عمل کی زندگی اس کے نزدیک انسانیت کی زندگی ہے، لہٰذا ایک مؤمن کی زندگی اور رسول کے شایانِ شان اسلوبِ حیات۔ اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوبِ زندگی ہے جس میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ اس کے جذبات اس کا معبود[1] ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہی۔ یہ جذبات اس کی ناک میں نکیل ڈالے اُسے زندگی کی مختلف شاہراہوں پر اِدھر اُدھر لئے پھرتے ہیں کبھی تصورات کی ان حسین وادیوں میں۔ کبھی تخیلات کے اُن نگاہ فریب مناظر کی طرف۔ چونکہ زندگی کا نصب العین متعین نہیں ہوتا اس لئے آج جذبات کی رو میں کچھ کہہ رہے ہیں، کل کچھ اور۔ جس قسم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آگئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لئے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے اس لئے جذبات پرستی کی اس نہج زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مؤمن

شاعر کی نفسیات

ا؎ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۲۵ ؍ ۴۳ ؎)

(اے پیغمبر!) تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟

کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔ یہ دو مختلف اسالیب حیات ہیں جن کا تقابل قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۶ / ۲۲۴-۲۲۶)

اور شاعروں کی پیروی ہمیشہ گم کردہ راہ لوگ کیا کرتے ہیں (اے پیغمبر!) تم نے دیکھا نہیں کہ وہ (روز) ہر (نئی) وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں ہیں؟

یعنی نہ ان کے فکر کا صحیح مرکز متعین ہے اور نہ ان کے قول اور عمل میں تطابق۔ یہ ہے نفسیاتِ شاعر۔ اور وہ اسلوب حیات جس کی خصوصیت پریشانی فکر و نظر، آوارگی قلب و نگاہ اور فقدان عمل و کردار ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا انداز حیات ہے جس میں زندگی کا نصب العین متعین ہے اور انسان کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ (۲۲۷)

(ہاں) سوائے ان لوگوں کے جو (پیغام حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنھوں نے نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا جا چکا انھوں نے اپنی مدافعت کی (یہ لوگ ایک متعین راستہ پر چلنے والے اور گفتار و کردار میں یکساں ہوتے ہیں) اور جن لوگوں نے (ان پر) ظلم کیا ہے وہ بہت جلد معلوم کرلیں گے کہ کس منزل کی طرف پلٹ رہے ہیں!

سورۂ شعراء کی ان آیات کے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے۔ ان کے درمیان جو "اِلَّا" (مستثنیٰ) آیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ "مسلم شعراء" ہدایت و سعادت کی راہ پر ہیں اس لئے قرآن کے نزدیک محبوب و مرغوب اور "غیر مسلم شعراء" ضلالت و غوایت پر ہیں اس لئے مغضوب و مبغوض۔ مفہوم اس سے یہ ہے کہ جو لوگ اول الذکر انداز زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں وہ غلط روش پر جا رہے ہیں لیکن جو دوسرا انداز اختیار کئے ہیں وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔ قرآنی انداز زندگی اختیار کرنے والا، اپنے مدعا کا اظہار نظم میں بھی کرے تو جائز اور درست غیر قرآنی اسلوب حیات اختیار کرنے والا اپنا مفہوم نثر میں ادا کرے تو بھی غلط۔ قرآن اسالیب زندگی سے بحث کرتا ہے نہ کہ طرق اظہار مدعا سے۔ لہٰذا قرآن نے جب "شاعری" کو غوایت کی راہ کہا ہے تو اس سے مفہوم وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو انسان کو غلط روش زندگی پر لے جاتی ہے اور فکر و عمل کی دنیا میں کہیں کا نہیں

مسلمان شاعروں کی قوم بن چکی ہے

چھوڑتی یہی وہ "شاعری" ہے جو ایک مدت سے مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات پر مستولی ہے اور ان کی کسی کوشش اور تحریک

کو باریاب نہیں ہونے دیتی۔ اگر ان کی باتیں سنئے تو ایسا معلوم ہوگا گویا ایک سیلاب امنڈتا چلا آرہا ہے جو دنیا کی ہر قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیگا۔ اور جب عمل کی طرف آیئے تو یہ حالت کہ ادنےٰ سے ادنےٰ چوکھٹ پر بھی سجدہ ریزی کے لئے تیار۔ اجتماعات قومی میں ان کے ریزولیوشنز کے الفاظ سے ان کے عزائم کا اندازہ لگایئے تو ایسا معلوم ہوگا، گویا یہ لوگ

سمندر پھاڑ دیں گے۔ کوہ سے دریا بہا دیں گے۔

اور انھیں ان کی کردار کی ترازو میں تولئے تو ایک پر کاہ ثابت ہوں گے جسے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اُڑائے اُڑائے پھرے۔ جذبات کی شعلہ مزاجی کا یہ عالم کہ ذرا سے اختلاف پر نعل برآتش ہو جائیں گے لیکن عدم استقلال کی یہ کیفیت کہ بگولے کا سایہ تمام رقص و وجد اور جوش و خروش آن کی آن میں خاک نشین ہو جائے گا۔ یہ تو ہے دنیائے عمل و استقامت میں ان کی حالت۔ دوسری طرف پریشانی فکر و نظر کا یہ عالم کہ ہر ٹولی کا قبلۂ مقصود الگ اور ہر گروہ کا کعبۂ مدعا جداگانہ۔ چار اس کے پیچھے مصروف دشت پیمائی۔ دس اس کے ساتھ مشغول صحرانوردی۔ ہر گروہ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کی عبرتناک تصویر اور ہر جماعت يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ کا تاسف انگیز مرقع۔ او راس طرح پوری کی پوری قوم اس "شاعری" کا عملی پیکر جس کی قرآن نے یوں مذمت کی ہے، لیکن بایں ہمہ اس فریب میں مبتلا کہ یہ مذمت دوسروں کی کیگئی ہے ہماری نہیں اس لئے کہ ہم تو اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے استثناء میں آگئے ہیں

خدا ایں سخت جاں را یار بادا ⁂ کہ افتاد است از بام بلندے

---

(۲) ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کفار نبی اکرمؐ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) "رجل مسحور" ہیں۔ (دیکھئے ۱۷/۴۷) یعنی آپ پر کسی نے جادو کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی بار بار تردید کی اور قرآن میں بصراحت فرما دیا کہ ان لوگوں کی کتنی بڑی گمراہی ہے جو اس قسم کے بیہودہ خیالات رکھتے اور پھیلاتے رہتے ہیں۔

رجل مسحور! کفار کا اتہام

لیکن آپ حیران ہوں گے کہ خود مسلمان ایک ہزار سال سے یہ عقیدہ لئے بیٹھے ہیں کہ رسول اللہؐ پر ضرور جادو کیا گیا تھا اور آپ "رجل مسحور" تھے۔ یقیناً یہ امر آپ کے لئے موجب تعجب ہوگا کہ مسلمان ایک ایسا عقیدہ کس طرح رکھ سکتے ہیں جو صریحاً قرآن کے خلاف ہو اور جس سے نبی اکرمؐ کی شان اقدس کے خلاف ایسا طعن پایا جائے۔

لیکن

لیکن اس کے باوجود یہ عقیدہ موجود ہے اور اس کی بنیاد ہے ایک ایسی حدیث پر جو بخاری میں موجود ہے۔ چنانچہ بخاری جلد دوم (مطبوعہ مصر) ص۳۷ میں ہے۔

عن عائشۃ قالت سحر النبیؐ صلے اللہ علیہ وسلم حتیٰ کَانَ یُخَیَّلُ اِلیہ اَنَّہٗ یَفْعَلُ الشَّیْئَ وَمَا یفعلُہٗ، حتّٰی کان ذَاتَ یَوْمٍ دَعَا وَدَعَا ثُمَّ قَالَ اَشْعَرْتَ اِنَّ اللہَ اَفْتَانِیْ فیما فیہ شِفَائِیْ اَتَانِیْ رَجُلَانِ فقعد احدھما عند رأسِیْ وَالْاٰخَرُ عند رجلی فقال احدھما للاٰخر ما وجع الرَّجُلِ قَالَ مطبوبٌ قال ومن طَبَّہٗ قال لَبِیْدُ بْنُ الْاَعْصَمِ قال فیماذا قال فی مُشْطٍ وَّمُشَاقَۃٍ وجُفِّ طَلْعَۃٍ ذَکَرٍ قَالَ فَاَیْنَ ھو قال فی بِئْرِ ذَرْوَانَ فَخَرَجَ الیھا النبیؐ صلعم ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ لِعَائِشَۃَ حِیْنَ رَجَعَ نَخْلُھَا کَاَنَّھَا رُؤُسُ الشَّیَاطِیْنِ فَقُلْتُ اِسْتَخْرَجْتَہٗ فَقَالَ لَا اَمَّا اَنَا فَقَدْ شَفَانِی اللہُ وَخَشِیْتُ اَنْ یُّثِیْرَ ذٰلِکَ عَلَی النَّاسِ شَرًّا ثُمَّ دُفِنَتِ الْبِئْرُ۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور اکرمؐ پر ایسا جادو کیا گیا تھا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے فلاں کام کرلیا حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک روز حضورؐ نے دعا کی پھر دعا کی۔ دعا کے بعد مجھ سے فرمایا۔ عائشہ! تمہیں معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے وہ حکم دیا جس میں میری صحت (مضمر) ہے۔ میرے پاس (خواب میں) دو آدمی آئے۔ ایک میرے سرہانے بیٹھا۔ دوسرا پائنتی۔ ایک دوسرے سے بولا اس شخص کو کیا بیماری ہے! اس نے کہا اس پر جادو کیا ہوا ہے۔ پہلا شخص بولا کس نے کیا ہے؟ دوسرے نے کہا لبید ابن اعصم نے۔ پہلے نے پوچھا۔ کس چیز میں کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کنگھی میں اور کنگھی سے جھڑے ہوئے بالوں اور نر کھجور کے غلاف میں۔ پہلا بولا یہ چیزیں کہاں رکھی ہیں؟ دوسرا بولا چاہ ذروان میں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ ذروان پر تشریف لے گئے اور لوٹ کر مجھ سے فرمایا کہ اس کنویں کے درخت کے کھجور شیطانوں کے سروں کی طرح ہیں میں نے عرض کیا۔ حضورؐ نے جادو کی چیز وہاں سے نکال ڈالی؟ فرمایا نہیں لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے صحت عطا فرمادی۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں لوگ اس فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ کنواں پاٹ دیا گیا۔

غور کیجئے صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاندین اسلام کی مذموم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ایک روایت وضع کی اور امام بخاریؒ نے اُسے اپنے مجموعہ میں شامل کرلیا۔ اب مسلمان اُسے ہزار برس سے سینہ سے لگائے لگائے پھر رہا ہے اور نہیں سوچتا کہ یہ قرآن کریم کی تصریحات کے کس قدر خلاف ہے اور نبی اکرمؐ کی عظمت شان کے کس درجہ منافی! لیکن اسے تو تعلیم یہ دی گئی ہے کہ سب کچھ روا رکھا جاسکتا ہے لیکن یہ سننا برداشت نہیں

کیا جاسکتا کہ امام بخاریؒ نے اپنے مجموعہ میں ایک غلط روایت شامل کرلی ہے! یہ ہے وہ شخصیت پرستی جو ہمیشہ سے حق پرستی کے راستہ میں حائل ہوتی چلی آرہی تھی اور جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے قرآن کو غلافوں میں لپیٹ کر رکھدیا اور اطاعت پھر اشخاص کی شروع کردی جسے قرآن نے اَنۡدَادًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ کہا تھا۔ نتیجہ اس کا ذلت اور پستی کا وہی جہنم تھا جس میں ان سے پہلی قومیں گرچکی تھیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ ۙ جَہَنَّمَ ۚ یَصۡلَوۡنَہَا ؕ وَ بِئۡسَ الۡقَرَارُ ﴿۰﴾ وَ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا لِّیُضِلُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعُوۡا فَاِنَّ مَصِیۡرَکُمۡ اِلَی النَّارِ ﴿۰﴾ (۱۴/۲۸)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنھیں اللہ نے نعمت عطا فرمائی تھی مگر انھوں نے کفرانِ نعمت سے اسے بدل ڈالا، اور اپنے گروہ کو ہلاکت کے گھر میں جا اُتارا؟ یعنی دوزخ میں جا اتارا جس میں وہ داخل ہوں گے؟ (پھر جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا، تو) کیا ہی برا ٹھکانا ہے! اور انھوں نے اللہ کے لئے اس کے ہم درجہ بنائے کہ لوگوں کو اس کی راہ سے بھٹکائیں۔ (اے پیغمبر!) تم کہہ دو اچھا (زندگی کے چند روزہ) فائدے برت لو۔ پھر بالآخر تمہاری راہ آتشِ دوزخ ہی کی طرف ہے!"

اجر رسالت

(۳) یہ بھی ہمارے سامنے آچکا ہے کہ نبی اکرمؐ نے کس طرح بار بار اعلان فرمایا کہ آپ اپنی دعوتِ اصلاح و ارشاد کے لئے کسی صلہ کے خواہاں نہیں تھے اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ رسولؐ کس مقام بلند و رفیع سے یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کا اجر اس کے اللہ کے ہاں ہے۔ لیکن اس ضمن میں بھی ایک آیت ایسی ہے جسے مسلمانوں کے ذوقِ شخصیت پرستی نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ گذشتہ اوراق میں گذر چکا ہے کہ قریش نے کس طرح تمام خاندانِ بنو ہاشم کا بائیکاٹ کردیا تھا اور انھوں نے تین برس تک شعب ابی طالب میں کن مشکلات میں محصور و محبوس زندگی گذاری تھی۔ صلۂ رحمی (رشتہ داری کا پاس خاطر) عربوں کی قومی خصوصیات میں سے تھا اور اسپر اُنھیں بڑا ناز تھا۔ لیکن روسائے قریش نے آپ کی مخالفت میں اس قومی خصوصیت کو بھی فراموش کردیا اور رشتہ داری کے تعلقات کو بھی پس پشت ڈالدیا۔ اس پر نبی اکرمؐ نے ان سے کہا کہ تم لوگ میری دعوتِ انقلاب کی مخالفت کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کرو۔ لیکن کمبختو! اس جوشِ مخالفت میں صلۂ رحمی کے اس جذبہ کو تو فراموش نہ کرو

مودۃ فی القربیٰ جو تمہارا قومی شعار رہے - بنو ہاشم کے خاندان سے تمہارے رشتہ دارانہ تعلقات ہیں، ان تعلقات پر تو نگاہ رکھو۔

ذٰلِكَ الَّذِىْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۗ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ۗ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۴۲/۲۳﴾

ان (نعمائے ابدی اور باغات جنت) کی خدا اپنے ان بندوں کو بشارت دیتا ہے جو (دعوتِ حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنھوں نے نیک کام کئے ہیں (اے پیغمبر!) تم کہدو کہ (اس دعوتِ حق پر) میں تم سے کسی معاوضہ کا خواہاں نہیں ہوں سوائے قرابت دارانہ محبت و شفقت کے۔ (مجھے اور کچھ نہیں چاہئے! اگر دعوتِ حق کو قبول کر کے نیک کام کروگے تو خود ہی فائدہ اٹھاؤگے کیونکہ خدا کا وعدہ ہے) کہ جو شخص بھی کوئی نیکی کرے گا ہم اخروی زندگی میں اس کی بہتری کو اور زیادہ کردیں گے (اب تک جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے مغفرت مانگ لو) یہ واقعہ ہے کہ خدا بہت ہی بخشنے والا اور بڑا ہی قدردان ہے!

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔ لیکن مسلمانوں کو جب اپنے جذبۂ شخصیت پرستی کی تسکین کا سامان قرآن سے کہیں نہ ملا تو انھوں نے اس قسم کے عنکبوتی آسرے ڈھونڈھنے شروع کئے چنانچہ اس آیت میں ایک اسی قسم کا آسرا ان کے ہاتھ آگیا اور انھوں نے جھٹ رائی سے پہاڑ بنالیا۔ اس آیت کے معنی یہ کئے گئے کہ

میں تم سے کچھ اجرِ رسالت نہیں مانگتا۔ بجز اس کے کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔

رشتہ داروں سے مراد "آلِ محمدؐ" (یعنی حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ کی اولاد) لی گئی (حالانکہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی تھی جبکہ حضرت فاطمہ رضؓ کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی) اور پھر اس کی تائید میں روایات کے انبار کے انبار لگ گئے۔ حتیٰ کہ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضؓ سے یہ روایت مرقوم ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں - ایک قرآن اور دوسرے اہل بیت (ترمذی میں عترتی آیا ہے)

ان روایات کی روشنی میں آیت مندرجہ صدر کی تفسیر یہ کی گئی کہ حضورؐ نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ صرف یہ مانگتا ہوں کہ تم میری آل سے محبت کرو۔[۱]

جذبۂ نسل پرستی ذرا غور کیجئے۔ رسول اللہؐ کی بعثت اس لئے ہوئی تھی کہ آپ تمام نسلی امتیازات کو مٹا کر اس کی جگہ خالص تقویٰ کو معیارِ تکریم و تعظیم قرار دیں۔ (اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ)

[۱] بحوالہ تفسیر ابن کثیر۔

ملوکیت قرآن کی رو سے اِسی لئے ناجائز ہے کہ اس میں حقوق و مفاد کی اجارہ داری موروثی (نسلی) استحقاق کی بنا پر ہوتی ہے۔ نبی اکرمؐ اسی غلط معیار استحقاق کے ابطال کے لئے مبعوث ہوئے اور تمام عمر اس غلط معیار کو مٹانے اور اس کی جگہ صحیح معیار کو قائم کرنے میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے رومیوں کی طرف جس فوج کا بھیجنا تجویز کیا اس کی سپہ سالاری حضرت اسامہ بن زیدؓ کو تفویض فرمائی۔ چونکہ آپ (حضرت اسامہؓ) ایک "غلام زادہ" تھے اس لئے بعض منافقین نے اس پر اعتراض کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ

اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ کی سرداری پر بھی تم معترض تھے۔ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا۔

یہ اس اہم معیار کا ایجابی پہلو تھا۔ دوسری طرف سلبی پہلو لیجئے تو حضورؐ نے وفات سے پہلے جو آخری خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے آخری الفاظ تھے۔

اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔[1]

یعنی زندگی کے آخری لمحات میں اس حقیقتِ کبریٰ کے دونوں پہلوؤں کو واضح کر دیا کہ ایک غلام کا بیٹا اگر جوہر ذاتی کی بنا پر کسی بلند ترین منصب کا مستحق ہے تو باقی سب کو اس کی سرداری قبول کرنی ہوگی خواہ وہ حسب و نسب میں اس سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں اور دوسری طرف یہ کہ خدا کی میزان میں اصل وزن عمل کا ہے، حسب و نسب کا نہیں۔ حتیٰ کہ پیغمبر کی بیٹی بھی اس معیار خداوندی سے مستثنیٰ نہیں۔ ان حقائق کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد آیت مندرجہ صدر کی اس تفسیر اور اس کی تائید میں ان روایات کو دیکھئے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ صاف نظر آجائیگا کہ یہ اس پارٹی پروپیگنڈا کا اثر ہے جو اسلام کے خلاف سب سے بڑی سازش تھی اور جس کے اثرات اسلامی تعلیم و تصوراتِ حیات کے انحطاط کے ساتھ ساتھ یوں بڑھتے گئے جیسے سورج ڈھلنے کے ساتھ ساتھ سائے بڑھتے جاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ سادات کی سیادت بالکل برہمنوں کی طرح ملّت کے سر پر مسلط ہوگئی ہے اور ہر سیّد کا یہ پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ واجب التکریم سمجھا جائے اور اُسے غیر سیدوں سے بلند مرتبہ رکھا جائے۔ سید اور غیر سید میں نسلی امتیاز کے غیر اسلامی جراثیم وہاں سے بڑھ کر آگے پھیلے اور مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح ذاتوں اور گوتوں میں بٹ گئے اور یہی ذاتیں

---

[1] مسند امام شافعی۔

ذاتوں کی تقسیم

اونچ اور نیچ کا معیار قرار پاگئیں اور اس طرح مسلمان رفتہ رفتہ اس عہد جاہلیت میں جا پہنچا جہاں سے اسلام نے کفارِ عرب کو نکالا تھا۔ اس قبائلی تفریق نے اس وحدت کی جڑ کاٹ کر رکھدی جسے قرآن نے اقرار توحید کا عملی اور فطری نتیجہ بتایا تھا۔ مذہبی گروہ بندیوں نے اسے شیعہ اور سنی۔ مقلد اور غیر مقلد کے شرک سے ملوث کیا اور نسلی امتیازات نے اسے عصبیت جاہلیت کے جہنم میں دھکا دیا۔ بایں ہمہ مسلمان مطمئن ہے کہ دنیا میں یہ توحید پرست ہے اور باقی سب مشرک۔ اور پھر قیامت پر قیامت یہ کہ جاہلیت کی اس غیر اسلامی زندگی کی تائید میں جو شہادات (روایات) پیش کی جاتی ہیں انھیں منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی طرف جو ساری دنیا سے اس عصبیت جاہلیہ کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ آیت زیرِ نظر کی اس تفسیر پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے جو اوپر درج کی گئی ہے اور سوچئے کہ اس نشتر کی زد کہاں تک پہنچتی ہے۔ اس تفسیر کی رو سے گویا نبی اکرمؐ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجرِ رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میری اولاد سے محبت کیا کرو۔ اب ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ اس کے علاوہ جو اجر بھی مانگتے وہ آپ کی زندگی تک محدود ہوتا یعنی آپ زیادہ سے زیادہ سلطنت اور حکومت مانگتے۔ دولت و حشمت طلب کرتے۔ یہ سب اجر آپ کی زندگی تک محدود ہوتے لیکن آپ نے جو اجر (بقول ان روایات کے) امت سے مانگا ہے اس کا سلسلہ تو قیامت تک جاری رہے گا یعنی اس کی رو سے ہر امتی کو ہر سید سے محبت کرنی ہوگی سید خواہ کچھ بھی کرے اس کے متعلق دل میں غیر از محبت کوئی اور جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ فرمانِ رسولؐ[1] ہے جس کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ اجرِ رسالت ہے جس کی ادائیگی پر ہم مامور ہیں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ فرمانِ رسول اللہؐ ہوگا۔ کیا نبی اکرمؐ کبھی ایسا ارشاد فرما سکتے ہیں کہ "میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک قرآن اور دوسرے اہل بیت"۔ لیکن ان چیزوں کو احادیث رسول اللہ کہکر مسلمانوں کو ان کے صحیح ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہ سب اس لئے کہ یہ چیزیں ان کتابوں (صحاح ستہ) میں شامل ہوگئی ہیں جنھیں غلطی سے مبرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہدے کہ ان کتابوں کے مشمولات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لینا چاہئے اور جو قرآن کے خلاف ثابت ہوں انھیں وضعی مان کر ان کتابوں سے نکالدینا چاہئے، تو ایسا کہنے والے پر "منکرِ حدیث" کا لیبل لگا کر اسے کافر بنا دیا جاتا ہے۔ یہ حالت ہے ہمارے مذہبی طبقہ کی۔ اور اس کے بعد مسلمان انکوائری (تحقیقاتی) کمیٹیاں بٹھاتے ہیں کہ وہ تحقیق کرکے

---

[1] یہی وجہ ہے کہ آلِ محمدؐ پر درود بھیجنا ہماری نمازوں تک میں داخل ہوگیا اور اس طرح سادات سے محبت اور نسلی تفوق کی بناء پر ان کی تعظیم و تکریم مذہبی فریضہ قرار پاگئی۔

بتائیں کہ ان کے زوال کے اسباب کیا ہیں ؟

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

تشکیلِ جماعت

حرفِ بے صوت اندریں عالم بُدیم
از رسالت مصرعِ موزوں شدیم

گذشتہ عنوان میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ نبی اکرمؐ کی دعوت انقلاب کی کس شدت سے مخالفت ہوتی تھی اور حضورؐ کو اس مخالفت کے مقابلہ میں کیسے کیسے جانگسل مصائب اور صبر آزما حوادث کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن حضورؐ کے سامنے صرف اس مخالفت کا مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اہم اور محنت طلب فریضہ اپنی جماعت کی تشکیل و تربیت کا تھا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ تزاحم و تصادم کی اول الذکر تخریب بھی اسی تعمیر کے لئے تھی۔ وہ ورطۂ آلا تھا، یہ شعبۂ رآلا تھا۔ چٹانوں کو توڑ کر سنگریزوں میں تبدیل کر دینا مقصود نہ تھا بلکہ مقصود یہ تھا کہ ان سنگریزوں کے ربط و ضبط اور ترتیب و تنظیم سے ایک ایسا قصر مشید تعمیر کیا جائے جو انسانیت کے لئے حصارِ امن و عافیت کا کام دے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ تعمیر کا کام تخریب سے بھی زیادہ صبر آزما اور استقامت طلب ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ کا نصب العین زندگی ایک ایسے نظام کا قیام تھا جس میں انسانی افکار و اعمال حق سے ہم آہنگی و یک رنگی حاصل کر سکیں۔

تعمیرِ ملت

اس نظامِ زندگی کے قیام و استحکام کے لئے جماعت کا وجود لاینفک تھا، لہٰذا نبی اکرمؐ کی یہ تمام جد و جہد اور سعی و کاوش درحقیقت اس جماعت کی تشکیل و تعمیر کے لئے تھی۔ حضورؐ کو جب اللہ کی طرف سے حکم ملتا تھا کہ آپ حق و صداقت کی اس آواز کو برابر بلند کرتے چلے جائیے وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ تو اس سے مفہوم ان مخالفین کو چڑانا نہیں تھا۔ مفہوم یہ تھا کہ یہ آواز کسی نہ کسی طرح ان سعید روحوں کے عمق قلب تک جا پہنچے جن میں ہنوز زندگی اور حرارت کے آثار موجود تھے تاکہ وہ حقیقت کو محسوس

کریں اور اس طرح حق و صداقت کی راہ پر آجائیں۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲)

تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے اتمام حجت کے بعد زندہ رہے!

مخالفتوں کے اس ہجوم اور مزاحمتوں کے اس شور و غوغا میں آپؐ کی یہ صوت سرمدی ہم جنس قلوب کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے تھی۔

غزل سرایم و پیغام آشنا گویم ✧ بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم

آپ نے آہنگر کی فسان کے نیچے رکھی ہوئی ریت کو دیکھا ہوگا۔ فسان پر لگائے جانے والے فولاد کے ذرات اُس ریت میں اس طرح مل جاتے ہیں کہ بڑی سے بڑی باریک بین نگاہ بھی انھیں متمیز نہیں کر سکتی۔ لیکن جب مقناطیسی پتھر کا ٹکڑہ اس ریت پر پھیر دیا جائے تو فولادی ذرات تڑپ تڑپ کر ریت سے الگ ہو جاتے ہیں اور کہکشانی ستاروں کی طرح اس پتھر کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ رسول کی آواز بھی اسی قسم کا مقناطیسی اثر اپنے اندر رکھتی ہے جس سے وہ تمام منتشر ذرات جو اپنے اندر قبول کشش و جذب کی صلاحیت رکھتے ہیں اس مرکز حق و صداقت کے گرد پروانہ وار جمع ہو جاتے ہیں اور ریت کے وہ ذرات جن میں جذب و انجذاب کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی ان سے یکسر الگ ہو جاتے ہیں۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۸/۳۷)

اور یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ ناپاک (روحوں) کو پاک (روحوں) سے جدا کر دے اور جو ناپاک ہیں ان میں سے بعض کو بعض کے خلاف کھڑا کر دے۔ پھر سب کو (اپنی تباہ حالیوں میں) اکٹھا کر دے۔ پھر قیامت کے دن (اس جمع شدہ گروہ) کو دوزخ کے حوالے کر دے۔ یہی لوگ ہیں یکسر تباہ ہو جانے والے!

یہ ہے وہ عمل تفریق و تجرید جس سے نوع انسانی دو گروہوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ایسے گروہ جو ایک دوسرے سے بالکل الگ اور متمیز ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو حق کے مطابق زندگی بسر کرنے کا تہیہ کرتا ہے۔ اس گروہ کو مؤمنین کی جماعت یا حزب اللہ کہا گیا ہے۔ دوسرا وہ جو اس نظام زندگی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ غیر خدا (طاغوتی) قوتوں کے وضع کردہ آئین و دساتیر کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے کفار کی جماعت یا حزب الشیطان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہی وہ تقسیم ہے جو زمان اور مکاں کی حدود و ثغور سے بے نیاز، نوع انسانی کو تصورات زندگی (Ideology) کے اختلاف

دو متمیز فریق

کی بنا پر الگ الگ کرتی ہے۔ اور یہ عین مطابق فطرت ہے۔ ان دو جماعتوں کی فطرت میں تضاد، سرشت میں تخالف۔ زاویۂ نگاہ میں تباین، ذہنیت میں اختلاف۔ لائحۂ عمل میں افتراق اور نصب العین میں بعد المشرقین ہوتا ہے۔ اس لئے ان دونوں میں سوائے نوعی اشتراک کے اور کوئی شئے مشترک نہیں ہوتی۔ کہئے کہ ڈاکوؤں کی جماعت اور پولیس کے گروہ میں کونسی چیز مشترک ہو سکتی ہے؟ اس لئے ان دونوں جماعتوں میں قلبی تعلقات استوار نہیں ہو سکتے۔ ایسے تعلقات کے لئے فکر و نظر میں یگانگت قلب و دماغ میں موانست خیال و عمل میں یکسانیت اور منزل مقصود کی وحدت نہایت ضروری ہے۔ جلد دوم اور سوم میں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکار جلیلہ پر ایک نگاہ پھر ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر ایک نے اسی معیار کے مطابق انسانوں کی تقسیم کی اور اس طرح ایک ایسی جماعت کی تشکیل کی جو دنیا میں حق کے لئے جئے اور حق کیلئے مرے۔ ایسی ہی جماعت کی تعمیر نبی اکرمؐ کے پیش نظر تھی۔ جونہی کوئی شخص اس نظام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اقرار کرتا (کہ اسی کا نام ایمان لانا ہے) وہ باقی تمام انسانوں سے کٹ کر اس نئی برادری کا فرد اور نئی جماعت کا ممبر بن جاتا اور حبش کے غلام اور مکے کے سردار میں ایسے برادرانہ تعلقات پیدا ہو جاتے کہ دنیا کی کوئی آنکھ ان میں امتیاز نہ کر سکتی۔

یہ حضرات اپنی فطرت کی صلاحیت و سعادت کی بنا، پر نبی اکرمؐ کے پیغام حیات آور میں حقیقت کی کوئی ایک جھلک دیکھتے تو اس کی حقانیت پر ایمان لے آتے لیکن بہرحال یہ اسی ماحول کے پروردہ اور اسی سوسائٹی کے افراد تھے جس کا ذکر عربوں کے کوائف و احوال میں آ چکا ہے۔ یہ اُمیّوں (ان پڑھ لوگوں) کی قوم سے تھے اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا۔ ان افراد کو زمین کی ان پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی ان بلندیوں پر لے جانا جہاں یہ [خَيْرَ أُمَّةٍ - (۳/۱۱)] کا آفتاب عالمتاب بنکر چمکیں اور ساری دنیا [أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۱)] کی تاریکیوں اور ظلمتوں کو مٹا کر [تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ (۳/۱۱)] اس کی جگہ علم و صداقت کی نورانیت کو پھیلا دیں۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

۔۔ ۔ کچھ آسان کام نہ تھا۔ شروع شروع میں ان حضرات (رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ) میں سے بعض

تعلیم و تربیت کا مرحلہ

کی حالت یہ تھی کہ جمعہ کی نماز میں بیٹھے ہیں۔ حضورؐ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ باہر سے کسی بازیگر کی ڈگڈگی یا جرس کارواں کی آواز کان میں آئی اور یہ حضورؐ کو اسی عالم میں چھوڑ کر تماشا دیکھنے یا سودا کرنے کے لئے اُٹھ بھاگے۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۶۲/۱۱﴾

اور (اے پیغمبر!) یہ لوگ جب کوئی تجارت یا کھیل کود دیکھتے ہیں تو اسی کی طرف لپک جاتے ہیں اور تمہیں (خطبہ میں) کھڑا ہوا ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ تم ان سے کہدو کہ خدا کے پاس جو کچھ (دنیوی اور اخروی اجر) ہے وہ اس کھیل تماشے اور تجارت سے (کہیں) بہتر ہے اور اللہ تو رزق دینے والوں میں سب سے بہتر رزق دینے والا ہے!

ان لوگوں کو دنیا کی امامت (LEADERSHIP OF THE WORLD) کے قابل بنانا جوئے شیر کا لانا تھا وہ قوم جو تمدنی زندگی کے مبادیات تک سے ناآشنا تھی جنہیں یہ کچھ سکھانے کی بھی ضرورت تھی کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ۚ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ (۳۳/۵۳)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! نبی کے گھروں میں اندر نہ چلے جایا کرو بجز اس صورت کے کہ کھانے کے لئے (پیغمبر تمہیں خود ہی بلائے اور تمہیں اندر جانے کی) اجازت دیدی جائے۔ اور اس صورت میں بھی تم اس کے برتنوں کو نہ تکا کرو بلکہ جب تمہیں بلایا جائے تو اندر چلے جاؤ اور جب کھانا کھا کر فارغ ہو جاؤ تو الگ الگ ہو جایا کرو۔ یہ نہ ہو کہ باتوں میں جی لگا کر جم کر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری ان باتوں سے پیغمبر کو تکلیف ہوتی تھی۔ مگر وہ (وسعتِ اخلاق کی وجہ سے صاف کہتے ہوئے) شرماتا تھا۔ لیکن خدا حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ (لہٰذا آئندہ اس کی احتیاط رکھو) اور دیکھو جب امہات المؤمنین سے تمہیں کچھ سامان مانگنا ہوا کرے تو ان سے پردہ کے پیچھے سے مانگا کرو (سامنے نہ جاکر کھڑے ہو جایا کرو)

انہیں اس مقام بلند پر پہنچا دینا کہ وہ دنیا کو جہانداری و جہانبانی کے طرق و اسالیب سے آگاہ کریں بہت بڑا کام تھا۔ یہی ہے وہ عظیم المرتبت فریضہ جسے قرآن کریم نے تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب و حکمت[1] اور تزکیۂ قلوب سے تعبیر کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ

---

[1] کتاب و حکمت کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ بر دست اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ حکمت قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں۔ کتاب قوانین کا نام ہے اور حکمت ان احکام کی علت و غایت اور مقصود و مطلوب۔ دونوں منزل من اللہ ہیں، اور قرآن کے اندر محفوظ۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳-۱۶۴)

(۲/۱۲۹ ز ۲/۱۵۱ ز ۳/۱۶۴)

(اور دیکھو) خدا کی وہ ذات ہے جس نے ان پڑھ قوم میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کے سامنے خدا کی آیتوں کی تلاوت کرتا، ان کا تزکیۂ نفس کرتا اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہو حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ نبی کے آنے سے پہلے وہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے!

اس فریضۂ رسالت میں تعلیم وتزکیہ کے الفاظ قابل غور ہیں۔ تعلیم کا تعلق بالعموم انسانی ذہن سے ہوتا ہو اور تزکیہ کا تعلق قلبِ انسان سے۔ کسی شئے کی حقیقت کو اس انداز سے واضح کردینا کہ وہ دوسرے کی سمجھ میں آجائے تعلیم ہے۔ لیکن دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے ذہنی جلا ہی کافی نہیں اس کے لئے قلبی تبدیلی کی ضرورت ہے جو درحقیقت اعمال انسانی کا سرچشمہ ہے۔ عمل کا جذبہ محرکہ قوت ارادی ہے اور قوت ارادی کے منبع ومخرج کو قلب کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جسے "نیکی" کہا جاتا ہے، وہ نیک ارادے ہی کے مظاہرے کا نام ہے۔ کانٹ کے الفاظ میں

بجز اچھے ارادے کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا سے باہر بھی ایسی شئے نہیں جس کو علی الاطلاق، بغیر کسی قید اور شرط کے اچھا کہا جاسکے۔

(Quoted by Mc kanzie in Manual of Ethics vol. I)

اخلاقیات کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ بقول میکنزی "جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اسکی اخلاقی حیثیت نہیں" (ایضاً) جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب وتطہیر فکر پر نہیں ہے، وہ نظام کبھی نشوو ارتقاء انسانیت کا کفیل نہیں ہوسکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔ بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کرسکتے جب تک ان قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور ان پر عمل کرنے والی قوم کے قلب ونگاہ کی اصلاح نہ ہوچکی ہو۔

قلبی تبدیلی نہایت ضروری ہے

تہذیب مغرب کی جہاں سوزی اور بالآخر خودکشی کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس نے انسان کو ایک مشین سمجھ لیا جسے جس وقت حسابی قاعدے کے مطابق چلایا جائے تو اس سے متعینہ نتائج از خود مرتب ہوتے چلے جائیں۔ حالانکہ صاحب اختیار وارادہ انسان اور بلا اختیار وارادہ مشین میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو انھوں نے کہدیا کہ جب ذہن انسانی کسی قانون اور ضابطہ کے اساس واصول اور متعلقات وتضمنات پر غور کرکے اس نتیجہ پر پہونچ جائے کہ وہ قانون اچھا اور وہ ضابطہ عمدہ ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس قانون پر عمل پیرا نہ ہو۔ لیکن وہ باایں ہمہ ادعائے علم ودانش، اتنا نہیں سمجھ سکے کہ عمل کا محرک جذبہ، قوت ارادی ہے۔ اور

قوت ارادی کا تعلق دل سے ہے، دماغ سے نہیں، اس لئے تنہا علم، عمل کا محرک نہیں ہو سکتا۔[۱] انھوں نے یہ بھی کر لیا کہ اپنی قوم کو سمجھا دیا کہ ان آئین و ضوابط کی پابندی سے اُنھیں فلاں اور فلاں مفاد حاصل ہو جائیں گے اس ترغیب و تحریص سے افرادِ قوم نے ان آئین و ضوابط پر عمل بھی کیا۔ لیکن چونکہ قوم، ان قوانین و ضوابط کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس نہیں کرتی تھی اس لئے ان کا یہ عمل سر تا سر منافقت تھا اور یہ ظاہر ہے کہ منافقت کے جراثیم ایسے ہیں جو دِق کے بخار کی طرح جوہر انسانیت کو آتش خاموش کی طرح اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتے ہیں۔ دیکھئے! دورِ حاضرہ کے "علم تجزیۂ نفس" کا امام (فرائڈ) مغربی سوسائٹی کی اس روشِ زندگی پر کس طرح ماتم کناں ہے۔ وہ لکھتا ہے

> وہ مہذب سوسائٹی جو افراد سے اچھے کردار کا تو مطالبہ کرتی ہے لیکن جن محرکات پر اس کردار کی بنیاد ہوتی ہے، ان کا کچھ خیال نہیں کرتی، وہ ایسے افراد سے اطاعتِ احکام کراتی ہے جو اس اطاعت میں اپنی فطرت کے تقاضوں کی اطاعت نہیں کر رہے ہوتے۔ جس شخص سے ایسے احکام کی اطاعت کرائی جائے جنھیں وہ اپنے فطری تقاضوں کا مظاہرہ نہ سمجھے علم النفس کی زبان میں یوں سمجھئے کہ ایسا شخص اپنے ذرائع و وسائل کے حدود سے باہر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی کو منافق کہتے ہیں، خواہ اسے اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ہماری دورِ حاضرہ کی تہذیب کی فضا ایسے منافقین کی تخلیق کے لئے غیر معمولی طور پر ساز گار ہے
>
> (Civilisation, War and Death - pp. 10-11)

قرآن اس قسم کی سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے جو اطاعتِ احکام میں اپنی فطرت کے تقاضوں کی تسکین محسوس کرے قلب کی اس کیفیت کا نام تزکیہ ہے۔ جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسانی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلابِ عظیم آجاتا ہے، کہ خارجی تبدیلی درحقیقت داخلی تبدیلی کے مظاہرہ کا نام ہے۔ قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے۔

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود ❊ جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

چونکہ اس نوعیت کی اطاعت میں فطرت اپنے تقاضوں کی تسکین و طمانیت کا سامان پاتی ہے، اس لئے

تزکیہ سے مفہوم

اس سے اس میں بالیدگی اور نشوو ارتقاء پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تزکیہ کے معنے ہی بڑھنا اور پھولنا، نشوونما کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ سورۂ والشمس میں ہے۔

---

[۱] اس موضوع پر تفصیلی بحث عنوان وحی جلد دوم میں گذر چکی ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (۹۱/۱۰)

(دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ جس نے نفس انسانی میں بالیدگی پیدا کی وہ بامراد ہوا اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد رہا[۱]۔

غور کیجئے یہاں تزکیہ کے مقابلہ میں تدسیہ آیا ہے اور تدسیہ کے معنے ہیں کسی چیز کو دبا دینا۔ سورۂ نحل میں ہے کہ "عرب جاہلیت میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جب کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر ملتی تو وہ شرم سے منہ چھپاتا پھرتا اور سوچتا کہ اسے عمر بھر کی ندامت کے لئے زندہ رہنے دے یا زمین میں دبا دے" اس کو تدسیہ کہا گیا ہے۔

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (۱۶/۵۹)

جس بات کی اسے خوش خبری دی گئی ہے، وہ ایسی برائی کی بات ہوئی کہ شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرے، (اور سوچ میں پڑ جائے کہ) ذلت قبول کرکے بیٹی کو رہنے دے، یا مٹی کے تلے گاڑ دے افسوس ان پر کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں.....!

ہاں! تو تزکیہ کے معنے ہیں نفس انسانی میں ارتقاء و بالیدگی پیدا کرنا۔ اور یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب احکام قرآنی خود فطرت کی آواز بن کر عمق قلب سے ابھریں۔ یہی تزکیۂ قلوب تھا جو حضورؐ کے مناصب دعوت و ارشاد میں سے تھا۔

عجمی تصورات نے جہاں اور قرآنی اعمال و افکار پر رنگ فریب پردے ڈالے ہیں "تزکیۂ نفس" کی حیثیت کو بھی ایسی برفانی سلوں کے نیچے دبا دیا ہے جس سے زندگی کی گرمیاں جمود و تعطل کی افسردگیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس کا غلط مفہوم

اب تزکیۂ نفس کے ساتھ ہی خانقاہوں میں چلّہ کشی اور زاویہ نشینی کا تصور سامنے آ جاتا ہے۔ اس تصور کی رو سے شریعت کے احکام اور ان کی اطاعت "ظواہر پرستی" ہے اور تزکیۂ نفس کے لئے باطنی تعلیم کی ضرورت ہے۔ یہ تعلیم ان اسرار و رموز اور بطون و غوامض پر مشتمل ہے جسے رسول اللہؐ نے امت کو کھلے بندوں نہیں دیا بلکہ مخفی طور پر دو چار منتخب حضرات کو بتایا اور جو وہاں سے پھر سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور یہ اتہام (معاذ اللہ) اس ذات گرامی پر لگایا جاتا ہے جسے خدا کی طرف سے حکم تھا کہ۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ

[۱] دیکھئے مفردات امام راغب اصفہانی۔ لفظ دسّ درستی۔

الْكٰفِرِیْنَ ۝ (۵/۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اُسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فرض رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں کے شر سے محفوظ رکھیگا۔ وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے!

اور یہ ابلاغ رسالت، مبین (کھلا کھلا۔ واضح) تھا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ (۱۶/۸۲)

پھر (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی لوگ اعراض کریں (اور سمجھنے بوجھنے کے لئے تیار نہ ہوں) تو (ان کی فکر چھوڑ دو) تمہارے ذمہ جو کچھ ہے، وہ صرف یہی ہے کہ صاف صاف پیغام حق پہنچا دینا!

اور خود اللہ تعالیٰ دیکھتا تھا کہ حضورؐ نے یہ فریضہ سرانجام دیدیا۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۝ (۷۲/۲۷-۲۸)

(دیکھو، وہ) سوائے ان رسولوں کے جنہیں وہ منصب رسالت کے لئے چن لیتا ہے (کسی کو بھی غیب کی باتوں پر مطلع نہیں کرتا) کیونکہ (وہ ان غیبی معاملات میں کوئی خیانت نہیں کر سکتے) اُنکے آگے پیچھے (خدا کے) محافظ (فرشتے) لگے ہوتے ہیں۔ تاکہ خدا کو (عملاً) معلوم ہو جائے کہ ان رسولوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو (لوگوں تک) پہنچا دیا ہے اور جو حالات ان کو درپیش ان کو اپنے احاطۂ قدرت میں لیلے اور ہر چیز کی شمار اپنے پاس محفوظ رکھے!

اور حضورؐ نے اس فریضۂ رسالت کو بایں حسن و خوبی سرانجام دیا کہ حجۃ الوداع میں پوری امت سے آپ نے دریافت فرمایا کہ اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ۔ کیوں؟ میں نے پیغام خداوندی پہنچا دیا ہے یا نہیں؟ سب نے بیک زبان جواب دیا کہ ہاں! آپ نے پہنچا دیا۔ اس پر آپ نے خدا کو شاہد کر کے فرمایا کہ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ..... اے خدا! تو گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام سب تک پہنچا دیا۔ اور پھر لوگوں سے فرمایا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ۔ جو لوگ موجود ہیں ان کے ذمہ ہے کہ وہ ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

اور اس طرح تکمیل فریضۂ رسالت کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ غور کیجئے۔ رسول، پیغام کو پہنچانے والا۔ خدا اس فریضہ کی تکمیل کا ذمہ لینے والا۔ ساری امت شاہد کہ آپ نے پہنچا دیا۔ لیکن اس کے باوجود آج

یہ عقیدہ موجود ہے کہ نہیں! حضورؐ نے ایک حصہ چھپا کر رکھ لیا تھا اور وہ صرف سینہ بسینہ آگے منتقل ہوا ہے۔ اور اس عقیدہ کی سند؟ اول تو "ارباب معرفت" کو ظاہری اسناد کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ان کے رموز و اسرار کی طرح اسناد بھی سینہ بسینہ منتقل ہوتی ہیں لیکن اس بنیادی عقیدہ کے لئے تو خود بخاری میں ایک روایت موجود ہے۔ بخاری کتاب العلم میں ہے۔

عن ابی ھریرۃ۔ قال حفظتُ عن رسول اللہؐ وعادین۔ فاما احدھما فبثثتہ واما الآخر فلو بثثتہ قطع ھٰذا البلعوم (جلد اول ص۲۴)

(حضرت) ابو ہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے دو برتن لیکر یاد رکھے۔ ایک کو تو میں (لوگوں کے سامنے) کھول چکا۔ رہا دوسرا۔ تو اگر اس کو بیان کردوں تو یہ حلق کاٹ دیا جائے۔

اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ——— سینہ تمام داغ داغ، پنبہ کجا کجا نہم۔

اس تزکیہ نفس کے لئے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے حضورؐ نے کوئی باطنی تعلیم نہیں دی وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ (نہ ہی یہ آپ کے شایانِ شان تھا) حضورؐ نے ایک ایسا جماعتی نظام قائم کیا تھا جس میں احکام قرآن پر اس نہج و انداز سے عمل ہوتا تھا کہ ان اعمال کے درخشندہ نتائج واضح اور بین طور پر سامنے آجاتے تھے جس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی تھی کہ یہ احکام زندہ حقائق ہیں، مردہ رسوم نہیں ہیں۔ ان محسوس نتائج سے روح میں بالیدگی اور قلب میں کشادگی پیدا ہوتی تھی۔ اسی کا نام تزکیہ تھا۔ سورۂ بقرہ کے تیسویں رکوع کو دیکھئے۔ طلاق اور عدت کے احکام بیان ہو رہے ہیں اور اس میں کہا یہ جاتا ہے کہ جو شخص ان نصائح پر عمل پیرا ہوگا تو یہ اس کے لئے اَزْكٰى وَاَطْهَرُ ہے۔

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (۲/۲۳۲)

تم میں سے ہر اس انسان کو، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اس حکم کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے! اسی بات میں تمہارے لئے زیادہ بالیدگی اور زیادہ پاکی ہے، اور اللہ جانتا ہے (کہ تمہارے لئے بہتری کی راہ کونسی ہے) مگر تم نہیں جانتے!

سورۂ توبہ میں دیکھئے۔ ہجرت اور جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں فرمایا۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ

ل ان امور کا ذکر جلد سوم۔ عنوان بنی اسرائیل قصۂ خضر میں بھی ہو چکا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے ان کا تکرار روا رکھا گیا ہے۔

اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۹/۱۰۳)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں کے مال سے صدقات قبول کرلو تم قبول کرکے انھیں (بخل وطمع کی برائیوں سے) پاک اور برومند کردوگے۔ نیز ان کے لئے دعائے خیر کرو۔ بلاشبہ تمہاری دعا اُن کے دلوں کے لئے راحت وسکون ہے۔ اور اللہ (دعائیں) سننے والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے!

غور کیا آپ نے کہ یہ "تزکیۂ قلوب" کس طرح ہوتا تھا؟ انفاق کے متعلق دوسری جگہ ہے۔

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ (۹۲/۱۸)

وہ (تقویٰ شعار) جو نفس انسان کی بالیدگی کے لئے (خدا کی راہ میں) مال دیتا ہے!

سورۂ نور میں دیکھئے۔ عام معاشرتی آداب واطوار کا بیان ہے، اس ضمن میں فرمایا۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (۲۴/۲۸)

پھر (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) اگر تم ان گھروں میں کسی کو (موجود) نہ پاؤ تو ان میں اندر نہ چلے جایا کرو تاآنکہ تمہیں اس کی اجازت دیدی جائے اور اگر تم سے کہدیا جائے کہ واپس ہوجاؤ (اس وقت ملاقات کرنے کی فرصت نہیں ہے) تو واپس چلے جایا کرو۔ کیونکہ یہی تمہارے واسطے بڑے تزکیہ کی بات ہے۔ اور (یاد رکھو) جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو (خوب خوب) جاننے والا ہے!

سورۂ نازعات میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف گئے تو اس سے کہا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے تزکیہ کی راہ بتاؤں؟

هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ (۷۹/۱۸)

تو کیا تجھے اس کی طرف رغبت ہے کہ تو تزکیہ حاصل کرلے؟

ان تمام مقاماتؔ[۱] پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کہیں کوئی راز اور "معرفت" کی بات ہے؟ کوئی ایسا "عمل" ہے جسے کھلے بندوں بیان نہ کیا جائے بلکہ چپکے چپکے کان میں کہدیا جائے؟ کوئی ایسا پوشیدہ راستہ ہے جو ہر شخص کو نہ بتایا جائے؟ کوئی ایسا مخفی "برتن" ہے جسے اگر لوگوں کے سامنے کھولدیا جائے تو وہ گلا کاٹ دیں؟ کوئی ایسا "چور دروازہ" ہے جس کا صرف برگزیدانِ راز ہی کو علم ہو؟ کوئی ایسی باطنی تعلیم ہے جو صرف "خواص" تک ہی محدود ہو؟

---

[۱] تزکیہ کے متعلق نیز دیکھئے ۲/۱۷۴ ؛ ۳/۲۷ ؛ ۴/۴۹ ؛ ۲/۲۷ ؛ ۲۴/۲۱ ؛ ۳۵/۱۸ ؛ ۵۳/۳۲ ؛ ۸۰/۳، ۷ ؛ ۸۷/۱۴ ۔

اس تعلیم و تزکیہ کے لئے نظام صلوٰۃ کا قیام سب سے عظیم اور بنیادی مرحلہ تھا۔ حضرات انبیاء سابقہ کے تذکار جلیلہ پر ایک نگاہ پھر ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اقامت صلوٰۃ کا حکم ہر جگہ دیا گیا۔ یہی حکم نبی اکرمؐ کے لئے آیا

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۝ (۲۰/۱۳۲)

اور (اے پیغمبر!) اپنے گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دے، اور اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جا۔

نظامِ صلوٰۃ

یہ نظام صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کی تشریح و تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ یہ نظام، اس بڑے نظام قرآنی کی ایک مختصر صورت (MINIATURE FORM) ہے جو تمام سلسلۂ رشد و ہدایت کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ صلوٰۃ کے نظام صغریٰ میں یہ نظام کبریٰ اس طرح جھلمل جھلمل کر رہا ہے جس طرح قطرۂ شبنم میں خاور درخشندہ ضیا، بار ہو۔ آپ کہیں گے (اور میں کہتا ہوں کہ آپ ایسا کہنے میں حق بجانب ہیں) کہ آج بھی تو مسلمان نمازیں پڑھتا ہے پھر اسکی نمازوں سے وہ نظام قرآنی کیوں مرتب نہیں ہوتا؟ اس کے اعمال کے موعودہ نتائج سامنے کیوں نہیں آتے؟ لیکن غور کیجئے کہ قرآن کریم نے "نماز پڑھنے" کے لئے نہیں کہا۔ قیام صلوٰۃ۔ یعنی نماز کے نظام (INSTITUTION) کے قیام کا حکم دیا ہے۔ مسلمان نمازیں پڑھتے ضرور ہیں لیکن انھوں نے نظام صلوٰۃ کو قائم نہیں کیا۔ ان کی نماز، ایک وقت معینہ کے لئے، ایک عمارت (مسجد) کی چار دیواری کے اندر، ایک عارضی عمل بن کر رہجاتی ہے، ان کی زندگی کی پوری فضا پر نہیں پھیلتی۔ ان کے ہاں امام کی اطاعت، سلام پھیرنے تک محدود ہو چکی ہے باقی ساری زندگی "صلوٰۃ بے امام" ہے۔ ان کی "جماعت" مسجد میں چند افراد کا ایک صف میں کھڑا ہو جانا ہے۔ ساری ملت کی زندگی جماعتی نہیں ہے، انفرادی ہے۔ ان کے نزدیک نمازیوں کا دوش بدوش کھڑے ہونا دو رکعتوں تک محدود ہے۔ مصاف زندگی میں کوئی ایک دوسرے کے ساتھ صف بستہ کھڑا نہیں ہوتا۔ ان کا اللہ اکبر کا اقرار، نماز کی نیت یا رکوع و سجود کی حرکات کے لئے اشارہ بنکر رہ گیا ہے۔ عملی زندگی میں اس حقیقت کبریٰ کا اعلان نہیں ہے کہ خدا سے بڑھ کر دنیا میں کوئی حکم (Autonomy) نہیں ہے۔ جب صلوٰۃ پڑھی ہی نہ جائے بلکہ قائم کی جائے تو وہ زندگی کے ہر گوشے میں منعکس اور معاملات کے ہر گوشے میں مرتسم ہوتی ہے اور اس طرح وہ نظام صغریٰ جو سمٹا کر زمان و مکان کی حدود میں ایک چھوٹے سے پیمانہ پر قائم کیا گیا ہے۔ پھیل کر زمین کے آخری کناروں تک جا پہنچا ہے اور اس طرح اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ "مومن کے لئے تمام کرۂ ارض مسجد بنایا گیا ہے" (حدیث)۔ یہ ہے عمل کی وہ صورت جس سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے مسلمانوں کی نگاہوں سے جب یہ حقیقت اوجھل ہوگئی اور قرآنی شعائر و عبادات، انفرادی

رسوم بن کر رہ گئے تو ظاہر ہے کہ وہ درخت کی خشک ٹہنی کی طرح بے ثمر ہو کر رہ گئے (شاخ کی بارآوری کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ درخت کے نظام کے ساتھ وابستہ ہو) اب نہ ان اعمال سے روح میں کشادگی پیدا ہوتی تھی نہ قلب میں بالیدگی (تزکیہ) ان رسوم کی ادائیگی محض اس لئے کی جاتی تھی کہ یہ "خدا کے احکام ہیں۔ "تزکیۂ نفس" کے لئے یونانی درسگاہوں اور ایرانی آتشکدوں کا رخ کیا اور وہاں سے ایسی ریاضتیں اور چلّے مستعار لئے جن سے قوت ارادی میں اضافہ ہو جائے۔ اس کا نام رکھ لیا گیا "تزکیۂ نفس" اور یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ "یُزَكِّيْكُمْ" سے یہی مفہوم ہے لہذا یہ قرآن وسنت کا اتباع ہے لیکن قوت ارادی کا نام تزکیۂ نفس رکھ لینے سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی (تِلْكَ) اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۱۲/۴۰) حالانکہ نہ یہ قرآن تھا نہ سنت۔ سنت نام ہے قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کا۔ حضورؐ خود قرآن کا اتباع کرتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷/۲۰۳)

(اے پیغمبر!) کہدو کہ میں صرف اس (ہدایت) کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پروردگار کیطرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے

اور قرآن ہی کی اطاعت کا حکم جماعت مؤمنین کے لئے تھا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو۔ اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

اس لئے حضورؐ قرآن ہی کی تعلیم دیتے تھے اور اسی پر عمل کراتے تھے تاکہ اس سے قلوب میں وہ ایقانی کیفیت پیدا ہو جائے جسے قرآن نے تزکیہ کہا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک مریض کسی طبیب سے

قرآن کی اطاعت

نسخہ لیتا ہے اور اس نسخہ کے اجزاء کے خواص واثرات پر غور وفکر کرتا ہے اس کے بعد اوزان کے تناسب کے متعلق تدبر وتفحص کرتا ہے اور تمام غور و خوض اور کد وکاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نسخہ ہر اعتبار سے لاجواب ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے وہ طبیب کی حذاقت کا ذہنی طور پر قائل ہو جائیگا۔ نہ اس سے اس کے قلب پر کوئی اثر مرتب ہوگا۔ اور نہ ہی اس غور وفکر اور تدبر وتفحص سے اُسے شفا ہی حاصل ہوگی۔ اس کے برعکس ایک دوسرا مریض ہے جو نسخہ لیتا ہے اور بلا کد وکاوش، طبیب کی ہدایت کے مطابق اس کا استعمال شروع کر دیتا ہے جس سے اُسے شفا حاصل ہو جاتی ہے۔ طبیب کی حذاقت پر اس مریض کا یقین اعماق قلب سے اُبھرے گا۔ ایک تیسرا

مریض ہے جو نسخہ پر غور و فکر سے اس کی اصابت و موزونیت کا بھی قائل ہوتا ہے اور اس کے بعد اسکے استعمال سے شفا بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ دل اور دماغ دونوں کی رو سے طبیب کی حذاقت کا قائل ہوگا۔

صرف علم

اول الذکر طریق تعلیم و تعلم کا ہے، جس سے ذہنی بصیرت تو حاصل ہوتی ہے قلبی ایقان نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تنہا علم کوئی انقلاب پیدا کرسکتا نہ ہی حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچا سکتا ہے۔

تو عرب ہو یا عجم ہو۔ ترا لا الٰہ الا + حرف غریب، جبتک ترا دل نہ دے گواہی

تنہا عمل

دوسرا طریق ایمان بالغیب کا ہے جس میں نتائج اعمال سے قلبی یقین و سکون کی کیفیت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ یقین و ایمان تنہا علم سے ہزار درجہ بہتر ہوتا ہے۔

یقین سادہ دلاں بہ، ز نکتہ ہائے دقیق

لیکن اس سے انسان اس عمل کی حقانیت کو دوسروں پر علی وجہ البصیرت واضح نہیں کرسکتا۔

لیکن تیسرا طریق تعلیم و تزکیہ کا ہے جس میں علم و آگہی سے ذہنی جلاء اور سعی و عمل سے قلبی انتعاش پیدا

اور علم و عمل دونوں

ہوتا ہے۔ یہ قرآنی طریق تربیت ہے جس کا ماحصل مردِ مومن ہوتا ہے۔ وہ مومن جس میں "تجلیات کلیم اور مشاہدات حکیم ہم کنار" ہوتے ہیں۔ اس کا علم دل و نظر کا ندیم" اور اس کا عمل "بتکدۂ دہر کا براہیم" ہوتا ہے۔ وہ مردِ مومن جس کے متعلق کہا گیا ہے۔

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز درون

اور جن کا تعارف قرآن ان الفاظ سے کراتا ہے کہ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (۳/۱۹۰-۱۹۱)

بلاشبہ آسمان اور زمین کی خلقت میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک، آتے رہنے میں ارباب دانش (مومنین) کے لئے (معرفت حق کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں!

وہ ارباب دانش، جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوئے ہوں (ہر حال میں اللہ کی یاد ان کے اندر بسی ہوتی ہے) اور جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان

وزمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں (اس ذکر و فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان پر معرفت حقیقت کا دروازہ کھل جاتا ہے ——— وہ پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ جو تو نے پیدا کیا ہے سو بلاشبہ بیکار و عبث نہیں پیدا کیا ہے (ضروری ہے کہ یہ کارخانۂ ہستی جو اس حکمت و خوبی کے ساتھ بنایا گیا ہے، کوئی نہ کوئی مقصد و غایت بھی رکھتا ہو) یقیناً تیری ذات اس سے پاک ہے کہ ایک فعل عبث اس سے صادر ہو! خدایا! ہمیں عذاب آتش سے (جو دوسری زندگی میں پیش آنے والا ہے)، بچا لیجیو!

اس دانش و بینش اور علم و بصیرت کے ساتھ ایمان کا یہ عالم کہ

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

(۳: ۱۹۳-۱۹۴)

خدایا! ہم نے ایک منادی کرنے والے کی منادی سنی، جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ" تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لے آئے۔ پس خدایا! ہمارے گناہ بخش دے، ہماری برائیاں مٹا دے، اور (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو! خدایا! ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی وعدہ فرمایا ہے، اور (اپنے لطف و کرم سے) ایسا کر کہ قیامت کے دن ہمیں تیرے حکم کی ذلت و خواری نصیب نہ ہو! بلاشبہ تو ہی ہے کہ تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہو سکتا!

اور اس کا نتیجہ۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (۳: ۱۹۵)

(جب ارباب دانش کے فکر و عمل کی صدائیں یہ تھیں) تو ان کے پروردگار نے بھی ان کی دعائیں قبول کریں (خدا نے فرمایا) بلاشبہ میں کبھی کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ مرد ہو خواہ عورت۔ تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو (اور عمل کے نتائج کا قانون سب کے لئے یکساں ہے) پس (دیکھو) جن لوگوں نے

(راہِ حق میں) ہجرت کی، اپنے گھروں سے نکالے گئے، میری راہ میں ستائے گئے، اور پھر (راہِ حق میں) لڑے اور قتل ہوئے، تو (اُن کے یہ اعمالِ حق کبھی رائیگاں جانے والے نہیں یقینی ہے کہ میں ان کی خطاؤں کو محو کر دوں، اور انھیں (نعیمِ ابدی کے) باغوں میں پہنچا دوں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں (اور اس لئے ان کی شادابی کبھی متغیر ہونے والی نہیں) یہ اللہ کی طرف سے ان کے اعمال کا ثواب ہوگا، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس (جزاءِ عمل میں) بہتر ثواب ہے!

جماعتِ حقہ یہ تھی اربابِ علم و دانش اور صاحبانِ ایمان و ایقان کی وہ جماعت جس کی تشکیل حضورؐ کے پیشِ نظر تھی۔ وہ جماعت کہ دن بھر اس دعوتِ انقلاب کی تبلیغ و تعمیم میں مصروفِ سعی و عمل رہتے اور راتوں کی تنہائیوں میں اپنے معلّمؐ و امامؐ سے کشور کشائی و جہانبانی کے رموز و اسرار سیکھتے، تبتّل و انابت الی اللہ کے طور و طریق معلوم کرتے اور باہمی توصیۂ حق و استقامت کی ممارست و مداومت سے حقیقی روابط و ضوابط کی تاسیس و تعمیر عمل میں لاتے۔ یہی تھی وہ جماعت جس کے متعلق سورۂ مزمّل میں فرمایا کہ

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ

---

۵ وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ؕ (۱۰۳-۳)

زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ درحقیقت انسان نقصان ہی نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو (دعوتِ حق پر) یقین لے آئے، اور جنھوں نے نیک کام کئے اور (ساتھ ہی) باہمی ایک دوسرے کو حق اور استقامت (علی الحق) کی نصیحت کرتے رہے۔ (کہ زندگی سے اگر کچھ فائدہ حاصل کرتے ہیں تو صرف یہی لوگ کرتے ہیں!)

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ؕ (۳-۲۰۰)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! (اگر کامیابی و سعادت حاصل کرنی چاہتے ہو، تو ساری باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ حق کے اوپر جمے رہو۔ ایک دوسرے کو استقامت علی الحق کی ترغیب دو، ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاؤ، اور اپنے آپ کو (قانونِ خداوندی کی) حفاظت میں لے آؤ تاکہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو!

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۭ عَلِمَ
اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ
مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا مَا
تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا
حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا
وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۰)

(اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم اور ساتھ ہی اُن (پیروانِ دعوتِ حق) کی ایک جماعت جو تمہارے ساتھ (ایمان لائے) ہیں (اکثر) دو تہائی رات تک، اور (کبھی) آدھی رات تک اور (کبھی کبھی) ایک تہائی رات تک (اپنے پروردگار کے حضور میں) کھڑے رہتے ہیں اور (ظاہر ہے کہ) اللہ ہی دن اور رات کا اندازہ مقرر کرتا ہے (لہٰذا اس کو تمہارے قیام کی معتدار ٹھیک ٹھیک معلوم ہے) ساتھ ہی خدا یہ بھی جانتا ہے کہ تم اس کو نبھا نہیں سکو گے لہٰذا اس نے تم پر (اپنی آسانی کے ساتھ) توجہ فرمائی چنانچہ (آئندہ کے لئے یہ حکم دیا کہ رات کو) جتنا آسانی سے ہو سکا کرے قرآن پڑھ لیا کرو۔ (کیونکہ) اُسے معلوم ہے کہ آگے چلکر تم میں کچھ لوگ بیمار بھی ہوں گے، کچھ ایسے بھی ہوں گے کہ وہ زمین میں سفر کریں گے (تاکہ) اللہ کا فضل (روزی) حاصل کرسکیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ (کے مقرر فرمودہ نظام زندگی) کی راہ میں جہاد کریں گے (اور ان مشاغل کی وجہ سے روزانہ اتنی فرصت مل جانا ممکن نہیں ہوگا) لہٰذا آئندہ سے وقت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ) جس قدر سہولت سے ہو سکا کرے (رات کو نماز میں) قرآن پڑھ لیا کرو! اور نماز (کے نظام) کو قائم رکھو، زکوٰۃ دو، نیز (زکوٰۃ کے علاوہ بھی) اللہ (کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اگر ضرورت پڑے تو مرکز) کو قرض حسنہ بھی دیا کرو۔ اور (خوب ذہن نشین کرلو کہ) جو کچھ مال تم اپنی جانوں کے واسطے آگے بھیجو گے (وہ ضائع نہیں جائے گا) اُسے خدا کے پاس (اجر و مکافات کی صورت میں محفوظ) پالو گے اور وہ نہایت ہی بہتر اور بہت بڑا بدلہ ہوگا۔ اور (اپنی کوتاہیوں سے جو بلا ارادہ بھی اکثر سرزد ہوتی رہتی ہیں) خدا سے بخشش طلب کرتے رہا کرو۔ بلاشبہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے!

جماعت کے افراد کا باہمی تعلق بھائیوں کا سا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ (۴۹/۱۰ بیز ۳۳/۵ ز ۵۹/۱)

(اے پیروانِ دعوت ایمانی! یاد رکھو، کہ) تمام پیروانِ دعوت ایمانی (آپس میں) بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان (ہمیشہ) صلح وصفائی رکھو (باہمی رنجشوں اور اختلافات کو راہ نہ دو) اور خود کو خدا کی حفاظت میں دیدو۔ اس طرح توقع ہے کہ تم پر (خدا کی طرف سے) مہربانی کی جائے گی (اور خلافت ارضی کے مستحق قرار پاؤگے!)

اور امام کا تعلق جماعت سے ایک مشفق غمگسار اور دلسوز رفیق کا۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (۹/۱۲۸)

(اے افرادِ نسل انسانی!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہارا رنج وکلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گذرتا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ اور (خصوصیت کے ساتھ) مؤمنوں کے لئے تو بڑا ہی شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے!

مخالفت کے تلاطم اور نامساعدتِ حالات کے طوفان میں۔ یہ مختصر سی جماعت اس صبر وسکون سے بڑھ رہی تھی جیسے سیپ میں موتی، جو موجوں کے تھپیڑوں سے بے نیاز، بخود خزیدہ، اپنی خودی کو پختہ تر کئے چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، شروع شروع میں اس جماعت کی اکثریت غریبوں اور ناداروں

جماعت کی توسیع

پر مشتمل تھی لیکن رفتہ رفتہ اوپر کا طبقہ بھی اس دعوت سے متأثر ہونے لگا۔ حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ ۶ سنہ نبوی میں اسلام لے آئے۔ قریش میں انکی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ اس کے دو ہی چار روز بعد حضرت عمرؓ بھی اس جماعت حقہ میں شامل ہوگئے۔ اسلام لانے سے بیشتر، حضرت عمرؓ، ایمان لانے والوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ آپ کے قبیلہ بلکہ خاندان میں نیّر اسلام کی کرنیں پہنچ چکی تھیں آپ کی بہن (فاطمہؓ) اور بہنوئی (سعیدؓ) دونوں مسلمان ہوچکے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی کنیز (لبینہؓ) بھی اس سعادت سے مشرف ہوچکی تھیں۔ حضرت عمرؓ، لبینہؓ کو بے تحاشا مارا کرتے تھے۔ دیگر افراد خاندان سے بھی اسی قسم کا سلوک کرتے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنا عقیدہ نہ بدلا۔ تنگ آکر یہ فیصلہ کیا کہ خود نبی اکرمؐ کو قتل کردیا جائے تاکہ یہ روز روز کا قصہ ختم ہو۔

تلوار لیکر سیدھے حضورؐ کی طرف چلے۔ راستہ میں آپ کا ایک عزیز ملا۔ آپ کے تیور دیکھکر بولا خیر ہے؟ کہا کہ اس کام کے لئے جا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہارے بہن اور بہنوئی دونوں اسلام لا چکے ہیں۔ وفور غضب سے بے تاب ہو کر پلٹے اور بہن کے گھر پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ بھائی کی آہٹ پاکر چپ ہوگئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لئے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہی تھیں؟ انھوں نے کہا کہ کچھ نہیں۔ بولے مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو۔ یہ کہا اور بہنوئی کو گلے سے پکڑ لیا۔ بہن چھڑانے کے لئے آگے بڑھیں تو ان کو بھی لہولہان کر دیا۔ بہن نے کہا کہ "عمر! جو جی میں آئے کر لو۔ لیکن قرآن اب دل میں اتر چکا ہے۔ وہ وہاں سے نہیں نکل سکتا"۔ نہ معلوم وہ کونسی سعادت مند گھڑی تھی جب بہن نے یہ ایمان افزا الفاظ کہے کہ یہ سیدھے حضرت عمرؓ کے دل تک اتر گئے اور وہ چٹان جو دنیا کے کسی حادثہ سے متاثر نہیں ہوا کرتی تھی پھوٹ کر بہنے لگی۔

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (۲/۷۴)

یہ واقعہ ہے کہ پتھروں میں بعض پتھر ایسے بھی ہیں، جن میں سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اور ان پتھروں میں ایسی چٹانیں بھی ہیں جو شق ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں اور ان میں سے پانی اپنی راہ نکال لیتا ہے، اور پھر انہی میں وہ چٹانیں بھی ہیں جو خوف الٰہی سے (لرز کر) گر پڑتی ہیں!

حضرت عمرؓ کا ایمان

دل پگھل گیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بہن سے کہا کہ جو کچھ تم پڑھ رہی تھیں مجھے بھی سناؤ بہن قرآن کے اجزاء اٹھا لائیں اور پڑھا کہ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۱)

زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے، ہر چیز اللہ کے مقرر کردہ فریضہ کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔

بہن سورۂ حدید کی آیات کی تلاوت کرتی جاتی تھیں اور حضرت عمرؓ کی دل کی دنیا میں انقلاب آتا جا رہا تھا حتّٰی کہ جب وہ اس آیت پر پہنچیں کہ

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...... (۵۷/۷)

(اے افراد نسل انسانی!) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ . . . .

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ یہاں سے اٹھے تو سیدھے بارگاہ رسالت میں پہنچے۔ حضورؐ اپنی ننھی سی جماعت کے ساتھ حضرت ارقمؓ کے مکان میں پناہ گزیں تھے۔ دستک پر دروازہ کھلا تو صحابہؓ نے دیکھا کہ باہر عمرؓ ہیں۔ جو تلوار گھر سے لیکر چلے تھے وہ اسی طرح گلے میں

حائل ہورہی تھی۔ نبی اکرمؐ خود آگے بڑھے اور حضرت عمرؓ کا دامن پکڑ کر فرمایا! "کیوں عمر! کس ارادے سے آئے ہو؟" جھکی ہوئی نظروں اور بھرائی ہوئی آواز سے کہا کہ ایمان لانے کے لئے۔

اللہ اکبر! عمر، کہ جس کے دبدبے سے پہاڑوں کے دل دہلتے تھے۔ قرآن کی چند آیتوں سے کیا سے کیا ہو گئے۔ رسول اکرمؐ نے سُنا تو بلاساختہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ پکار اٹھے کہ خدا کی بڑائی اور کبریائی کا زندہ مظاہرہ سامنے تھا۔ اس کے ساتھ ہی صحابہؓ نے اس زور سے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہا کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے جماعت میں خاص تقویت آگئی۔ ظاہر ہے کہ قریش نے اس تبدیلی کا کتنی سختی سے مقابلہ کیا ہوگا لیکن عمر(رض) تو وہ پہاڑ تھا کہ حوادث زمانہ کی موج اس سے آکر ٹکرائے۔ اپنا سر پھوڑ کر واپس جائے۔ آپ نے اس مخالفت کا اس شدت سے مقابلہ کیا کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ حرم کعبہ میں جاکر نماز ادا کی۔

اس زمانہ میں وسائل نشر و اشاعت اور ذرائع رسل و رسائل کی فراوانی ایسی نہ تھی جیسی آجکل ہے۔ بلکہ اگر آج کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو ان ذرائع و وسائل کی کمی کیا، فقدان تھا۔ اس لئے کسی تحریک کے اغراض و مقاصد کے عام کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ انفرادی طور پر دُعات و نُقباء کو مختلف اطراف و انواح میں بھیجا جائے یا لوگوں کی اجتماعی تقاریب سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مکہ میں یہ دوسری صورت زیادہ موزوں تھی۔ اس لئے کہ تمام قبائل عرب حج کے موقعہ پر مکہ میں جمع ہوجاتے تھے۔ داعیانِ انقلاب اسلام کی یہ مختصر سی جماعت اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتی اور اگرچہ قریش کی مخالفت کی شدت ان دنوں اور بھی بڑھ جاتی

حج کے موقعہ پر دعوت

لیکن، بایں ہمہ، یہ سرشارانِ کیفِ حق و صداقت، خطرات و صعوبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، این و آن سے بے نیاز، اس دعوتِ انقلاب کی نشر و اشاعت میں منہمک نظر آتے۔ اس طرح نیّرِ اسلام کی تابندہ شعاعیں مکہ سے باہر تک بھی پھیل گئیں۔ اگرچہ اس دعوت پر مختلف قبائل و قریات کے افراد نے لبیک کہا لیکن اس شجر مقدس کی باریابی کے لئے جو زمین سب سے زیادہ سازگار نکلی وہ ارضِ یثرب تھی۔

یثرب کا شہر (جو بعد میں مدینۃ النبی کے ممتاز لقب سے باعث فروغ نورِ دیدۂ عالمیان ہوا۔ اور پھر مختصر ہو کر مدینہ کے نام سے وجہ تسکینِ خواطرِ انام) ایک قدیمی بستی تھی جہاں یہودی ایک مدت سے آباد تھے۔ جب یمن میں مشہور سیلاب

مدینہ کے باشندے

آیا ہے تو وہاں کے کچھ لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ ان میں سے اوس اور خزرج دو بھائی مشہور سردار تھے۔ انہی دو کے نام سے دو خاندانوں کی بنیاد پڑی۔ یہودیوں کے علاوہ یثرب کی آبادی انہی دو خاندانوں پر مشتمل تھی اور یہی وہ دو فرخندہ اختر قبائل تھے جو آسمانِ سعادت و رشادت پر انصار کے درخشندہ ستارے بنکر چمکے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ وَذٰلِکَ ھُوَالْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

یہودی وہاں اثر و اقتدار بھی رکھتے اور تھے انصار کے مقابلہ میں علم و دانش بھی زیادہ۔

اس لئے انصار پر ان کا اچھا خاصا اثر تھا۔ یہ یہودیوں سے انبیائے سابقہ کے قصے کہانیاں بھی سنتے رہتے تھے اور یہودی عقیدہ کے مطابق ایک آنے والے پیغمبر کے نام سے بھی آشنا تھے۔ یہ لوگ بھی حج کے موقعہ پر مکہ آتے تھے۔ سنہ نبوی میں جب یہ لوگ حج کے لئے آئے تو نبی اکرمؐ نے قبیلۂ خزرج کے کچھ لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی۔ ان میں سے چھ حضرات نے ایک ساتھ اسلام قبول کرلیا۔ دوسرے سال بارہ حضرات یثرب سے آئے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ کوئی معلم ان کے ساتھ بھیجدیا جائے جو انھیں اسلامی احکام کی تعلیم دے۔ حضورؐ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ روانہ فرمادیا۔ انکی تبلیغ سے گھر گھر اسلام کا چرچا ہوگیا۔ اگلے سال حج کے زمانہ میں بہتر آدمی مکہ میں آئے اور حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی جب یہ لوگ بیعت کررہے تھے تو سعد بن زرارہ نے کھڑے ہوکر کہا کہ "بھائیو! یہ بھی خبر ہے کہ کس

بیعت کا مفہوم!

چیز پر بیعت کررہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن و انس سے اعلانِ جنگ ہے۔" سب نے کہا کہ ہاں! ہم اسی پر بیعت کررہے ہیں!! عرب و عجم اور جن و انس سے اعلانِ جنگ ہے۔" اللہ اکبر! یہ حضرات اسلام کی حقیقت کو کیسا صحیح سمجھے تھے! "دنیا کی ہر طاغوتی قوت کے خلاف اعلانِ جنگ" یہ تھا حقیقی اسلام! اور آج! —— باطل کی ہر قوت کے سامنے جھک جانا اور اسی کی عطا فرمودہ "آزادی" کی حدود میں چند رسموں کا ادا کرلینا —— یہ ہے آج کا اسلام۔

اس طرح یہ سلسلۂ رشد و ہدایت آہستہ آہستہ بتدریج آگے بڑھتا گیا۔ نہایت خاموشی سے جیسے چاندنی کی نورانی چادر فرشِ صحرا پر بچھتی جائے۔ یا نسرین و یاسمن کی شمیم جاں نواز، نسیم صبحگاہی کے غیر محسوس جھونکوں کے ساتھ فضائے عالم کو معطر کرتی جائے

آہستہ آہستہ! بتدریج!!

بتدریج

اس تمہید میں پورا تیرہ ۱۳ برس کا عرصہ صرف ہوگیا۔ ذرا غور کیجئے کہ حضورؐ کی نبوت کی کل عمر تیئیس ۲۳ برس کی تھی۔ اور یہ نبوت تمام نوع انسانی کے لئے۔ قیامت تک کے لئے جاری و ساری رہنی تھی۔ اس تیئیس برس کی مدت کو قیامت تک پھیلا کر دیکھئے۔ ایک ایک سانس ایک ایک صدی کے برابر دکھائی دے گا۔ یا شاید اس سے بھی زائد۔ اتنا گراں قیمت وقت اور اس میں سے نصف سے

زیادہ (یعنی تیرہ برس) اسی تمہید میں صرف ہوگیا۔ اور اس تیرہ برس کی تگ و تاز اور سعی و کاوش کا ماحصل؟ زیادہ سے زیادہ تین سو افراد کی جماعت! عام پیمانوں سے ناپئے تو نتائج کی یہ رفتار کسی تحریک کے لئے کامیاب قرار نہیں دی جائے گی لیکن جن کی نگاہیں حقائق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ باقی دس برس کے سارے نتائج جو آج تک ہر مورخ کو محو حیرت کئے ہوئے ہیں۔ انہی تیرہ برس کی "سست رفتار" کے پیدا کردہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح داعیٔ انقلاب کی نگاہ اپنی جماعت کے اعداد و شمار پر نہیں ہوتی بلکہ افرادِ جماعت کے دل و دماغ پر ہوتی ہے۔ وہ افرادِ جماعت کو گنتا نہیں۔ تولتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک ہیرا۔ کوئلہ کے ہزاروں من ڈھیر پر بھی وزنی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کوئلے (CARBON) کو ہیرے میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئلے کے انبار جمع کرنے کی نہیں۔ اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ کوئلے کو ہیرا بننے کے لئے کتنی مدت درکار ہوتی ہے۔ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی نگہ گرم سے ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو برق تپاں میں تبدیل کر دیتا ہے کہ باطل کے جس انبار پر شعلہ ریز ہوں اسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھدیں وہ انہیں ایمان محکم اور عمل پیہم کے آتشدانوں سے گذار کر ان کی خودی کا استحکام کرتا ہے۔ اور اس طرح ان میں وہ فولادی جوہر پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا ہر نفس شمشیر عریاں بن جاتا ہے۔ لیکن قطرے کو گہر بننے اور آہن خام کو شمشیر جوہر دار میں تبدیل ہونے کے لئے ہزار جگر گداز مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ رسول کی تعلیم و تربیت، افرادِ جماعت کو انہی صبر آزما مراحل سے گذار رہی ہوتی ہے۔ حضورؐ نے تیرہ برس کی مدت میں قدوسیوں کی ایک ایسی ہی جماعت تیار کی جو گنتی میں کچھ نہیں تھی لیکن جس نے دنیا میں وہ انقلاب پیدا کر دیا جسے آسمان کی آنکھوں نے ایک ہی بار دیکھا ہے اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہے۔ سطح بیں نگاہیں اس تیرہ (۱۳) برس اور آنے والے دس (۱۰) برس میں ایک حد فاصل قائم کرتی ہیں اور اس (مکی) زندگی کو نبوت کے جمالی پہلو کا ترجمان بتاتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

مکی اور مدنی زندگی

۔۔۔۔۔۔ اور دوسری (مدنی) زندگی کو جلالی گوشے کا مظہر لیکن یہ مکی اور مدنی کا فرق اور جمالی اور جلالی کا امتیاز مقام نبوت سے بے خبری کی دلیل اور منصب رسالت سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اسی غلط نگہی کا نتیجہ ہے کہ مغرب کے مستشرق حضورؐ کو (معاذ اللہ) ایک (OPOR-TUNIST) ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قیام مکہ میں آپ کی زندگی محض "مذہبی مصلحین" کی سی تھی جس میں آپ کے پیش نظر عربوں کی اخلاقی اصلاح تھی۔ مدینہ میں پہونچکر جب قوت اور جمعیت حاصل ہوگئی تو آپ کو سلطنت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوگیا جس کے لئے لڑائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا[1]۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

جیساکہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ خیال مقامِ نبوت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ ایک رسول کے سامنے یوم بعثت سے ہی ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین ہوتا ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی زندگی کا مقصد۔ اسکی زندگی پہلے دن سے آخری دن تک ایک ہی نصب العین کی طرف منجر اور ایک ہی نظام کی پابند ہوتی ہے فرق صرف اس کے پروگرام کی تقسیم کا ہوتا ہے۔ یعنی کبھی تیاری کا زمانہ ہوتا ہے اور کبھی تیار شدہ اجزاء و عناصر کو بروئے کار لے آنے کا۔ یہ نہیں کہ تیاری کے زمانہ میں اس کا عقیدہ کچھ اور ہوتا ہے اور بعد کے زمانہ میں کچھ اور۔ ایک ماہر فن تعمیر (ARCHITECT) کے پنسل کے پہلے نشان سے لیکر، تیشۂ معمار کی آخری ضرب تک، تمام مراحل، عمارت پیش نظر کی تکمیل ہی کے اجزاء ہوتے ہیں۔ انھیں الگ الگ نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ماہر فن تعمیر (ARCHITECT) عمارت کو صرف ذہنی تصورات یا صفحۂ قرطاس پر چند خطوط و نقوش کی مدد سے تیار کرتا ہے اور معمار شکست و ریخت اور ضرب و حرب سے۔ آرکیٹکٹ کا ذہنی تصور یا پنسل کا نشان، تیشۂ معمار کی ضرب ہی کا ایک جزو ہوتا ہے اور دونوں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں۔ اور اگر بنگاہِ تعمق دیکھئے تو پہلا مرحلہ، جو بظاہر خاموش اور غیر محسوس سا ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے سے بھی زیادہ اہم اور انقلاب در آغوش ہوتا ہے اس لئے کہ عمارت کے نقشہ کا ایک غلط خط، تیشۂ معمار کی تمام ضربات کو نہ صرف بیکار بلکہ بعض اوقات وجۂ تخریب بنا دیتا ہے۔

اس تیرہ برس کے عرصہ میں اس کاروانِ ہدایت و رشادت کا ہر قدم آہستہ آہستہ اس نصب العین کیطرف بڑھ رہا تھا جو پہلے دن سے ان کے لئے معین ہو چکا تھا اور جس تک پہنچنا ان کی زندگی کا منتہیٰ۔ اس وادی میں، اس کاروانِ سعادت کے نقوش قدم کے تابندہ ذرات دیکھنے والی آنکھ سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مسلک حق و صداقت کا تقاضا ہے کہ

بانشہ درویشی در ساز و دمادم زن ۔۔۔ چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

(حاشیہ متعلق صـ۳۳۸) ہندوستان کی گذشتہ سیاسی تحریک کے ابتدائی دور میں تشدد (ہمسا) اور عدم تشدد (اہمسا) کے نظریہ نے اچھی خاصی اہمیت حاصل کرلی تھی اور عدم تشدد کے حامی اپنے عقیدہ کی تائید میں حضورؐ کی مکی زندگی کا مسلک پیش کیا کرتے تھے حضور کی حیات طیبہ میں تشدد اور عدم تشدد کے مسالک کا یہ امتیاز بھی اس غلط نگہی کا نتیجہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ قرآنی نظام ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ نہ وقتی مصالح پر اس لئے اسے تماماً دیکھنا چاہئے نہ کہ جزءً جزءً۔ "اہمسا" بطور عقیدہ مسلمانوں میں بار نہیں پا سکتا۔

ہجرت

اِنّی ذَاھِبٌ اِلیٰ رَبِّی

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است

دعوت و تبلیغ اور نصیحت و تلقین کا وہ سلسلہ جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے، برابر جاری رہا اور وہ فولادی ذرات جو اس ریت کے ڈھیر میں پوشیدہ تھے، اس طرح اڑ اڑ کر اس مقناطیس حق و صداقت سے آ کر ملتے رہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے تمثیلی واقعہ میں پرندے آپ کی آواز پر لبیک لبیک!! کہتے ہوئے دوڑے آئے تھے۔ حتیٰ کہ یہ تمام فولادی ذرات جن میں محض فطری کشش سے اس مرکز ہدایت و رشد کے گرد جمع ہونے کی صلاحیت باقی تھی، جامد پتھر کے ذروں سے الگ ہو گئے۔ تحریک انقلاب آسمانی کا یہ پہلا دور اسی عمل تخلیص و تنقیح اور اپنی جماعت کی تعمیر و تطہیر کے لئے تھا۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۰)

تاکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں انھیں پاک کر دے، اور جو منکرین حق ہیں انھیں یک قلم نیست و نابود کر دے!

اب وہی لوگ باقی رہ گئے جو قوت و دولت کے نشہ میں بدمست، محض بربنائے بغض و عداوت، مخالفت کئے جا رہے تھے۔ تمرد و سرکشی نے ان سے عقل و بصیرت اور دانش و عبرت کی تمام صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ تعصب و جہالت نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے اور انکار و جحود نے ان کے دلوں پر مہریں لگا رکھی تھیں۔ چنانچہ ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ

سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۲/۷)

(اے پیغمبر!) تم انہیں (انکار حق کے نتائج سے) ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ کبھی ماننے والے نہیں (انھوں نے روشنی کیطرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں، اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو آنکھیں بند کرلیتا ہے اسکے لئے تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے۔ پس اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ) اُن کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑگیا ہے (کوئی بات کتنی ہی سچی ہو، سمجھ نہیں سکتے، کوئی آواز کتنی ہی اونچی ہو سن نہیں سکتے، کوئی چیز کتنی ہی روشن ہو، دیکھ نہیں سکتے) سو (جن لوگوں نے اپنا یہ حال بنا لیا ہے، وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔ کامیابی کی جگہ) ان کے لئے عذاب جانکاہ ہے!

جو باقی رہ گئے

یہ وہ لوگ تھے کہ جن کے دل میں نہ حسن عمل کے جزا کی تبشیر و ترغیب کچھ ذوق سعادت اور ولولہ انابت پیدا کرسکتی تھی اور نہ ہی ان کی سرکشی و غوایت کے انجام و عواقب کی تنذیر و ترہیب ان میں جذبۂ تضرع و خشیت کی نمود کرسکتی تھی۔ لہٰذا ان کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہدیا گیا کہ ان کے پیچھے سر کھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر یہ نہیں سنتے تو ان سے اعراض برتئے۔ یہ اسی سلوک کے قابل ہیں۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ (۵۳/۲۹)

تو (اے پیغمبر!) تم بھی ان لوگوں سے اعراض برتو جو ہمارے ذکر سے گردن موڑ کر چلدیتے ہیں اور جو دنیوی زندگی کے سوا کسی اور بات کا ارادہ ہی نہیں کرتے!

اس سے قبل جب ہنوز ان لوگوں سے کچھ توقعات باقی تھیں۔ یہ کہا گیا تھا کہ

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝ (۴۱/۱۳)

پس (اے پیغمبر!) اگر وہ منہ موڑ کر چلدیں تو ان سے کہدو کہ میں نے تمہیں (انکار و بدعملی کے نتیجہ میں) قوم عاد و ثمود والی کڑک کی طرح (خدا کے عذاب کی) ایک کڑک سے ڈرادیا ہے (اور اپنا فرض پورا کردیا ہے۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے!)

اعراض

لیکن اب ان کی طرف سے جب پوری پوری مایوسی ہوگئی تو کہدیا گیا کہ

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۳/۸۹)

پس (اے پیغمبر!) ان سے (اب) درگذر کرو اور کہدو کہ (بس اب میرا) سلام ہے۔ چنانچہ

کچھ عرصہ کے بعد وہ خود ہی جان لیں گے (کہ جو کچھ تم کہتے تھے اس میں کس قدر صداقت تھی!)

اس لئے کہ انھیں حکمت و موعظت کے ہر طریق اور نصیحت و عبرت کے ہر انداز سے سمجھا کر دیکھ لیا۔ نخوت و تکبر انھیں سمجھنے کی طرف مائل ہی نہیں ہونے دیتا۔ اس لئے ان کی ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝ (۵۴/۴-۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے سامنے وہ خبریں بھی آچکی ہیں جن میں کافی تنبیہ موجود تھی اور انتہائی عقل و بصیرت کی باتیں بھی آچکیں مگر ان تمام ڈرانے والی باتوں نے کچھ بھی اثر نہ کیا۔ لہٰذا (اے پیغمبر! اب) تم بھی ان سے اعراض برتو (اور انھیں اس دن کے حوالہ کرو) جس دن پکارنے والا (فرشتہ) انھیں ایک سخت چیز (یعنی عذاب الٰہی) کیطرف پکارے گا! (تب انھیں حقیقت معلوم ہوگی)

رسول کے ذمہ پیغامات خداوندی کا پہنچا دینا ہے۔ دلوں کی حالت کا بدل دینا نہیں۔

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝ (۳/۱۹ نیز ۱۳/۴۰، ۱۶/۸۲)

پھر اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں، تو (اے پیغمبر!) تم کہدو، میرا اور میرے پیرؤں کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دیا ہے۔ اور اہل کتاب اور (عرب کے) اَن پڑھ لوگوں سے پوچھو، تم بھی اللہ (کے قانون) کے آگے جھکتے ہو یا نہیں؟ اگر وہ جھک جائیں تو (سارا جھگڑا ختم ہوگیا، اور) انھوں نے راہ پالی، اگر روگردانی کریں، تو پھر (جن لوگوں کو خدا پرستی ہی سے انکار ہو اور محض تقلید آبائی ہی کو دینداری سمجھ رہے ہوں، ان کے لئے دلیل و موعظت کیا سود مند ہو سکتی ہے؟ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنا کام کئے جاؤ) تمہارے ذمہ جو کچھ ہے وہ پیام حق پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے حال سے غافل نہیں وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے!

آپ ان پر داروغہ نہیں مقرر کئے گئے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنسَانَ كَفُورٌ ۝ (۴۲/۴۸ نیز ۶/۱۰۸، ۴/۸۰)

لہٰذا (اے پیغمبر!) اگروہ اعراض برتیں (تو پرواہ نہ کرو) ہم نے تمہیں ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔ تمھارے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پیغام حق کو ان تک پہنچا دو۔ یہ واقعہ ہے کہ جب ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت (وشفقت کا مزہ) چکھاتے ہیں تو خوش ہو جاتا ہے (اور اتنا خوش ہوتا ہے کہ بدیہی باتوں سے بھی غافل ہو جاتا ہے) اور اگر انھیں خود اپنے ہاتھوں کئے ہوئے اعمال کی بدولت کسی برائی سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو پھر تو انسان ناشکرا ہے ہی (اس کے بعد اس سے راہ حق کی طرف آنے کی توقع کرنا عبث !)

اس لئے آپ پر اس اعراض سے کوئی ملامت نہیں آسکتی۔ آپ نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ (۵۱/۵۴)

لہٰذا (اے پیغمبر!) تم ان سے (آئندہ) اعراض برتو۔ چنانچہ تم (اس کی وجہ سے) کسی ملامت کے مستحق نہیں ٹھہرو گے !

نبی اکرمؐ ان شوریدہ بختوں کی فلاح وسعادت کی فکر میں جس طرح اپنی جان گھلا رہے تھے اس کا تفصیلی ذکر سابقہ عنوان میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ ایک مشفق طبیب کی طرح آپ شقاوت وقساوت قلبی کے ان مریضوں کی صحت یابی کی فکر میں دن رات غلطاں وپیچاں رہتے۔ ادائیگی فرض کے احساس

جوش تبلیغ اور شدت غمگساری

جوش تبلیغ کے انہماک اور ان لوگوں کو ہلاکت اور تباہی سے بچانے کی فکر کے ہیجان میں آپ جادۂ اعتدال سے بھی آگے بڑھ جاتے جہاں اس علام الغیوب اور واقف اسرار وبطون قلوب کو اپنے دست تادیب سے حضورؐ کو روکنا پڑتا۔ اس لئے کہ حضورؐ دلوں کے حالات سے واقف نہیں تھے۔ آپ کی نگاہ صرف ظواہر تک محدود تھی اس لئے آپ ان لوگوں کی انتہائی مخالفت ومعاندت کے باوجود ان کی طرف سے اپنی امیدیں منقطع نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ خیال کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی بدبختیوں کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جائے

اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا كَسَبَتۡ (۶/۷۰)

کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے !

آپ کو دعوت وتبلیغ کی راہ میں آگے ہی آگے بڑھائے جاتا تھا۔ اس لئے کہ آپ انسانی زندگی کی قیمت سے آگاہ تھے۔ آپ کو خوب معلوم تھا کہ ایک انسان کو ہلاکت سے بچا لینا گویا تمام نوع انسانی کو ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔

وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا (۵/۳۲)

اور جس کسی نے کسی کی زندگی بچالی، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دیدی[1]۔

اس لئے وفور رافت و محبت، نوع انسانی سے جوش ہمدردی و غمگساری میں آپ کسی مقام پر نہیں رکتے تھے لیکن خدائے علیم و خبیر کی نگاہِ لطیف ظواہر سے نیچے اتر کر دل کی گہرائیوں تک پہنچتی تھی اور جانتی تھی کہ جن لوگوں میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ان کے بچانے کی فکر میں سعی و عمل محض تضیع اوقات ہے۔ اور چونکہ ایک رسول، اور بالخصوص رسول خاتم النبیین کی حیات مقدسہ کا ایک ایک لمحہ نہایت گراں بہا اور عظیم القدر ہوتا ہے اس لئے ایسے قیمتی وقت کو یوں ضائع نہیں ہونے دیا جاسکتا۔ یہ ہے علت، اعراض کے حکم کی۔ اس سے مقصود

اعراض کیوں؟

یہ ہے کہ آپ اب ان لوگوں کا خیال چھوڑ دیجئے جو کسی بات کو سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں اور یہی وقت اپنی جماعت کی تنظیم و ترتیب اور تزکیہ و تطہیر میں صرف کیجئے کہ اس کے بعد کا سارا پروگرام انہی کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچنا ہے۔

سورۂ عبس پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اسی حقیقت کو کیسے مؤثر اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نبی اکرمؐ رؤسائے قریش کے پاس بیٹھے دعوت و تبلیغ میں مشغول تھے کہ اتنے میں حضرت ابن ام مکتومؓ

حضرت ابن مکتومؓ کا واقعہ

آگئے۔ یہ، ساداتِ قریش کے مقابلہ میں شکستہ حال بھی تھے اور ساتھ ہی نابینا بھی، سردارانِ قریش ہمیشہ یہ طعن دیا کرتے تھے کہ (معاذ اللہ) اراذل و سفہاء اور ضعفاء و غرباء کی ایک جماعت ہے جو آپ کے پیچھے لگ گئی ہے، ابن ام مکتومؓ کی آمد سے قریش کا یہ طعن آپکی

---

[1] سورۂ مائدہ کی اس عظیم المرتبت آیت پر غور کیجئے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝ (۵ : ۳۲)

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ حکم لکھدیا تھا کہ "جس کسی نے، سوا اس حالت کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں لوٹ مار مچانے والوں کو سزا دینی ہو، کسی جان کو قتل کرڈالا، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جس کسی نے زندگی بچالی، تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دیدی" اور پھر ان کے پاس (یکے بعد دیگرے) ہمارے رسول (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آتے رہے (اور ظلم و خونریزی سے روکتے رہے) لیکن اس پر بھی ان میں سے اکثر آدمی ایسے ہیں جو ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہیں!

اس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن اتنا دیکھئے کہ قرآن کریم نے زندگی کی وحدت کو کس بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے؟ کیا انسانی علم کے اکتشافات یا اس کے ضوابطِ اخلاق تمدن و عمرانیت اس سے آگے کسی اور مقام کا تصور بھی کرسکتے ہیں؟

نگاہوں کے سامنے آگیا اور آپ نے محسوس کیا کہ اس وقت یہ نہ ہی آتے تو اچھا تھا۔ اس خیال سے بھی کہ ان لوگوں پر دعوت و تلقین کا جو اثر ہوا ہے وہ شاید زائل ہو جائے۔ اور اس سے بھی کہ یہ منہ پھٹ سرداران قریش اپنے جوش تمرد و سرکشی میں ابن ام مکتومؓ کو نہ جانے کیسے توہین آمیز الفاظ کہہ بیٹھیں جس سے ان کی دل آزاری اور حضورؐ کی دل شکنی ہو۔ اس مربی حقیقی نے عین اس نازک موقعہ پر آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنا لاحاصل ہے۔ آپکی توجہ کی اصل مستحق تو انہی شکستہ حال لوگوں کی جماعت ہے۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے) لہٰذا ان سے اعراض کیجئے اور اپنی تمام سعی و کاوش کو اب اپنی جماعت کے استحکام کے لئے مرکوز کر دیجئے۔

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ (۳۶: ۷۰)

تاکہ اے پیغمبر! تم (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ان لوگوں کو ڈراؤ جن میں زندگی کے کچھ آثار ہیں اور (اس طرح خدا کی) بات پوری ہو جائے۔

اس لئے فرمایا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۙ أَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۭ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۭ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۭ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ (۸۰: ۱-۱۰)

داد ہو! پیغمبر کی پیشانی پر بل پڑ گئے، پیٹھ پھیر لی، کیونکہ اس کے پاس ایک نابینا آدمی چلا آیا تھا (اے پیغمبر!) تمہیں کیا معلوم کہ ایسے ہی لوگوں سے تزکیہ نفس حاصل کر لینے کی توقع ہے یا اس کی امید ہے کہ وہ نصیحت حاصل کریں اور تمہاری نصیحت انہیں فائدہ دے جائے۔ لیکن (اس کے برخلاف) جو لوگ (دعوت حق سے استفادہ کرنے کی) ضرورت ہی نہیں سمجھتے تم پھر بھی ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہو حالانکہ اگر وہ لوگ تزکیہ نفس حاصل نہیں کرتے تو تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود تمہارا طرز عمل یہ ہے کہ) جو آدمی (طلب حق کے لئے) تمہاری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے اور اس کے دل میں خدا کا خوف بھی ہے اس سے تم اپنے آپ کو غافل بنا لیتے ہو!

غور کیجئے کہ ان چند ٹکڑوں میں اصل حقیقت کس خوبصورتی سے جگمگا رہی ہے! الفاظ بظاہر یہ حضورؐ کے خلاف زجر و توبیخ اور سرزنش و عتاب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس

تہدید و سرزنش کا اصلی رُخ ان منکرین و معاندین کیطرف ہے۔ اسلوب بیان کی ندرت نے اس وعید میں جو شدت اور گہرائی پیدا کردی ہے، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ جب آپ کسی عزیز دوست سے کہتے ہیں کہ "چھوڑیئے صاحب! آپ کسے سمجھا رہے ہیں؟" تو آپ کی یہ تعریض و تنقید آپ کے دوست کے طرزِ عمل کے خلاف نہیں ہوتی بلکہ اس نشتر کی اصلی زد اس کے شریان پر ہوتی ہے جسے آپ کا دوست سمجھا بجھا رہا تھا۔ "آپ کسے سمجھا رہے ہیں؟" کے مختصر سے ٹکڑے میں۔ اس شخص کی ضد۔ ہٹ دھرمی۔ افہام و تفہیم سے لاپروائی، حتیٰ کہ

تادیب کا حقیقی رُخ

حماقت اور جہالت کے تمام گوشے اس جامعیت سے سمٹ کر آگئے ہیں جسپر ایجاز و اختصار کی بلاغت وجد کر رہی ہے! بعینہٖ یہی انداز توبیخ عَبَسَ وَتَوَلّٰی کے اسلوب بیان میں نقاب پوش ہے۔ پھر ان سے اگلے ٹکڑوں کو دیکھئے۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ۝ (۱۱-۱۶)

ہرگز نہیں! (ایسا کبھی نہ کرو) یہ واقعہ ہے کہ پیغام حق ایک یاددہانی ہے، تو جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے (نہ کسی پر جبر ہے اور نہ کسی سے رُکاوٹ) یہ پیغام حق معزز بلند مرتبہ اور پاکیزہ نوشتوں میں موجود ہے جو شریف اور نیک سرشت محافظ فرشتوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہیں۔۔۔۔!

یہ وہی حقیقت ہے جسے اس سورۃ سے ملحق گذشتہ سورۃ کی آخری آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ۝ (۴۵)

(اے پیغمبر!) تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو لوگ یوم مکافاتِ عمل سے ڈرتے ہیں انھیں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والے ہو!

سورۂ عبس کے ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (آپ ان پر داروغہ مقرر نہیں کئے گئے) اور فَتَوَلَّ عَنْهُمْ وَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (ان سے اعراض کیجئے اس سے آپ پر کوئی ملامت نہیں ہوگی) کی تنبیہ و توبیخ کا اصلی رُخ کس طرف نظر آتا ہے؟ صاف دکھائی دے گا کہ یہ بالواسطہ (INDIRECTLY) کفار و معاندین کی سرکشی اور تمرد، جحود و انکار، ضد اور جہالت کے خلاف تہدید و سرزنش کا کھلا ہوا عتاب ہے اور ان سے اعراض کی غایت و علت کا واضح بیان۔

⁂

لیکن حضورؐ کا یہ اعراض و انقطاع کسی غصہ یا برافروختگی کا مظاہرہ نہ تھا بلکہ ان لوگوں کی قساوت و شقاوت پر

انتہائی رنج وغم اور شدت یاس و نومیدی کا اظہار تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی طبیب مشفق کا مریض کی بالیں سے ایک آہ سرد بھر کر اٹھ جانا کس قیامت کے آنے کی پیشگوئی ہوتا ہے! اس اعراض سے یہی مفہوم تھا۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ انگلی کا ناسور لاعلاج ہو چکا ہے اور اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ انگلی کو کاٹ کر الگ پھینک دیا جائے۔ یہ آخری وعید تھی کہ اب ان لوگوں کو خدا کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنْتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَا تُوعَدُونَ ۝ (۲۱/۱۰۹)

پھر اگر وہ روگردانی کریں، تو کہہ دے "میں نے تمہیں (انکار و سرکشی کے نتائج سے) یکساں طور پر خبردار کر دیا ہے۔ یہ تو میں نہیں جانتا، جس بات کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کا وقت قریب آ لگا ہے یا ابھی دور ہے (تاہم وہ ٹلنے والا نہیں)

سورۂ طور میں ہے۔

فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝ (۵۲/۴۵-۴۶)

لہٰذا (اے پیغمبر!) انہیں چھوڑ دو۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اس دن سے مل لیں جس دن وہ سزا میں مبتلا کر دیئے جائیں گے۔ جس دن ان کی مکاریاں ان کے کوئی کام نہ آئیں گی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائیگی!

ان لوگوں کو اب خدا کے قانونِ مجازات کے حوالے کر دو جو اپنی کارفرمائی اور نتیجہ برآری میں نہ کسی کی رعایت کرتا ہے نہ کسی پر ظلم۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۶۸/۴۴)

چنانچہ (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو جو اس بات (یوم مکافاتِ عمل) کو جھٹلا رہے ہیں مجھ پر چھوڑ دو، ہم آہستہ آہستہ ان کی گرفت کرتے جائیں گے جہاں سے ان کو پتہ بھی نہ چلیگا (اور بالآخر ہمارا عذاب ان کو فنا کے گھاٹ اتار دیگا)

مہلت کی گھڑیاں

بس اتنا ہے کہ یہ نتائج وعواقب اس کے قانون امہال و تاجیل کے ماتحت وقت معین پر برآمد ہوتے ہیں یہی تربص و انتظار کے لمحات مہلت کی گھڑیاں ہوتی ہیں۔ اگر اس وقفہ سے بھی فائدہ نہ اٹھایا جائے اور جس غلط روش پر چل رہے ہیں اس سے منہ نہ موڑا جائے تو پھر وہ نتائج سامنے آ کر رہتے ہیں جنکی گرفت محکم اور جن کے اثرات اٹل ہیں۔

وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۝ (۶۸:۴۵)

اور میں انھیں مہلت دے رہا ہوں (یہ نہیں کہ میں نے انھیں بالکل چھوڑ دیا ہے) یاد رکھو یہ حقیقت ہے کہ میری تدبیر بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔

اس حقیقت کو سورۂ مزمل میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

وَذَرْنِیْ وَالْمُكَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا ۝ (۷۳:۱۱)

اور (اے پیغمبر!) ان دولت کے نشہ میں سرشار، (دعوتِ حق کو) جھٹلانے والوں کو مجھ پر چھوڑ دو اور تھوڑی سی انھیں مہلت دو (تاکہ عمل کو نتیجہ پیدا کر لینے کا وقفہ مل جائے۔ یہ وقفہ گذر جانے کے بعد وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا دیئے جائیں گے!)

اور سورۂ مدثر میں۔

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۝ (۷۴:۱۱)

(اے پیغمبر!) ان لوگوں کو جنھیں میں نے (ہی) پیدا کیا ہے، تنہا مجھ پر چھوڑ دو (کیونکہ جس طرح میں نے انھیں پیدا کر دیا ہے میں انھیں فنا بھی کر سکتا ہوں)

یہ اگر دل میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس تحریکِ حق و صداقت کی کامیابی ان کی مدد کی محتاج ہے تو یہ ان کی خود فریبی ہے حق کی کامیابی کے لئے خدا کی نصرت کافی ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (۲:۱۳۷)

پھر اگر یہ لوگ بھی ایمان کی راہ اختیار کر لیں۔ اسی طرح جس طرح تم نے اختیار کی ہے، تو سارے جھگڑے ختم ہو گئے۔ (اور) انھوں نے ہدایت پالی۔ لیکن اگر اس سے روگردانی کریں تو پھر سمجھ لو کہ (ان کے ماننے اور متفق ہونے کی کوئی توقع نہیں) ان کی راہ (طلبِ حق کی جگہ) مخالفت اور ہٹ دھرمی کی راہ ہے۔ پس ان سے قطع نظر کر لو اور اپنے کام میں سرگرم رہو) وہ وقت دور نہیں جب اللہ کی مدد تمہیں ان کی مخالفتوں سے بے نیاز کر دے گی۔ وہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

لہٰذا اگر یہ اعراض کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۝ (۹:۱۲۹)

(اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ سرتابی کریں، تو ان سے کہہ دو میرے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے

کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات۔ میں نے اسپر بھروسہ کیا، وہ تمام عالم ہستی کی جہانداری کے) عرش عظیم کا خداوند ہے!"

حضرات انبیاء کرام کی دعوتِ انقلاب کی تاریخ پر غور کیجیے! صاف نظر آجائے گا کہ ہر تحریک تین مراحل سے گذرتی رہی ہے۔ پہلا مرحلہ دعوت و تلقین اور تبلیغ و تبیین کا ہوتا ہے جس میں اس پیغام کی عام نشر و اشاعت کی جاتی ہے اور افہام و تفہیم کے ذریعہ سعید روحوں کو اس کی طرف بلایا جاتا ہے۔ جب یہ دونوں جماعتیں چھٹ کر

مرحلہ برأت وہجرت

الگ الگ ہو جاتی ہیں تو پھر برات و ہجرت کا مرحلہ آتا ہے جس میں ان متمرد و سرکش انسانوں سے قطع علائق کر لیا جاتا ہے۔ اور تیسرا مرحلہ فتح و کامرانی کا ہوتا ہے جس میں حق، باطل پر غالب آجاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ اپنی نزاکت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچکر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۲۶:۷۱)

اور (دیکھو) نوحؑ نے کہا "اے میرے پروردگار! انکار حق کرنے والوں میں سے روئے زمین پر کسی رہنے والے متنفس کو (زندہ) نہ چھوڑ!

اور اس کے بعد اس متمرد قوم کا جو کچھ انجام ہوا اسپر بھنور کی آنکھ آج تک رو رہی ہے۔ یہی حضرت ہودؑ نے قوم عاد سے کہا۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهٖ إِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ إِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ (۵۷:۱۱)

پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچادی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور (مجھے تو نظر آ رہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دیدے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے!

اور اس کے بعد۔

فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۷۲:۷)

پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہودؑ کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچالیا۔ اور جنہوں نے

نشانیاں جھٹلائی تھیں، ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہ تھے!

اور حضرت صالحؑ نے بھی اس مقام پر پہنچکر اسی طرح اعراض برتا۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ (۷۹)

پھر صالحؑ ان سے کنارہ کش ہوگیا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

اور اس کے بعد۔

وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰى ۝ (۵۳/۵۱)

اور ایسے ہی قوم ثمود، کہ خدا نے اُسے بھی باقی نہیں رکھا۔

ثمود کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ ملت حنیفہ کے مؤسس اول حضرت ابراہیمؑ کی تحریک میں یہ مقام برارت و ہجرت بالکل متمیز اور متغایر حیثیت سے نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ز كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (۶۰)

جب انھوں نے اپنی قوم سے علانیہ کہدیا کہ "ہم (حضرت ابراہیم اور آپ کی جماعت) ان چیزوں سے جنہیں تم اللہ کے سوا معبود بنائے ہوئے ہو۔ بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کیلئے عداوت و نفرت آشکارا ہوگئی یہانتک کہ تم اللہ واحد پر ایمان لے آؤ۔"

اور اس کے بعد ان سے کہدیا کہ

اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۲۹/۲۶)

"میں اس وطن کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں جو غالب اور حکمت والا ہے"

اور

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۝ (۱۹/۴۸)

"میں نے تم سب کو چھوڑا، اور انھیں بھی جنھیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں"

اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس ملک کو چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے تاکہ کسی بار آور زمین میں حکومت الٰہیہ کے

یہی مرحلہ حضورؐ کے سامنے

شجر مقدس کی تخم ریزی کی جائے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچکر نبی اکرمؐ نے ان منکرین و متمردین کو مخاطب کر کے یہ زلزلہ انگیز اعلان کر دیا کہ

قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِیْنُكُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۝ (۱۰۹/۶)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو "اے منکرین دعوت حق! میں اُن چیزوں کی عبودیت (اطاعت و فرمانبرداری) اختیار نہیں کروں گا جن چیزوں کی عبودیت تم اختیار کئے ہوئے ہو اور نہ تم ہی اُس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرو گے جس کی عبودیت میں اختیار کر رہا ہوں (لہٰذا میری اور تمہاری راہ الگ الگ ہے) اور نہ میں ان چیزوں کی عبودیت (اطاعت) اختیار کر سکتا ہوں جنکی عبودیت تم نے اختیار کر رکھی ہے اور (بظاہر حالات) تم بھی اس (خدائے واحد) کی عبودیت (اطاعت) اختیار کرنے والے نہیں ہو جنکی عبودیت میں نے اختیار کر لی ہے (لہٰذا کسی باہمی سمجھوتہ کی بھی امید نہیں ہے) تمہارے لئے تمہارے اعمال کی جزا ہے۔ اور میرے لئے میرے اعمال کی جزا (مکافات عمل کے دن حقیقت واضح ہو جائے گی)

اس اعلان برأت و علیحدگی کی شدت، تاکید اور وضاحت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ چند جملوں کے تکرار سے حق و باطل کو کس طرح متفارق و متمیز کر کے رکھدیا ہے کہ جس میں مفاہمت و مصالحت کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا پہلے اندازِ تخاطب کو دیکھئے۔ مخالفین کی جماعت کو "یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" کہکر سارے قرآن میں صرف اسی مقام پر

لہ لفظ کافر نے غیر مسلموں کے دل میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ گالی ہے۔ حالانکہ یہ لفظ محض ایک امر واقعہ (FACT) کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ ایک سوسائٹی قائم کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کے قواعد و ضوابط کو صحیح تسلیم کر کے اس کے ممبر بن جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ممبر نہیں بنتے۔ ان (NON-MEMBERS) کو کافر کہا جاتا ہے۔ یعنی ان قواعد و ضوابط کو نہ ماننے والے۔ اگر (NON-MEMBER) کے لفظ میں کسی قسم کے سبّ و شتم کا شائبہ پایا جاتا ہے تو کافر کو بھی گالی سمجھئے۔ اگر وہ محض ایک واقعہ کا اظہار کرتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ لفظ کافر کو گالی کس طرح سمجھ لیا جاتا ہے۔ کافر کے معنے ہیں نہ ماننے والا۔

پکارا گیا ہے۔ اس لئے یہ خطاب بھی ایک نمایاں خصوصیت اپنے آغوش میں لئے ہے۔ ایک تو یہ کہ حق و صداقت کی دعوت کے جواب میں ان لوگوں نے دلیل و برہان اور دانش و بصیرت کی تمام راہوں کو چھوڑ کر صرف ایک شیوہ اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اور وہ شیوہ تھا بلا دلیل و حجت انکار اور کیسر انکار کا۔

قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ ○ (۳۴)

انھوں نے کہا "سچ مچ ہم ان پیغاموں کو ماننے والے نہیں جنکے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے"

اور:-

اِنَّا كَفَرْنَا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ (۱۴)

واقعی ہم ان باتوں سے انکار کرتے ہیں جنکو دیکر تمہیں بھیجا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ منابذہ اور قطع علائق کسی ذاتی غصہ یا انتقام کی بنا پر نہیں۔ اس کی وجہ صرف تمہارا کفر ہے۔ جادۂ حق پرستی سے انحراف ہے۔ تم آج اس غلط روش کو چھوڑ کر زندگی کی سیدھی راہ اختیار کر لو۔ ہمارے بھائی بن جاؤ گے

غور کیجئے کہ قرآن اپنے اصول و مبانی کو کس طرح ہر مقام پر اجاگر کرتا جاتا ہے۔

اب اس اعلان کے آخری ٹکڑے پر غور کیجئے "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ"۔ اس کے عام طور پر یہ

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ

معنے کئے جاتے ہیں کہ "تمہارا دین تمہارے لئے۔ میرا دین میرے لئے" جس روش زندگی پر تم چلے جا رہے ہو۔ وہ تمہارے لئے مبارک۔ جس پر میں چل رہا ہوں وہ میرے لئے خوش آیند۔ نہ میں اس سے تعرض کرتا ہوں نہ تم اس سے متعرض ہو۔ تم اپنے آئین حیات پر راضی۔ میں اپنے مسلک سے خوش۔ اللہ اللہ۔ خیر صلاً"۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ معانی اور مفہوم ایک رسول کی بنیادی تعلیم سے یکسر متناقض ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ رسول، کسی غیر خدائی آئین زندگی سے مفاہمت نہیں کر سکتا کہ حق و باطل میں کسی قسم کی مصالحت، حق کی شکست اور باطل کی ظفرمندی ہے۔ رسول کی بعثت کا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ نظام حق و صداقت (دین خداوندی) تمام ادیان (دیگر نظامہائے زندگی) پر غالب آجائے۔

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (۹)

(ہاں) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو حقیقی ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس دین کو، تمام (ٹھہرائے ہوئے) دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے!

لہٰذا اگر رسول ہی کفار سے یہ کہدے کہ تم اپنے دین پر خوش رہو، میں اپنے دین پر راضی۔ تو پھر دنیا میں دین الحق

ادیانِ باطل پر غالب کس طرح سے آسکتا ہے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ میں دین کے معنے وہی ہیں جو مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں ہیں یعنی مکافات عمل۔ لہٰذا اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ جس روش زندگی کو تم اختیار کئے ہو اس کے ہلاکت انگیز انجام وعواقب کا وبال تمہارے اپنے اوپر ہی پڑے گا۔ ہم پر نہیں پڑے گا۔ اور ہمارے مسلک زندگی کے نتائج وثمرات ہمارے لئے ہوں گے اس میں تمہارا کچھ حصہ نہیں ہو سکتا۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی تشریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں آتی ہے۔

فَاِنْ کَذَّبُوْکَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَکُمْ عَمَلُکُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۰/۴۱)

اور اگر یہ (اس قدر سمجھانے پر بھی) تجھے جھٹلائیں، تو کہدے، میرے لئے میرا عمل ہے، تمہارے لئے تمہارا۔ میں جو کچھ کرتا ہوں اس کی ذمہ داری تم پر نہیں، تم جو کچھ کرتے ہو، اس کے لئے میں ذمہ دار نہیں۔ (ہر شخص کے لئے اس کا عمل ہے، اور عمل کے مطابق نتیجہ)

یعنی۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۳۴/۲۵)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو (اگر بالفرض ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو) تم سے ہمارے جرموں کے متعلق باز پرس نہیں ہوگی، اور (اسی طرح) جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی باز پرس ہم سے نہیں کی جائیگی (لہٰذا ہماری فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں البتہ اپنی پاداشِ عمل کے لئے تیار رہو)

تم فلاح وسعادت کی راہ اختیار نہیں کرتے اور کہتے ہو کہ یہ خسران و نامرادی کی راہ ہے۔ اور اسی کے برعکس تباہی اور بربادی کے جس جہنم کی طرف خود کشاں کشاں جا رہے ہو اسے ریاحینِ کامیابی وبساتینِ کامرانی کی صراط مستقیم بتا رہے ہو۔ میں نے تمہیں اولۂ منیرہ اور براہین واضحہ سے بتا دیا کہ کونسی راہ کس طرف منجر ہے۔ اب اس کے بعد بھی تم اپنے انکار وجحود سے باز نہیں آتے تو کذب وصدق کے پرکھنے کا ایک ہی معیار باقی ہے اور وہ یہ کہ تم اپنی راہ چلتے جاؤ، میں اپنی راہ چلتا جاؤں۔ انجام کار دیکھو کہ تم کہاں پہنچتے ہو اور میرا کاروانِ زندگی کس منزل پر جا کر رکتا ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (۱۱/۱۲۱-۱۲۲)

اور (اے پیغمبر!) جو لوگ ایمان نہیں لاتے (اور دعوتِ حق کا مقابلہ کر رہے ہیں) ان سے کہدے "تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ۔ ہم بھی (اپنی جگہ) سرگرم عمل ہیں۔ اور (نتیجہ کے) منتظر رہو۔ ہم بھی منتظر ہیں!"

پھل خود درخت کی شناخت کرا دے گا اور اس وقت زیغ نظر اور اعوجاج نگاہ کی تمام دسیسہ کاریاں نکھر کر سامنے آجائیں گی۔ اس لئے۔

وَاَبۡصِرۡهُمۡ فَسَوۡفَ يُبۡصِرُوۡنَ ○ (۳۷/۱۷۵ نیز ۶/۱۵۹)

اور انہیں دیکھتے رہو (یعنی ظہور نتائج کا ان کے حق میں انتظار کرتے رہو) چنانچہ کچھ عرصہ بعد وہ بھی (نتائج کو، کھلی آنکھوں) دیکھ لیں گے!

ظہورِ نتائج میں تاخیر

ظہور نتائج میں یہ تاخیر مشیت کے قانون امہال و تربص کے مطابق تھی اور اس سنت اللہ کے موافق بھی کہ متمردین و منکرین پر عذاب اس وقت تک نہیں آتا جبتک رسول، ان سے قطعاً مایوس ہو کر دوسری جگہ نہ چلا جائے۔ سورۂ انفال میں ہے۔

وَاِذۡ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ○ (۸/۳۲)

اور (اے پیغمبر!) جب ایسا ہوا تھا کہ (کفار مکہ نے) کہا تھا "خدایا! اگر یہ بات (یعنی پیغمبر اسلام کی دعوت) تیری جانب سے امر حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے، یا ہمیں کسی دوسرے) عذاب دردناک میں مبتلا کر.....!"

اس کے جواب میں فرمایا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَاَنۡتَ فِيۡهِمۡ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَهُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ○ (۸/۳۳)

اور اللہ ایسا کرنے والا نہ تھا کہ تو ان کے درمیان موجود ہو اور پھر انہیں عذاب میں ڈالے۔
اور اللہ ایسا بھی کرنے والا نہیں کہ انہیں عذاب میں ڈالے حالانکہ وہ معافی مانگ رہے ہوں!

لیکن اس کے بعد۔

وَمَا لَهُمۡ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَمَا كَانُوۡۤا اَوۡلِيَآءَهٗ ؕ اِنۡ اَوۡلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الۡمُتَّقُوۡنَ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ○ (۸/۳۴)

لیکن (اب کہ تجھے مکہ چھوڑ دینے پر انہوں نے مجبور کر دیا) کونسی بات رہ گئی ہے کہ خدا انہیں عذاب نہ دے حالانکہ وہ مسجد حرام سے مسلمانوں کو روک رہے ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے متولی ہونے کے لائق نہیں۔ اس کے متولی اگر ہو سکتے ہیں تو ایسے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں (نہ کہ مفسد و ظالم) لیکن ان میں سے اکثروں کو (یہ حقیقت) معلوم نہیں۔

اس آخری آیت پر مزید غور کیجئے جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ منکرین مکہ پر عذاب کس شکل میں آنا تھا۔ امم سابقہ میں ہم عذاب کی مختلف نوعیتوں کو دیکھ چکے ہیں۔ کوئی قوم بارش کی طغیانیوں میں بلبلوں کی طرح بہ گئی۔ کوئی کوہِ آتش فشاں کی شعلہ باریوں سے راکھ کا ڈھیر ہوگئی۔ کہیں کوئی بستی آندھی کے طوفان میں خس وخاشاک کی طرح اڑگئی۔ اور کوئی قریہ زلزلہ کے دھماکوں سے زمین دوز ہوگیا۔ لیکن (جیسا کہ معجزات کے عنوان میں تفصیل بیان کیا جائیگا) اب انسانیت اپنے عہدِ شعور کو پہنچ چکی تھی اس لئے اب ان کے اعمال کے نتائج، مافوق الفطرت عناصر کی شکل میں سامنے نہیں آتے تھے بلکہ انھیں استبدال قومی کے کھلے ہوئے اصول کے ماتحت متشکل ہونا تھا

اہل مکّہ پر عذاب کی شکل

سردارانِ قریش کے تمام شرف واجتبا کی بنیاد اور فخر وناز کی علت انکی تولیت کعبہ تھی۔ بیت اللہ کے کلید بردار ہونے کی جہت سے وہ تمام قبائل میں ممتاز اور سرفراز گنے جاتے تھے۔ اسی سے مکہ کی مرکزیت قائم تھی اور اسی مرکزیت میں ہی قریش کی قوت ودولت کا راز تھا۔ لیکن انھوں نے اس مرکز شرف ومنزلت انسانیت کو فتنہ وفساد کا سرچشمہ اور ذمائم وقبائح کا گہوارہ بنا رکھا تھا۔ اور برہمنیت کی تمام خرابیاں ایک ایک کرکے ان میں جمع ہوچکی تھیں۔ اس لئے ان کا علاج یہ تھا کہ ان سے کعبہ کی تولیت چھین لی جائے (چھین کیا لی جائے۔ چونکہ ان میں اس کی صلاحیت نہیں رہی تھی اس لئے یہ شرف ان سے خود بخود چھن جاتا تھا جس طرح وہ شاخ جس میں جذب وکشش کی صلاحیتیں باقی نہ رہیں۔ خشک ہوکر خود بخود نیچے گر پڑتی ہے) اور یہ امانت ان کے سپرد کردی جائے جن میں اس کے تحفظ کی صلاحیت ہو۔ اسی کا نام قانونِ استبدال واختلاف (THE LAW OF SUBSTITUTION AND SUCESSION) ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۴۷)

اور اگر تم دعوتِ حق سے روگردانی کروگے تو (یاد رکھو) خدا تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو دیدیگا۔

(تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی)

اب اسی موضوع کے دوسرے گوشے کی طرف آئیے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر شرح وبسط سے لکھا جاچکا ہے۔ رسول کا مقصد خالی وعظ ونصیحت نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی حکومت کا قیام ہوتا ہے، جس میں احکامات خداوندی نافذ ہوں۔ وعظ وتلقین اور تبلیغ وتفہیم سب اسی مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی منزل کی طرف لیجانے والے راستے ہوتے ہیں۔ وہ جس جگہ پیدا ہوتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ اس نظامِ حکومت کا قیام اسی جگہ سے شروع ہو وہ اس فضا کو اس نظامِ زندگی کے لئے سازگار بنانے میں سعی وعمل کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتا۔ وہ پوری جدوجہد کرتا ہے

کہ لوگ سمجھ سکیں کہ وہ انھیں کس زندگی بخش نظام کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن سرکش قومیں جو اس نظام کے قیام میں اپنے مفاد و مقاصد سئیہ کی موت دیکھتی ہیں اس کی سرتوڑ مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن جب صورت یہ پیدا ہو جائے کہ اس مقام پر اس نظام کے قیام کا امکان نظر نہ آئے تو اس وقت یہ داعیٔ انقلاب یہ کہکر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لیتا کہ میرے ذمہ جو فریضہ عائد ہوتا تھا میں نے اسے ادا کر دیا۔ اب اگر یہ لوگ نہ مانیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ایسا خیال اس شخص کے دل میں تو پیدا ہو سکتا ہے جو یا تو ان فرائض کو خارج سے عائد شدہ سمجھ کر طوعاً وکرہاً ان کی تعمیل کر رہا ہو۔ یا اپنے آپ کو کسی خاص خطۂ زمین کے لوگوں کی اصلاح کا ذمہ دار سمجھتا ہو۔ عام دنیاوی ریفارمروں کی یہی صورت ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کا مقام ان سے کہیں بلند ہوتا ہے جیسا کہ گذشتہ عنوان میں لکھا جا چکا ہے۔ اس نظام کا قیام اس کی فطرت کا تقاضہ اور عمق قلب کی آواز ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہر ایسی فضا کو جس میں یہ نظام قائم نہ ہو، اپنے لئے غیر فطری اور ہلاکت آمیز سمجھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وطن کی

وطن کا مفہوم رسول کی نگاہوں میں

حدود و ثغور اس کے نزدیک کچھ معنے نہیں رکھتیں اس لئے اس کی چار دیواری اس کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ اسکے نزدیک وطن وہ ہے جس کی زمین اس نظام خداوندی کے نظام کے لئے سازگار اور بارآور ہو۔ لہذا جب وہ کسی ایک مقام پر اس نظام کے قیام کے امکانات نہیں دیکھتا تو کسی ایسے مقام کا رخ کر لیتا ہے۔ جہاں اسکے امکانات نسبتاً زیادہ ہوں۔ اسی کا نام رسول کی زبان میں "ذَھَابَ اِلَی اللہِ" یا "ھجرت الی اللہ" ہے۔ ہجرت کے معنے ہیں چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ ایک مسلم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ "ہجرت" کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ہر وہ تعلق جو اس کے نصب العین کے حصول میں مانع ہو، اُسے بلا تأمل و توقف چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہی وہ کانٹے ہیں جنھیں راستے سے ہٹانا بڑے جہاد کا کام ہے۔ ذاتی جذبات۔ خواہشات۔ عیش و آرام۔ مال کی محبت۔ اولاد سے وابستگی۔ رشتہ داروں سے تعلقات۔ دیگر رجحانات و میلانات، ان میں سے جو "کانٹا" بھی دامن گیر ہو، اُسے جھٹک کر الگ کر دیا جائے۔ ایک سہل انگار اور تن آسان آدمی کے لئے وطن کی جاذبیت بڑی محکم گیر ہوتی ہے اور اسے چھوڑنے میں بعض اوقات سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس لئے انسان وطن کی زمین میں بری طرح سے پاگل ہو جاتا ہے۔ وطن کی یہی کشش و جاذبیت تھی جو ایک جگہ رہنے والے انسانوں کے لئے وجہ جامعیت اور باعث اتحاد و اتفاق بنی اور اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ایسی پختگی اختیار کر لی کہ آج دنیا میں قومیتوں کا انحصار اوطان پر قرار پا گیا اور خدا کی یہ وسیع زمین، محض پہاڑوں اور دریاؤں کے فرضی خطوط سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر انسانوں کی بستیوں کے بجائے درندوں کا بھٹ بن گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان جس مقام پر رہتا ہے اس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ جس مکان کو آپ اتنے شوق سے

بناتے ہیں۔ پھر اس میں اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھتے ہیں۔ مختلف کام کاج کرنے کے بعد آپ کا ہر قدم غیر شعوری طور پر اس کی طرف اٹھتا ہے۔ جب آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ دریا چڑھ گیا ہے اور عنقریب سیلاب کا رخ اسی بستی کی طرف ہونے والا ہے جس میں آپ کا یہ مکان ہے، تو آپ کس طرح ہر کشش اور جاذبیت کو جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں اور دیوانہ وار یہاں سے بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس وقت نہ مکان کی محبت آپ کے راستہ میں حائل ہوتی ہے نہ اس کے مشمولات سے وابستگی عنان گیر۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ آپ کے پاس ایک ایسی چیز بھی ہے جسے آپ مکان اور اس کے تمام متعلقات سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے آپ ان تمام چیزوں کو بلا توقف و تردد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ متاع گراں بہا جس کی حفاظت میں آپ کسی تعلق اور وابستگی کی پرواہ نہیں کرتے۔ آپ کی جان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جان بڑی گراں بہا متاع ہے لیکن جن کی نگاہیں طبعی زندگی کی چار دیواری سے آگے بھی جاتی ہیں، ان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ گراں بہا اور عزیز تر شے ایک اور ہے جسے جوہر خودی، شرف انسانیت، کلمۃ الحق یا ایمان کے جامع لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی دیکھے کہ باطل کا سیلاب بے پناہ ہے جو چاروں طرف سے امنڈے چلا آ رہا ہے اور اس میں اس کی اس متاع نایاب کی خیر نہیں تو کہئے کہ اس وقت اس کے نزدیک وطن کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ وہ بلا تردد و تامل وطن کی خار دار جھاڑی کو اپنے راستے سے الگ پھینک دے گا، اور کسی ایسے مقام کی طرف رخ کریگا جہاں اس کی یہ متاع بے بہا محفوظ ہو جائے۔ اور اس کی حفاظت صرف اسی نظام میں ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) اس کا نام ہجرت ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس کی

ہجرت سے مفہوم

حفاظت میں اسے اپنی جان تک بھی دینی پڑ جائے تو، زیادہ عزیز شے کی حفاظت کی خاطر، کم عزیز شے کی قربانی کے اصول کے مطابق، وہ اس میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔ اس کا نام شہادت ہے جو جہاد کی آخری منزل ہے۔ لہٰذا ہجرت انسانی فطرت صحیحہ کا تقاضا اور مرد مؤمن کی مجاہدانہ زندگی کا شعار ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است ✤ ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رَم است ✤ ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

یہی، وہ حقیقت باہرہ ہے جس کی بنا پر قرآن کریم نے ہجرت کو اس قدر اہمیت دی ہے۔ اور مختلف طرق و اسالیب سے اس کی اساسی حکمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ○ (۲۹/۵۶)

اے میرے بندو، جو صوت حق پر یقین رکھتے ہو! یہ واقعہ ہے کہ میری زمین بہت کشادہ ہے۔ تو (اگر ایک جگہ نہیں تو دوسری جگہ، اور اگر دوسری جگہ نہیں تو تیسری جگہ، بہر حال میری ہی عبودیت (اطاعت و

فرماں پذیری) اختیار کرو!

فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ کے انقلاب انگیز ٹکڑے پر غور کیجئے یعنی مؤمن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا اور صرف خدا کی حکومیت اختیار کرے۔ اب اگر ایسا ہونا اس سرزمین میں ممکن ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہے تو ھُوَ الْمُرَادُ۔ اور اگر وہاں اس کا امکان نہیں تو اِنَّ اَرْضَ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھے رہنا اور غیر اللہ کی محکومیت پر قناعت کر جانا۔ یہ تو مرد مؤمن کی زندگی نہیں، دیکھئے! سورۂ نساء میں اسی حقیقت کو کس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ ۭ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا ۭ فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ۭ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴿۹۷﴾

جو لوگ (دشمنوں کے ساتھ رہ کر) اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں، ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتے ان سے پوچھتے ہیں "تم کس حال میں تھے؟" (یعنی دین کے اعتبار سے تمہارا کیا حال تھا؟) وہ جواب میں کہتے ہیں "ہم کیا کرتے؟ ہم ملک میں مغلوب و بے بس تھے" (یعنی بے بسی کی وجہ سے اپنے اعتقاد و عمل کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے[1]) اس پر فرشتے کہتے ہیں اگر تم اپنے ملک میں مغلوب و بے بس تھے، تو کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ ہجرت کر کے چلے جاتے؟" غرضکہ یہ وہ لوگ ہیں جنکا ٹھکانا دوزخ ہے، اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہو تو کیا ہی بری جگہ ہے!

معذورین معافی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو طبعی (نہ کہ قلبی) طور پر کمزور و ناتواں ہوں اور ہجرت کی کوئی راہ نہ پاتے ہوں۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَا یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْھُمْ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ (۴ : ۹۹)

مگر (ہاں) جو مرد، عورتیں، بچے، ایسے مجبور و بے بس ہوں کہ کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں، اور (ہجرت کی) کوئی راہ نہ پاتے ہوں، تو امید ہے کہ اللہ (ان کی معذوری دیکھتے ہوئے) انہیں معاف

---

[1] ہجرت کی راہ نہ پانے والوں پر یہ لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے ہی مقام کو تنفیذ احکامات الٰہیہ (یعنی حکومت خداوندی) کے لئے سازگار بنانے کی جدوجہد کریں نہ کہ اپنی حالت پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں۔

کر دے، اور وہ معاف کر دینے والا، بخش دینے والا ہے!

باقی رہے ہجرت کر جانے والے تو:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِى الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۚ وَّمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۴:۱۰۰)

اور (دیکھو) جو کوئی اللہ کی راہ میں (اپنا گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کرے گا تو اُسے خدا کی زمین میں بہت سی اقامت گاہیں ملیں گی، اور (ہر طرح کی) کشائش پائیگا (کہ معیشت کی نئی نئی راہیں اس کے سامنے کھل جائیں گی) اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے اور پھر (راہ ہی میں) موت آجائے، تو اس کا اجر اللہ کے حضور ثابت ہو گیا (وہ اپنی نیت کے مطابق اپنی کوشش کا ضرور اجر پائے گا) اور اللہ تو (ہر حال میں) بخشنے والا، رحمت رکھنے والا ہے!

سورۂ احزاب میں ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۗ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۳۹: ۱۰ - ۱۲)

(اے پیغمبر اسلام! ہمارے بندوں سے) کہدو کہ (ہمارا ارشاد ہے) اے میرے بندو جو دعوت حق پر یقین رکھتے ہو اپنے پروردگار کے تقویٰ شعار بندے بن جاؤ (یعنی اس کے احکام کی اطاعت کرو) جو لوگ اعمال صالحہ کرتے ہیں ان کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہی بھلائی ہے (کہ وہ انھیں اپنی زمین کا وارث بنا دے گا، اور (اگر کسی خاص مقام پر حالات کے ماتحت وہ ہمارے احکام کی پوری پوری اطاعت نہ کر سکیں، تو) اللہ کی زمین بڑی فراخ ہے (انھیں کسی ایسی جگہ منتقل ہو جانا چاہئے جہاں ان کے لئے اطاعت احکام الٰہی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو) حقیقت حال یہ ہے کہ صرف اُن لوگوں کو بے حساب پورا پورا اجر دیا جاتا ہے جو (راہ حق میں) جم کر مستقل مزاجی کا ثبوت دینے والے ہیں۔ (نیز) کہدو کہ مجھے تو (میرے پروردگار کی طرف سے) یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ ہی کی محکومیت و اطاعت اختیار کروں (در آنحالیکہ اپنے نظام زندگی کو اسی کے لئے خالص کرنے والا ہوں اور مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں اولین اطاعت شعار بندہ بن جاؤں!"

اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ مزید تفسیر ہے فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ کی جواد پر درج

مہاجرین کے مدارج

کی جا چکی ہے۔ خدا کی راہ یعنی قیام نظام حکومت الٰہیہ کے لئے ہجرت کرنے والوں کے فضائل ومناقب قرآن کے مختلف مقامات پر ابھرے ہوئے حروف میں ملتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰہِ ۭ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (۲/۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے اور راہِ ایمان میں ثابت قدم رہے) اور جن لوگوں نے ہجرت کی سختیاں برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی (سچی) امیدواری کرنے والے ہیں، اور جو کوئی اللہ کی رحمت کا سچے طریقہ پر امیدوار ہو تو اللہ (بھی) رحمت سے بخشش دینے والا ہے!

اور سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۭ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝

(۳/۱۹۴ نیز ۱۶/۴۱-۱۱۰ ، ۲۲/۵۸ ، ۲۴/۲۲)

پس (دیکھو) جن لوگوں نے (راہِ حق میں) ہجرت کی، اپنے گھروں سے نکالے گئے، میری راہ میں ستائے گئے، اور پھر (راہِ حق میں) لڑے اور قتل ہوئے، تو (ان کے اعمال حق کبھی رائیگاں جانے والے نہیں) یقینی ہے کہ میں ان کی خطائیں محو کردوں، اور انہیں (نعیم ابدی کے) باغوں میں پہنچادوں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور اسلئے ان کی شادابی کبھی متغیر ہونے والی نہیں) یہ اللہ کی طرف سے ان کے اعمال کا ثواب ہوگا، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس (جزاء عمل میں) بہتر ثواب ہے!

اس کے برعکس جو لوگ آزمائش کے ایسے موقعہ پر تذبذب میں پڑگئے اور خدا کی راہ میں ترک وطن میں تامل کیا۔ قرآن انہیں منافق قرار دیتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ منافقت قرآن کی میزان میں کس قدر سنگین جرم ہے۔ سورۂ نساء میں انہی منافقین کے متعلق فرمایا۔

وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْھُمْ اَوْلِیَآءَ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْھُمْ وَاقْتُلُوْھُمْ

حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ص وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝

(۴/۸۹ نیز ۴/۴۴)

ان منافقوں کی دلی تمنا یہ ہے کہ جس طرح انھوں نے کفر کی راہ اختیار کرلی ہے، تم بھی کرلو۔ اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔ پس (دیکھو) جبتک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں (اور دشمنوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہارے پاس نہ آجائیں) تمہیں چاہئے کہ ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ (انھیں بھی انہیں لوگوں میں سے سمجھو جو تمہارے خلاف جنگ وپیکار میں سرگرم ہیں) پھر اگر یہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں، تو (جو کوئی دشمنوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یقیناً اس کا شمار بھی دشمنوں ہی میں ہوگا۔ لہٰذا) انھیں گرفتار کرو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو اور نہ تو کسی کو اپنا دوست بناؤ، نہ کسی کو اپنا مددگار

اور سورۂ انفال میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ج وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۸/۷۲)

جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (مکہ کے مہاجرین کو مدینہ میں) جگہ دی اور ان کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا کارساز و رفیق ہے۔ اور جن لوگوں کا حال ایسا ہوا کہ ایمان تو لائے مگر ہجرت نہیں کی تو، تمہارے لئے ان کی رفاقت واعانت میں سے کچھ نہیں ہے جب تک وہ اپنے وطن سے ہجرت نہ کریں، ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد چاہیں، تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے۔ الّا یہ کہ کسی ایسے گروہ کے مقابلہ میں مدد چاہی جائے جس سے تمہارا صلح وامن کا عہد وپیمان ہے (کہ اس صورت میں تم عہد وپیمان کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتے) اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں!

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ کی سرزمین اس دعوت حق وصداقت کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہو رہی تھی۔ وہاں کے

ہر سال حجاج آتے اور سعادتِ اسلام سے مشرف ہوتے۔ اور ہر وہاں سلسلۂ تبلیغ و تلقین جاری تھا جس سے سال بھر نیرِ اسلام کی شعاعیں ان کے قلوب و نگاہ کو منور کرتیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ ہوگیا

مدینہ کی طرف ہجرت

کہ اس تحریکِ انقلابِ آسمانی کی اولین جولانگاہ وہی ارضِ مقدس بنے گی اس لئے حضورؐ نے صحابہؓ کو اجازت دیدی کہ وہ آہستہ آہستہ اس دارالسلام کی طرف منتقل ہوتے چلے جائیں۔ نظر بظاہر جماعتِ مؤمنین کا اس طرح ترکِ وطن کرنا ان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا تھا اس لئے قریش اسے اپنی فتح اور ان کی شکست قرار دیتے تھے اور ایک قریش ہی پر کیا منحصر! دنیا کا ہر وہ شخص جس کی نگاہ فقط مادی اسباب و ذرائع پر ہو، اسے گریز اور فرار ہی قرار دے گا۔ تیرہ برس تک مسلسل، ان ضعیفوں اور ناتوانوں پر مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑے گئے انھیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ برسوں تک ان پر سامانِ خورونوش کی راہیں مسدود کردی گئیں۔ لہٰذا (ہر سطح بیں یہی کہیگا کہ) یہ تنگ آکر بھاگ نکلنے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن عین اس زمانہ میں جبکہ ساری دنیا اسے ان کی شکست و ہزیمت قرار دے رہی تھی، ایک بے صوت صدا انھیں پکار پکار کر نشیدِ کامرانی اور

دیباچۂ فتح و کامرانی

نویدِ شادمانی دے رہی تھی اور واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چند ہی دن کے بعد دیکھو گے کہ فتح و نصرت کس کے حصہ میں آتی ہے اور شکست و نامرادی کس کے مقدر میں ہے۔ ان سے برملا کہا جا رہا تھا کہ

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۸ : ۲۱)

یہ تو خدا نے لکھ دیا ہے کہ (بالآخر) میں اور میرے رسول ضرور غالب آکر رہیں گے حقیقت (بھی) یہ ہے کہ اللہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے (لہٰذا اس پر کون غالب آسکتا ہے؟)

اور یہ کہ

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ۚۖ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (۳۷ : ۱۷۱-۱۷۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارا یہ فیصلہ ہمارے بندوں یعنی رسولوں کے حق میں بہت پہلے ہو چکا تھا کہ در اصل وہی ہوں گے جو (بالآخر) مظفر و منصور ہو کر رہیں گے اور در حقیقت ہماری فوج (جماعتِ مسلمین۔ حزب اللہ) ہی ہوگی جو (مخالفین پر) غالب آکر رہے گی!

کہیں یہ کہ

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَیُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ (۳۹)

(اے پیغمبر!) کیا یہ بات نہیں ہے کہ خدا اپنے بندہ کے (دشمن تمہارے) لئے کافی ہے؟ اور (دیکھو) یہ لوگ تمہیں غیر خدائی طاقتوں سے ڈراتے ہیں (حالانکہ خدا کے مقابلہ میں غیر خدائی طاقتیں کیا بنا سکتی ہیں؟) اور جسے اللہ (راہِ حق سے) بھٹکا دیتا ہے اُسے کوئی راہ بتانے والا نصیب نہیں ہوتا (پھر وہ ایسی احمقانہ باتیں کرنے لگتا ہے)

اور کہیں یہ۔

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ (۹۳)

اور (اے پیغمبر!) کچھ دنوں بعد خدا تمہیں اتنا کچھ دیدے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے!

کسی جگہ اس اشارہ سے

وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ (۹۳)

اور (اے پیغمبر!) یقیناً اس آغاز سے تمہارے لئے انجام بہت بہتر ہوگا۔

اور کسی جگہ اس کی ایسی کھلی ہوئی تشریح سے کہ۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۲۸)

(اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ جس ذات (خداوندی) نے تم پر اس قرآن (کے قانون اور خدائی نظام) کو واجب التعمیل قرار دیا ہے وہ یقیناً تمہیں ایک (بہتر) انجام کی طرف لوٹانے والا ہے۔ تم (ان منکرین دعوتِ حق سے) کہدو کہ میرا پروردگار اچھی طرح جانتا ہے کہ کون ہدایت کو لیکر آیا ہے اور کون ہے جو کھلی گمراہی میں مبتلا ہے (نتائج سامنے آجانے پر تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہو جائے گا)

اور اس حتم و یقین کے ساتھ کہ

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (۴۰ نیز ۴۷)

(اے پیغمبر اسلام!) تم (اپنی دعوتِ حق پر) استقامت کے ساتھ جمے رہو۔ یہ واقعہ ہے کہ خدا کا وعدہ (حرف بحرف) سچا ہے اور (ہاں) اپنی کوتاہی کی مغفرت طلب کرتے رہا کرو اور اپنے پروردگار کی تعریف و ستائش کے ساتھ ہر شام اور صبح کو اس کی پاکی کا آوازہ بلند کرتے رہا کرو.....!

بلکہ ان الفاظ میں کہ۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ○ (۶۱/۸)

یہ منکرین حق چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی حق کے چراغ کو) اپنے موہنوں سے (پھونکیں مار مار کر) بجھا دیں حالانکہ اللہ (بالآخر) اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے خواہ یہ انکار کرنے والے اسے (کتنا ہی) ناپسند کیوں نہ کریں!

دوسری طرف ان مخالفین ومعاندین کے متعلق اس صراحت کے ساتھ کہ

فَاَھْلَکْنَآ اَشَدَّ مِنْھُمْ بَطْشًا وَّمَضٰی مَثَلُ الْاَوَّلِیْنَ ○ (۴۳/۸)

چنانچہ ہم تو ان قوموں کو بھی ہلاک کر چکے ہیں جو گرفت میں ان سے بھی کہیں بڑھ کر سخت تھیں (تو یہ بیچارے ہمارے سامنے کیا ہیں؟) اور ان پہلے لوگوں کا حال تو گذر چکا ہے (جنکے نشانات آجتک بھی موجود ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی ہوئی بات تو نہیں ......)

اور یہ کہ

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَہٗ بَعْدَ حِیْنٍ (۳۸/۸۸)

اور (اے منکرین دعوت حق!) تم اس کی خبر کچھ عرصہ کے بعد ضرور بالضرور معلوم کر لوگے (کہ انکار حق کا نتیجہ ہمیشہ تباہی اور بربادی ہی ہوتاہے)

قرآن کریم کے آخری پارے کی آخری مختصر سورتوں کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ منذرات و مبشرات کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی چلی جا رہی ہیں۔ یہ سورتیں کم و بیش اسی زمانہ سے متعلق ہیں جب ایک طرف ان مخالفین کو آخری وعید سے متنبہ کیا گیا کہ ان میں سے جو لوگ آنے والی ہلاکت سے بچنا چاہیں اب بھی بچ جائیں۔ اور دوسری طرف، ایسے یاس انگیز اور خون آمیز حالات میں جماعت مومنین کو فتح و نصرت اور غلبہ و تسلط کی بشارت دی گئی۔ سورۂ عصر (۱۰۳) کو دیکھئے۔

قرآن کی آخری سورتیں

وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ (۱۰۳/۱-۳)

زمانہ اس پر شاہد ہے کہ نوع انسانی خسارہ ہی خسارہ میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو دعوت حق پر یقین لے آئے اور جنھوں نے نیک کام کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق کی اور حق پر

استقامت کے ساتھ جم جانے کی نصیحت کرتے رہے (کہ صرف یہی ایک جماعت ہے جو زندگی سے کوئی فائدہ حاصل کرتی ہے)

دیکھئے کیسے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ تاریخ کے اوراق اور زمانہ کے تغیرات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ

سورۂ عصر انسان کی غلط روش زندگی کا انجام ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں (اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ) اور اس ناکامی سے صرف وہ لوگ بچ سکیں گے جو حقائق ابدی پر ایمان رکھیں اور اپنے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کریں جس سے وہ باطل کی قوتوں کا مقابلہ کر سکیں اور یہ صلاحیتیں اسی صورت میں پیدا ہو سکیں گی کہ وہ ایک ایسا جماعتی نظام قائم کریں جس میں تمام افراد ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کرتے رہیں (اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ)

اس کے بعد سورۂ ھُمَزَہ (۱۰۴) کو دیکھئے۔ سادات قریش، اس دعوت حق و صداقت کی مخالفت اپنی دولت

سورۂ ھمزہ کے گھمنڈ پر کیا کرتے تھے اور اسی نشہ میں بدمست طرح طرح کی بہتان تراشیوں اور تہمت بافیوں پر اتر آئے تھے، غور کیجئے، انھیں اس مسلک زندگی کے انجام سے کیسے غیر مبہم طریق پر متنبہ کیا گیا ہے۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ ۙ۝ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ ۙ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ ۝ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ ۝ۡ وَمَآ اَدْرٰىکَ مَا الْحُطَمَۃُ ۝ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ ۙ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَۃِ ۝ اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ ۙ۝ فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ ۝ (۹-۱۰۴)

(اے افراد نسل انسانی! یاد رکھو) ہر بہتان طراز اور بدنام کرنے والے کے لئے رسوائی ہی رسوائی ہے۔ (کون بہتان طراز اور بدنام کرنے والا؟) جو مال و دولت (کے ڈھیر) جمع کرتا ہے اور انھیں گنتا رہتا ہے وہ (شاید) یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال و دولت اسے ہمیشہ کی زندگی دیدیگا (اور اسے موت نہیں آئے گی) ہرگز نہیں۔ اُسے یقیناً ایک شعلہ فگن آگ میں ڈالدیا جائیگا۔ اور اور (اے پیغمبر!) تمہیں معلوم بھی ہے کہ وہ شعلہ فگن آگ کیا ہوتی ہے؟ وہ خدا کی ایک بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ جو دلوں پر چڑھ جائے گی۔ وہ آگ ان لوگوں پر بڑے بڑے ستونوں کے درمیان بند کر دی جائے گی۔

پھر یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آچکی ہے کہ قریش کی قوت و ثروت اور سیادت و ریاست کا مدار تولیت کعبہ پر تھا۔ انھیں یہ تمام شرف و امتیاز اس لئے حاصل تھا کہ وہ خانۂ خدا کے کلید بردار تھے۔ اسی کی وجہ تھی کہ

وہ اگرچہ ایک ایسی بے برگ وگیاہ وادی میں آباد تھے، دنیا بھر کی نعمتیں ان کے پاس کشاں کشاں چلی آتی تھیں۔ اور جب وہ باہر نکلتے تھے تو ان کی یہ کیفیت تھی کہ ملک میں چاروں طرف لوٹ مار اور قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے تجارت کے قافلوں کی طرف انگلی اٹھا کر بھی دیکھ جائے۔ ان سے کہا گیا کہ سمجھو! تقاضائے سپاس گزاری اور حق تشکر و امتنان یہ ہے کہ جس خدا نے تمہیں ایسا شرف و امتیاز بخشا ہے اس کی محکومیت اختیار کرو اور جس گھر کی بدولت یہ سب کچھ عطا ہوا ہے اس کی عظمت و فضیلت کا پاس رکھو۔

سورۂ قریش

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (۱۰۶/۱-۴)

قریش کی حفاظت، اور ان کے سرمائی و گرمائی اسفار (تجارت) کی حفاظت پر غور کرو! (کہ خدا نے کس طرح ان کی حفاظت کا سامان فرما دیا ہے) لہٰذا انہیں چاہئے کہ اس گھر (کعبہ) کے پروردگار کی محکومیت و اطاعت اختیار کریں (جس کے نام پر انہیں حفاظتوں کے یہ سامان میسر ہوئے ہیں) وہ پروردگار، جس نے انہیں بھوکے رہنے کے بجائے کھانے کے لئے رزق دیا اور خوف کے بجائے امن و سلامتی عطا فرمائی۔

لیکن اگر تم اس روش پر جمے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم نے خدا کی خدائی میں اوروں کو بھی شریک کر رکھا ہے اور اس کے اس مقدس گھر کو فتنہ و فساد کی کثافتوں سے آلودہ کر رکھا ہے۔ تو تمہیں معلوم ہے کہ خدا کو اپنے گھر کو بچانا آتا ہے۔ ابھی کل کا واقعہ ہے جس کے عینی شاہد تمہارے اندر موجود ہیں کہ خدا نے "ہاتھیوں والے" کے لشکر کے ساتھ کیا کیا؟

سورۂ فیل

واقعہ یہ تھا کہ یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے (جو شاہ حبش کا گورنر تھا) ۵۷۰ء میں جو حضورؐ کا سن ولادت ہے۔ ارادہ کیا کہ مکہ کو فتح اور خانۂ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے تاکہ عربوں کی مرکزیت[۱] اور قریش کی سیادت تباہ ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے بجائے اسکے کہ برملا اعلانِ جنگ کرتا اپنے ساتھ ہاتھیوں کی ایک عظیم الشان فوج لیکر خفیہ خفیہ بڑھنا شروع کیا۔ اس یورش کے لئے حج کا موسم تجویز کیا جب عربوں میں لڑائیوں کا سلسلہ منقطع (یا ملتوی) ہو جاتا تھا۔ اور پھر ایام تشریق۔ کہ جن میں تمام عرب ہتھیار الگ رکھ کر رسوم حج کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتے۔ مزید برآں اس نے

---

[۱] تفصیل "تحویل قبلہ" کے عنوان میں ملیگی۔

مانوس راستہ کو چھوڑ کر پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے چور راستہ اختیار کیا تاکہ کسی کو اس حرکت و یورش کا علم ہی نہ ہونے پائے تاآنکہ وہ مکہ پر حملہ آور ہو جائے۔ یہ تھے اس کے مکائد خفیہ تدابیر عرب اسکی آمد سے بے خبر تھے لیکن اللہ تو بے خبر نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسا سبب پیدا کر دیا جس سے یہ تمام راز طشت از بام ہو گیا گدھ اور چیلیں ہمیشہ لاشوں اور مرداروں کی تلاش میں رہتی ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں جب کبھی لشکر ادھر ادھر جنبش کرتے تو وہ اپنی فطری ذہانت سے بھانپ لیتیں کہ کہیں ان کی ضیافت کا سامان ہونے والا ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ساتھ ہو لیتیں۔ ابرہہ نے زمین پر تو تمام حفاظتی تدابیر اختیار کر لیں کہ اس کا راز افشا نہ ہونے پائے۔ لیکن آسمان پر تو اسے کچھ اختیار حاصل نہیں تھا عربوں نے دیکھا کہ گدھوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلاتے چلے آرہے ہیں تو انھوں نے ان "خبر رساں ایجنسیوں" سے فوراً بھانپ لیا کہ ان کے سائے میں کوئی لشکر بڑھے آرہا ہے۔ حج کے موقعہ پر اجتماع عظیم موجود تھا۔ سب ارد گرد کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ نیچے وادیوں میں ابرہہ کا لشکر ہے اور اوپر پہاڑیوں پر عربوں کا ہجوم، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ازمنہ گذشتہ کے فنون حرب سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ سنگ باری اس زمانہ کے کیسے مؤثر حربات میں سے تھی۔ ہزار ہزار من کی چٹانیں اوپر سے لڑھکا دی جاتیں جو اپنے ہی زور (MOMENTUM) سے اس شدت سے نیچے آتیں کہ جو ان کی زد میں آجاتا اس کا بھرکس نکل جاتا۔ آن واحد میں ہاتھی اور ان کا لشکر بھس بنکر رہ گیا۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝ (۱۰۵)

(جماعت قریش!) تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھیوں والوں (ابرہہ اور اسکی فوج) کے ساتھ کیا کیا تھا؟ تمہارے پروردگار نے ان کی خفیہ تدابیر کو بے سود نہیں بنا دیا تھا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ نہیں بھیجدیئے تھے؟ تم (یعنی تمہاری قوم) ادھر سے ان پر پتھراؤ کر رہے تھے چنانچہ (اس طرح تمہارے پروردگار نے) انھیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا کر ڈال دیا تھا!

قریش سے کہا گیا کہ وہ لوگ ابھی تک تم میں موجود ہیں جنہوں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور جنہوں نے نہیں دیکھا انہوں نے دیکھنے والوں سے سنا ہے۔ خدا کو کعبہ کا چونا اور پتھر محبوب نہیں کہ ان کی حفاظت ضروری تھی۔ جس مقصد کے لئے تعمیر کعبہ عمل میں لائی گئی تھی وہ مقصد محبوب تھا۔ تم نے اس مقصد کو غارت کر دیا اور

اس کے بروئے کار لانے میں جو کوشش کی جا رہی ہے۔ تم ان کی مزاحمت کرتے ہو تو جس خدا نے ابرہہ جیسے ذی قوت جیوش وعساکر کے مالک کو اس طرح تباہ کر دیا، کیا اسی قسم کی تباہی تمہارے اوپر نہیں لا سکتا؟

سورۂ ماعون

ڈرو خدا کے قانون مکافات عمل سے کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ لیکن تم ہو کہ اس قانون مجازات ہی کی تکذیب کر رہے ہو۔

اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ؁ (۱۰۷/۱)

(اے پیغمبر!) تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو قانون مکافات کو جھٹلاتا ہے۔

چنانچہ غربا پروری اور مساکین نوازی کی جس غایت کے پیش نظر ہمیں تولیت کعبہ کی فضیلت عطا کی گئی تھی۔ تم نے اس غایت ہی کو غارت کر دیا۔

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ؁ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؁ (۱۰۷/۲-۳)

چنانچہ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو جھڑکتا، ڈانٹتا ہے اور (لوگوں کو) مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔

اور خدا کی وہ صلوٰۃ جس کے لئے اس کعبہ کو مرکز بنایا گیا تھا، اسے اس طرح ضائع کر دیا کہ تمہاری صلوٰۃ و مناسک سب دکھاوے کی رسوم رہ گئیں اور ان کی روح فنا ہو گئی۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ؁ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ؁ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ؁ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ؁ (۱۰۷/۴-۷)

تباہ ہو جائیں یہ نماز پڑھنے والے جو (نمازیں پڑھتے ہوئے بھی) اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ جو صرف دکھلاوے ہی کی خاطر سب کچھ کرتے ہیں اور ذرا سی خیرات تک سے (لوگوں کو) روکتے ہیں۔

پھر دیکھئے کہ براءت اور قطع علائق کے اعلان کی سورۃ کافرون کو کس طرح دو مبشرات (سورۂ کوثر اور نصر) کے درمیان رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں پر انتہائی بے کسی اور بے بسی، عاجزی اور بیچارگی، مفلسی اور ناداری کا عالم طاری تھا، ستم رسیدگی اور مظالم کشی کی حد یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اب وہ ترک وطن بھی کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں جبکہ (بظاہر) چاروں طرف مایوسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ انہیں فتح و ظفر اور کثرت و فراوانی کی بشارتیں دی جاتی ہیں۔ سورۂ کوثر کو دیکھئے۔ تین مختصر سے جملوں میں

سورۂ کوثر

قدر اہم امور سمیٹ کر رکھ دیئے ہیں وقت وہ ہے کہ جب ہر شے کی کمی محسوس ہو رہی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸/۱) ہم نے تمہیں ہر شے کی کثرت و

فراوانی سے نواز دیا۔ اَعْطَیْنٰکَ پر غور کیجئے۔ "ہم نے تمہیں عطا کر دیا"۔ انداز بیان ہی کس قدر حتمی اور یقینی ہے سو اس جہان نو میں پہنچکر جس کی طرف اب آپ جادہ پیما ہو رہے ہیں، اللہ کے اس نظام حکومت کو مستحکم کیجئے جس کی ہیئت صغریٰ صلوٰۃ میں منعکس ہے اور جس کی تکمیل حج[1] میں جا کر ہوتی ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○ (۲/۱۰۸)

لہٰذا اپنے پروردگار کے لئے نماز قائم کرو اور قربانی کرو۔

غور کیجئے۔ اس آیت میں صرف تین الفاظ ہیں اور ہر لفظ اپنی جگہ ہمالیہ کی طرح محکم۔ نماز اور قربانی میں ملت اسلامیہ کی ہیئت اجتماعیہ کا پورا انتظام آجاتا ہے۔ نماز، اس جماعت کے شب و روز کے گرد ایک ایسا حصار کھینچ دیتی ہے جس میں یہ باطل کی ہر قوت سے محفوظ و مصئون ہو جاتی ہے۔ اور حج ان کی سال بھر کی زندگی کا پورا پروگرام مرتب کر دیتا ہے اور یہ سارا انتظام کس لئے قائم کیا جاتا ہے؟ لِرَبِّكَ۔ "اپنے رب کے لئے" وہی جو مومن کی زندگی کے ہر سانس کا منتہیٰ و مقصود ہے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۶/۱۶۲)

میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے!

اس استخلاف فی الارض سے مقصود، جوع الارض کی تسکین اور ذاتی خواہشات کی تکمیل نہیں۔ بلکہ شرف و مرتبت انسانیت کا عروج و ارتقاء ہے جو انسان کو اس منزل کی طرف لیجاتا ہے جو اس کی تخلیق کی غایت ہے۔

پھر نحر کے لفظ پر غور فرمائیے۔ نحر اونٹ کی قربانی کے لئے مخصوص ہے۔ اب اس جماعت مومنین کا رخ مدینہ کی طرف تھا جہاں یہود کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اب مسلمان وہاں یہودیوں کے ساتھ ملکر قریش مکہ سے انتقام لینے کی فکر کریں گے اور چونکہ مسلمان کمزور ہیں اس لئے ان سے دب کر اتحاد کریں گے جس میں شاید اپنے اصولوں کو بھی چھوڑ دینا پڑے۔ لفظ نحر نے ایسے تمام باطل خدشات و خیالات کے گلے پر چھری پھیر دی۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ اور مسلمانوں کو اونٹ کی قربانی کا حکم۔ لہٰذا ان دونوں کے مسلک میں بنیادی اختلاف ہو گیا۔

---

[1] تفصیل حج کے عنوان میں کسی آئندہ جلد میں ملے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ وَانْحَرْ سے مراد حج اس لئے ہے کہ قرآن کی رو سے قربانی کا مقام خانۂ کعبہ (بیت العتیق) ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ○ (۲۲/۳۳)

پھر (اس) خانۂ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے

اور تقریب حج کی۔ اور اگر حج کے معنی عام لئے جائیں تو مفہوم ہوگا اونٹ ذبح کر کے محتاجوں کو کھلانا۔

اب تیسرا ٹکڑا دیکھئے۔ جس میں۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۱۰۸:۳﴾

(اے پیغمبر!) یہ واقعہ ہے کہ تمہارے بدخواہ ہی ہیں جن کا نام و نشان بھی باقی نہ رہیگا۔

یعنی اس نظام کے قیام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو بھی حق و صدق کے اس نظام کا مخالف ہوگا اسکی جڑ کٹ جائیگی

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶:۴۵﴾

تو (دیکھو) اس طرح اُس گروہ کی جڑ کاٹ دی گئی جو ظلم کرنے والا تھا اور تمام ستائشیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے

سورۂ نصر اس کے بعد سورۂ نصر کو دیکھئے۔ ایسی مایوسی کے عالم میں، فتح و ظفر کی ایسی کھلی ہوئی بشارت۔ صرف خدائے علام الغیوب کی طرف سے ہی دی جا سکتی تھی۔ (تشریح اس سورۂ مقدسہ کی فتح مکہ کے ضمن میں آئے گی)

سورۂ لہب اس کے بعد سورۂ لہب ہے جو تنذیر و وعید پر حرف آخر ہے۔ اس میں قریش کی شکست و ہزیمت اور ناکامی و نامرادی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ (تفصیل اس کی بھی بعد میں آئے گی جہاں یہ بتایا جائیگا کہ اس میں ابولہب کو کیوں خصوصیت سے خطاب کیا گیا ہے)

سورۂ اخلاص پھر سورۂ اخلاص ہے، جس میں اس حقیقت کبریٰ کی وضاحت ہو گئی ہے کہ یہ تمام سلسلۂ شکست و ریخت اور تعمیر و تربیت کس غرض کے لئے ہے۔ تفصیل تو اس کی طول طویل ہے لیکن اجمالاً اسے ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ لفظ ہے توحید۔ قرآن کا سارا پیام اسی ایک لفظ کی تفسیر ہے اس کا تمام نظام اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ اس کی کہکشاں گیر و ثریا بوس عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے۔

معوذتین اس کے بعد معوذتین، یعنی مصائب و آلام کی تلاطم خیزیوں اور نوازل و زلازل کی بلاانگیزیوں، شدائد و نوائب کے ہجوم اور حیل و مکائد کے طوامیر سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو قوانین خداوندی اور نصرت ایزدی کے حصن حصین میں لے آنا۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ ﴿۱۱۳:۱-۵﴾

کہدو کہ میں رات کی ظلمت خیز تاریکیوں سے جب بظاہر امید کی کوئی کرن کہیں نظر نہیں آتی،

اس خدا کے آغوش عافیت میں آنا چاہتا ہوں جو ایسی تیرہ و تار رات کے بعد ظلمات کی فضاؤں کو چیر کر فادر و درخشندہ سے تمام کرۂ ارض کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ میں ہر شے کے شر انگیز پہلو سے اس مبدأ خیر کی پناہ چاہتا ہوں۔ اپنی پیش نظر مہم میں تمام ایسی جماعتوں سے بچنا چاہتا ہوں جو کسی کے عزم راسخ میں تزلزل اور پائے استقامت میں لغزش پیدا کر دیں۔ اور ان سے بھی جو اس مہم کی کامیابی کو دیکھ کر محض بربنائے حسد، مخالفت پر آمادہ ہو جائیں!

غور کیجئے! تیرہ برس کی کوہ کنی کے بعد ایک مختصر سی جماعت کو ساتھ لیکر ایک جدید محاذ قائم کرنے کا پروگرام پیش نظر ہے۔ مقابلہ میں دنیا بھر کی قوتیں برسر پیکار ہیں۔ ایسی حالت میں دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ افراد جماعت کے عزم کی پختگی اور ارادوں کی بلندی میں ذرا سا فرق بھی نہ آنے پائے اور دوسرے یہ کہ اس تمام تگ و تاز اور جد و جہد میں مطمح نگاہ اعلائے کلمۃ الحق کے سوا کچھ نہ ہو تاکہ اللہ کی تائید و نصرت یعنی حق سے ہم آہنگی کے فطری نتائج ہمیشہ شامل حال رہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۙ الَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱۴)

اس خدع و فریب کے مجسمہ سے جو چپکے چپکے۔ دبے پاؤں چور کی طرح آئے اور کان میں کچھ پھونک کر اسی طرح سے خاموش پیچھے ہٹ جائے۔ خواہ وہ مانوس لوگوں سے ہو یا غیر مانوس سے۔ میں اس خدا کی تائید و نصرت کی پناہ طلب کرتا ہوں جو نوع انسانی کا پروردگار ہو۔ انکا بادشاہ اور الٰہ۔

غور کیجئے، ربوبیت کے معنے ہیں کسی چیز کو اس کی ابتداء سے انتہا تک تمام مراحل بحسن و خوبی طے کرا دینا۔ اُسے تکمیل تک پہنچا دینا۔ اس خدا کی نصرت و معاونت کی طلب جو نوع انسانی کو ان کے نقطۂ آفرینش سے انسانیت کی معراج کمال تک پہنچا دے اور اس کا طریق یہ ہے کہ طبعی اور انسانی (روحانی) زندگی کے ہر شعبہ میں مقصود نگاہ اسی کی ذات ہو۔ طبعی زندگی کے لئے اس کی ملکیت اور حیات انسانیہ کے لئے اس کی الوہیت۔ لہٰذا دنیا میں ارباب حکومت و اقتدار اور مدعیان روحانیت و اسرار (یعنی بادشاہت اور برہمنیت) دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر تمام نوع انسانی کا ایک رب۔ ایک شاہنشاہ اور ایک الٰہ ہونے کی جہت سے تمام نوع انسانی کا ایک ہونا بھی مشہود ہو گیا۔ لہٰذا وحدت خالق سے وحدت خلق کا عالمگیر تصور فوراً سامنے آ گیا۔ اس خدا کی نصرت و تائید دنیا کی ہر اس قوت کے خلاف جو انسانوں کے ایمان و ایقان میں وسوسہ اندازی اور شکوک انگیزی پیدا کرنے کی سعی مذموم کریں۔

ان دعاؤں اور التجاؤں۔ ان آرزؤں اور تمناؤں کو ساتھ لیکر ایک جہاں نو کیطرف جادہ پیما ہونے کا عزم کیا گیا، جو دنیا میں خدا کی بادشاہت کا محسوس محور بنے اور جہاں سے اس آسمانی انقلاب کے چشمے پھوٹ کر سارے عالم میں تموج و تحرک پیدا کردیں۔

نبی اکرمؐ صحابہؓ کو مدینہ کی سازگار فضا کی طرف بھیجتے جاتے تھے۔ قریش نے جب یہ دیکھا کہ اس طرح اسلام مدینہ میں قوت پکڑتا جارہا ہے اور ان کے لئے ایک زندہ خطرہ بن رہا ہے تو انھوں نے اس معاملہ پر گہری توجہ بنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے دار الندوہ میں ایک اجلاس عام کیا جس میں ہر قبیلہ کے رؤسا شریک تھے۔ لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ کسی نے کہا کہ حضورؐ کو قید کردیا جائے۔ کسی نے کہا کہ جلاوطن کردینا کافی ہوگا۔ ابوجہل نے کہا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک شخص منتخب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر حضورؐ کو قتل کردے۔ اس صورت میں

حضورؐ کے قتل کی سازش

آپ کا خون تمام قبائل میں بٹ جائیگا۔ اور بنو ہاشم کے لئے سارے قریش کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ قرآن کریم میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرکے کہا گیا ہے کہ

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ (۸/۳۰)

اور (اے پیغمبر!) وہ وقت یاد کر جب (مکہ میں) کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے، تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں یا قتل کر ڈالیں، یا جلاوطن کردیں، اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے، اور اللہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہا تھا۔ اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے!

سورۂ طلاق میں ہے۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (۸۶/۱۵-۱۷)

یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی مخفی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں اپنی خفیہ تدابیر میں مشغول ہوں (دونوں طرف سے تدبیریں ہو رہی ہیں) لہٰذا (اے پیغمبر!) ان منکرین حق کو کچھ مہلت دیدو۔ تھوڑی دیر کیلئے چھوڑ دو (بہت جلد معلوم ہوجاتا ہے کہ کون اپنی تدابیر میں کامیاب ہوتا ہے اور کس کی تدابیر ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھتی ہیں)

نبی اکرمؐ کو مخالفین کے ان ارادوں کا علم ہوچکا تھا۔ آپ نے بمشاورت حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے سامان مکمل کرلئے

شبِ ہجرت

دوسری طرف مخالفین بھی اپنی قرارداد کے مطابق، اس فکر میں تھے کہ موقعہ پاکر آپ کا (معاذ اللہ) خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ حضورؐ کو یقیناً اس کا علم ہوگا۔ بالآخر ایک رات طے پا گیا کہ آپ مکہ کو چھوڑ دیں۔ مکان میں حضرت علیؓ حضورؐ کے پاس تھے۔ آپ نے دیکھا کہ اگرچہ سامانِ سفر وغیرہ کے متعلق حضورؐ کو کوئی فکر نہیں کہ وہ حضرت صدیق اکبرؓ کے ذمہ تھا۔ بایں ہمہ کسی بات کا تردد

اور ایک تردد

ہے جو حضورؐ کے لئے وجہ پریشانی ہو رہا ہے! حضرت علیؓ نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! ایک تردد ہے جو میرے لئے فی الواقعہ باعث پریشانی ہو رہا ہے

بھلا آپ سوچئے تو سہی کہ اس وقت کونسی بات وجہ تردد اور باعث پریشانی خاطر ہو سکتی تھی؟ خود سوچئے یا کسی اور صاحب دانش و بینش سے پوچھئے طائر فکر زیادہ سے زیادہ انہی گوشوں تک پہنچ سکے گا کہ ان حالات میں حضورؐ کو یہی فکر لاحق ہوگا کہ ان حالات میں کس طرح جان بچائی جا سکتی ہے؟ یا یہ کہ اگر میں بحفاظت نکل بھی گیا تو پس ماندگان کا کیا حشر ہوگا؟ وقس علیٰ ہذا۔

یہ اندیشے بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ لیکن سیرت کی بلندی، انسان کو ان حدود سے کہیں بلند لیجاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے تردد یہ لاحق ہو رہا ہے کہ میں آج کی رات یہاں سے نکل جاؤں گا لیکن میرے پاس ان لوگوں کی (جو آپ کے قتل کے درپے تھے) کچھ امانتیں موجود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان امانتوں کو اپنے ساتھ لیجاؤں یا ایسی صورت میں چھوڑ جاؤں کہ وہ اپنے حقداروں تک نہ پہنچ سکیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ اس وقت کونسا تردد حضورؐ کے لئے وجہ پریشانی ہو رہا تھا؟ چنانچہ قرار یہ پایا کہ حضرت علیؓ .... یہ امانات اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں۔

کچھ رات گئے حضورؐ اللہ کی حفاظت کا یقین لئے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے حسب تجویز حضرت ابوبکرؓ بھی آپ سے مل گئے۔ اور آپ۔

وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ○ (۱۷/۸۰)

اور تیری دعا یہ ہونی چاہئے کہ "اے پروردگار! مجھے (جہاں کہیں پہنچا، تو) سچائی کے ساتھ پہنچا۔ اور (جہاں کہیں سے نکال، تو) سچائی کے ساتھ نکال، اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنے والی ہو"

حضورؐ کی ہجرت

کی دعائیں مانگتے مکہ سے جانب مدینہ روانہ ہو گئے۔ صبح قریش نے دیکھا کہ

حضورؐ گھر میں نہیں ہیں۔ انہوں نے حضرت علی رضؓ کو کچھ وقت کے لئے ستایا لیکن پھر چھوڑ دیا۔ اور حضورؐ نے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ۲۷ صفر ۱۳ نبوت (مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء) کا واقعہ ہے۔ مکہ سے دائیں جانب تین چار میل کے فاصلہ پر، پہاڑ کی چوٹی کے اوپر ایک غار ہے (جسے غار ثور کہتے ہیں) حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ صبح سے پہلے پہلے اُس غار میں جا چھپے۔ دشمن تعاقب کو نکلے تو اسی طرف ہو لئے۔ حتیٰ کہ وہ اتنے قریب آگئے کہ ان کے پاؤں کی آہٹ غار میں سنائی دیتی تھی۔

اس مقام پر ذرا ٹھہر کئے اور حالات کا جائزہ لیجئے۔ آبادی سے دور، غار کی تنہائیوں میں، دو۲ اور صرف دو۲ متنفس چھپے بیٹھے ہیں۔ متعاقبین کا گروہ غار کے دہانہ کے قریب آپہنچا ہے۔ خطرہ کی آمد حضرت ابوبکرؓ کے دل میں پریشانی کی رمق پیدا کر رہی ہے جس کے آثار آپ کے خطوط جبیں سے چھلک پڑتے ہیں۔

غار کی تنہائیاں

یہ پریشانی اپنی وجہ سے نہیں بلکہ اس ذات گرامیؐ کی خیر طلبی کے جذبہ سے ہے جو دنیا میں ہر متاع (حتیٰ کہ خود اپنی جان) سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ حضورؐ ان آثار کو بھانپ لیتے ہیں اور سکون اور جمعیت خاطر کے اس انداز سے کہ جس میں طمانیت قلب کی ہزاروں جنتیں جھلک رہی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ (۹/۴۰)[1]

(اے ابوبکرؓ) فکر نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے

یہ ہے ایمان کا وہ مقام جس پر نبی خود فائز المرام ہوتا ہے اور اپنے متبعین کو پہنچانا چاہتا ہے۔ اللہ

[1] پوری آیت یہ ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (۹/۴۰)

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اللہ نے اسکی مدد کی ہے۔ اور اس وقت کی ہے جب کافروں نے اسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ (صرف دو آدمی تھے) اور دو۲ میں دوسرا اللہ کا رسول تھا اور دونوں غار (ثور) میں چھپے بیٹھے تھے۔ اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی کو کہا تھا "غمگین نہ ہو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے" وہ دشمنوں کو ہم پر قابو نہ دیگا) پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا، اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنھیں تم نہیں دیکھتے اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور (تم دیکھ رہے ہو کہ) اللہ ہی کی بات ہے جس کے لئے بلندی ہے' اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے!

کی معیت! دنیا بھر کی قوتیں اس ایک ایمان کے اندر پوشیدہ ہیں لیکن یہ معیت حاصل کیسے ہوتی ہے؟ بات بالکل صاف ہے۔ اللہ حق ہے۔ جب آپ حق پر ہوں تو اللہ آپ کے ساتھ ہے۔ اور یہ حق، قرآن کے اندر ہے۔

تین شب و روز حضورؐ نے اپنے "یارِ غار" کے ساتھ یہیں بسر کئے۔ چوتھی شب حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے سواری کی اونٹنیاں آگئیں اور آپؐ آگے روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں اطلاع پہنچ چکی تھی کہ آپ نے مکہ چھوڑ دیا ہے۔ تمام انصارؓ و فورِ شوق و جذبۂ محبت سے سرشار، صبح نور کے تڑکے بستی سے باہر آکر دیدہ و دل فرشِ راہ کئے انتظار میں بیٹھ جاتے، ہر روز صبح یہی کیفیت رہتی۔

محبوب اور ایسا جاں نواز محبوب! انتظار اور ایسا سرور آمیز انتظار! کیسا وجد انگیز تھا یہ منظر!!!

دشمن سامنے

قریش نے حضرتؐ کی گرفتاری پر سو اونٹ کا انعام مشتہر کر رکھا تھا۔ بریدہ اسلمی، ایک قبیلہ کا سردار، اس انعام کے لالچ سے حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ حضورؐ کو راہ میں پالیا۔ جب سامنے آیا اور ہمکلام ہوا تو اثر و جذب کا ایک تیر تھا جو سیدھا دل تک اتر گیا اور اپنی قوم کے ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ جوشِ مسرت سے اپنی سفید پگڑی نیزہ پر باندھ کر اس کاروانِ رشد و سعادت کے آگے آگے چل پڑا پگڑی کا پھریرا ہوا میں لہراتا اور رقص انگیز انداز سے بشارتیں سناتا چلا جا رہا تھا کہ "امن کا بادشاہ۔ صلح کا حامی۔ دنیا کو انصاف و عدالت سے بھرپور کر دینے والا" آرہا ہے۔ اس طرح رواں دواں، نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے یہ قافلۂ جذب و سرور مدینہ کی طرف بڑھتا گیا۔ اور ۱۲ ربیع الاول (۲۴ ستمبر) کی صبح مدینہ کے قریب جا پہنچا۔

مدینہ میں تشریف آوری

مشتاقین کی جماعت حسبِ معمول انتظار کے بعد واپس لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرائن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرشِ راہ بن رہی ہیں۔ اس نے آواز دی کہ "اہلِ عرب۔ وہ جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آگیا!" تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور انصار ہتھیار سج سج کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے اور پروانہ وار اس آواز کی سمت بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قبا کہتے ہیں۔ حضورؐ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی اور حضورؐ نے ان کی میزبانی قبول فرمالی۔ یہاں سب سے پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا۔ یہی وہ مسجد قبا ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (۹/۱۰۸)

(اے پیغمبر!) اس بات کی کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگانِ الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی

مسجد حقدار ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا) اس میں ایسے لوگ (رہتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک و صاف رہیں۔ اور اللہ (بھی) پاک و صاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے!

چودہ دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی قبا سے مدینہ تک راستہ میں دو رویہ فدائیوں کی صفیں تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور فرطِ عقیدت سے معمورہ جذب و نشاط اور گہوارۂ حسن و بہار بن رہا تھا گلی کوچوں سے تحمید و تقدیس کے نغمے اور تسبیح و تہلیل کے زمزمے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت بیز بنا رہے تھے جوشِ استقبال سے ساتگین قلوب اس طرح بے محابا چھلک رہے تھے کہ صہبائے محبت، مسرت و ابتہاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامان و آستین کو صحن گلستان و کف باغبان بنا رہی تھی کہیں وفور تشکر و امتنان سے جبیں ہائے نیاز بحضور رب ذوالمنن سجدہ ریز و زمین بوس تھیں اور کہیں ہجوم جذبات سے مرتعش ہاتھ تھے کہ بارگاہ صمدیت میں اس مہمانِ عزیز کی خیر سگالی اور خوش بختی کی حسین دعائیں اور معصوم التجائیں لئے ہوئے یوں جانب عرش عظیم اُٹھ رہے تھے جیسے دشت ساکت و خاموش میں نخیلِ بلند ایستادہ ہوں۔ خاک یثرب کے ذرات ابھر ابھر کر ہمہ تن دید بن رہے تھے کہ انھیں آج اس ذات اقدس و اعظم کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمام عالم کے لئے سرمایۂ ناز و مباہات تھی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جوشِ مسرت میں دف بجاتیں اور یہ استقبالیہ نغمہ گاتی تھیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا		مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا		مَا دَعَىٰ لِلّٰهِ دَاعٍ

خلوص و محبت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حسن و خوبی یثرب کی بستی میں داخل ہوا جسکا نام اس کے بعد مدینۃ النبی ہو گیا۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں حضورؐ کی میزبانی کی سعادت کس کے نصیب ہوتی ہے۔ یہ شرف حضرت ایوب انصاری کے مقدر میں تھا جہاں اب مسجد نبوی ہے۔ حضرت ایوبؓ کا مکان اس سے متصل تھا۔ وہیں فروکش ہو گئے

مسجد نبوی کی تعمیر

اس جہانِ نو میں اب اس نظام کی تشکیل کے خطوط معین ہونے شروع ہو گئے۔ گذشتہ تیرہ[۱۳] برس کا عرصہ جسکی گویا تمہید تھا اس نظام کی تربیت گاہ اور دار المشاورت یعنی مرکزِ صغیر مسجد ہوتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے مسجد ہی تعمیر کی گئی۔ نہایت سادہ عمارت کچی اینٹوں کی دیواریں کھجور کے پتوں کی چھت۔ کچا فرش لیکن مٹی اور پانی کی اس کچی عمارت کے اندر نماز پڑھنے والوں کے قلب و دماغ اس قدر پختہ کہ دنیا کی آہنی قوتیں ان سے ٹکرائیں اور پاش پاش ہو گئیں۔ مسجد سے متصل ہی سکونتی مکانات بنوائے۔ مکانات کیا؟ کچی اینٹوں کے مختصر سے حجرے تھے۔ کوئی دس دس فٹ چوڑے بارہ بارہ فٹ لمبے چھتیں اتنی نیچی کہ آدمی کھڑا ہو تو سر چھت سے جا ٹکرائے۔ دروازوں پر کمبل پڑے رہتے تھے۔ یہ نہیں کہ زمانۂ غربت و افلاس میں مجبوراً ایسے مختصر سے حجروں میں سکونت اختیار کر لی گئی تھی جب پورے عرب کی بادشاہت مل گئی تھی اس وقت کے

"محلات وقصور" بھی یہی مختصر سے کچے حجرے ہی تھے۔

اس کے بعد خاص اہتمام سے جماعت کا التزام کیا گیا اور نمازیوں کو بلانے کیلئے اذان تجویز ہوئی۔ اسی جماعت کا سلسلہ مسجد کی چار دیواری سے آگے بڑھا اور مواخاۃ کے نام سے اسکی تاسیس ہوئی۔ مکہ کے مسلمان، ایک شہر کے رہنے والے اور بالعموم باہمی قرابت دار تھے۔ یہاں پہنچے تو انصار دوسرے "وطن" کے باشندے۔ اور غیر قبائل سے متعلق۔ اب فی الحقیقت اس اسلامی قومیت کی بنیاد رکھی گئی جو نسل اور وطن کی غیر فطری حدود سے بے نیاز اور رنگ اور زبان کے امتیازات سے معرّیٰ ہوتی ہے۔ مہاجرین میں بعض حضرات دولتمند بھی تھے لیکن چونکہ مکہ سے چھپ چھپا کر نکلے تھے اسلئے مدینہ پہنچے تو بالکل نادار تھے۔ انصار کا مال و متاع ان کے نخلستان تھے۔ انھوں نے اپنی تمام کائنات اس مرکزِ ملت کے قدموں میں ڈھیر کردی اور خود درخواست کی کہ انھیں مہاجرین اور انصار میں نصفا نصف بانٹ دیا جائے۔ حضورؐ نے اس تقسیم کے بجائے مختلف مہاجرین کو مختلف انصار کا "بھائی بھائی" بنا دیا یہی وہ سلسلہ مواخاۃ و موالات تھا جس کا ذکر قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

مواخاۃ کا سلسلہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸:۷۲)

جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ (کے دین) کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اور جن لوگوں نے (مکہ کے مہاجرین کو مدینہ میں) جگہ دی اور ان کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا کارساز و رفیق ہے؟

ان کی کیفیت یہ تھی کہ خود بھوک اور افلاس کی سختیاں برداشت کرتے تھے لیکن کیا مجال جو اپنے بھائیوں کو ذرا بھی تکلیف ہونے دیں۔ سورہ حشر میں ہے:

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي
صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ
وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ (۵۹:۹)

اور (دیکھو) جو لوگ (قبائل انصار، شہر مدینہ میں) پہلے سے گھر بنا چکے ہیں (یعنی ان کے گھر موجود ہیں) اور (ساتھ ہی دعوتِ حق پر یقین رکھنے کی دولت) سے بھی مالا مال ہیں وہ ان لوگوں سے جو انکی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں محبت کرتے ہیں اور جو کچھ انھیں (یعنی مہاجرین کو خدا کی طرف سے) دیا گیا ہو اسکے لئے اپنے سینوں میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے (یعنی اس میں اپنا حصہ بٹانے کا خیال بھی نہیں لاتے) اور اگرچہ کتنی ہی تنگدستی میں مبتلا ہوں پھر بھی مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں (کہ خود بھوکے رہ جائیں گے مگر انھیں کھلا دیں گے) اور حقیقت یہ ہے کہ جنھیں نفس کی خست اور بخیلی سے نجات مل جاتی ہے تو وہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہوتے ہیں!

یہی وہ لوگ تھے جنھیں قرآن کی شہادت نے "مومن حقا" قرار دیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸/۷۴)

(غرضکہ) جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ (کے دین) کی راہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے (مہاجرین مکہ کو) پناہ دی اور مدد کی، تو فی الحقیقت یہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی!

کتنی عظیم الشان ہے یہ شہادت اور کتنا بلند تھا ان حضرات کا نصیبہ۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ یہ رشتۂ اخوت ایسا استوار ہوا کہ انصار بھائی کی موت پر اس کے ترکہ کا وارث مہاجر بھائی قرار دیا جاتا لیکن جب بعد میں اس کی ضرورت نہ رہی تو قرآن کریم نے اس کی تصریح کردی کہ ترکہ میں رشتۂ قرابت مقدم ہونا چاہئے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۸/۷۵)

اور جو لوگ بعد کو ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا، تو وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں (انہیں اپنے سے الگ نہ سمجھو) اور (باقی رہے) قرابت دار، تو وہ اللہ کے حکم میں ایک دوسرے کی میراث کے زیادہ مقدار ہیں (پس باہمی بھائی چارگی میں ان کے حقوق فراموش نہ کردیئے جائیں) بلاشبہ اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

یورپ اسے نہیں سمجھ سکتا

آج یورپ کے علمائے عمرانیات کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے سے قطعاً واقف نہ ہوں، کس طرح ایک دوسرے کے معاون و مددگار اور شریک غم و الم ہوسکتے ہیں؟ اس لئے کہ یورپ کے تمام نظام تعاون وتناصر کی بنیاد سوداگری (Business) ہے ان کی نگاہیں نفع اور نقصان (Profit and Loss) کے اعداد و شمار سے آگے جا ہی نہیں سکتیں۔ چنانچہ عمرانیات (Sociology) کا مشہور ماہر Cooly اپنی کتاب Social Organism میں لکھتا ہے

محبت، تعاون اور اخوت کے بنیادی جوہر یکسر جذباتی اور ذاتی ہیں، اور بڑی بڑی جماعتوں پر ان کا اطلاق ناممکن ہے یہ تو ممکن ہو کہ آپ اپنے اس ہمسایہ سے پیار کریں جسے آپ ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ لیکن یہ تقاضا کہ آپ ان لوگوں سے محبت کریں جن سے آپ متعارف نہیں، ایک ناممکن مطالبہ ہے۔

یہ اس لئے کہ مغرب کے یہ علمائے عمرانیات و تمدن اس رشتہ کی گہرائیوں اور حدود فراموشیوں سے یکسر ناآشنا ہیں جس کی بنیاد ایمان جیسے گہرے جذبے پر ہوتی ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس کے ماتحت روئے زمین کے تمام مومن اپنے آپ کو ایک جسد واحد کی طرح محسوس کرتے ہیں کہ پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے سے آنسو چھلک جائے اور جب تک وہ کانٹا نکل نہ جائے تمام جسم پر راحت و آرام اور خورد و نوش حرام ہو جائے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ اور اس کے اطراف میں یہود[1] آباد تھے اور انکا اثر و اقتدار بھی کافی تھا۔ یہ تین قبیلے تھے بنو قینقاع۔ بنو نضیر اور بنو قریظہ کتب تاریخ میں ہو کہ حضورؐ نے مدینہ کی حفاظت کے متعلق مہاجرین و انصار اور یہود مدینہ کے درمیان ایک معاہدہ کیا۔ ذرا حالات کے پس منظر پر نگاہ رکھیے۔ مہاجرین، بیکس و نادار، ایک نئی بستی میں آکر پناہ

یہود سے معاہدہ

پناہ گزیں ہوئے ہیں جن کے ہاں پناہ لی ہے وہ بھی یہود کے مقابلہ میں زیادہ اثر و اقتدار نہیں رکھتے لیکن بایں ہمہ اس معاہدہ کی دفعات پر نگاہ ڈالئے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ معاہد مغلوبانہ تو کجا، مساویانہ حیثیت سے بھی نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایک ایسا معاہدہ ہے جیسے ایک بالا دست جماعت مشترکہ دفاع کے لئے فریق ثانی سے کرتی ہے۔ معاہدہ کا سرنامہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

هٰذَا كِتَابٌ مِّنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ (صلعم) بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قُرَيْشٍ وَّيَثْرِبَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ فَلَحِقَ بِهِمْ وَجَاهَدَ مَعَهُمْ۔

یہ تحریر ہے محمد النبی (صلعم) کی قریش اور یثرب کے مؤمنین اور ان لوگوں کے باب میں جو ان کے اتباع میں ان کو ساتھ شامل ہوں اور ان کے ساتھ ملکر جہاد کریں۔

اور

وَاَنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ بَعْضُهُمْ مَوَالِيْ لِبَعْضٍ دُوْنَ النَّاسِ

اور سب مؤمن ایک دوسرے کے بھائی اور مددگار ہیں اوروں کے مقابلہ میں

اور

وَاَنَّهٗ مَنْ تَبِعَنَا مِنْ يَهُوْدَ فَاِنَّ لَهُ النَّصْرُ وَالْمُرُوْءَةُ غَيْرُ مَظْلُوْمِيْنَ وَلَا مُتَنَاصِرِيْنَ عَلَيْهِمْ۔

جو یہودی ہماری اتباع میں (ہمارا ساتھ دیں) وہ امداد و مروت کے حقدار ہوں گے۔ اس طرح کہ نہ ان پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف مؤمن باہم ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

اور یہ کہ

وَاَنَّهٗ مَا كَانَ بَيْنَ اَهْلِ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ مِنْ حَدَثٍ وَّاشْتِجَارٍ يُخَافُ فَسَادُهٗ فَاِنَّ مَرَدَّهٗ اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاِلٰى مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ (صلعم)

اس تحریر کے ماننے والوں میں اگر کوئی نئی بات پیدا ہو (جس کا ذکر اس معاہدہ میں نہیں) یا کوئی اور جھگڑا

---

[1] یہود اور نصاریٰ، دعوت اسلام کے کس طرح اور کیوں مخالف ہوگئے۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازعہ فیہ امر میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنا ہوگا[۱]۔

اس طرح مدینہ میں اندرونی سازشوں اور بیرونی خدشات کے امکانات کو کم کرنے کے بعد نبی اکرمؐ اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت خصوصی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ اصل کام ان افراد صالحہ کو ایک خیر امت میں تبدیل کر کے انہیں عالمگیر انقلاب کا اولین خمیر بنانا تھا کہ اس کے بعد پھر وہ نوع انسانی کے جس آٹے میں جا کر ملیں اس میں بھی وہی خمیر پیدا ہو جائے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

---

[۱] یہ ہیں اس معاہدہ کی بعض دفعات جسے بعض لوگ مسلم و غیر مسلم کے امتزاج و ائتلاف اور ضم و ادغام سے "متحدہ قومیت" کی تشکیل کے لئے بطور سند پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن معاہدہ تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے ضم و ادغام سے ایک متحدہ قومیت کی تکوین نہیں بلکہ ایک مشترکہ مقصد میں باہمی رضامندی سے متحدہ محاذ قائم کرنے کی صورت تھی اور وہ بھی اس شکل میں کہ مسلمانوں کا ہاتھ بہرکیف غالب رہے۔ یہ حضرات اپنے دعوے کی دلیل میں یہ چیز پیش کرتے ہیں کہ اس معاہدہ کے سرنامہ کے بعد یہ بھی مذکور ہے کہ

اَنَّهُمْ اُمَّةٌ وَّاحِدَةٌ مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ ۔"

یہ باہمی معاہدہ کرنے والے لوگ، دوسروں کے مقابلہ میں ایک جماعت ہوں گے

اس لئے مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں۔ اس دلیل کی عنکبوتیت واضح ہے۔ "اُمّۃ واحدۃ" سے مفہوم ایک فریق (one party) ہے، نہ کہ مصطلحہ قوم (Nation) جیسا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کی اساس و بنیاد اس اہم اصل پر ہوتی ہے کہ قومیت کا امتیاز کفر و اسلام ہے۔ اس تمام تعلیم کے مقابلہ میں، اس معاہدہ کے الفاظ "اُمَّةً وَّاحِدَةً" سے یہ دلیل لانا کہ مسلم و غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں قرآن کی بنیادی تعلیم سے متناقض ہے اور اس اصل عظیم کے صریحاً خلاف جس کی تبلیغ و قیام کیلئے حضورؐ تشریف لائے۔ اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ معاہدہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ کا آئینہ قرآن ہے۔ تاریخ کے واقعات کو اس کے تابع رکھنا ہوگا۔ اگر کوئی روایت قرآن کے خلاف جائے گی تو قرآن کو صحیح اور تاریخی روایت کو مشتبہ ماننا ہوگا

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

مرکزِ ملّت

تحویلِ قبلہ

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

قوموں کی ہستی کا مدار ان کی مرکزیت پر ہوتا ہے، ان کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی خصوصیت اسی نقطۂ ماسکہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر ان کی مرکزیت میں خلل و انتشار واقع ہو جائے تو انکی ملی حیثیت کا شیرازہ اس طرح بکھر جاتا ہے جسطرح پرکار کا پاؤں مرکز (CENTRE) سے ہل جانے سے پورے کا پورا دائرہ بگڑ جاتا ہے۔ قوموں کا خصوصی امتیاز ان کا اندازِ فکر ہے جو تہذیب و تمدن کے محسوس پیکروں میں دنیا کے سامنے آتا ہے اور تہذیب و تمدن کی محافظ اس قوم کی قوت و سطوت ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے پس پشت قوت و اقتدار موجود نہ ہو لیکن یہ قوت و اقتدار بھی ایک مرکز کا محتاج ہوتا ہے۔ اور مرکزی تشتت و خلفشار، بڑی سے بڑی قوت قاہرہ کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ قوت اور حکومت کا مرکز اس قوم کا دارالسلطنت ہوتا ہے۔ تاریخ کے شواہد پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ قوموں کے قیام و فنا میں ان کے دارالسلطنت کو کتنا بڑا دخل رہا ہے۔ بڑی سے بڑی وسیع و عریض سلطنت کو مغلوب کرنے کیلئے اس کے دارالخلافہ کو فتح کر لینا کافی ہے۔ یوں دیکھئے تو دارالخلافہ بھی دوسری بستیوں کی طرح اینٹ اور پتھر کی عمارات کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ لیکن محسوسات کے خوگر انسان کے دل میں غیر شعوری طور پر اس کی اہمیت اس قدر پیوست اور محکم گیر ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو اس کے رجحاناتِ قلب و میلاناتِ نظر کی طنابیں غیر محسوس طور پر اس مرکز کے ساتھ یوں پیوستہ ہوں گی جس طرح فضا کی پہنائیوں میں گم ہو جانے کے باوجود پرندے کی نگاہیں ایک لاسلکی سلسلہ کی وساطت سے شاخِ آشیانہ سے مربوط و منوط رہتی ہیں۔ مرکز کا جذب و کشش افرادِ قوم کو اس طرح باہمدگر متمسک رکھتا ہے جس طرح اجرامِ فلکی اپنے اپنے محوری نظام کی کشش سے، باوجود فصلِ مکانی ایک دوسرے سے ملحق و متصل ہوتے ہیں۔ لیکن جونہی یہ مرکزی کشش ختم ہوئی وہ ایک ہی جگہ ہونے کے باوجود اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں جس طرح صحرا میں ریت کے ذرّے — اور پھر انکا مآل! یعنی پانی کی ہر موج انھیں اپنے ساتھ بہا کرلے جائے اور ہوا کا ہر تیز جھونکا انھیں جدھر چاہے اڑائے اڑائے پھرے۔

مرکز کی اہمیت

ملتِ اسلامیہ کا فکرِ خصوصی

ملت اسلامیہ کا فکر خصوصی خدا کی حاکمیت کا تصور ہے۔ یہی وہ خصوصیت کبریٰ ہے جو اسے تمام اقوام و ملل عالم سے متمیز و ممتاز کرتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۲۹﴾

مسلمانو! اگر تم اپنے آپ کو قوانین خداوندی کی محافظت میں رکھو تو وہ تمہارے لئے (حق و باطل میں) امتیاز کرنے والی ایک قوت پیدا کر دیگا۔ اور تم سے تمہاری برائیاں دور کر دیگا اور کوتاہیوں کو ڈھانپ دیگا۔ اللہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا ہے!

خدا کی حاکمیت کا عملی نفاذ ان کی زندگی کا نصب العین اور قوائے فکر و عمل کا مرجع ہے۔ یہ نفاذ، قوت و سطوت کے بغیر ناممکن ہے

مرکزِ مشہود

اور ان کی قوت کا مرکز مشہود بیت الحرام ہے۔ اس ملت کی تاسیس حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں سے عمل میں آئی تھی اور انہی کے ہاتھوں ـــــ دنیا کے بتکدہ میں پہلا یہ گھر خدا کا" وجود پذیر ہوا تھا۔ (تفصیل جلد سوم میں گذر چکی ہے) حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پہلوٹھے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی زندگی کو اسی گھر کی تولیت کیلئے وقف کر دیا اور یہی وہ ذبح عظیم ہے جسکا تعارف قرآن کریم نے ایسے درخشندہ الفاظ میں کرایا۔ لیکن نبی اکرمؐ سے پہلے نبوت و رسالت حضرت ابراہیمؑ کی شاخ فلسطینی (یعنی اولاد حضرت اسحٰقؑ) کے حصہ میں رہی جو بعد میں بنی اسرائیل کے نام سے دنیا میں متعارف ہوئے۔ انھوں نے یروشلم کے بیت المقدس کو اپنا قومی مرکز قرار دیا اور جب تک وہ مرکز پائندہ رہا یہ قوم بھی زندہ رہی، جب یہودیوں کے ہاتھ سے قوت چھن گئی تو یہ قومی مرکز بھی ایک "مقدس شہر" بنکر رہگیا جس میں انکے بزرگوں کے مقبرے اور اسلاف کے تبرکات تھے۔ یہود کا مذہب بھی قومی تھا اسلئے ان کا مرکز بھی قومی مرکز ہی رہا۔ بر عکس اس کے اسلام نوع اسلامی کے لئے نظام زندگی تھا اس لئے اسکے مرکز محسوس کیلئے بھی ضروری تھا کہ وہ انسانیت کا مرکز اور دنیا میں امن و سلامتی کا ضامن ہو۔ یہ بلند مقصد تھا جو کعبہ کی عمارت کا گویا سنگ بنیاد تھا، غور کیجئے جب کعبہ کی بنیاد رکھی گئی ہے تو اسوقت اعلان کر دیا گیا کہ یہ گوشہ تمام نوع انسانی کیلئے امن و عافیت کا ذمہ دار اور سکون و سلامتی کا کفیل ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۱۲۵﴾

اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانہ کعبہ کو) انسانوں کی گردآوری کا مرکز اور امن و حرمت کا مقام ٹھہرا دیا، اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ کے کھڑے ہونیکی جگہ (ہمیشہ کیلئے) نماز کی جگہ بنالی جائے، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے، اسے طواف کرنیوالوں، عبادت کیلئے ٹھہرنے والوں، اور رکوع و سجود

کرنے والوں کیلئے (ہمیشہ) پاک رکھنا (اور غیر خداوندی نظام کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا)۔

اور سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ (۳/۹۶-۹۷)

بلاشبہ، پہلا گھر جو نوعِ انسانی کیلئے (حکومتِ الٰہیہ کا مرکز) بنایا گیا ہے، وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا، اور تمام انسانوں کیلئے سرچشمۂ ہدایت۔ اس میں (دینِ حق کی) روشن نشانیاں ہیں۔ انان جملہ مقامِ ابراہیم ہے (یعنی ابراہیم کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنیکی جگہ، جو اس وقت سے لیکر آج تک بغیر کسی شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے

اور ازاں جملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آ گیا۔

غور کیجئے، قرآن، انسانیت کو کس قدر بلند مقام پر پہنچاتا ہے۔ آج ساری دنیا کا ستایا ہوا انسان للچائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف تکتا ہے کہ کوئی ایسا مقام مل جائے جہاں اُسے انسانی درندوں کے پنجہ ہائے خونین سے پناہ مل جائے، لیکن اسکی للچائی ہوئی نگاہیں چاروں طرف سے خاسر و نامراد اور مایوس و نومید واپس لوٹ آتی ہیں اور حسرت بنکر کنجِ قلب میں گوشہ نشیں ہو کر رہجاتی ہیں۔

ساری دنیا کے امن کا ذمہ دار

قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ستم کدۂ دہر میں کوئی ایسا مقام ہونا ضروری ہے کہ مَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ جو وہاں سے پناہ طلب کرے اُسے ایسا امن میسر آ جائے کہ دنیا میں کسی کی عتاب آلود نگاہ اسکی آسودگیوں کو کثیف نہ کر سکے۔ یہ مقام، نظامِ توحید کے مرکز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا! یہی وہ مقام ہے جو قوموں اور گروہوں کے مفاد کا محافظ نہیں بلکہ نوعِ انسانی کے متاعِ شرف و مزیت کا ملجاو مامن ہے۔

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

اسی لئے قرآن نے کعبہ کو قِیَامًا لِّلنَّاسِ کہا ہے۔

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو کہ حرمت کا گھر ہے، سب نوعِ انسانی کے لئے (امن و جمعیت) قیام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے

یعنی اس نظام کا مرکز جس میں انسان، انسان کی غلامی کے رکوع و سجود اور اسکی محکومیت کے تعبد و تذلل سے چھٹکارا پا کر سرفرازی و سربلندی حاصل کر سکے اور اس طرح گری ہوئی انسانیت (ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ) کو پھر سے قیام کی سعادت نصیب ہو جائے (جَعَلْنٰھَا قِیَامًا لِّلنَّاسِ) بس غلامی رہجائے تو اس ایک خدا کی اور جھکنا ہو تو اسی کی چوکھٹ پر۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا وَّطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (۲۲/۲۶)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کیلئے خانۂ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی (اور حکم دیا کہ) میرے ساتھ کسی کو

شریک نہ کر، اور میرا یہ گھران لوگوں کے لئے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں قائم رہنے والے اور رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں !"

اور اس قیام انسانیت میں زمان و مکان کی کوئی قید نہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ (۲۲/۲۵)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی، اور جو اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں، نیز مسجد حرام سے جسے ہم نے بلا امتیاز تمام انسانوں کیلئے مرکز ٹھہرایا ہے۔ خواہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے، (تو انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم انھیں) اور ہر اُس آدمی کو جو اس میں ازراہِ ظلم حق سے منحرف ہونا چاہیگا، عذاب دردناک کا مزہ چکھائیں گے

ہر وہ انسان جو اس مرکزِ امن و سلامتی کو اپنا مامن اور پناہ گاہ مان لے۔ اس کے حصارِ عافیت میں آجائے۔ اسی کو مسلم کہا گیا ہے

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (۲۷/۹۱)

(اے پیغمبر! اعلان کردو کہ) مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے اُس پروردگار کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کروں جس نے اُسے عظمت و حرمت بخشی ہے اور جو تمام چیزوں کا مالک و مختار ہے اور (نیز) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم لوگوں میں سے ہو جاؤں (جن کا شعار اطاعت اور فرماں پذیری میں خدا کے آگے جھک جانا ہے !)

ان ہی کے لئے حقیقی امن و سکون ہے اور باقی سب کے لئے خوف و حزن۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ۝ (۲۹/۶۷)

کیا انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہم ہی تو ہیں جس نے حرم (کی سرزمین) کو مامون و محفوظ بنا دیا ہے حالانکہ انکے اردگرد لوگوں کو اچک لیا جاتا ہے تو کیا (اس کے باوجود) وہ باطل پر ایمان لاتے رہیں گے اور اللہ کے انعام و احسان کی ناشکری (اور انکار) کرتے رہیں گے؟

اسی لئے اس مرکزِ نظامِ حکومتِ الٰہیہ کو بلد امین کہا گیا ہے۔

وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝ (۹۵/۳)

اور اس مامون (و محفوظ) شہر کی قسم !

نوعِ انسانی کیلئے امن و عافیت کا گوشہ جسکی تلاش میں آج ساری دنیا ماری ماری پھر رہی ہے اور جو کہیں نہیں ملتا۔

اسکی تولیت کے مستحق !

اب ظاہر ہے کہ اس نظامِ امن و سلامتی کے مرکز کی تولیت کے مستحق وہی ہو سکتے ہیں جو خود

قوانین الٰہیہ کی حفاظت میں آچکے ہوں اور دنیا میں ان کی تنفیذ و ترویج کے کفیل ہوں۔

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ ([illegible])

اور ان کے پاس کیا سامان حفاظت ہے کہ خدا انہیں عذاب نہ دے سکے گا حالانکہ وہ لوگ مسجد حرام سے وہاں کے صحیح مستحق لوگوں کو روکتے اور منع کرتے ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ اس کے متولی ہونے کے لائق نہیں۔ اس کے متولی اگر ہو سکتے ہیں تو ایسے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کے قوانین کی حفاظت میں دے دیا ہو (نہ کہ مفسد و ظالم)۔ لیکن ان میں سے اکثروں کو (یہ حقیقت) معلوم نہیں۔

جو خدا کے سوا کسی اور حاکمیت کے بھی قائل ہوں ان کا اس مرکزِ توحید سے کیا واسطہ اسی لئے کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ ([illegible])

مسلمانو! حقیقت حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مشرک نجس ہیں پس چاہیے کہ اب اس برس کے بعد یعنی ۹ھ ہجری کے بعد سے وہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں، اور اگر تم کو (ان کی آمد و رفت کے بند ہو جانے سے) فقر و فاقہ کا اندیشہ ہو (کہ وہ ہر طرح کی ضرورت کی چیزیں باہر سے لاتے اور تجارت کرتے ہیں) تو گھبراؤ نہیں۔ اللہ چاہے گا تو عنقریب تمہیں اپنے فضل سے بے نیاز کر دے گا۔ اللہ سب کچھ جانتا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

نماز کا پہلا قبلہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہود و نصاریٰ، یروشلم کو مقدس شہر مانتے تھے اور عرب "کعبہ" کو، لیکن کعبہ کی یہ تعظیم، شرک کی ہر آلودگی کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھی اور یہ سب سے بڑا جرم تھا جو انہیں ہلاکت و تباہی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ رسول اللہ کے پیش نظر سب سے اہم فریضہ، بیت اللہ کی تطہیر اور اسے "قِيَامًا لِّلنَّاسِ" بنانا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ مقصد رسالت ہی نوع انسانی کو کعبہ کی صحیح مقام سے روشناس کرانا تھا۔ کتب تاریخ میں ہے کہ قیام مکہ کے دوران میں آپ ایسے رخ پر نماز پڑھتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں ایک ہی سمت میں سامنے آجاتے تھے لیکن مدینے میں مکہ اور بیت المقدس دونوں متضاد سمتوں میں پڑتے تھے لیکن نماز میں رخ ایک ہی سمت ہو سکتا تھا۔ آپ نے یہ رخ بیت المقدس ہی کی طرف رکھا۔ یہ قرین قیاس بھی ہے اس لئے جب تک کسی خاص معاملہ میں خدا کا حکم نہیں آتا تھا آپ اس روش کی اقتدار کیا کرتے تھے جسے اہل کتاب انبیاء سابقہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ بشرطیکہ ایسی روش، اسلام کی کسی اصولی تعلیم کے خلاف نہ جاتی ہو۔ خود قرآن میں گذشتہ انبیاء کرام کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۝ (۹۰/۶)

(اے پیغمبر!) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں خدا نے راہِ حق دکھادی پس انہی راہ کی تم بھی پیروی کرو۔ تم کہدو کہ میں اس (رہنمائی) پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔ یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام دنیا کیلئے پند و نصیحت ہے۔

تبدیلی کا سوال

لیکن اصل سوال یہ نہیں تھا کہ نماز میں رُخ کس طرف کیا جائے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے تعین قبلہ کو نظام حکومت خداوندی میں ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ نماز میں رُو بقبلہ ہونا تو فقط ایک علامت ہے جیسے کسی سلطنت کا جھنڈا کہ اسکی ذاتی حیثیت ایک کپڑے کے ٹکڑے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی لیکن وہ نشان ہوتا ہے اس سلطنت کی عظمت و وقار اور انقیاد و احترام کا۔ اس کی سربلندی اس سلطنت کی سرفرازی کی علامت اور اس کی نگوں ساری، اس حکومت کے ضعف و انہدام کے مترادف ہوتی ہے اس جھنڈے کے نیچے جمع ہونا اس سلطنت سے وفاداری کا اعلان اور اسکی اطاعت و فرمانبرداری کا مظاہرہ ہوتا ہے یہی مفہوم اتباع قبلہ کا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (۲/۱۴۵)

اور اگر تو ان اہل کتاب کے پاس تمام نشانات بھی لے آئے تو بھی یہ تیرے قبلہ کی اتباع نہیں کرنے کے۔ اور تم نے ان کے قبلہ کی اتباع نہیں کرنی اور یہ بھی ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع نہیں ہیں۔ اور اگر تو اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آچکا ہے۔ انکی خواہشات کی پیروی کرے تو تو ظالموں میں سے ہوجائے۔

اس کی تفسیر دوسری جگہ ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝ (۲/۱۲۰)

اور حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی کتنی ہی نشانیاں پیش کرو لیکن) یہود اور نصاریٰ تم سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو صرف اس حالت میں خوش ہوسکتے ہیں کہ تم ان کی (بنائی ہوئی) ملتوں کے پیرو ہوجاؤ۔ (کیونکہ جن بات کو انھوں نے دین سمجھ رکھا ہے، وہ گروہ پرستی کے تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے) پس تم ان سے (صاف صاف) کہدو کہ خدا کی ہدایت کی راہ تو وہی ہے جو ہدایت کی حقیقی راہ ہے۔ اور یاد رکھو کہ اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے، تو (یہ ہدایت الٰہی سے صریح انحراف ہوگا، اور پھر) اللہ کی دوستی اور مددگاری سے تم یکسر محروم ہوجاؤ گے!

یعنی اتباع قبلہ درحقیقت اتباع ملت (نظام و آئین کی اتباع) ہے۔ ورنہ نماز میں تعیین سمت فی ذاتہ مقصود نہیں

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲/۱۷۷)

نیکی اور بھلائی (کی راہ) یہ نہیں ہے کہ تم نے نماز کیوقت اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لیا یا پچھم کی طرف کر لیا۔ (یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات ظواہر و رسوم کی کر لی) نیکی کی راہ تو ان لوگوں کی راہ ہے، جو ——— اللہ پر، آخرت کے دن پر، ملائکہ پر، آسمانی کتابوں پر، اور خدا کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔

اور خدا کی محبت کی راہ میں اپنا مال۔ رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور سائلوں کو دیتے ہیں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں۔ جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اسے پورا کر کے رہتے ہیں تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو، یا خوف و ہراس کا وقت، لیکن ہر حال میں صبر کرنے والے (اور اپنی راہ میں ثابت قدم) ہوتے ہیں۔

تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو نیکی کی راہ میں سچے ہیں، اور یہی ہیں جو متقی انسان ہیں!۔

تعیین سمت علامت ہے اتباع نظام اور مرکز سے وابستگی کی۔ مدینہ پہنچنے کے بعد چونکہ وہ مقام آگیا تھا جس میں اس نظام کو محسوس و مشہود صورت میں سامنے آنا تھا۔ اس لئے تعیین مرکز کا سوال زیادہ اہمیت پکڑتا جا رہا تھا

مسئلہ کی اہمیت

اور اس مسئلہ کے حل کے لئے حضورؐ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتی تھیں۔ قرآن کریم نے اس کیفیت کو خود انہی الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۝ (۲/۱۴۴)

(اے پیغمبر!) ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکم الٰہی کے شوق و طلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جاتا ہے تو یقین کرو، ہم عنقریب تمہارا رخ ایک ایسے ہی قبلہ کی طرف پھرا دینے والے ہیں جس سے تم خوشنود ہو جاؤ گے۔

اس مقام پر صورت حالات کا ذرا پھر جائزہ لیجئے۔ جماعت مومنین کی کل کائنات تین سو سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ تو مہاجرین تھے جو مفلس و نادار، دوسروں کے ہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ باقی انصار تھے جو خود مدینہ کے یہودیوں کے زیر اثر تھے۔ یہودیوں کا اقتدار مسلّم تھا۔ وہ خود ایک پیغمبر کے منتظر تھے جسکی بشارات ان کی کتب مقدسہ میں پائی جاتی تھیں۔ گوناگوں مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ یہودیوں سے بنا کر رکھی جائے ان کے قبلہ (بیت المقدس) کو ہی

اپنا قبلہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ جب تک نبی اکرم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے بہت سے یہودی (منافقانہ طور پر) مسلمانوں میں شامل رہے۔ انہیں اس پر فخر تھا کہ مسلمانوں نے مشرکین کے مقابلہ میں انکو مذہبی تفوق اور قومی برتری کو تسلیم کر لیا ہے لیکن اسلام کا مسلک ان مصلحتوں سے بہت بلند تھا۔ اگر اس قسم کے مصالح پیش نظر ہوتے تو مکہ کے قریش سے بگاڑ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بیت المقدس یہود کا قومی مرکز بنکر رہ گیا تھا لیکن اسلام ایک عالمگیر دین تھا جس کا دائرہ تمام نوع انسانی کو محیط تھا۔ اس لئے اس دائرہ کا مرکز بھی کسی خاص قوم

تعیین قبلہ

کا شعار نہیں بن سکتا تھا۔ لہذا شعبان ۲ھ میں حضور کو حکم آگیا کہ بیت الحرام کو اپنا قبلہ تصور کریں

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ (۱۴۴)

تو (اے پیغمبر اب) چاہئے کہ تم اپنا رخ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کیطرف پھیر لو۔ اور جہاں کہیں بھی تم اور تمہارے ساتھی ہوں، ضروری ہے کہ رخ اسی طرف کو پھر جایا کرے۔

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے (یعنی یہود اور نصاریٰ کے علماء) وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کیطرف سے ایک امر حق ہے (کیونکہ ان کے مقدس نوشتوں میں اسکی پیشین گوئی موجود ہے لیکن گروہ پرستی کا تعصب انہیں اجازت نہیں دیتا کہ سچائی کا اقرار کریں۔ تو تم ان کی مخالفتوں کی کچھ پروا نہ کرو) جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں، اللہ ان سے غافل نہیں ہے!

اہل کتاب اس لئے جانتے تھے کہ خود ان کی کتابوں میں مذکور تھا کہ حضرت ابراہیم نے کعبہ کو تعمیر کیا۔ اس لئے اس ملت کیلئے جو اپنے آپ کو ابراہیم سے منسوب کرے، وہی قبلہ ہو سکتا تھا۔ تحویل قبلہ نے

یہود کا اضطراب

مدینہ میں ایک ہیجان پیدا کر دیا کہ یہ درحقیقت ایک بہت بڑے انقلاب کا اعلان تھا

قرآن کریم کے دوسرے پارہ کو کھولئے۔ ابتدا اسی واقعہ سے ہوتی ہے۔ فرمایا۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۴۲)

جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں، وہ (اس بات کی حقیقت نہیں پا سکتے کہ کیوں بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ) کہیں گے، مسلمان جس قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، کیا بات ہوئی کہ ان کا رخ اس سے پھر گیا؟ (اے پیغمبر!) تم کہو، پورب ہو یا پچھم، سب اللہ ہی کے لئے ہے (وہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں۔ جب بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، تو وہ بھی اللہ کیلئے تھی، اور اب کعبہ کیطرف متوجہ ہوتے ہیں، تو توجہ بھی اللہ ہی کے لئے ہے۔ البتہ ایک خاص جہت قرار

دینے میں مصلحت ہے) اور وہ جس کو چاہتا ہے کامیابی و سعادت کی سیدھی راہ دکھا دیتا ہے!

سب سے پہلے اس حقیقتِ عظمیٰ کی طرف اشارہ کر دیا کہ تعیینِ جہت مقصود بالذات نہیں مشرق و مغرب سب اللہ کیلئے ہیں۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس لئے اس تبدیلیٔ جہت سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خدا کسی خاص جہت کی طرف قیام پذیر ہے۔ تو پھر تعیینِ قبلہ سے مقصد کیا ہے؟ اگلی آیت میں اسکی وضاحت فرمادی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ؁ (۱۴۳)

اور (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانۂ کعبہ "قبلہ" قرار پایا تو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں "نیک ترین امت" ہونے کا درجہ عطا فرمایا، تاکہ تمام انسانوں کے لئے (سچائی کی) شہادت دینے والے تم ہو، اور تمہارے لئے اللہ کا رسول شہادت دینے والا ہو۔ اور جس قبلہ کی طرف تم اب رُخ کئے ہوا ہے ہم نے اس لئے قبلہ بنادیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون لوگ اللہ کے رسول کی پیروی میں سچے ہیں، اور کون لوگ الٹے پاؤں پھر جانے والے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہدایت یافتہ لوگوں کے سوا اور سب کے لئے اس معاملہ میں بہت ہی سخت آزمائش تھی۔ بہر حال (جو لوگ آزمائش میں پورے اترے ہیں، وہ یقین کریں، ان کی استقامت کے ثمرات بہت جلد انہیں حاصل ہوں گے) ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تمہارا ایمان رائیگاں جانے دے۔ وہ تو انسانوں کے لئے سرتاسر شفقت و رحمت رکھنے والا ہے!

تشکیلِ ملت

"كَذٰلِكَ" پر غور کیجئے۔ یعنی تعیینِ قبلہ سے مقصود، تشکیلِ امت، یعنی تمہاری جداگانہ ملی ہستی کا تشخص ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمہیں دنیا میں ایک ممتاز اور متمیز حیثیت عطا کی جائے۔ اور تمہارا فریضۂ حیات یہ ہو کہ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال کے نگران (شہید) رہو اور تمہارے اعمال کا نگران تمہارا مرکز ہو۔ پھر اسی سے یہ مقصد بھی حاصل ہو گیا کہ جو لوگ منافقانہ طور پر تمہاری جماعت میں شامل تھے، وہ تم سے الگ ہو گئے۔ اس لئے کہ ہزار منافقت کے باوجود یہود اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا رشتہ ان کے قومی مرکز سے ٹوٹ جائے۔ اس کے بعد پھر توجہ اس حقیقتِ کبریٰ کی طرف مبذول کرادی کہ اس تعیینِ جہت ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا اصل شئے تو اعمالِ صالحہ میں مسابقت ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ ۔۔۔۔۔ (۲ / ۱۴۸)

اور (دیکھو) ہر گروہ کے لئے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ عبادت کے وقت) رُخ پھیر لیتا ہے (پس یہ کوئی ایسی بات نہیں جو دین کے اصول و مہات میں سے ہو، اور جسے حق و باطل کا معیار سمجھ لیا جائے۔ اصلی چیز جو اس طرح کے تمام احکام سے مقصود ہے، وہ نیک عملی ہے) پس نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو خدا تم سب کو پالے گا۔ یقیناً اس کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں (اس کی قدرت ہر چیز اور ہر گوشہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے!)

تعیین قبلہ سے مقصود تمہارے لئے وجہ جامعیت پیدا کرنا ہے (أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا) اس کا مظاہرہ متحد الجہت ہونے میں ہے۔ اس لئے ۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ (۲ / ۱۴۹)

اور (اے پیغمبر!) تم کہیں سے بھی نکلو (یعنی کسی سمت اور کسی مقام میں بھی ہو) لیکن (نماز میں) رُخ اسی طرف کو پھیر لو جس طرف مسجد حرام واقع ہے۔ اور یقین کرو، یہ معاملہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امر حق ہے۔ (پس ایک نئے قبلہ کی عالمگیر قبولیت تمہیں کتنی ہی دشوار نظر آتی ہو۔ لیکن اس کی کامیابی قطعی اور اٹل ہے۔ اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ کرو) اور جانتے رہو کہ اللہ تمہارے اعمال کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ (اس کا قانون مجازات تمہارے ایک ایک عمل حق کی نگرانی کر رہا ہے!)

تاکہ تمہاری جداگانہ ہستی اور تمہارے افکار و اعمال اور مقاصد و مصالح کے متعلق کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے اور اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی دلیل حجت نہ ہو۔ اور اس لئے کہ اس مرکزیت کے قیام سے افضال و انعامات خداوندی کا اتمام ہو، اور سفر زندگی میں تم سیدھی راہ پر رہو۔

آج کعبہ کی حیثیت!

تقرر قبلہ کے ان حیات بخش مقاصد پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ آج ہمارے نزدیک قبلہ کی کیا حیثیت باقی رہ گئی ہے؟ کیا بعینہ وہی نہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بار بار تاکیداً کہا تھا کہ کہیں کعبہ کی حیثیت نہ سمجھ بیٹھنا کعبہ تمہاری ملی ہستی کا محور، تمہاری قوت کا مرکز، اور تمہارے فکر و عمل کی یک نگہی ہ

یک رنگی کی دلیل ہے۔ دیکھنا کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کا تقرر محض اس لئے ہوا ہے کہ تم اپنی نمازوں میں منہ اس طرف کر لیا کرو۔ اور بس! یہ تعیین جہت تو اس مقصود کے حصول کا مظاہرہ ہے۔ دیکھئے کہ کیا آج کعبہ سے مقصود فقط اتنا نہیں رہ گیا ہے کہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی جائے۔ یا اس کا طواف کر کے حج کی رسم ادا کر لی جائے۔ قرآن نے یہ بتایا تھا کہ توحید سے مقصود یہ ہے کہ خدائے واحد کی حاکمیت قبول کرنے والوں میں وحدتِ ملی پیدا ہو۔

چیست ملت ایکہ گوئی لا آلہ ✤ باہزاراں چشم بودن یک نگاہ

ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب ✤ یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب

یہ یک نگہی وہم آہنگی مرکز کے بغیر ناممکن ہے۔ اور تمہاری نگاہوں کا مرجع محسوس اور قلوب کا مرکز مشہود بیت الحرام ہے۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے ✤ روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و راز ما بیت الحرام ✤ سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

یہ مرکز اس قدر مضبوط ہو کہ تمام دنیا کی قومیں اپنے اپنے تنازعات و اختلافات میں اس کی طرف رجوع کریں اور نوعِ انسانی سے متعلق جب کوئی نیا سوال پیدا ہوتا تو ہر ایک کی نگاہ اس مرکز کی طرف اٹھتی اور یہاں کا فیصلہ تمام فیصلوں پر غالب رہتا۔ کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا یہی مفہوم اور شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کا یہی مطلوب ہو، مؤمن کا تو مقام یہ تھا کہ۔

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے ✤ دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

ہر قوم کے اعمال اسی میزان پر آکے تلتے تھے۔ اور خیر و شر کے فیصلوں کا یہی معیار تھا، مؤمن کے اس مقام کا راز، حرم کی تقویت میں پوشیدہ تھا۔ اس کی کشت حیات کی سیرابی وہیں کے زمزم سے ہوتی تھی، آج غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان جن مصائب و مشکلات کا حل لیگ اوف نیشنز۔ یا یونائٹڈ نیشنز۔ اور گنائزیشنز (.......) میں تلاش کر رہا ہے۔ ان کا صحیح حل عرفات کے میدان سے ملتا تھا۔ لیکن آج خود "مؤمن" کی کیا حالت ہے؟ اس حدیث الم کو نہ ہی چھیڑا جائے تو اچھا ہے۔ کیا آزاد اور کیا محکوم۔ ہر خطہ کے مسلمان کی حالت یہ ہے کہ دوسروں کے معاملات میں حکم بننا تو کجا۔ خود اپنے معاملات میں غیروں کے فیصلوں کا محتاج ہے اور جس طرح ان کا جی چاہتا ہے وہ اُسے نکیل سے پکڑ کر لئے لئے پھر رہے ہیں۔

گاہ او را با کلیسا ساز باز ✤ گاہ پیش دیریاں اندر نماز

فکر ان کی غیروں کی مستعار، عمل ان کا دوسروں کی نقالی۔ کہئے کہ اس فکر اور اس عمل سے کیا نتائج مرتب ہوں گے

ازاں فکر فلک پیما چہ حاصل ✤ کہ گرد ثابت و سیارہ گردد

مثال پارۂ ابرے کہ از باد ✤ بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

کعبہ اسی طرح سے موجود ہے (بلکہ اس سے کہیں زیادہ چمک اور دمک کے ساتھ) اُس وقت تو وہ صرف اینٹ اور پتھر کی کھردری سی عمارت تھی اور اب یاقوت و مرمر کے در و دیوار پر چاندی اور سونے کی مرصع کاری لیکن اُس وقت وہ جسدِ ملت کا قلب متحرک تھا اور اب ——— ان کی بے جان نمازوں کی جہت اور بے روح طواف کی چار دیواری۔ یہ ہے فطری نتیجہ اس تبدیلی کا جس سے اسلام جیسا "دین" مذہب بنکر رہ گیا ہے۔ نماز ان کی پوجا پاٹ

دین، مذہب بنکر رہ گیا

حج ان کی یاترا۔ رسوم باقی۔ خود فنا۔ رسم کی پابندی ایسی کہ غیروں کو آج بھی کعبہ کی عمارت کے قریب نہیں آنے دیا جاتا اور روح سے بے نیازی ایسی کہ ان ہی غیروں کا اثر و اقتدار اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر رہا ہے۔ نمازیں تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا رُخ اسی ایک قبلہ کی طرف ہوتا ہے اور زندگی کے تمام گوشوں میں ان کی نگاہوں کے قبلے جدا جدا۔ حج کرنے جاتے ہیں تاکہ عمر بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کر آئیں اور آتے وقت زمزم کا پانی ٹین کی ڈبیوں میں بند کر کے لیتے آئیں تاکہ اسے مردوں کے کفن پر چھڑکا جائے۔ نتیجہ اس کا وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں جن میں پوری کی پوری اُمت آج گرفتار ہے۔ حساس قلوب ان کے درد کا مداوا سوچتے ہیں لیکن گھبرا کر رہ جاتے ہیں کہ۔

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

لیکن نہیں سمجھتے کہ ان کے مرض کا علاج مختلف زخموں پر مرہم لگانا نہیں۔ کہ یہ تو علاماتِ مرض ہیں۔ علاج علت مرض کا ہونا چاہیئے۔ یاد رکھئے! جس طرح انسانی صحت کا مدار قلب کی صحت پر ہے اسی طرح قوموں کے امراض کا علاج ان کے مرکز کی تقویت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب تک ہمارا مرکزِ ملت، یعنی کعبہ، اپنا صحیح مقام اختیار نہیں کر لیتا اس وقت تک ہمارے کسی دُکھ کا بھی علاج نہیں ہو سکتا۔ اور مرکز کی صحت کا راز حج کی تقریب (Institution) کی صحت میں مضمر ہے[1]۔ جب تک حرم کی صحیح پوزیشن متعین نہیں ہوتی ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی کامیاب و شادکام نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے:

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست
طوافِ او طوافِ بام و در نیست

میانِ ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

---

[1] تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

جہاد

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ

زندگی جہد است و استحقاق نیست

پروپیگنڈا! یعنی وہ فن جس کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ جھوٹ کو سو مرتبہ دہرایئے، سچ بن کر دکھائی دینے لگ جائے[1] گا۔ اس کا یہ دعویٰ کسی اور شعبے میں کامیاب ہوا یا نہ، لیکن اسلام کے متعلق غلط فہمی پیدا کرنے میں جس حد تک یہ کامیاب ہوا ہے تاریخ کے صفحات پر اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے حقیقت یہ ہے کہ یورپ اپنی تمام تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ایک مرکز پر جمع ہوا ہے اور دنیائے انسانیت کی بدبختی کہ اس کا یہ اتحاد و ائتلاف، صلیبی جنگوں کی صورت میں اسلام کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے ہوا۔ ان جنگوں میں یورپ کی شکست ایک بہت بڑے جاں گداز اور دل سوز صدمے کا موجب تھی۔ مرور زمانہ نے اس زخم کو یورپ کے دماغ سے شاید مندمل کر دیا ہو، لیکن اس کے تحت الشعور میں اس کا گہرا اثر ابھی تک باقی ہے اور یہ وہ پھانس ہے جس نے اسے کبھی چین کی نیند سونے نہیں دیا۔ اور وہ اس شکست کے انتقام کی فکر میں ہمیشہ پیچ و تاب کھاتا رہا ہے۔

یورپ کا جذبۂ انتقام

کسی قوم سے انتقام لینے کی ایک صورت تو وہ ہے جو چنگیز و ہلاکو خاں کی داستانوں کی صورت میں تاریخ کے صفحات پر خون کے حروف سے لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ دور جہالت کی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ جس میں انسان نے ابھی یہ نہیں سیکھا تھا کہ اپنی سبعیت و بربریت کے تیز ناخنوں کو کس طرح نرم و نازک پنجوں میں چھپائے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئند حریری نقاب اڑھائے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ بتا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا۔ لیکن جب انسان نے "عقل و حکمت اور دانش و بینش"

---

[1] (HUXLEY) کے الفاظ میں پروپیگنڈا منظم جھوٹ کا نام ہے"

Dr. INGE, in "The fall of Idols; P. 75)

میں ترقی کی تو اس نے اس طرح کھلم کھلا اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کو حماقت سمجھا۔ اب سب سے زیادہ کامیاب وہ قرار پایا جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک کہیں نظر نہ آئے۔ وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو ایسے مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو۔ وہ ناصح و مصلح کے لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے، دریں حالیکہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دورِ جہالت کے انسان کی جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفانِ بلاخیز تھیں جو کف بر دہاں، بڑھتا، امنڈتا، بپھرتا چلا آئے کہ جس کی شورشوں کو اندھے بھی دیکھیں اور بہرے بھی سنیں۔ لیکن دورِ عقل و تدبر کے فسوں ساز انسان کے انتقام و تخریب کی چالیں ایک پرسکوت دریا کی طرح ہیں کہ جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموج۔ نہ حرکت ہے نہ تلاطم۔ لیکن سطحِ آب کے نیچے ایسے خوفناک اژدر و نہنگ چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو نگل جائیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سن سکیں۔ اس پرسکوت طریقِ تخریب و استہلاک کا نام ہے پروپیگنڈا! یہ وہ آتشِ خاموش ہے کہ اندر ہی اندر تمام متاعِ دین و دانش کو راکھ کا ڈھیر بنا دے اور سطح سے اوپر دھواں تک نہ ہو۔ یہ وہ خاموش و منظم سازش ہے جس سے آہستہ آہستہ بتدریج بلا شور و شغب، غیر محسوس طور پر اشیاء کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویے بدل جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد فریقِ مخالف جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرا لیتا ہے۔ یہی وہ سحرِ سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں۔ کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں۔ دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔

اسلام کی تصویر

دولِ یورپ نے اسلام سے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے اسی سحرِ سامری سے کام لیا اور اس کے خلاف اس منظم لیکن خاموش طریق سے پروپیگنڈا کیا کہ اسے دنیا کی نگاہوں میں کچھ سے کچھ بنا کر رکھ دیا اور زبان و قلم کے زور سے اس کی ایسی بھیانک اور خوفناک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر، خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے، قتل و غارت گری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خونریزی، جور و تظلم، ستم و استبداد کے خونین مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں، جن میں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیلِ حوادث کی طرح بڑھے چلے آ رہے ہیں، جن کے جلو میں سبعیت و بربریت

کے مجسمے، ہولناک جنات و عفاریت کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے، اللہ اکبر کے نعروں میں امنڈے آرہے ہیں۔ اور اس قہر خداوندی، اس سیلاب بلا کے سامنے، تہذیب و تمدن، علم و عمرانیت، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذاہب و مسالک، ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں اور انسان کی ہزار ہا سال کی محنت و کاوش نے جو کچھ متاع علم و ہنر اکھٹی کی تھی وہ سب خس و خاشاک کی طرح بہے چلی جاتی ہے۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں، آسمان تک جاتا اور واپس آجاتا ہے کہ گویا (معاذ اللہ) اس خونخوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب کے لئے بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامت صغریٰ گذرتی ہے، آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں، بستیاں اجڑ جاتی ہیں، کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں، تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ایوانات و قصور کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں، کسی جگہ زنار کا ڈھیر نظر آتا ہے، منادر ویران ہیں، گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن کو کہیں امان ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے عافیت۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے مصئون۔ کچھ قتل کر دیئے گئے، جو باقی بچ گئے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے، وحشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جا رہے ہیں کہ وہاں احترام انسانیت کو دو ٹکوں میں فروخت کیا جائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے آکر پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگتا ہے۔ حقارت و نفرت۔ انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اسے اس عالم سوز تہذیب اور ننگ انسانیت تمدن، اس وحشیانہ تعلیم اور اس بہیمانہ مذہب کو امن و سلامتی کی دنیا سے مٹانے کی مختلف تدابیر و خیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔

امن و سلامتی کا دین یہ تصویر اس اسلام کی بتائی جاتی ہے جس کے لفظی معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ وہ اسلام جس کی تعلیم کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ وہ انسان کو سلامتی کی راہ دکھاتا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ڛ قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵: ۱۵-۱۶)

اے اہل کتاب! یہ واقعہ ہے کہ ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا۔ کتاب الٰہی (یعنی تورات و انجیل) کی بہت سی باتیں جنہیں تم (ہوائے نفس سے) چھپاتے رہے ہو، وہ تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے

اور بہت سی باتوں سے درگذر کر جاتا ہے (کہ ان کے بیان کی ضرورت نہیں) اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی، اور ایسی کتاب آچکی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔ خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو (ہوائے نفس کی جگہ) خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں، سلامتی کی راہ کھول دیتا ہے، اور اپنے حکم سے (یعنی اپنے مقررہ قانون کے بموجب) انہیں تاریکیوں سے نکالتا، روشنی میں لاتا، اور (کامیابی وسعادت کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

جس کا بتایا ہوا راستہ نوع انسانی کو اس منزل تک لیجاتا ہے جسے **دارالسلام** یعنی امن وسلامتی کا گھر کہا جاتا ہے۔

لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۶/۱۲۸)

ان لوگوں کے لئے (جو خدا کی سیدھی راہ پر گامزن ہوئے) اُن کے پروردگار کے نزدیک سلامتی اور عافیت کا گھر ہے اور جیسے کچھ ان کے (نیک) عمل رہے ہیں ان کی وجہ سے وہ ان کا مددگار و رفیق ہے۔ یہی وہ امن وسلامتی کا گوشہ ہے جس کی طرف اس کا خدا دعوت دیتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (۱۰/۲۵)

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے (کامیابی ونجات کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔

اور جس میں تمام افکار و اعمال کا منتہی اور سعی وکاوش کا مقصود سلامتی کی جنت ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ۝ (۱۵/۴۵-۴۶)

بلاشبہ متقی انسان (اس دن) باغوں اور چشموں (کے عیش وراحت) میں ہوں گے (انہیں کہا جائے گا) سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان ان باغوں میں داخل ہو جاؤ!

فساد کے خلاف

اور اس کے مقابلہ میں فساد برپا کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ سورۂ رعد میں دیکھئے، اہل جنت کو کس طرح امن وسلامتی کی تبریک وتہنیت کی صداؤں سے نوازا گیا ہے اور ان کے برعکس فساد برپا کرنے والوں کو کس طرح خدا کے عنایات و افضال سے محروم بتایا گیا ہے کہ یہی لعنت کا مفہوم ہے

جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ

أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝ (۱۳/۲۵)

(بلاشبہ) یہی لوگ ہیں (جن کے لئے ہمیشگی کے) باغ ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے آباء واجداد، بیویوں، اور اولاد میں سے، جو نیک کردار ہوں گے وہ بھی جگہ پائیں گے اور (وہاں کی زندگی ایسی ہوگی) کہ ہر دروازہ سے فرشتے ان پر آئیں گے۔ اور کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے استقامت کا ثبوت دیا۔ سو کیا ہی اچھا اس گھر کا انجام ہوا۔ اور جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کا عہد مضبوط کرنے کے بعد پھر اسے توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کر ڈالتے ہیں اور ملک میں شر و فساد برپا کرتے ہیں ان کے لئے لعنت ہے اور برا ٹھکانا۔

وہ صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ دنیا میں تباہی وخرابی پیدا کرنے والا مسلک کبھی خدا کو پسند نہیں ہو سکتا

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (۲/۲۰۵)

اور جب انہیں حکومت مل جاتی ہے تو ان کی تمام سرگرمیاں ملک میں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ خرابی پھیلائیں اور انسان کی زراعت و محنت کے نتائج اور اس کی نسل ہلاک کردیں۔ حالانکہ اللہ یہ کبھی پسند نہیں کرسکتا کہ (زندگی و آبادی کی جگہ) ویرانی و خرابی پھیلائی جائے۔

وہ اسے فاسقین کا مسلک بتاتا ہے جو یکسر مومنین کی ضد ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (۲/۲۶-۲۷)

اور (خدا کا قانون یہ ہے کہ) وہ گمراہ نہیں کرتا مگر ان ہی لوگوں کو جو (ہدایت کی تمام حدیں توڑ کر) فاسق ہو گئے۔ (فاسق کون ہیں؟ فاسق وہ ہیں) جو احکام الٰہی کی اطاعت کا عہد و میثاق کرکے پھر اسے توڑ ڈالتے ہیں اور جن رشتوں کے جوڑنے کا حکم خدا نے دیا ہے ان کے قطع کرنے میں بے باک ہیں اور (اپنی بدعملیوں اور سرکشیوں سے) ملک میں فساد پھیلاتے ہیں۔ سو جن لوگوں کی شقاوتوں کا یہ حال ہے وہ ہمیشہ گمراہی کی چال ہی چلیں گے۔ اور (فی الحقیقت) یہی لوگ ہیں جن کے لئے سرتاسر نامرادی اور نقصان ہے۔

وہ کھلے ہوئے الفاظ میں انسان کو اس ہلاکت انگیز روش سے روکتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۷/۵۶)

اور (دیکھو) ملک کی درستی کے بعد (یعنی دعوت کے ظہور کے بعد جو اس کی درستی کی دعوت ہے اس میں خرابی نہ پھیلاؤ! (اپنی خطاؤں سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت سے) امید رکھتے ہوئے اس کے حضور دعائیں کرو! یقیناً اللہ کی رحمت ان سے نزدیک ہے جو نیک کردار ہیں۔

چونکہ جنت امن و سلامتی کا گھر ہے اس لیئے وہ غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا گذر نہیں ہو سکتا جو دنیا میں سرکشی اور طغیان کی روش اختیار کرکے فساد برپا کرتے رہے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ؀ (۲۸/۸۳)

اس آخرت کے (امن وسلامتی کے) گھر کو (فی الحقیقت) ہم نے انہیں لوگوں کے لیئے بنایا ہے جنہوں نے دنیا میں سرکشی اور فساد برپا نہیں کیا اور (در اصل، آخرت کی بھلائیاں) انہی لوگوں کے لیئے ہیں جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

وہ امم سابقہ اور اقوام گذشتہ کی تباہیوں اور بربادیوں کی عبرت انگیز داستانیں بیان کرتا ہے تو اس لیے کہ اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ فتنہ و فساد شرف انسانیت سے کس قدر متخالف و متضاد ہے اور ان کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ فرعون اور اس کی قوم کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کرتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ مفسدین تھے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَاۗىِٕفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَاۗءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَاۗءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸/۴ نیز ۲۸/۴)

بلاشبہ فرعون نے دنیا میں سرکشی اختیار کی اور اہل ملک کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا۔ (تاکہ ان کی قوت منتشر ہو جائے) وہ لوگوں کی ایک جماعت (بنی اسرائیل) کو کمزور کرتا جا رہا تھا۔ ان کے لڑکوں کو ذبح (قتل) کر دیتا تھا۔ اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ بڑے ہی فساد پھیلانے والوں میں سے تھا۔

فرعون، جور و استبداد اور تمرد و رعونت کا مجسمہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی قارون، سرمایہ داری کا پیکر تھا۔ اور چونکہ طاغوتی سیاست کے ساتھ ساتھ، سرمایہ داری بھی دنیا میں کچھ کم فساد برپا نہیں کرتی، اس لیئے قارون کے متعلق بھی بتا دیا گیا کہ وہ بھی مفسدین میں سے تھا۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْۗاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۤ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ○ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ○ (۲۸: ۷۶-۷۷)

بلاشبہ قارون موسیٰ کی قوم میں سے ایک فرد تھا پس اس نے ان پر طغیان و سرکشی اختیار کی (درآں حالیکہ) ہم نے اسے اس قدر خزانے عطا کئے تھے کہ ان خزانوں کی کنجیاں (کسی) طاقت ور اونٹنی پر لادی جاتی تھیں۔ پس (یاد تو کرو) جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ گھمنڈ مت کر۔ کیونکہ اللہ گھمنڈ بازوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو کچھ خدا نے تجھے (دولت و حشمت) عطا کی ہے اس میں آخرت کے گھر کو۔۔۔ تلاش کر (یعنی اسے خدا کی راہ میں خرچ کر اور اس طرح آخرت کی سربلندیاں حاصل کر۔ اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول (کہ وہ کس قدر قلیل ہے) اور تو بھی بھلائی (کی راہ) اختیار کر جیسے کہ خدا نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے اور دنیا میں فساد برپا مت کر۔ بلاشبہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وہ امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد بصد تأسف پکار کر کہتا ہے کہ ان میں ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے کہ انہیں فساد انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں سے روکتے!

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ○ (۱۱: ۱۱۶)

پھر (دیکھو!) ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جو لوگ تم سے پہلے گذر چکے ہیں ان میں اہل خیر باقی رہے ہوتے اور لوگوں کو ملک میں شر و فساد کرنے سے روکتے۔ ایسا نہیں ہوا مگر بہت تھوڑے عہدوں میں جنہیں ہم نے نجات دی۔ ظلم کرنے والے تو اسی راہ پر چلے جس میں انہوں نے اپنی نفس پرستیوں کی آسودگی پائی تھی۔ اور (وہ سب احکام حق کے) مجرم تھے۔

تاکہ وہ قومیں ہلاکت و بربادی کے عذاب سے بچ جاتیں؟

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ○ (۱۱: ۱۱۷)

اور (یاد رکھو!) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک کر دے۔ اور اس کے باشندے مصلحین ہوں۔

وہ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان کو بار بار دہراتا ہے۔ اور وہ ہر دیدۂ اعتبار کی توجہ اُن کے اس جرم کبیر کی طرف منعطف کراتا ہے کہ۔

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۵ : ۶۴)

یہ لوگ جب بھی کبھی لڑائی کی آگ سلگاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے (یعنی اس کا فتنہ تمام ملک میں نہیں پھیلنے پاتا) یہ لوگ ملک میں خرابی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اللہ خرابی پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بعثت نبی اکرمؐ کا مقصد حتیٰ کہ وہ اسلام کے ظہور کا مقصد اور نبی کریمؐ کی بعثت کی غایت یہی قرار دیتا ہے کہ اُس زمانہ میں دنیائے فکر و عمل کے ہر گوشے میں فساد رونما ہو چکا تھا۔ اور اسی فساد کو مٹانے کے لئے نظام خداوندی کی ضرورت تھی۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (۳۰ : ۴۱)

(ہم نے پیغمبر اسلام کو اس لئے مبعوث کیا ہے کہ) لوگوں کے خود کردہ اعمال کی بدولت، چونکہ تباہی و بربادی نے خشکی و تری (دونوں) کو گھیر لیا ہے (یعنی تمام عالم میں فتنہ و فساد پھیل گیا ہے) اس لئے (ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا قانونِ مکافات) لوگوں کو ان کے کچھ خود کردہ اعمال کا مزہ چکھا دے۔ ممکن ہے کہ لوگ (اپنے انکار و سرکشی اور اپنے اعمال کے زندہ نتائج کو دیکھ کر باز آ جائیں اور نظام فطرت کی طرف، واپس لوٹ آئیں۔

چنانچہ اس کی دعوت کی پہلی آواز یہی تھی کہ اللہ کی زمین میں فساد مت برپا کرو۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ○ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○ (۲ : ۱۱-۱۲)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں خرابی نہ پھیلاؤ: اور (بدعملیوں سے باز آ جاؤ) تو کہتے ہیں ہمارے کام خرابی کا باعث کیسے ہو سکتے ہیں، ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں۔ یاد رکھو! یہی لوگ ہیں جو خرابی پھیلانے والے ہیں اگرچہ (جہل و سرکشی سے اپنی حالت کا) شعور نہیں رکھتے۔

اسی لئے وہ فساد کو ایمان و عمل صالح کی ضد قرار دیتا ہے۔ کہ یہ دونوں ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ○ (۳۸ : ۲۸)

(کیا تم یہ سمجھتے ہو؟) کہ ہم ان لوگوں کو بھی جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کی راہ اختیار کی

باعتبار نتائج ملک میں فساد پھیلانے والوں کی طرح بنادیں گے یا ہم تقویٰ اختیار کرنے والوں کو (باعتبار اجر عمل) فساق و فجار کی طرح کر دیں گے (یاد رکھو یہ ہمارے قانون مجازات کے یکسر خلاف ہے)

کہیے! جس نظام زندگی کے بنیادی عناصر یہ ہوں اس کی تصویر وہ ہو سکتی ہے جس کا خاکہ گزشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکا ہے؟ کیا یہ دین، دنیا میں امن و سلامتی کا کفیل ہو گا یا فتنہ و فساد کا مظہر؟ تو کیا یہ نوعِ انسانی کی بدبختی نہیں کہ اس نے صلح و آشتی کے اس پیامبر کو جور و استبداد کا داعی سمجھ لیا، اور اس طرح تریاق کو زہر ہلاہل تصور کر کے اس کے استعمال سے ہمیشہ اجتناب کیا اور مرض کو لاعلاج گردان کر سسک سسک کر جان دیدی۔ حقیقت یہ ہے

مسلمان کی روش صلح و آشتی

کہ قرآنی تعلیم کی رو سے مسلمان بیچارا تو اس قدر بےکس و مظلوم واقع ہوا ہے کہ کسی کے خلاف ناحق ہاتھ اٹھانا تو ایک طرف، غیر مذہب والوں کی گالی کا جواب بھی گالی سے نہیں دے سکتا مثلاً کوئی شخص نبی اکرمؐ کی شان اقدس و اطہر میں (بناہ بخدا) گستاخی کے کلمات زبان پر لائے۔ تو مسلمان مقابلہ میں اس کے بانیٔ مذہب کی شان میں سوء ادبی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ بانیٔ مذہب اُن انبیاء کرامؑ میں سے ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں بصراحت موجود ہے تو ایک مسلمان کے لئے تو ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور اگر اس کا ذکر صراحتاً قرآن میں نہیں تو چونکہ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر ملک میں انبیاء کرامؑ بھیجے تھے لیکن ان میں سے ہر ایک کا ذکر قرآن میں صراحتہً نہیں آیا، اس لئے ہو سکتا ہے وہ بانیٔ مذہب ان حضرات انبیاء کرامؑ میں سے ہو جن کا ذکر قرآن میں اس طرح اجمالاً آیا ہے یہاں تک کہ مشرکین کے متعلق بھی قرآن میں آیا ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ
عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ
ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۰۸)

اور (مسلمانو!) جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم اُن کے معبودوں کو بھی دشنام نہ دو کہ پھر وہ بھی حد سے متجاوز ہو کر بے سمجھے بوجھے خدا کو بُرا کہنے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر جماعت کے لئے اس کے کاموں کو خوشنما بنا دیا ہے (کہ ہر جماعت اپنی اپنی راہ رکھتی ہے۔ اور اپنی ہی راہ اُسے اچھی دکھائی دیتی ہے) پھر بالآخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔ پھر وہ ہر جماعت پر اس کے کاموں کی حقیقت کھول دے گا جو وہ (دنیا میں) کرتی رہتی ہے۔

عدل وانصاف یہ تو تھا دوسروں کے جذبات کا احترام۔ معاملات میں جس شدت وتکرار سے عدل وانصاف کی تعلیم قرآن کریم میں آئی ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں مل سکے۔ باربار یہ تاکید آئی ہے کہ فیصلے ہمیشہ عدل سے کرو!

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰىٓ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ (۴ ع)

(مسلمانو!) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو وہ اس کے حوالہ کر دیا کرو! (ایسا نہ کرو کہ کسی حق دار کے حق سے انکار کر دو!) اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو چاہیئے کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو! کیا ہی اچھی بات ہے جس کی خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے (کہ ساری باتوں کی اچھائی اور خوبی عدل ہی کے قیام سے مل سکتی ہے!) بلاشبہ وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔

سورہ انعام میں ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ ۚ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۖ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ (۶ ع ۱۵۳)

اور (اسی طرح) یتیموں کے مال کے نزدیک نہ جاؤ! (یعنی اس میں تصرف کرنے کا ارادہ بھی نہ کرو!) اِلّا یہ کہ اچھے طریقے پر ہو (یعنی اُن کے فائدہ اور نگہداشت کے لئے نگہبانی کرنی چاہو) تو یہ بھی اُس وقت تک کہ یتیم اپنی عمر کو پہونچ جائیں۔ اور انصاف و دیانت کے ساتھ ماپ تول پورا کرو! ہم کسی جان پر اس کی مقدور سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے (پس جہاں تک تمہارے بس میں ہے انصاف و دیانت کی کوشش کرو!) اور جب کبھی بات کہو تو انصاف کی کہو۔ اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے ساتھ جو عہد وپیمان کیا ہے اسے پورا کرو! یہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو!

دوسرے مقام پر ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۱۴/۹۰ نحل ۱۹/۱۹)

(مسلمانو!) اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملے میں) انصاف کرو! (اور مزید برآں) احسان بھی کرو! اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو! اور تمہیں روکتا ہے (کن باتوں سے؟) بے حیائی کی باتوں سے۔ ہر طرح کی برائیوں سے۔ اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ سمجھو اور نصیحت پکڑو!

سچی گواہی

عدل کا مدار شہادت پر ہے۔ اس باب میں دیکھیے کہ قرآن کریم کی تعلیم کیا ہے؟ فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ (۴/۱۳۵)

مسلمانو! ایسے ہو جاؤ! کہ انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے سچی گواہی دینے والے ہو۔ اگرچہ تمہیں خود اپنے خلاف یا اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہی گواہی دینی پڑے۔ اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے بڑھ کر ان پر رحم و مہربانی رکھنے والا ہے (تمہیں ایسا نہیں چاہیئے کہ کسی مالدار کی دولت کی طمع میں۔ یا کسی محتاج کی محتاجی سے بے اعتنائی برت کر سچی بات کہنے سے جھجکو!) پس دیکھو ایسا نہ ہو کہ ہوائے نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے۔ اور اگر تم (گواہی دیتے ہوئے) بات کو گھما پھرا کر کہوگے (یعنی صاف نہ کہنا چاہوگے) یا گواہی دینے سے پہلو تہی کروگے تو (یاد رکھو!) تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

مجرم کی مدد جرم عظیم ہے

اور مجرم کی مدد کرنا تو اس کے نزدیک جرم عظیم ہے۔ قصۂ حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں ارشاد ہے:-

قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِلْمُجْرِمِينَ ۝ (۲۸/۱۷)

(موسیٰ نے) کہا کہ اے میرے پروردگار (جس طرح تو نے (اب تک) مجھ پر انعام و مہربانی فرمائی ہے (اسی طرح میں بھی اقرار کرتا ہوں کہ) میں کبھی بھی مجرمین کا رفیق (و مددگار) نہ ہوں گا۔

خود نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا:-

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۲ / ۱۰)

پس اے پیغمبر (اقوام عالم کو) اسی تسلیم کی طرف دعوت دیتا رہ اور خود بھی اس پر مضبوطی سے جما رہ، بالکل اسی طرح جیسے کہ تجھ کو حکم دیا ہے اور لوگوں کی نفسانی خواہشات کی پیروی مت کر! اور ان سے کہدے کہ میں تو اس کتاب پر (پورا پورا) یقین رکھتا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔ اور اعلان کرد ے کہ (خدا کی طرف سے) مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف (کے ساتھ فیصلے) کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمہارا پروردگار ہے۔ ہمارے اعمال کے نتائج ہمارے لئے ہیں۔ اور تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے لئے۔ ہمارے تمہارے درمیان کوئی (دنیاوی اور ذاتی) جھگڑا نہیں اور اللہ (ایک دن مکافات عمل کے لئے، ہم سب کو (اپنے روبرو) جمع کرے گا۔ اور بالآخر ہم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ عدل کے معاملہ میں قرآن کس قدر بلند معیار قائم کرتا ہے۔ دوستوں سے عدل وانصاف عام روش انسانی ہے۔ اجنبی سے عدل بھی قرین قیاس ہے۔ لیکن ایک قوم سے

دشمن سے عدل!

آپ کی کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ وہ آپ کی تخریب واستہلاک کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہتی ہے۔ وہ آپ کی ضرر رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی۔ اس قوم یا اس قوم کے کسی فرد کا کوئی معاملہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس وقت عدل کے تقاضے سے اپنی قوم (یا اپنی قوم کے کسی فرد) کے خلاف اور دشمن کے حق میں فیصلہ دینا، یہ ہے مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ قرآن اسی عدل کا حکم دیتا ہے کہ اس کے نزدیک انصاف کا یہی معیار ہے۔ فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵ / ۸ نیز ۴ / ۱۳۵)

مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ (خدا کی سچائی) کے لئے مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کے لئے گواہی دینے والے ہو۔ اور دیکھو! ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لئے ابھار دے کہ (اس کے ساتھ) انصاف نہ کرو! (ہر حال میں) انصاف کرو! کہ یہی تقویٰ

سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو! تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

"دشمن سے پیار کرو!" ایک جذباتی شاعری سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب تک انسان کے سینہ میں دھڑکنے والا دل موجود ہے، دشمن سے پیار اس کے لئے ناممکن ہے۔ یہ تعلیم خلاف فطرت ہے۔ اس لئے ناممکن العمل۔ البتہ دشمن سے عدل، یہ ممکن ہے۔ لیکن اس امکان کو عمل میں لانے کے لئے جس کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف، جس خشیت الٰہی اور احترام انسانیت، بالفاظ دیگر جس پاکیزگی سیرت اور بلندی کیرکٹر کی ضرورت ہے وہ کسی نگہ حق شناس کے لئے محتاج تشریح نہیں۔ "دشمن سے بھی انصاف کرو" اس تعلیم کی نظیر آپ کو دنیا کے کسی اور ضابطۂ اخلاق و قوانین میں نہیں مل سکتی۔ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ کہئے کہ جس دین کی یہ تعلیم ہو، اسے جور و استبداد کا مذہب قرار دینا کس قدر حق و انصاف سے چشم پوشی اور عدل و صداقت سے پہلو تہی ہے!

خونِ ناحق قرآن نے سب سے پہلے دنیا کو وحدتِ خلق کی بلند ترین حقیقت اور احترامِ انسانیت کے اشرف ترین اصول سے روشناس کرایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک انسانی زندگی کی کتنی بڑی قیمت ہو سکتی ہے۔ اور کسی کی جان لینا اس کے ضابطۂ آئین و دستورِ حیات میں کیسا جرم عظیم ہے؛ انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو واضح کرنے کے لئے اس نے ایسا جامع اور بلیغ اندازِ بیان اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف وحدتِ خلق کا عالمگیر اصول نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور دوسری طرف قتلِ ناحق کے خلاف شدید ترین سرزنش و عتاب کا پہلو بے نقاب ہو جاتا ہے یہ سوۂ مائدہ میں ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝ (۵: ۳۲)

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جس کسی نے سوا اس حالت کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں لوٹ مار مچانے والوں کو سزا دینی ہو کسی جان کو قتل کر ڈالا تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جس کسی نے کسی کی زندگی بچالی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دیدی

لہ تفصیل تعقہ حضرت عیسٰیؑ (جلد سوم) میں گذر چکی ہے۔

اور (پھر ان کے پاس یکے بعد دیگرے ہمارے رسول (سچائی کی) روشن دلیلوں کے ساتھ آتے رہے اور (ظلم و خوں ریزی سے روکتے رہے) لیکن اس پر بھی ان میں سے اکثر آدمی ایسے ہیں جو ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

خوں بہا

اور اس تنبیہہ و سرزنش کے باوجود اگر کوئی خلاف ورزی قانون کرے تو اس کے لئے قصاص کا حیات بخش اور عدل پرور آئین موجود ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲: ۱۷۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جو لوگ قتل کر دیئے جائیں اُن کے لئے تمہیں قصاص (یعنی بدلہ لینے کا) حکم دیا جاتا ہے (لیکن بدلہ لینے میں ہر انسان دوسرے انسان کے برابر ہے) اگر آزاد آدمی نے آزاد آدمی کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ وہی قتل کیا جائے گا (یہ نہیں ہو سکتا کہ مقتول کی بڑائی یا نسل کے شرف کی وجہ سے دو آدمی قتل کئے جائیں جیسا کہ عرب جاہلیۃ میں دستور تھا یا معزز قاتل اپنے بجائے اپنے کسی غلام کو سزا کے لئے دیدے۔) اگر غلام قاتل ہے تو غلام ہی قتل کیا جائے گا (یہ نہیں ہو سکتا کہ مقتول کے آزاد ہونے کی وجہ سے دو غلام قتل کئے جائیں) عورت نے قتل کیا ہے تو عورت ہی قتل کی جائے گی۔ اور پھر اگر ایسا ہو کہ کسی قاتل کو مقتول کے وارث سے (جو رشتہ انسانی میں) اس کا بھائی ہے معافی مل جائے (اور وہ قتل کی جگہ "خون بہا" لینے پر راضی ہو جائے، تو (خون بہا لیکر چھوڑ دیا جا سکتا ہے) اور (اس صورت میں) مقتول کے وارث کے لئے دستور کے مطابق (خون بہا کا) مطالبہ ہے اور قاتل کے لئے خوش معاملگی کے ساتھ ادا کر دینا اور دیکھو (یہ جو قصاص کے معاملہ کو تمام زیادتیوں اور ناانصافیوں سے پاک کر کے عدل و انصاف اور مساوات کی حقیقت پر قائم کر دیا گیا ہے تو یہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے سختیوں کا کم کر دینا اور رحمت کا فیضان ہے اب اس کے بعد جو کوئی ظلم و زیادتی کرے گا تو یقین کرو وہ (اللہ کے حضور) عذاب دردناک کا سزاوار ہوگا۔

اور یہ وہ اصولِ مساوات و آئین معدلت گستری ہے جس میں فی الحقیقت نوعِ انسانی کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی لئے آیت مندرجہ صدر سے ملحق آیت میں فرمایا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (۲/۱۷۹)

اور اے ارباب دانش! قصاص کے حکم میں (اگرچہ بظاہر ایک جان کی ہلاکت کے بعد دوسری جان کی ہلاکت گوارا کر لی گئی ہے لیکن فی الحقیقت یہ ہلاکت نہیں ہے) تمہارے لئے زندگی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے تاکہ تم برائیوں سے بچو! (اور ظلم و فساد کی راہیں بند ہو جائیں)

چونکہ قانون کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں، اس لئے عدالت کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ مقتول کے وارثوں کو قصاص کے بدلے دیت (خون بہا) لینے پر مجبور کرے۔ البتہ اگر وہ بطیب خاطر بلا جبر و اکراہ از خود اپنا حق قصاص چھوڑ کر دیت لینے پر راضی ہو جائیں۔ یا فراخ حوصلگی اور کشادہ ظرفی سے معاف ہی کر دیں تو اور بات ہے۔ اس لئے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ کسی جرم کی سزا یا انتقام حد جرم سے آگے نہیں بڑھنی چاہیئے۔ اور اس سزا اور انتقام کی بھی صرف اجازت ہے۔ جو دل کی رضامندی سے معاف کر دے تو یہ روش، خوش آئند ہے۔ بشرطیکہ مجرم اس عفو اور درگذری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا رہا ہو۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ○ (۱۶/۱۲۶)

اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی ہے۔ اور اگر تم نے صبر کیا (یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہ دیا)، تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔

سورہ شوریٰ میں ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○
(۴۲/۴۰ — ۴۳)

اور (یاد رکھو) برائی کا بدلہ برائی ہے۔ (مگر) اس برائی کے برابر (ذرہ برابر کم و بیش نہیں) اور جس نے (برائی کو) معاف کر دیا۔ اور صلح و صفائی کی راہ اختیار کی (یقیناً) اس کا بدلہ اللہ کے ذمہ ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ ظلم کرنے والوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اور جس نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد اس ظلم کا انتقام لیا ہے اس پر کوئی الزام نہیں۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو از خود لوگوں پر ظلم

کرتے ہیں اور ملک میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ (درحقیقت) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے (خدا کے ہاں) دردناک عذاب ہے۔ اور جس نے (برائی پر) صبر کیا اور (زیادتی کو) معاف کردیا تو اس کے لئے بلاشبہ اس کا یہ فعل (عفو وبخشش) بڑی جرأت اور بلند حوصلگی کے کاموں میں سے ایک کام ہے۔

رہزنی وقزاقی

باقی رہی لوٹ مار، رہزنی، قزاقی، غصب و غارتگری، تو قرآن کریم نے ان تمام ذرائع ذمائم و معائب اور مصادر شنائع و مثالب کو ایک ہی جامع حکم کے تابع بند کر دیا، جب فرمایا۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ (۲: ۱۸۸)

اے پیروان دعوت ایمانی! اچھی طرح یاد رکھو کہ تم میں سے کوئی شخص، ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھائے۔

زمانہ کی جہالت اور تعصب نے اسلام کے خلاف جو فرد جرم مرتب کی ہے اس میں سب سے نمایاں جگہ پر یہ جرم دکھائی دیتا ہے کہ اس میں دوسروں کو بہ جبر مسلمان کیا جاتا ہے اور ایمان بزور شمشیر منوایا جاتا ہے۔

اسلام اور شمشیر

یہ الزام اک زندہ شہادت ہے اس حقیقت کی کہ انسان جب جوش انتقام اور جذبۂ مخالفت سے اندھا ہوتا ہے تو کس طرح ان حقائق سے اغماض کرتا ہے جو دنیا کے کسی پردہ سے بھی چھپ نہیں سکتے اور کس طرح اس واضح تعلیم سے تسامح برتتا ہے جو بلا تاویل و تفسیر اپنے آپ کو ہر دیدہ بینا کے سامنے بے نقاب پیش کر رہی ہے۔ قرآن کوئی کتاب مستور نہیں جس کی رسائی صرف خواص تک ہو، کوئی باطنی تعلیم نہیں جو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھی جائے۔ کسی مردہ زبان میں نہیں کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہ آسکے۔ سیدھی سادی عربی زبان میں ایک کتاب ہے، جو ہر کتب فروش کے ہاں مل سکتی ہے، اس کے تراجم قریب قریب دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں۔ جس کا جی چاہے اسے لے کر پڑھے اور خود معلوم کرلے کہ اس کی تعلیم کیا ہے لیکن اتنی تکلیف تو وہ گوارا کرے جسے حقیقت کی تلاش اور سمجھنے کی آرزو ہو۔ جن کا مقصد دوسروں کو بدنام کرنے کے لئے غلط پروپیگنڈا کرنا ہو وہ خود ایسا کیوں کریں؟ اور دوسروں کو ایسا کرنے پر آمادہ ہی کیوں ہونے دیں؟ وہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹا کر (جو اسلامی تعلیم کی اساس اور یقینی سند ہے) انہیں غلط تاریخ و روایات کے خرافات و اباطیل میں الجھا دیں گے اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ کو بھی اسی رنگ میں رنگ دیں گے۔ قرآن کے نزدیک ایمان کا تعلق یکسر انسان کے دل سے ہے۔

ایمان سے مقصود یہ ہے کہ وہ تصورِ حیات میں انسان کا زاویۂ نگاہ درست کر دے اور یہ ہو نہیں سکتا جب تک اس کے امیال و عواطف کے سرچشمہ (یعنی قلبِ انسانی) میں تبدیلی پیدا نہ ہو۔ اس لئے اس کے نزدیک ایمان کے شجرِ طوبیٰ

ایمان سے مفہوم تبدیلیٔ قلب ہے

کی جڑیں انسان کے عمقِ قلب میں پیوست ہونی چاہئیں، اور اس کی آبیاری اس کے خونِ جگر سے۔ تاکہ اس کی شاخیں فضا کی پہنائیوں کو محیط ہو جائیں اور عرش کی بلندیوں کو چوم آئیں اور اس طرح اس کے برگ و بار سے درخشندہ نتائج مرتب ہوں جو تکمیلِ شرفِ انسانیت کے کفیل بن جائیں۔ اس کے نزدیک وہ اقرار جو صرف زبان تک محدود ہو ایمان کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ایمان میں جبر و اکراہ ایک کھلا ہوا تضاد اور واضح تباین ہے۔ اور یہ وہ نقیضین ہیں جو ایک جگہ جمع ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ انسانی طبائع و مزاج کے اختلاف کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس حقیقت کا واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ اگر مقصود یہ ہوتا کہ تمام انسان اپنے اختیار و ارادہ کو عمل میں لائے بغیر ایک نہج پر چلنے کے لئے مجبور ہوں تو خدا سے یہ کیا بعید تھا کہ وہ شجر و حجر کی طرح انسان کو بھی پیدائشی طور پر ایک مسلک کا پابند کر دیتا۔ لیکن یہ مقصودِ مشیت نہیں تھا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۵/۴۸)

اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا (یعنی ایک طرح کی استعداد و حالت پر پیدا کرتا) لیکن (تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس لئے نہیں کیا، تاکہ جو کچھ (ارادے اور اختیار کی صلاحیتیں) تمہیں دی گئی ہیں ان میں تمہیں آزمائے (اور تمہارے لئے طلب و ترقی کی راہیں پیدا ہوں) پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو! بالآخر تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتلائے گا کہ جن باتوں میں تم باہمدگر اختلاف کرتے تھے ان کی اصل حقیقت کیا ہے......!

اس سے بھی واضح الفاظ میں ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۹۹)

اور اے پیغمبر! اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ (اور دنیا میں اعتقاد و عمل کا اختلاف باقی نہ رہتا لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا اس کی مشیت یہی ہوئی کہ طرح طرح کی طبیعتیں اور طرح طرح کی استعدادیں ظہور میں آئیں اور انہیں اختیار و

وارد ہ سکے ظہور کے مواقع دیئے جائیں۔ پھر اگر لوگ نہیں مانتے تو کیا توان پر جبر کرے گا کہ جب تک

ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں۔؟

سورۂ انعام میں ہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكُوا ۗ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ
وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ○ (۶/۱۰۷)

اور اگر اللہ چاہتا تو (اس کی قدرت رکھتا تھا کہ انسان کو اس طرح کا بنا دیتا کہ سب ایک راہ چلنے والے ہوتے اور) یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس کی مشیت کا یہی فیصلہ ہوا کہ ہر انسان اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے پس تم جو کچھ کر سکتے ہو یہی ہے کہ سچائی کی راہ انہیں دکھا دو! انہیں جبراً اپنی راہ پر نہیں چلا سکتے۔) ہم نے نہ تو تمہیں ان پر پاسبان بنایا ہے (کہ ان کی رائے اور عمل کی نگہبانی کرو) نہ تمہارے حوالے ان کی ذمہ داری ہے (کہ ان کے نہ ماننے کے تم ذمہ دار ہو)۔

انسانی اختیار و ارادہ وہ کہتا ہے کہ خدا نے حق و صداقت کو واضح طور پر آشکارا کر دیا۔ اب اس کے بعد جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ ... وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹)

اور کہدو کہ یہ سچائی تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اب جو چاہے مانے اور جو نہ چاہے نہ مانے۔

جو اس پیغام حق و صداقت کو قبول کرلے گا، اس کی انسانیت ارتقائی منازل طے کر کے اسے سفر حیات کی منزل آخریں تک پہنچا دے گی۔ جو ایسا نہ کرے گا وہ اس شرف و سعادت اور عزت و کرامت سے محروم رہ جائے گا۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا
أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ○ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُونَ ○ (۶/۱۰۴-۱۰۵)

دیکھو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس علم و دلیل کی روشنیاں آچکی ہیں (اور جہل و گمراہی کا اب کوئی عذر باقی نہیں رہا) پس اب جو کوئی دیکھے اور سمجھے تو (اس کا فائدہ) خود اسی کے لئے ہے اور جو کوئی (اپنی آنکھ سے کام نہ لے اور) اندھا ہو جائے تو اس کا وبال اسی کے سر آئیگا۔ اور (اے پیغمبر تم کہدو!) میں تم پر کچھ پاسبان نہیں ہوں (کہ جبراً تمہاری آنکھیں کھولوں) اور دیکھو

اسی طرح گوناگوں طریقوں سے ہم آیتیں بیان کرتے ہیں (تاکہ حجت تمام ہو جائے) اور وہ لوگ خود پکار اٹھیں کہ تم نے (بیان حق میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ سب کچھ) پڑھ سنایا۔ نیز اس لئے کہ جو لوگ جاننے والے ہیں ان کے لئے (دلائل حق) واضح کر دیں!

اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ (۱۰۸ پ ۱۱)

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہدو کہ اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس آگئی ہے۔ پس جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لئے کریگا اور جو بھٹکے گا تو اس کی گمراہی اسی کے آگے آئیگی۔ میں تم پر نگہبان نہیں ہوں (کہ زبردستی کسی راہ میں کھینچ لاؤں اور پھر اس سے نکلنے نہ دوں)

وہ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو دیکھنے کے لئے آنکھیں عطا کر دیں اور فضا میں سورج کی روشنی پھیلا دی۔ اب جس کا جی چاہے سیدھی راہ پر چلے اور جو اپنی ہلاکت چاہتا ہے وہ غلط روش اختیار کرے۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (۳/۷۶ پ ۲۹)

ہم نے بلاشبہ انسان کو راہ (حق و صداقت) کی طرف رہنمائی کر دی۔ اب وہ چاہے تو اسے اختیار کرے یا اس سے انکار کرے۔

قرآن فطرت انسانی کی فراموش شدہ حقیقتوں کی یاد دہانی ہے۔ اس یاد دہانی کے بعد جو چاہتا ہے کہ اپنی متاع گم گشتہ کو تلاش کرے وہ اٹھے اور اس کے بیان کردہ سراغ سے اس کا پتہ لگالے۔ اور جو اس کے باوجود بھکاری کا بھکاری رہنا چاہے تو اس کی ناداری و فلاکت کا کیا علاج؟

فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ (۵۵/۷۴ پ ۲۹، ۱۲/۸۰، ۲۸/۸۱، ۱۹/۷۳، ۲۹/۷۶)

پس جو چاہے اس ذکر (حق و صداقت) کو یاد کرے

وہ اس پیغام حق و صداقت کی طرف دعوت دینے والوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اس آواز کو دوسروں تک حکمت و موعظت اور دلائل و براہین سے پہونچا دیں۔

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۱۲۵/۱۶)

اے پیغمبر! اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ! اس طرح کہ حکمت کی باتیں بیان کرو! اور اچھے طریقہ پر پند و نصیحت کرو! اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو وہ بھی ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے اور کون راہ راست پر ہے

وہ ان کے علم و بصیرت اور دانش و بینش کو اپیل کریں اور اس طرح ان کی زمینِ قلب کو اس سدرۃ المنتہیٰ کی تخم گیری کے لئے تیار کریں!

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۫ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؁ (۱۲)

اے پیغمبر! تم کہدو! کہ میری راہ تو یہ ہے میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور اس راہ میں، جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں۔ اللہ کے لئے پاکی ہو میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں

جور و اکراہ، استبداد ہے وہ امم سابقہ کے احوال و کوائف میں ہمیں بتلاتا ہے کہ متمرد اقوام اور مستبد حکام، حریتِ فکر و آراء کو سلب کر لیتے تھے اور اپنے تغلب و تسلط کی بنا پر مذہب میں زبردستی کرتے تھے۔ قوم شعیب کے متعلق فرمایا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ؁ (۷)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں دنیوی طاقت کا گھمنڈ تھا کہا "اے شعیب! دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی۔ یا تو تجھے اور ان سب کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکال باہر کریں گے۔ یا تمہیں مجبور کر دیں گے کہ ہمارے دین میں لوٹ آؤ" شعیب نے کہا "اگر ہمارا دل تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً مان لیں"؟

اور فرعون کے متعلق متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے کہ جب اس کے دربار میں جادوگروں نے حق و صداقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے رب موسیٰ پر اپنے ایمان کا اظہار کیا ہے تو فرعون نے اپنی پوری شان استکبار و فرعونیت سے گرج کر کہا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ؁ (۲۰)

فرعون نے کہا تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے ؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں ؟ میں تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم دونوں میں سے کون سخت عذاب دینے والا ہے۔ اور کس کا عذاب دیرپا ہے۔

اور فرعون کے غضب و عتاب کا یہی خوف تھا جس کی وجہ سے لوگ ایمان نہیں لاتے تھے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ (۱۰/۸۳)

دیکھو اس پر بھی ایسا ہوا کہ موسیٰ پر کوئی ایمان نہیں لایا۔ مگر صرف ایک گروہ جو اس کی قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا۔ وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتا ہوا کہ کہیں مصیبت میں نہ ڈال دیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش (بادشاہ) تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ (ظلم و استبداد میں) بالکل کمینہ اور چھوٹا تھا۔

یہی وہ تغلب و استبداد اور جور و اکراہ تھا جسے مٹانے کے لیے حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت ہوتی تھی اس لیے اسلام کا تو مقصد ہی اس جبر کا استیصال تھا نہ کہ اس کا احیاء و استحکام۔ وہ کہتا ہے کہ

جبری اقرار، اقرار ہی نہیں ہوتا

اگر کسی شخص کے گلے پر چھری رکھدی جائے اور اس سے کفر کا اقرار لے لیا جائے، دراں حالیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ تو یہ اقرار اقرار ہی تصور نہیں کیا جائے گا۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۱۶/۱۰۶)

اور جو کوئی ایمان لانے کے بعد پھر اللہ سے منکر ہوا اور اس کا دل اس انکار پر راضی ہو گیا تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ مگر ہاں ! جو کوئی کفر پر مجبور کیا جائے (اور مجبور ہو کر بخوف جان کوئی ایسی بات کہدے) اور اس کا دل اندر سے ایمان پر مطمئن ہو (تو ایسے لوگوں سے مواخذہ نہیں)

جب اس قسم کا اقرارِ کفر، اقرار نہیں، انکار ہی ہے۔ تو اس قسم کا اقرار ایمان، ایمان کیسے قرار دیا جا سکتا ہے ؟ وہ تو اس باب میں یہاں تک محتاط ہے کہ جو بدو مسلمانوں کے اقتدار و سطوت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے، ان سے کہا گیا کہ ہنوز اپنے آپ کو مومن مت کہو۔ صرف یہ کہو کہ

تم نے اسلامی نظام کی اطاعت تسلیم کر لی ہے۔ مومن اس وقت کہلاسکو گے جب ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۴۹/۱۴)

بدوؤں نے کہا کہ ہم مومن ہو گئے (اے پیغمبر! ان سے) کہدیجئے کہ تم تاہنوز مومن نہیں بنے۔ البتہ تم کہہ سکتے ہو کہ (ہم نے نظام اسلامی کی اطاعت قبول کر لی اور اس معنی میں تم کہہ سکتے ہو کہ) ہم مسلمان ہو گئے، تاآنکہ ایمان تمہارے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر جائے۔ اور اگر تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (وفرمانبرداری اختیار کی تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ (بلکہ تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔) بلاشبہ اللہ بڑا ہی بخشش دینے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

مومن تو وہ ہوتا ہے جس کے دل میں شک و ارتیاب کی کوئی خلش باقی نہ رہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (۴۹/۱۵)

بلاشبہ حقیقی مومن صرف وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (دل کی گہرائیوں سے) ایمان لائے اور پھر گرفتار ارتیاب وتذبذب نہیں ہوئے اور جنہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی وہ لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں!

ارتداد

غور کیجئے! کیا اس قسم کے یقین وایمان اور ایقان واذعان کی کیفیت کہ جس میں شک وشبہ کا کوئی شائبہ تک نہ رہے، کبھی جبر سے بھی پیدا ہوسکتی ہے؟ غیر مسلم تو ایک طرف اگر اپنے دین کی صداقت کے متعلق کسی مسلمان کے دل میں بھی شک وشبہ پیدا ہو جائے تو وہ مسلمان نہیں رہ سکتا مرتد ہو جاتا ہے اور اسے بجبر مسلمان نہیں رکھا جاسکتا۔ یعنی جس طرح اسلام میں داخل ہونے کے لئے انسان کو پوری پوری آزادی حاصل ہے، اسی طرح اس سے نکلنے کے لئے بھی راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اسی لئے قرآن کی رو سے ارتداد کی کوئی سزا نہیں بجز اس کے کہ اس قسم کا سوختہ بخت انسان، انسانیت کے شرف ومزیت، اور دین ودنیا کی سعادت وحکومت سے محروم ہو جائے گا۔ دیکھئے سورۂ آل عمران میں اس حقیقت کو کیسے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ

حَقٌّ وَّجَآءَھُمُ الْبَیِّنٰتُ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ
اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃَ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا لَا یُخَفَّفُ
عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝ (۳: ۸۶-۸۸)

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اس گروہ پر (فلاح وکامیابی کی) راہ کھول دے، جس نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کرلی۔ حالانکہ اس نے گواہی دی تھی کہ اللہ کا رسول برحق ہے اور (حقیقت کی) روشن دلیلیں اس کے سامنے واضح ہو گئی تھیں۔ اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں پر (فلاح وسعادت کی) راہیں نہیں کھولتا۔ ان لوگوں کو (ان کے ظلم وشرارت کا) جو بدلہ ملنے والا ہے وہ تو یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی، انسانوں کی سب کی لعنت برس رہی ہے۔ اس حالت میں وہ ہمیشہ گرفتار رہیں گے۔ نہ تو ان کا عذاب کبھی کم ہوگا اور نہ کبھی مہلت پائیں گے۔

لیکن اس کے بعد ان پر اس سعادت وعظمت کا دروازہ ابدی طور پر بند نہیں کر دیا گیا۔ جس وقت بھی انہیں ایمان ویقین کی طمانیت نصیب ہو جائے وہ پھر اس سوسائٹی کے ممبر بن سکتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

ہاں جن لوگوں نے اس حالت کے بعد بھی توبہ کر لی اور اپنے آپ کو سنوار لیا، تو بلاشبہ اللہ (۳: ۸۹) بخشنے والا اور (اپنی رحمت بے حساب سے) بخشنے والا ہے!

اور اس طرح ایمان واعمال صالحہ سے اپنی چھنی ہوئی سعادت پھر سے حاصل کر سکتے ہیں۔

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اھْتَدٰی ۝ (۲۰: ۸۲)

اور (دیں نے کہا) جو کوئی توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل ہو اور پھر حقیقت کا راستہ پائے تو میں یقیناً اس کے لئے بڑا ہی بخشنے والا ہوں۔

لیکن جو اس طرح نہ لوٹے اور اپنے کفر وانکار کے راستہ پر ہی چلتا جائے تو وہ یقیناً راہ گم کردہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ وَ
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝ (۳: ۹۰)

(لیکن) جن لوگوں کا یہ حال ہو کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کر لی اور اپنے کفر کی سرکشیوں اور شرارتوں میں بڑھتے ہی گئے تو ایسے لوگوں کی پشیمانی کبھی قبول ہونے والی نہیں (کیونکہ سچی توبہ انہیں نصیب نہیں ہو گی) اور یہی لوگ ہیں جو راہ سے بھٹک گئے ہیں۔

اور اس کا نتیجہ ہلاکت وتباہی کا جہنم ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۝ (۳/۹۱)

بلاشبہ جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی اور اسی انکار و کفر کی حالت میں مر گئے تو اگر وہ اس کے بدلہ میں فدیہ دینا چاہیں تو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی ہرگز ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہوگا اور ان کے لئے مددگاروں میں سے بھی کوئی مددگار پیدا نہ ہو سکے گا۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ

اور ان تمام تفاصیل کے بعد اس آیۂ قدسہ کو دیکھئے جو اس باب میں قول فیصل کا حکم رکھتی ہے اور جس کی اکیلی شہادت ہر شک وشبہ کو مٹانے کے لئے کافی ہو سکتی ہے اور یہ ہے سورۂ بقرہ کی وہ آیت جو "آیت الکرسی" سے ملحق ہے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۲/۲۵۶)

دین[1] کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں (کیونکہ وہ دل کے اعتقاد سے تعلق رکھتا ہے اور جبر و تشدد سے اعتقاد پیدا نہیں کیا جا سکتا، بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ (اور اب دونوں راہیں لوگوں کے سامنے ہیں جونسی راہ چاہیں اختیار کر لیں) پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی سرکشی و فساد کی قوتوں سے بیزار ہو جائے، اور اللہ پر ایمان لائے تو بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کی) مضبوط شاخ پکڑ لی۔ یہ شاخ ٹوٹنے والی نہیں (وہ جس کے ہاتھ آ گئی وہی گرنے سے محفوظ ہو گیا۔ اور یاد رکھو، اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، کہ

قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان خیالات کو بھی اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں جو اس وقت

---

[1] اس کی مزید تفسیر آیندہ چل کر سامنے آئے گی۔

آپ کے افقِ قلب سے اٹھ اٹھ کر آپ کی فضائے ذہنی پر چھا رہے ہیں اور بار بار یہ سوال سامنے لا رہے ہیں کہ اگر مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں تھا اور اسلام، امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا مذہب تھا تو

پھر یہ جنگ و جدل کیوں؟

پھر یہ تمام سلسلۂ جنگ و جدل اور سرایا و غزوات کس لئے، جن کے تذکرہ سے قرآن کی سور و آیات اور کتبِ تاریخ و سیر کے صفحات بھرے پڑے ہیں؟ حتیٰ کہ متقدمین نے حضور کی سیرۃ مقدسہ پر جتنی کتابیں لکھی ہیں وہ کتبِ سیرۃ نہیں، بلکہ بالعموم مغازی کے نام سے دنیا میں متعارف ہوئیں کہ ان کا بیشتر حصہ غزوات کے کوائف و حالات پر ہی مشتمل تھا۔ یہ خیالات آپ کے دل میں اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ آپ نے اسلام کو ایک مذہب سمجھ لیا ہے، حالانکہ اسلام مذہب نہیں، بلکہ دین ہے۔ اور مذہب و دین کے لطیف لیکن نہایت عمیق فرق کو ملحوظِ خاطر نہ رکھنے سے یہ تمام خلفشارِ قلبی، اور خلجانِ ذہنی پیدا ہو رہا ہے۔ مذہب (Religion) یا دھرم سے مفہوم ہے خدا اور بندے کے درمیان

مذہب اور دین کا فرق

تعلق۔ یہ تعلق ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے[1] جس کا انسان کی خارجی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کی خارجی زندگی یا ہیئتِ اجتماعی کے لئے ایک اور نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسے دولتی نظام (State) یا حکومت کہا جاتا ہے۔ مذہب میں خدا کی حیثیت محض ایک پرستش کی شے (Object of Worship) کی ہوتی ہے۔ اور بندے اور خدا کا تعلق پرستار (Worshipper) اور پرستیدہ (Worshipped) کا تعلق ہوتا ہے۔ معاملات کی دنیا میں ان کے پاس وہی چند اخلاقی عناصر ہوتے ہیں جو ساری دنیا میں عام طور پر مروّج ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو! چوری نہ کرو! زنا نہ کرو! وقس علیٰ ہذا۔ یہ اخلاقی ضوابط چونکہ ہر جگہ مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک ہی طور پر مانے جاتے ہیں، اس لئے ان کا دعویٰ ہے کہ "عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں" وہ ہے ان کے نزدیک خدا پرستی اور یہ ہے نیک عملی[2]۔ لیکن اسلام ایک مذہب نہیں دین ہے۔ مذہب کا لفظ تک

---

[1] چونکہ ان اہلِ مذاہب کے یہاں انسانی نظامِ زندگی کے لئے کوئی ضابطۂ قوانین نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے مذہب کا احاطہ انسان کی داخلی زندگی قرار دیدیا۔ اور اس کی ایک پرائیویٹ عقیدہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہ سمجھ سکے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھئے تو انسان کا عقیدہ لاکھ پرائیویٹ ہو اس کا اثر اس کی خارجی زندگی پر ضرور پڑتا ہے۔ اگر کوئی عقیدہ انسان کے لائحہ عمل کو متاثر نہیں کرتا تو وہ عقیدہ ہی کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ان اہلِ مذاہب کا عقیدہ بھی ایک رسم کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور

قرآن کریم میں نہیں۔ اور دین، انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً:-

دین کے معنی

(۱) غلبہ واقتدار۔ حاکمیت و فرماں روائی۔ کسی کو اپنا مطیع ومحکوم بنانا۔ اسی لئے مدین۔ مطیع و فرماں بردار کو کہتے ہیں۔ دیکھیے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ٥ (۳۷/۵۳ نیز ۵۶/۸۶-۸۷)

کیا ہم جب مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جائیں گے تو کیا اس وقت ہم عاجز ومطیع ہو جائیں گے؟

(۲) کسی کے تابع فرمان اور مطیع ومحکوم ہو جانا۔ اسی لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قوم دین کہتے ہیں۔

(۳) شریعت و قانون سورۂ یوسف میں (دین الملک) بادشاہ کا قانون اسی معنی میں استعمال ہوا ہے دیکھیے!

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَاءِ اَخِيْهِ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ٥ (۱۲/۷۶)

پھر یوسف نے اپنے بھائی سے پہلے دوسروں کے سامان کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ پھر آخر میں اپنے بھائی کے سامان سے صواع ملک کو برآمد کر لیا۔ یہ ہم نے یوسف کی خاطر ایک خفیہ تدبیر کر دی تھی، ورنہ خدا کی مشیت کے بغیر یوسف شاہی قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا۔ یاد رکھو! ہم جس شخص کو چاہتے ہیں درجے بلند کر دیتے ہیں اور ہر جاننے والے کے اوپر ایک بڑا جاننے والا موجود ہے۔

یا فرعون نے جس وقت اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ کی دعوت انقلاب کے خلاف بھڑکایا تھا تو انہیں یہی کہکر اشتعال دلایا تھا کہ یہ تمہارے نظام حکومت (دین) کو بدلنا چاہتا ہے۔ دیکھیے!

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵

انسان کے قلب ونگاہ پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

۵۲ معلوم نہیں کہ اس نیک عملی کے ساتھ وہ خدا پرستی کی شرط بھی کیوں عائد کرتے ہیں؟ اس لئے کہ یہ اخلاقی عناصر تو ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلمات میں سے ہیں جو خدا کو نہیں مانتے۔ ایک دہریہ خدا کا منکر کبھی یہ نہیں کہیگا کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے۔ وہ بھی یہ کہے گا کہ سچ بولنا چاہئے چوری نہیں کرنی چاہیے۔ سو اس اخلاقی ضابطہ کے لئے خدا پر ایمان کی بھی ضرورت نہیں۔

اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْہِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۵۷

اور فرعون نے (اپنی قوم سے) کہا مجھے موسیٰ کو قتل کر لینے دو۔ اسے چاہیئے کہ وہ اپنے پروردگار کو (مدد کے لئے) پکارے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ (اگر یونہی ڈھیل دی جاتی رہی تو) وہ تمہارے نظامِ حکومت کو بدل ڈالے گا۔ یا سرزمینِ (مصر) میں فتنہ و فساد برپا کرے گا۔

(۴) جزا۔ بدلہ۔ مکافات۔ نتائج اعمال۔ سورۂ فاتحہ میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اسی معنیٰ کو آشکارا کر رہا ہے۔

انسانی زندگی کے مختلف گوشوں پر غور کیجئے اور پھر دیکھیئے کہ قرآن کریم نے اس کے نظامِ زندگی کے لئے جو لفظ (دین) استعمال کیا ہے وہ کس قدر جامع اور بلیغ ہے۔

(۱) انسان تمام مخلوقات سے زیادہ نہتا پیدا کیا گیا ہے اس لئے وہ اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے اجتماعی زندگی کا محتاج ہے۔ اسی لئے انسان کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ کی گئی ہے کہ وہ ایک مدنی الطبع حیوان ہے۔ (SOCIAL ANIMAL)

(۲) یہ اجتماعی زندگی قواعد و ضوابط کی محتاج ہے۔ اس لئے کہ جب انسان اجتماعی زندگی بسر کرے گا۔ تو اس کے افکار و اعمال، اور حرکات و سکنات کا اثر اس کی ذات تک ہی محدود نہیں رہے گا، بلکہ دوسروں تک متعدی ہوگا۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ بلا ضابطہ و قانون اور بغیر آئین و دستور قائم رہ سکے۔

(۳) وہ نظام جس کے تابع انسان اپنی اس ہیئتِ اجتماعیہ کی ترتیب و تنظیم قائم رکھتا ہے، دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں مملکت (STATE) کہلاتی ہے اور اس نظام کا نام دولتی نظام (SYSTEM OF STATE) رکھا جاتا ہے۔ اس "دولتی نظام" کا عمود و محور یہ ہے کہ ایک مرکزی اقتدار (CENTRAL AUTHORITY) ہو جس سے اس مملکت کی ہیئتِ حاکمیہ قائم رہے۔ اور باقی تمام افرادِ مملکت اس اقتدارِ اعلیٰ کے مطیع و محکوم ہوں۔

(۴) یہ لوگ اس اطاعت و محکومیت کی زندگی کو اس لئے بطیب خاطر اختیار کرتے ہیں کہ اس روشِ زندگی کے نتائج ان کے لئے نفع رساں اور منفعت بخش ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے نظام کے اجزاء ترکیبی حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) اقتدارِ اعلیٰ یا ہیئتِ حاکمیہ۔

(۲) افرادِ مملکت کی محکومیت و اطاعت۔

(۳) وہ دستور و آئین جس کی اطاعت کی جائے۔

(۴) اس انداز زندگی کے نتائج۔

قرآن اس پورے نظام کا تعارف جس کے اجزاء ترکیبی مندرجہ صدر ہیں، دین کی جامع اصطلاح سے کراتا ہے۔ جب سے شعور انسانی نے آنکھ کھولی اور افراد نے اجتماعی زندگی اختیار کی ہے۔ انہوں نے تشکیل مملکت کے مختلف معیار اور اس کے نظام کی متنوع صورتیں وضع و اختیار کی ہیں۔ ابتدائی زمانہ کے انسان

دولتی نظام

کی قبائلی زندگی اور شخصی حکومت سے لیکر دور حاضرہ کی وطنیت۔ اور جمہوریت عمومیت۔ آمریت، اشتراکیت، فسطائیت وغیرہ سب مملکت کی مختلف شکلیں اور اس کے نظام کی متنوع صورتیں ہیں۔ یہ شکلیں بے شک مختلف اور یہ صورتیں بلا ریب متنوع ہیں لیکن آپ بغور دیکھیں گے تو یہ اختلاف و تباین محض قالب و پیکر کا اختلاف ہے، روح اور حقیقت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ایک رہی ہے۔ یعنی انسانوں کی وجہ جامعیت، تشکیل مملکت، کا معیار، نسل اور زبان رنگ اور وطن کا اشتراک، اور ان کے نظام حکومت کی بنیاد اس مفروضہ پر کہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے لئے قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کیا کہ یہ

اسلامی نظریہ

وجہ جامعیت اور یہ معیار راقدار سب غیر فطری ہیں اور اس لئے باطل مملکت کی تشکیل: ایمان یعنی Ideology کی وحدت پر ہونی چاہیئے! دنیا کے تمام انسان جو ایک نظریہ حیات اور ایک تصور زندگی رکھتے ہیں، ایک قوم کے افراد اور ایک مملکت کی رعایا ہیں اور اس نظریہ حیات اور تصور مملکت کی بنیاد اس آفاقی اصول پر ہے کہ قانون سازی کا حق کسی انسان کو نہیں۔ انسانوں کے لئے اصولی قوانین اور اساسی آئین صرف ذات خداوندی متعین کر سکتی ہے۔ اس لئے اس نظام مملکت میں حاکمیت کا اقتدار اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور چونکہ خدا عبارت ہے ان صفات عالیہ سے جسے انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قوانین خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرت عالیہ کے نوامیس کی اطاعت ہے کسی غیر کی محکومیت نہیں۔ فلہذا اس مملکت میں انسان کسی غیر کا محکوم اور غلام نہیں ہوتا بلکہ اس حریت و آزادی کا پیکر زندہ ہوتا ہے جو اس کی فطرت صحیحہ کا تقاضا ہے۔ اور چونکہ وحدت خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدت خلق ہے اس لئے اس نظام کی بنیاد عدل پر ہوتی ہے۔ دنیاوی میزانوں میں عدل سے مفہوم ہے قانون مروجہ کے مطابق فیصلہ۔ مثلاً جب امریکہ میں شراب خوری قانوناً ممنوع تھی تو شراب خوار کی سزا دہی مطابق عدل و انصاف تھی۔ اور آج جبکہ قانون انسداد شراب منسوخ ہو چکا ہے تو شراب خوار سے کوئی باز پرس

عدل سے مفہوم

نہ کرنا عین مطابق عدل و انصاف ہے۔ اور اسے سزا دینا ظلم و استبداد۔ لہذا انسانوں کے خودساختہ قوانین میں عدل کی کوئی مطلق (Absolute) حیثیت نہیں محض اضافی (Relative) حیثیت ہے۔ لہذا جس فیصلہ کو آپ ایک وقت میں عین عدل کہہ رہے ہوں ضروری نہیں کہ وہ فی الواقع عدل پر مبنی ہو۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فیصلہ قانون مروجہ کے مطابق ہے۔ لیکن چونکہ قوانین الٰہیہ تو ہیں فطرت انسانیہ کے مطابق ہیں اور فطرت صحیحہ کے تقاضوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، اس لئے قوانین خداوندی کے مطابق فیصلے عدل مطلق (Absolute Justice) پر مبنی ہوں گے۔ اس نظام میں عدل سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہر انسان کو اس کی مضمر صلاحیتوں کے نشوو ارتقاء کے وسائل اور ان کے مظاہر کے امکانات میسر ہوں اور ہر فرد جماعت (سوسائٹی) میں وہ مقام حاصل کرلے جس کا وہ اپنی فطری استعداد کی رو سے مستحق ہے۔ لہذا قرآن نے دنیا کو جس دین سے روشناس کرایا اس کے اجزاء ترکیبی حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس مملکت میں اقتدار اعلیٰ اور منصب حاکمیت صرف خدا کو حاصل ہے (دین کے پہلے معنی)

(۲) تمام افراد ملت خدا کی محکومیت میں یکساں ہیں (دین کے دوسرے معنی)

(۳) اس نظام حاکمیت کی اساس قوانین قرآن کے اندر منضبط و محفوظ ہیں (دین کے تیسرے معنی)

(۴) اس نظام کا عملی نتیجہ عدل ہے جس کے بروئے کار لانے کے لئے ہر فرد مملکت اپنے اپنے مقام پر ذمہ دار ہے اور عدالت خداوندی میں جواب دہ (دین کے چوتھے معنی)

یہ ہے قرآن کی رو سے الدین جسے اسلام کہتے ہیں اس لئے کہ اس دائرہ کا نقطۂ گردش یہ اہم اصول ہے کہ اس مملکت کا ہر فرد اپنے آپ کو اس نظام کے سپرد کر دیتا ہے اور دل کے ہر ارادہ اور نگاہ کی ہر جنبش کو قانون خداوندی کے سامنے جھکا دیتا ہے۔ یہی وہ دین قیّم ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۰ : ۳۰)

اے پیغمبر اسلام! ہر طرف سے منہ موڑ کر اس نظام زندگی کی طرف اپنا رخ پھیر لو! جو اس فطرت خداوندی کے عین مطابق ہے جس پر خدا نے تمام نوع انسانی کو پیدا کیا ہے (یاد رکھو خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہی صحیح نظام زندگی ہے لیکن (افسوس) کہ اکثر لوگ

اس سے واقف نہیں ہیں۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات پر غور کیجیے اور پھر دیکھئے کہ اس نے دین کے اس وسیع مفہوم کے چاروں گوشوں کو کس طرح سمیٹ لیا ہے؟ سب سے پہلے اس نے یہ بتلایا کہ چونکہ اجتماعی زندگی بسر کرنا انسانی فطرت میں تھا اس لیے اس قسم کی زندگی کے لیے قوانین وضوابط حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بھیجے گئے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوع انسانی کو (انفرادی زندگی بسر نہیں کرنا تھا بلکہ امت واحدہ کی اجتماعی زندگی بسر کرنا تھا۔ (اور اس کے لیے قوانین وضوابط ضروری تھے) اس لیے اللہ نے یکے بعد دیگرے نبیوں کو مبعوث کیا وہ ایمان وعمل کی (برکتوں کی) بشارت دیتے اور (انکار وبدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے۔ نیز ان کے ساتھ کتاب الہٰی نازل کی گئی۔ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو (اور تمام لوگوں کو راہ حق پر متحد کر دے) اور یہ جو لوگ باہمدگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ نہیں! وحی الہٰی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے۔ (اور ان میں تفرقہ اور اختلاف کی کوئی گنجایش نہ تھی) مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے۔ (اور دین کی ایک راہ پر مجتمع رہنے کی بجائے الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ جاتے تھے) بالآخر اللہ نے ایمان لانے والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے (اور ایک دوسرے کو جھٹلا رہے تھے) اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی راہ دکھا دیتا ہے!۔

حضرت ابراہیمؑ سے پیشتر جن حضرات انبیاء کرامؑ (حضرت نوح۔ حضرت ہود، حضرت صالح علیہم السلام) کا ذکر اس نے کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شعار زندگی ہنوز قبائلی تھا۔ اور ان قبائل وشعوب میں منظم مملکت وجود میں نہیں آئی تھی۔ تاریخ کے صفحات پر اس کا وجود پہلے پہل حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نظر سے گذرتا ہے۔ اس سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ نظام مملکت پہلے پہل ایک منظم اور منضبط

شکل میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ ہی سے عمل میں آیا۔ اسی لئے بعد میں دین کو ان ہی کی ملت (مسلک) شعار بتایا گیا۔ سورہ نساء میں ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ؁ (۴/۱۲۵)

اور پھر (بتلاؤ) اس آدمی سے بہتر دین رکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ جس نے اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دیا۔ اور وہ نیک عمل بھی ہے اور اس نے ابراہیم کے طریقوں کی پیروی کی جو تمام انسانی نظام ہائے اطاعت سے منہ موڑ کر صرف خدا ہی کے لئے ہو رہا تھا اور (اسی بلاشرک اطاعت کی بنا پر) اللہ نے ابراہیم کو اپنا مخلص دوست بنا لیا تھا

اور سورہ انعام میں

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِــيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؁ (۶/۱۶۱)

اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو کہ مجھے میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے کہ وہی درست اور صحیح دین ہے، ابراہیم کا طریقہ۔ ایک خدا ہی کے لئے ہو جانا اور ابراہیم ہرگز شرکوں میں سے نہیں تھا

اسی دین پر قائم رہنے کی تاکید حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو کی۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؁ (۲/۱۳۲)

اور پھر اسی طریقہ کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور (اس کے پوتے) یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا "اے میرے بیٹو! خدا نے تمہارے لئے اس دین (حقیقی) کی راہ پسند فرمائی ہے۔ تو دیکھو دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو یعنی فرمانبردار رہو"

یہی وہ "آل ابراہیمؑ" تھی جس کے متعلق بصراحت فرما دیا کہ انہیں کتاب و نبوۃ کے ساتھ ملک عظیم بھی عطا ہوا تھا۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰھُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا

یا پھر خدا نے اپنے فضل سے لوگوں کو جو کچھ عطا کیا ہے اس کا انہیں حسد ہے (اور نہیں چاہتے کہ ہم جس نعمت سے محروم ہو چکے ہیں وہ دوسروں کے حصہ میں آئے) اگر یہی بات ہے

(تو انہیں اس بات سے بے خبر نہیں ہونا چاہیئے، کہ ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب اور حکمت دی تھی اور ساتھ ہی عظیم الشان سلطنت بھی عطا فرمائی تھی.

حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں مصر کی مملکت کا نظام نہایت واضح صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے جس میں فرعون کی شخصی حکومت تھی. یہی وہ غیر فطری نظام تھا جس پر آپ نے اپنے قید و بند کے زمانہ کے وعظ میں تنقید کی تھی اور اس کی جگہ اُس نظام مملکت دینؔ کی طرف توجہ دلائی تھی جو فطرت کی صحیح بنیادوں پر قائم ہوتا ہے.

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۳۹-۴۰)

لے یاران مجلس (تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ) جُدا جُدا آقاؤں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے. تم اس کے سوا جن ہستیوں کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں. اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں اتاری. حکومت تو اللہ ہی کے لئے ہے. اس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اسی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو اور کسی کی نہ کرو!

یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے!

حضرت یوسفؑ کے بعد بنی اسرائیل کی پوری داستان اسی نظام مملکت کے انقلابات پر مشتمل ہے. حضرت موسیٰؑ اور آپ کی جماعت کی جد و جہد سے فلسطین کی سرزمین میں فرعونی نظام (دین) اُلٹ گیا اور اس کی جگہ، مملکت بنی اسرائیل کے ہاتھ میں آگئی.

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ۝ (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو کمزور و حقیر خیال کرتے تھے اسی کو ملک کے تمام مشرقی کا اور اس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکتوں سے مالا مال ہے وارث کر دیا. اور اس طرح اے پیغمبر اسلام! تیرے

پروردگار کا فرمان پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کیونکہ وہ ہمت و ثبات کے ساتھ (جمے رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کے لئے) جو کچھ بنا تا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں وہ سب درہم برہم کر دیں!

حضرات انبیاء کرام اسی دین کو قائم کرنے کے لئے آتے تھے لیکن ان کے بعد ان کی امتیں دین کو مذہب سے بدل دیتی تھیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں یہودیوں کے ذہن سے دین کا تصور یکسر محو ہو چکا تھا اس لئے کہ جب آپ انہیں رومیوں کے نظام مملکت کے خلاف انقلاب پر آمادہ کرنا چاہتے تھے تو وہ اس تبدیلی میں اپنی مذہبی سیادت کا خاتمہ دیکھتے تھے اسی لئے خود انہوں نے آپ کی دعوت کی مخالفت شروع کر دی (تفصیل جلد سوم میں گذر چکی ہے) نبی اکرمؐ اسی دین کو قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے جس کا نام اسلام تھا اور جس کی اصلی صورت یہود و نصاریٰ نے اس درجہ مسخ کر رکھی تھی کہ خود انجیل میں اس قسم کی تعلیم داخل ہو چکی تھی کہ "قیصر کا حصہ قیصر کو دو اور کلیسا کا حصہ کلیسا کو" دین اور دنیا کی یہ تقسیم، وحدت کی جگہ ثنویت، دین کو مذہب سے بدل دینے کا نتیجہ تھا۔ مذہب ان کے نزدیک رہبانیت کا نام تھا۔ اور حکومت قیصر کا کام۔ قرآن ان تمام اختلافات کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ اس نے آکر اعلان کر دیا۔ کہ رہبانیت، مذہب کا تصور ذہن انسانی کی تخلیق ہے فرمودہ خداوندی نہیں۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (۵۷/۲۷)،

اور وہ رہبانیت جو انہوں نے خود ہی گھڑ لی تھی ہم نے ان پر فرض نہیں کی ہوئی تھی۔

خدا کی طرف سے دین عطا ہوا تھا جس کا نام اسلام ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَھُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۳/۱۹)

بلاشبہ الدین (یعنی اصلی دین) اللہ کے نزدیک الاسلام ہی ہے۔ (اس ایک دین کے سوا اور کوئی دین نہیں) اور یہ جو اہل کتاب نے باہم دگر اختلاف کیا تو یہ اس لئے نہیں ہوا کہ اس دین کے سوا انہیں کسی اور دین کی راہ دکھا دی گئی تھی، یا دین کی راہ مختلف ہو سکتی ہے بلکہ اس لئے کہ علم کے حصول کے بعد وہ اس پر قائم نہیں رہے اور آپس کی ضد اور عناد سے الگ الگ ہو گئے۔ اور یاد رکھو جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے (اور ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیتا ہے) تو اللہ کا قانون بھی حساب لینے میں سست رفتار نہیں۔

اور یہی دین ہے جس کا میزان خداوندی میں وزن ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دین (نظام مملکت) فطرت انسانی کے مطابق نہیں۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (۳/۸۳-۸۵)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈ نکالیں۔ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے خوشی سے یا ناخوشی سے اسی کے حکم کے فرماں بردار ہیں۔ اور بالآخر سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو کہ ہم خدا پر اور اس کتاب پر (خدا کی) جو ہم پر نازل کی گئی ہے یقین رکھتے ہیں اور اسی طرح ان کتابوں پر بھی یقین رکھتے ہیں جو ابراہیم اسماعیل و اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل کی گئی تھیں۔ اور ایسے ہی ان پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا تھا۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ (کہ ایک کو مانیں اور دوسرے کو نہ مانیں یا دوسرے کو مانیں اور تیسرے کا انکار کردیں)۔ اور ہم اسی ایک خدا کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ اور (دیکھو!) جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت کے دن اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔

اس نظام کی بنیادی خصوصیت اور اساسی امتیاز یہ ہے کہ اس میں اطاعت و محکومیت خدا اور صرف خدا کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے بار بار ارشاد ہوا کہ " وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ " (۷/۲۹ و ۶۵)

دین کی اساس

اطاعت و انقیاد کی تمام صورتیں، محکومیت و فرماں پذیری کی سب جہتیں، تعبد و تذلل کے تمام گوشے، خود سپردگی اور نگوں ساری کے تمام انداز تسلیم و رضا کے سب اسلوب، قلب و نگاہ کے تمام جھکاؤ، اس ایک ذات صمدیت مآب کے لئے وقف کردو کہ اس کے سوا اور کوئی ایسی ہستی نہیں کہ جس کے سامنے جھکنا زیبا، اور اطاعت و محکومیت شایان شان انسانیت ہو وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۸/۱۴) اگرچہ کفار کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو؟ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ

أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۳۹/۳) اے پیغمبر اسلام! الدین کو خدا کے لئے خالص رکھتے ہوئے اللہ ہی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو! یاد رکھو خالص دین خدا ہی کے لئے ہے۔

جب کائنات کی پستیوں، بلندیوں میں سب کچھ اسی کی مملکت میں ہے تو پھر اطاعت وجود بھی دائم و قائم اسی کے لئے ہے

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝ (۱۶/۵۲)

اور اسی کے لئے ہے، جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اور اسی کے لئے دین ہے دائمی۔ پھر کیا تم اللہ کے سوا دوسری ہستیوں سے ڈرتے ہو؟

اگر کسی کو اس حقیقت عظمیٰ کے اعتراف میں شک ہے تو اسے گمراہیوں کی ان ہلاکت انگیز وادیوں میں بھٹکنے والے اندھوں کی تقلید آنکھوں والا کیوں کرے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ښ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۰/۱۰۴-۱۰۵)

اے پیغمبر اسلام! تم کہدو! اے لوگو! اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی طرح کے شبہ میں ہو۔ تو میں بتلا دیتا ہوں کہ میرا طریقہ کیا ہے؟ تم اللہ کے سوا جن ہستیوں کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرتے ہو۔ میں ان کی محکومیت و اطاعت اختیار نہیں کرتا۔ میں تو اللہ کی محکومیت و اطاعت اختیار کرتا ہوں جس کے قبضہ میں تمہاری زندگی ہے اور جس کے حکم سے تم پر موت طاری ہوتی ہے اور مجھے اسی کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ مومنوں کے زمرے میں رہوں۔ اور نیز مجھے کہا گیا ہے کہ ہر طرف سے ہٹ کر اپنا رخ اللہ کے دین کی طرف کر لو۔ اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم شرک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ!

لہذا۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۱۰/۱۰۶)

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پکار! اس کے سوا نہ کوئی ... تجھے ... فائدہ پہنچا سکتا

ہے نہ نقصان۔ اگر تونے ایسا کیا تو پھر یقیناً تو بھی ظلم کرنے والوں میں گنا جائے گا۔

اس لئے کہ:۔

وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۚ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۱۰۷)

(اور اگر اللہ کی طرف سے تجھے کوئی دکھ پہنچے تو جان لے کہ اسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔ مگر اسی کی ذات اگر وہ تجھے کسی قسم کی خوبی بخشنی چاہے تو جان لے کہ کوئی نہیں جو اس کا فضل روک لے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے، اپنا فضل کرے۔ وہ بخشش دینے والا، رحمت والا ہے۔)

لہٰذا انہیں پکار کر کہدو:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ (۱۰۸)

(اے پیغمبر اسلام!) ان لوگوں سے کہدو کہ اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی تمہارے پاس آگئی ہے۔ پس جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا۔ اور جو بھٹکے گا تو اس کی گمراہی اس کے آگے آئے گی۔ میں تم پر نگہبان نہیں ہوں (کہ زبردستی کسی راہ پر کھینچ لاؤں۔)

اس کی عملی شکل

اور اس اطاعت وانقیاد خداوندی کی عملی شکل کیا ہے؟

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (۱۰۹)

(اے پیغمبر اسلام!) جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے اس پر چلتے رہو! اور اپنی راہ میں جمے رہو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ ۔ ۔ ۔

اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ (۲۲)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی خشکی اور تری میں سیر وگردش کا سامان کردیا ہے۔ پھر جب

ایسا ہوتا ہے کہ تم جہازوں میں سوار ہوتے ہو۔ جہاز موافق ہوا پا کر تہیں لے اڑتے ہیں، مسافر خوش ہوتے ہیں (کہ کیا ہی اچھی ہوا چل رہی ہے)، پھر اچانک ہوائے تند کے جھونکے نمودار ہوجاتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں ہجوم کرنے لگتی ہیں۔ اور مسافر خیال کرتے ہیں۔ بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی) تو اس وقت (انہیں خدا کے سوا کوئی اور ہستی یاد نہیں آتی وہ) دین کے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ خدایا! اگر تو اس حالت سے ہمیں نجات دیدے تو

ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے۔

عبادت کا مفہوم اس حقیقت کے پیش نظر قرآن کریم نے خدا اور بندے کے تعلقات کے اظہار کے لئے لفظ عبادت کا استعمال کیا ہے، جس کے معانی میں مندرجہ صدر مفہوم خود شامل ہے۔ عبادت کے معنی ہی محکومیت اور غلامی کے ہیں۔ اس لئے قرآن کی رو سے انسان اور خدا کا تعلق محض پرستار و پرستیدہ کا نہیں بلکہ حاکم و محکوم کا ہے۔ وعظ یوسفی کے ان درخشندہ ٹکڑوں پر پھر غور کیجئے جو زندان کی تاریکیوں میں وجہ نورانی قلب و نظر ہوئے، یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی فرمایا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) حکومت صرف اللہ کے لئے ہے "اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۲/۴۰) اس نے حکم دیا ہے کہ محکومیت و عبودیت صرف اسی کی اختیار کرو!" ان دونوں ٹکڑوں کو ملائیے۔

اور دیکھئے کہ عبادت کا صحیح مفہوم کس طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سورہ کہف کے آخر میں فرمایا

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ (۱۸/۱۱۰)

(اے پیغمبر اسلام!) ان سے کہدیجئے کہ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا معبود وہی ایک ہے اس کے سوا کوئی نہیں پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کے لئے آرزو رکھتا ہے چاہیئے کہ اچھے کام انجام دے! اور اپنے پروردگار کی محکومیت و اطاعت میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے۔ (بس اس کے سوا میری کوئی پکار نہیں)

اور خود اسی سورۃ کے شروع میں اللہ تعالےٰ کے متعلق ہے کہ:۔

لہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف چند ضمنی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶)

وہ اپنی حکومت میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا۔

ان دونوں کے ربط سے عبادت کے معنی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رو سے عبادت کے معنی پرستش کرنا نہیں بلکہ محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اس سے غور فرمائیے کہ جب ایک عبد مومن خدا کے حضور پورے خضوع و خشوع سے اقرار کرتا ہے کہ ایاك نعبد "ہم تیری ہی محکومیت اختیار کرتے ہیں" تو کتنے بڑے انقلاب انگیز دعوے کا اعلان کرتا ہے۔ عبادت کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر ان آیات پر پھر ایک مرتبہ غور فرمائیے جو دین سے متعلق اوپر درج ہو چکی ہیں ۔۔۔۔۔۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کا صحیح مفہوم کس قدر واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مقام پر اس حقیقت کے ایک اور گوشہ کی طرف غور کرنا بھی ضروری ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان جو حاکم و محکوم کا تعلق ہے وہ اس نوعیت کا نہیں جس نوعیت کا تعلق دنیاوی حکام اور ان کی محکوم رعایا میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ تمام کائنات کا مالک، قوتوں کا حقیقی سرچشمہ، اور ان صفات عالیہ سے عبارت ہے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کر کے انسانیت کی معراج کبریٰ تک پہنچتا ہے اس لئے اس کی اطاعت و محکومیت سے مقصود اس کی جبروت و کبریائی اور اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف اور اس کے شئون و اصباغ سے ہمنوائی و یکرنگی کے لئے تگ و تاز ہے۔ اسی اعتراف کا فطری نتیجہ ہے کہ ستائش و نیائش کی تمام نغمہ سرائیاں اسی کی ذات پر ہمتا کے لئے وقف ہوں اور تعبد و سجودگی تمام نیاز مندیاں اسی کے عتبۂ عالیہ کے لئے مخصوص۔ ان والہانہ جذبات کے اظہار کا نام اگر پرستش رکھا جائے تو پھر اس اعتبار سے خدا اور بندے کے قرآنی تعلقات میں پرستش کا یہ گوشہ بھی موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر یہ تعلقات سمٹ سمٹا کر نقطۂ پرستش تک محدود رہ جائیں تو اس کا نام مذہب (یا رہبانیت) ہوگا اور اگر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی تمام بساط کو محیط ہوں تو اس کا نام دین ہے فلہٰذا۔ دین کے اندر مذہب شامل ہے لیکن مذہب کے اندر دین شامل نہیں۔ نظام مملکت سے جب خدا اور بندے کے اس تعلق کو الگ کر لیا جائے تو وہ خالص مادی سیاست رہ جاتی ہے جسے چنگیزیت کہا جائے گا۔ اور اگر دین سے نظام مملکت کو جدا کر دیا جائے تو وہ صرف مذہب رہ جاتا ہے جسے رہبانیت کہا جاتا ہے دین کی یہی وہ تفریق ہے جس سے اس شد و مد کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا

فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ
وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ۝ (۴۲: ۱۳)

اے پیروان دعوت ایمانی! خدا نے تمہارے لئے وہی الدین (نظام زندگی) مقرر کیا ہے جس کی اس نے نوح کو وصیت کی تھی یا (اے پیغمبر اسلام!) جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے اور جس کی ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی تھی کہ اس الدین (نظام زندگی) کو قائم کرو (کہ ایک زندہ حقیقت بن جائے) اور پھر اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرو! (اے پیغمبر اسلام!) مشرکین کو یہ نظام بہت ہی گراں اور ناگوار معلوم ہو رہا ہے جس کی طرف تم انہیں بلا رہے ہو! یہ واقعہ ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے اپنی طرف منتخب کر لیتا ہے (یعنی جسے چاہتا ہے نسل انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے منتخب کر کے منصب رسالت سے نواز دیتا ہے) اور یہ اس کا قانون ہے کہ وہ اپنی طرف صرف انہی لوگوں کی راہ نمائی کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (متمرد و سرکش لوگوں کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا)

دنیا میں بنیادی تفریق یہ ہے کہ اسے مذہب و سیاست کے شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پرستش خدا کی اور محکومیت انسانوں کی، یہی وہ شرک تھا جس سے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا تھا۔ سورۂ روم کی مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کیجئے! اور دیکھئے کہ وہ کس طرح پکار پکار کر اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں کہ:-

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ
لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۰: ۳۰)

اے پیغمبر اسلام! ہر طرف سے منہ موڑ کر اس نظام زندگی (الدین) کی طرف اپنا رخ پھیر لو جو اس فطرت خداوندی کے عین مطابق ہے جس پر خدا نے تمام نوع انسانی کو پیدا کیا ہے (یاد رکھو!) خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہی صحیح نظام زندگی (الدین القیم) ہے لیکن (افسوس) اکثر لوگ اس (حقیقت سے) واقف نہیں ہیں۔

یہ ہے دین کی اصل بنیاد، اس کے بعد فرمایا۔

مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝
مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ
فَرِحُونَ (۳۰: ۳۱-۳۲)

اللہ کی طرف رجوع ہوتے ہوئے (فطرت الٰہی کا اتباع کرو) اور خدا کی حفاظت و صیانت میں آجاؤ۔

اور نماز کا نظام ؛ قائم کرو - اور خدا کے ساتھ (حکومیت و اطاعت میں دوسری ہستیوں کو شریک کرنے والوں میں سے مت ہو جاؤ ر (اور ان مشرکین میں سے مت ہو جانا!) جنہوں نے دین (نظام زندگی) میں تفریق پیدا کر دی اور وہ گروہ در گروہ بٹ گئے (اور حالت یہ ہو گئی کہ) ہر جماعت پھٹکے ہوئے (اقبال بد) پر نازاں و فرحاں تھی۔

تفریق مذہب و سیاست

پہلی تفریق "مذہب و سیاست" کی - اس کے بعد، تحزب و تشیع سیاسی پارٹیوں اور مذہبی گروہ سازی کی شکل میں جب مرکزیت فنا ہو جائے، حکومیت خدا کے بجائے انسانوں کی اختیار کر لی جائے۔ اور دین نام رہ جائے چند رسوم و مناسک کی ادائیگی کا تو پھر سیاسی اور مذہبی جتنے بھی فرقے بن جائیں کم ہیں - دین کی یہی وہ بنیادی تفریق یعنی مذہب و سیاست کی علیحدگی تھی جس نے ظہور اسلام کے وقت ساری دنیا میں فساد ہی فساد پھیلا رکھا تھا۔ اسی تفریق کو مٹانے کے لئے حضورؐ تشریف لائے علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں، اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سر بزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی، ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

یہ تھا وہ دین جسے لیکر حضورؐ مبعوث ہوئے اور ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اللہ کے اس عہد کو بھلا چکے تھے کہ حکومیت اس کے سوا کسی کی جائز نہیں - اور جن اجزاء مذہب و سیاست کو ملانے کا حکم اللہ نے دیا تھا انہوں نے قطع کر رکھا تھا اور جس طرح دنیا میں فساد برپا ہو رہا تھا۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ص وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲:۲۷)

(فاسق کون ہیں: فاسق وہ ہیں) جو احکام الٰہی کی اطاعت (و حکومیت) کا عہد و میثاق کر کے پھر اسے توڑ دیتے (اس عہد سے پھر جاتے) ہیں اور جن عناصر کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے ان کے قطع کرنے میں بے باک ہیں، اور اپنی (بداعمالیوں اور سرکشیوں سے) ملک میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔

بلاشبہ یہی لوگ ہیں جن کے لئے سرتاسر نامرادی ہی نامرادی ہے۔

⁂

حکومت اور قوت

دین کے اس مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد اب آگے بڑھئے۔ دنیا میں کوئی نظامِ مملکت قوت کے بغیر نہ قائم کیا جا سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے۔ قانون، قانون کی حیثیت ہی اس وقت اختیار کرتا ہے جب اس کے پیچھے قوتِ نافذہ موجود ہو۔ ہندوستان میں ضابطۂ تعزیراتِ ہند ایک زندہ قانون ہے اس لئے کہ یہاں اسے چلانیوالی قوت موجود ہے۔ لیکن یہی کتاب سرحد کے آزاد قبائل میں ردی کی ٹوکری میں پھینکدینے کے قابل ہے کہ وہاں اس قوت کا دائرۂ اثر و نفوذ نہیں یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان حرارت آمیز، اور بصیرت نواز، الفاظ میں آشکارا کیا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۵۷/۲۵)

(اے افرادِ نسلِ انسانی!) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور ان کے ساتھ کتاب (قانون) اور میزان (عدل) نازل کی تھی، تاکہ لوگ عدل و انصاف کو قائم کر سکیں اور دیکھو ہم نے شمشیرِ فولادی کو نازل (پیدا) کیا جس میں بڑی ہی طاقت اور لوگوں کے لئے بڑی ہی منفعتیں ہیں۔ تاکہ خدا، عملاً جان لے کہ کون بن دیکھے خدا اور اس کے رسول کے (الدین) کی امداد کرتا ہے (اور کون امداد نہیں کرتا) بلاشبہ اللہ بڑی ہی قوتوں کا مالک اور عزت و عظمت والا ہے!

کتاب (قانون) اس کے ساتھ فولاد (قوت)، ان ہی دونوں کے امتزاج سے نظامِ مملکت کا قیام ہے۔ قانون بلا قوت محض ضابطۂ اخلاق رہ جاتا ہے۔ جسے ملا اپنے وعظ میں، پنڈت اپدیشں میں، اور پادری گرجا کے سرمن (sermon) میں منتوں اور سماجتوں سے پیش کرتا ہے، اور سامعین حظِ تقریر سے بہرہ یاب ہو کر دامن جھاڑ کر اٹھ آتے ہیں اور ایسے اجتماعات وعظ و نصائح کو موجبِ خیر و برکت اور باعثِ ثوابِ دارین قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں۔ اور جب قوت کیساتھ

---

[1] اوائل ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا۔ [2] اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر ہے اور خدا کے نزدیک پیارا ہے۔ (مسلم۔ کتاب القدر، باب فی الامر والقوۃ)

قانون نہیں رہتا تو وہ سرزمین بے آئین، فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

اہل حق را زندگی از قوت است قوت ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں قوت بے رائے جہل است و جنوں

قانون بلا قوت (یعنی مذہب) میں حق و باطل کا معیار مباحثوں اور مناظروں کے لفظی مجادلات رہ جاتے ہیں۔ اور ہر فریق اپنے اپنے قانون (ضابطہ تعلیم مذہب) کو منطقی دلائل و فلسفی براہین سے سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ کسی قانون کی نافعیت و اصابت اور صداقت و حقانیت کا معیار ہی وہ نتائج ہیں جو اس پر عمل پیرا ہونے سے مرتب ہوتے ہیں۔ اور وہ نتائج مرتب ہو ہی نہیں سکتے جب تک اس قانون کو دنیا میں عملاً نافذ نہ کر دیا جائے۔ اس لئے

زندگی کشت است و حاصل قوت است

شرح رمز حق و باطل قوت است

استخلاف

قرآن کریم اس قوت نافذہ کو استخلاف کہتا ہے جس سے دین تمکن ہو جائے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔـا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴ : ۵۵)

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور (وراثت ارض کی) صلاحیت پیدا کرنے والے اعمال کئے، یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم ضرور بالضرور انہیں دنیا میں قوت و عظمت کا مالک بنا دیں گے جس طرح ہم نے ان سے پہلوں کی قوت و شوکت عطا فرمائی تھی اور یہ وعدہ کیا ہے کہ بلاشبہ خدا اُن کے اس دین کو ان کے لئے متمکن (با اقتدار و صاحب قوت) بنا دے گا جسے خدا نے ان کے لئے پسند فرما لیا ہے۔ اور نیز پُر خوف زندگی کے بعد اُن (کی زندگی) کو امن و سلامتی (کی زندگی) میں تبدیل کر دے گا۔ کیونکہ وہ لوگ میری ہی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرتے ہیں اور میرے ساتھ (میری اطاعت و محکومیت میں) کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے۔ اور جس نے ان تمام باتوں کے باوجود انکار کی راہ اختیار کی تو درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو فسق و فجور پھیلانے والے ہیں۔

دیکھئے! دین کے اس تمکن کا نتیجہ کیا ہے؟ عبادت (محکومیت) صرف خدا کی رہ جائے اور اسکی حاکمیت میں کسی کی شرکت نہ ہو یَعْبُدُوْنَنِیْ وَلَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا اسی طرح دنیا میں قانون قرآنی کی تنفیذ ہوگی۔ اور اس قوت پر، ہر وقت قانون خداوندی کا محاسبہ اور نگرانی ہوگی۔ قرآن اور شمشیر بس اسی دائرہ کے اندر دین محصور و مصئون ہے ؎

این دو قوت حافظ یک دیگر اند
کائنات زندگی را محور اند
مرد مومن را عزیز اے نکتہ رس
چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

یہی وہ مدار تمکن دین ہے جس کے متعلق سورۂ انفال میں فرمایا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)

اور جس قدر ان کے مقابلہ کے لئے تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو! اس طرح مستعد رہو گے تم اللہ کے (کلمۂ حق کے) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رہو۔

اسی لئے وہ جماعت مومنین، وہ خدا کا لشکر (حزب اللہ) جو دنیا میں اس قانون خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے منتخب کیا گیا، اس کا فریضۂ زندگی یہ بتلایا گیا۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

(۲۲/۴۱ نیز ۳/۱۱۰، ۹/۱۱۲)

وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا)، تو وہ نماز کا نظم، قائم کریں گے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم کریں گے، برائیاں روکیں گے اور (یاد رکھو) تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے لئے ہے۔

دنیا میں بھلائی کا حکم نافذ کرنے والے۔ فتنہ و فساد کو روکنے والے[1]۔ نشۂ قوت میں بدمست ہو کر جور و

---

[1] حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق پر جھکا دو" (جامع ترمذی تفسیر مائدہ) اس ایک مختصر سے ٹکڑے میں اسلام کی بنیادی تعلیم اور جہاد کا پورا فلسفہ آجاتا ہے۔

تقدیر پر اترنے والے نہیں۔ اس لئے کہ وہ اس تمام قوت و سطوت کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز و نگوں سار رہتے ہیں کہ وہ اس قوت کے امین بنائے گئے ہیں، مالک نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ؎

خسروی شمشیر و درویشی نگاہ　　ہر دو گوہر از محیط لا الٰہ

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است　　ایں تجلیہائے ذات مصطفیٰ است

ایں دو قوت از وجود مومن است　　ایں قیام و آں سجود مومن است

یہی ہیں وہ صاحبان قوت و عجز اور ارباب شدت و رحمت جن کے متعلق سورہ فتح میں فرمایا کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ

محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ (جماعت مؤمنین میں سے) ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں سخت اور آپس میں نرم ہیں۔ تم انہیں رکوع و سجود میں مشغول پاؤ گے کہ ہمیشہ اللہ کے فضل و رضامندی کے طلبگار رہتے ہیں۔ سجدہ کے اثرات سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا یہی حال تورات میں مذکور ہے اور بالکل یہی حال انجیل میں بیان ہوا ہے

اس شدت و صلاحیت کی ضرورت اس لئے ہے کہ اس کے بغیر قانون بے نتیجہ ہو کر رہ جاتا ہے ؎

تمیز خار و گل سے آشکارا　　نسیم صبح کی روشن ضمیری

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے　　اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

ان قرآنی حقائق پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ قوت، تمکن و استقرار دین (نظام مملکت) کیلئے کس قدر لاینفک ہے۔ لاینفک کیا؟ دین کا منطقی نتیجہ ہے۔ قوت کے بغیر دین، مذہب بن کر رہ جاتا ہے

گر موجب ہنگامہ نہ ہو ممبر و محراب

دیں بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب

اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت پیش نظر رکھئے کہ جو قوت دین کی حفاظت کے لئے اور قوانین خداوندی کے تابع ہو وہ دنیا میں سرکشی و طغیان کا باعث نہیں ہو سکتی۔ سرکشی اور طغیان، جور و استبداد اس وقت آتا ہے جب قوت و سیاست، دین سے الگ کر لی جائے ؎

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے　　صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیل سبک سیر وزمیں گیر کے آگے | عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر | ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

قرآن دنیا میں دین لیکر آیا ہے، نہ اکیلا مذہب، نہ اکیلی سیاست۔ اس کے احکامات ضوابط اخلاق نہیں۔ جنہیں بطور پند و نصائح پیش کیا جائے اور منت و سماجت سے اس پر عمل پیرا ہونیکی تلقین کی جائے۔ بلکہ وہ ایک ضابطۂ آئین ہے جسے حکومت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کیا جائے گا۔ غور کیجئے زنا ایک اخلاقی جرم ہے لیکن اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲۴)

(اے پیروان دعوت ایمانی! یاد رکھو! خدا کا یہ قانون اور فرمان ہے کہ) زانی مرد و عورت رکی یہ سزا ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کے سو درے لگائے جائیں۔ اور ریاد رہے کہ) قانون خداوندی میں، ان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت و نرمی تمہارے لئے عناں گیر نہ ہو۔ اور ان دونوں کو سزا دیتے وقت مؤمنین کی ایک جماعت کو موجود رہنا چاہیئے (یعنی یہ سزا علی الاعلان دیجائے گی گلکسیا میں گڑ نہیں چھوڑا جائے گا۔)

آپ نے غور کیا کہ دین سے یہاں کیا مفہوم ہے؟ کیا وہ فتاویٰ کہ جو مفتیانِ دین مبین اور حاملان شرع متین کی بارگاہ ارشاد و موعظت سے صادر ہوتے ہیں، جن کی پابندی دوسرے کی مرضی پر منحصر ہے یا وہ حکم جو حکومت کی طرف سے نافذ ہوتا ہے اور جس کی پابندی قانوناً کرائی جاتی ہے۔ یا مثلاً شہور اربعہ کی حرمت کا حکم۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ (۹)

اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ مہینوں کی ہے۔ اللہ کی کتاب میں ایسا ہی لکھا گیا جس دن آسمانوں اور زمینوں کو اس نے پیدا کیا۔ ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت کے مہینے ہوئے (یعنی رجب ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم)، کہ امن کے مہینے سمجھے جاتے تھے اور لڑائی ممنوع تھی (الدین) صحیح

نظام زندگی یہی ہے، پس ان حرمت کے مہینوں میں (جنگ و خوں ریزی کر کے) اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو! اور چاہیئے کہ مشرکین سے بلا استثنا جنگ کرو! جس طرح وہ تم سے بلا استثنا جنگ کرتے تھے اور (ساتھ ہی یاد رکھو!) کہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو (ہر حال میں) تقوی والے ہیں۔

یہاں پر بھی دین کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اپنے مفہوم کی وضاحت کر رہا ہے۔ یا اشیار خورد و نوش کی حلت و حرمت کے مسائل۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۵: ۳)

(مسلمانو!) تم پر (یہ چیزیں) حرام کر دی گئی ہیں۔ مردار جانور۔ خون۔ سور کا گوشت۔ وہ (جانور) جو غیر خدا کے نام پر پکارا جائے۔ گلا گھونٹ کر مارا ہوا۔ چوٹ لگا کر مارا ہوا۔ وہ جو بلندی سے گر کر مر جائے۔ وہ جو کسی جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے۔ وہ جسے درندہ پھاڑ کھائے۔ مگر ہاں وہ (حرام نہیں) جسے تم (اس کے مرنے سے پہلے) ذبح کر لو۔ وہ جانور جو کسی تھان پر (چڑھا کر) ذبح کیا جائے اور یہ بات بھی کہ (کسی جانور کا گوشت یا کوئی اور چیز بطور جوے کے) تیروں کے پاسوں سے آپس میں تقسیم کر لو (جیسا کہ مشرکین عرب کیا کرتے تھے) یہ گناہ کی بات ہے۔ (مسلمانو!) جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی تھی وہ آج تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں (کہ تم راہ حق چھوڑ کر ان کا طریقہ اختیار کرنے والے نہیں) پس ان سے نہ ڈرو! مجھ سے ڈرو! (اور میرے حکم کی تعمیل کرتے رہو! اگر تم مجھ سے ڈرتے رہے تو پھر کوئی نہیں جو تمہیں اپنی قوت و طاقت سے خوف زدہ کر سکے گا) آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور تمہارے لئے پسند کر لیا ہے ایک دین جو دین اسلام ہے! پس دیکھو جو کوئی بھوک سے بے بس ہو جائے (یہ بات نہ ہو کہ عمدًا گناہ کرنا چاہے) اور کوئی حرام چیز کھا لے، تو اللہ بخشنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے

دیکھئے یہاں تکمیل دین کا ارشاد ہوا ہے۔ اسلام میں ان احکام کی خلاف ورزی قانونی جرم ہے، مذہبی گناہ نہیں۔ لیکن چونکہ اس کے قانون کی اساس اس اصول پر ہے کہ مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے نہیں، اس لئے وہاں قانونی جرم اور مذہبی گناہ الگ الگ نہیں ہو سکتے۔

٭

عالمگیر نظام حکومت

اب اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن کا نظام مملکت' دین فطرت انسانی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے اور تکمیل شرف انسانیت کا کفیل و آئینہ دار ہے، اس لئے یہ تمام نوع انسانی کا دین ہے۔ بلا لحاظ زمان و مکان اور بغیر حدود ملک و نسب اس کے نزدیک یہ دین (یعنی خدا کی حاکمیت کا عملی نفاذ) حق ہے اور اس کے سوا تمام نظامات مملکت (خواہ ان کی صورت فرعون کی شخصی حکومت ہو یا دور حاضرہ کی نظر فریب جمہوریت) باطل ہیں۔ اس لئے کہ ان کی بنیاد اس غلط اصول پر ہے کہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں پر حکومت کا حق حاصل ہے

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سو جب حقیقت یہ ہے کہ یہ نظام مملکت نوع انسانی کے لئے ہے اور صرف یہی نظام حق ہے تو اسے کسی خاص قوم تک محدود یا کسی خاص خطۂ ارض میں محصور سمجھنا اصولاً غلط اور اس کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس نظام کی تکمیل ہی اسی صورت میں ہوگی جب یہ نظام تمام نظامات عالم پر غالب آجائے اسی لئے فرمایا کہ

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۴۸/۲۸﴾

خدا وہی تو ہے جس نے اپنے رسول (محمد) کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین (نظام حکومت) کو تمام ادیان (نظامہائے باطل) پر غالب کر دے۔ اور دین حق کے متعلق خدا کی شہادت بس کرتی ہے:

دوسری جگہ ہے۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ

عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۶۱/۹ ، ۹)

لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (ہدایت خداوندی) کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، حالانکہ (یہ طے ہو چکا ہے کہ) کفار کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو خدا بہرحال، اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے۔ وہ خدا، وہ ہے جس نے اپنے رسول (محمد) کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین (نظام حکومت) کو تمام ادیان (نظام ہائے باطل) پر غالب کر دے، خواہ مشرکین کو اس کی کتنی ہی ناگواری کیوں نہ ہو؟

ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر فائق و غالب ثابت کرنے کے لئے تو مناظرے کے میدان کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک دین (نظام مملکت) کو دوسرے دین پر غالب و مسلط کرنے کے لئے کسی اور میدان کی ضرورت ہے۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

یہاں منطق و فلسفہ کی داستان سرائیاں اور کلام و بیان کی قوالیاں کام نہیں دیتیں۔ یہاں وہ حدید کام دیتا ہے جسے اللہ نے قانون کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ دنیا میں عدل قائم رہے؎

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے　　کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں　　پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

لیکن یہ فقط مصرعۂ اول ہے۔ شعر اس وقت مکمل ہو گا جب قرآن کا مصرعۂ ثانی بھی اس کے ساتھ ہو گا کہ شمشیر کا نتیجہ، عدل، صرف اسی صغریٰ و کبریٰ سے مرتب ہو سکتا ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

باب دوم

گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ حسب ذیل نتائج آپ کے سامنے آجائیں گے۔

(۱) انسان مدنی الطبع ہے اس لئے حیات اجتماعی اس کا تقاضائے فطرت ہے۔

(۲) حیات اجتماعیہ کی تشکیل و ترتیب کا نام مملکت ہے۔

(۳) مملکت کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۴) اس نظام کا قیام و استحکام قوت پر منحصر ہوتا ہے۔

(۵) انسانوں نے جس قدر نظامات مملکت تجویز و اختراع کئے وہ سب اس اصول پر متفرع تھے کہ بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے لئے قانون سازی اور حکومت کا حق حاصل ہے۔

(۶) انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی اساس مصالح مملکت پر ہوتی ہے' ضابطۂ انسانیت پر نہیں۔

(۷) ضابطۂ اخلاق کا دائرہ مذہب سمجھا جاتا ہے۔ جس کی بنیاد خدا (یا کسی اور ہستی) کی پرستش پر ہوتی ہے۔

(۸) مذہب اور سیاست کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور دونوں میں باہمی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(۹) اسلام ایک ایسا نظام مملکت پیش کرتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کا منصب صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے اور مملکت اس کے قانون کو نافذ کرنے کا ذریعہ اور واسطہ۔

(۱۰) اس قانون کے نفاذ کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے کہ قوت کے بغیر قانون کی کچھ حیثیت نہیں رہتی۔

(۱۱) اس انتظام کا زندہ نتیجہ نوع انسانی کے لئے عدل و انصاف ہوتا ہے جس میں بالادست اور زیردست کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔

(۱۲) یہ نظام چونکہ فطرت انسانی کے تقاضوں کے مطابق ہے اس لئے تمام نوع انسانی کے لئے مطلوب ہے۔

(۱۳) اس نظام کے سوا چونکہ تمام نظامات مملکت غیر فطری ہیں لہذا باطل ہیں۔ اس لئے اس نظام

حق و صداقت کا تمام باطل نظامات پر غلبہ و کامرانی ضروری ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اس نظام کا غلبہ کیسے ہوگا؟ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس نظام مملکت (دین) کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ دنیا میں خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں اور وہ قوانین جن کی رو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جائے گی، قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ اصول ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ عقیدے کا تعلق دل سے ہوتا ہے

اختیار و ارادہ

اس لئے یہ کسی سے بجبر نہیں منوایا جا سکتا۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ سے یہی مفہوم ہے کہ آپ کسی کو اس عقیدے پر ایمان لانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے؛ کہ ایمان اور جبر دو متضاد چیزیں ہیں۔ لا اکراہ فی الدین کی تفسیر سورۂ یونس کی اس آیت سے ہو جاتی ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۝ (۱۰/۹۹)

اور اے پیغمبر اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ (اور دنیا میں اعتقاد و عمل کا اختلاف باقی ہی نہ رہتا۔ لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا اور اس کی مشیت یہی ہوئی کہ طرح طرح کی طبیعتیں اور طرح طرح کی استعدادیں ظہور میں آئیں۔ پھر اگر لوگ نہیں مانتے تو) کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لائیں چھوڑنے والا نہیں؟

عقیدہ کی آزادی انسانی حریت فکر و نظر کی اساس و بنیاد ہے، اور قرآن اس آزادی کو بڑی شدت اور تاکید سے برقرار رکھتا ہے اور اس باب میں اس تعلیم کی مثال دنیا کے کسی اخلاقی ضابطہ میں نہیں مل سکتی۔ دیکھئے وہ کس قدر واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (۲۲/۴۰)

اور یاد رکھو! اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں .. .. بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کے لئے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادتگاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ (یاد رکھو!) جو کوئی اللہ کی (سچائی) کی حمایت کرے گا ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں کہ وہ یقیناً قوت رکھنے والا

اور سب پر غالب ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ آیت مقدسہ کس مقام پر آئی ہے؟ وہاں، جہاں مسلمانوں کو پہلی مرتبہ جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ذرا اُن آیات پر بھی غور کر لیجئے! ارشاد ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۔ ۔ ۔ (۲۲-۳۹-۴۰)

جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی رخصت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں۔ ان کا کوئی جرم نہ تھا اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔

اور اس کے بعد ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲-۴۱)

(یہ مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز کا نظم قائم کریں گے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

ان آیات کو ملا کر دیکھئے آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟ یعنی مسلمانوں کو تمکن فی الارض اس لئے ملیگا کہ لوگوں کے عقائد کی آزادی برقرار رہے۔ اگر کوئی قوم ہندوؤں کے مندر، عیسائیوں کے گرجے، یا یہودیوں کے صومعے برباد یا منہدم کرنے کا ارادہ کرے

تمام معابد کی حفاظت

تو خدا کے سپاہی ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس دست درازی کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر ہو کر باہر نکل آئیں وہ ان معابد کی حفاظت میں اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں وہ اللہ کی مساجد سے روکنے والے کو ظالم کہتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (۲-۱۱۴)

(اور غور کرو!) اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے؟ جو اللہ کی عبادتگاہوں میں اسکے

نام کی یاد سے مانع آئے اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو، جن لوگوں کی ظلم و شرارت کا یہ حال ہے۔ یقیناً وہ اس لائق نہیں کہ خدا کی عبادتگاہوں میں قدم رکھیں بجز اس حالت کے کہ دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کی جگہ خود دوسروں کی طاقت سے ڈرے سہمے ہوئے جائیں اور ظلم و شرارت کی جرأت ہی انہیں باقی نہ رہے، یاد رکھو ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب ہے

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهٖ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲ : ۲۱۷)

اے پیغمبر! لوگ تم سے پوچھتے ہیں۔ کہ جو مہینہ حرمت کا مہینہ سمجھا جاتا ہے اس میں لڑائی لڑنا کیسا ہے ان سے کہدو! اس میں جنگ کرنا۔ بڑی برائی کی بات ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو! کہ انسان کو اللہ کی راہ سے روکنا (یعنی ایمان اور خدا پرستی کی راہ اس پر بند کر دینا) اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام میں نہ جانے دینا۔ نیز مکہ سے وہاں کے بسنے والوں کو نکال دینا۔ اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برائی ہے۔ اور فتنہ (یعنی ظلم و فساد) قتل سے بھی بڑھ کر ہے (پھر بتلاؤ! کہ ان برائیوں کا انسداد ضروری ہے یا ایک مہینہ کی حرمت کے پیچھے لگے رہنا؟ جس حرمت کا خود دشمنوں نے بھی لحاظ نہیں رکھا ہے) اور یاد رکھو! یہ لوگ تم سے برابر لڑتے رہیں گے؛ یہاں تک کہ اگر بن پڑے تو تمہیں تمہارے دین سے بھی برگشتہ کر دیں (کیونکہ تم میں اور ان میں اور کوئی وجہ مخاصمت نہیں ہے سارا جھگڑا اسی بات کا ہے کہ کیوں تم نے دین حق قبول کر لیا ہے؟ پھر کیا تم تیار ہو کہ بعض لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اسے چھوڑ دو! اگر تیار نہیں ہو تو ظاہر ہے کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں) اور دیکھو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے گا اور اسی حالت برگشتگی میں دنیا سے چلا گیا تو یاد رکھو! اس کا شمار ان لوگوں میں سے ہوگا جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے والا۔

اسی فساد کو روکنے کے لئے وہ دنیا میں ایک ایسی جماعت کا وجود ضروری سمجھتا ہے جو مستبد قوتوں

کی سرکشی کا جواب دے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۬ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (۲/۲۵۱)

چنانچہ (ایسا ہی ہوا) انہوں نے حکم الہٰی سے اپنے دشمنوں کو ہزیمت دی اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو پادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا اور حکمرانی و دانشوری کی باتوں سے جو کچھ سکھلانا چاہا سکھلا دیا (اور اسی طرح ایک گروہ قلیل کے صبر و ثبات اور خدا پرستی نے بنی اسرائیل کو ان کی گرتی ہوئی حالت سے نکال کر عظمت و اقبال کے عروج پر پہنچا دیا، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ ایک گروہ کے ذریعہ سے دوسرے گروہ کو راہ سے ہٹاتا رہتا اور قوموں اور جماعتوں میں باہمدگر مزاحمت جاری رہتی، تو دنیا خراب ہو جاتی (اور امن و عدالت کا نام نشان تک باقی نہ رہتا) لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔ (اور یہ اس کا فضل ہے کہ کوئی ایک گروہ سدا ایک ہی حالت پر نہیں چھوڑ دیا جاتا، بلکہ ہمیشہ باہمی منازعت و مدافعت جاری رہتی ہے۔)

جبر سے مسلمان نہیں بناتا

ان تصریحات سے اندازہ لگائیے کہ کیا اسلام مذہب کو بزور شمشیر پھیلاتا ہے؟ یا اپنی شمشیر سے دوسروں کے مذاہب کی حفاظت کرتا ہے؟ دوسروں کے ہاں جاکر زبردستی تبدیلیٔ مذہب تو ایک طرف وہ تو یہاں تک رواداری کا حکم دیتا ہے کہ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ (۹/۶)

اور اے پیغمبر! اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں تک کہ وہ اچھی طرح اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے (اس کے امن کی جگہ) اس کے ٹھکانے پہنچا دو۔ یہ بات اس لئے ضروری ہے کہ یہ لوگ (دعوت حق کی حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔

اب اس سے آگے بڑھئے! دین کے اس اصل الاصول کو جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بجبر نہیں منوایا جاسکتا۔ لیکن جو لوگ برضا و رغبت اس اصول کو قبول کر لیں۔ اور اس طرح مسلمان ہو جائیں۔ تو ہما نظام مملکت (دین) کا قیام ان کا مذہب (عقیدہ) ہے اس لئے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہئے کہ وہ

انہیں اس نظام کے قیام سے روکے یا اس میں مداخلت کرے یہ ہے وہ آزادی جسے مسلمان ہر قیمت

تلوار کب اٹھے گی

پر برقرار رکھے گا۔ باقی اہل مذاہب کے نزدیک مذہبی آزادی سے مقصود پوجا پاٹ کے آئین و دستور اور رسوم و مناسک کے انداز و اطوار کی آزادی ہے اور بس مسلمان یہ آزادی ہر ایک کو دیں گے۔ لیکن ان کے نزدیک "مذہبی آزادی" یہیں تک محدود نہیں یہ تو ان کے "مذہب" کا ایک گوشہ ہے۔ ان کے مذہب کا دائرہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے اس لئے ان کے ایمان کے مطابق مذہبی آزادی سے مفہوم نظام مملکت کی آزادی ہے۔ یہی ان کا دین ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس نظام مملکت کے قیام میں مانع آئیں گے یا اس کی تخریب کے ارادے کریں گے مسلمان انکی ان کوششوں کو روکیگا اور کبھی بروئے کار نہیں آنے دیگا۔ وہ انتہائی کوشش کرے گا تاکہ باہمی افہام و تفہیم اور صلح صفائی سے معاملہ صاف ہو جائے اور مستبد و سرکش قوتیں اپنی حیلہ کاریوں اور متمردانہ دراز دستیوں سے باز آجائیں۔ لیکن اگر وہ اپنی قوت کے نشہ میں حدود فراموش اور شیوہ ناآشنا ہو جائیں اور انسانیت کا کوئی جذبہ ان میں باقی نہ رہے تو پھر مسلمان جاں بکف میدان میں آجائے گا۔ اور یا اپنی دینی آزادی کو حاصل کرلے گا یا اپنے خون کا آخری قطرہ تک دیدیگا کہ اس کے نزدیک حق و صداقت کی مدافعت میں جان دیدینا غیر اللہ کے نظام میں زندگی بسر کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

مرد مومن انسانی غلامی (طاغوتی نظام) کی ناسازگار فضا میں سانس نہیں لے سکتا، خواہ اس میں دنیاوی معیار و میزان کی رو سے کتنا ہی امن کیوں نہ ہو۔ اس کے نزدیک امن و فساد کی تعریف ہی اور ہے۔ اگر کوئی حکومت، اپنی قوت کے زور پر قزاقی اور رہزنی، لوٹ اور غارتگری کو دبا دیتی ہے اور لوگ حفاظت سے اپنے اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں اور بے خوف و خطر ادھر ادھر سفر کر سکتے ہیں تو اسے پر امن حکومت کہا جائیگا جس کے عہد زریں میں کہیں فتنہ و فساد دکھائی نہیں دے گا۔ قرآن بیشک اس قسم کی بدامنی کا استیصال چاہتا ہے لیکن اس کے نزدیک بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے آگے بھی جاتی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی امن و سلامتی یہ ہے کہ دنیا میں محکومیت صرف خدا کے لئے ہے جس میں انسانوں کو اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی دونوں میں فلاح و سعادت اور شگفتگی و بشاشت نصیب ہو۔ اس کے نزدیک یہی نظام مملکت حق ہے۔ اس کے سوا تمام نظامات باطل (طاغوتی) ہیں۔ اور جب حق باطل کے تابع ہو جائے (یعنی نظام مملکت غیر اللہ کا ہو) تو اس کا نام فساد ہے خواہ اس میں بظاہر کیسا ہی امن کیوں

نہو؟ اسی لئے وہ برملا کہتا ہے

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ؕ (۲۳/۷۱)

اور اگر ایسا ہوتا کہ سچائی ان کی خواہشوں کی پیروی کرتی تو یقیناً آسمان و زمین اور مافیہا سب میں فساد برپا ہو جاتا۔ ہم نے ان کے لئے ان کی نصیحت کی بات مہیا کردی تو یہ اپنی نصیحت کی بات سے گردن پھیرے ہوئے ہیں۔

اسی لئے وہ دنیا میں غیر اللہ کے نظام مملکت کو فساد قرار دیتا ہے۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ؕ (۴۷/۲۲)

اگر تم (راہ حق سے) پلٹ گئے تو کیا اس نوبت تک پہنچ گئے ہو کہ تم زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے لگو اور باہمی رشتہ داریوں کے تعلقات کو منقطع کرنے لگ جاؤ؟

اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ؕ (۴/۷۶)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں تو ان کا لڑنا اللہ کے لئے ہوتا ہے (کیونکہ وہ حکومت خداوندی کے قیام کی خاطر لڑتے ہیں) اور جن نوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (یعنی غیر خدائی نظام کے قیام کی خاطر) سو اگر تم ایمان رکھتے ہو تو چاہیئے کہ شیطان کے حمایتیوں سے لڑو (اور ان کی طاقت و کثرت کی پرواہ نہ کرو)! شیطانی مکر دیکھنے میں کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو لیکن حق کے مقابلہ میں، کبھی جمنے والا نہیں

یہاں مومن اور کافر کی تمیز غور طلب ہے۔ سبیل اللہ (حق کی راہ) یعنی حکومت الٰہیہ کے قیام (دین) کی خاطر لڑنے والے مومن اور اس نظام کے خلاوہ کوئی نظام ہو اسے قائم کرنے والے

اذنِ قتال

کافر۔ لہذا وہ لوگ جو دین کے قیام میں مانع آئیں اور اس کی تخریب و استیصال کے ارادے کریں اور ان کے ان ارادوں کی روک تھام کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے تو اس مقام پر جماعت مومنین کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ یہی وہ حالات تھے جن کے ماتحت مسلمانوں کو پہلے پہل شمشیر بے نیام کرنے کی اجازت ملی تھی۔ ایک مرتبہ اس اذن، اجازت کی آیت پر پھر غور کر لیجیئے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ اَلَّذِيْنَ

أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ (پ ۲۲ — ۳۹-۴۰)

جن مومنوں کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انہیں بھی (اس کے جواب میں) جنگ کی رخصت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں۔ ان کا کوئی جرم نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور دیکھو! اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا۔ (اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدد کرنے کے لئے بے روک چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہیں زمین پر محفوظ نہ رہتیں۔ خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں، جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ (یاد رکھو!) جو کوئی اللہ (کی سچائی) کی حمایت کرے گا ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں وہ یقیناً قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے۔

اس کی تفصیل و وضاحت دیگر مقامات پر پھیلی ہوئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ○ (پ ۲ — ۱۹۰)

اور دیکھو! جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں چاہیئے کہ اللہ کی راہ میں تم بھی ان سے لڑو! (پیچھے نہ ہٹو) البتہ کسی طرح کی زیادتی نہ کرنا چاہیئے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو زیادتی کرنے والے ہیں۔

اس سے آگے ہے۔

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ○ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (پ ۲ — ۱۹۱-۱۹۲)

(اہل مکہ نے تمہارے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے تو تمہاری طرف سے بھی اب اعلان جنگ ہے) جہاں پاؤ انہیں قتل کرو، اور جس جگہ سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے تم بھی انہیں لڑ کر نکال دو! (اس طرح تمہیں قتل و خونریزی کا جواب قتل و خونریزی سے دینا ہوگا اور قتل و خونریزی بجائے خود ایک

برائی ہے نہ لیکن، فتنہ کا قائم رہنا قتل و خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور (باقی رہا حدود حرم کا معاملہ کہ اس کے اندر لڑائی کی جائے یا نہ کی جائے، تو اس بارے میں حکم یہ ہے کہ جب تک وہ خود مسجد حرام کی حدود میں تم سے جنگ نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے جنگ نہ کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ انہوں نے وہاں جنگ کی تو تمہارے لیے بھی یہی ہوگا کہ جنگ کرو! لیکن اگر ایسا ہو کہ وہ جنگ سے باز آگئے (تو پھر اللہ کا دروازۂ رحمت و بخشش بھی بند نہیں) بلاشبہ وہ رحمت سے بخشش دینے والا ہے۔

جور و تعدی کی روک تھام کرو اس حد سے آگے بڑھو گے تو یہ پھر جور و تعدی ہو جائے گا اور اس صورت میں تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ خدا کے نزدیک دونوں ظالمین کے زمرہ میں شمار ہو جاؤ گے۔

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

(باقی رہا ان مہینوں کا معاملہ جن کا عرب میں احترام کیا جاتا ہے اور ان میں لڑائی بند کر دی جاتی ہے تو اس بارے میں تمہارا طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ) اگر حرمت کے مہینوں کی رعایت کی جائے تو تمہاری طرف سے بھی رعایت ہونی چاہیئے اگر نہ کی جائے تو تمہاری طرف سے بھی نہیں (مہینوں کی) حرمت کے معاملہ میں (جبکہ جنگ ہو) اس کا بدلہ ہے یعنی جیسی روش ایک فریق جنگ کی ہوگی، ویسی ہی دوسرے فریق جنگ کو بھی اختیار کرنی پڑے گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایک فریق تو مہینوں کی حرمت سے بے پروا ہو کر حملہ کر دے اور دوسرا فریق حرمت کے خیال سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے) پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو چاہیئے کہ جس طرح کا معاملہ اس نے تمہارے ساتھ کیا۔ ویسا ہی معاملہ تم بھی اس کے ساتھ کرو (لڑتا ہے تو تم بھی لڑو نہیں لڑتا ہے تو تمہاری طرف سے بھی لڑائی نہیں ہونی چاہیئے) البتہ (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو! اور یہ بات نہ بھولو! کہ اللہ انہی کا ساتھی ہے۔ جو اپنے کاموں میں پرہیزگار ہیں۔

اللہ کی نصرت تو مظلوم کے ساتھ ہوگی کہ یہی تقاضائے عدل و انصاف ہے۔

ذٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ (۲۲/۶)

بہرحال حقیقت حال یہ ہے کہ جس کسی نے خود زیادتی نہیں کی بلکہ جتنی سختی اس کے ساتھ کی گئی تھی ٹھیک اتنی ہی بدلہ میں کرنی چاہیئے؟ اور پھر دشمن مزید زیادتی پر اتر آیا تو ضروری ہے کہ اللہ مظلوم کی مدد کرے۔ اللہ یقیناً معاف

کر دینے والا بخشش دینے والا ہے۔

پہلی اور آخری اجازت

یہ پہلی اجازت کے موقع کی پابندیاں ہیں اور یہی حدود و قیود آخری میدان حرب و پیکار (فتح مکہ) کے ضمن میں بھی تھیں۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (۹: ۳۶)

اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ مہینوں کی ہے۔ اللہ کی کتاب میں ایسا ہی لکھا گیا۔ جس دن آسمانوں کو اور زمین کو اس نے پیدا کیا (یعنی جب سے اجرام سماویہ بنے ہیں خدا کا ٹھہرایا ہوا حساب یہی ہے) ان بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت کے مہینے ہوئے۔ (یعنی رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم۔ کہ امن کے مہینے سمجھے جاتے تھے اور لڑائی ممنوع تھی) دین کی سیدھی راہ یہی ہے پس ان حرمت کے مہینوں میں (جنگ و خونریزی کر کے) اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ اور چاہیئے کہ تمام مشرکوں سے بلا استثناء جنگ کرو جس طرح وہ تم سب سے بلا استثناء جنگ کرتے ہیں۔ اور (ساتھ ہی یہ بھی) کہ اللہ انہیں کا ساتھی ہے جو (ہر حال میں) تقویٰ والے ہیں۔

مقامات مندرجہ صدر میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ان دشمنان حق و صداقت کے خلاف صرف اسوقت تک جنگ جاری رکھو! جب تک یہ جنگ جاری رکھیں۔ اگر یہ ظلم و تعدی سے باز آجائیں تو تم بھی مخالفت کا ہاتھ روک لو! ان کے متعلق یہ بھی بتا دیا گیا کہ کبتک جنگ جاری رکھیں گے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۲: ۲۱۷)

اے پیغمبر! لوگ تم سے پوچھتے ہیں جو مہینہ حرمت کا مہینہ سمجھا جاتا ہے اس میں لڑائی لڑنا کیسا ہے؟ ان سے کہدو اس میں جنگ کرنا بڑی برائی کی بات ہے۔ مگر (ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ) انسان کو اللہ کی راہ (یعنی قیام نظام خداوندی سے) روکنا اور (اس طرح حق سے) انکار کرنا۔ اور مسجد حرام میں نہ جانے دینا

اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برائی ہے اور فتنہ (یعنی ظلم و فساد) قتل سے بھی بڑھ کر ہے، پھر بتلاؤ ان برائیوں کا انسداد ضروری ہے یا ایک مہینہ کی حرمت کے پیچھے پڑے رہنا جس کی حرمت کا خود دشمنوں نے بھی لحاظ نہیں رکھا، اور (یاد رکھو!) یہ لوگ تم سے برابر لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر بن پڑے تو تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کردیں۔ (کیونکہ تم میں اور ان میں کوئی اور وجہ مخاصمت تو ہے نہیں۔ سارا جھگڑا اس بات کا ہے کہ کیوں تم نے دین حق قبول کرلیا۔ پھر کیا تم تیار ہو کہ جس بات کو حق سمجھتے ہو محض لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اسے چھوڑ دو! اگر تیار نہیں ہو تو ظاہر ہے کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں، اور دیکھو تم میں سے جو شخص اپنے دین سے برگشتہ ہوجائیگا اور اسی حالت برگشتگی میں دنیا سے جائے گا تو یاد رکھو اس کا شمار ان لوگوں میں سے ہوگا جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے۔ اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے والا!
یعنی یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے نظام سے پھر جاؤ اور جب تک تم ایسا نہ کروگے یہ تمہارے خلاف لڑتے رہیں گے۔ لہٰذا تم بھی اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ نظام مملکت خالصتہً اللہ کے لئے ہوگیا ہے اور اس میں کسی انسان کی دست درازی اور مداخلت کا امکان واحتمال نہیں رہا۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۱۹۳)

اور دیکھو ان لوگوں سے جنگ جاری رکھو! یہاں تک کہ فتنہ (یعنی ظلم و فساد) باقی نہ رہے۔ اور دین صرف اللہ کے لئے ہوجائے (انسانی ظلم و استبداد کی مداخلت اس میں باقی نہ رہے) پھر اگر ایسا ہو کہ یہ لوگ جنگ سے باز آجائیں تو تمہیں بھی ہاتھ روک لینا چاہیئے کیونکہ) جنگ میں تشدد نہیں کرنا ہے، مگر صرف ان ہی لوگوں کے مقابلہ میں جو ظلم کرنے والے ہیں۔

اسی کو دوسری جگہ یوں دہرایا گیا ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۸/۳۹)

اور دیکھو ان لوگوں سے جنگ جاری رکھو، یہاں تک کہ فتنہ (یعنی ظلم و فساد) باقی نہ رہے۔ اور دین صرف اللہ کے لئے ہوجائے۔ پھر اگر ایسا ہو کہ وہ (جنگ سے) باز آجائیں تو جو کچھ وہ کرتے ہیں خدا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں

یہ جنگ کی دوسری صورت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ یکسر مدافعانہ ہے۔ محاربانہ نہیں۔ یہ یاد رہے کہ مدافعانہ سے یہ مفہوم نہیں کہ غنیم تمہارے ملک پر چڑھائی کر دے اور تم گھروں میں محصور ہو کر لڑائی کرو تو یہ مدافعانہ جنگ ہو گی۔ اور اگر تم باہر نکل کر دشمن کے علاقہ کی طرف چلے گئے تو یہ جنگ محاربانہ ہو گی۔ مدافعت و محاربت کا معیار مقام جنگ نہیں۔ بلکہ علت جنگ ہے۔ مدافعانہ کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کسی پر جور و تعدی اور ظلم و استبداد نہیں کریں گے۔ لیکن جب یہ اپنے نظام کو مخالفین کے ہاتھوں محفوظ نہیں پائیں گے تو اپنے دین (نظام) کے تحفظ کے لئے مخالفین کی قوت شکنی کا سامان کریں گے خواہ اس کے لئے فن حرب و ضرب (strategy of war) کے تقاضے کے مطابق دشمن کے ملک پر چڑھائی ہی کیوں نہ کرنی پڑے؟ جب اس سرکش قوم کی قوت ٹوٹ جائے گی تو اس سے معاہدہ کیا جائے گا؟ (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)۔

مدافعانہ جنگ

اب آگے بڑھیئے! جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ نظام مملکت (دین) کسی قوم کی حکومت نہیں جس کا دائرہ کسی خاص خطۂ ارض تک محدود ہو اور اس سے آگے تجاوز، تغلب اور استیلاء سمجھا جائے۔ یہ نظام دنیا میں وجہ قیام امن و سلامتی اور باعث تکمیل شرف و مزیت انسانیت ہے اس لئے اس کا دائرہ اثر و نفوذ تمام روئے زمین کو محیط ہے۔ اس منتہی کے حصول کے لئے اس خطۂ ارض سے جو اس کی اولین تربیت گاہ اور مرکز استخلاف ہو گا، سلسلہ دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت شروع کیا جائیگا؛ چونکہ قرآن آزادی فکر و آراء کا علمبردار ہے اس لئے وہ اس سلسلہ دعوت و تبلیغ میں بھی کسی رکاوٹ اور مزاحمت کو برسر حق تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نقباء اور دعاۃ مذہبی مبلغین کی انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ اس نظام مملکت کے نمایندوں کی حیثیت سے دنیا کے ہر کونے میں جائیں گے اور لوگوں تک یہ پیغام حق و صداقت پہنچائیں گے؛ اور اس طرح انہیں بتلائیں گے کہ وہ انسانی غلامی کے ان نظامات باطل سے آزادی حاصل کر کے کس طرح وہ نظام قائم کر سکتے ہیں جو سرتاپا حق پر مبنی ہے اور انسانی فلاح و ارتقاء اور سعادت و شرافت کا متکفل۔ ان نمایندگان نظام مملکت خداوندی کی حفاظت و صیانت کے لئے دیگر اقوام و ملل سے معاہدات کئے جائیں گے۔ جو قوم ایسے مبنی بر عدل و انصاف (یعنی باہمی صلح و آشتی کے معاہدہ) سے انکار کرے گی یا معاہدہ شکنی کرے گی اس سے تصادم لازمی ہو گا۔ یہ جنگ کی تیسری شکل ہے جو عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف ہو گی۔ معاہدات کا احترام قرآن کی اساسی تعلیم میں سے ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی

تبلیغ دین

معاہدات کا احترام

کرنے والوں کو فاسق قرار دیتا ہے۔

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۲۷)

(فاسق کون ہیں؟ فاسق وہ ہیں جو احکام الٰہی کی اطاعت کا عہد و میثاق کرکے پھر اسے توڑ دیتے ہیں اور جن عناصر کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے ان کے قطع کرنے میں بے باک ہیں۔ اور وہ (اپنی بدعملیوں اور سرکشیوں سے) ملک میں فساد پھیلاتے ہیں۔ سو (جن لوگوں کی شقاوتوں کا یہ حال ہے۔ وہ ہمیشہ گمراہی کی چال ہی چلیں گے اور فی الحقیقت) یہی لوگ ہیں جن کے لئے سرتاسر نامرادی اور نقصان ہے۔

وہ یہود کے خلاف یہ سنگین الزام عائد کرتا ہے (اور تاریخ اس پر شاہد ہے) کہ وہ ہمیشہ عہد شکنی کرتے رہتے۔

أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۰۰)

(اور یہ لوگ جو آج دعوت حق کی مخالفت کر رہے ہیں تو غور کرو! اس سے پہلے ان لوگوں کی روش کیسی رہ چکی ہے) جب کبھی ان لوگوں نے اتباع حق کا کوئی عہد کیا تو کسی نہ کسی گروہ نے ضرور ہی اسے پس پشت ڈال دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے دل خداپرستی کے سچے ایمان سے خالی ہیں

اسی طرح وہ کفار کی عہد شکنی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ (۱۰)

کیا ہی برا ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں کسی مومن کے لئے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں، نہ عہد و اقرار کا یہی لوگ ہیں کہ ظلم میں حد سے گذر گئے ہیں۔

ان سلبی اشارات کے بعد وہ جماعت مومنین کو تاکید کرتا ہے کہ وہ عہد کی پابندی کریں کہ اس کا التزام اصل نیکی اور اساس عدل و شرافت ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (۱۷۷)

نیکی اور بھلائی کی راہ یہ نہیں ہے۔ کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لیا۔ یا پچھم

کی طرف کر لیا (یا اسی طرح کوئی بات ظواہر و رسوم کی کرلی) نیکی کی راہ تو ان لوگوں کی راہ ہے جو اللہ پر آخرت کے دن پر، ملائکہ پر، آسمانی کتابوں پر، اور خدا کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتے ہیں۔ اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں، جب قول و قرار کرتے ہیں تو اسے پورا کر کے رہتے ہیں۔ تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت لیکن ہر حال میں صبر کرنے والے (اپنی راہ میں ثابت قدم) ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو نیکی کی راہ میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو متقی انسان ہیں۔"

اور یہی لوگ تقویٰ شعار ہیں

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۳/۹)

ہاں خدا کا یہی قانون ہے کہ جو کوئی اپنا قول و قرار سچائی کے ساتھ پورا کرتا ہے اور لین دین میں متقی ہوتا ہے تو خدا کی پسندیدگی انہی لوگوں کیلئے ہے جو متقی ہوتے ہیں۔

اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵) (اپنے عہود و عقود کی پابندی کرو) اس نظام کا گویا آئین اساسی ہے اور اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے کہ

اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (۱۷/۳۴)

عہد پورا کرو، اس لئے کہ یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہونے والا۔ اس کے متعلق تم اپنے خدا کے ہاں جواب دہ ہوگے کیونکہ جب تم کسی سے معاہدہ کرتے ہو تو یوں سمجھو کہ اس میں اللہ کو ضامن قرار دیتے ہو۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۶/۹۱)

اور جب تم آپس میں قول و قرار کرو (تو سمجھ لو کہ یہ اللہ کے نزدیک عہد ہو گیا تو) چاہیئے کہ اللہ کا عہد پورا کرو! اور ایسا نہ کرو کہ قسمیں پکی کر کے انہیں توڑ دو۔ حالانکہ تم اللہ کو اپنے اوپر نگہبان ٹھہرا چکے ہو۔ (یعنی اس کے نام کی قسم کھا کر اسے شاہد قرار دے چکے ہو) یقین کرو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا علم ہر بات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اسی لئے فلاح و سعادت کے چشمے اور کامیابی اور کامرانی کی راہیں انہی کیلئے کھلی ہیں جو اپنے عہود کی پابندی کرتے ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ

عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ (۲۳/۱-۸ نیز ۷۰/۳۲)

بلاشبہ ایمان لانے والے کامیاب ہوئے (کون ایمان لانے والے) جو اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع رکھتے ہیں۔ جو نکمّی باتوں سے رُخ پھیرے ہوئے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں۔ جو اپنے ستر کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ ہاں اپنی بیبیوں سے زناشوئی کا علاقہ رکھتے ہیں یا ان سے جو ان کی ملکیت میں آگئیں۔ (یعنی انسداد غلامی کے احکام سے پہلے جو عورتیں ان کے قبضہ میں آگئیں) تو ان سے علاقہ رکھنے کی وجہ سے ان پر کوئی ملامت نہیں۔ اور جو کوئی (اس معاملہ میں) اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نکالے تو ایسی صورتیں نکالنے والے ہی ہیں جو حد سے باہر ہیں اور (وہی مومن کامیاب ہوئے) جن کا یہ حال ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔

اس باب میں قرآن انسان کو ایسے بلند مقام پر لیجاتا ہے کہ نگہ بصیرت محو حیرت رہجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے

احترام عہد کی بلندیاں

کہ اگر کسی قوم سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اور کسی معاملہ میں وہاں کے مسلمان تمہیں مدد کے لئے پکارتے ہیں تو تم اپنے معاہدہ کے خلاف ان مسلمانوں کی مدد بھی نہیں کر سکتے کہ یہ بھی عہد شکنی میں داخل ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (۸/۷۲)

اور جن لوگوں کا حال ایسا ہو کہ ایمان تو لائے مگر ہجرت نہیں کی تو تمہارے لئے ان کی امداد و رفاقت میں سے کچھ نہیں جب تک وہ اپنے وطن سے ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد چاہیں تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے إِلَّا یہ کہ کسی ایسے گروہ کے مقابلہ میں مدد چاہی جائے جس سے تمہارا (صلح و امن کا) عہد و پیمان ہے (کہ اس صورت میں تم عہد و پیمان کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتے) اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔

جب تک فریق مخالف عہد نباہتا جائے مسلمانوں کے لئے عہد و معاہدہ کی پابندی ضروری ہے، خواہ کعبہ کے

۱؎ یہ فٹ نوٹ صفحہ ۔۔۔ پر ملاحظہ فرمائیے۔

حالات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ (۹ : ۷)

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکوں کا عہد، اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا) تو (ان کا عہد ضرور عہد ہے اور) وہ جب تک تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہو! اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔

دھوکہ نہیں دیا جا سکتا

البتہ جب ان کی طرف سے نقض عہد کا اندیشہ ہو تو انہیں ان کا عہد واپس دیا جا سکتا ہے، دھوکے سے عہد شکنی نہیں کی جا سکتی۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝ (۸ : ۵۸)

اور اگر ایک گروہ (ابھی میدان جنگ میں مقابلہ پر تو نہیں آیا، لیکن تمہیں اس) سے دغا کا اندیشہ ہے تو چاہیئے ان کا عہد ان ہی پر لوٹا دو! (یعنی عہد فسخ کر دو!) اس طرح کہ دونوں جانب یکساں حالت میں ہو جائیں (یعنی ایسا نہ کیا جائے کہ اچانک شکست عہد کی انہیں خبر دی جائے بلکہ پہلے سے جتا دیا جائے تاکہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر تیاری کی مہلت مل جائے)، یاد رکھو! اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اس تعلیم پر غور فرمائیے اور پھر اس کا مقابلہ کیجئے۔ سیاسی دنیا کے مسالک و مشارب سے بین فرق آپ کے سامنے آجائیگا۔ دنیائے قدیم کے مقنن سولن کے نزدیک "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو اپنے اندر پھانس لیتا ہے۔ اور اپنے سے قوی کے ہاتھوں فوراً ٹوٹ جاتا ہے" دنیائے جدید کی سیاست کا امام اطالوی مدبر میکیاولی (MACHIAVELLI) ہے جس کا ضابطۂ اصول و مبانی بتمام

۱؎ سنن ابن ماجہ کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کی امان دی اور پھر اسے قتل کر ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔

مغربی سیاست کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ سنئے کہ وہ اس باب میں کیا لکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

بادشاہ کے لئے صفت روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل وفریب کے جال بچھا سکے اس کے ساتھ ہی خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن مصالح کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہے تو اس معاہدہ کو بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل پہلے سے تلاش کرے۔

(The Prince; Chap. 18)

میکیاولی[1] کا فلسفہ وہ بنیاد ہے جس پر مغرب کی تمام سیاست وتمدن کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ آپ میکیاولی کے محولہ بالا اقتباس کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ آج دنیا کی اتنی اتنی بڑی قوموں میں جو تمام نوع انسانی کی فلاح وبہبود کی اجارہ داری اور عدل وانصاف کی مصطیری کی مدعی ہیں، معاہدات ومیثاقات کی کس طرح مٹی پلید ہوتی ہے۔ جس دیدہ دلیری سے یہ اکابر ملل واباطل اقوام اپنے وعدوں سے مکر جاتے ہیں اسے دیکھکر شرم کی نگاہیں جھک جاتی ہیں اور حیا کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے لیکن یہ تمدن وتہذیب اور عدل وانصاف کے ستون ہیں کہ صبح کی بات سے شام کو مکر جاتے ہیں اور شام کے عہد سے صبح کو اور اس میں نہ کوئی جھجک محسوس کرتے ہیں نہ تامل اور ویسے کے ویسے معتبر بنے رہتے ہیں اس لئے کہ جھجک وتامل تو اس صورت میں ہو جب ان کے سینے میں جھوٹ اور سچ کی کشمکش کا ہیجان متلاطم ہو، وہ اپنے ضابطۂ سیاست میں اس قسم کی عہد شکنی اور دروغ بافی کو عیب ہی نہیں سمجھتے تو پھر حجاب وتکلف کیسا اور ملامت وسرزنش کس کی؟ میکیاولی سیاست کا اصل الاصول یہ ہے کہ اخلاق ومذہب کو سیاست سے بالکل الگ رکھنا چاہیئے اور سیاست میں صرف اس اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ تمہیں کامیابی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے اور بس!

(Means are justified by the ends achieved)[2]

---

[1] قدیم ہندوستان کی سیاست میں صرف ایک مدبر کا ذکر ملتا ہے جو (Kautilya) کے نام سے پکارا جاتا ہے (Narayan Chandra Bandyopadhaya) نے اس کی کتاب ارتھ شاستر کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے وہ اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ کاٹلیا کے لفظی معنیٰ ہی "فریب کار" کے ہیں، Spalding نے اپنی کتاب (Civilisation in East and West) میں اس کے اصول سیاست کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اور اسے "ہندوستان کا میکیاولی" کہکر پکارا ہے۔ اس کے اصول سیاست بھی بالکل میکیاولی کے سے ہیں اور وہ بھی عہد ومعاہدہ کو وقتی مصالح کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور ان سے بلا توقف پھر جانے کی تلقین کرتا ہے۔ [2] مقصد کی کامیابی کے لئے جائز وناجائز جو ذرائع بھی استعمال کرو سب جائز ہیں۔

اس "پیامبرِ سیاست ابلیسیہ" کا فرمان ہے جس پر اس کی اُمت نہایت شدت سے عمل پیرا ہے اور اس طرح خود بھی تباہی اور ہلاکت کے جہنم میں گرفتار ہے اور باقی دنیا کو بھی اپنے ساتھ اس قعرِ مذلت میں لے ڈوبی ہے۔ جب قرآن کی اس بصیرت افروز اور عدل پرور تعلیم کو عمل میں لایا گیا تو اس وقت معاہدات کی پابندی کس شدت سے ہوتی تھی اس کا ذکر ذرا آگے چل کر ملیگا۔ اس وقت صرف یہ بات بیان ہو رہی تھی کہ اسلامی نظام مملکت غیر اقوام سے معاہدات کریگا اور ان کا احترام ان پر لازم ہوگا۔ لیکن جو قوم عہد شکنی کرے گی اس سے تصادم ضروری ہوگا۔ یہ جنگ کی تیسری شکل ہوگی۔ نبی اکرمؐ نے مخالفین عرب سے معاہدات کئے۔ لیکن انہوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی اور انہیں بار بار توڑا۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُـــــــــــمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ (۸: ۵۵-۵۶)

بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین چارپائے وہ (انسان) ہیں، جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی ایمان لانے والے نہیں۔ اے پیغمبر! جن لوگوں سے تم نے (صلح کا) عہد و پیمان کیا تھا پھر انہوں نے اسے توڑا اور یہ ہوا کہ ہر مرتبہ عہد کر کے توڑتے ہی رہے اور (بدعہدی کے وبال سے) ڈرتے نہیں۔

لہٰذا ان سے جنگ ناگزیر تھی۔ سورۂ توبہ کا پہلا اور دوسرا رکوع دیکھئے۔ ان مخالفین کی عہد شکنی اور معاہدات فراموشی کی تفاصیل آپ کے سامنے آجائیں گی۔ ہنگامی معاہدات تو ایک طرف اسلام دشمنی میں وہ ان عہود دستیوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے جو ان کے ہاں بطور قومی شعار صدیوں سے رسماً (Conventionally) چلے آتے تھے اور جن کی پابندی ان کا ملّی شعار تھا۔ انہوں نے چار مہینے حرمت کے مقرر کر رکھے تھے جن میں جنگ و جدال اور حرب و ضرب کا سلسلہ از خود ملتوی ہو جاتا تھا اور ہر شخص بے خوف و خطر نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ وہ باہمی جنگ و پیکار میں ان مہینوں کی حرمت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ قرآن نے بھی ان مہینوں کی حرمت کو برقرار رکھا۔ اور اس کی پابندی کی تاکید کی۔ لیکن مخالفین کی عہد شکنی کا یہ عالم تھا کہ ان مہینوں میں بھی رد و بدل کر دیتے تھے۔ اور اس طرح فریب دے کر جنگ سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

کفار کی عہد شکنی

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (۹: ۳۷)

نسی (یعنی مہینہ کو اس کی جگہ سے پیچھے ہٹا دینا جیسا کہ جاہلیت میں دستور ہو گیا تھا) اس کے سوا کچھ نہیں ہے

کہ کفر میں کچھ اور بڑھا دینا ہے۔ اس سے کافر گمراہی میں پڑتے ہیں۔ ایک ہی مہینہ کو ایک برس حلال سمجھ لیتے ہیں (یعنی اس میں لڑائی جائز کر دیتے ہیں)، اور پھر اسی کو دوسرے برس حرام کر دیتے ہیں (یعنی اس میں لڑائی کو ناجائز کر دیتے ہیں) تاکہ اللہ نے حرمت کے مہینوں کی جو گنتی رکھی ہے اسے اپنی گنتی سے مطابق کر کے اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کو حلال کر لیں۔ ان کی نگاہوں میں ان کے بُرے کام خوشنما ہو کر دکھائی دیتے ہیں اور (اللہ کا قانون ہے کہ وہ) منکرین حق پر (کامیابی وسعادت) کی راہ نہیں کھولتا یہ معاہدہ شکنی کی بدترین شکل تھی اس لئے قرآن کریم نے اسے "زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ" کہا ہے۔

مظلوم کی مدد کیلئے جنگ

پھر اور آگے بڑھئے! جن غیر مسلم علاقوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہو گی وہاں لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ اور اس نظام کی صداقت پر ایمان لائیں گے۔ اگر ان پر کوئی قوم دست درازی کرے گی تو مرکز ملت پر ان کی امداد بھی فرض ہو گی۔ ایسے موقع پر اگر صلح و آشتی اور عہد و معاہدہ سے بات نہیں سلجھے گی تو ان مظلومین کی حفاظت اور ان پر ظلم و تشدد کی مدافعت میں جنگ لازم آئے گی۔ سورہ نساء میں ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ۝ (۴:۷۵)

اور مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے، حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو ظالموں کے ظلم و تشدد سے عاجز آ کر فریاد کر رہے ہیں۔ خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم و تشدد پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا (یعنی اہل مکہ سے نجات دلا)، اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنا دے اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے۔

لیکن اگر اس ستانے والی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو گا تو معاہدہ کی شرائط کے خلاف ان مظلومین کی بھی مدد نہیں کی جائے گی۔ اس لئے کہ معاہدہ کا احترام مقدم ہے۔ ایسی صورت میں معاہدہ کی شرائط کے مطابق پہلے معاہدہ فسخ کیا جائے گا اور پھر ان لوگوں کے خلاف قدم اٹھایا جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ

فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۷۲)

جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اور جن لوگوں نے (مکہ کے مہاجروں کو مدینہ میں) جگہ دی اور ان کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا کارساز و رفیق ہے۔ اور جن لوگوں کا حال ایسا ہو کہ ایمان تو لے آئے مگر ہجرت نہیں کی تو تمہارے لئے ان کی اعانت رفاقت میں سے کچھ نہیں ہے جب تک وہ اپنے وطن سے ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد چاہیں تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے۔ الا یہ کہ کسی ایسے گروہ کے مقابلہ میں مدد چاہی جائے جس سے تمہارا (صلح و امن) کا معاہدہ اور پیمان ہے (کہ اس صورت میں تم عہد و پیمان کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتے)، اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔

مظلومین کی یہ امداد اس لئے ہے کہ اگر مفسدین کو ان کے ظلم و استبداد سے نہ روکا جائے تو کسی کمزور کو جینے کا حق ہی نہ رہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝ (۷۳)

اور دیکھو! جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ بھی (راہ کفر میں) ایک دوسرے کے کارساز و رفیق ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے (یعنی باہمی ولایت اور بھائی چارگی کا جو حکم دیا گیا ہے اور وفاء عہد و اعانت مسلمین کی جو تلقین کی گئی ہے اس پر کاربند نہیں رہو گے) تو ملک میں فتنہ پیدا ہو جائے گا۔ اور بڑی ہی خرابی پھیلے گی!

واضح رہے کہ اگرچہ یہ آیات مکہ کے مظلومین کے ضمن میں آئی ہیں۔ لیکن ان کا حکم عام ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ مظلوم کی آواز کہیں سے اٹھے خدا کے یہ سپاہی بلا تمیز مذہب و ملت اور بلا لحاظ رنگ و وطن، محض حق کی امداد کی خاطر، ان مظلومین کی آواز پر لبیک کہیں گے اور ان کی حفاظت میں اپنی جان تک دیدیں گے۔ اس لئے کہ ان کا فریضہ حیات احترام انسانیت ہے۔ اگر کمزور کی امداد کے لئے کوئی بھی نہ اٹھے تو دنیا اس طرح درندوں کا بھٹ بن جائے جس طرح آج اقوام مغرب کی چیرہ دستیوں سے بن رہی ہے کہ زبردست کے لئے خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر اس کا کوئی گوشہ اور عافیت کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہی وہ کمزور کی مدافعت ہے جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی اس آیت مقدسہ کے اجمال میں پوشیدہ ہے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ڨ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ

وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

چنانچہ (ایسا ہی ہوا، انہوں نے حکم الٰہی سے اپنے دشمنوں کو ہزیمت دی اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو پادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا۔ اور حکمرانی و دانشوری کی باتوں سے، جو کچھ سکھلانا تھا سکھلا دیا۔ اور اس طرح ایک گروہ قلیل کے صبر و ثبات اور خدا کی اطاعت نے بنی اسرائیل کو ان کی گرتی ہوئی حالت سے نکال کر عظمت و اقبال کے عروج پر پہنچا دیا) اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ سے دوسرے گروہ کو راہ سے ہٹاتا رہتا اور قوموں اور جماعتوں میں باہمدگر مزاحمت جاری رہتی، تو دنیا خراب ہو جاتی (اور امن و عدالت کا نام و نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ دنیا کے لئے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔ (اور یہ اس کا فضل ہے کہ ایک گروہ کو سدا ایک ہی حالت پر نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ مستبدین کی سرکوبی کے لئے دوسرا گروہ بھی تیار ہو جاتا ہے۔)

حکم بننے والی جماعت

اس سلسلہ کی ایک اور کڑی بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگر سڑک پر دو آدمی آپس میں لڑ پڑیں تو پولیس کا سپاہی انہیں گرفتار کر کے عدالت میں لیجائے گا اور وہاں جو بھی ظالم قرار پائے گا سزا بھگتے گا۔ یہ دو افراد کا معاملہ تھا۔ لیکن اسی طرح اگر دو اقوام ایک دوسرے سے الجھ جائیں تو کہئے کہ وہ کونسی پولیس ہے جو انہیں ماخوذ کریگی۔ اور وہ کونسی عدالت ہے کہ جہاں ان پر مقدمہ چلے گا اور زیادتی کرنے والی قوم اپنے جرم کی سزا پائے گی۔ دنیا میں آج جس قدر فساد نظر آرہا ہے اس قسم کی محتسب پولیس اور عدالت کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ پہلی جنگ کی تھکی ہوئی قوموں نے "لیگ آف نیشنز" کے نام سے اسی قسم کے احتساب اور عدل کا محکمہ قائم کیا تھا۔ چونکہ نیتیں سب کی خراب تھیں اس لئے نتیجہ ظاہر تھا۔ چنانچہ اس "جمعیت اقوام" کا وہی حشر ہوا جو (بقول علامہ اقبالؒ) "کفن دزدوں" کی جماعت کا ہوا کرتا ہے۔ اب دوسری جنگ کے بعد اسی روح کو ایک دوسرا پیکر دیا گیا ہے اور جمعیت اتحاد اقوام ... ... کا وجود عمل میں آیا ہے

چونکہ یہ عمارت بھی ان ہی کج بنیادوں پر رکھی گئی ہے اس لئے اس کے انجام کی پیش گوئی میں بھی کسی علم غیب کی مدد کی ضرورت نہیں۔ صرف قرآنی فراست کی ضرورت ہے۔ دنیا میں اس قسم کی جماعت کے وجود کا نظریہ ... ... قرآن ہی کا عطا فرمودہ ہے۔ اقوام یورپ نے یہ تصور تو وہاں سے لے لیا لیکن وہ اس روح کو کہاں سے لے لیتے جس کے پیکر کا نام ایسی جماعت ہوتی ہے۔ وہ روح صرف اطاعت خداوندی سے پیدا ہو سکتی ہے اور مغرب کی اہرمنی سیاست میں خدا کے نام سے چڑ ہے اس لئے طاغوتی روح کا پیکر

وہ نتائج کس طرح سے پیدا کرے گا؟ قرآن، دنیا میں جماعت مومنین (حزب اللہ) کا یہی فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اقوام عالم کے تنازعات ومناقشات میں حکم بنیں (تمام فیصلے عدل وانصاف سے کریں۔ اور جو اس فیصلہ سے سرتابی کرے اور دنیا میں فساد برپا کرنا چاہے اس کا سر کچل کر رکھدیں! کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْل

سورۂ حجرات کی آیت شریفہ پر غور کیجئے یہ فریضہ نکھر کر سامنے آجائیگا!

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (۴۹/۹)،

اور دیکھو اگر مومنوں میں سے دو گروہ (آپس میں) جھگڑ بیٹھیں تو (اے جماعت مومنین! اور اے حزب اللہ تمہارا فریضہ ہے، کہ ان کے درمیان صلح وصفائی کرادو! پس اگر ان میں سے ایک گروہ (تمہارے فیصلہ سے) سرتابی کرے تو تم بھی (دوسرے گروہ کے ساتھ مل کر) باغی جماعت سے قتال کرو! تا آنکہ (باغی جماعت) خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے (یعنی مرکز ملت کے فیصلہ کے آگے گردن جھکائے) پس اگر وہ (جماعت) لوٹ آئی تو تم ان میں عدل وانصاف کے ساتھ باہمی صلح وصفائی کرادو! اور (یاد رکھو اس باہمی مصالحت کرانے میں) پورا پورا انصاف کرو۔ یہ واقعہ ہے کہ اللہ انصاف کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

اسی کے ساتھ سورۂ بقرہ کی وہ آیت ملا کر دیکھئے! جو اوپر لکھی جاچکی ہے۔ مقید حکم مطلق سے بدلجائیگا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۲۵)

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو راہ سے ہٹاتا رہتا (اور قوموں اور جماعتوں میں باہمی منازعت ومدافعت جاری رہتی) تو دنیا خراب ہوجاتی (اور امن وعدالت کا نام ونشان باقی نہ رہتا۔ لیکن اللہ دنیا کیلئے فضل ورحمت رکھنے والا ہے۔
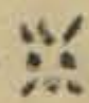
قرآن کریم میں دوسروں سے جنگ کی یہی شکلیں ہیں۔ ان کے علاوہ دو ایک صورتیں اور بھی ہیں لیکن وہ اس نظام مملکت (دین) کے داخلی انتظامات سے متعلق ہیں۔ قرآن اس کی تو اجازت دیتا ہے کہ اگر کسی شخص کا دل اس نظام کی صداقت (ایمان) سے منحرف ہوگیا ہے تو وہ اسلام کو ترک کرکے دوسرا مذہب اختیار کرے (تفصیل اس کی پہلے گذر چکی ہے) لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ جماعت کے اندر رہتے ہوئے اس کے فیصلوں سے سرکشی اختیار کی جائے۔ نظام مملکت کے فیصلوں کی حیثیت قانون کی ہوتی ہے۔ اور

باغیوں کی سزا

قانون کی اطاعت لازمی اگر قانون کا اتباع بھی افراد کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور انہیں کھلی چھٹی ہو کہ جب جی چاہے ان سے انحراف کر لیں تو ایسا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ نظام کے بقا کا راز اس کے قانون کی اطاعت میں ہے۔ نظام کے فیصلوں کی خلاف ورزی کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت اختیار کی جائے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۵/۳۳)

بلاشبہ ان لوگوں کی جو اللہ اور اس کے رسول (یعنی ملت اسلامیہ) سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں .... یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے۔ (یعنی جیسی کچھ سزا ان کے لئے مناسب ہو دی جائے) یہی لوگ ہیں جن کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کیلئے سخت ترین عذاب (جہنم) ہے۔

دوسری شکل جو اس سے کہیں زیادہ سنگین اور نتائج کے اعتبار سے کہیں بڑھ کر تباہ کن ہے یہ ہے کہ بظاہر جماعت کے ساتھ ہوں اس کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کئے نظر آئیں لیکن در پردہ اس کی تخریب اور بربادی کی کوشش کی جائیں اور اس کے لئے غیروں سے ساز باز شروع کر دی جائے

منافقت

اس کا نام منافقت ہے۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی جہاں پر بتلایا جائے گا کہ جماعت میں منافقین کیسے پیدا ہو جاتے ہیں اس مقام پر صرف ان کی محاربانہ کوششوں کے دفعیہ تک اکتفا کیا جائے گا۔ منافقوں کی ان فتنہ پردازیوں کے متعلق سورۂ حشر میں ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۖ وَمَنْ يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ ۝ وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا

نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ لِلْفُقَرَاۗءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ڵ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (۵۹: ۷-۱۱)

(یاد رکھو!) یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ان منافقین نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت اور ان کا مقابلہ کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ) جو اس کا مقابلہ کرے اور اس کے احکام کی مخالفت کرے تو یہ واقعہ ہے کہ خدا اسے سخت ترین عذاب دینے والا ہے۔ جو کھجور کے درخت تم کاٹ ڈالو یا جو درخت تم ان کے تنوں پر چھوڑ دو (تو یہ سب کچھ) اللہ کے حکم سے ہے اور اس لئے ہے کہ خدا نافرمان لوگوں کو رسوا کرنا چاہتا ہے۔ اور جو کچھ خدا اپنے رسول پر بطور فئے کے مرحمت فرمائے جن پر نہ تم نے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ دوڑائے (تو اس میں کچھ تمہارا حق نہیں ہے۔ خدا اپنے رسولوں کو جن لوگوں پر چاہے مسلط کر دے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے (اسی طرح) خدا جو کچھ دیہات کی آبادیوں سے اپنے رسول کے لئے بطور فئے کے بھجوائے تو وہ سب کچھ اللہ، رسول، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ (خدا نے اس فئے کو صرف ان لوگوں کے لئے اس لئے مخصوص کر دیا ہے) تاکہ وہ تمہارے امیر لوگوں کا آپس کا لین دین نہ بن جائے۔ (یاد رکھو) رسول، جو کچھ تمہیں عطا کرتا ہے اسے بلا تکلف لے لو اور جس سے وہ منع کر دیتا ہے اس سے باز آجاؤ! یہ حقیقت ہے کہ خدا بہت سخت عذاب دینے والا ہے۔

یہ ان تنگ دست مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے شہروں اور اپنے مال و منال سے (بے تعلق کر کے) نکال دیئے گئے ہیں۔ وہ اللہ سے اس کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی اور جویا رہتے ہیں اور اللہ اور

اس کے رسول (کے دین) کی (اپنی جانوں سے) امداد کرتے رہتے ہیں۔ واقعۃً یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔ (ایسے ہی) وہ لوگ بھی ہیں جو ان سے پہلے دارالاسلام (مدینہ منورہ) اور ایمان کو اختیار کر چکے ہیں۔ یہ لوگ ان مہاجرین سے بڑی ہی محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کر کے آتے ہیں۔ جو کچھ (خدا کی طرف سے) انہیں دیا جاتا ہے اس کے لئے وہ اپنے سینوں (دلوں) میں کوئی ضرورت (یا تنگی) محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے نفسوں پر انہیں ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود بھی تنگدستی اور غربت کا شکار ہوتے ہیں (یاد رکھو) جو لوگ (خدا کے فضل و کرم سے) نفسانی بخل اور کنجوسی سے بچا دیئے جائیں تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہوتے ہیں!

اسی طرح جو لوگ ان کے بعد آئے ہیں وہ (خدا سے دعائیں کرتے ہوئے) عرض کرتے ہیں اے پروردگار! ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم سے پہلے ایمان کی سعادت سے شرف اندوز ہو چکے ہیں مغفرت فرما دے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لا چکے ہیں کسی قسم کا کھوٹ پیدا نہ کر۔ خدایا! یہ واقعہ ہے کہ تو بڑا ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

اے پیغمبر اسلام! کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو منافقت پھیلاتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ان بھائیوں سے جنہوں نے اہل کتاب میں سے ہونے کے باوجود انکار کی راہ اختیار کی ہے (یعنی یہودی ہیں) کہتے ہیں کہ اگر تم کو (جزیرہ عرب سے) نکال دیا گیا تو یقین جانو ہم بھی (خود بخود) تمہارے ساتھ ہی نکل کھڑے ہوں گے۔ اور تمہارے بارہ میں ہرگز ہرگز ہم کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ اور (تم ہمارے جانے لگے تو بے فکر رہو) ہم ضرور بالضرور تمہاری امداد کریں گے۔ (مگر یاد رکھو، اور تمام باتوں کی طرح ان کے یہ وعدے بھی سرتاسر فریب اور دھوکہ ہیں) اللہ شہادت دیتا ہے کہ درحقیقت وہ (اس میں) جھوٹ بولنے والے ہیں!

ان کے خلاف جنگ کے سلسلہ میں فرمایا۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاۗءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَاۗءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا

قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ

يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ سَتَجِدُوْنَ

اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا

فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝

(۸۸ - ۹۱)

مسلمانو، تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم منافقین کے بارے میں دو فریق بن گئے ہو؟ حالانکہ اللہ نے ان بدعملیوں کی وجہ سے جو انہوں نے کمائی ہیں انہیں الٹا دیا ہے اور وہ صریح راہ حق سے پھر چکے ہیں؛ کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھا دو جن پر خدا نے راہ گم کردی ہے؟ (یعنی جن پر خدا کے قانون سعادت و شقاوت کے بموجب فلاح و سعادت کی راہ بند ہو گئی ہے؛) اور یاد رکھو، جس کسی پر اللہ راہ بند کردے (یعنی جس کسی پر اس کے قانون کا فیصلہ صادر ہو جائے کہ اس کے لئے راہ پانا نہیں)، تو پھر تم اس کے لئے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ ان منافقوں کی دلی تمنا یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے انکار حق کی راہ اختیار کرلی ہے تم بھی کرلو اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔ پس (دیکھو) جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں (اور دشمنوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہارے پاس نہ آجائیں) تمہیں چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ (انہیں بھی ان ہی لوگوں میں سے سمجھو جو تمہارے خلاف جنگ و پیکار میں سرگرم ہیں)۔ پھر اگر یہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں۔ تو (جو کوئی جنگ کی حالت میں دشمنوں کا ساتھ دیتا ہے، یقیناً اس کا شمار بھی دشمنوں ہی میں ہوگا۔ پس) انہیں گرفتار کرو، جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، اور نہ تو کسی کو اپنا دوست بناؤ، نہ کسی کو اپنا مددگار۔

مگر ہاں، جو لوگ (دشمنوں سے الگ ہو کر) کسی ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور اس میں عہد و پیمان ہے، یا ایسے لوگ ہوں کہ لڑائی سے دل برداشتہ ہو کر تمہارے پاس چلے آئیں، نہ تم سے لڑیں، نہ (تمہاری طرف سے) اپنی قوم کے ساتھ لڑیں (تو ایسے لوگ اس حکم میں داخل نہیں۔ ان کے خلاف تمہارا ہاتھ نہ اٹھے۔) اگر خدا چاہتا تو ان لوگوں کو بھی تم پر مسلط کر دیتا کہ تم سے لڑے بغیر نہ رہتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور جنگ نہیں کرتے، نیز صلح کا پیام بھیج رہے ہیں تو خدا نے تمہارے لئے کوئی راہ نہیں رکھی ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرو۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ تمہیں ایسے ملیں گے جو (لڑائی کے خواہشمند نہیں ہیں) تمہاری طرف سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی۔ لیکن جب کبھی فتنہ و فساد کی طرف لوٹا دیئے جائیں۔ تو اوندھے منہ اس میں گر پڑتے ہیں (اور اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتے) تو اگر ایسے لوگ کنارہ کش نہ رہیں اور نہ تو تمہاری طرف پیام صلح بھیجیں نہ لڑائی سے ہاتھ روکیں، تو

انہیں گرفتار کرو، اور جہاں کہیں پاؤ قتل کرو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے برخلاف ہم نے تمہیں کھلی حجت (جنگ) دیدی ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝ مَّلْعُونِينَ ۚ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۝ (۳۳ / ۶۰-۶۱)

اے پیغمبر اسلام (ہوشیار رہو) اگر یہ منافقین اور وہ لوگ جو شہر (مدینہ منورہ) میں فتنہ فساد پھیلاتے رہتے ہیں (اپنی ان کمینہ حرکتوں سے) باز نہ آئے تو ہم تمہیں ان سے جنگ کرنے کا حکم دیدیں گے۔ پھر ان کی جمعیت کو اس قدر پراگندہ کردیں گے، کہ تمہارے قرب وجوار میں ان میں سے بہت تھوڑے سے آدمی ہی باقی رہ جائیں گے (اور باقی لوگوں کو جزیرۂ عرب سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کردیا جائے گا) یہ منافقین ملعون ہیں (جن پر خدا کی طرف سے لعنت بھیجی گئی ہے) جس جگہ بھی پائے جائیں گرفتار کرلیے جائیں اور قتل کردیئے جائیں (یعنی ان کے قتل وقتال میں کسی قسم کی کسر اٹھا رکھی جائے)

یہ لوگ کفار کے ساتھ سازباز کرتے تھے۔ اسی لئے بعض آیات میں کفار و منافقین کا ذکر یکجا آیا ہے۔ مثلاً

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (۹/۷۳ نیز دیکھیے ۶۶/۹)

اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں دونوں سے جہاد کرو! اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ! (کیونکہ کافروں کی عہدشکنیاں اور منافقوں کا غدر و فریب اب آخری درجہ تک پہنچ چکا ہے) بالآخر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے (اور جس کا آخری ٹھکانا دوزخ ہو)، تو کیا ہی بری لوٹنے کی جگہ ہے۔

یہی وہ فریبی کفار ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ ان الفاظ میں آیا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ (۹/۱۲۳)

اے پیروان دعوت اسلامی! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس (پھیلے ہوئے) ہیں اور چاہیئے کہ وہ (جنگ میں) تمہاری سختی کو محسوس کریں۔ (کہ بغیر اس کے جنگ جنگ نہیں) اور یاد رکھو اللہ ان کا ساتھی ہے جو (ہر حال میں) متقی ہوتے ہیں۔

جنگ ختم کرنے کیلئے جنگ

یہ ہیں وہ صورتیں جن میں قرآن نے جنگ کی اجازت دی ہے اور یہ اجازت بھی اس لئے تاکہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ ۖ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ (۴۷)

(اے پیروان دعوت ایمانی!) جب تم ان لوگوں سے ملو جنہوں نے انکار کا رستہ اختیار کیا ہے تو ان کی گردنیں مار دو۔ (انہیں قتل کر ڈالو) حتیٰ کہ جب تم انہیں اچھی طرح قتل کر چکو (اور وہ شکست خوردہ ہو کر بھاگنے لگیں) تو ان کو مضبوطی سے باندھ لو (گرفتار کر لو) پھر اس کے بعد یا انہیں احسان رکھکر چھوڑ دو یا زر فدیہ لیکر آزاد کر دو (یہ دونوں صورتیں جائز ہیں) حتیٰ کہ جنگ اپنے ہتھیاروں کو رکھدے (ختم ہو جائے) اس بات کو (اچھی طرح) یاد رکھو۔ اور اگر خدا چاہتا (کہ بغیر تمہارے واسطہ کے وہ خود ہی کفار کو ان کے کئے کی سزا دیدے) تو وہ یقیناً خود ہی ان سے انتقام لے لیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا، لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگوں کی آزمائش اور ابتلا تم میں سے بعض لوگوں کے ذریعہ سے کرائے۔ اور (یاد رکھو) جو لوگ اللہ کے (دین کے) رستہ میں قتل کر دیئے گئے ہیں خدا ان کے اعمال کو ہرگز بے نتیجہ نہ ہونے دیگا۔!

بابِ سوم

گذشتہ باب میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ وہ کون سے ناگزیر حالات ہیں جن کے ماتحت قرآن کریم طوعاً و کرہاً جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ ان تمہیدی تصریحات کے بعد ہمیں ان غزوات کی طرف آجانا چاہیئے جو نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں پیش آئے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ عنوان تشنۂ تکمیل رہ جائے گا۔ اگر ہم اس موضوع کے ایک اور پہلو سے پردہ اٹھائے بغیر آگے بڑھ گئے۔

جنگ کے خلاف اصولی اعتراضات

کہا یہ جاتا ہے کہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں جنگ بہر حال اور بہر نوع وحشت اور بربریت کا مظہر ہے۔ اور اسے کسی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ "جنگل کا قانون" ہے اور انسان کے اس عہد جہالت و سبعیت کی یادگار ہے جب تنازعات کے فیصلے دلائل و براہین اور دانش و بینش کی بجائے بہیمانہ قوت (Brutal Force) کی رو سے ہوا کرتے تھے اس لئے علم و عقل اور تہذیب و تمدن کے دور میں اسے اضطراراً بھی جائز نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ انسانیت سے گرا ہوا فعل ہے کہ کسی انسان سے کوئی خاص بات قوت اور زور سے منوائی جائے۔ جب انسان کو عقل و تمیز کا شرف عطا ہوا ہے تو اس کے اختلافات و تنازعات افہام و تفہیم سے کیوں نہ طے کر لئے جائیں؟ جنگ و جدل وحشیانہ فعل ہے۔ پیار، محبت، صلح، آشتی، رحمدلی، شانتی: یہ انسانیت کے جوہر ہیں جنہیں آگ اور خون فنا کر دیتی ہے! بظاہر یہ تعلیم بڑی خوش آیند اور نگاہ فریب دکھائی دیتی ہے اور اس کے خلاف لب کشائی کرنیوالے کی شقاوت و قساوت کے متعلق کسی دلیل کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تعلیم محض الفاظ و حروف کی دنیا ہی میں خوش آیند معلوم ہوتی ہے یا عملی دنیا میں بھی کارفرما ہو سکتی ہے؟

تورات میں لڑائی کے کھلے کھلے احکام موجود ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ تورات کا بیشتر حصہ بنی اسرائیل کی لڑائیوں کی داستان پر مشتمل ہے (مثلاً دیکھئے کتاب گنتی باب ۳۱) اس لئے یہود کی طرف سے اس فلسفہ کی تائید نہیں ہو سکتی اس کی سب سے بڑی مؤید عیسائیت ہے کیونکہ انجیل میں "دشمن سے بھی پیار کرو!" "بدی کی مدافعت مت کرو!" "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال آگے کر دو!" کی تعلیم ملتی ہے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے عیسائیت ہی کو لیتے ہیں۔ ہم معارف القرآن جلد سوم (عنوان حضرت عیسیٰؑ) میں تفصیلاً بتا چکے ہیں کہ بزدلی اور دون ہمتی کی محولہ بالا تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم نہ تھی بلکہ اسے سینٹ پال نے اس زمانہ میں وضع کیا جب عیسائی نامساعدت حالات سے چاروں طرف سے

عیسائیت کا نقطۂ نظر

گھرے ہوئے تھے اور انہیں ایک انقلاب آفریں جماعت کے پسماندگان کی حیثیت سے سلطنت کا مجرم قرار دیا جا رہا تھا۔ حکومت کی اس دارو گیر سے بچنے کے لیئے یہ تعلیم وضع کی گئی اور اس طرح ایک ایسا فلسفۂ زندگی جزو مذہب بن گیا جو انسانی حریت و خودداری کے لیئے زہر ہلاہل کا حکم رکھتا تھا۔ اس فلسفہ نے انسانیت کو کس قدر نقصان پہنچایا، اس کی تصریحات خود ان عیسائی مورخوں اور فلاسفروں کے ہاں شرح و بسط سے موجود ہیں جنہوں نے تاریخ کا مطالعہ غیر جانبدارانہ کیا اور فطرت انسانی کو بے نقاب رکھنے کی کوشش کی۔

خود عیسائیوں کا اعتراف

مشہور جرمن فلاسفر نیٹشے لکھتا ہے

> مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ چیزوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس نے طبائع انسانی کی تمام خودارانہ قوتوں کا استیصال اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اس نے بڑے بڑے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر کے رکھدیا ہے۔ (Neitzchi, by M.A. Magay)

لیکی، تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں لکھتا ہے

> لیکن انکساری اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے، اور گو یہ وصف ایک زمانہ تک نہایت موزوں و مناسب رہا۔ تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دیسکا ترقی تمدن کے لیئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔

تہذیب کا مشہور امریکی مؤرخ (Dorsey) اپنی کتاب (Civilisation) میں رقمطراز ہے۔

> آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعتراف شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابل اطمینان نہیں۔ اطمینان کی آرزو باطل اور آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔ یہ انداز نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (صفحہ ۴۴۶)

"دشمن سے بھی پیار کرو!" کا حکم کس قدر فطرت انسانی کے خلاف اور ناممکن العمل ہے اس کے متعلق مشہور عالم "اجتماعیات" (W. A. Brend) اپنی کتاب (Foundations of Human Conflicts) میں لکھتا ہے۔

> انجیل کا یہ حکم کہ دشمن سے بھی محبت کرو، ایک ایسا مطالبہ ہے جو نفسیاتی طور پر ناممکنات سے ہے۔

یہی کچھ (Samuel Lowy) نے اپنی کتاب (Man & Fellowmen) کے صفحہ ۶ پر لکھا ہے۔ اور اس باب میں علم "تجزیۂ نفس" کے امام (Sigmund Frued) کی رائے بھی قابل غور ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

ہمسایہ سے پیار کرنے کا حکم ناممکن العمل ہے محبت کی ایسی وسعتیں صرف اس کی قدر و قیمت کو کم کر سکتی ہیں، برائی کا علاج نہیں کر سکتیں۔ تہذیب اس قسم کے احکام کی کچھ پرواہ نہیں کرتی۔ یہ ایک مقدس حکم ہے جسے کہہ تو آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس پر عمل مشکل ہی سے ہو سکتا ہے

(Civilisation, War and Death:
PP. 78-94)

"برائی کی مدافعت نہ کرو!" ایک ایسا حکم ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے دنیا میں شر کی تمام قوتیں بے لگام ہو جاتی ہیں اور جور و استبداد، اور ظلم و ستم، عمرانی اور تمدنی زندگی کے ہر شعبے پر چھا جاتا ہے اسی لئے (Briffault) عیسائیت کے خلاف یہ سنگین جرم عائد کرتا ہے کہ اس نے اس غلط تعلیم سے ہمیشہ ظلم و استبداد کا ساتھ دیا ہے۔ اور اس طرح عدل و انصاف کا گلا گھونٹا ہے۔ اس نے اس باب میں سپین کے پروفیسر (Dr. Falla de Gracia) کا ایک اقتباس بھی دیا ہے جو باوجود اپنی طوالت کے اس قابل ہے کہ یہاں نقل کر دیا جائے۔

ڈاکٹر گریشیا لکھتا ہے:-

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصور اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، دعوت دی ہے اور انہیں آئین محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انہیں خدا کی ربوبیت کی یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب اخلاق کے اس طوفان میں، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراج کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس، جور و استبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان، آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو ان کی طرف فارقلیط کا پیغام رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرہ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے

ابتلاء و آزمایش ہے۔ نظام عالم کا خاصہ ہے۔ اسی حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بناء پر قائم ہے۔ سینٹ ونسنٹ فرانسس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیام عام کرتا ہے اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں، وہ مٹ جائیں۔ فنا ہو جائیں۔ عیسائیت کی روح انہیں جا کر تسلی دے گی لیکن یہ اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئیگا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح سے مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے، ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہوگا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصور اس کے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصور۔ وہ ہمیشہ عفو برداشت، رحمدلی کا سبق پڑھاتی رہی۔ لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام خودداریوں کا ترک ...... تدسیۂ آرزو ..... عدم مدافعت، خاموش اطاعت۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا۔ غرضکہ اس قسم کے متشدد (غیر فطری) ضابطۂ اخلاق کا طوفان، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا لیکن ظلم و استبداد اور جور و ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔

(The Making of Humanity: pp. 332-33)

اس لئے کہ ظلم و ستم کی مدافعت ہو سکتی ہے قوت سے اور قوت کا استعمال عیسائیت کی غیر فطری تعلیم میں حرام ہے۔ ظالم اور مستبد قوتوں کی گردن مروڑی جا سکتی ہے پنجۂ فولاد سے اور عیسائیت میں فولاد "قیصر" کے حصہ میں آیا ہے "خدا" کے حصہ میں نہیں۔ اس لئے ظلم و استبداد کی تمام قوتیں آزاد ہیں کہ جو جی میں آئے کریں۔ مظلوم و مقہور کے دل میں انتقام کا تصور پیدا ہونا بھی گناہ ہے۔ اس کے لئے آسمان کی بادشاہت ہے زمین کی نہیں۔ اسے ان مظالم و شدائد پر بھی دشمن سے پیار کرنا ہوگا کہ یہی "اس کے خدا" کا حکم ہے۔ ظاہر ہے

مزید اعترافات

کہ جب خدا کے ماننے والوں کی یہ کیفیت ہو جائے گی تو دنیا میں طاغوتی طاقت ہی کا غلبہ ہوگا۔ چونکہ یہ تعلیم یکسر غیر فطری اور ناممکن العمل تھی اس لئے اب خود مسیحیت کے ارباب بست و کشاد اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ سینٹ پال (لندن) کا ڈین، ڈاکٹر انج . . . .

ارباب کلیسا میں بڑی ممتاز ہستی ہے وہ اپنی کتاب (The Fall of Idols) میں (Pacifism) کے عنوان کے ماتحت لکھتا ہے۔

عدم مدافعت کا اصول، ایک چھوٹے سے گلے کے لئے ناموافق ماحول میں زندگی بسر کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ لیکن ایک منظم سوسائٹی تشدد کے استعمال سے کبھی مجتنب نہیں رہ سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک عیسائی حکومت کو اپنی حدود میں کسی جرائم پیشہ گروہ کو مغلوب نہیں کرنا چاہیئے! اور جب اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا کرنا ضروری ہے تو پھر اس حکومت کو دشمن کے حملہ کی مدافعت کرنا بھی ضروری ہوگا...... فتنہ وفساد کی مدافعت نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، جو کسی ضابطہ کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔ آگسٹائن کا بھی خیال تھا کہ ایسے حالات میں جنگ حق بجانب ہوتی ہے اور ایسے جرائم کے انسداد نہ کرنے سے ہم درحقیقت سرکشی کا بھلا کر رہے ہیں عدل کے بغیر سلطنت کیا ہے؟ ایک بڑے پیمانے پر قزاقی صفحہ ۱۷۹

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف لکھتا ہے۔

یہ دیکھ لینے کے بعد کہ ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں مدافعانہ جنگ ضروری ہو جاتی ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کے ماتحت یہ یقین کیا جائے کہ اب جنگ ضروری ہو چکی یا نہیں۔ (صفحہ ۱۸۱)

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے "آرک بشپ آف کنٹربری" کلیسائے انگلستان میں عیسائیت کی سب سے بڑی مقتدر ہستی ہے۔ اس کے متعلق رائٹر کا حسب ذیل بیان قابل غور ہے:-

آرک بشپ آف کنٹربری اور یارک کے نزدیک ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں جنگ میں شرکت، عیسائیت کے منافی نہیں ہوگی۔

(اخبار نیشنل کال مورخہ ۱۳/۳۶ ۲۲)

چنانچہ اس جواز شرکت کا مظاہرہ گذشتہ جنگ عالمگیر میں ہمارے سامنے آچکا ہے جس میں بقول...... (Sir Richard Gregory) کیفیت یہ تھی کہ:-

---

۱؎ بخاری باب مظالم میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا (یعنی تم اپنے بھائی کی امداد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم)۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر مظلوم ہو تو اس کی امداد تو کی جا سکتی ہے لیکن ظالم کی مدد کس طرح کی جائے فرمایا کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روک کر!

جناب مسیحؑ کا کلیسا ان ہتھیاروں اور قوتوں کو اپنی برکت دیتا ہے جو جنگ کے لئے تیار کی جاتی ہیں
اگرچہ ہر عیسائی سلطنت جو جنگ میں شریک ہوتی ہے اپنی فتح کے لئے اسی خدا کی مدد مانگتی ہے۔

(Religion in Science and Civilisation: P. 274)

ان تصریحات کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عیسائی مشنریوں کا یہ دعویٰ کہ جنگ بہر حال خلاف تہذیب و خلاف انسانیت ہے اور عیسائیت کی تعلیم جنگ کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ کس قدر مبنی علی صداقت ہے! عیسائی مشنری اس تعلیم کی تبلیغ کیوں کرتی ہے اس کا جواب عنوان زیر نظر کے آخر میں آپ کے سامنے آجائے گا۔

ہندو مذہب اور جنگ

ہندو مت، مذہب ہی جنگ و جدال کا ہے۔ تورات کی طرح وید بھی ان لڑائیوں کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں آریہ غیر آریوں کے مقابل صف آرا ہوئے علاوہ ازیں ان کے دیوتاؤں کی لڑائیوں کے قصّے بھی ویدوں میں موجود ہیں۔ رگوید منڈل ۲ منتر ۲۰ رچا ۷-۶ میں ہے۔

وہ اندر جس نے ورترا کو قتل کیا اور جس نے قصبے کے قصبے اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر دیئے۔ وہ کالے داسوں کی فوج کو تباہ کرتا ہے۔

اور اسی وید کے چوتھے منڈل. منتر ۱۶ رچا ۱ میں ہے کہ

اس نے پچاس ہزار سیاہ فام دشمنوں کو لڑائی میں تباہ و غارت کیا۔

ان لڑائیوں کی مزید تفصیل کیلئے مسٹر آر۔ سی۔ دت کی کتاب (The Ancient Civilisation of India) ملاحظہ فرمائیے! ویدوں کے بعد ہندو اتہاس (تاریخ) میں شری رام چندر جی مہاراج اور شری کرشن جی مہاراج کے نام اوتاروں کی حیثیت سے لئے جاتے ہیں۔ رامائن اور مہا بھارت مقدس مذہبی کتابیں تصور کی جاتی ہیں۔ رامائن اس لڑائی کی تفاصیل پر مشتمل ہے جو مہاراج رام چندر نے لنکا کے راجہ راون کے ساتھ لڑی اور "مہابھارت" میں کورو اور پانڈو کی جنگ کا قصہ مذکور ہے۔ کرشن مہاراج کی طرف منسوب کردہ "گیتا" کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ جب جنگ مہابھارت کے سلسلہ میں عین میدان میں پہنچ کر، ارجن شمشیر افگنی سے ہچکچایا، کیونکہ اس نے دیکھا کہ میدان میں دونوں طرف ایک ہی دادا کی اولاد ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہے تو کرشن جی نے "فلسفۂ عمل" کی تلقین سے

اس کے سرد لہو کو گرمایا اور اسے جنگ وپیکار پر اکسایا۔ مہاراج رام چندر اور مہاراج کرشن کے یہی وہ معرکہ آرا کارنامے ہیں جن کی بنا پر انہیں اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر ہندو مت کی طرف سے جنگ و قتال کے خلاف لب کشائی ناممکنات میں سے ہے۔ لیکن جیسا کہ ظہر الفساد کے عنوان میں بتصریح لکھا جا چکا ہے، چونکہ ہندو مت، ہر قسم کی متضاد تعلیم کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اس لئے اہمسا (عدم تشدد) کی تعلیم بھی اس مذہب کا جزو بتائی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے زمانہ میں اس کا اس قدر پرچار ہوا ہے کہ اُسے پرمودھرما (سب سے بلند مذہب) قرار دیا جاتا ہے۔ "اہمسا" کے پرچارک ہندو قوم کے سیاسی راہ نما مہاتما گاندھی ہیں چونکہ ہنگامی سیاست معارف القرآن کا موضوع نہیں اس لئے ہمیں ان کو الف دعواطف سے بحث نہیں جن کے باعث "اہمسا" کو ہندوستان کی تحریک رام راج کا سب سے کامیاب حربہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس حربہ کو بطور عقیدہ اور فلسفۂ زندگی کے پیش کیا جاتا ہے اس لئے اس کا ذکر ناگزیر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا خود مہاتما گاندھی کے نزدیک یہ فلسفہ، زندگی کے ہر شعبہ اور تمام حالات میں ممکن العمل ہے یا ان کے نزدیک ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن میں تشدد ضروری ہو جاتا ہے۔ اہمسا سے مفہوم یہ ہے کہ دشمن سے انتقام نہ لیا جائے برائی کی مدافعت کے لئے کبھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے، تشدد پر کسی حالت میں بھی نہ اتر آجائے۔ مہاتما گاندھی کے نزدیک اہمسا میں صداقت ہے اور

مہاتما گاندھی کا فلسفہ

اسی لئے وہ قریب بیس پچیس برس سے اس کا متواتر و مسلسل پرچار کر رہے ہیں، لیکن ایسے حالات بھی سامنے آجاتے ہیں جن میں خود مہاتما گاندھی کو اہمسا کے اصولوں کے خلاف تلقین کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ۹ راگست ۱۹۴۶ء کے اخبار ہریجن میں لکھا ہے کہ ایک حبشی پادری کی کسی سفید فام

اور اعتراف

(یورپین) نے بیعزتی کی تو اس پادری نے (جو بڑے توانا اور مضبوط جسم کا تھا) اپنے حریف سے کہا کہ "بھائی مجھے معاف کر دو!" اس پر مہاتما گاندھی لکھتے ہیں کہ:-

> یہ اہمسا نہیں ہے۔ یہ مسیح کی تعلیم کی تضحیک ہے جوانمردی کا تقاضا تھا کہ وہ پادری اس سفید فام سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتا

اسی طرح فسادات کلکتہ کے موقع پر انہوں نے اپنے اسی اخبار کے افتتاحیہ میں لکھا کہ

> یہ لوگ بدلہ بھی لے سکتے ہیں اور اس سے مجتنب بھی رہ سکتے ہیں۔ اجتناب آسان اور سادہ ہے بشرطیکہ اس کے لئے عزم موجود ہو۔ بدلہ پیچیدہ ہے۔ (اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بدلے میں ایک دانت کے بدلے ایک ہی دانت توڑا جاتا ہے یا زیادہ۔
> (ہریجن ۲۵ راگست ۱۹۴۶ء)

جہاں تک جیو ہتیا (جان تلف کرنے) کا تعلق ہے مہاتما گاندھی کا عقیدہ ہے کہ سانپ، بچھو، بھیڑیئے اور

اسی قسم کے اور جانور جو نوع انسانی کے لئے خطرناک ہیں تلف کر دیئے جائیں۔ اس پر کسی نے اعتراض کیا تو انہوں نے ۹ جون ۱۹۲۶ء کے ہریجن کے مقالہ افتتاحیہ میں اس کا جواب دیا جس کے دوران میں لکھا ہے کہ

یہ ناممکن ہے کہ انسان تشدد سے اپنی زندگی میں یکسر مجتنب رہ سکے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتیازی خط کس مقام پر کھینچا جائے۔ ہر خط ہر شخص کے لئے ایک ہی نہیں ہو سکتا

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:-

اہمسا کی بنا پر جانوروں کو اجازت دیدینا کہ وہ کھیتوں کو کھا جائیں دراں حالیکہ ملک میں قحط پڑا ہوا ہو یقیناً گناہ ہے۔ خیر اور شر اضافی چیزیں ہیں۔ جو چیز ایک قسم کے حالات میں خیر (نیکی) ہے، وہی دوسری قسم کے حالات میں شر (بدی) بن سکتی ہے۔

یہاں سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ خود مہاتما گاندھی کے نزدیک اہمسا صداقت مطلق (Absolute Truth) نہیں بلکہ اضافی صداقت (Relative Truth) ہے۔ اور ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جب "اہمسا" پر عمل پیرا ہونا موجب گناہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت ہمسا (تشدد) ہی عین نیکی ہو جاتا ہے یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اس کے نزدیک ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن میں عفو درگذر ہی نیکی ہوتی ہے اور ایسے بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن میں "عصائے کلیمی" ہی عدل و صداقت قرار دیا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں مہاتما گاندھی دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

بندر جس قدر نقصان پہنچاتے ہیں لوگ اس سے تنگ آجاتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ وہ مر جائیں اگر انہیں کوئی مار دے تو جی میں بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ظاہری طور پر وہ ان کے تلف کئے جانے کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ایک دوست جو شاستروں سے خوب واقف ہے لکھتا ہے کہ بندر فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کی تعداد دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کہئے کہ اس باب میں اہمسا کا کیا حکم ہے۔

اس کے جواب میں مہاتما گاندھی لکھتے ہیں۔

میرا اہمسا میرا اپنا ہے۔ میں جانوروں کو تلف نہ کرنے کے عقیدہ کا قائل نہیں ہوں۔ جو جانور انسان کو چیر پھاڑ ڈالیں یا انہیں نقصان پہنچائیں میں ان کی جان بچانے کے لئے اپنے دل میں کوئی جذبہ نہیں پاتا۔ بلکہ میں ان کی نسل کی افزائش میں مدد دینے کو غلطی سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں چیونٹوں، کیڑے مکوڑوں، کتوں اور بندروں کو خوراک بہم پہنچانے کے خلاف ہوں۔ میں ان کی زندگی بچانے کے لئے انسان کی زندگی قربان نہیں کر سکتا۔ بنا بریں میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جہاں بندر انسانوں کی بہبو

کے خلاف ایک مصیبت بن رہے ہیں انہیں تلف کر دینا قابل معافی ہی نہیں بلکہ ان کا مار دینا فرض ہے

سوال یہ پیدا ہوگا کہ یہی اصول انسانوں پر بھی کیوں نہ منطبق کیا جائے؟ ایسا نہیں ہوسکتا اس لئے

کہ انسان کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں وہ ہمارے ہی جیسے ہیں. خدا نے انہیں عقل عطا فرمائی ہے

جو جانوروں کو نہیں دی گئی (ہریجن مورخہ ۵ رمئی ۱۹۴۶ء)

اس اقتباس کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی انسان یا انسانوں کی کوئی جماعت

کمزور دلیل

وہی کچھ کرنے لگ جائے جو بھیڑیئے یا بندر کرتے ہیں وہ فصلوں کو تباہ و برباد کردیں ملک میں فتنہ و فساد برپا کردیں جس سے کسی شریف انسان کی عزت، آبرو، جان مال، حریت و آزادی، کچھ بھی محفوظ نہ ہو۔ انہیں انسانوں کی طرح دلیل و برہان سے سمجھایا جائے تو اس کا جواب اینٹ اور پتھر سے دیں۔ ان کی عقل و دانش کو اپیل کی جائے تو وہ سامنے سے تھپڑ ماریں انہیں انسانیت کا واسطہ دیا جائے تو وہ اس کا مضحکہ اڑائیں اور انسانی جان اور مال، عزت و عصمت کی تباہی و بربادی میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں تو اس وقت کیا کیا جائے؟ کیا یہ کہ چونکہ ان مفسدین کی شکل و صورت انسانوں جیسی ہے اس لئے انہیں ان کی انسانیت سوز حرکات سے زبردستی نہ روکا جائے اور کھلا چھوڑ دیا جائے کہ جو ان کے جی میں آئے کریں کیا اس طرح سے دنیا کا کوئی نظام امن و عافیت قائم رکھ سکتا ہے اس میں شبہ نہیں کہ علم و عقل بہت بڑے جوہر ہیں جن سے نوع انسانی کو نوازا گیا ہے لیکن کیا یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ نہیں کہ جذبات سے مغلوب ہوکر انسان علم و عقل کے باوجود کس درجہ حیوانیت پر اتر آتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح شراب کے نشہ میں انسان کی عقل مفلوج ہو جاتی ہے اسی طرح جذبات کے نشہ سے بھی عقل اندھی ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح ایک شرابی کو (بحالت شراب) دلائل و براہین سے قائل کرنا ناممکن ہے، جذبات سے مغلوب انسان کی عقل و بصیرت کو اپیل کرنا بھی بیکار ہے۔ ادمنہ جہالت و وحشت کے ڈاکوؤں اور قزاقوں کو چھوڑیئے کہ کہدیا جاسکتا ہے کہ ان میں علم و عقل کی کمی تھی۔ دور حاضرہ کی متمدن و مہذب قومیں جب آئے دن درندوں کی طرح آپس میں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں تو اُن کی عقل و بینش کہاں گم ہو جاتی ہے؟ ابھی کل کا ذکر ہے کہ مسلسل چھ برس تک ان ہی متمدن و مہذب انسانوں نے دنیا کو آگ و خون کا جہنم بنائے رکھا اور کسی صاحب عقل و فہم کی کوئی دلیل (Reason) اس درندگی سے روک نہ سکی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی قلب و دماغ کی تربیت سے اس میں حیوانیت کا عنصر کم کیا جاسکتا ہے (اور قوانین الٰہیہ کی اتباع و اطاعت سے مقصود یہی ہے)، لیکن بایں ہمہ طبائع انسانی کے تفاوت کا تقاضا ہے کہ ایسے انسان موجود رہیں گے جن میں حیوانیت کا عنصر غالب ہو۔ ان انسان نما درندوں کے خونی پنجوں سے انسانیت کو محفوظ رکھنے کے لئے دلائل

براہین (Reason) کے علاوہ ضرب کلیمی کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ یونہی دیکھنے میں انسان ہیں لیکن حقیقت میں حیوان بلکہ اُن سے بھی بدتر اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ خود یورپ کے مدبرین نے بھی مسئلہ کے اس پہلو پر کافی غور کیا ہے لیکن وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عقلی دلائل سے جنگ نہیں روکی جاسکتی۔ ڈاکٹر انج جس کا تعارف پہلے کرایا جاچکا ہے' اس باب میں رقمطراز ہے۔

> عام طور پر عصر حاضر کا انسان جنگجو نہیں ہے لیکن اس کے اندر غصہ کی آگ نہایت آسانی سے بھڑکائی جاسکتی ہے اگر یہ تشخیص درست ہے تو پھر جنگ کو دلائل و براہین سے ختم کر دینے کے امکانات بہت بعید ہیں (صفحہ ۱۹۳)

اسی ضمن میں (Treatise on Right & Wrong) کا مصنف (H. L. Mencken) لکھتا ہے کہ

> ایک قوم کی دوسری قوم کے مدمقابل لا کھڑا کرنے کی اس مہیب سازش کے درمیان وہ نظری مصلحتیں دکھائی دیتی ہیں جو جنگ کو ختم کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ اگر کسی معجزہ سے ان کی آرزو پوری ہو جائے تو نیشنلزم کا یہ بت گر جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کی بہت سی باطل اور خلاق سوز اقدار بھی۔ اس لئے کہ اس کی قوتوں کا سرچشمہ خوف ہے۔ اور کوئی شخص ایسے دشمن سے خائف نہیں ہوگا جو عدل کے ہتھیاروں سے مسلح ہو۔ لیکن موجودہ تاریخی عہد کے اختتام سے قبل جنگ کے ختم ہو جانے کے امکانات بہت کم ہیں اور اس میں ابھی صدیاں درکار ہیں۔ انسان ابھی وحشی قبائل سے بہت قریب ہے اور اس لذت کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں جو اسے اس وقت ملتی ہے جب اس کا خون گرم ہو جائے اور وہ دشمن کے تعاقب میں نکلے یا اس سے نبرد آزما ہو..... جب مختلف حکومتوں کی طرف سے صلح کے مطالبات پیش ہوتے ہیں تو وہ مطالبات درحقیقت اپنے اپنے مفاد کے مطالبات ہوتے ہیں۔ میں نے بہ حیثیت ایک صحیفہ نگار کے تین بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے جو جنگ کو ختم کر دینے کے لئے منعقد ہوئیں اور جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے وہ میری اسی شرکت کا نتیجہ ہے۔ چند دنوں کی منافقانہ نرمی و آشتی کے بعد یہ مدبرین چھینے اور جھپٹنے پر اتر آتے تھے اور جب وہ اپنے اپنے ملک میں واپس جاتے تھے تو ان کی کامیابی کو اس معیار سے نہیں پرکھا جاتا تھا کہ وہ دنیا میں قیام امن و صلح کے لئے کیا کچھ کر کے آئے ہیں بلکہ اس سے کہ وہ (آئندہ) جنگ کے لئے کیا کچھ (سامان) لیکر آئے ہیں۔ لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوام) کا شیرازہ اس دن سے بکھرنا شروع ہو گیا تھا جب اس کے عزائم

بے نقاب ہونے لگے۔ اور یہ چیز اس کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ظہور پذیر ہو گئی تھی ان تمام انسانوی دعاوی کے باوجود جو اس کے قائم کرنے والوں نے دنیا کے سامنے پیش کئے، اس کے قیام سے درحقیقت مقصد یہ تھا کہ جنگ عظیم کے مال غنیمت کو فاتحین کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔ اور جونہی یہ کاروبار شروع ہوا تو یہی فاتحین مال غنیمت کی اس تقسیم پر باہم گرالجھ پڑے۔ (صفحہ ۲۳۳)

اور آگے بڑھئے ۱۹۳۲ء میں لیگ آف نیشنز کے (National Institute of Intellectual Co-operation) کے ایما پر پروفیسر آئین سٹان (Eien Stan) نے مغرب کے مختلف ممتاز ارباب فکر و نظر کو دعوت دی کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں کہ

"کیا نوع انسانی کو جنگ کی مصیبتوں سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ ہے؟"

علم تجزیہ نفس کے مشہور ماہر فرائڈ نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا وہ ارباب بصیرت کیلئے قابل غور ہے۔

ہر چند یہ بات متضاد سی نظر آئے گی۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس غیر منقطع امن کی منزل کا راستہ جسے حاصل کرنے کے ہم اس درجہ متمنی ہیں، خود جنگ کے ذریعہ ہی تیار ہو گا۔ اس لئے کہ جنگ کے ذریعے بڑی بڑی سلطنتوں کا قیام وجود میں آجائے گا جن کی حدود کے اندر ان کی مرکزی قوت کی وجہ سے جنگ ناممکن ہو جائے گی ...... جنگ ختم کرنے کا ایک ہی یقینی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ باہمی رضامندی سے ایک ایسی مرکزی قوت کو قائم کر دیا جائے جس کے فیصلے مختلف اقوام کے مفاد کے تصادم کے وقت قول فیصل کا حکم رکھیں اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول اس قسم کی عدالت عالیہ کی تخلیق اور دوم اس کے لئے قوت نافذہ کی بہم رسانی۔ جبتک یہ دوسری چیز بہم نہ پہنچائی جائے اول شے[1] بیکار ہو گی......

بہر حال، جیسا کہ آپ کو خود معلوم ہے سوال یہ نہیں کہ انسان کی غالب قوتوں کو کس طرح دبایا جائے بلکہ یہ کہ ان کو کس طرح جنگ کی بجائے دیگر شعبوں میں استعمال کیا جائے (صفحہ ۹۳-۸۷)

آخر میں ڈاکٹر فرائڈ لکھتا ہے کہ "ہم دماغی کام کرنے والے لوگ اس لئے جنگ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ہماری جسمانی فطرت کا ایسا ہی تقاضہ ہے"

[1] غور کیجئے عہد حاضر کا یہ ممتاز ترین دماغ کس طرح اسی حل پر پہنچا ہے جو قرآن کریم نے صدیوں پہلے تجویز کیا تھا۔ قرآن دنیا میں امت مسلمہ کا وجود اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ شھداء علی الناس (تمام نوع انسانی کے معاملات کے نگہبان) ہوں اور دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکیں اور یہ فریضہ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے کہ جب ان کے پاس کتاب اللہ کے ساتھ فولاد بھی ہو!

یہ ان لوگوں کے حالات ہیں جو آج علم وعقل میں اقوام عالم کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں اور ہر معاملہ کو دلیل و برہان سے طے کرنے کے مدعی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرکش قوتیں دلیل و برہان سے اپنی غلط روش سے باز آجائیں تو مہاراجہ رام چندر کو راون کے خلاف فوج کشی کی کیا ضرورت تھی اور مہاراجہ کرشن کو کورکھشیتر کے میدان میں اس قدر قتل و خونریزی کی کیا حاجت؟ کیا وہی دلائل جو انہوں نے ارجن کو جنگ کرنے پر آمادہ کرنے میں استعمال کئے تھے، کوروں کو جنگ سے محترز رکھنے میں استعمال نہیں کئے جاسکتے تھے؟ لہٰذا دنیا میں جب تک سرکش طبائع کا وجود باقی ہے، انسانیت کو ان کے دندانِ حرص و آز سے محفوظ رکھنے کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اہمسا" کے اوتار مہاتما گاندھی کو بھی بالآخر یہی کہنا پڑا کہ:۔

میں تو یہی کہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان کی عورتیں یہ محسوس کریں کہ وہ بے بس ہیں اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جائے۔ عورتوں میں ریوالور اور خنجر رکھنے کا رواج ترقی پذیر ہے۔ (ہریجن مورخہ ۲۷ ۱/۴۲)

یہی وہ خنجر ہے جس کی اجازت قرآن دیتا ہے۔

عنوان زیر نظر کے ابتدا میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ مغرب کے تحت الشعور میں وہ کونسا جذبہ اسلام کے خلاف آتش خاموش کی طرح کارفرما ہے جس کے ماتحت وہ ہر اسلامی قوت کے ضعف و اضمحلال کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ارباب کلیسا کے جیوش وعساکر انہیں پیش آہنگ کا کام دیتے ہیں۔

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکر کلیسیا کے سفیر

ناصحین مشفق!

یہ مسیحی مبلغ ناصحان مشفق کے لباس میں جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ یورپ سے چلتے ہیں تو اپنے اسلحہ سازکارخانوں کو تاکید کر آتے ہیں کہ دیکھنا تمہاری بھٹیاں کہیں سرد نہ پڑجائیں اور سولہ سولہ[۱۶] انچ دھانے کی توپیں، چار چار من کے گولے، فریا بوس طیارے اور عالم سوز جوہری بم تیار ہوتے جائیں[۱]۔ لیکن مشرق میں مسلمانوں کو "مسیح کی منادی" سنائی جاتی ہے کہ خدا کی بادشاہت کمزوروں اور ناتوانوں کا حصہ ہے۔ جو ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا گال بھی اس کے سامنے کردو کہ آسمانی بادشاہت تمہارے لئے مقدر ہوچکی ہے۔ باقی رہی اس دنیا کی سلطنت اور حکومت تو یہ تو مٹی ہے۔ اس لئے مٹی پر نگاہ رکھنا ذلت کی نشانی ہے۔ وہ اسی طرح انہیں آسمانی بادشاہت کے خواب اور افسانے سناتے رہے حتیٰ کہ زمین کی بادشاہت دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اور مسلمان۔ ہاں وہی مسلمان جس کے متعلق اس کے

[۱] حاشیہ اگلے صفحے کے نیچے ملاحظہ فرمایئے۔

خدا نے کہا تھا۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (۹/۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں اور مال بھی اور اس قیمت پر کہ ان کے لئے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات انجیل اور قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا خوشیاں مناؤ اور یہی ہے جو سب سے بڑی فیروز مندی ہے۔

یہی مسلمان تسبیح و مصلی کو مآل حیات سمجھ کر اور قناعت و توکل کے غلط مفہوم کی افیون کھا کر سو گیا۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ۔ یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست ۔ یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

مغرب کے ان ناصحانِ مشفق کی اس منظم سازش[۱] کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی "اسرار و رموز" میں ایک نہایت بصیرت افروز تمثیل لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگل میں ایک شیر رہتا تھا

بھیڑیں اور شیر وہاں کی بھیڑیں جب اس سے تنگ آگئیں تو انہوں نے مل جل کر مشورہ کیا کہ اس کا

---

[۱] واضح رہے کہ عیسائیت کی تعلیم کے دوش بدوش یہ جنگی تیاریاں کچھ دورِ حاضرہ کی پیداوار نہیں ہیں۔ صلیبی جنگ لڑنے والے لڑنے والے ہی نہیں بلکہ سارے یورپ کو اس کے لئے مشتعل کرنے والے یہی ارباب کلیسا یعنی ان کے بڑے بڑے بطاریق واساقیف ہی تھے۔ وہ صلیبی جنگ جس کے متعلق خود ایک عیسائی مورخ کا بیان ہے۔

جب رسول عربیؐ کی فوجیں یروشلم میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئیں (یعنی بہ عہد حضرت عمرؓ) تو کسی ایک غیر مسلم کو بھی بنا بر مذہب قتل نہیں کیا گیا۔ لیکن جب صدیوں بعد صلیبی جنگ لڑنے والے عیسائی اس شہر میں داخل ہوئے تو کوئی مسلمان مرد، عورت، بچہ باقی نہیں چھوڑا گیا۔

(Thomas Sugrue; Quoted in "Think and Grow Rich: P. 249)

علاج کیا کیا جائے۔ جوان میں سب سے زیادہ سیاست داں بھیڑ تھی اس نے کہا کہ دیکھو! اگر تم تمام بھیڑیں بھی اکھٹی مل جاؤ تب بھی ایک شیر نہیں بن سکتیں۔ لہٰذا اپنے آپ کو شیر بنانے کا خیال محض وہم ہے۔ کوشش یہ کرو کہ کسی طرح یہ شیر بھیڑ بن جائے۔ چنانچہ اس بھیڑ نے ایک تارک الدنیا فقیر کے سے کپڑے پہنے اور نہایت مسکین سی شکل بنا کر شیر کے پاس آبیٹھی اور اُسے اُپدیش دینا شروع کیا کہ بابا! یہ دنیا چند روزہ ہے مایا کا جال ہے۔ یہ خونریزی کی زندگی شریفوں کا کام نہیں۔ دشمن سے پیار کرو۔ اپنی خودی کو مارو۔ اس سے اطمینان قلب حاصل ہوگا۔ یہی زندگی کا مقصد ہے۔

ایکہ می نازی بذبح گوسفند ۔۔۔ ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند
زندگی را می کند ناپائدار ۔۔۔ جبر و قہر و انتقام و اقتدار
غافل از خود شو اگر فرزانۂ ۔۔۔ گر ز خود غافل نۂ دیوانۂ
چشم بند و گوش بند و لب بہ بند ۔۔۔ تا رسد فکر تو بر چرخ بلند

گوسفند کی یہ خواب آور افسون سازی کارگر ہوئی اور شیر اس کا چیلہ بن گیا اور گوشت چھوڑ کر گھاس پات پر گذران ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کی قوت و ہیبت، تندی و تیزی، جلال و جبروت مسکینی و عاجزی، کمزوری اور ناتوانی بزدلی اور دوں ہمتی میں بدل گئی اور حالت یہ ہوگئی کہ

از علف آں تیزیٔ دنداں نماند ۔۔۔ ہیبت چشم شرر افشاں نماند
دل بتدریج از میان سینہ رفت ۔۔۔ جوہر آئینہ از آئینہ رفت
آں جنونِ کوششِ کامل نماند ۔۔۔ آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت ۔۔۔ اختیار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنی بے زور شد ۔۔۔ مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی ۔۔۔ بیدلی، کوتہ دلی، دوں فطرتی

نتیجہ یہ ہوا کہ ۔۔۔ **شیر بیدار از فسون میش خفت**

اور قیامت یہ کہ ۔۔۔ **انحطاط خویش را تہذیب گفت**

وھابی تحریک ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد "وہابی تحریک" جو جناب سید احمد بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ تعالیٰ کے خون گرم اور جذبہ صادق کی رہین منت تھی، ہندی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور نہضتِ جدیدہ کی ایک حیات آور کوشش تھی۔ یہ تحریک کس طرح کچلی گئی؟ یہ ایک حدیث ہے الم انگیز اور قصہ ہے جگر سوز جس کے بیان کرنے کا

یہ موقعہ نہیں۔ اس تحریک کی دوبارہ نمود کے امکانات کو معدوم کرنے کے لئے پادریوں کے عساکر وجنود ہجوم کرکے سرزمین ہند پر طوفان بلا کی طرح پھیل گئے جنہوں نے ایک طرف مسلمانوں کی فعال قوتوں کو مناظرہ بازی کے میدان کی طرف کھینچ لیا اور دوسری طرف عوام میں "مسیح کی منادی" اور آسمانی بادشاہت کے خواب آور افسوں کو پوری طرح پھیلا دیا۔ لیکن وہ اپنی ان تمام کوششوں کے باوجود اپنے مقصد کے حصول کی طرف سے مطمئن نہ تھے اس لئے کہ مسلمانوں میں مہدی کی آمد کا تصور ان کے اینوئی اثرات کو گراں نشین نہیں ہونے دیتا تھا

نبی قادیان

چنانچہ اس کڑی کو "قادیان کے نبی" نے پورا کردیا اور اپنی مزعومہ "وحی" کی سند کے ساتھ اعلان کر دیا کہ

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال

دیں کیلئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

اس منظم پروپیگنڈا کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان جہاد کے معاملہ میں عام طور پر جھینپا جھینپا سا نظر آنے لگا۔ اور جن لوگوں نے اس "نئے نبی" کی نبوت کو تسلیم نہ بھی کیا ان کی بھی یہ کیفیت ہوگئی کہ اس باب میں اُن کا رویہ معذرتی (APOLOGETIC ATTITUDE) ہوگیا وہ چاہتے تھے کہ قرآن میں جہاد کی آیتیں نہ ہی ہوتیں تو اچھا تھا۔ چونکہ اس پر ان کا بس نہیں تھا اس لئے انہوں نے ان آیات کی ایسی مضحکہ انگیز تاویلیں شروع کردیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اس زمانہ کے احکام ہیں جب دنیا ابھی اتنی مہذب نہیں ہوئی تھی وہ دور وحشت وبربریت تھا۔ یہ احکام وقتی تھے۔ اس زمانہ کے عربوں کی جنگ جو خصلت کے پیش نظر ان چیزوں کی ضرورت لاحق ہوگئی تھی۔ لیکن اب یہ تمام آیات منسوخ ہو چکی ہیں وقس علیٰ ہذا۔ یہ سازش کامیاب ہو ہی چکی تھی لیکن ایسا

پیام اقبال

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہندی مسلمانوں سے شاید اپنے دین کے احیاء میں کچھ کام لینا ہے جو ان میں اقبال جیسے دیدہ ور کو بھیجدیا جس نے اپنی فراست ایمانی اور بصیرت فرقانی سے راہ گم کردہ مسلمان کی نگاہوں کو پھر سے قرآن کی طرف مرتکز کردیا اور اس منظم سازش کے نگاہ فریب پردوں کو چاک کرکے حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور علانیہ کہدیا کہ

ہو اگر قوت فرعون کی در پردہ مرید

قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

اس نے ان ناصحین مشفق سے پوچھا کہ:-

باطل کے فال وفر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات — اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر

یہ اسی مردِ خود مست و خدا آگاہ کا اعجاز ہے کہ آج مسلمان نے پھر سے حقیقتِ قرآنی کو بے حجاب دیکھ لیا ہے اور قرآن اور صاحب قرآن کی سیرت کے اس حیات آور پہلو کو اپنی پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بدھ مت اور جین مت

اس میں شبہ نہیں کہ بدھ مت اور جین مت جیسے مذاہب نے دنیا میں جیو ہتیا کے خلاف تعلیم دی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان مذاہب نے انسانی دنیا کو کونسا تمدن دیا ہے؟ جین مت کے پیرو تاریخ میں کسی مقام پر بھی اُبھرے ہوئے نظر نہیں آتے اور آج ان کا جداگانہ تشخص بھی معروف نہیں، بدھ مت والوں نے مہاراجہ اشوک اور کنشک کی حکومت کے بل بوتے پر کچھ فروغ حاصل کیا لیکن اس کے بعد ہندوؤں کی ایک ہی یورش نے انہیں اس طرح ہندوستان کی چاردیواری سے باہر نکال کھڑا کیا کہ آج انہیں اس ملک میں ایک مسلمہ اقلیت تک کی بھی حیثیت حاصل نہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ مذاہب اور ان کا فلسفہ یکسر انفرادی زندگی کے لئے "نجات" (مکتی) کا مدعی تھا اجتماعی زندگی سے انہیں کچھ سروکار نہ تھا۔ یہی کیفیت اس زمانہ کی عیسائیت کی تھی جب عدم تشدد پر ان کا ایمان تھا۔ ڈاکٹر آنج کے الفاظ میں:۔

"عیسائیت ایک خالص مذہبی تحریک تھی انفرادی اور عالمگیر[1]" (صفحہ ۱۲)

یہی کیفیت ہندو مذہب کی ہے چنانچہ خود مہاتما گاندھی لکھتے ہیں۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس علیحدگی کے لئے جان تک دیدیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔ مثلاً صحت، رسل و رسائل، امور خارجہ، سکے وغیرہ۔ مذہب سے اسے کچھ واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ

---

[1] عالمگیر کس طرح جب خود اناجیل میں بار بار لکھا ہے کہ حضرت مسیح صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور وہ "بیٹوں کی روٹی کتوں کو ڈالنے نہیں آئے تھے"۔

معاملہ[1] ہے۔ (ہریجن مورخہ ۲۲/۴/۳۹ء)

لیکن جیساکہ شروع میں شرح وبسط سے لکھا جاچکا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے جس میں حکومت اور مذہب دونوں عناصر شامل ہیں۔ کسی حکومت کو دیکھئے اسے قدم قدم پر "جنگ" کی ضرورت پڑتی ہے۔

قیام حکومت اور قوت

جنگ کیا ہے؟ کسی سے کوئی بات بجبر منوانا، یعنی قوت کا استعمال آپ غور کیجئے کہ حکومت کو کس طرح ہر روز قوت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ایک ڈاکو جب امن عامہ میں خلل انداز ہوتا ہے تو اس کی گرفتاری کے لئے پولیس متعین کی جاتی ہے۔ ڈاکو اور پولیس میں قوت کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جس کی قوت زیادہ ہوتی ہے وہ غالب آجاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ ڈاکو اس آویزش میں مارا جاتا ہے۔ اگر زندہ گرفتار ہو جائے تو سب سے پہلے اس کی قوت (اسلحہ وغیرہ) چھینی جاتی ہے عدالت اس کے خلاف مقدمہ چلاتی ہے اور جرم ثابت ہونے پر اسے سزا دیتی ہے۔ یہ سزا پھر قوت کے زور پر عمل میں آتی ہے اس کا نام قیام امن ہے جو ہر منظم حکومت کا اولین فریضہ ہے۔ غور کیجئے۔ یہاں قدم قدم پر قوت کا استعمال ہوتا ہے اور اسے نہ کوئی عیسائی راہب معیوب قرار دیتا ہے نہ ہندو مہاتما۔ امن قائم رکھنے والی حکومت کو دونوں آشیرباد (دعا) دیتے ہیں۔ لیکن جب ایک ڈاکو کے بجائے کوئی جماعت یا قوم ڈکیتی پر اتر آئے تو اس کے خلاف چارہ جوئی (یعنی جنگ) کو وحشت و بربریت قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ "فلسفہ" کس قدر سطحی اور نگاہ فریب ہے۔ قرآن چونکہ حقائق ابدی کا ترجمان ہے اس لئے وہ عمومی جذبات کی رو میں بہہ کر اس قسم کے سطحی "ضابطۂ اخلاق" کی تلقین نہیں کرتا۔ برائی (Evil) کی مدافعت دین کا اصل الاصول[2] ہے

برائی کی مدافعت

قرآن کہتا ہے کہ برائی کی مدافعت بطریق احسن کرو!

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ (۲۳/۹۶)

اے پیغمبر اسلام! چاہیئے کہ برائی کی مدافعت مناسب ترین طریقہ سے کی جائے

[2] THE ELIMINATION OF WRONG IS THE IRREDUCIBLE MINIMUM OF MORALITY (BRIFFAULT; MAKING OF HUMANITY)

[1] یہ ایڈیشن مسلمانوں کے اس دعوے کے جواب میں تھا کہ ان کی قومیت کی بنیاد مذہب ہے۔ اس کے برعکس ۱۹۳۸ء میں خود کانگریس کے سیکرٹری (مسٹر کرپلانی۔ جو اب ۱۹۴۷ء میں صدر کانگریس ہیں) ایک مفصل بیان میں بتا چکے ہیں کہ کانگریس کا نظام تمام تر گاندھی جی کے فلسفۂ حیات پر متشکل ہوگا۔ اس وقت سیاست اور مذہب ایک ہو جاتا ہے۔

وہ تسلیم کرتا ہے کہ ایسی برائیاں بھی ہیں جو ہنگامی طور پر سرزد ہو جاتی ہیں اور برائی کرنے والے کی فطرت مسخ نہیں ہوتی۔ اسی لئے ایسی برائیوں کا دفعیہ عقل و دانش اور فطرت سلیم کو اپیل کرنے سے ہو سکتا ہے، اسی کا نام "برائی کی مدافعت بھلائی سے کرنا ہے"

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۲۸: ۵۴)

اور دیکھو! مؤمنین کی جماعت بھلائی کے ذریعہ سے برائی کی مدافعت کرتی ہے، اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق عطا فرمایا ہے اس میں سے (راہ حق میں) خرچ کرتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ اس طریق عمل سے دشمن بھی دوست بن سکتا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ (۴۱: ۳۴)

اور (اے پیغمبر اسلام! یاد رکھو) برائی اور بھلائی کبھی برابر نہیں ہو سکتیں (لیکن ہمیشہ) برائی کی مدافعت مناسب ترین طریقہ سے کیا کرو! اور اگر بالفرض تم میں اور برائی کرنے والے میں باہمی رنجش و عداوت بھی ہو تو وہ تمہارے اس طریق عمل سے گویا کہ تمہارا مشفق ترین دوست بن جائے گا!

لیکن چونکہ وہ فطرت انسانی کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کرتا اسی لئے وہ یہاں پہنچ کر رک نہیں جاتا، بلکہ دوسرے رخ کو بھی سامنے لاتا ہے اور کہتا ہے کہ برائی کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنکی فطرتیں مسخ ہو جاتی ہیں اور وہ دیدہ و دانستہ سرکشی و طغیان پر اتر آتے ہیں۔ یہ وہ برائی ہے جس کا دفعیہ قوت ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ وہ جرم ہے جس کی سزا ضروری ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ ۝ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ (۴۲: ۳۹-۴۰)

اور یہ مسلمان، وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں بُرائی ہی برائی آکر گھیر لیتی ہے تو وہ اس کی مدافعت کرتے ہیں اور (فی الحقیقت) برائی کا بدلہ برائی ہی ہے (بشرطیکہ مدافعت (کی صورت میں ہو بہو) برائی کی برابری کی جائے (یعنی قبل مدافعت بھی زیادتی کو ذرہ بھر دخل نہ ہونا چاہیئے)، پس جس نے (برائی کو) معاف کر دیا (یعنی اس سے درگذر کی) اور اصلاح حال کی کوشش کی تو (بلاشبہ) اس کا اجر (صلہ عفو و درگذر) اللہ پر ہے، یہ واقعہ ہے کہ خدا ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

مظلوم کے لئے یا مظلوم کی حمایت میں، قوت کا استعمال، کوئی جرم نہیں۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ

مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲؍۴۱)

اور یاد رکھو! جس نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا یا مدافعت کی، تو اس پر تمہیں کوئی باز پرس کا حق نہیں۔

قوت کا استعمال اسی وقت جرم ہے جب اُسے سرکشی اور طغیان، فساد، اور عدوان کے لئے استعمال کیا جائے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۴۲؍۴۲)

ہاں! تمہیں باز پرس کا حق ان لوگوں سے ضرور ہے جو لوگوں پر ظلم ڈھاتے اور زمین میں بغاوت و سرکشی پھیلاتے پھرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے!

اسی لئے قرآن عفو و درگذر کی بھی تلقین کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی امن و انصاف کے قیام کے لئے حسب ضرورت سزا و عقوبت کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اور یہی سزا و عقوبت جب افراد سے آگے بڑھ کر اجتماعی شکل اختیار کرلے تو جنگ کہلاتی ہے۔ اگر یہ چیز انسانیت کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہے تو عین خیر، اور اگر ذاتی اغراض و انتفاع کے لئے ہے تو یکسر شر۔

زندگی کشت است و حاصل قوت است ۔۔۔ شرح رمز حق و باطل قوت است
صلح، شر گردد۔ چو مقصود است غیر ۔۔۔ گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند ۔۔۔ جنگ باشد قوم را نا ارجمند
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید! ۔۔۔ تیغ او، در سینۂ او، آرمید
تیغ بہر عزت دین است و بس ۔۔۔ مقصد او حفظ آئین است و بس

یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جسے نبی کریمؐ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا، جب حضورؐ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص بہادری کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ اور انتقام کے لئے لڑتا ہے ان میں سے کس کا جہاد صحیح ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ:-

وَمَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (بخاری)

جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کی بات سب سے بلند ہو رہے تو اس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے!

باب چہارم

جہاد

یونانی مفکرین کے نزدیک کائنات کا تصور سکونی تھا، اس تصورِ کائنات کا فطری نتیجہ رواقیت (Stoicism) کا وہ فلسفہ تھا جس نے ترکِ عمل اور فنائے آرزو سے شجرِ انسانیت کی ہر شاخ سے نمِ زندگی کو خشک کر دیا اور اس کے برگ و بار پر افسردگی کی برودت طاری ہوگئی۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہی فلسفہ مختلف شکلوں میں دنیائے فکر و عمل پر مستولی تھا۔ قرآن نے اس غلط نظریۂ زندگی اور غیر فطری فلسفۂ حیات کی تردید کی اور بتلایا کہ کائنات سکونی نہیں بلکہ حرکاتی ہے۔ اور اس کا ذرہ ذرہ زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل، اسی سعی و عمل اور تگ و تاز کا نام ہے جہاد، جہاد کے معنی ہیں محنت

جہاد کے معنی

اور کوشش (جد و جہد) قرآن نے اس کے مقابل قعود (بیٹھے رہنے) کا لفظ استعمال کر کے اس کے صحیح معانی کو واضح کر دیا ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ‎(۴/۹۵)

مسلمانوں میں سے جو لوگ معذور نہیں ہیں اور بیٹھے رہے ہیں (جہاد میں شریک نہیں ہوئے) تو وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں، اللہ نے مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر باعتبار درجہ کے فضیلت دی ہے (کہ ان کے اعمال دوسرے لوگوں کے اعمال سے فائق ہیں) اور (یوں تو) خدا کا وعدۂ نیک سب کے لئے ہے (کسی کا عمل نیک ضائع نہیں ہو سکتا لیکن درجہ کے اعتبار سے برابر نہیں) اور (اسی لئے) بیٹھے رہنے والوں کے مقابلہ میں جہاد کرنے والوں کو اجرِ عظیم میں بھی اللہ نے فضیلت عطا فرمائی ہے۔

لہٰذا اس کے معنی عمل کے ہوئے۔ قرآن کو شروع سے لیکر آخر تک دیکھئے ہر جگہ ایمان و عمل کی تاکید نظر آئے گی۔ ایمان سے مقصود ہے تعین مقصد۔ اور عمل سے مقصد ہے اس مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد۔ یہ ہے مومن کا جہاد جس میں چھوٹی سے چھوٹی حرکت سے لیکر بڑی سے بڑی قربانی تک، سب شامل ہے

اس راہ سعی و کاوش میں آخری مرحلہ وہ ہے جہاں انسان اپنی جان جیسی متاعِ عزیز ہتھیلی پر رکھ کر باطل کے مقابلہ میں صف آرا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قتال (جنگ) بھی جہاد کے اندر شامل ہے بلکہ یوں کہئے کہ جہاد کا نقطۂ آخریں اس سے واضح ہو گیا کہ جہاد کے معنی ہر مقام پر جنگ و قتال نہیں۔ مؤمن کی ساری زندگی جہاد ہے اور یہ جہاد خود اپنی ذات کے لئے ہے، کہ اسی سے شرفِ انسانیت کا ارتقا، اور روح کی بالیدگی ہوتی ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۹/۶)

اور جس (مومن) نے جہاد میں . . . . حصہ لیا تو حقیقت یہی ہے کہ وہ جہاد اپنے ہی نفس کے (فائدہ کے) لئے کرتا ہے بلاشبہ اللہ تو تمام دنیا والوں (کے اعمال نیک و بد) سے بے نیاز ہے

اور اسی سے اس راہ کا نشان ملتا ہے جو کاروانِ حیات کو اس کی منزلِ مقصود تک لیجاتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۲۹/۶۹)

اور وہ لوگ جو ہماری راہ (حق و صداقت) میں جہاد کرتے ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ ہم انہیں اپنی راہ (عروج و ارتقا) کی طرف رہ نمائی کر دیتے ہیں اور بلاشبہ اللہ نیک عمل کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

اسی کا نام صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے کے لئے صبح و شام دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ سورۂ نساء میں منافقین کے تذکرہ کے ضمن میں فرمایا۔

وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِن دِيَارِكُم مَّا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِّنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ۝ وَإِذًا لَّآتَيْنَاهُم مِّن لَّدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۝ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ (۴/۶۶-۶۸)

اور (دیکھو!) اگر ہم انہیں حکم دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو! (یعنی لڑائی میں لڑتے لڑتے قتل ہو جاؤ) یا حکم دیتے کہ اپنے گھروں سے (ہجرت کر کے) نکل کھڑے ہو تو! (ان کا کیا حال ہوتا؟ یہ ہوتا کہ چند آدمیوں کے سوا کوئی بھی اس کی تعمیل نہ کرتا۔ حالانکہ جس بات کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے اگر اس پر یہ عمل کرتے تو ان کے لئے بہتری تھی اور اس طرح وہ (راہِ حق میں) پوری طرح جمے بھی رہتے۔ اور (اگر یہ راہِ حق میں پوری طرح جمے رہتے تو) اس صورت میں ضروری تھا کہ (اس کے نتائج بھی ان کے حصہ میں آتے) ہم اپنی جانب سے انہیں ایسا اجر عطا فرماتے جو بہت بڑا اجر ہوتا۔ اور ایسی راہ پر لگا دیتے جو (کامیابی و سعادت کی) سیدھی راہ ہوتی۔

یہی مومن کا وسیلہ ہے

یہی خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (۵/۳۵)

اے پیروان دعوت ایمانی! (ہر حال میں اللہ کے قوانین کی حفاظت میں رہو! اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ ڈھونڈو! یعنی اس کی راہ میں جد و جہد کرو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔

اور اس کے بغیر حصول جنت ناممکن ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ۝ (۳/۱۴۱)

اے پیروان دعوت حق! کیا تم سمجھتے ہو کہ (محض ایمان کا دعوی کرکے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے (اور ایمان و عمل کی آزمائشوں سے تمہیں گذرنا نہیں پڑے گا) حالانکہ ابھی تو وہ موقعہ پیش ہی نہیں آیا کہ اللہ تمہیں آزمائشوں میں ڈال کر ظاہر کر دیتا کہ کون لوگ ہیں جو راہ حق میں پوری پوری کوشش کرنے والے ہیں، اور کتنے ہیں جو مشکلات و شدائد میں ثابت قدم رہتے ہیں۔

اس سے درجات عظیم ملتے ہیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ (۹/۲۰)

جو لوگ ایمان لائے، اور ہجرت کی، اور اللہ کی راہ (حق) میں جان و مال سے جہاد کیا تو یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بہت بڑا درجہ ہے اور وہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔

یہی لوگ خدا کی رحمتوں کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۲/۲۱۸ نیز ۱۶/۱۱۰)

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے، اور ہجرت کرکے (گھروں سے) نکل کھڑے ہوئے اور خدا کی راہ (حق و صداقت) میں جہاد کیا تو یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور بلاشبہ اللہ بخش دینے والا اور رحم کرنے والا ہے!

ل اسی لئے حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ان الجنۃ تحت الظلال السیوف یقیناً جنت تلواروں کی چھاؤں تلے ہے (بخاری کتاب الجہاد) اور ترمذی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ دو قطرے خدا کو بہت محبوب ہیں ایک آنسو کا قطرہ جو اس کے خوف میں نکلے اور دوسرا خون کا قطرہ جو اس کی راہ میں بہے۔

اور فلاح وسعادت کے مستحق۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۸۸-۸۹/۹)

لیکن (اے افراد نسل انسانی!) اللہ کے رسول نے اور انہوں نے جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (راہ حق میں) جہاد کیا (اوران کی منافقانہ چالیں کچھ بھی نہ کر سکیں) یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے نیکیاں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے (نعیم ابدی کے) ایسے باغ تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اس لئے یہ باغ کبھی خشک ہونے والے نہیں) یہ ہمیشہ ان باغوں میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی فیروزمندی ہے (جو ان کے حصہ میں آئی ہے)

مومن کی زندگی

ایک مومن کی زندگی پر غور کیجئے! وہ دنیا میں پیدا ہوتا ہے کہ خود بھی قوانین الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور ان ہی قوانین کو دنیا میں نافذ کرے۔ وہ جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اپنے آپ کو اس کے مطابق نہیں ڈھالتا، بلکہ اس ماحول کو اپنے نصب العین کے مطابق بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس تبدیلی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اسی لئے یہ "سب کچھ" (جان و مال) مقصود نہیں، مقصود قوانین الٰہیہ کی تنفیذ ہے۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار	با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں	می شود جنگ آزما، با آسماں
بر کند بنیاد موجودات را	می دہد، ترکیبِ نو، ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند	چرخِ نیلی فام را، برہم زند

می کند از قوتِ خود آشکار!
روزگارِ نو کہ باشد سازگار!

یہ انقلاب مومن زندگی کا مقصود ہے۔ اور اس کے لئے ہر جد وجہد جہاد۔ قرآن کریم اس حقیقت کو نہایت سادہ اور دل نشین انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن اپنی جان اور مال کا مالک نہیں بلکہ امین ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ

بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۹ ـ ۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں، اور ان کا مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لئے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو وہ (کسی دنیاوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمے ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرادیا) تورات، انجیل، قرآن (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو۔ پس (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا، خوشیاں مناؤ! اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے۔

یہ وہ تجارت ہے جس میں کوئی خسارہ نہیں، نقصان نہیں، فائدہ ہی فائدہ ہے ——

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۶۱ ـ ۱۰ ـ ۱۳)

اے پیروان دعوت ایمانی! کیا میں تم کو ایسی (نفع بخش) تجارت بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب (کے اندیشہ) سے بچالے، (وہ سوداگری یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسول پر یقین (ایمان) رکھو اور اللہ کی راہ (حق) میں اپنی جان اور اپنے مال کے ساتھ جہاد کرو! (یاد رکھو!) تمہارے لئے یہی بہتر ہے بشرطیکہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو؛ (اگر تم نے یہ طریق عمل اختیار کیا تو یقین رکھو!) خدا تمہاری خطائیں معاف کر دے گا۔ اور نعیم ابدی کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور ایسے نعیم ابدی کے باغوں والے مکانات میں (داخل کرے گا) جو (نہایت نفیس و عمدہ مکانات) ہیں (یاد رکھو!) یہ بہت ہی بڑی فیروزمندی ہے۔ اور (اس فیروزمندی کے علاوہ) اک دوسری (بشارت و خوشخبری بھی ہے)، جس کو تم پسند کرتے ہو (وہ کیا ہے؟ وہ ہے) خدا کی طرف سے (فوری) امداد اور قریبی فتح یابی، (چنانچہ اے پیغمبر اسلام! آپ (خدا کی ان نعمتوں کے متعلق) مومنوں کو بشارت دیدیجیے (تاکہ وہ سعی و عمل میں مصروف رہیں اور خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونے پائیں)

اعلائے کلمۃ الحق کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے اسی لئے اعلائے کلمۃ الحق مومن کی زندگی کا نصب العین ہے اسی کیلئے اسے منتخب کیا گیا ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۧ (۲۲)

اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو! اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے، پوری طرح ادا کر دو! اس نے تمہیں برگزیدگی (شرف و مجد) کے لئے چن لیا ہے۔ تمہارے لئے دین (نظام زندگی) میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔ وہی طریقہ (زندگی) تمہارا ہو، جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا۔ پچھلے وقتوں میں بھی اور اس (قرآن) میں بھی، اور یہ اس لئے کیا تاکہ رسول تمہارے لئے (حق کا) گواہ ہو اور تم تمام انسانوں کے لئے پس نماز کا نظام قائم کرو! زکوٰۃ کی ادائیگی کا سامان کرو! اللہ کا سہارا مضبوط پکڑلو! وہی تمہارا کارساز ہے، اور جس کا کارساز اللہ ہوا، تو کیا ہی اچھا کارساز ہے، اور کیا ہی اچھا مددگار!

چونکہ خدا خود حق ہے، اس لئے مومن کا جہاد جو کلمۃ الحق کی بلندی کے لئے ہے اللہ کی مرضی کے عین مطابق ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَمَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ (۶۰)

اے پیروانِ دعوت ایمانی! (چاہیئے، کہ تم اپنے اور میرے دشمنوں کو دوست نہ بنائے رکھو! (اس طرح) کہ ان سے دوستی جتلانے لگو۔ بلاشبہ یہی وہ لوگ ہیں جو تمہارے پاس آئے ہوئے دین حق (صحیح نظام زندگی) کا انکار کر چکے ہیں، اور صرف اس بنا (و قصور) پر کہ تم اپنے پروردگار (حقیقی) پر یقین (ایمان) رکھتے ہو تمہیں شہر بدر کر چکے ہیں۔ اگر تم میری راہ (حق) میں جہاد کرنے کی غرض سے (اپنے گھروں سے) نکلے ہو، اور (ساتھ ہی) میری رضامندی بھی حاصل کرنا چاہتے ہو (اور کیفیت یہ ہے کہ) تم ان لوگوں سے چپکے چپکے دوستی بھی جتلاتے ہو، حالانکہ میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم چھپا کر کرتے ہو اور جو کھلم کھلا کرتے ہو۔ اور (یاد رکھو آئندہ) جو کوئی بھی تم میں سے یہ روش اختیار کرے گا تو (جان رکھو!) وہ بلاشبہ راہ راست سے بھٹک گیا ہے!

چونکہ یہ جد و جہد اور سعی و عمل تنفیذ قوانین الٰہیہ کے لئے ہے، اس لئے یہ، بالفاظ دیگر، "خدا کی مدد کرنا" ہے سورۂ محمد کی حسب ذیل آیات پر غور کیجئے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ فرمایا۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ۬ ذٰلِكَ ؕۛ وَ لَوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّیَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَیَهْدِیْهِمْ وَ یُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ۚ وَ یُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝ (۴۷/۴-۶)

پس جب تمہارا منکرین (حق) سے مقابلہ ہو جائے تو ان کی گردنیں اڑا دو! تا آنکہ تم ان کی خوب خونریزی کر چکو تو مضبوطی کے ساتھ باندھ لو (گرفتار کر لو)، پھر یا تو (بلا معاوضہ) احساناً چھوڑ دو یا (زرِ) فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار نہ اٹھالے (یعنی سلسلۂ جنگ بند ہو جائے)، یہ (حکم جہاد اس لئے ہے کہ) اگرچہ اللہ اگر چاہتا تو خود ہی ان سے انتقام لے سکتا تھا لیکن (اس کی یہ مشیت ہوئی کہ) تم میں سے ایک دوسرے کا، ایک دوسرے کے ذریعہ امتحان کرے اور (یاد رکھو!) جو لوگ خدا کی راہ (حق و صداقت) میں مارے جاتے ہیں خدا ان کے اعمال (صالح) کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دیتا۔ اللہ انہیں منزل (مقصود) تک پہنچا دے گا، اور ان کی حالت سنوار دے گا۔ اور ان کو جنت میں داخل کرے گا! (دراں حالیکہ) انہیں جنت کی پہچان کرا دی جائیگی!

اس کے بعد ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ (۴۷/۷)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اگر تم نے اللہ (کے قیامِ دین) کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور (اس طرح مدد کرے گا کہ) تمہارے قدم (اچھی طرح) جما دے گا!

عام دنیا کے نزدیک زندگی سانس کی آمد و شد کا نام ہے، اور عمل تنفس کے بند ہو جانے کا نام موت۔ قرآن محض اس طبعی زندگی کو زندگی نہیں قرار دیتا؛ اس کے نزدیک زندگی وہ ہے جس میں انسانیت زندہ رہے۔ غور کیجئے کہ وہ جیتے، جاگتے، چلتے، پھرتے، انسانوں سے کیا کہتا ہے؟

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (۸/۲۴)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو! جب وہ پکارتا ہے، تاکہ تمہیں

(انسانیت کی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کردے، اور جان لو کہ، (بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ) اللہ (اپنے ٹھیرائے ہوئے قانون و اسباب کے ذریعہ) انسان، اور اس کے دل کے درمیان، حائل ہوجاتا ہے اور جان لو کہ (آخرکار)، اسی کے حضور جمع کئے جاؤ گے!

حیات ابدی

"زندگی کی طرف دعوت" کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس فضا کو پیدا کیا جائے جس میں تمہاری انسانیت زندہ رہ سکے، خواہ اس کے لیے زمین و آسمان کو الٹ ہی کیوں نہ دینا پڑے

مسلمانے کہ داند رمز دیں را ۔۔۔ نساید پیش غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بکام او نگردد ۔۔۔ بکام خود بگردد ایں زمیں را

اسی لئے جب وہ محض سانس لینے کا نام زندگی نہیں رکھتا، تو سانس بند ہوجانے کو موت کیسے قرار دے سکتا ہے؟ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جو اس جدوجہد میں مارا جائے اسے مردہ مت کہو! وہ زندہ ہے۔ لیکن تم جو زندگی کو محض نفس شماری تک محدود رکھتے ہو، اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۴)

اور (اے مسلمانو!) جو شخص خدا کی راہ (حق) میں (جدوجہد کرتا ہوا) مارا گیا اسے مردہ نہ کہو! بلکہ وہ تو (بہ اعتبار نتیجہ و انجام کار) زندہ ہے۔ لیکن (افسوس) تم (اس حقیقت کو) نہیں جانتے!

کہنا تو ایک طرف اپنے وہم و گمان میں بھی نہ لاؤ کہ وہ مردہ ہے!

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (۳/۱۶۸)

اور اے پیغمبر اسلام! جو لوگ اللہ کی راہ (حق) میں (جدوجہد کرتے ہوئے) قتل ہوئے ہیں ان کی نسبت ایسا خیال نہ کرنا کہ وہ مر گئے ہیں، نہیں وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے حضور اپنی روزی پا رہے ہیں۔

یہی وہ ہیں جن کی زندگی کی تمام چھوٹی چھوٹی لغزشیں، اور فروگذاشتیں، ان کے اس عظیم الشان حسن عمل کی چادر سے ڈھکی جاتی ہیں۔ اور وہ سیدھے اپنی منزل مقصود تک جا پہنچتے ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ ۖ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (۳/۱۹۴)

جب ارباب فکر و دانش ہماری پکار سن کر ایمان لے آئے اور ہمیں پکارنے لگے، تو ان کے پروردگار نے بھی ان کی دعائیں قبول کریں، (خدا نے فرمایا) بلاشبہ میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ مرد ہو،

خواہ عورت، تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو، (اور عمل کے نتائج کا قانون سب کے لئے یکساں ہے) پس دیکھو جن لوگوں نے راہ حق میں، ہجرت کی اپنے گھروں سے نکالے گئے، میری راہ میں ستائے گئے، اور پھر راہ حق میں لڑے اور قتل ہوئے تو ان کے یہ اعمال حق کبھی رائگاں جانے والے نہیں، یقینی ہے کہ میں ان کی خطائیں معاف کردوں، اور انہیں (نعیم ابدی کے) باغوں میں پہنچادوں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، اور اسی لئے ان کی شادابی، وتروتازگی کبھی متغیر ہونے والی نہیں) یہ اللہ کی طرف سے ان کے اعمال کا ثواب ہوگا۔ اور اللہ ہی ہے جس کے پاس (حسنِ عمل میں) بہتر ثواب ہے!

اور یہ متاع دنیا کی ہر شے سے بہتر ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (۳/۱۵۷)

اور دیکھو! اگر اللہ کی راہ (حق) میں تم قتل ہوگئے، یا اپنی موت مرگئے، تو اللہ کی طرف سے جو رحمت و بخشش تمہارے حصہ میں آئے گی وہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کا ذخیرہ لوگ جمع کیا کرتے ہیں۔

اور یہ بہت بڑا اجر ہے۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (۴/۷۴)

سو (دیکھو!) جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی (اللہ کے ہاتھ) فروخت کرچکے ہیں، انہیں چاہیئے کہ اللہ کی راہ (حق) میں جنگ کریں، اور جو کوئی اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے، تو خواہ وہ قتل ہوجائے، خواہ غالب آئے (ہر حال میں) ہم اسے اجر عظیم عطا کریں گے!

یہی وجہ ہے کہ اس راہ میں ہر تکلیف موجب رحمت، اور ہر صعوبت کفیل جنت ہوتی ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۹/۱۲۰)

اہل مدینہ اور اردگرد کے دیہات والوں کے شایان شان نہ تھا کہ (عزیز) اپنی جانوں کی تو اس قدر پرواہ کرتے اور رسول کی زندگی کی پرواہ ہی نہ کرتے یہ اس لئے کہ انہیں اللہ کی راہ میں جو بھی پیاس کی تکلیف اور تکان اور بھوک کی

کلفت پہنچی ہے یا وہ ایسی جگہ پاتے ہیں جہاں کفار کو جانا ناخوش آیند ہے اور نہ ہی دشمنوں سے وہ کچھ حاصل کرتے ہیں تو یہ سب کچھ ان کے نیک اعمال میں شمار ہوتا ہے۔ بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا اور کوئی عمل مجاہد کے عمل کے برابر نہیں ہو سکتا۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (۹/۱۹)

کیا تم لوگوں نے یوں ٹھہرا رکھا ہے کہ حاجیوں کے لئے سبیل لگا دینی، اور مسجد حرام کو آباد رکھنا، اسی درجہ کا کام ہے، جیسا اس شخص کا کام، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا۔ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں۔ اور اللہ (کا قانون ہے کہ وہ) ظلم کرنے والوں پر (کامیابی کی راہ) نہیں کھولتا۔

مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مجاہدین کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑنے والی گرد و غبار کی قسم کھائی ہے کسی خانقاہ نشین کی تسبیح و مصلیٰ کی قسم نہیں کھائی، کہ قیام عدل و انصاف کا انحصار اول الذکر کے خون گرم پر ہے ثانی الذکر کے آب سرد۔ اور آہ خشک پر نہیں۔ دیکھئے خدائے قوی و عزیز کس وجد و مسرت سے ان اشہبان برق تاب کا ذکر کرتا ہے۔

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُورِيَاتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا ۝ فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا ۝ (۱۰۰/۱-۵)

اور قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں پھر پتھر پر ٹاپ مار کر آگ اڑاتے ہیں، پھر صبح کے وقت تاخت و تاراج کرتے ہیں، پھر اس وقت غبار اڑاتے ہیں، اور (اسی حالت میں دشمنوں کی جمعیت میں جا گھستے ہیں (یہ وہ گھوڑے ہیں جو جہاد میں کام آتے ہیں)۔

اس لئے قرآن کے نزدیک ایمان کی کسوٹی میدان جہاد ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ وَإِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ (۴۹/۱۴-۱۵)

(یہ) بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو اے پیغمبر اسلام! آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ البتہ یوں کہہ سکتے ہو کہ (سرکشی چھوڑ کر) ہم نے (نظام اسلامی کی) اطاعت قبول کر لی۔ ایمان اس وقت تک تمہارے قلوب (کی گہرائیوں) میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (یہاں اس طرح ہو سکتا ہے) اگر تم (سچائی کے ساتھ)

اللہ اور اس کے رسول (کے احکام) کی اطاعت کرنے لگو۔ تو (یقین رکھو!) اللہ اعمال میں سے ذرا بھی کم نہ کرے گا۔ (کیونکہ بلاشبہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ سچے مومن تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یقین) لائے پھر (عمر بھر) کبھی شک میں نہیں پڑتے۔ اور مال و جان کے ساتھ خدا کی راہ (حق و صداقت) میں جہاد کیا۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے ایمان و یقین میں) سچے ہیں۔

اس لئے اگر دنیا کی کوئی شے بھی جہاد سے زیادہ عزیز ہو گی تو ایمان گیا۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِينَ ۝ (۹: ۲۴)

اے پیغمبر (مسلمانوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے۔ تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو، تمہارے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں، یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو (کلمۂ حق تمہارا محتاج نہیں) انتظار کرو کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ (کا مقررہ قانون ہے کہ وہ) فاسقوں پر (کامیابی و سعادت کی) راہ نہیں کھولتا!

⁂

زوال و عروج امم کا محکم اصول

قوموں کے عروج و زوال کی داستان عبرت انگیز پر نگاہ ڈالیئے۔ ایک اصول ہر جگہ، اور ہر زمانہ میں کارفرما نظر آئے گا۔ جب تک کسی قوم میں جہد للبقا کا جذبہ اور کارگہ حیات میں آگے بڑھنے کا ولولہ موجود رہا وہ قوم زندہ اور برقرار رہی، لیکن جونہی اس کے قوائے فکر و عمل مضمحل و مختل ہو گئے اس کی زندگی کی ہر شاخ پر افسردگی چھا گئی، اور اس کے بعد وہ یوں صفحہ ہستی سے مٹ گئی كَأَنْ لَّمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا۔ سطح بین نگاہیں قوموں کی ہلاکت و بربادی کے لئے خارجی اسباب و علل کی تلاش کرتی ہیں، لیکن جو نگاہ اس سطح سے نیچے اتر کر تہ تک پہنچتی ہے، وہ دیکھتی ہے کہ یہ خارجی اسباب و علل درحقیقت چیونٹیوں کے اس بے پناہ لشکر کی طرح ہوتے ہیں جو کیڑے کی لاش کو چمٹ کر اسے ادھر سے ادھر لئے پھرتی ہیں۔ اس قوم کی موت کا حقیقی سبب، خود اس کی داخلی قوتوں کا اضمحلال و اختلال ہوتا ہے۔

مگر کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن کریم استبدال و استخلاف کے اس غیر مبدل قانون کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اس ملت شریفہ کو جسے نوع انسانی کی پاسبانی کے لئے منتخب کیا گیا تھا کھلے کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ یاد رکھو! تمہاری بقا کا راز جہاد میں ہے۔ اگر اس سے گریز کروگے تو تمہاری جگہ دوسری قومیں لے لیں گی، اور تمہاری داستانیں ماضی کے افسانے بن کر رہ جائیں گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۹-۳۸،۳۹)

اے پیروان دعوتِ ایمانی! (آخر) تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں۔ کیا آخرت چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی ہی پر ریجھ گئے ہو؟ (اگر ایسا ہی ہے، تو یاد رکھو!) دنیا کی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے، مگر بہت تھوڑی! اگر قدم نہ اٹھاؤگے تو یاد رکھو، وہ تمہیں ایک ایسے عذاب میں ڈالے گا جو دردناک ہوگا، اور تمہاری جگہ کسی دوسرے گروہ کو لا کھڑا کرے گا۔ اور تم (دفاع سے غافل ہو کر، اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکوگے۔ اپنا ہی نقصان کروگے)، اور اللہ تو ہر بات پر قادر ہے۔

یہ جو تمہیں وقتاً فوقتاً باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے تو اسی میں تمہاری زندگی کا راز ہے اس لئے کہ اس سے تمہاری قوتوں کا محاسبہ (Stock Taking) ہو جاتا ہے اور تم بچشم خویش اندازہ کر سکتے ہو کہ تم میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں آزمایش کہتے ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ ۝ (۴۷-۳۱)

اور اے پیروان دعوت ایمانی! ہم (عنقریب، تمہیں (ایک کڑی) آزمائش (جہد و عمل) میں ڈالیں گے (تاکہ) ہم (اس کے بعد) تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان جائیں (کہ کون اس مرحلۂ آزمایش پر پورا اترتا ہے) اور (نیز) تمہارے دعوی کو آزمایش میں ڈالیں گے (کہ کہیں یہ خبریں جھوٹے دعوی تو نہیں)۔

یہ آزمائشیں (یعنی محاسبۂ قوت و استعداد کی کسوٹی)، مختلف شکلوں میں ہوگی۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۝ (۲/۱۵۵-۵۷)

ہم عنقریب تمہاری آزمایش کریں گے۔ خوف، اور بھوک، اور نقصان جان اور اموال اور ثمرات (کی آزمائش) سے، پس بشارت ہے ان ثابت قدم (مجاہدین) کے لئے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو (وہ اس کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے سلام و رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو (درحقیقت) ہدایت یافتہ ہیں۔

اگر تم ان میں پورے نہ اترے، تو ایسے فتنوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ جو پوری کی پوری قوم کو گھیر لیں گے۔ اس لئے کہ امتوں کی حیات اور موت، اجتماعی ہوا کرتی ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (۷/۳۴)

اور (دیکھو!) ہر امت (کی رفتار و تنزل) کے لئے ایک ٹھہرایا ہوا وقت ہے سو جب کسی امت کا ٹھہرایا ہوا وقت آگیا تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے، نہ ایک گھڑی آگے۔ (جو کچھ اس کے لئے ہونا ہے۔ ہو گذرتا ہے) اور قوموں کی قومیں ذلت و رسوائی کے جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہیں۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَھَا ۭ حَتّٰٓی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْھَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىھُمْ لِاُوْلٰىھُمْ رَبَّنَا ھٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِھِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۳۸)

اس پر حکم الٰہی ہوگا۔ انسانوں اور جنوں کی امتوں کے ساتھ جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں۔ تم بھی آتش دوزخ میں داخل ہو جاؤ! جب کبھی ایسا ہوگا کہ ایک امت دوزخ میں داخل ہوگی تو وہ اپنی طرح کی دوسری امت پر لعنت بھیجے گی۔ پھر جب سب اکٹھی ہو جائیں گی تو پچھلی امت پہلی امت کے متعلق کہے گی اے ہمارے پروردگار یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا (یعنی جن کی تقلید میں ہم گمراہ ہوئے) تو انہیں آتش عذاب کا دوگنا عذاب دیجیو! خدا فرمائے گا تم میں سے ہر ایک کے لئے دوگنا عذاب ہے!

جب یہی کچھ امم سابقہ سے ہوتا آیا ہے تو تم اس سنۃ اللہ (خدا کے غیر مبدل قانون) سے کس طرح مستثنیٰ رکھے جاؤ گے؟ تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا!

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُوْا

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۹: ۱۶)

اے پیروانِ دعوتِ اسلامی! کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم اتنے ہی میں چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی تو اللہ نے ان لوگوں کو پوری طرح آزمائش میں ڈالا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہے۔ اور اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کو چھوڑ کر کسی کو اپنا پوشیدہ دوست نہیں بنایا ہے (یاد رکھو) جیسے کچھ تمہارے اعمال ہیں، خدا ان سب کی خبر رکھنے والا ہے۔

فقط اتنا کہہ دینے سے کہ ہم مسلمان ہیں۔ تم اس قانونِ سرمدی سے بچ نہیں سکتے۔ تمہارے دعویٰ ایمان کا صدق و کذب پرکھا جائے گا اور اس کی پرکھ اعمال کی ترازو سے ہوگی نہ کہ لفظی شاعری سے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۲۹: ۲-۳)

اے افرادِ نسلِ انسانی! کیا لوگ یہ گمان کئے ہوئے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر کہ ہم تو ایمان لے آئے (بلا ثبوتِ عمل) چھوڑ دیئے جائیں گے (اور ان سے کسی قسم کی پرسشِ اعمال نہ ہوگی) اور وہ کسی طرح کی آزمائش میں مبتلا نہیں کئے جائیں گے۔ اور (یاد رکھو!) فی الواقعہ ہم ان سے پہلی امتوں کو بھی (ان کی سزائے اعمال کی وجہ سے) فتنوں میں ڈال چکے ہیں تاکہ اللہ انہیں بتلا دے کہ کون (اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں۔

عجمی اثرات سے بہانہ سازیاں

اور اس آزمائش کے لئے جہاد کے میدان سے بڑھ کر صاف اور کھری ہوئی کسوٹی اور کونسی ہو سکتی ہے؟ سورۂ فتح کے دوسرے رکوع کو دیکھئے کس قدر کھلے ہوئے الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، غور سے دیکھئے کس طرح مختلف انداز کی بہانہ سازیوں اور حیلہ جوئیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان آیات میں تخاطب اگرچہ اس زمانہ کے بہانہ سازوں سے کیا گیا ہے لیکن مفہوم کی عمومیت تمام آنے والے بہانہ سازوں، اور حیلہ کاروں کو محیط ہے، یہ بہانہ سازیاں اور عقلی حیلہ جوئی کی دسیسہ کاریاں اس دور میں شروع ہوئیں جب اس زندہ اور زندگی بخش پیغام خداوندی کی جگہ، عجمی نکات آفرینیوں، اور موشگافیوں نے لے لی اور قوم کے قوائے عملیہ کو یونانی فلسفہ، اور ایرانی تصوف، کی برفانی سلوں نے شل کر دیا۔

تصوف عجم

کبھی کہا گیا کہ سب سے بڑا جہاد، نفس کے خلاف جہاد ہے، اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ خانقاہوں کے تنگ و تاریک گوشوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کی ضربیں لگائی جائیں۔ اور سِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ کے وظیفے پڑھے جائیں! حالانکہ جس جگہ (جہادِ کبیر) کا ذکر کیا ہے وہیں اس کی تصریح بھی کر دی ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ سورہ فرقان میں ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ (۲۵: ۵۲)

اے پیغمبر اسلام! (آپ کسی حالت میں بھی) ان منکرین (حق) کی اطاعت (وہ محکومیت) قبول نہ فرمائیے اور ان سے جہاد کبیر (یعنی سخت جنگ) کرتے رہیئے (تا آنکہ یا تو یہ سب کے سب مارے جائیں یا آپکی اطاعت قبول کرلیں)

دیکھئے اس آیت مقدسہ میں فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ پکار پکار کر کس طرح اس "جہاد کبیر" کی تفسیر کر رہا ہے یعنی باطل کی ان قوتوں کے خلاف قرآنی احکام کے مطابق جہاد کرو (جَاهِدْهُمْ بِهِ) تاکہ ان کے طاغوتی نظام کی جگہ اطاعت فقط نظام خداوندی کی باقی رہ جائے۔

یا سہل انگار ارباب شریعت کی یہ تقسیم عمل کہ جنگ آزمائی جیوش و عساکر (کشتریوں) کے لئے ہی

ارباب شریعت کی تقسیم

اور ہمارے ذمہ تفقہ فی الدین کا فریضہ ہے، جسے ہم (برہمنوں کی طرح) مساجد کے ممبروں، اور فتاویٰ و ارشاد کی مسندوں پر بیٹھ کر سر انجام دیتے ہیں اور اس کی سند قرآن کی آیت کہ

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (9/122)

اور (دیکھو!) یہ ممکن نہ تھا کہ سب کے سب مسلمان (اپنے گھروں سے) نکل کھڑے ہوں (اور تعلیم دین کے مرکز میں آکر علم و تربیت حاصل کریں) پس کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم حاصل کرتی، اور جب (تعلیم و تربیت کے بعد) اپنے گھروں میں واپس جاتی اور لوگوں کو (جہل و غفلت کے نتائج سے) ہوشیار کرتی تاکہ (برائیوں سے) بچیں۔

آیت کا مفہوم ترجمہ سے واضح ہے۔ تفقہ فی الدین، یعنی احکام خداوندی کی تفہیم کی بہترین جگہ مرکز حکومت ہے اس غرض کے لئے یہ ضروری نہیں کہ حکومت کی تمام آبادیاں امڈ کر مرکز کی طرف آجائیں اور احکام دین (حکومت خداوندی) سیکھیں۔ اس کے لئے سہل اور ممکن العمل طریق یہ ہے کہ ہر مقام کے چند نمائندے مرکز میں آئیں اور احکام سیکھ کر اپنے اپنے مقام کی طرف لوٹ جائیں اور وہاں جاکر دوسروں تک ان احکام کو پہنچائیں اور ان کی غایت کو ان پر واضح کریں۔ اس طرح سے یہ لوگ اور وہ جو مرکز تک نہیں آسکتے تفقہ فی الدین میں

---

[1] یاد رکھئے قرآن کی رو سے کامل اطاعت ہی نہیں بلکہ بعض امور میں بھی کفار کی اطاعت ارتداد و کفر ہے (دیکھئے 47/25-26) اس لئے کہ نظام خداوندی لاشریک ہے اور کسی اور نظام سے امتزاج کو تلبیس حق و باطل قرار دیتا ہے ایسا کرنے والا دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل و خوار ہوتا ہے (دیکھئے 2/85)

برابر ہو جائیں گے۔ اسی آیت کا ایک دوسرا مفہوم وہ ہے جس کی طرف نفس کا لفظ اشارہ کرتا ہے۔ اسی سورہ (توبہ) میں تنفیر کا لفظ جنگ کی خاطر نکلنے کے لئے استعمال ہوا ہے (دیکھئے اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا) اس رعایت سے اس آیۂ مقدسہ کے معنی یہ ہوں گے کہ جہاد کے وقت تمام کی تمام آبادی کا فوج میں شامل ہو جانا ضروری نہیں۔ جتنی ضرورت ہوگی اتنے ہی لوگ فوج میں شامل کئے جائیں گے۔ میدان جہاد تفقہ فی الدین کا بہترین مقام ہوتا ہے۔ یہاں یہ لوگ دشمن کے مقابلہ میں صف آرا بھی ہوں گے۔ اور دین کی غرض وغایت بھی اپنے سامنے مشہود پائیں گے۔ یہ لوگ جب واپس جائیں گے تو اپنی دوسری جماعت سے یہ تمام کیفیات بیان کریں گے۔ اس طرح سے یہ تعلیم عام ہو جائے گی۔

بہرحال آیت کا مفہوم اول الذکر ہو یا ثانی الذکر اس سے برہمنیت اور کشتری (یعنی حربی جماعت اور مولویت کی جماعت) کی تفریق کا کہیں جواز نہیں نکلتا۔ اسلام اس قسم کی تفریق وتمیز سکھانے کے لئے نہیں آیا۔ اس نظام میں ہر مومن سپاہی اور فقیہ ہو سکتا ہے اسلام کے عہد اول میں اس قسم کی کوئی تقسیم موجود نہ تھی۔ وہاں "دینی مسائل" سکھانے والی کوئی الگ جماعت نہ تھی۔ یہ جماعت اس وقت پیدا ہوئی جب دین مذہب سے بدل گیا اور "احکام" کی جگہ "مسائل" نے لے لی۔ اسلامی نظام زندگی میں احکام حکومت ہی دینی مسائل ہوتے ہیں یہ ہے قرآن کی رو سے جہاد کا مفہوم اور اسی میں راز حیات پوشیدہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۹/۱۲۳)

مسلمانو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس پھیلے ہوئے ہیں اور چاہیئے کہ وہ (جنگ) میں تمہاری سختی محسوس کریں، (کہ بغیر اس کے جنگ جنگ نہیں) اور دیکھو اللہ ان کا ساتھی ہے جو (ہر حال میں) متقی ہوتے ہیں۔

آئندہ عنوان میں وہ تفاصیل آپ کے سامنے آئیں گی جن میں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کے ان احکام جہاد وقتال کو نبی اکرمؐ کس طرح عملی شکل میں لائے۔

غلامی

انسانی تاریخ کیا ہے؟ صید و صیاد کی ایک خونچکاں داستان! یوں تو اس داستان کی ہر کڑی زہرہ گداز و الم انگیز ہے، لیکن اس کا سب سے زیادہ المیہ ٹکڑا وہ ہے جسے غلامی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غلامی یعنی انسانیت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی ملکیت تصور کر لینا۔ اس سے بڑھ کر وجہ ننگ انسانیت اور کونسی لعنت ہو سکتی ہے؟ ہم نے لکھا ہے کہ انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی ملکیت میں رکھنا غلامی ہے لیکن اس سے بھی غلامی کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی۔ آپ نے کبھی یہ نہ دیکھا ہوگا کہ بھیڑ بکریوں کا مالک انہیں خونخوار بھیڑیوں کے آگے ڈال دے۔ لیکن یہ تماشہ آپ کو انسانوں کی دنیا ہی میں نظر آئے گا کہ روما کے ایمپی تھیٹروں میں بھوکے شیروں کو کھلا چھوڑ کر غلاموں کو اندر دھکیل دیا جاتا تھا، اور سبعیت و درندگی کا یہ انسانیت سوز منظر ان غلاموں کے آقاؤں اور دوسرے تماشائیوں کے لئے تفریح کا ذریعہ بنا کرتا تھا۔

اسلام آیا تو اس نے دنیا کے ہر گوشے میں غلاموں کو نظام معاشرت کا ایک اہم جزو دیکھا۔ یہ انسانی مساوات کا پیغامبر اس انسانی ذلت کو کس طرح باقی رہنے دے سکتا تھا؟ اس نے مستبد انسانوں کو للکارا اور کہا ذرا سوچو تو سہی کہ انسان کا دوسرے انسانوں کو اپنی ملکیت سمجھ لینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ تمام انسان انسان ہونے کی جہت سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ انسانی شرف و تکریم کے خلاف ہے کہ انسان کو جنس یا مویشی تصور کر لیا جائے آزادی انسان کا شرف اولین اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسانیت کی دنیا میں غلامی باقی نہیں رہ سکتی۔

جنگ کے قیدی

جو لوگ لڑائیوں میں غلام ہو کر آتے تھے انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد ان کی اولاد پیدائشی غلام تصور ہوتی تھی۔ قرآن نے غلامی کے اس سرچشمہ کو بند کر دیا۔ اس نے کہا کہ کوئی جنگی قیدی غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ انہیں رہا کیا جائے گا زر فدیہ لے کر یا احسانا جیسا بھی تقاضائے وقت ہو۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا
ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ (۴/۴۷)

(اے پیروان دعوتِ ایمانی!) جب تم (میدان جنگ میں) ان لوگوں کے بالمقابل آؤ، جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو (چاہیئے!) کہ تم اُن کی گردنیں مار دو! تا آنکہ انہیں پوری پوری شکست دیدو (یعنی ان کی قوت کو جڑ سے اکھیڑ ڈالو!) پھر ان کو مضبوطی سے باندھ لو! (یعنی گرفتار کر لو!) اس کے بعد یا تو پھر زر فدیہ لے کر یا ان پر احسان کر کے (یعنی جیسا بھی وقت کا تقاضا ہو) چھوڑ دو۔ تا آنکہ جنگ اپنے ہتھیاروں کو رکھدے (یعنی جنگ بند ہو جائے) اس بات کو (اچھی طرح یاد رکھو!) اور اگر خدا چاہتا کہ بغیر تمہارے واسطے کے وہ خود ہی کفار کو ان کے کیئے کی سزا دیتا) تو وہ یقیناً ان سے خود ہی انتقام لے لیتا (مگر اس نے ایسا نہیں چاہا) بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تم میں سے بعض لوگوں کے ہاتھوں بعض لوگوں کو آزمائش (وابتلا) میں ڈالے۔ اور (یاد رکھو!) جو لوگ اللہ کے (دین کے) راستہ میں قتل کر دیئے گئے ہیں۔ خدا ہرگز ان کے اعمال کو بے نتیجہ نہیں ہونے دیگا۔

اور جب تک وہ رہا نہ ہوں وہ ریاست کے مہمان (STATE GUESTS) ہوں گے۔ جب سرچشمہ اس طرح بند کر دیا تو اس ندی کو خود بخود خشک ہو جانا تھا۔ لیکن اس کے لئے خشک ہونے میں وقت ضرور لگنا تھا۔ اس لئے جو پانی اس میں پہلے سے موجود تھا اس کی نکاس کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیئے تھی۔ جنگی قیدیوں کے متعلق مندرجہ بالا حکم فتح مکہ کے زمانہ میں نازل ہوا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اس سے پہلے بھی کسی جنگ میں قیدیوں کو غلام نہیں بنایا، لیکن اس زمانہ میں عربوں کے ہاں عام طور پر غلام موجود تھے۔ باہر کا کام کاج کرنے کے لئے غلام اور گھروں کے اندر لونڈیاں شریک بستر۔ یہ غلام اور لونڈیاں ان کے معاشی و معاشرتی نظام کا جزو بن چکے تھے۔

پہلے کے غلام

ان سب کو یکدم الگ کر دینے سے اس نظام میں خلفشار (اختلال) واقع ہو جاتا۔ مسلمانوں کی خود اپنی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ اس اختلال کا خاطر خواہ انتظام کر سکتے۔ اس قسم کا خلفشار نہ صرف آقاؤں کے لئے وجہ گراں باری ہو جاتا، بلکہ خود آزاد شدہ غلاموں اور لونڈیوں کے لئے بھی مصیبت کا باعث بن جاتا۔ اور پورے کے پورے نظام مدنیت کے لئے مشکلات کا موجب اور مفسدات کا سرچشمہ ہو جاتا اس لئے تقاضائے مصلحت یہی تھا کہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو ایک لخت الگ نہ کر دیا جائے بلکہ یہ تبدیلی بتدریج پیدا کی جائے۔ تاکہ یہ لوگ آہستہ آہستہ غلامی کی حالت سے نکل کر آزادانہ نظام میں کھپتے چلے جائیں۔ قرآن کریم نے ان سابقہ غلاموں کو (یعنی جو پہلے سے موجود تھے) مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (جو تمہارے قبضہ و تصرف میں ہیں) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے غلاموں کے متعلق تمام احکام ان ہی کی بابت ہیں۔ جب ان احکام کی رو سے غلاموں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو غلامی کا وجود از خود مٹ گیا۔ اس لئے کہ نئے غلام بنائے نہیں جا سکتے تھے اور جو موجود تھے مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وہ اس طرح رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ میں ماضی کا صیغہ ہے۔

اب دیکھئے قرآن کریم نے اُس وقت کے موجود غلاموں (مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) کی اصلاح اور آزادی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔

تدابیر سب سے پہلے اس نے لوگوں کو ترغیب و تحریص دلائی کہ وہ غلاموں کو آزاد کرتے رہیں۔ اس کے لئے اُس نے "تحریر رقبۃ" (غلاموں کو آزاد کرنے کو) مختلف خطاؤں اور لغزشوں کا کفارہ قرار دیا۔ مثلاً

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (۲۲)

اور (دیکھو) کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے۔ مگر یہ کہ غلطی سے (اور شبہ میں) اس کے ہاتھ سے کوئی قتل ہو جائے۔ اور جس کسی نے ایک مسلمان کو غلطی سے (اور شبہ میں) قتل کر دیا ہو، تو چاہیئے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دے۔ اگر مقتول کے وارث خون بہا معاف کر دیں تو کر دے سکتے ہیں۔ اور اگر مقتول اس قوم میں سے ہو جو تمہاری دشمن ہے (یعنی تم سے لڑ رہی ہے) تو چاہیئے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کیا جائے (خون بہا کا دلانا ضروری نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے وارثوں اور ساتھیوں سے مسلمانوں کی جنگ ہے۔) اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدۂ صلح ہے (یعنی معاہد ہو) تو چاہیئے کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو خون بہا بھی دے اور ایک مسلمان غلام بھی آزاد کرے۔ اور جو کوئی غلام نہ پائے (یعنی اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو) تو اُسے چاہیئے کہ لگاتار دو مہینے روزے رکھے۔ اس لئے کہ اللہ کی طرف سے یہ (اس کے گناہ کی) توبہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت رکھنے والا ہے۔

بھول چوک سے لغو قسموں کا کفارہ۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ

لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۵/۸۹)

تمہاری قسموں میں سے جو قسمیں لغو (بے معنی) ہوں۔ ان پر خدا تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔ ان پر کرے گا جنہیں تم نے سمجھ بوجھ کر ٹھیرایا ہو تو (اگر کوئی قسم توڑنی پڑے تو) اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ درمیانی درجہ کا کھانا جیسا تم اپنے بیوی بچوں کو کھلایا کرتے ہو؟ یا (دس مسکینوں کے کھانے کی جگہ) کپڑا پہنا دینا، یا ایک غلام آزاد کر دینا اور اگر (یہ سب کچھ) میسر نہ آسکے تو پھر تین دن تک (پے در پے) روزہ رکھنا چاہیئے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ (سمجھ بوجھ کر) قسم کھا بیٹھو۔ اور چاہیئے کہ اپنی قسموں کی نگہداشت کرو (کہ کھا کر توڑنی نہ پڑیں) اللہ اسی طرح اپنی آیتیں تم پر واضح کر دیتا ہے تاکہ شکر گزار ہو۔

ظہار (غصے کی حالت میں بیوی کو ماں کہدینے کی لغویت کا کفارہ)

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (۵۸/۳)

اور جنہوں نے ظہار (یعنی غصہ کی حالت میں بیویوں کے لئے "ماں" جیسے الفاظ کو استعمال کیا) (اور) پھر کئے ہوئے قول سے پھر گئے (یعنی اس سے رجوع کر لیا) تو (چاہیئے کہ) عورتوں کو چھونے سے پہلے پہلے غلام آزاد کر دیا جائے۔ یہ بات وہ ہے جس کی تمہیں نصیحت کی جاتی ہے۔ اور اللہ ان (تمام) باتوں کو خوب طرح جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

یہ تاوان انہیں کس قدر گراں پڑتا تھا اس کا اندازہ ہم آج نہیں لگا سکتے۔ اس لئے کہ ہم اس کا احساس ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے نزدیک ایک غلام کی قیمت کیا تھی؟ یوں بھی انسانی خون بڑا لذیذ ہوتا ہے اور جب یہ ایک مرتبہ منہ کو لگ جائے تو پھر چھڑائے نہیں چھوٹتا۔ اس لئے قرآن کریم نے تحریر رقبہ کو پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے سے تعبیر کیا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ (۹۰/۱۱-۱۳)

(مگر ان حقائق کے باوجود) انسان پہاڑ کی چڑھائی پر چڑھنے کے لئے یعنی دشوار اور گراں کاموں پر عمل کرنے کے لئے) (اے پیغمبر اسلام) تمہیں معلوم بھی ہے کہ وہ پہاڑ کی چڑھائی کون سی ہے (وہ چڑھائی غلاموں کی) گردنوں کو (طوق غلامی سے) آزاد کرانا ہے۔

پھر دوسری صورت یہ پیدا کی گئی کہ غلاموں کو یہ حق دیدیا گیا کہ وہ جس وقت چاہیں اپنے مالکوں سے زر معاوضہ طے کر لیں۔ اس طے شدہ رقم کو وہ اپنی کمائی سے جمع کریں یا مخیر لوگوں سے بطور قرض یا احسانا لیکر مالک کو ادا کر دیں اور اس طرح آزاد ہو جائیں۔ اسے مکاتبت کہتے ہیں۔ خود مالک سے بھی کہا گیا

مکاتبت

کہ وہ ان کے زرِ مکاتبت میں چندہ دے!

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا ۖ وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ ۚ وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَن يُكْرِههُّنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِن بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۴/۳۳)

اور ان لوگوں کو ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیئے جو (بوجہ عسرت و افلاس نکاح کی مقدرت نہیں رکھتے تا آنکہ اللہ انہیں اپنے فضل و کرم سے غنی کر دے (یعنی نکاح کرنے کے قابل ہو جائیں) اور جو لوگ تمہارے مملوکوں میں سے مکاتبت کا معاملہ کرنے کے خواہشمند ہوں تو چاہیئے کہ اگر ان میں بھلائی کے آثار پاؤ تو اُن سے (معاملہ) مکاتبت کر لو۔ اور اس مال میں سے جو تم کو اللہ نے دے رکھا ہے ان کو بھی (بطور امداد و اعانت) کچھ دیدو! (تاکہ وہ جلد سے جلد آزاد ہو سکیں) اور چاہیئے کہ اپنی لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو (دراں حالیکہ وہ پاکدامنی سے رہنا چاہیں) تم کو ایسا کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں، بجز اس کے کہ دنیاوی زندگی کا معمولی سا فائدہ (یعنی دولت) تم حاصل کر لو۔ اور جو شخص ان لڑکیوں کو (ایسا کرنے پر) مجبور کرے گا تو (یاد رکھو!) بلاشبہ اللہ ان لونڈیوں کے مجبور کئے جانے پر بھی (ان کے لئے) بخشنے والا مہربان ہے۔

پھر یہ کہا گیا کہ ان غلاموں، اور لونڈیوں کی شادیاں کر دی جائیں، تاکہ یہ اپنی آزادانہ عائلی زندگی بسر کر سکیں اور اس طرح ملت کے اجزائے صالحہ بنتے چلے جائیں۔

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۲۴/۳۲)

اور تم میں سے جو غیر شادی شدہ ہیں (چاہیئے کہ) ان کا نکاح کر دو! اور (اسی طرح) جو تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے نکاح کے لائق ہوں ان کا بھی نکاح کر دیا کرو! اگر (بالفرض) وہ مفلس ہوں (اور اس قابل نہ سمجھے جائیں کہ وہ ازدواجی زندگی کے اخراجات کے کفیل ہو سکیں گے اور اس کے لئے تم ان کی شادیاں کرتے ہوئے ہچکچاؤ تو یاد رکھو تمہیں اس اندیشہ و فکر کی ضرورت نہیں (یقیناً) اللہ انہیں اپنے فضل و کرم سے غنی (صاحبِ استطاعت) بنا دے گا۔ اور اللہ (انتہائی) وسعت والا اور (تمام چیزوں کا) جاننے والا ہے!

یہی نہیں کہ لونڈیوں کی شادی غلاموں سے ہو جائے۔ بلکہ دوسرے لوگ بھی ان سے شادی کریں۔

وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم

مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِىَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۠ (۴/۲۵)

اور تم میں سے جو کوئی اس کا مقدور نہ رکھتا ہو کہ مسلمان پاکباز بیبیوں سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو (لڑائی کے قیدیوں میں سے) تمہارے قبضہ میں آئی تھیں اور مومن ہیں، اور (اس بات میں کوئی ذلت نہ سمجھو کہ تم نے ایسی عورت سے نکاح کر لیا جو لڑائی میں قید ہو کر آئی تھی اور لونڈی بنائی گئی تھی بڑی چیز ایمان ہے اور) اللہ تمہارے ایمانوں کا حال بہتر جاننے والا ہے (ہو سکتا ہے کہ ایک لونڈی ایمان کے لحاظ سے بہتر درجہ رکھتی ہو اور ایک شریف زادی ایمانی خصائل سے محروم ہو) اور تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو (یعنی انسان ہونے کے لحاظ سے سب مساوی درجہ رکھتے ہو) پس ایسی عورتوں کو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے (بلا تامل) نکاح میں لاؤ اور دستور کے مطابق اُن کا مہر ان کے حوالہ کر دو البتہ یاد رہے کہ وہ ازدواجی زندگی کے) قید و بند میں رہنے والی ہوں، بدکار عورتیں نہ ہوں اور نہ ایسی ہوں کہ چوری چھپے بدچلنی کرتی رہتی ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ قید نکاح میں آنے کے بعد، ان میں سے کوئی عورت، بدچلنی کی مرتکب ہو تو اس کے لئے اس سزا سے آدھی سزا ہوگی جو (آزاد) بیبیوں کے لئے ہے۔ یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں اندیشہ ہو کہ نکاح نہ کئے وہ بدی اور برائی میں پڑ جائیں گے۔ اور اگر تم صبر کرو (اور بہتر وقت و حالت کا انتظار کر سکو) تو یہ تمہارے لئے کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ (انسانی کمزوریوں کو) بخشنے والا، اور اپنے تمام احکام میں رحمت رکھنے والا ہے!

حسن سلوک

اور جب تک یہ لوگ ان کے گھروں میں رہیں ان سے نہایت عمدہ سلوک کیا جائے ایسا ہی حسن سلوک جیسا اپنے ماں، باپ، خویش و اقارب سے کیا جاتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ (۴/۳۶)

اور (دیکھو!) اللہ کی اطاعت و محکومیت (عبودیت) اختیار کرو۔ اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک

نہ ٹھہراؤ! اور چاہیئے کہ ماں باپ کے ساتھ قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں مسکینوں کے ساتھ پڑوسیوں کے ساتھ۔ خواہ قرابت دار پڑوسی ہوں یا اجنبی ہوں۔ نیز پاس کے اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اور ان لوگوں کے ساتھ جو مسافر ہوں۔ یا لونڈی غلام ہونے کی وجہ سے) تمہارے قبضہ میں ہوں احسان و سلوک کے ساتھ پیش آؤ! اللہ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو اترانے والے اور ڈینگیں مارنے والے ہیں۔

یہ گھروں میں اس طرح رہیں سہیں جس طرح دیگر افراد خاندان۔

وَقُل لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۲۴ نور ۳۱)

اور (اے پیغمبر اسلام!) اسی طرح مومن عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مواقع کو ظاہر نہ ہونے دیں، سوائے ان مواقع کے جو کام کاج کے وقت عادۃً کھل جایا کرتے ہیں (یعنی ان کو چھپانے کی ضرورت نہیں) اور چاہیئے کہ اپنے دوپٹوں کو اپنے سینوں پر ڈالے رکھیں اور اپنی زینت گاہوں کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے محارم (یعنی باپ پر یا اپنے شوہروں کے باپ پر، یا بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر، یا اپنے گھر کی عورتوں پر، یا اپنی لونڈیوں پر یا ان مردوں پر، جو بطور ملازم گھروں میں (کھانا وغیرہ پکاتے ہوں)، کہ ان کو (عورتوں کی طرف) اصلاً توجہ نہ ہو یا ایسے بچوں پر جو عورتوں کی پردہ کی باتوں سے ہنوز ناواقف ہیں۔ اور اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے۔ اور مسلمانو تم سب (جن احکام کی اطاعت میں تم سے کوتاہی ہوئی ہو ان سے) اللہ کی طرف توبہ کرو! تاکہ تم فلاح یاب ہو جاؤ!

جو احکام ان پر عائد ہوں وہی ان پر نافذ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ‏(۲۴/۵۸)

اور اے پیروان دعوتِ ایمانی! تمہیں اور تمہارے ان مملوکوں کو (آمد و رفت کے وقت) جو تم میں (تا ہنوز) حد بلوغ کو نہیں پہنچے۔ ان کو تین وقتوں میں اجازت کی ضرورت ہے (ایک) نماز فجر سے پہلے اور (دوسرے) جب دوپہر کے وقت (سونے کی خاطر) تم اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد (یہ تینوں وقت) تمہارے پردوں کے وقت ہیں اس لئے بلا اجازت ایک دوسرے (کے کمرے میں داخل ہونا جائز نہیں) (اور) ان تینوں اوقات کے علاوہ (بلا اجازت آمد و رفت میں) نہ تم پر کوئی الزام ہے نہ ان کے لئے خوف کی بات (کیونکہ) وہ اکثر و بیشتر تمہارے پاس آتے ہی رہتے ہیں۔ ایسے ہی (جس طرح یہ حکم صاف طور پر بیان کر دیا گیا) اللہ تمہارے لئے اپنے احکام صاف صاف بیان کر دیتا ہے۔ اور اللہ (بہت بڑا جاننے والا (اور بڑی دانائی والا ہے!)

اس طرح ان کے دل سے جذبہ مرعوبیت دور ہوتا چلا جائے گا۔ جس نے انہیں انسانوں کی صف سے الگ کر رکھا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ "آقا" اپنی مملوکہ لونڈیوں سے متمتع بھی ہوتے تھے اس لئے

تمتع

کہ ان بیچاریوں کا سوسائٹی میں کوئی درجہ (Status) ہی نہ تھا۔ یہ تمتع زنا ہی کی دوسری شکل تھی۔ اسی لئے ایسی لونڈیوں کو سریہ کہتے تھے، یعنی راز کی چیز (جس سے چھپ چھپا کر تعلقات قائم کئے جائیں)، اس قسم کی لونڈیاں، جو مندرجہ صدر قرآنی تدابیر کے باوجود باقی رہ گئی تھیں، بھی فراموش نہیں کر دی گئیں قرآن کریم نے بیک جنبشِ قلم، انہیں لونڈی کے پست مقام سے اٹھا کر بیوی کا بلند و متعارف درجہ دیدیا۔ لگے۔ چھپے، تعلقات کی بجائے انہیں محل حلال قرار دیا اور اس طرح ان کے تعلقات کی اجنبیت کو متعارف حیثیت دے کر انہیں ان کی زندگی کا برابر کا شریک اور ان کی اولاد کو برابر کی اولاد بنا دیا۔ قرآن نے متعدد مقامات پر انہیں محل حلال قرار دیا ہے مثلاً سورہ انبیاء میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ (۲۳/۵-۶ نیز ۷۰/۲۹-۳۰)

(فلاح پانے والے کون ہیں؟ وہ وہ ہیں!) جو اپنی شرمگاہوں کے لئے (غلط شہوانی جذبات سے)

حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی منکوحہ بیبیوں پر یا اپنی (جائز) لونڈیوں پر، ان پر (ایسا نہ کرنے میں)
کوئی الزام نہیں۔

نیز سورۂ نساء میں جہاں تعداد ازدواج پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ اس کے ضمن میں فرمایا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۚ ذٰلِکَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا (۴/۳)

اور دیکھو! (اگر سوسائٹی میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ یتیم لڑکیاں زیادہ رہ جائیں اور تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کی حفاظت کا صحیح طریق یہ ہے کہ ان میں سے یا اُن کی ماؤں میں سے) جو تمہیں پسند آئیں نکاح کر لو! (ایک وقت میں) دو، دو تین، تین، چار چار تک کر سکتے ہو (بشرطیکہ ان میں انصاف کر سکو یعنی سب کے حقوق یکساں طور پر ادا کر سکو) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر چاہیئے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو یا پھر جو عورتیں (لڑائی کے قیدیوں میں سے تمہارے ہاتھ آچکی ہیں (انہیں بیوی بنا کر رکھو) بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب ہے (بمقابلہ اس کے کہ یتیم لڑکیوں کے حقوق کے لئے اللہ کے حضور جوابدہ ہو۔

قرآن نے ان عورتوں سے نکاح ناجائز قرار دیا ہے جن کے شوہر پہلے سے موجود ہوں (یعنی ایک ہی عورت کے ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر نہیں ہو سکتے) ان لونڈیوں میں ایسی بھی تھیں جو اسیر ہو کر آئیں اور لونڈیاں بنالی گئیں۔ لیکن ان کے شوہر اپنے ہاں ابھی تک زندہ تھے۔ اب یہ مطلقہ تھیں نہ بیوہ۔ لہذا محولہ بالا حکم میں ان کی استثناء کی گئی۔ سورۂ نساء میں محرمات کی تفصیل دینے کے بعد فرمایا۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۚ کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ۝ (۴/۲۴)

اور (دیکھو) وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو دوسروں کے نکاح میں ہوں، ہاں (لڑائی کے قیدیوں میں سے) جو عورتیں تمہارے قبضہ میں آگئی تھیں (اور تم نے انہیں لونڈیاں بنالیا تھا تو وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔) یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے (قانون) ٹھہرا دیا گیا ہے ان عورتوں کے علاوہ (جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے)

تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں (تم ان سے نکاح کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ ازدواجی زندگی کی قید و بند میں رہنے کے لئے، نہ کہ نفس پرستی کے لئے۔ اپنا مال خرچ کر کے ان سے نکاح کرو) پھر جن عورتوں سے تم نے ازدواجی زندگی کا فائدہ اٹھایا ہے، تو چاہیئے کہ جو مہر ان کا مقرر ہوا تھا، وہ ان کے حوالے کر دو! اور مہر مقرر کرنے کے بعد اگر آپس کی رضامندی سے کوئی بات ٹھہر جائے (یعنی بیوی اس میں کمی بیشی منظور کرلے، یا اس کا کوئی حصہ، یا کجنبتی سب کچھ معاف کر دے) تو ایسا کیا جا سکتا ہے اس میں تم پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا، یاد رکھو، اللہ سب کچھ جاننے والا۔ اور (ہر بات میں) حکمت رکھنے والا ہے!

غلامی کا خاتمہ اس طرح قرآن نے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ جو غلام اور لونڈیاں اس وقت موجود تھیں ان کا مسئلہ اس طرح حل کر دیا اور آئندہ سے غلامی کا سرچشمہ بند کر دیا۔ یہ تدبیری احکام قرآن کریم میں اس لئے موجود ہیں کہ اگر کوئی ایسی قوم اسلام لے آئے جس میں غلام اور لونڈیاں موجود ہوں۔ یا کسی اس قسم کی قوم پر قرآنی احکام نافذ کئے جائیں، تو مرکز ملت کے سامنے یہ نظائر موجود ہوں جن کی روشنی میں وہ ان غلاموں کا مسئلہ حل کر سکے۔ قرآن نے غلامی کو اس طرح قاطبۃً ختم کر دیا۔ لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی تو انہوں نے جہاں قبل از اسلام کی اور قبیحات کو ایک ایک کر کے اپنی معاشرت کا جزو بنا لیا۔ غلامی جیسی لعنت کا بھی پھر سے اجرا کر لیا۔ اور اس کر و فر کے ساتھ کہ مسلمانوں کی تاریخ کا شاید

پھر غلام کہاں سے آگئے؟ ہی کوئی ورق ایسا ملے جس میں حرم سراؤں اور درباروں میں، لونڈیاں اور غلام چلتے پھرتے دکھائی نہ دیں۔ ایک ایک سلطان کے حرم میں ہزار ہزار لونڈیاں، استغفراللہ۔ آپ یقیناً متعجب ہوں گے کہ یہ باتیں روا کیسے رکھی گئیں؟ لیکن اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ ان کے پاس روایات کا چور دروازہ ایسا تھا جس کے راستے ہر رہزنِ متاعِ دین و دانش بے محابا سوسائٹی کے نہاں خانوں میں باریاب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ لونڈیوں سے تمتع کے باب میں بھی روایات وضع کی گئیں اور یا للعجب کہ ان انسانیت سوز مکذوبات اور شرمناک مفتریات کو اس ذات اطہر و اقدس کی طرف منسوب کیا گیا کہ جس کے ضبطِ نفس اور اتقان عصمت پر ابن مریم قسم اٹھائے۔ لونڈیوں کے متعلق خود "صحاح ستہ" میں ایسی ایسی روایات موجود ہیں کہ جن کے تصور سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ہمیں قطعاً جرأت نہیں ہو سکتی کہ ان روایات کو یہاں درج کر دیا جائے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جبکہ کفار و مشرکین تک کی مملکات میں غلامی اور بردہ فروشی جرم قرار پا چکی ہے، مکہ کی مقدس سرزمین میں لونڈیاں سربازار فروخت ہوتی ہیں۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا۔ اور اس کے باوجود مسلمان منبروں اور

پلیٹ فارموں سے گلے پھاڑ پھاڑ کر بڑے فخر و ناز سے اعلان کرتے ہیں کہ غلامی کی لعنت کو دنیا سے ہم نے مٹایا۔ وہ تھی قرآن کی تعلیم، اور یہ ہیں روایات کے پھندے میں پھنسے ہوئے مسلمان۔

منزل مقصود قرآں دیگر است رسم و آئین مسلماں دیگر است

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد در ایاغ او نہ مے دیدم نہ دُرد

از ملوکیت، نگہ گردد، دگر عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

سلسلۂ غزوات
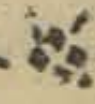
گذشتہ عنوان میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ اسلام کا جنگ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ان حقائق کی روشنی میں ہمیں ان غزوات کو دیکھنا چاہیئے جو زمانہ نبوت میں پیش آئے اور جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ ان میں سب سے پہلا واقعہ بدر کا ہے۔

جنگ بدر

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی ہجرت، قریش مکہ پر کس قدر گراں گذری تھی اس سے ان کے تمام عزائم مشئومہ خاک میں مل گئے۔ لیکن عرب کا جوش انتقام، اور وہ بھی اس قسم کی اجتماعی حیثیت لئے ہوئے ایسا نہ تھا کہ یونہی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ مسلمانوں کا تعاقب کیا جائے اور جب تک ان کی تحریک (اسلام) کا استیصال نہ کر لیا جائے چین سے نہ بیٹھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس خیال کو عام کیا، اور اس طرح سارے عرب کو مخالفت و مبازرت کے لئے مشتعل کر دیا۔ مدینہ میں ہجرت سے پہلے عبداللہ بن اُبی رئیس الانصار تھا۔ قریش نے اسے خط لکھا کہ۔

> تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو، یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کر دیں گے۔ اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کر لیں (بحوالہ سنن ابی داؤد)

نبی اکرم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے عبداللہ بن ابی کو سمجھایا کہ اس مخالفت میں تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے، اس لئے کہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے، اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اس نے قریش کی بات نہ مانی قریش نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲ھ ہجری کے اوائل میں مکہ کے ایک رئیس کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور حضورؐ کے مویشی لوٹ کر لے گیا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب قریش کا قافلہ شام کی طرف تجارت کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس قافلہ کو واپسی پر اسی راستہ سے گذرنا تھا امیر کارواں، ابوسفیان کو کسی نے یہ غلط خبر پہنچا دی کہ مسلمان تمہارے قافلہ کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اس نے اس کی اطلاع قریش مکہ کو بھیجدی۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے، خوئے بدرا بہانہ بسیار ایک لشکر جرار ساتھ لے کر مدینہ کی طرف امنڈ آئے، نبی اکرمؐ کو

معلوم ہوا تو آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ ان کی بے سروسامانی کا عالم تھا وہ ظاہر ہے لیکن یہ تو قدوسیوں کی وہ جماعت تھی جس نے اپنی جان، اور مال حق کی حمایت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ وہ ہر حکم کی تعمیل کے لئے حاضر تھے آپ نے انصار کی طرف نگاہ اٹھائی تو ان کے رئیس سعد بن معاذ نے کہا کہ آپ حکم دیں تو ہم سمندروں میں کود پڑیں۔ چنانچہ آپ فدائیوں کی اس مختصر سی جماعت کو ساتھ لے کر غنیم کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت خدا کی اس وسیع و عریض زمین میں خدا کا نام لینے والوں کی کل کائنات یہی تین سو کے قریب جان نثار تھے جو لوائے حق و صداقت کے سائے میں اپنے دعوئے ایمان کی شہادت کے لئے اس طرح چل دئے تھے۔ شوق شہادت کے دنور کا یہ عالم تھا کہ جب ایک کمسن بچے (عمیر بن ابی وقاص) سے کہا گیا کہ وہ واپس چلا جائے تو رو دیڑا۔ اور حضورؐ کو مجبوراً اجازت دینی پڑی کہ وہ ساتھ ہولے۔ اس جوش مسرت میں اس کا بڑا بھائی (سعد بن ابی وقاص) اٹھا، اور چھوٹے بھائی کے گلے میں خود تلوار حمائل کی۔ آسمان کے فرشتے اس حسین منظر کو دیکھ رہے تھے اور خدائے علیم وخبیر سے عرض کر رہے تھے کہ بارالٰہا تو نے سچ کہا تھا کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ جان نثاروں کی یہ کل جماعت ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ساتھ کل دو گھوڑے تھے۔ مقابلہ میں قریش بڑے کروفر اور شان و شوکت سے نکلے تھے، ہزار سپاہیوں کی جمعیت، سو سواروں کا رسالہ، تمام رؤسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریک فوج، رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ قریش کو بدر کے قریب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے باہر نکل گیا ہے، اور اب اندیشہ کی کوئی بات نہیں لیکن ان کی تو نیت ہی جنگ کی تھی وہ واپس کیوں لوٹتے؟ وادی کی دوسری طرف نبی اکرمؐ نے ڈیرا ڈال دیا۔ حباب بن منذر ایک صحابی تھے انہوں نے خدمت اقدس میں آکر عرض کیا کہ محل فرودگی کا یہ انتخاب وحی کی رو سے ہوا ہے یا حضورؐ نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں۔ اس پر حضرت حباب بن منذر نے عرض کیا کہ پھر اس مقام سے فلاں مقام زیادہ مناسب ہے، ہمیں وہاں جا کر اترنا چاہیئے۔ حضورؐ نے معاملہ کے ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جو حضرت حباب نے پیش کئے تھے، اور فرمایا کہ حباب کی رائے زیادہ صائب ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی رائے پر عمل[1] فرمایا۔ رات کو بارش ہوئی تو موقعہ کے حسن انتخاب اور اس تائید غیبی نے میدان کا نقشہ الٹ دیا اور اب جو دیکھا تو بساط جنگ کا ہر گوشہ مجاہدین کے حق میں تھا۔ یہ اُس رمضان کی سترہ تاریخ تھی جس میں پہلے پہل روزے فرض ہوئے تھے۔ دشمن کے مقابلہ کے لئے تو سترہ روزے ہی کافی ہیں، بشرطیکہ روزے سے مفہوم محض نان و آب سے اجتناب ہی نہ ہو بلکہ

پہلا رمضان

[1] اس واقعہ کو ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ ایک اہم اصولی بحث کے فیصلہ میں مدد دے گا جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

نگاہ اس کے اس مفہوم پر ہو جو آب و گل کے پیکروں میں بجلیوں کی تڑپ پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں تو سترہ رمضان ۲ھ (مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے برسرِ آرا تھیں اور دنیا میں اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کر رہی تھیں کہ انسانی تقسیم (قومیت) کا صحیح معیار کیا ہے؟ حضرت نوحؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک کے حضرات انبیاء کرام کے کوائف و احوال گذشتہ جلدوں میں آپ کے سامنے آچکے ہیں آپ نے دیکھا کہ کس طرح کفر و ایمان نے باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، میاں اور بیوی خویش و اقارب میں ایک بدیہی تفریق کر کے رکھ دی تھی۔ وہ واقعات فرداً فرداً تاریخ کے صفحات پر رونما ہوئے۔ لیکن آج وہ تمام کے تمام ان دو صفوں میں سمٹ کر سامنے آگئے، یہ دو صفیں جو ایک دوسرے کے مقابل شمشیر بکف کھڑی تھیں، کن افراد پر مشتمل تھیں؟ ان پر جن کا ملک ایک تھا زبان ایک تھی، رنگ و نسل ایک تھا۔ حسب و نسب ایک تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایک وجہ افتراق تھی جس نے ان تمام وجوہ جامعیت کو منسوخ کر کے انہیں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا تھا اور اس طرح دنیا کو بتلا دیا تھا کہ قرآن کی رو سے قوموں کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے وہ وجہ تفریق و ملت تقسیم تھی، ایمان! ایک طرف حضرت ابوبکرؓ تھے تو دوسری طرف مقابل

انسانی تقسیم کا فطری معیار

میں ان کا بیٹا۔ ادھر حضرت حذیفہؓ تھے، تو صف غنیم میں ان کا باپ عتبہ ادھر حضرت عمرؓ تھے تو ادھر آپ کا ماموں جس کے خون سے آپ کی تلوار رنگین تھی۔ ادھر حضرت علیؓ تھے تو مخالف صف میں ان کے بھائی عقیل۔ نہیں! اور آگے بڑھیے۔ ادھر خود محمدؐ تھے تو سامنے کی صف میں آپ کے حقیقی چچا (حضرت) عباس، اور آپ کے داماد ابو العاص! ادھر ام المومنین حضرت سودہؓ تھیں تو سامنے ان کے عزیز سہیل بن عمرو۔ یہ تھی وہ حقیقی تقسیم جو وطن، رنگ، زبان، نسل کی غیر فطری حدود و ثغور سے ماوراء تھی۔ حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنوں میں سے تھا، لیکن حقیقی چچا عباس غیروں میں سے۔ روم کا صہیب یگانہ لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔ صفیں کھڑی ہوئیں تو امام جماعت (حضور نبی اکرمؐ) نے ان پر تیرتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ایک تیر کے اشارے سے صفیں سیدھی کیں (یہ جو آپ "نماز باجماعت" کے وقت "صفیں سیدھی کر لو" کی تاکید سنا کرتے ہیں۔ یہ اسی زندگی بخش، اور حیات آفریں "سنت کی پیروی" ہے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

عین اس وقت حذیفہؓ بن الیمان اور ابو حسیلؓ دو صحابی دوڑتے دوڑتے، صفوں میں شامل ہوئے۔ یہ کہیں دوسری طرف سے آرہے تھے۔ ایسے موقع پر ایک آدمی کا اضافہ

ایفائے عہد کا عدیم النظیر واقعہ

بھی ہزار مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ مجاہدین کو بڑی خوشی ہوئی۔

حضورؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ وہ کسی اور طرف سے آرہے تھے۔ راستہ میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کو جارہے ہو انہوں نے انکار کیا، اور وعدہ کیا کہ وہ اس جہاد میں شرکت نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ مجاہدین سے آکر ملے۔ آپ نے سنا تو فرمایا کہ تم نے ان سے عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو! ہماری مدد اللہ کرے گا۔

اب اس معرکۂ حق و باطل کی مزید تفصیلات قرآن کے الفاظ میں سنئے چونکہ خیر و شر کی آویزش میں یہ جنگ بڑی اساسی اہمیت رکھتی ہے اس لئے قرآن کریم نے شرح و بسط سے اس کا تذکرہ کیا ہے اور پوری کی پوری سورۂ انفال گویا اس کے کوائف و عواطف کا بیان ہے۔ بات یہاں سے شروع ہوئی ہے۔ کہ مدینہ میں یہ اطلاع آچکی تھی کہ ایک طرف سے قریش کا قافلہ آرہا ہے اور دوسری طرف سے ان کا لشکر جرار۔ اب فطری طور پر بعض لوگوں کا رجحان طبیعت اس طرف ہوگا کہ اگر مقابلہ ہونا ہے تو قافلہ والوں کے ساتھ ہو کیونکہ اس بے سروسامانی کے عالم میں جو اس وقت مدینہ کے مسلمانوں پر مسلط تھی۔ قریش کے جنود و عساکر کا مقابلہ مشکل نظر آتا تھا۔ لیکن اللہ تعالے کو یہ منظور تھا کہ حق و باطل کا فیصلہ میدان جنگ میں ہو جائے اور روسائے قریش اپنی قوت کے زعم باطل پر جو اس قدر حق کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں انہیں معلوم ہو جائے کہ حق کی اس آواز کو دبا لینا آسان نہیں ہے چنانچہ یہ تھا وہ فیصلہ جس کے ماتحت مجاہدین کی یہ بے سروسامان جماعت گھر سے نکلی۔

قرآنی تفاصیل

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (۸: ۵-۸)

(اس معاملہ میں بھی ویسا ہی سمجھ) جس طرح (جنگ بدر میں) یہ بات ہوئی تھی کہ تیرے پروردگار نے سچائی کے ساتھ تجھے تیرے گھر سے باہر نکالا تھا۔ اور یہ واقعہ تھا کہ مومنوں کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا۔ وہ تجھ سے امر حق میں جھگڑ پڑے۔ باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا وہ باہر نکل کر مقابلہ ہونے سے اس درجہ ناخوش تھے گویا انہیں زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ اور وہ (اپنی موت اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے ہیں۔ اور (مسلمانو!) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا (دشمنوں کی) دو جماعتوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ ضرور آئے گی۔ اور تمہارا حال یہ تھا کہ چاہتے تھے، جس جماعت میں لڑائی کی طاقت

نہیں۔ (یعنی قافلہ والی) وہ ہاتھ آجائے۔ اور (خدا کا چاہنا دوسرا تھا) خدا چاہتا تھا کہ اپنے وعدہ کے ذریعہ حق کو ثابت کردے اور دشمنانِ حق کی جڑ بنیادیں کاٹ کر رکھدے (اور) یہ اس لئے تاکہ حق کو حق کر کے دکھلادے، اور باطل کو باطل کر کے اگرچہ (ظلم و فساد کے) مجرم ایسا ہونا پسند نہ کریں۔

اب ہم میدانِ جنگ میں آپہنچے ہیں۔ دونوں جماعتیں آمنے سامنے صف آرا ہیں۔ ایک طرف طاغوتی قوتیں اپنی پوری شوکت و شدت کے ساتھ آمادہ پیکار ہیں۔ دوسری طرف خدا پرستوں کی یہ مختصری جماعت جو تین سو تیرہ (۳۱۳) نفوس پر مشتمل ہے۔ بے ساز و یراق، حق و صداقت کی مدافعت و حفاظت کے لئے سربکف سامنے کھڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کا معرکہ انسانیت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا ہے۔ معاملہ کی نزاکت، اور اس واقعۂ عظیمہ کی اہمیت کے احساس سے نبی اکرمؐ کا یہ عالم تھا کہ فوجیں میدان میں ہیں اور حضورؐ اس خدائے ناصر و معین کی بارگاہِ عالیہ میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں کہ جس کی نصرت و تائید کے بغیر زندگی کے کسی گوشہ میں بھی کامیابی و کامرانی نصیب نہیں ہوسکتی؛ اور جس کی عاجز نوازیاں بیکسوں کا آخری سہارا، اور بے نواؤں کا ماویٰ و ملجا بنتی ہیں۔ جھولی پھیلائی ہوئی ہے اور محویت کا یہ عالم ہے کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر گر پڑتی ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اسی خشوع و خضوع اور والہانہ جذبۂ انہماک سے بحضور رب العزت عرض کرتے ہیں کہ

بار الٰہا اگر مٹھی بھر جماعت مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

مانگنے والے نے اس الحاح و زاری سے مانگا۔ اور دینے والے نے اس بذل کریمانہ۔ اور ترحم خسروانہ سے نوازا کہ:-

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿٩﴾

جب ایسا ہوا تھا کہ (جنگ بدر کے موقعہ پر) تم نے اپنے پروردگار سے فریاد کی تھی۔ کہ ہماری مدد کر اور اس نے تمہاری فریاد سن لی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے کہ پیچھے بعد دیگرے آئیں گے، تمہاری مدد کرونگا۔

فرشتوں کی مدد

یہ فرشتے کیا کریں گے، کیا مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ تم جاؤ۔ آرام سے گھروں میں بیٹھو ہم ان دشمنوں کو خود ہی ختم کرڈالیں گے؟ نہیں خدا کی نصرت اس طرح نہیں آیا کرتی۔ اس کی نصرت دلوں میں طمانیت و یقین کی بہار آفریں جنتیں لبا دیتی ہے۔ اور دلوں کی حالت بدل جانے سے خارجی دنیا از خود بدل جایا کرتی ہے۔ میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح و شکست کا مدار ہے، وہ سپاہی کی روح ہے اگر اسے اپنی کامیابی پر یقین ہے اگر جمعیت خاطر نصیب ہے تو وہ بے تیغ بھی میدان مار سکتا ہے۔ یہی طمانیت قلب کی دولت تھی جو اللہ نے ان مجاہدین کو عطا فرمادی۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۟ (۸: ۱۰)

اور اللہ نے یہ بات جو کی، تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ تمہارے لیے (خوشخبری ہو، اور تمہارے مضطرب دل) قرار پا جائیں۔ ورنہ مدد تو (ہر حال میں) اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بلاشبہ وہ (سب پر) غالب آنے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اسی حقیقت کو سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓی ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝ (۳: ۱۲۳-۱۲۷)

اور دیکھو! یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے تمہیں بدر کے میدان جنگ میں فتحمند کیا تھا، حالانکہ تم بڑی ہی گری ہوئی حالت میں تھے۔ (اور تمہاری کامیابی کا کوئی وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا تھا) پس اللہ سے ڈرو! (اور اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تم میں اس کی نعمتوں کی قدر شناسی پیدا ہو جائے۔ (اے پیغمبر اسلام!) وہ وقت (بھی) یاد کرو! جب تم (میدان جنگ میں) ایمان والوں سے یہ کہہ رہے تھے، کہ کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ (دشمن کے لشکر جرار کے مقابلہ میں) تین ہزار نازل کئے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے۔ ہاں بلاشبہ، اگر تم صبر کرو، اور تقوی کی راہ اختیار کرو۔ اور پھر ایسا ہو کہ دشمن اسی دم تم پر چڑھ آئے تو تمہارا پروردگار (صرف تین ہزار فرشتوں ہی سے نہیں بلکہ) پانچ ہزار، نشان رکھنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا (اور ان کی کثرت و طاقت تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکے گی) اور یہ بات جو کہی گئی ہے تو محض اس لئے کہ تمہارے لئے (فتحمندی کی) خوشخبری ہو، اور تمہارے دل اس کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں اور مدد و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے، اس کی طاقت سب پر غالب ہے، اور وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے! اور نیز اس لئے، تاکہ منکرین حق کی جمعیت، وطاقت کا ایک حصہ بیکار کر دے یا انہیں اس درجہ ذلیل و خوار کر دے کہ نامراد ہو کر الٹے پاؤں پھر جائیں!

اس قلبی کیفیت کے ساتھ ہی خارجی دنیا میں بھی ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا جس سے فضا مسلمانوں کے لیے سازگار

ہوگئی۔ قریش چونکہ بدر کی وادی میں پہلے آپہنچے تھے اس لئے انہوں نے پانی کے چشمہ پر قبضہ کرلیا تھا اس سے مسلمانوں

بارش

کو فطرۃً تردد ہوا۔ پھر اس وادی میں زمین ریتلی تھی جس سے پیادہ فوج کے پاؤں ریت میں دھنسے جاتے تھے، اور مسلمان تمام تر پیادہ ہی تھے، لڑائی کی رات بارش ہوگئی جس سے مجاہدین کے پاس پانی کی بھی افراط ہوگئی اور زمین کی بھی حالت بدل گئی۔ ان کا خوف امن میں بدل گیا تو وہ نہایت اطمینان سے رات بھر سوئے اور صبح تازہ دم ہو کر میدان میں آگئے۔

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝

اے پیروان دعوت ایمانی! (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ اس نے چھا جانے والی غنودگی تم پر طاری کردی تھی کہ اس کی طرف سے تمہارے لئے تسکین و بے خوفی کا سامان تھا۔ اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمہیں پاک وصاف ہونے کا موقع دیدے۔ اور تم سے شیطان (کے وسوسے) کی ناپاکی دور کردے۔ نیز تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھ جائے۔ اور (ریتیلے میدانوں میں) قدم جما دے!

یہ وہ اطمینان قلب اور تثبیت خاطر تھی جو مسلمانوں کو نصیب ہوگئی اور کفار کے دل پر ان کا رعب طاری ہوگیا۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ۝

یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں پر وحی کی تھی، میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو استوار رکھو! عنقریب ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں (مومنوں کی) دہشت ڈال دوں گا! سو (اے مسلمانو!) ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ! ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو یاد رکھو اللہ (پاداش عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے۔

سپاہیوں کی کیفیت قلبی کا یہی وہ فرق ہے جو تعداد کی کمی اور سامان کی قلت کا مداوا کردیتا ہے۔ اور ایک ایک سپاہی، فریق مخالف کے دو، دو پر اور بسا اوقات دس دس پر بھاری ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ

قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۸: ۶۵-۶۶)

اے پیغمبر اسلام! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا دیجئے (مسلمانو!) اگر تم میں بیس آدمی بھی مشکلوں کو جھیل جانے والے نکل آئے تو یقین کرو وہ دو سو دشمنوں پر غالب ہو کر رہیں گے۔ اور اگر تم میں ایسے آدمی سو نکل آئے تو سمجھو ہزار کافروں کو مغلوب کر کے رہیں گے اور یہ اس لئے ہوگا کہ کافروں کا گروہ ایسا گروہ ہے جس میں سمجھ بوجھ نہیں۔ (اے مسلمانو!) اب اللہ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس نے جانا کہ تم میں کمزوری ہے۔ اچھا اب اگر تم میں جھیل جانے والے سو آدمی ہوں گے (تو انہیں صرف اپنے سے دو گنی تعداد کا مقابلہ کرنا ہوگا یعنی) وہ دو سو دشمنوں پر غالب رہیں گے۔ اور اگر ہزار ہوں گے تو سمجھو دو ہزار کو مغلوب کر کے رہیں گے (اور یہ سب کچھ ہوگا) اللہ کے حکم (کی مدد) سے اور اللہ جھیل جانے والوں کا ساتھی ہے!

یہی وہ فرق تھا جو میدان بدر میں نمایاں طور پر سامنے آ گیا۔ صنادید قریش اور اُن کے لشکر اپنی تعداد کے نشہ میں سرشار تھے اور فریق مقابل کی قلتِ تعداد، اور نقص سامان و اسلحہ کے پیش نظر انہیں خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔

ثبات و یقین ادھر مجاہدین کے دل استقامت و عزم اور یقین و ثبات سے ایسے مضبوط ہو چکے تھے کہ وہ فریق مخالف کی تعداد سے گھبراتے ہی نہیں تھے۔ انہیں ایک طرف خدا کے اس وعدہ پر کہ ایک ایک مرد مومن دو دو کفار پر غالب آ جاتا ہے، ایسا پختہ ایمان تھا، اور دوسری طرف تائید ایزدی اپنی کامیابی پر ایسا محکم یقین کہ دشمنوں کی تعداد، انہیں اپنی تعداد سے زیادہ سے زیادہ دگنی دکھائی دیتی تھی۔ یعنی ان کی اصلی تعداد سے ایک تہائی کم۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو دو مقامات پر بیان کیا ہے سورۂ آل عمران میں ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ (۳: ۱۳)

بلاشبہ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں (کلمۂ حق کی نشانیوں کی) بڑی ہی نشانی تھی جو (بدر کے میدان میں) باہم گر مقابل ہوئے تھے، اس وقت ایک گروہ تو مٹھی بھر بے سر و سامان مسلمانوں کا تھا جو اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا منکرین حق کا تھا جنہیں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان سے دوچند ہیں (با ایں ہمہ منکرین حق کو شکست ہوئی) اور اللہ جس کسی کو چاہتا ہے اپنی نصرت سے مددگاری پہنچاتا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں اس معاملہ میں بڑی ہی عبرت ہے!

دوسری جگہ سورۂ انفال میں ہے۔

اِذْ يُرِيكَهُمُ اللّٰهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ (۴۳-۴۴)

اور اے پیغمبر اسلام! یہ وہ دن تھا کہ اللہ نے تجھے خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کرکے دکھائی (یعنی یہ دکھلایا کہ اگرچہ بظاہر مسلمانوں سے زیادہ ہوں گے۔ لیکن عزم وثبات میں تھوڑے ثابت ہوں گے) اور اگر انہیں بہت کرکے دکھلاتا تو (مسلمانو!) تم ضرور ہمت ہار دیتے، اور اس معاملہ میں جھگڑنے لگتے۔ اللہ نے تمہیں اس صورت حال سے بچا لیا۔ یقین کرو جو کچھ انسانوں کے سینوں میں چھپا ہوتا ہے، وہ اس کے علم سے پوشیدہ نہیں! اور (پھر دیکھو!) جب تم دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے، اور اللہ نے ایسا کیا تھا کہ دشمن تمہاری نظروں میں تھوڑے دکھائی دیئے (کیونکہ تمہارے دلوں میں ایمان واستقامت کی روح پیدا ہو گئی تھی) اور ان کی نظروں میں تم تھوڑے دکھائی دیئے (کیونکہ بظاہر تعداد میں وہی زیادہ تھے) اور یہ اس لئے کیا تھا، تاکہ جو بات ہونے والی تھی اسے کر دکھائے۔ اور سارے کاموں میں دار و مدار اللہ ہی کی ذات پر ہے۔

مسلمانوں کی تعداد، فریق مخالف سے پہلے ہی کم تھی۔ لیکن کفار کے نشۂ رعونت وتکبر نے یہ کہکر اس تعداد کو اور بھی کم کر دکھایا، کہ یہ بے سروسامان مٹھی بھر جماعت ہے ہی کیا؟ اسے ہم ابھی کچل دیں گے۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اپنے نصب العین کی صداقت، اور عزم واستقامت کی بنا پر انہیں زیادہ سے زیادہ دگنا خیال کیا جس پر غالب آنا وعدۂ خداوندی کی رو سے یقینی تھا سپاہیوں کی قلبی کیفیت یوں بساط مصاف الٹ دیا کرتی ہے

ثابت قدمی کی تاکید

اب فوجیں آمنے سامنے ہیں ادھر صحابۂ کبار کی وہ جماعت ہے جس کا ایمان ساری دنیا کے مؤمنین کے لئے نمونہ ہے، لیکن انہیں بھی تاکید ہوتی ہے کہ یاد رکھو! جو باطل کے مقابلہ میں پیٹھ دکھا دے گا، سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔

وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (۱۶)

مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو جائے (یعنی وہ تم پر ہجوم کرکے چڑھ دوڑیں، اور تم مقابل ہو) تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ (سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرو) اور جو کوئی ایسے موقع پر پیٹھ دکھائے گا، بجز اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینترا بدلے یا اپنی جماعت کی طرف پناہ جوئی کے لئے رخ کرے تو سمجھ لو! وہ خدا کے غضب

آگیا۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوا اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہوا تو اس کے پہنچنے کی جگہ کیا ہی بری جگہ ہے۔

اطاعت، ضبط نفس، ایثار حق کی مدافعت میں باطل کے مقابلہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی؛ اب فوجیں باہم گتھم گتھا ہو گئیں۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ خدا حق ہے۔ اس لئے حق وصداقت کی علمبردار جماعت، خدائی مشن کو پورا کرنے کے لئے دنیا میں آتی ہے۔ اور قوموں کی تقدیر کے متعلق خدائی فیصلے ان ہی کے ہاتھوں نفاذ پذیر ہوتے ہیں۔ بدر کے میدان میں ایک ایسا ہی فیصلہ تھا جو ظہور پذیر ہونے والا تھا۔ دیکھئے قرآن کریم نے اس حقیقت عظمیٰ کو کیسے بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ
وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۱۷)

پھر کیا تم نے انہیں (جنگ میں) قتل کیا؟ نہیں خدا نے کیا۔ (یعنی محض اس کی تائید سے ایسا ہوا) اور (اے پیغمبر!) وہاں تیر اندازی تم نے نہیں کی۔ درحقیقت خدا نے کی تھی۔ اور یہ اس لئے ہوا تھا کہ اس کے ذریعے ایمان والوں کو ایک بہتر آزمائش میں ڈال کر آزمائے بلاشبہ اللہ سننے والا۔ علم رکھنے والا ہے!

تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے، خود خدا کی تقدیر ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے لا رہی تھی، تلواریں تمہاری تھیں لیکن تقدیر الٰہی کا ہاتھ تھا جو انہیں چلا رہا تھا۔ تیر تمہارے تھے لیکن قوانین مشیت کے فیصلے تھے جو قضائے مبرم بن کر ان کی انیوں کے ساتھ لپٹ رہے تھے۔

عزم او خلاق تقدیر حق است

روز ہیجا تیر او تیر حق است

تھوڑے ہی عرصہ میں سردار لشکر عتبہ بن ربیعہ، اس کے بیٹے ولید، اور بھائی شیبہ، کی لاشیں میدان میں تھیں، ابوجہل کہ جس کی عداوت وسرکشی کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں، انصار کے دو نوجوان بھائیوں (معوذ اور معاذ) کی تلوار سے پیوست زمین ہو گیا۔ سرداران لشکر کے قتل سے قریش کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور انہوں نے ہتھیار ڈال دئے مسلمانوں میں سے ۱۴ (چودہ) مجاہدین نے شہادت پائی۔ کفار کے قریب ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے اسیران جنگ میں حضرت عباس، عقیل اور حضورؐ کے داماد ابوالعاص بھی تھے، حق وباطل کے اس پہلے معرکہ میں یوں حق غالب آیا، اور باطل پسپا ہوا کہ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۸/۱۸)

یہ سب تو ہو چکا۔ اب سن رکھو کہ اللہ کافروں کی مخفی تدبیروں کو (جو دعوت حق کے مٹانے کے لئے کر رہے ہیں) کمزور کر دینے والا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم نگاہوں کا رخ اصل حقیقت کی طرف پھیر دیتا ہے۔ وہ رؤسائے قریش سے کہتا ہے کہ تم بات کا فیصلہ افہام و تفہیم سے نہیں بلکہ شمشیر و سنان کے ذریعے چاہتے تھے، سو یہ لو فیصلہ تمہارے سامنے ہے اسے دیکھ لو اور آئندہ کے لئے فیصلہ کر لو کہ حق و صداقت کی اس تحریک کی مخالفت اسی طرح کئے جاؤ گے، یا اب اپنے تمرد و رعونت سے باز آجاؤ گے؟

إِن تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۖ وَإِن تَنتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَإِن تَعُودُوا نَعُدْ ۖ وَلَن تُغْنِيَ عَنكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۸/۱۹)

(اے رؤسائے مکہ) اگر تم فتحمندی کے ظہور کے طلبگار تھے تو دیکھ لو فتحمندی تمہارے سامنے آگئی (یعنی جنگ بدر کے نتیجہ نے ہار جیت کا فیصلہ آشکارا کر دیا) اور اگر (آئندہ لڑائی سے) باز آجاؤ تو تمہارے لئے بہتری کی بات یہی ہے، اور اگر پھر یہی چال چلے تو ہم بھی چلیں گے، اور یاد رکھو تمہارا جتھا تمہارے کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ بہت سے آدمی اکٹھے کر لو! یقین کرو اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

جنگ کے قیدی اسیران جنگ کے متعلق چونکہ ابھی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے انہیں بطور سرکاری مہمان (State guest) رکھا گیا۔ اور اس غرض کے لئے دو دو چار چار کر کے انہیں صحابہؓ میں بانٹ دیا گیا۔ ان کے پاس کپڑے نہیں تھے اس لئے سب سے پہلے کپڑے فراہم کئے گئے۔ حضرت عباس کشیدہ قامت تھے اس لئے کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا عبداللہ ابن ابی نے جو خود دراز قد تھا اپنا کرتہ منگا کر دیا۔ حضرت عباس نبی اکرمؐ کے چچا تھے۔ ذرا اس احساس احسان کو دیکھئے کہ عبداللہ ابن ابی تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتا رہا لیکن اس کی وفات پر نبی اکرمؐ نے خود اپنا کرتہ کفن کے لئے بھیجا اور بخاری کی روایت کے مطابق یہ کرتہ اسی کرتہ کے بدلہ میں تھا کتنا اچھا سودا رہا اس رئیس المنافقین کا

قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمر تھا جو فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے عام مجامع میں نبی اکرمؐ کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! اس کے سامنے کے دو دانت اکھڑ وا دیئے جائیں تا کہ آئندہ تقریر کرنے کے قابل نہ رہے۔ یہ چونکہ ذاتی انتقام ہو جاتا اس لئے حضورؐ نے اس کی اجازت نہ دی۔ قیدیوں کے ساتھ کس تواضع کا سلوک ہوتا تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے جسے خود ایک قیدی (ابو عزیز) نے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جس انصاری نے مجھے اپنے گھر مہمان رکھا تھا ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح و شام کھانا لاتے تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گذارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیدیتا لیکن وہ اُسے ہاتھ بھی نہ لگاتے اور زبردستی مجھے کھلا دیتے۔

یہ تھا قیدیوں کے ساتھ سلوک! اللہ اکبر تربیت نبوی نے ان "وحشی قبائل" کے افراد کو کیا سے کیا بنا دیا تھا؟ چونکہ قیدیوں کے متعلق ابھی تک خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا تھا اس لیے آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمرؓ کی رائے تو یہ تھی کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے (بلکہ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے رشتہ دار قیدی کو قتل کر دے) تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سے زر فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے حضور نے اسی رائے کو پسند کیا اور قیدیوں سے زر فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ جو ناداری کی وجہ سے زر فدیہ نہ دے سکے ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ جو ایسا بھی نہ کر سکتے تھے، انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔ جن سے زر فدیہ لیا گیا ان کے متعلق فرمایا گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِن يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (۸/۷۰-۷۱)

اے پیغمبر (اسلام)! جو لوگ لڑائی کے قیدیوں میں سے تمہارے قبضہ میں ہیں ان سے کہدو کہ اگر اللہ نے تمہارے دلوں میں کچھ نیکی پائی، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، اس سے کہیں بہتر چیز تمہیں عطا فرمائے گا۔ اور تمہیں بخش (بھی) دے گا۔ وہ بڑا بخشنے والا رحمت والا ہے! اور اگر ان لوگوں نے چاہا کہ تمہیں دغا دیں، تو (کوئی وجہ نہیں کہ تم اس اندیشہ سے اپنا طرز عمل بدل ڈالو!) یہ اس سے پہلے خود اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں اور اسی کی پاداش ہے کہ تمہیں ان پر قدرت دیدی گئی ہے۔ اور (یاد رکھو) اللہ سب کچھ جاننا اور (اپنے کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ بعد میں جب قرآن میں قیدیوں کے متعلق حکم آیا تو وہ بھی اسی کے مطابق تھا (تفصیل سابقہ عنوان میں غلامی کے باب کے تحت گذر چکی ہے)

دل کے نرم گوشے کی دھڑک

اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کر دیا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان ہی قیدیوں میں حضورؐ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص بھی تھے (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) حضرت زینبؓ ابھی مکہ ہی میں تھیں۔ آخر رسول کی بیٹی تھیں، دل کے نازک گوشوں پر نگاہ رکھتی تھیں آپ کی شادی کے وقت ماں (حضرت خدیجۃ الکبریٰ) نے ایک ہار بطور جہیز دیا تھا، شوہر کا زر فدیہ بھیجا تو اس کے ساتھ ہی وہ ہار بھی بھیجدیا۔ اس ہار نے زمانہ کی طنابوں کو بیس پچیس برس پیچھے کھینچ دیا، اور حضورؐ کو وفا شعار، اور عفت مآب بیوی کی رفاقت یاد دلا دی، جس نے تمام مصائب اور مشکلات

ہیں بڑی جگر سوزی، اور دل دوزی سے ساتھ دیا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات، ایک ایک کر کے سامنے آ گئے اور حضورؐ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ ذرا حضورؐ کے مقام کو سامنے رکھئے۔ بہ حیثیت رسول اور امیر ملت مسلمانوں کے مال و جان کے مختار و ناطق ہیں کسی کو مجال نہیں کہ آپ کے فیصلوں سے سرتابی تو ایک طرف، دل میں گرانی بھی محسوس کرے جی چاہتا ہے کہ اس کی ماں کی یادگار ہار، بیٹی کو واپس دیدیں لیکن حریت و مساوات کا یہ عالم ہے کہ خود فیصلہ نہیں فرماتے صحابہؓ سے کہتے ہیں کہ اگر تم راضی ہو تو اس ہار کو واپس لوٹا دیا جائے۔ سب نے سر تسلیم خم کر دیا اور ہار واپس کر دیا گیا

مال غنیمت

عربوں میں جنگ کی سب سے بڑی کشش مال غنیمت تھی۔ اسلام نے چونکہ جنگ اور صلح کے پیمانے ہی مختلف مقرر کئے تھے اس لئے مال غنیمت مقصود بالذات نہ تھا۔ اصل مقصد اعلاء کلمۃ الحق تھا اس میں اگر دشمن شکست کھا کر بھاگ نکلے، اور اپنا مال میدان میں چھوڑ جائے تو یہ بیشک حلال و طیب تھا لیکن اگر جنگ کا محرک جذبہ مال غنیمت ہو جائے تو یہ جنگ باطل کی جنگ ہوگی، حق کی نہ ہوگی۔ چونکہ مال غنیمت کے متعلق ابھی تک کوئی احکام نہیں آئے تھے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میدان ہاتھ آنے کے بعد مجاہدین کا مظفر و منصور لشکر مال غنیمت کی طرف لپک پڑا اور بجائے اس کے کہ یہ مال مرکز میں جمع ہو کر تقسیم ہوتا۔ سپاہیوں نے اسے حسب معمول اپنی انفرادی ملکیت سمجھ لیا۔ یہ منشائے خداوندی کے خلاف تھا۔ اس لئے اس پر تنبیہ کیا گیا۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (۸/۶۸)

اگر اس بارے میں، پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہو گیا ہوتا، جو کچھ تم نے جنگ بدر میں مال غنیمت لوٹا، اس کے لئے ضرور تمہیں بہت بڑا عذاب پہنچتا۔

لیکن چونکہ یہ محض سہو تھا، خرابی نیت نہ تھی اس لئے اس فرو گذاشت کو معاف کر دیا گیا۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۸/۶۹)

بہرحال جو کچھ تمہیں مال غنیمت میں ہاتھ لگا ہے، اسے حلال و پاکیزہ سمجھ کر اپنے کام میں لاؤ۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے!

سب سے پہلی عید

یہ سب کچھ ہو گیا تو عید الفطر کی شکل میں جشن فتح منایا گیا، یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی عید تھی، جس کی رسم اب ہمارے یہاں یوں ادا ہوتی ہے۔

عید آزاداں شکوہ ملک و دیں

عید محکوماں ہجوم مومنیں

بدر کی شکست نے کفار کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت بٹھا دی۔ اور اس طرح باطل کا وہ گروہ جو اپنی سرکشی اور

عناں تابی، میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ حق کے ساتھ پہلی ہی ٹکر میں بری طرح مجروح ہوا۔ اور یہی تھی وہ پہلی فتح جس کی یاد مسلمانوں کو بعد میں ان الفاظ میں دلائی جاتی تھی کہ

وَاذْكُرُوٓا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِى الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَـَٔاوَىٰكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

اور (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی۔ اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں۔ پھر اللہ نے تمہیں (مدینہ میں) ٹھکانا دیا، اپنی مددگاری سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا، تاکہ تم شکر گزار رہو!

نعمائے خداوندی کے دونوں گوشوں پر نگاہ ڈالئے (فَـَٔاوَىٰكُمْ) تمہاری حفاظت کا سامان کیا۔ لیکن اصل مقصد اتنا ہی نہیں تھا کہ تم کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر محصور ہو جاؤ، بلکہ مقصد یہ تھا کہ طاغوتی قوتوں کی سرکوبی ہو جائے، تاکہ دنیا میں قوانینِ حق و عدل کا نفاذ ہو! اس کے لئے تمہارے بازوؤں میں کوہ شکن قوت عطا فرمائی (وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ) جس سے تم نے سرکشی و عدوان کے بڑھتے ہوئے کف بدہاں سیلاب کو روکا اور اس طرح تمہیں آزادی کی فضا میں رزقِ طیب عطا ہوا (وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَٰتِ) کہ رزقِ طیب فی الحقیقت اسی قوم کے نصیب میں ہے، جو اس فضا میں سانس لے، جو طاغوتی حکومتوں کی انسانیت کش جراثیم سے پاک ہو اور اسے اس کی معراجِ کبریٰ تک پہنچنے کے لئے اذنِ بال کشائی دے، غلامی کا رزق تو وہ شجرۃ الزقوم ہے جسے اہلِ جہنم کا حصہ بتایا گیا ہے۔ اس رزق سے تو دم گھونٹ کر مر جانا اچھا کہ زہر آلود نانِ شیریں سے فاقہ ہزار درجہ بہتر ہے۔

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

جنگ احد

(۱۴ شوال ۳ھ مطابق ۲۹ مارچ ۶۲۵ء)

بدر کی شکست نے قریش کی آتش خاموش کو شعلۂ جوالہ میں بدل دیا۔ جن کے اقربا اس جنگ میں مارے گئے تھے، ان کے سینے جوش انتقام سے جہنم زار بن گئے، وہ سب مل کر ابو سفیان کے پاس گئے، اور یہ فیصلہ کیا کہ شام کے قافلہ کے سامان تجارت میں سے راس المال تو حصہ داروں کو واپس دیدیا جائے لیکن زرمنافع مقتولین بدر کے انتقام کے لئے الگ رکھ لیا جائے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ اپنے قومی شاعروں کو ملک کے طول و عرض میں بھیجا کہ وہ اپنی آتش نوائیوں سے ساری فضا کو مشتعل کردیں۔ بدر کی لڑائی میں عورتیں ساتھ نہیں گئی تھیں۔ اس مرتبہ بڑے بڑے اونچے گھرانوں کی عورتیں بھی فوج کی معیت میں تیار ہوگئیں، تاکہ میدان جنگ میں مردوں کو غیرت دلائیں، اور ان کے پاؤں اکھڑنے نہ دیں۔ اس ساز و سامان، اور شکوہ و سطوت کے ساتھ باطل کا یہ بحر مواج شوال ۳ھ میں مدینہ کی طرف امنڈا۔ حضورؐ نے اطلاع پانے پر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ اکابر صحابہؓ کی رائے تھی کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیجدیا جائے اور خود شہر کے اندر پناہ گیر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی نے بھی یہی رائے دی لیکن نوجوانان ملت کے شوق شہادت کا یہ عالم تھا کہ

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

انہوں نے اصرار کیا کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیئے! ان کے اصرار کی بنا پر حضورؐ نے بھی باہر نکل کر لڑنا منظور کرلیا۔ قریش کا لشکر مدینہ سے ڈیڑھ دو میل باہر، کوہ احد کے قریب آچکا تھا۔ حضورؐ ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ باہر نکلے جن میں عبداللہ بن ابی کی تین سو کی جماعت بھی تھی جو بنو سلمیٰ اور بنو حارث کے قبائل پر مشتمل تھی یہ رئیس المنافقین یہ کہکر راستہ سے اپنی جماعت سمیت واپس لوٹ آیا کہ چونکہ محمدؐ نے میری بات نہیں مانی، اس لئے میں ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (پ ۳ - ۱۲۰ - ۱۲۱)

اور (اے پیغمبر اسلام!) وہ وقت یاد کرو جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور (احد کے میدان

میں) لڑائی کے لئے مسلمانوں کو جا بجا مورچوں پر بٹھا رہے تھے اور اللہ سب کچھ سننے والا۔ جاننے والا ہے!

پھر جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں، (اور واپس لوٹ چلیں)، حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا، اور جو ایمان رکھنے والے ہیں انہیں تو چاہیئے (ہر حال میں) اللہ پر بھروسہ رکھیں!

اب حضورؐ کے ساتھ سات سَو کی جماعت رہ گئی۔ ان میں سے کمسن بچوں کو واپس کر دیا گیا۔ بدر کی طرح یہاں بھی بچوں

شوقِ شہادت

کا شوقِ شہادت اس فیصلہ کے نفاذ کلی میں عناں گیر ہو گیا۔ جب رافع بن خدیجؓ سے کہا گیا کہ تم چھوٹے ہو، واپس چلے جاؤ تو وہ پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے، کہ قد بڑا نظر آئے انہیں اذنِ معیت دی گئی تو ایک اور نوجوان (سمرۃ) جو ان کے ہمسن تھے مصر ہو گئے، اور انہوں نے یہ دلیل دی کہ میں رافع کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں۔ اگر انہیں اجازت دی گئی ہے تو مجھے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہ نے رافع کو زمین پر گرا دیا۔ اس بنا پر انہیں بھی اجازت دیدی گئی۔ حضورؐ نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صفیں قائم کیں۔ پشت کی طرف سے دشمن کی یورش کا خطرہ تھا۔ آپ نے تیر اندازوں کا دستہ اس طرف متعین فرمایا۔ اور تاکید فرما دی کہ کچھ بھی ہو وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔

جنگ شروع ہوئی، اگرچہ مقابلہ میں تین ہزار کا لشکر تھا جس میں قریب دو سو سوار بھی تھے۔ لیکن یہ جمعیت بھی مجاہدین کا مقابلہ کیا کر سکتی تھی؟ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے، اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے

فتح مبدّل بہ شکست

لیکن عین اس وقت ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے اس فتح کو مبدل بشکست کر دیا، تیر اندازوں کا وہ دستہ جو پشت پر حفاظت کے لئے متعین کیا تھا، ضبط نہ کر سکا۔ اور مالِ غنیمت لوٹنے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ کر میدان میں آ گیا۔ ان کے سپہ سالار حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے بہت روکا۔ لیکن وہ نہ رکے۔ ان کے ساتھ صرف چند جانباز رہ گئے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ مجاہدین میدان میں بے خطر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے، دیکھا تو سر پر تلواریں برس رہی ہیں۔ ایسی پریشانی پھیلی کہ اپنے بیگانے کی خبر نہ رہی، حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ جو رسول اللہ سے صورت میں مشابہ تھے شہید ہو گئے تو غل مچ گیا کہ رسول اللہؐ نے شہادت پا لی ہے۔ اس سے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

اس اضطراب اور بدحواسی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ خود رسول اللہ کہاں ہیں؟ عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا کسی طرح حضورؐ کے قریب آ گیا، اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری جس سے مغفر کی دو کڑیاں چہرے میں چبھ کر رہ گئیں اتنے میں شمع نبوت کے پروانوں نے حضورؐ کو اپنے گھیرے میں لے لیا نیزوں، اور تلواروں کی بوچھار ہو رہی تھی لیکن یہ جاں نثار ان سب کو اپنے سینوں پہ لے رہے تھے، تاکہ حضورؐ ان کی زد سے محفوظ رہیں۔ وہ مخالفین یہ کچھ کر رہے تھے

اور ادھر حضور کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (مسلم) "اے خدا میری قوم کو معاف کر دے کہ وہ جانتے نہیں ہیں" حضور تیر وسنان کی اس بارش کے باوجود ثابت قدمی سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے جہاں دشمنوں کی رسائی نہ تھی۔ ابوسفیان خوش تھا کہ رسول اللہ نے شہادت پالی ہے۔ اس نے مقابل کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ

اُعْلُ هُبَلُ ــــ ھبل کا بول بالا ہو۔

صحابہؓ نے حضورؐ کے حکم سے جواب دیا کہ

اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ ــــ بلند وبالا تو اللہ کا بول ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ

لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ ــــ ہمارے پاس عزی (بت) ہے تمہارے پاس نہیں

صحابہؓ نے کہا کہ

اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ خدا ہمارا آقا ہے تمہارا کوئی آقا نہیں۔

قرآنی تفاصیل

ابوسفیان کو جب معلوم ہوا کہ حضورؐ شہید نہیں ہوئے، زندہ ہیں تو اپنی فوج سمیت واپس چلا گیا۔ قرآن کریم نے واقعۂ احد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۳/۱۵۲)

اور دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت پورا کر دکھایا تھا جبکہ تم اس کے حکم سے دشمنوں کو تہ تیغ کر رہے تھے، اور ہر طرح جیت تمہاری ہی تھی، لیکن جب ہم نے تمہیں فتحمندی کا جلوہ دکھا دیا، جو تمہیں اس قدر محبوب ہے، تو تم نے کمزوری دکھلائی، اور جنگ کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے، (ایک گروہ نے کہا اب مورچہ پر ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے؛ دوسرے نے کہا نہیں، ہم تو آخر تک یہیں جمے رہیں گے،) اور (بالآخر اپنے قائد کے حکم سے کہ اللہ کا رسول تھا،) نافرمانی کر بیٹھے، تم میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو دنیا کے خواہشمند تھے (یعنی مال غنیمت کے پیچھے پڑ گئے) کچھ ایسے تھے کہ جن کی نظر آخرت پر تھی (یعنی مال غنیمت سے بے پرواہ ہو کر اپنی جگہ پر جمے رہے

ؔ بحوالہ بخاری۔

اور شہید ہوئے) پھر ہم نے تمہارا رُخ دشمنوں کی طرف سے پھرا دیا، تاکہ تمہیں (اس حادثہ سے) آزمائیں (اور اس طرح تمہاری فتح شکست سے بدل گئی) باایں ہمہ خدا نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ (اور اس لغزش کے اثرات سے تمہارے دل پاک و صاف ہو گئے) بلاشبہ وہ مومنوں کے لئے بڑا ہی فضل والا ہے!

یہ دو جماعتیں، تیر اندازوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ وہ جو اپنے امیر کے حکم کے خلاف مال غنیمت پر ٹوٹ پڑا۔ دوسرا وہ جو اس کے ساتھ اپنی جگہ پر جما رہا۔ اس کے بعد

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (۳/۱۵۲)

(اے پیروان دعوت ایمانی، وہ وقت بھی یاد کرو جب تم میدان جنگ سے) بھاگے جا رہے تھے۔ اور بدحواسی کا یہ حال تھا کہ) ایک دوسرے کی طرف مڑ کر دیکھتا تک نہ تھا، اور اللہ کا رسول تھا کہ پیچھے سے پکار رہا تھا، سو جب تمہارا یہ حال ہوا تو اللہ نے بھی تمہیں رنج پر رنج دیا۔ تاکہ (اس حادثہ سے عبرت پکڑو، اور آئندہ) نہ تو اس چیز کے لئے رنج و ملال کرو، جو ہاتھ سے جاتی رہے، نہ اس مصیبت پر غمگین ہو جو سر پر آپڑے، اور یاد رکھو جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

پھر جب نبی اکرمؐ امن و حفاظت سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور ابوسفیان کا لشکر واپس لوٹ گیا تو مسلمانوں کو اطمینان نصیب ہوا۔ اب جو مافات پر تبصرہ شروع ہوا تو ایسے کمزور دل لوگ بھی تھے جو اسے طرح طرح کے ظنون و اوہام پر محمول کرتے تھے۔

ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۳/۱۵۳)

پھر دیکھو! ایسا ہوا کہ اللہ نے (ابتری و پریشانی کے) غم و افسوس کے بعد، تم پر بے خوفی کی خود فراموشی طاری کر دی (یعنی یکایک تمہارے دل اس طرح مطمئن ہو گئے کہ خوف و ہراس کا احساس تک باقی نہ رہا) یہ حالت ایک گروہ پر چھا گئی تھی۔ لیکن تم میں ایک دوسرا گروہ تھا جسے اس وقت بھی اپنی جانوں ہی کی پڑی تھی

اور اللہ کی جناب میں عہد جاہلیت کے سے ظنون و اوہام رکھتا تھا۔ اس گروہ کے لوگ کہتے تھے "جو کچھ ہوا اس میں ہمیں کچھ دخل نہ تھا" (یعنی ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم کچھ کرتے) اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے کہدو! (کہ معاملہ پر کیا موقوف ہے) ساری باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں (لیکن اللہ ہی نے ہر نتیجہ کے لیے اس کے اسباب بھی مقرر کر دیئے ہیں) اصل یہ ہے کہ جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے وہ تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے کہنے کا اصلی مطلب یہ ہے کہ اگر اس معاملہ میں ہمارے لئے (فتح وکامرانی) سے کچھ ہوتا تو میدان جنگ میں نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبر! ان سے کہدو کہ اگر تم اپنے گھروں کے اندر بیٹھے ہوتے، جب بھی جن کے لیے مارا جانا تھا، وہ گھر سے ضرور نکلتے اور مارے جانے کی جگہ پہنچ کر رہتے۔ اور (جنگ احد میں جو کچھ پیش آیا، تو اس میں چند در چند مصلحتیں پوشیدہ تھیں ازاں جملہ یہ کہ) اللہ کو منظور تھا، جو کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہوا ہے اس کے لئے تمہیں آزمائش میں ڈالے، اور جو کدورتیں تمہارے دلوں میں پیدا ہو گئی تھیں انہیں پاک وصاف کر دے، اور اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو انسانوں کے دلوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

جن تیر اندازوں کی غلطی سے یہ سب کچھ واقعہ ہوا وہ اپنے قصور پر سخت نادم اور اس کے نتائج پر سخت منفعل تھے، اس لئے مبدء فیض کی شان کریمی نے ان کے قطرات انفعال کو موتی سمجھ کر چن لیا۔ اور ان کی لغزش کو اپنی مغفرت کے دامن سے ڈھانپ دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ؀ (۳/۱۵۵)

تم میں سے اُس دن جن لوگوں نے لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے، تو ان کی لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کے باعث جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں، شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے (یہ بات نہ تھی کہ ان کے ایمان میں فتور آگیا ہو۔ بہر حال) یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی، وہ یقیناً بخش دینے والا۔ اور انسانوں کی کمزوریوں، اور خطاؤں کے لئے بہت بردبار ہے۔

اب اس کے بعد اس واقعہ کے نتائج وعواقب کی طرف توجہ دلائی، تاکہ وہ آئندہ کے لئے عبرت وموعظت کا کام دے۔ فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

بَصِيرٌ ۝ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (۳/ ۱۵۵-۱۵۶)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! دیکھو، ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، اور جن کا شیوہ یہ ہے کہ اگر ان کے بھائی بند سفر میں گئے ہوں، یا جنگ میں مشغول ہو گئے ہوں، اور انہیں موت پیش آ جائے، تو کہنے لگتے ہیں۔ "اگر یہ لوگ گھر سے نہ نکلتے اور ہمارے پاس ٹھہرے رہتے، تو کاہے کو مرتے، یا مارے جاتے (حالانکہ ایک خداپرست کے دل میں ایسے خطرات کبھی نہیں گذر سکتے، اور یہ بات جو تمہیں کہی گئی تو اس لئے کہی گئی) تاکہ اللہ اس بات کو (یعنی تمہارے دلوں کی بے خوفی، اور ایمان کی استواری کو) منکرین حق کے لئے داغ حسرت بنا دے (کہ کسی حال میں بھی تمہیں کمزور و بے ہمت نہ کر سکیں) یاد رکھو، اللہ ہی کے ہاتھ موت و زندگی کا سررشتہ ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اس کی نگاہ سے مخفی نہیں!

باقی رہی یہ شکست تو اس سے بد دل اور شکستہ خاطر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۳/ ۱۶۴)

جب (جنگ احد میں) تم پر مصیبت پڑی، اور یہ مصیبت ایسی تھی کہ اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (بدر میں) دشمنوں پر پڑ چکی ہے، تو تم بول اٹھے "یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آ پڑی" اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو (ہاں مصیبت تو ضرور آ پڑی) مگر خود تمہارے ہی ہاتھوں آئی (اگر تم کمزوری نہ دکھاتے اور احکام حق کی اطاعت کرتے تو کبھی یہ مصیبت پیش نہ آتی) یاد رکھو اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں!

یہ سب اس لئے تھا کہ

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ۝ (۳/ ۱۶۵-۶۶)

اور دیکھو، دو گروہوں کے مقابلہ کے دن تمہیں جو کچھ پیش آیا (یعنی جنگ احد میں جو کچھ پیش آیا) تو اللہ ہی کے حکم سے پیش آیا، (کیونکہ اس نے فتح و شکست کا قانون ایسا ہی ٹھہرا دیا ہے) اور اس لئے پیش آیا، تاکہ ظاہر ہو جائے کہ ایمان رکھنے والے کون ہیں اور نفاق والے کون ہیں؟ (چنانچہ منافقوں کا نفاق اس موقع پر پوری طرح کھل گیا) جب ان سے کہا گیا "آؤ! (وقت کا فرض انجام دیں) یا تو اللہ کی راہ میں

(باہر نکل کے) جنگ کرو، یا (شہر میں رہ کر) دشمنوں کا حملہ روکو۔ تو کہنے لگے "اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لڑائی ضرور ہو گی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے" یقین کرو جس وقت انھوں نے یہ بات کہی، تو وہ کفر سے زیادہ نزدیک تھے بمقابلہ ایمان کے! یہ لوگ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جو فی الحقیقت ان کے دلوں میں نہیں ہے، اور جو کچھ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں خدا اس سے بے خبر نہیں!

وہ لوگ جن کی کیفیت یہ ہے کہ

الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ (۳/۱۶۸)

جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو (جنگ کے وقت) اپنے گھروں میں بیٹھے رہے لیکن اپنے بھائیوں کے حق میں کہتے ہیں "اگر ہماری بات پر چلتے تو کبھی نہ مارے جاتے" اے پیغمبر! تم کہدو! اچھا اگر تم واقعی (اپنے اس خیال میں) سچے ہو تو جب موت تمہارے سرہانے آکھڑی ہو تو اسے نکال باہر کرنا (اور اپنی چترائی و پیش بینی سے ہمیشہ زندہ رہنا!)

جن مجاہدین نے میدان جنگ کے اضطراب و پریشانی کے باوجود حضورؐ کی آواز پر لبیک کہا اُن کے متعلق فرمایا

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ○ (۳/۱۷۲)

(اور اے پیغمبر اسلام!) جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا۔ (اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے باوجودیکہ (ایک برس پہلے جنگ کا) زخم کھا چکے تھے، سو یاد رکھو، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً ان کے لئے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے!

باقی رہے کفار، تو ان کے لئے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ○ (۳/۱۷۸)

اور (اے پیغمبر اسلام!) یہ جو ہم ان لوگوں کو جنھوں نے انکار کی راہ اختیار کی ہے (زندگی، اور سروسامان زندگی کی مہلت دے کر) ڈھیل دے رہے ہیں، تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ڈھیل ان کے حق میں بہتری ہے۔ نہیں ہم انہیں ڈھیل دیر رہے ہیں کہ (اگر بدعملیوں سے باز آنے والے نہیں، تو) اپنے گناہ میں اور زیادہ پختہ ہو جائیں، اور بالآخر ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے!

اس جنگ میں کئی ایک خواتین اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہؓ کے متعلق روایت ہے کہ آپ

خواتین کی شرکت

مشکیں بھر بھر لاتی تھیں، اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، حضرت ام عمارہؓ کے متعلق منقول ہے کہ جب نبی اکرمؐ کو دشمنوں نے نرغہ میں لے لیا تو آپ نے سپر بن کر حضورؐ کو اپنی اوٹ میں لے لیا، اور تیروں کی بوچھار کو اپنے آپ پر روکنے لگیں، جب ابن قمیہ حضورؐ کے قریب آیا تو حضرت ام عمارہ نے تلوار سے اس پر وار کیا۔ وہ چونکہ زرہ پوش تھا اس لئے وار سے بچ گیا، لیکن اس کی تلوار سے آپ کے کندھے پر گہرا زخم آگیا۔ جب نبی اکرمؐ کی شہادت کی (غلط) خبر مدینہ پہنچی تو وفاشعار خواتین اسلام بے تابانہ گھروں سے نکل آئیں اور میدان کی طرف چل پڑیں، حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے آکر دیکھا تو حضورؐ کے چہرۂ مبارک سے جو مغفر کی کڑیوں سے زخمی ہو گیا تھا ابھی تک خون جاری تھا، حضرت علیؓ اور آپ نے مل کر زخموں کو دھویا۔

دوسری طرف غیر مسلم خواتین کا یہ حال تھا کہ جب حضرت حمزہؓ کو وحشی غلام نے شہید کیا ہے تو ابوسفیان کی بیوی ہند نے آکر ان کا مُثلہ کیا اور کلیجہ نکال کر کچا چبا گئی (اس سے ان لوگوں کی خوئے درندگی کا اندازہ لگایئے)

حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صفیہؓ شکست کی خبر سن کر میدان میں آئیں، حضورؐ نے اس خیال سے انہیں لاش دیکھنے سے روک دیا کہ مبادا بھائی کی لاش کو اس حالت میں دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں، انہوں نے حضورؐ کا پیغام سنا تو کہا کہ کوئی بات نہیں، میں بھائی کے متعلق سب ماجرا سن چکی ہوں، یہ خدا کی راہ میں کوئی بڑی قربانی نہیں۔ حضورؐ نے اجازت دیدی تو آپ لاش پر گئیں۔ جان سے پیارے بھائی کے ٹکڑے خاک و خون میں آغشتہ سامنے پڑے تھے، مغفرت کی دعا مانگی، اور ضبط کی ایک دنیا آنکھوں میں لئے خاموش واپس آگئیں۔

اس لڑائی میں مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمی شہید ہوئے۔ مسلمانوں کے افلاس کا یہ عالم تھا کہ شہیدوں کے کفن کے لئے پورا کپڑا نہ تھا چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے سر کو کپڑے سے ڈھانپا گیا اور پاؤں کو گھاس سے۔ دو دو شہیدوں کو ملا کر ایک ایک قبر میں دفنایا گیا۔ جسے قرآن زیادہ یاد ہوتا تھا اسے مقدم کیا جاتا۔

ایک صاحب عمرو بن ثابت جو اصیرم کے نام سے مشہور تھے، مسلمانوں کے ساتھ احسان و مروت سے پیش آیا کرتے تھے لیکن اسلام نہیں لائے تھے، غزوۂ احد کے دن اُن کے دل میں صداقت نے جوش مارا مسلمان ہوئے اور تلوار ہاتھ میں لے کر کسی کو خبر کئے بغیر سیدھے میدان میں جا پہنچے۔ جاں فروشانہ لڑے اور شہید ہو گئے، انہی کے متعلق (بروایت حضرت ابوہریرہؓ) مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ اصیرم نے

معراج شہادت

ایک وقت کی بھی نماز نہ پڑھی لیکن سیدھا جنت میں چلا گیا

عشق نے اک جست میں طے کر دیئے قصے تمام

اس زمین و آسمان کو لامکاں سمجھا تھا میں

دوسری طرف یہ واقعہ بھی قابل غور ہے کہ مدینہ میں ایک شخص قزمان تھا۔ اس کی حرکات اس قدر واضح تھیں کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ غزوۂ احد کے دن اس نے کفار قریش کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ تنہا سات آٹھ مشرکوں کو قتل کیا، صحابہؓ اس کی دلیری پر بہت خوش تھے، اور حیران تھے کہ ایسے شخص کے متعلق مخبر صادقؐ نے کیسے فرمایا کہ یہ جہنمی ہے۔ وہ زخمی ہوا تو صحابہؓ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ قزمان! ہم تجھے بشارت دیتے ہیں۔ تو نے بہت بڑا کام کیا۔ اس نے کہا کہ بشارت کا ہے کی؟ یہ تو مکہ اور مدینہ والوں کی باہمی جنگ تھی۔ قومی حمیت نے ابھارا اور میں میدان میں آگیا یہ نہ ہوتا تو میں کبھی نہ لڑتا۔ اب صحابہؓ کی سمجھ میں آیا کہ میدان جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے کفار کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے جان دیدینے کے باوجود، مرنے والا کس طرح جہنمی کا جہنمی رہتا ہے۔ شہادت اسی وقت ہے جب سر اللہ کے لئے دیا جائے، نہ کہ اس وقت جب اسے وطن کے دیوتا کی بھینٹ چڑھایا جائے۔

"وطن پرست" کی موت

غور فرمایا آپ نے کہ قرآن کی میزان میں محض حب الوطنی کیا وزن رکھتی ہے؟ اور اس کے باوجود مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو حب الوطنی کو من الایمان کہتے ہیں۔ اور قیامت پر قیامت کہ اس مقولہ کو منسوب کرتے ہیں اس ذات گرامی کی طرف جس کی بعثت خدائے واحد کی توحید کو قائم کرنے اور دنیا سے اس قسم کے تمام بتوں کو توڑنے کے لئے ہوئی تھی۔ وطن قیام حکومت الٰہیہ کا فقط ایک ذریعہ ہے۔ اور بس! اس لئے کہ ریاست (state) کے قیام کے لئے زمین اولین شرط ہے، مومن اگر زمین کے لئے لڑتا ہے تو اس لئے کہ اس پر قرآنی نظام ریاست قائم ہو سکے گا۔ اگر یہ مقصود نہیں تو وہ اپنا سر اللہ کے ہاتھ نہیں کسی اور کے ہاتھ بیچتا ہے، وَذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ اور اگر قزمان کا مطلب یہ تھا کہ وہ قبائلی عصبیت کی بناء پر لڑا ہے تو اس موت کے "موت جاہلیت" ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ آج دنیا ان ہی جذبات کے تحت مصروف جنگ و قتال، اور مشغول تگ و تاز ہے اور ظاہر ہے کہ اس سعی و جدوجہد کا وزن قرآن کی میزان میں کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن قرآن کو پس پشت ڈالنے والا مسلمان ہے کہ اوروں کی دیکھا دیکھی اس تگ و دو کو جہاد آزادی اور جنگ حریت نام دے کر اپنے آپ کو مغالطہ اور دوسرے کو فریب دیتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

ؔ اوائل ۱۹۴۷ء میں لکھا گیا۔

(۳) جنگ احزاب

ذیقعدہ ۵ھ

میدان بدر میں مسلمانوں کی فتح نے مخالف عناصر کے حوصلے فی الجملہ پست کر دیئے تھے لیکن احد کی شکست نے راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دیدی اور مخالفت و عدوان کے جذبات میں از سر نو سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ اب ان فتنہ پردازیوں کا سب سے بڑا مرکز خود مدینہ تھا۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ میں یہودیوں

مدینہ کے یہود

کا بڑا اثر و اقتدار تھا نبی اکرمؐ نے ان سے معاہدہ کر رکھا تھا۔ لیکن ان میں مدت ہائے دراز کی بے مرکزی سے دنائیت اور تسفّل کی ایسی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کی وجہ سے انہیں عہد و معاہدہ کا کوئی پاس ہی نہ تھا۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ یہ لوگ قریش کی طرح کھلی ہوئی دشمنی نہیں کرتے تھے بلکہ مار آستین بن کر ڈستے تھے، منافقت سے مسلمان ہو جاتے اور اس طرح ان کی جماعت میں داخل ہو کر تخریبی سازشیں کرتے۔ یہ سب سے بڑا فتنہ تھا جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے سینہ کا ناسور بنگیا تھا۔ قرآن کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ اہل کتاب و منافقین کی اسلام برانداز سازشوں اور انسانیت کش و انسانیت سوز دسیسہ کاریوں کی اجمالی اور تفصیلی داستانیں ہر جگہ بکھری ہوئی نظر آئیں گی۔ ان تفاصیل کا یہ موقع نہیں مختصراً یوں سمجھئے کہ مؤمنین کی قوتوں کا بڑا حصہ اسی فتنہ کے استیصال کی نذر ہو گیا۔ منافقین کی یہ تدلیسات و تلبیسات ان کے اپنے دائرہ سے نکل کر عربی قبائل کو بھی متاثر کر گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بھی بدعہدی و غداری شروع کر دی۔ ۴ھ کا ذکر ہے کہ قبیلہ کلاب کے رئیس، ابو البراء نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ چند مبلغین کو اس کے ساتھ بھیجدیا جائے تاکہ وہ اس کے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیں حضورؐ نے ستر

مسلم مبلغین کی شہادت

انصار اس کے ساتھ کر دیئے۔ انہوں نے اپنے نمائندہ حرام بن ملحان کو اس قبیلہ کے دوسرے سردار عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ عامر نے حرام کو قتل کر دیا اور خود آس پاس کے قبائل کے ساتھ ایک لشکر لے کر آگے بڑھا۔ اور تمام صحابہؓ کو نرغے میں لے کر شہید کر دیا۔ صرف ایک عمروؓ امیہ) کو یہ کہکر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں۔ اس واقعۂ فاجعہ اور حادثۂ ہائلہ سے حضورؐ اور صحابۂ کبار کے دل پر جو قیامت گذری ہوگی اس کا اندازہ ہر قلب مؤمن لگا سکتا ہے۔ اسی طرح عضل اور قارۃ کے دو قبیلوں کے چند آدمیوں نے آکر کہا کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے چند آدمیوں کو ہمارے ساتھ بھیجدیجئے تاکہ وہ انہیں اسلام کے احکام سکھا دیں، آپ نے حضرت عاصم بن ثابتؓ کی سیادت میں دس صحابہ کو ساتھ

کر دیا۔ راستہ میں ان بدبختوں نے غداری کی اور بنو لحیان کے دو سو آدمیوں کو اشارہ کر دیا کہ انہیں قتل کر دو

کفار کی پناہ میں نہیں آنا چاہتے

صحابہؓ یہ بھانپ کر ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے۔ تیر اندازوں نے کہا کہ تم نیچے اتر آؤ ہم تمہیں پناہ دیں گے لیکن حضرت عاصمؓ نے کہا کہ ہم کفار کی پناہ میں نہیں آنا چاہتے۔ سات مجاہد تو وہیں شہید ہو گئے تین کو یہ قیدی بنا کر ساتھ لے گئے۔ ایک کو راستہ میں شہید کر دیا۔ اور باقی دو (حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ) کو اہل مکہ کے پاس فروخت کر دیا۔ حضرت خبیب نے جنگ احد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ انہیں اس کے لڑکوں نے خرید لیا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے۔ ایک دن یہ ان ہی کے گھر میں حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے، بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آگئی اور دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، یہ دیکھ کر کانپ اٹھی۔ حضرت خبیبؓ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، ہم بچوں کو قتل نہیں کیا کرتے۔ حارث کے بیٹے انہیں باہر لے گئے اور انہیں قتل کرنا چاہا۔ آپ نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دیدی۔ انہوں نے نماز پڑھ کر کہا کہ جی تو

قابل رشک شہادت

چاہتا تھا کہ دیر تک نماز پڑھتا رہوں لیکن اس سے شاید تمہیں خیال گذرتا کہ میں موت سے ڈرتا ہوں۔ اس لئے نماز ختم کرتا ہوں۔ اللہ اکبر! عین تلوار کے نیچے گردن رکھ کر اس قدر طمانیت قلب صرف ایمان محکم سے نصیب ہو سکتی ہے۔ اسی زمانہ سے یہ دستور ہو گیا ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہے۔ حضرت زیدؓ کو قتل کرنے لگے تو ابوسفیان نے جو تماشائیوں کے ہجوم میں کھڑا تھا کہا کہ سچ بتلاؤ اگر اس وقت تمہارے بدلے محمدؐ قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوشی نہ سمجھتے! انہوں نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ او بدبخت، کیا کہتا ہے میں تو اپنی جان کو اتنا بھی عزیز نہیں رکھتا کہ اس کے عوض رسول اللہ کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے۔ یہ تھی رسول کی محبت!

اب خود یہود کی طرف آئیے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان کے تین قبیلے (بنو قینقاع، نضیر، اور قریظہ) مدینہ میں تھے، جن سے حضورؐ نے معاہدۂ امن و اتحاد کیا تھا۔ اس معاہدہ کو سب سے پہلے قینقاع نے توڑا

یہود کی عہد شکنی

مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حضورؐ نے ان کا محاصرہ کیا۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد وہ تنگ آگئے انہوں نے عبداللہ بن ابی کو ثالث بنایا جس کے فیصلے کے مطابق انہیں مدینہ سے جلا وطن کر دیا گیا۔ بنو نضیر کی طرف سے بھی نقض عہد کے آثار و قرائن پے در پے ظہور میں آ رہے تھے۔ حتیٰ کہ حضورؐ کی جان تک پر حملہ کرنے میں بھی دریغ

نہ کیا آپ نے ان سے تجدید عہد کے لئے کہا۔ لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہیں اپنے قلعوں پر ناز تھا اور منافقین در پردہ ان کی حمایت پر تلے بیٹھے تھے۔ حضورؐ نے ان کا بھی محاصرہ کیا اور درختوں کے وہ جھنڈ جن سے وہ کمین گاہوں کا کام لیتے تھے کٹوا دیئے۔ پندرہ دن کے بعد انہوں نے بھی امان چاہی تو انہیں اجازت دیدی گئی کہ وہ اپنا مال و متاع لے کر مدینہ سے چلے جائیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر خیبر کی طرف چلے گئے۔ سورۂ حشر میں ان ہی یہودیوں اور ان کے خفیہ مددگار منافقین کا ذکر ہے۔ شروع میں ہی ہے

هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۝ وَلَوْلَآ اَنْ کَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِی الدُّنْیَا ۗ وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۵۹: ۲-۴)

(اے پیروان دعوت ایمانی! یقین کرو) تمہارا پروردگار وہی ہے جس نے ان اہل کتاب (یہودیوں) کو جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی تھی پہلی مرتبہ ہی سب کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ مسلمانو تم (ان کی ظاہری شان و شوکت کی وجہ سے) یہ گمان بھی نہ کرسکتے تھے کہ وہ (اس طرح) نکل جائیں گے اور وہ (خود بھی) یہ گمان کئے ہوئے تھے کہ ان کے قلعے انہیں (اللہ کے انتقام اور اس کی گرفت سے) بچائے رہیں گے۔ (مگر ان کی یہ توقعات نقش بر آب ثابت ہوئیں اور دنیا نے دیکھ لیا کہ) خدا (کا عذاب) ان پر ایسی جگہ سے آپہنچا کہ اس کا انہیں خیال بھی نہ تھا۔ اور ان کے دلوں میں (مسلمانوں کا اتنا) رعب ڈال دیا کہ وہ خود ہی اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے۔ پس اے ارباب دانش! (اس واقعہ سے) عبرت حاصل کرو! اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ خدا اپنے قانون مشیت میں ان (یہودیوں) کے لئے جلاوطنی (کا عذاب) لکھ چکا تھا تو انہیں دنیا ہی میں اس سے بھی ذلیل ترین عذاب یعنی قتل کی سزا دیجاتی، اور ان کے لئے آخرت میں (تو) دوزخ کا عذاب ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ وہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔ اور ظاہر ہے کہ جو لوگ اللہ کی مخالفت پر کمربستہ ہوجائیں تو (یاد رکھو!) اللہ بھی (بدلہ اس عمل میں) سخت ترین سزا دینے والا ہے

ان ہی کے وہ درخت کاٹے گئے تھے جن کی طرف قرآن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۵۹)

(اے مسلمانو!) تم نے جو کھجوروں کے درخت کاٹ دیئے، یا ان کو ان کی جڑوں پر بدستور کھڑا رہنے دیا۔ تو (یاد رکھو! یہ سب کچھ) اللہ کے حکم (ورضامندی کے عین) مطابق ہے اور (اس لئے ہے کہ) فاسقین کو ذلیل ورسوا کرے

اور یہی تھے جو اپنے مال میں سے کچھ تو لے گئے، اور باقی چھوڑ گئے، جسے دین کی اصطلاح میں فے کہا جاتا ہے

وَمَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۵۹)

اور اللہ نے اپنے رسول کو ان (قبیلۂ نضیر کے یہودیوں سے) جو کچھ دلوایا تو (یہ حقیقت ہے کہ) تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے ہیں نہ اونٹ (بلکہ بلا زحمت ومشقت تمہارے ہاتھ آگیا) اور یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو جس مال پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے!

اس مال فے کی تقسیم کے متعلق فرمایا۔

مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ (۵۹)

جو کچھ اللہ اس طرح اپنے رسول کو دوسری لبستیوں (کے کافروں) سے دلوا دے سو وہ بھی اللہ کا حق ہے، اور اس کے رسول کا، اور آپ کے قرابت داروں کا، یتیموں کا، مسکینوں کا، اور (غریب) مسافروں کا (یہ حکم تقسیم اس لئے بیان کر دیا گیا) تاکہ (یہ مال فے) تم میں سے صرف تونگروں کے حصہ میں نہ آجائے۔ اور (مسلمانو!) یاد رکھو! تمہیں رسول جو کچھ دیا کرے تم (بطیب خاطر) اسے لیا کرو! اور جس سے منع کرے اس سے باز رہنے کی کوشش کرو! اور (ہر معاملہ میں) اللہ سے ڈرتے رہو! (چونکہ اللہ مخالفوں کو پاداش عمل میں سخت ترین سزا دینے والا ہے!

ان ہی کے مددگار وہ منافقین تھے جن کے متعلق فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (۱۱)

(اے پیغمبر اسلام!) کیا آپ نے ان منافقین (عبداللہ بن ابی وغیرہ) کو نہیں دیکھا جو اپنے (ہم مذہب) بھائیوں اہل کتاب (یہودیوں) سے کہتے ہیں جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی کہ اگر تم (مدینہ سے) نکالے گئے تو ہم بھی یقیناً تمہارے ساتھ نکل پڑیں گے۔ اور ہم تمہارے معاملہ میں کسی کی بات ماننے والے نہیں، اور اگر تمہاری کسی سے جنگ ٹھن گئی تو بلاشک ہم تمہاری مدد کریں گے، اور اللہ (اس بات پر) شاہد (عادل) ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں

یہ ان کے زبانی دعوے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ لَاَانْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ (۵۹ — ۱۲ — ۱۳)

(اے مسلمانو! حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ) اگر یہ (اہل کتاب) نکالے گئے تو یہ (منافقین) اُن کے ساتھ (ہرگز) نہیں نکلیں گے، اور اگر ان کے ساتھ جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد بھی نہیں کریں گے اور اگر (بفرض محال) مدد کرنے بھی لگ گئے تو یقیناً پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ پھر ان کی مدد کی کچھ (پیش) نہ چلے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ (تم لوگوں کا خوف ان (منافقین) کے دل میں اللہ سے بھی زیادہ ہے اور یہ اس لئے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ سے کورے ہیں۔

یہود کی قلعہ بندیوں کے متعلق فرمایا

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۴)

یہ (یہود و منافق) لوگ تو سب مل کر بھی تم سے نہ لڑیں گے، اگر لڑیں گے بھی تو محفوظ بستیوں میں (شہر بند ہو کر یا شہر پناہوں (قلعہ کی فصیلوں) کی آڑ لے کر ان کی آپس ہی میں لڑائی بہت سخت ہے۔ (فریق مقابل) یہ سمجھتا ہے کہ وہ سب ایک ہیں حالانکہ ان کے دل (ایک دوسرے سے) الگ الگ ہیں اور یہ سب (نا اتفاقی) اس لئے ہے کہ یہ لوگ ایسے ہیں جو (قطعاً) عقل نہیں رکھتے!

ذرا اس خصلت یہودیہ پر غور کیجئے کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ان کے سر ملے ہوئے ہوں گے لیکن دل ایک دوسرے سے الگ الگ۔ اور پھر ذرا آج اپنی حالت پر بھی نگاہ ڈالئے! اس آئینہ میں خود اپنی صورت نظر آجائے گی؟ اور ان کے انجام کے متعلق فرمایا۔

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝ (پ ۲۸ ع ۵۹)

(یہ یہود بنو نضیر) ان لوگوں کی طرح ہیں جو ان سے کچھ ہی پہلے گذر چکے ہیں، اور اپنے افعال (شنیعہ) کا مزہ چکھ چکے ہیں، (اس دنیاوی سزا کے بعد) آخرت میں بھی ان کے لئے (بڑا ہی) دردناک عذاب ہے (اور نیز ان (منافقین) کی شیطان کی طرح مثال ہے کہ (اوّل تو) انسان سے کہتا ہے کہ تو انکار کا رستہ اختیار کر! پھر جب وہ (اس کے فریب میں مبتلا ہو کر) کفر اختیار کر لیتا ہے تو (اس سے کہنے لگتا ہے) میں تجھ سے بری الذمہ ہوں (اور) میں تو اللہ سے ڈرنے والا ہوں جو دنیا جہان کا پروردگار ہے پس (نتیجۃً آخری انجام) کار دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں کے دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے۔ اور (خدا کے قانون میں) ظالموں کی یہی سزا ہے۔

جنگ احزاب تک پہنچنے کے لئے ان تمہیدی تفاصیل کو سامنے لانا ضروری تھا، قریش و یہود کی اب متفقہ سازش نے عالمگیر حیثیت اختیار کر لی۔ بنو نضیر نے خیبر پہنچنے کے بعد قریش مکہ کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا۔ وہ پہلے ہی سے آمادہ بیٹھے تھے۔ پھر یہ قبیلہ غطفان کے پاس پہنچے، اور انہیں بھی جنگ کیلئے آمادہ کر لیا۔ قبیلۂ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی، اس تعلق کی بنا پر وہ بھی شرکت کے لئے تیار ہو گئے بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا وہ بھی آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ تمام طاغوتی قوتیں اپنے اپنے اختلافات کو بالائے

جنگ احزاب

طاق رکھ کر حق کے مقابلہ کے لئے یکجا ہو گئیں کہ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ۔ اسی جہت سے اس جنگ کو جنگ احزاب کہتے ہیں۔ یعنی مختلف جماعتوں کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ! یہ لشکر جرار آندھی کی طرح اٹھا۔ اور مدینہ کے مضافات تک آپہنچا۔ بنی قریظہ کے یہود جنہوں نے مسلمانوں سے عہد کیا تھا، ابھی تک الگ تھے۔ لیکن بنی نضیر کی ترغیب سے یہ بھی مخالفین کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور اب کفار و یہود کی پوری قوتیں حق کے مقابلہ میں آگئیں۔ تصادم و تزاحم کا یہی وہ ہجوم تھا جس کی

تصویر قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (۳۳: ۱۰-۱۱)

(اے مسلمانو! وہ وقت یاد کرو!) جب وہ لوگ (یہود و کفار) تم پر اوپر اور نیچے ہر طرف سے (رزغہ کرکے) آچڑھے تھے اور (دہشت کے مارے تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں اور (حالت یہ تھی کہ) کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا اور تم اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے تو اس موقع پر مسلمانوں کا (پورا، پورا) امتحان لیا گیا تھا (جس میں وہ پورے اُترے) بہت ہی بری طرح جھنجوڑ ڈالے گئے تھے۔

نبی اکرمؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو حضرت سلمانؓ پارسی کی رائے سے یہ طے پایا کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیجدیا جائے اور خود ایک خندق کے اندر پناہ گزین ہو کر مدافعت کریں۔ چنانچہ ایک بہت بڑی خندق کھودی گئی۔ اللہ کے ان مزدوروں میں خود حضورؐ بھی شامل تھے، اور

خندق کی تیّاری

بایں نمط کہ فاقوں سے شکم مبارک پر پتھر باندھ رکھے تھے۔ اور تمام جسم خندق کے گرد و غبار سے اٹ رہا تھا۔ یہ تھی جماعت مؤمنین کی وہ سپاہیانہ زندگی جس سے باطل کی ہر قوت پر غلبہ حاصل ہوتا تھا۔ یہ معرکہ بڑے ابتلاء و آزمائش کا موجب تھا۔ دن رات کی مشقت، بھوک اور خوف کی صعوبت۔ سامنے ایک جم غفیر، بحر مواج کی طرح متلاطم، مسلمانوں کی فوج میں منافقین بھی موجود تھے لیکن منافقت و ایمان خالص کی تو پرکھ ہی ایسے جاں گداز مراحل میں ہوتی ہے۔ وہ لگے بہانہ سازیاں اور روباہ بازیاں کرنے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۚ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ (۳۳: ۱۲-۱۳)

اور (یاد تو کرو!) جب وہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کھوٹ اور نفاق کا مرض ہے یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسول نے جھوٹا وعدہ کیا ہے! اور جب اُن (منافقین) کے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب (مدینہ) والو! تمہارے لئے یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں سو اپنے گھروں کو لوٹ چلو۔ اور ان میں سے بعض لوگ (خود نبی سے (گھر جانے کی) اجازت مانگتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ

(چونکہ) ہمارے گھر بالکل ہی غیر محفوظ ہیں (اس لئے ہمیں واپسی کی اجازت دیدیجئے اے نبی!) اُن کے گھر (قطعاً) غیر محفوظ نہیں ہیں۔ مگر واقعہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ تو (ان بہانوں سے) بھاگنا ہی چاہتے ہیں۔

یہ تمام حیلہ جوئیاں محض اس لئے تھیں کہ ان کے قلبی رجحانات کفر کی طرف تھے، اگر انہیں ان ہی حالات میں سلمانوں سے لڑنا پڑتا تو سب سے آگے ہوتے۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ۝ (۳۳/۱۴)

(حالانکہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ) اگر مدینہ میں اس کے اطراف (وجوانب) سے کوئی (کفار کا لشکر) آگھسے پھر ان سے فتنہ (وفساد برپا کرنے) کو کہا جائے تو وہ اس کو فوراً منظور کرلیں گے۔ اور (گھروں میں) بہت کم ٹھہریں گے۔

حالانکہ یہ وہ لوگ تھے۔

وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۝ (۳۳/۱۵)

حالانکہ یہی (منافقین) لوگ اس سے پہلے اللہ سے (یہ) عہد کرچکے تھے کہ (دشمن کے مقابلہ میں) پیٹھ نہ دکھائیں گے اور (یہ حقیقت ہے کہ) اللہ سے کئے ہوئے عہد کی بالآخر باز پرس ہوکر رہے گی!

فرمایا کہ ان سوختہ بختوں سے کہدیجئے کہ!

قُل لَّن يَنفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِن فَرَرْتُم مِّنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ قُلْ مَن ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُم مِّنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۳۳/۱۶-۱۸)

(اے پیغمبر اسلام!) ان (منافقین) سے کہدو کہ اگر تم موت سے اور قتل ہونے سے بھاگتے ہو تو یہ بھاگنا تم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس بھاگنے کے بعد بھی تم (زندگی سے اُس) تھوڑے سے عرصہ کے لئے ہی فائدہ حاصل کرسکتے ہو (جتنا تمہارے لئے مقدر ہوچکا ہے) نیز ان سے یہ بھی کہدیجئے کہ وہ کون (سی طاقت) ہے جو تمہیں اللہ کی برائی (اور) بھلائی سے جسے وہ تمہیں پہنچانا چاہے روک سکے (اور وہ سن رکھیں کہ خدا کے سوا نہ وہ کسی کو اپنا حامی پائیں گے نہ مددگار (اللہ تم میں سے ان لوگوں کو خوب طرح

جانتا ہے جو (دوسروں کو لڑائی میں جانے سے) مانع آتے ہیں جو اپنے بھائیوں (اعزاء و اقرباء) سے یوں کہتے ہیں کہ ہماری طرف آجاؤ۔ اور (اُن کی بزدلی و دوں ہمتی کا خود یہ عالم ہے) کہ میدان جنگ میں بہت ہی کم آتے ہیں۔

ان کی کیفیت یہ ہے کہ۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِیْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَاۗىِٕكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۳۳ : ۱۹ – ۲۰)

(یہ منافقین تو) تمہارے حق میں بڑے ہی بخیل ہیں، اور جب کبھی کوئی خوف (و ابتلاء) کا موقع (پیش) آتا ہے تو (اے پیغمبر اسلام!) وہ لوگ تمہاری طرف اس کیفیت سے دیکھتے ہیں کہ آنکھوں کی پتلیاں (خوف کے مارے) اس طرح گھوم رہی ہوتی ہیں جیسے اُن پر موت کی بے ہوشی طاری ہو رہی ہو۔ پھر جب وہ خوف (کا وقت) دور ہو جاتا ہے تو تم کو زبان درازی سے مال (غنیمت کی) حرص میں طعنے دینے لگتے ہیں۔ یہ لوگ (دراصل ابتداء ہی سے) ایمان نہیں لائے تھے، چنانچہ ان کے تمام اعمال (اپنے قانون مکافات کے مطابق) اللہ نے بے کار و بے نتیجہ کر دیئے ہیں اور یہ بات اللہ کے لئے بالکل آسان ہے! یہ لوگ (بوجہ خوف) یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ (ابھی تک) لشکر نہیں گئے اور اگر (بالفرض) (یہ گئے ہوئے) لشکر (پھر لوٹ کر) آجائیں تو (پھر تو) یہ لوگ (اپنے لئے) یہی پسند کریں گے کہ کاش ہم (کہیں) دیہاتوں میں جا کر رہنے لگیں (تاکہ وہیں بیٹھے بیٹھے) تمہاری خبریں پوچھا کریں! اور اگر تم میں رہنا پڑ ہی جائے تو بس برائے نام ہی لڑیں۔

ایک طرف منافقین کی یہ جماعت تھی، اور دوسری طرف خدا کے مخلص بندوں کی جماعت جن کی یہ کیفیت تھی کہ:۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ (۳۳ : ۲۲)

اور جب جماعت مومنین نے لشکروں کی طرف دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی (وقت و موقع ہے) جس کی

خبر ہم کو اللہ اور رسول نے دی تھی، اور اللہ اور اس کے رسول نے (بالکل) سچ کہا تھا۔ اور (اس سے یہی ہوا کہ) ان کے ایمان و اطاعت میں اور ترقی ہو گئی۔

کچھ وہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں جان دے کر اپنے معاہدہ کو سچا کر دکھایا، اور باقی وہ جو ابھی اس انتظار میں تھے کہ کب وہ وقت آئے اور وہ اپنی صداقت عہد کی عملی شہادت پیش کریں۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۳۳/۲۳﴾

ان مومنوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اللہ سے کئے ہوئے عہد میں پورے اتر چکے ہیں (پھر ان (عہد کرنے والوں میں سے)، بعض تو وہ ہیں جو اپنا مقررہ وقت (زندگی) پورا کر چکے۔ اور ان میں (بعض لوگ شہادت کے) مشتاق ہیں اور (اب تک) انہوں نے (اپنے اس اشتیاق میں) کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہونے دیا۔

اور یہ اس لئے کہ خود ان کے سامنے ان کا رسول، روشنی کے ایک بلند مینار کی طرح مستحکم و استوار کھڑا تھا کہ سرکشی و عدوان کی موجیں چاروں طرف سے یلغار کر کے آئیں اور سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں جن کے سامنے ایمان و ایقان اور صبر و استقامت کا ایسا نمونہ موجود ہو ان کے پائے ثبات میں لغزش کس طرح آجائے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۳۳/۲۱﴾

تم میں سے ان لوگوں کے لئے خدا کے رسول (کے کردار و صفات میں) ایک عمدہ نمونہ موجود ہے جو اللہ (کے حضور جواب دہی)، اور آخرت کے دن کی امید رکھتے ہوں اور اکثر اوقات میں خدا کو یاد رکھتے ہوں

محاصرہ جاری رہا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے صعوبات و شدائد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان مشکلات کے پیش نظر حضورؐ کو خیال گذرا کہ کہیں انصار ہمت نہ ہار جائیں کیونکہ وہ اس قسم کی جنگ کے عادی نہ تھے۔ اس لئے آپ نے چاہا کہ غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کر لیا جائے کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث انہیں دیدیا جائے۔ رؤسائے انصار نے جب یہ سنا تو یہ عرض کیا کہ اگر یہ فیصلہ خداوندی

انصار کا استقلال

ہے تو اس سے انکار کی مجال نہیں۔ لیکن اگر حضور اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو پھر جرأت عرض معاف! ہم اس پر تیار نہیں ہیں۔

ہم سے تو بحالت کفر بھی کسی کو خراج مانگنے کی جرأت نہیں ہوئی، چہ جائیکہ اب جبکہ اسلام نے ہمارا پایہ اتنا بلند کر دیا ہے ہم اس پر آمادہ ہو جائیں۔ حضورؐ اس استقلال کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور معاہدہ کا خیال چھوڑ دیا۔

محاصرہ کی طوالت سے خود محاصرین بھی تنگ آ رہے تھے، وطن سے اتنی دور ۲۴ ہزار فوج کو رسد پہنچانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ سردی کا موسم ذرائع رسل و رسائل کی قلت، گھر بار سے دوری، تنگ آ کر انہوں نے ایک دن ہلہ بول دیا اور خندق کا ایک ایسا حصہ جو زیادہ چوڑا نہیں تھا، عبور کر لیا۔ جنگ شروع ہو گئی، یہ معرکہ اس سختی اور پریشانی کا تھا کہ جماعت مجاہدین کو نماز تک ادا کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ تیروں اور پتھروں کی بارش ایک ثانیہ کے لئے بھی تھمنے نہیں پاتی تھی۔ جوں توں کر کے دن ختم ہوا تو رات کو اس سختی سے بادِ صرصر چلی کہ کفار کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں۔

اس "جیشِ خداوندی" کے حملہ نے مخالفین کو بدحواس کر دیا قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر نعمت خداوندی کی حیثیت سے کیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۳۳)

اے پیروانِ دعوت ایمانی! اس وقت کے لئے اپنے اوپر خدا کی رحمت و نعمت کو یاد کرو جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے تھے تو ہم نے ان پر ایک آندھی بھیج دی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی (فرشتوں کی) ایسی فوجیں بھی بھیج دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں۔ اور اللہ تمہارے اس وقت کے اعمال کو خوب طرح دیکھ رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے بھی ہمت ہارنی شروع کر دی اور قریش کو محسوس ہونے لگ گیا کہ اب یہ ساتھ چھوڑ دینے پر آمادہ ہیں۔ ان تمام مشکلات و موانع کے پیش نظر انہوں نے بھی سمجھا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ چنانچہ ۲۰، ۲۲ روز کی ناکام طغیانیوں کے بعد یہ طوفان جدھر سے اٹھا تھا، خاسر و ناکام ادھر ہی کو واپس لوٹ گیا۔

وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا (۳۳/۲۵)

(اور اے مسلمانو!) اللہ نے منکرین (حق) کو (مدینہ سے) غصہ میں پیچ و تاب کھاتا ہوا لوٹا دیا کہ ان کی کوئی (بھی) مراد پوری نہ ہو سکی، اور اللہ جنگ میں مسلمانوں کے لئے خود ہی کافی ہو گیا۔ اور (بلاشبہ)

---

[۱] میدان بدر میں حضرت حباب بن منذر کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس واقعہ کو بھی پیش نظر رکھئے! ان کا نتیجہ مستخرجہ بعد میں سامنے آئے گا۔

اللہ بڑا ہی قوت والا اور بڑا ہی زبردست ہے

بنی قریظہ (یہودیوں) نے کھلی ہوئی عہد شکنی کی تھی، اس لئے ان کی سرکوبی ضروری تھی۔ اگر حلیف تو تیں اس طرح وقت پر غداری کر جائیں، تو نظام امن کس طرح قائم رہ سکے! ان سے جب اس کے متعلق بازپرس کی گئی تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی حرکات پر نادم ہوتے، سب وشتم پر اتر آئے لہٰذا ان کے خلاف فوج کشی کی گئی۔ قریب ایک ماہ تک وہ محصور رہے اور پھر ان ہی کے مقرر کردہ ثالث کے فیصلے کے مطابق ان کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا گیا۔

بنو قریظہ کی سرکوبی

وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا ﴿۳۳/۲۶﴾

اور جن اہل کتاب نے ان (مشرکین) کی مدد کی تھی (خدا) نے ان کو بھی اپنے ان قلعوں سے نیچے اتار دیا جن میں وہ محصور تھے) اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا۔ جن میں سے بعض کو تم قتل کر رہے تھے اور بعض کو گرفتار کر رہے تھے۔

اس طرح اللہ نے ان کے اموال واراضی کا مالک مجاہدین کی جماعت کو بنا دیا۔ اور نہ صرف ان ہی زمینوں کا بلکہ (مستقبل قریب میں) ان زمینوں کا بھی جو ابھی تک ان کے قدموں سے پامال بھی نہیں ہوئی تھیں۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِیَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ﴿۳۳/۲۷﴾

اور (ہم نے) تمہیں ان (یہود) کی زمینوں، ان کے گھروں، اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا۔ اور (ایسی) زمین کا بھی (مالک بنا دیا) جس پر تم نے ابھی قدم (تک) نہیں رکھا تھا، اور اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے!

جنگ حدیبیہ

ذیقعدہ سنہ ۶ھ

نظام قرآنی میں جو مرکزی حیثیت کعبہ کو حاصل ہے، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور یہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے کن اضطراری حالات میں مکہ کو چھوڑا تھا۔ کعبہ چونکہ اس تمام سعی وکاوش اور جد وجہد کا ماحصل، اور تمام تگ وتاز، اور حرکت وعمل کا منتہی تھا۔ اس لئے مدینہ میں آنے کے بعد بھی وہ حضورؐ کی تمناؤں کا مرکز، اور آرزوؤں کا محور رہا۔ آپ کا جسم یہاں تھا لیکن روح وہیں تھی۔ آپ کی نگاہ کا ہر تار اسی قبلۂ مقصود سے وابستہ اور دل کی ہر جنبش اسی مرکز حیات سے ہم آہنگ تھی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے خیال اسی سدرۃ المنتھی کی طرف لگا رہتا تھا۔ پھر چونکہ اپنے مشن کی صداقت پر ایمان محکم اور اس کی آخری کامیابی پر یقین کامل تھا اس لئے یہ امید آپ کے قلب اطہر کی انتہائی گہرائیوں میں ایک حقیقت ثابتہ بن کر پیوست تھی کہ ایک نہ ایک دن ہمیں پھر مکہ میں داخل ہونا ہے اور اس طرح کعبہ کو ملت اسلامیہ کا مرکز بن کر رہنا ہے۔ ذیقعدہ سنہ ۶ھ کا ذکر ہے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے متبعین کے طائفہ مقدسہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اگرچہ ابھی تک مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہوا تھا، لیکن عربوں میں حج حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے ہی رائج تھا۔

عمرہ کیلئے روانگی

اور سنت ابراہیمی کے اتباع میں وہاں حج بھی کیا جاتا تھا اور عمرہ بھی، حضورؐ نے عمرہ کا ارادہ کیا۔ وفور شوق نے قریب چودہ سو صحابہؓ کو بھی ہمرکاب کر دیا۔ زائرین بیت اللہ کا یہ کاروان عشق ومحبت، جذب وکیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے رواں دواں دیار محبوب کی جانب روانہ ہوا قریش نے جب یہ سنا تو خواہ مخواہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگ گئے۔ حضورؐ جب مکہ سے باہر ایک منزل کے فاصلہ پر مقام حدیبیہ پر پہنچے تو نہایت واضح الفاظ میں قریش تک یہ پیغام بھجوا دیا کہ ہم صرف زیارت بیت اللہ کے لئے آئے ہیں۔ عمرہ کا احرام باندھے ہوئے ہیں اور قربانی کے جانور ہمارے ساتھ ہیں، تمہیں معلوم ہے کہ ایسی حالت میں کوئی لڑائی نہیں لڑا کرتا۔ اس لئے مفت کی ضد نہ کرو ہمیں زیارت کعبہ سے شرف یاب ہونے دو۔ لیکن ان کے سر پر قوت کا نشہ سوار تھا۔ انہوں نے جواب میں ایک دستہ فوج بھیجدیا۔ حالانکہ اس مہینہ میں عرب لڑائی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس دستہ کو مسلمانوں نے آسانی سے گرفتار کر لیا۔ انہوں نے معافی مانگی تو اس ابر کرم کی گہرباریوں نے ان کے دامن امید کو خالی نہ لوٹایا اور سب کو معافی دے کر چھوڑ دیا۔ انہیں کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ

اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ (۴۸/۲۴)

وہی ایسا ہے جس نے مکہ کی وادی میں تمہارے ہاتھوں کو ان (منکرین حق کے قتل) سے اور ان کے ہاتھوں کو تمہارے (قتل) سے بعد اس کے کہ خدا تمہیں ان پر فتحمند اور ظفریاب کر چکا تھا، باز رکھا اور اللہ تمہارے کاموں کو (اس وقت بھی) دیکھ رہا تھا!

گفتگوئے صلح

اس کے بعد حضور نے قریش سے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ انہوں نے حضرت عثمان کو نظر بند کر لیا اور خبر مشہور ہو گئی کہ آپ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ سرکشی اور طغیان کی انتہا اور دنائت و بدعہدی کی آخری حد تھی۔ آپ ایک ببول کے درخت کے نیچے تشریف فرما تھے وہیں اپنے ساتھیوں سے اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جاں سپاری کی بیعت[1] لی۔ یہی وہ بیعت رضوان ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (۴۸/۱۸-۱۹)

بیشک اللہ ان مومنوں سے (انتہائی) خوش ہوا، جب یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، پس اللہ نے (خوش ہو کر) ان کے دلوں میں سکون و طمانیت (کی لہر) پیدا کر دی اور ان کو ایک (فوری اور) قریبی فتح دی، اور ساتھ ہی بہت سی دوسری غنیمتیں بھی جن کو یہ لوگ حاصل کر رہے ہیں۔ اور اللہ بڑا زبردست حکمت والا ہے!

بیعت رضوان

یہ بیعت خدا سے اس بات کا عہد نامہ تھا کہ اس کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جائیگا اور چونکہ رسول اللہ بہ حیثیت "نمایندہ خداوندی و مرکز ملت" بیعت لے رہے تھے اس لئے حضورؐ کے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ قرار دیا گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ

---

[1] غور کیجئے کہ اسلام میں بیعت سے کیا مفہوم تھا اور اس کے بعد جب دین عجمی تصوف کی افسانوی فضا میں گم ہو گیا تو بیعت سے کیا مقصود رہ گیا

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۰﴾

اے پیغمبر اسلام! جو لوگ آپ سے بیعت (جہاد) کر رہے ہیں، گویا کہ وہ خدا سے بیعت کر رہے ہیں (اور) خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، پھر بیعت کے بعد جو شخص عہد کو توڑے گا تو اس کے عہد کے توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا۔ اور جو شخص خدا سے کیا ہوا عہد (جہاد، عملی طور پر) پورا کر دکھائے گا تو عنقریب خدا اس کو (جزائے عمل کے طور پر) بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی۔ چنانچہ قریش نے اپنی طرف سے سہیل کو گفتگوئے مصالحت کے لئے بھیجا۔ جن شرائط پر صلح ہوئی وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال حج کے لئے آئیں۔ اور صرف تین دن رہ کر چلے جائیں، ہتھیار ساتھ نہ ہوں صرف تلواریں ہوں اور وہ بھی نیام میں۔

(۳) مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں انہیں ساتھ نہ لے جائیں اور اگر کوئی اور مسلمان مکہ میں رہنا چاہے تو اسے اس سے روکیں نہیں

(۴) کفار میں سے اگر کوئی شخص مدینہ جائے تو اسے روکا نہ جائے، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آجائے تو کفار اسے واپس نہیں کریں گے۔

(۵) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرائط مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ حتیٰ کہ معاہدہ کی تحریر کے وقت جزئیات تک میں قریش کے نمائندہ (سہیل) نے جہاں جہاں کسی بات پر اصرار کیا اسے مان لیا گیا۔ مثلاً کاتب معاہدہ (حضرت علیؓ) نے شروع میں حسب معمول بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا تو سہیل نے کہا کہ عربوں کے دستور کے مطابق (باسمک اللّٰھم) لکھو۔ یہ بھی منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد جب یہ لکھا گیا کہ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے تسلیم کیا ہے تو سہیل نے اس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ آپ کا نام محمد ابن عبداللہ لکھئے کیونکہ ہم آپ کو رسول اللہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ بھی مان لیا گیا۔ ابھی معاہدہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابو جندل) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ ہی میں کفار نے انہیں قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر مسلمانوں کے پاس آگئے۔ پاؤں میں بیڑیاں

حضرت جندل

جسم زخموں سے لالہ زار، مصائب و تکالیف سے حالت نزار۔ وہ کونسی آنکھ تھی جو انہیں اس حالت میں دیکھ کر اشکبار نہ ہو گئی ہوگی؟ لیکن سہیل نے کہا کہ ہر چند ابھی معاہدہ کی تکمیل نہیں ہوئی لیکن ابو جندل کو مسلمان اپنے

پاس نہیں رکھ سکتے بنی اکرمؐ نے کئی مرتبہ اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے اسے بھی تسلیم کرلیا اور ابو جندل کو اس کی تحویل میں دے دیا۔ ابو جندل چودہ سو مسلمانوں کی جمعیت سے فریاد کر رہے تھے کہ بھائیو تم مجھے پھر انہی بھیڑیوں کے حوالہ کر رہے ہو! ذرا میری حالت کو تو دیکھو!! اگر تم بھی مجھے ان شدائد و آلام سے نہ بچاؤ گے تو پھر میری امداد کو اور کون آئے گا! اس فریاد پر مسلمانوں کے دل تڑپ اٹھے، لیکن فیصلہ کے خلاف ایک انگلی تک نہیں اٹھ سکتی تھی۔ چودہ سو کا جم غفیر کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ رسول اللہؐ نے ابو جندل کو مخاطب کرکے کہا کہ "ابو جندل! ضبط اور تحمل سے کام لو! خدا تمہارے اور دوسرے مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اب ہو چکی ہے، ہم ان لوگوں سے بد عہدی نہیں کرنا چاہتے" مسلمان اس صلح سے بہت دل شکستہ اور مغموم تھے اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ اعتراف شکست تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس شکست کو فتح قرار دیا۔ اور فتح بھی کھلی ہوئی فتح جب فرمایا کہ

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝ (۴۸/۱-۳)

(اے پیغمبر اسلام!) بلاشبہ ہم نے تمہیں (صلح حدیبیہ کے ذریعہ) ایک کھلی ہوئی واضح فتح عطا فرمائی تاکہ اللہ تمہارے تمام اگلے پچھلے "تدبیری اسقام" (تدبیری کوتاہیاں) معاف کردے۔ اور تمہارے لئے اپنی نعمتوں کو تمام و کمال پورا کردے۔ (اور تمہیں حق و صداقت کی) سیدھی راہ کی طرف راستہ دکھا دے اور (نیز) اپنی پر شکوہ مدد کے ساتھ تمہاری امداد فرمائے۔

چنانچہ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ یہ ظاہری شکست فی الواقعہ بعد کی فتوحات کے لئے کشادہ راہ تھی اس وقت تک مسلمان محض اپنی حفاظت کی فکر میں تھے۔ اب اس کے بعد غلبہ و تمکن کی زندگی شروع ہوئی ایک عرصہ کی کشیدگی تعلقات اور سلسلہ جنگ و جدال نے کفار اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ خود غرض عناصر مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کے بھیانک افسانے مشہور کر دیتے تھے جس سے قریش وغیرہ کے دلوں میں نفرت اور عداوت کے جذبات اور بھی بھڑک اٹھتے تھے۔ اس معاہدہ نے آتش مبازرت کو فرد کیا تو مخالفین نے مدینہ آنا جانا شروع کر دیا۔ اور انہوں نے

فتح کا پیش خیمہ

[1] اس آیت میں عام طور پر ذنب کا ترجمہ گناہ کیا جاتا ہے۔ جس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ عصمت انبیاء کے متعلق کسی دوسری جگہ بحث آئے گی۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ذنب گناہ ہی کو نہیں کہتے۔ اس کے معنی ہم نے "تدبیری اسقام" کئے ہیں۔ اس مفہوم کی تشریح بھی اسی مقام پر ہوگی۔ جہاں عصمت انبیاء کا ذکر ہوگا۔ [ملاحظہ ہو تتمہ عنوان نہال]

مسلمانوں کے قریب آکر دیکھا کہ یہ درحقیقت ویسے نہیں جیسی ان کی تصویر کھینچی جاتی تھی اوران کے عزائم ومقاصد وہ نہیں جو ان کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ اس قریب دوسال (بائیس ماہ) کے عرصہ میں جب یہ معاہدہ قائم رہا لوگ مسلمانوں کی طرف کھنچے چلے آئے۔ حدیبیہ کے وقت نبی اکرمؐ کی معیت میں صرف چودہ سو کی جمعیت تھی اور اس کے دوسال بعد جب مکہ فتح ہوا ہے تو آپکی جلو میں دس ہزار کی جماعت تھی اس لئے حدیبیہ کا معاہدہ جو بظاہر شکست خوردگی اور مرعوبیت کا مظہر دکھائی دیتا تھا، درحقیقت حصول مقاصد کے لئے کشادراہ کی صورت تھی، اور اسی لئے ایک فتح مبین خود غیر مسلم مورخین بھی جب اس معاہدہ پر غور کرتے ہیں تو اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اس باب میں رقمطراز ہے

معاہدہ حدیبیہ نے دونوں مصافی جماعتوں کو دم لینے کی فرصت دیدی اور اس کا تمام فائدہ نبی اکرمؐ کو ہوا۔ یہ صلح قریب دوسال تک قائم رہی اور اس دوران میں اہل مکہ کے لئے پیہم ناکامیوں اور مسلسل ذلتوں کا باعث ثابت ہوئی۔ وہ شرط جس کی رو سے محمدؐ نے یہ عہد کرلیا تھا کہ مکہ کے آدمیوں کو ان کے پاس واپس کردیا جائے گا اور جو بالکل قریش کے حق میں تھی۔ تمام توقعات کے خلاف ان کے لئے باعث نقصان ثابت ہوئی۔ اور بالآخر انہیں خود ہی درخواست کرنی پڑی کہ اس شرط کو بدلدیا جائے۔

قرآن کریم کے الفاظ پر غور کیجئے۔ اس نے اس "فتح مبین" کو کس قدر اہمیت دی ہے اس نے بتایا ہے کہ

(۱) یہ معاہدہ اس امر کا پیش خیمہ ہے کہ حصول مقصد میں جو تدبیری اسقام ونقائص رہ جائیں انہیں جماعت کی قوت اپنے دامن سے ڈھانپ لے اور وہ شکست وہزیمت کا باعث نہ بنیں (لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ)

(۲) اللہ تعالیٰ اس نعمت کا اتمام کردے گا جس کا وعدہ مسلمانوں سے کیا گیا ہے یعنی تکمیل دین اور قیام حکومت خداوندی، اسی کا نام صراط مستقیم کی طرف ہدایت رکھا گیا ہے۔

(۳) آئندہ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے لئے غلبہ وتمکن عطا کرنے والی نصرت خداوندی۔

جب یہ حقائق ابھر کر مسلمانوں کے سامنے آئے تو ان کے دلوں کی افسردگی سکون وطمانیت میں بدل گئی جو ان کے لئے وجہ ایزادی ایمان ہوئی۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ (۴۸/۴-۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارا خدا وہی ہے! جس نے مسلمانوں کے دلوں میں (طمانیت و) سکون پیدا کیا تاکہ ان کے ایمان میں مزید زیادتی ہو۔ اور (یہ حقیقت ہے کہ) زمین آسمان کے تمام لشکر اللہ ہی کے تابع فرمان ہیں۔ اور اللہ (اپنی مصلحتوں کو) خوب جاننے والا (اور اپنے کاموں میں) دانائی رکھنے والا ہے! اور نیز اس لئے بھی تاکہ اللہ (اطاعت و فرماں پذیری کے بدلے میں) مسلمان مردوں اور عورتوں کو (نعیم ابدی کی) ایسی بہشتوں میں داخل کر دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی کہ ان میں (ہمیشہ کی زندگی) بسر کریں گے۔ اور تاکہ (اطاعت و انقیاد کی بدولت) ان کی (معمولی لغزشوں کو) معاف کر دے، اور یہ (تمام باتیں) اللہ کے نزدیک بہت بڑی فیروزمندی (میں داخل) ہیں!"

اور یہ اس لئے کہ

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ (۲۸)

اور تاکہ خدا، ان منافق مردوں، اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو عذاب (میں مبتلا) کر دے جو کہ اللہ کے متعلق بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں (گھبراؤ نہیں) بُرائی کا چکر ان پر پڑنے ہی والا ہے کیونکہ خدا ان سے ناراض ہو چکا ہے اور انہیں اپنی رحمتوں سے دور کر چکا ہے۔ علاوہ ازیں آخرت میں بھی ان کے لئے اس نے ایک دوزخ تیار کی ہوئی ہے، جو بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے!"

یہ بظاہر "گر کر صلح کرنا" تو اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی ورنہ

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (۲۸)

اور آسمان و زمین کے تمام لشکر اللہ ہی کے تابع فرمان ہیں، اور اللہ زبردست حکمتوں والا ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ (۲۸)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (اے پیغمبر اسلام) تمہیں شاہد بنا کر بھیجا ہے تاکہ (مومنوں کے لئے) ان کے نیک اعمال کے نتائج کی، خوشخبری دینے والے۔ اور (منکرینِ حق کے لئے انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والے بنو!

اسی لئے حصولِ نصب العین کا طریقہ یہ ہے کہ

لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً

وَأَصِيلًا ۝ (۴۸-۹)

تاکہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (کے دین) کی مدد کرو۔ اور اس کی تعظیم کرو۔ اور صبح و شام اس کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہو!

مسلمان اگرچہ مکہ کی طرف محض عمرہ کے لئے گئے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قریش مکہ اس کی مخالفت کریں گے، اور اس لئے جنگ ضرور ہو گی۔ لہذا وہ مسلمانوں کے ساتھ گئے ہی نہیں تھے، ان کے متعلق فرمایا کہ

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ۝ (۴۸-۱۱-۱۲)

اے پیغمبر اسلام! جو دیہاتی (حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے ہیں وہ عنقریب تم سے (بات بنا کر) کہیں گے کہ ہمارے اہل و عیال اور مال (و جائداد) نے ہمیں فرصت نہ لینے دی (ورنہ ہم آپ کے ہمراہ ضرور چلتے) لہذا ہمارے لئے (اس کوتاہی کی) معافی کی دعا کر دیجئے! یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ وہ باتیں بنائیں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں (اے پیغمبر اسلام!) تم ان سے کہدو اگر اللہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے پر آئے تو وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمہارے لئے کچھ بھی کر سکے۔ بلکہ اللہ تمہارے تمام اعمال پر (پوری طرح) خبردار ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ (تم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ رسول اور (رسول کے ہمراہی مسلمان اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر ہی نہ آ سکیں گے۔ اور تمہارے دلوں کو یہ بات کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی اور تم نے (مسلمانوں کی جماعت کے حق میں) بُرے بُرے گمان پکائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم اب برباد ہونے والے لوگ ہو گئے!!

ان کا شمار بھی کفار ہی کے ساتھ ہے۔

وَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ۝ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ (۴۸-۱۳-۱۴)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر دل سے ایمان نہیں لائے گا تو (یاد رکھو!) ہم نے انکار کی راہ اختیار

کرنے والوں کے لئے ایک دوزخ تیار کر رکھی ہے اور تمام زمین و آسمان کی حکومت اللہ ہی کے لئے ہے وہ جس کو چاہے بخش دے، اور جس کو چاہے سزا دے اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے!

اس کے بعد فرمایا۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۴۸/۱۵)

(اے پیغمبر اسلام!) جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے تو وہ عنقریب جب تم لوگ (خیبر کی) غنیمتیں لینے کے لئے چلو گے تو کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کے حکم کو (جو خیبر کے بارے میں نازل ہوا ہے) بدل ڈالیں۔ (اے پیغمبر اسلام!) تم ان سے کہدو کہ تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے (کیونکہ) تمہارے لئے خدا نے پہلے سے ایسا ہی حکم فرما دیا ہے تو وہ لوگ جواب میں عنقریب کہیں گے (خدا کا نام کیوں لیتے ہو؟ یوں کہو نا کہ) تم ہمارے اوپر حسد کرتے ہو حقیقت حال یہ ہے کہ یہ منافقین کی قوم ایسے لوگ ہیں جو بہت ہی کم سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

اس میں فتح خیبر کی طرف اشارہ ہے جو چند ہی ماہ بعد ظہور میں آگئی اور جس میں مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت ملا ان منافقین سے کہا گیا۔

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۖ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۴۸/۱۶)

اے پیغمبر اسلام! ان پیچھے رہنے والے (منافقین دیہاتیوں) سے کہدیجئے کہ عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے بلائے جاؤ گے جو سخت جنگ جو ہوں گے۔ (پھر تمہارے لئے دو ہی راستے ہیں) یا تو اُن سے (برابر) لڑتے رہو! یا وہ مطیع اسلام ہو جائیں (یعنی اسلامی نظام زندگی کی اطاعت قبول کر لیں) پس اگر تم (شریک جنگ ہو کر) اطاعت اختیار کرو گے، تو اللہ تمہیں (تمہاری اطاعت و فرماں پذیری کے بدلہ میں) نیک عوض (دنیا میں مال غنیمت، اور آخرت میں جنت) دے گا اور اگر تم روگردانی اختیار کرو گے، جس طرح اس سے پہلے (حدیبیہ میں) روگردانی اختیار کر چکے ہو تو (یاد رکھو!) اللہ تم کو دردناک عذاب کی سزا دے گا۔

غالباً یہاں رومیوں یا ایرانیوں کی طرف اشارہ ہے جن سے بعد میں مسلمانوں کی لڑائیاں ہوئیں۔ قرآن کی رو سے ہر مومن سپاہی ہے اس لئے جب بھی ضرورت پڑے اسے خدا کی راہ میں جان دینے کیلئے موجود ہونا چاہیئے،

بشرطیکہ وہ معذور نہ ہو۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيْمًا (۴۸ : ۱۷)

(ہاں البتہ) اندھے، لنگڑے، اور بیمار کے لئے (اگر وہ شریک جہاد نہ ہوں تو) کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور (یاد رکھو!) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (فرماں پذیری) اختیار کرے گا تو اللہ اس کی اطاعت کے عوض، اسے نعیم ابدی کی ایسی بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور (یاد رکھو!) جو شخص (خدا کے احکام سے) روگردانی کرے گا تو اللہ اسے ایک دردناک عذاب (کے ذریعہ) سے سزا دے گا۔

اس کے بعد پھر روئے سخن حدیبیہ کی طرف بدل گیا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّأُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۴۸ : ۱۸ - ۲۱)

(اے پیغمبر اسلام!) اللہ اس جماعت مومنین سے انتہائی خوش ہوا جو آپ سے درخت کے نیچے بیعت (جہاد) کر رہی تھی۔ اور اللہ کو ان کے دلوں (کے خلوص) کا (پورا پورا) حال معلوم تھا۔ چنانچہ (اسی وقت) اللہ ان کے دلوں میں سکون (طمانیت کی لہر) پیدا کر دی۔ اور ان کو ایک (فوری اور قریبی فتح مندی عطا فرمائی) اور (اس فتح کے ساتھ) بہت سی غنیمتیں (بھی) دیں جن کو یہ (مسلمان) لوگ (بخوشی) لے رہے ہیں۔ اور اللہ بڑی ہی زبردست دانائی والا ہے! اللہ نے تم سے بہت سی (ایسی) غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم (آئندہ چل کر حاصل) کرو گے (اور) سر دست تم کو یہ (غنیمتیں) دیدی گئی ہیں اور لوگوں کے ہاتھوں کو تمہارے (قتل) سے روک دیا ہے اور (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ (یہ واقعہ) مومنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور تاکہ اللہ تمہیں (حق و صداقت کی) سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر دے۔ اور ایک دوسری فتحمندی بھی (ہونے والی ہے) جس پر تم ابھی قابو یافتہ نہیں ہوئے (لیکن) اللہ

اسے اپنے احاطۂ قدرت میں لئے ہوئے ہے اور اللہ (یقیناً) ہر چیز پر (پورا پورا) قادر ہے!!

پھر فرمایا۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۴۸: ۲۲، ۲۳)

اور اگر تم سے یہ لوگ جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی ہے (بالفرض) لڑتے بھی تو (یقیناً) پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلتے (اور) پھر ان کو کوئی یار و مددگار نہ ملتا (یعنی ان کے لئے کہیں سر چھپانے کی جگہ میسر نہ آتی) یہ خدا کا وہ طریقہ ہے جو اس سے پہلے بھی پیش آتا رہا ہے۔ اور (اے پیغمبر اسلام!) تم خدا کے طریقہ میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

لیکن فیصلہ یہی تھا کہ اس مقام پر جنگ کرنا ہی نہیں

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ (۴۸: ۲۴)

(یاد رکھو!) وہ اللہ ہی ہے جس نے عین مکے کے قرب میں تمہارے ہاتھوں کو اُن (کے قتل) سے اور اُن کے ہاتھوں کو تمہارے (قتل) سے باز رکھا۔ بعد اس کے کہ تم اُن (کفار) پر قابو یافتہ ہو چکے تھے اور اللہ تمہارے کاموں کو (اس وقت بھی) دیکھ رہا تھا۔

حالانکہ یہ لوگ وہ تھے۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔـوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِــيْمًا ۝ (۴۸: ۲۵)

(اے پیروان دعوت ایمانی!) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی اور تم کو (عمرہ سے باز رکھنے کے لئے) مسجد حرام (کے داخلہ) سے روکا۔ اور نیز قربانی کے جانور کو اس کے خاص موقعہ پر پہنچنے سے باز رکھا۔ اور اگر (مکہ میں) بہت سے مومن مرد اور بہت سی مومن عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی (یعنی) اگر ان (مسلمانوں) کے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں ---------------

----

ضرر پہنچتا" تو بھی) سب قصہ (قضیہ) طے کر دیا جاتا (لیکن ایسا اس لئے نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر یہ (مظلوم مسلمان مکہ سے کہیں) ٹل گئے ہوتے تو (ہم) ان لوگوں کو جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی تھی دردناک عذاب میں مبتلا کرتے (یعنی یہ کافر عذاب الٰہی سے اس لئے بچے رہے کہ مکہ میں کچھ مسلمان موجود تھے جن کی وجہ سے عذاب نازل نہیں کیا گیا۔

اور ان کے دلوں میں حمیت جاہلیہ کے جذبات عداوت و مخاصمت بھرے ہوئے تھے۔

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۴۸/۲۶)

(اے پیروان دعوت ایمانی!) جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں حمیت کو جگہ دے رکھی ہے اور حمیت بھی (کونسی؟) جاہلیت کی (حمیت) تو (مقابلہ میں) اللہ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر سکون و طمانیت اتار دی، اور ان کو (ہر حال میں) تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا۔ اور وہ (فی الحقیقت) اس کے زیادہ مستحق اور اہل ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو پوری طرح جانتا ہے!

باقی رہیں حضورؐ کی وہ تمنائیں اور آرزوئیں جو خواب کی صورت میں ابھر کر نگاہوں کے سامنے آگئی تھیں تو وہ ایک حقیقت کا مشاہدہ تھا اس لئے وہ خواب پورا ہو کر رہے گا۔

لَّقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۖ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ۖ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِن دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا ○ (۴۸/۲۷)

بیشک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو (بالکل) مطابق واقعہ ہے کہ تم لوگ انشاء اللہ مسجد حرام (یعنی مکہ) میں امن و امان کے ساتھ ضرور داخل ہو گے۔ تم میں کوئی تو سر منڈائے ہوئے ہوگا، تو کوئی بال کترے ہوئے کہ تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہوگا۔ اللہ ان باتوں کو (اچھی طرح) جانتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔ پھر (یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ نے) اس کے علاوہ تم کو ایک قریبی (خود ہی) فتح عطا فرما دی!

اس لئے کہ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ؕ (۴۸/۲۸)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو صحیح (نظام زندگی) دین اور ہدایت دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام (نظامہائے عالم) دینوں پر غالب کر دے، اور اللہ ہی (دین الٰہی کی حق و صداقت کیلئے) کافی شاہد ہے۔

لہلہاتی کھیتی

مکہ کی پر از صعوبات و مشکلات زندگی، اور اس کے بعد مدینہ کی ابتدائی زندگی، اسی مقصد عظیم کے حصول کی تیاری، اور اسی منزل عظمیٰ تک پہنچنے کا سفر تھا یہ درحقیقت وہ محنت تھی جو ایک کسان کو زمین کی تیاری۔ تخم ریزی، آبپاشی، کھیت کی حفاظت۔ اور دیگر متعلقہ جزئیات کے لئے کرنی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکا اب وہ کھیتی جو ایمان و اعمال صالحہ سے پروان چڑھی تھی پکنے کے قریب آگئی ہے۔ اس کے بعد دیکھئے گا وہ کس طرح جھولیاں بھر دیتی ہے؛

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ ۖۚ وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۴۸/۲۹)

محمد اللہ کے رسول اور ان کے ساتھ (قدوسیوں کی جماعت) جن کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ وہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے لئے چٹان کی طرح سخت اور برق خاطف کی طرح مہیب ہیں لیکن باہمدگر سرتاپا شفقت و رافت اور ہمدرد و محب، وہ دنیا میں کسی طاغوتی قوت کے سامنے نہیں جھکتے جھکتے ہیں تو فقط ایک اللہ کے سامنے۔ اسی سے وہ فضل و عنایات کے خواہاں ہیں اور اسی کی رضا جوئی کے طالب۔ اس باب صمدیت کے آستاں پر پیہم سجدہ ریزیوں سے ان کی پیشانیوں پر وہ نقوش تاباں مرتسم ہو گئے ہیں جو دنیا میں درخشندہ ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ یہی ہے قدوسیوں کی وہ جماعت جن کے تذکرے کتب سماویہ (تورات و انجیل) میں آچکے ہیں۔ یہ جماعت کیا ہے! یوں سمجھئے کہ اپنی ساعت تاسیس سے لے کر دوام تکمیل تک ایک کشت حق و صداقت ہے۔ شروع میں یہ کیفیت تھی کہ ایمان کی زمین صالحہ سے اعمال کا تخم حسنہ اک نرم و نازک پتی کی شکل میں منصۂ شہود

پر آیا پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخ نو دمیدہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو! ایک لہلہاتی کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور حاسدوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگ گئے یہ تھے مغفرت اور اجر عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان اور اعمال صالح کے بدلے میں جماعت مومنین سے کئے تھے اور جو اس کی عاجز نوازیوں نے اس طرح پورے کئے۔

ذرا جماعت مؤمنین کی اس خصوصیت عظمیٰ پر نگاہ ڈالیئے۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

جماعت مؤمنین کی خصوصیات

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ وہی ہے جس کے متعلق سورۃ توبہ میں فرمایا وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً تاکہ کفار تمہارے اندر سختی اور صلابت محسوس کریں، اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب اور دبدبہ بیٹھ جائے۔

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا (۳۳/۲۶)

اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے ان (اہل کتاب یہود) کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا۔ (ان میں سے) ایک گروہ کو تم تہ تیغ کر ڈالو گے اور ایک گروہ کو گرفتار کرو گے۔

اور وہ کبھی تمہارے اوپر غالب نہ آسکیں۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱)

اور خدا کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ منکرین (حق) ایمان رکھنے والوں کے خلاف کوئی راہ پا لیں۔

اور اپنی جماعت میں ایک دوسرے کے زخموں کے لئے مرہم۔ دل کا سرور آنکھوں کا نور۔ تمام قلوب مودت و محبت کے سلسلہ میں منسلک ایک نصب العین ایک مقصد حیات۔ ایک راہ عمل۔ فلہذا تمام کارواں ایک اکائی (unit) ایک کی خوشی میں سب کی خوشی۔ ایک کی مصیبت میں سب کی مصیبت۔ ساری بات ایک جسد واحد کی مثل کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ نبی اکرم کے ارشاد گرامی کے مطابق۔

مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكَى لَهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى

مسلمانوں کی مثال باہمی مودت اور مرحمت اور ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم واحد کی
اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہو جائے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے
یہی ہے ایک مومن کی زندگی کا شعار دشمنوں کے مقابلہ میں حصار سنگیں و شمشیر آتشیں۔ لیکن اپنوں کے لئے
نظافت عنبریں و لطافت یاسمیں۔ اور یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ قرآن میں اپنوں اور بیگانوں سے مفہوم
کیا ہے ؟

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ
بَيْنَهُمْ

حسبِ معمول مسلمانوں کی طرف سے معاہدہ کی پابندی بڑی شدت سے ہوئی مخالفین کے افراد مدینہ میں
مسلمانوں کی طرف سے کوئی مخالفت نہیں پاتے تھے۔ اس لئے وہاں آرام و سکون سے آتے جاتے اور رہتے سہتے
تھے، برعکس اس کے جو مسلمان اہل مکہ کے ہاتھوں اذیتیں اٹھاتے تھے، ان کے لئے اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ
وہ وہاں سے نکل کر کسی دوسری جگہ آزادانہ زندگی بسر کریں، کیونکہ مدینہ بھی ان کے لئے حد ممنوعہ تھی۔ رفتہ رفتہ
اس قسم کے مسلمانوں کی ایک الگ جماعت سمندر کے کنارے مقام عیص پر جمع ہو گئی۔ قریش کو ان سے خطرہ
محسوس ہوا اور انہوں نے اسی میں خیریت سمجھی کہ نبی اکرمؐ سے درخواست کی جائے کہ معاہدہ کی اس شرط کو کالعدم
تصور کیا جائے۔ اس کے بعد یہ مسلمان مدینہ آ گئے عورتیں شروع سے ہی اس شرط سے مستثنیٰ تھیں اس لئے
ان کے متعلق سورۂ ممتحنہ میں حکم آ گیا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَاۗءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ اَعْلَمُ
بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ
حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْ
هُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ
وَلْيَسْــَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاِنْ
فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ
مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ (۶۰ : ۱۰-۱۱)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تمہارے پاس مؤمن عورتیں (دار الحرب سے) ہجرت کر کے آئیں تو تمہیں چاہیئے کہ (ان کے مسلمان ہونے کا) امتحان کر لیا کرو (اگرچہ) اُن کے (حقیقی) ایمان کو (تو) اللہ ہی بہتر جانتا ہے (ہاں) اگر تم (اپنے امتحان کی رو سے) انہیں مسلمان سمجھو تو چاہیئے کہ انہیں کفار کی طرف واپس مت لوٹاؤ! (کیونکہ) نہ تو وہ (مؤمن عورتیں) اُن منکرینِ حق کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ منکرینِ حق (اُن مؤمن عورتوں کے لئے جائز ہیں۔ اور ان کفار نے جو کچھ (ان عورتوں پر) خرچ کیا ہو، وہ چاہیئے کہ انہیں واپس کر دو! اور تمہارے لئے ان عورتوں سے نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ ان کا (زر) مہر ان کو ادا کر دو۔ اور (اے مسلمانو!) چاہیئے کہ کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی نہ رکھو اور (ان کافر عورتوں پر) تم نے جو کچھ خرچ کیا ہو (ان کافروں سے) مانگ لو! اور (ایسے ہی) جو کافروں نے خرچ کیا ہو وہ (تم سے) مانگ لیں یہ اللہ کا (ایک ایسا) حکم ہے جو تمہارے درمیان (حق و انصاف کا) فیصلہ کرتا ہے۔ اور اللہ (بلاشبہ) بڑی ہی حکمت والا اور بڑا ہی جاننے والا ہے! اور اگر (بالفرض) تمہاری بیبیوں میں سے کوئی کافروں میں رہ جائے جو کہ تمہارے ہاتھ نہ آسکے (اور کافروں کو زرِ مہر ادا کرنے کا سوال پیدا ہو تو) چاہیئے کہ تم بھی اسی قدر (زرِ مہر) ادا کرو جس قدر کہ وہ (منکرینِ حق) اپنی بیبیوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر (تم کو) دے چکے ہیں اور (اے مسلمانو!) اس اللہ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو جس پر تم یقین (کامل) رکھتے ہو!

ذرا ان احکام کی معدلت گستری پر غور کیجیے

غزوۂ خیبر ۷ھ

غزوۂ خیبر کا ذکر قرآن کریم میں بصراحت نہیں آیا لیکن سورۂ فتح میں جن مغانم کثیرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ خیبر ہی کی فتح کے مآل میں حاصل ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں یہ جنگ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اس لئے کہ یہ پہلی لڑائی ہے جس میں اہل کتاب سے نبرد آزمائی ہوئی۔ اور انہیں مسلمانوں کی رعایا بنایا گیا۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب یہودیوں کے قبائل مدینہ سے نکلے ہیں تو سب خیبر میں مرکوز ہوگئے تھے۔ جہاں انہوں نے بڑے بڑے مضبوط قلعے بنا لئے تھے۔ یہ سرزمین اسلام کے خلاف پیہم سازشوں کا مرکز بن رہی تھی۔ احزاب کی جنگ ان ہی سازشوں کا نتیجہ تھی۔ حدیبیہ سے واپسی پر نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا کہ یہود اِدھر اُدھر کے قبائل سے ساز باز کر رہے ہیں تا کہ مل کر مدینہ پر حملہ کیا جائے۔ یہ سیلاب بلا ایسا نہ تھا جس کا انتظار مدینہ میں بیٹھ کر کیا جاتا۔ اس کا مقابلہ وہاں جا کر کرنا ہی ضروری تھا۔ اس لئے حضورؐ نے اس حملہ کو روکنے کے لئے شروع ۷ھ میں خیبر کا رخ کیا۔ یہ مقام مدینہ سے قریب دو سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ چودہ سو پیادہ فوج اور دو سو سوار حضورؐ کی معیت میں تھے۔ جب یہ فوج خیبر کے سواد میں پہنچی ہے تو رات ہو چکی تھی۔ حضورؐ رات کو کبھی حملہ نہیں کیا کرتے تھے اس لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے بستی سامنے تھی حضورؐ نے حسب معمول خدا کا نام لے کر دعا مانگی کہ

اے خدا! ہم تجھ سے اس بستی کی۔ اور اس بستی والوں کی۔ اور بستی کی ہر شے کی بھلائی چاہتے ہیں۔

اور ان سب کی شرارتوں سے تجھ سے پناہ کے جویا ہیں (بحوالہ ابن ہشام)

غور فرمایئے! یہ ایک "حملہ آور" کی آرزوئیں ہیں۔ کتنی حسین ہیں یہ دعائیں اور کس قدر غمگسارانہ ہیں یہ تمنائیں!

مرحب یہیں کا نامور پہلوان تھا جس کی شجاعت و بسالت کی داستانیں زبان زدِ خلائق تھیں جنگ شروع ہوئی تو حضرت علیؓ کے ایک ہی حملہ نے اسے آغشتۂ خاک و خون کر دیا۔ مختلف قلعات کے محاصرے

فتح خیبر

مدتوں تک رہے۔ بالآخر تمام یہودیوں نے اعتراف شکست کیا۔ اور صلح کی درخواست پیش کی۔ اسلام کا مقصد ہی امن و سلامتی ہے۔ یہ درخواست منظور کی گئی۔ یہودیوں کی زمین ان سے لے لی گئی۔ اس زمین کا نصف بیت المال میں عام ضروریات کے لئے

رکھ لیا گیا اور باقی نصف مجاہدین میں برابر تقسیم کر دی گئی۔ پیدل کو ایک حصہ اور سوار کو دو۔ امیر ملت امام امت، سالار جیش (سپہ سالار فوج) حضورؐ نبی اکرم کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا۔ یہودیوں کی درخواست پر زمین ان ہی کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔ اور نصف بٹائی پر ان سے معاملہ طے ہوا جب تقسیم پیداوار کا وقت آتا تو آپ کسی صحابی کو بھیج دیتے وہ پیداوار کے دو حصے کر کے یہود سے کہتے کہ جونسا حصہ تم چاہو لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہوتے اور کہتے کہ زمین و آسمان اسی عدل سے قائم ہیں۔

یہود نے صلح بھی کی، ان سے اس قدر مراعات بھی برتی گئیں، لیکن فطری دنائت نہ جانی تھی نہ گئی۔ ان کی ساری عمر سازشوں ہی میں گزر گئی۔ چنانچہ ابھی حضور خیبر ہی میں تھے کہ یہودی عورت نے آپ کی دعوت کی جسے حضور نے ازراہ کرم گستری قبول کر لیا۔ لیکن اس بدبخت نے کھانے میں زہر ملا دیا۔ زہر کے اثر سے حضورؐ تو بچ گئے۔ لیکن ایک اور صحابی (بشر بن براءؓ) شہید ہو گئے (یہ سازشیں بدستور قائم رہیں تا آنکہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں تنگ آ کر یہود کو اضلاع شام کی طرف منتقل کر دیا۔)

کھانے میں زہر

حفظ امانت

یہ غزوۂ خیبر ہی کا واقعہ ہے کہ اسود راعی، اہل خیبر کا ایک چرواہا، بکریاں چراتا چراتا حضورؐ کے قریب آیا اور عرض کیا کہ اگر میں اسلام لا کر خدا کی راہ میں جان دیدوں تو مجھے بھی جنت مل جائے گی؟ حضور نے فرمایا کہ اس میں کیا شبہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ بسم اللہ میں میدان میں جاتا ہوں حضورؐ نے دریافت کیا کہ یہ بکریاں کس کی ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ یہ گاؤں والوں کی ہیں۔ میں ان کا چرواہا ہوں۔ غور کیجئے! یہ بکریاں ان گاؤں والوں کی ہیں جن کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ یہ بکریاں تمہارے پاس امانت ہیں۔ پہلے اس امانت کو اس کے مالکوں تک پہنچا آؤ، پھر جنگ میں شریک ہونا! چنانچہ وہ گیا اور بکریوں کو گاؤں کی طرف ہانک کر شریک جہاد ہوا۔

کہئے تاریخ کے اوراق کو کہ عین میدان جنگ میں اس قسم کے بلند اصول کی کوئی مثال پیش کر کے دکھائیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ جنگ ایک اہم خصوصیت اپنے اندر رکھتی تھی، قرآن کریم نے عام کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے جس قسم کے تعلقات کا حکم دیا ہے اور قرآنی نظام حکومت کے ماتحت ان کی جو پوزیشن متعین کی ہے اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ اس وقت صرف اتنا بتانا ضروری ہے کہ اہل کتاب سے جو جزیہ لینے کا حکم ہے اس سے کیا مفہوم ہے؟ اس لئے کہ معاندین نے

اس کے متعلق بھی ایسا گمراہ کن پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ جزیہ کا نام سنتے ہی غیر مسلموں کی آنکھوں میں غصہ اور انتقام کا خون اتر آتا ہے اور وہ اسے انسانیت کے خلاف جرم عظیم تصور کرتے ہیں۔ یہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اسلام میں جنگ سے مقصود صرف یہ ہے کہ جو سنبد اور سرکش قوتیں دنیا میں عدل و انصاف اور حق و صداقت کا نظام قائم کرنے کے راستہ میں مزاحم ہوں ان کی قوت کو توڑ دیا جائے۔ تاکہ دنیا فساد کی آگ سے محفوظ ہو جائے۔ قرآن کریم میں ایک ہی جگہ جزیہ کا حکم ہے اور وہاں اس کے ساتھ ہی اس مفہوم کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (۹/۲۹)

اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر یقین (ایمان) رکھتے ہیں، نہ آخرت کے دن پر، نہ اُن چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرا دیا ہے اور نہ سچے دین (نظام زندگی) ہی پر عمل پیرا ہیں تو (مسلمانو!) ان سے (بھی) جنگ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیں، اور حالت ایسی ہو جائے کہ ان کی سرکشی ٹوٹ چکی ہو!

اس آیت کے آخری الفاظ "وھم صاغرون" اس مقصد کی وضاحت کرتے ہیں یعنی اصلی غرض یہ ہے کہ ان کا زور ٹوٹ جائے اور وہ اس نظام عدل و صداقت کے سامنے جھک جائیں۔

اب دیکھئے کہ جزیہ ہے کیا۔ یہ بھی پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اسلامی نظام میں ہر مسلمان سپاہی ہوتا ہے اور عند الضرورت اس سے فوجی خدمت "بہ جبر" لی جاتی ہے۔ (بہ جبر سے یہ مطلب ہے کہ مسلمان ہونا اور فوجی خدمت دینا لازم و ملزوم ہیں۔ اور اس میں اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا) اسلام اپنی غیر مسلم رعایا پر یہ جبر نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے ایک غیر مسلم کو اجازت ہوگی کہ وہ چاہے تو فوجی خدمت ادا کرے اور چاہے تو اس سے الگ رہے۔ غور کیجئے کہ یہ پہلا قدم ہی کس قدر مراعات اور رواداری پر مبنی ہے۔ یعنی جو حق حاکم قوم کے افراد کو حاصل نہیں وہ محکوم قوم کو از خود دیدیا گیا ہے۔ اب آگے بڑھئے۔ مسلمانوں پر اپنی غیر مسلم رعایا کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہب، اور مقدس مقامات وغیرہ کی حفاظت لازمی ہے ان غیر مسلموں میں سے جو فوجی خدمت سے مستثنیٰ رہنا چاہیں ان سے اس حفاظت کے بدلے میں تھوڑا سا ٹیکس لے لیا جاتا ہے، تاکہ یہ روپیہ فوجی اخراجات میں کام آسکے۔ اس ٹیکس کا نام ہے جزیہ۔ خیبر کے یہودیوں سے زمین کی بٹائی پر صلح ہو گئی تھی، اس لئے وہی ان کا جزیہ سمجھنا چاہیئے! (جزیہ کے متعلق

قرآنی حکم اس وقت نازل نہیں ہوا تھا، فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کی حقیقی حکومت کی بنیاد پڑتی ہے اس لئے اس کے بعد نبی اکرمؐ نے (اور حضورؐ کے اتباع میں خلفائے راشدین نے) جن یہود و نصاریٰ وغیرہ سے صلح کی تو ان کے معاہدات میں جزیہ کے مقاصد کی بھی تصریح فرما دی۔ ان معاہدات کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ زرجزیہ کے معاوضہ میں ان قوموں کو حقوق حاصل تھے[1] کہ

(۱) کوئی دشمن ان پر حملہ آور ہوگا تو ان کی مدافعت کی جائے گی، اس میں ان کی جان، مال کاروان تجارت اور دیگر مملوکہ اشیاء سب شامل ہیں۔

(۲) ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا ان کے معابد کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

(۳) جو حقوق اس سے پہلے انہیں حاصل تھے وہ زائل نہیں کئے جائیں گے۔

(۴) ان سے عشر وصول نہیں کیا جائے گا۔

اب دیکھئے کہ اس ٹیکس کی مقدار کیا تھی۔ اس کی عام شرح تین روپے اور چھ روپے سالانہ تھی۔ اور زیادہ سے زیادہ بیس روپے اور پھر اس سے بیس برس سے کم، اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے مرد۔ نیز تمام عورتیں مفلوج، معطل العضو، نابینا، مفلس، اور تمام لوگ جو فوجی خدمت از خود قبول کر لیں مستثنےٰ تھے۔ اس کے برعکس اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ مسلمانوں کو جبری فوجی ملازمت کے علاوہ زکوٰۃ بھی دینی پڑتی تھی۔ یعنی اگر کسی مسلمان کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہو تو اسے (اُس وقت کی شرح کے مطابق) کم از کم اڑھائی ہزار روپیہ زکوٰۃ کا دینا پڑا۔ اور ساتھ ہی فوجی ملازمت بھی اور اگر وہ غیر مسلم ہے تو اسے صرف بیس روپے ادا کرنے پڑے اور اس کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری دوسروں کے سر عائد ہو گئی۔ اب فرمائیے! دنیا میں اس سے زیادہ سستی حفاظت بھی کہیں مل سکتی ہے اور پھر اس حفاظت کے عہد پر عمل کس شدت سے ہوتا تھا اس کا اندازہ اس قسم کے تاریخی واقعات سے لگائیے کہ

عہد حفاظت کی پابندی

شام کے علاقہ میں مسلمانوں نے عیسائیوں سے سال بھر کا جزیہ وصول کیا لیکن کچھ دنوں بعد، ہرقل (عیسائی بادشاہ) کے حملہ کے مقابلہ کی وجہ سے مسلمانوں کو وہاں سے اپنی فوجیں ہٹانا پڑیں، تو تمام زرجزیہ یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ یہ رقم تمہاری حفاظت کے عوض میں لی گئی تھی۔ جب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر رہے تو اس کا معاوضہ کیا؟ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ جب مسلمان .. ..

---

[1] ملاحظہ ہو فتوح البلدان

فوجیں یہ شہر خالی کر رہی تھیں تو وہاں کی عیسائی رعایا نم آلود آنکھوں سے انہیں رخصت کر رہی تھی۔ اور یہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا تمہیں ہمارے شہروں کی حکومت پھر عطا کرے۔ اگر تمہاری جگہ عیسائی فوجیں ہوتیں تو اس موقع پر واپس دینا تو درکنار جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ بھی لوٹ کھسوٹ لیتیں۔

یہ ہے وہ جزیہ جسے مشرق و مغرب کے معاندین حق و صداقت نے کیا کچھ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر رکھا ہے۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا!

فتح مکہ

رمضان سنہ ۸ھ (جنوری سنہ ۶۳۰ء)

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ

تاریک مایوسیوں، اور ظلمت انگیز ناامیدیوں کے اس ہجوم میں، جس میں گھرے ہوئے اس کاروان متاع توحید و صداقت نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، دور، افق سے اس پار ایک بے صوت صدا تھی جو نہایت دل کش لاہوتی انداز میں، اس بے سروسامان، عاجز و درماندہ جماعت کے کانوں تک یہ نغمۂ جاں فزا اور مژدۂ روح افزا پہنچا رہی تھی کہ

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ (۳ : ۱۳۹)

(اے پیروان دعوت ایمانی!) نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو!

یہ گھبرانے اور دل چھوڑنے کی کوئی بات نہیں یہ مظلومی اور یہ بیکسی یہ درماندگی اور لاچاری، یہ ضعف و ناتوانی، یہ ہجوم نوائب و انبوہ مصائب۔ یہ تمام نوازل و زلازل، یہ ناامیدیاں اور مایوسیاں، یہ سب وقتی اور عارضی ہیں۔ انجام کار تمام کامیابیاں اور کامرانیاں، ہر قسم کی تازگیاں اور شادابیاں، قوت و غلبہ شان و شوکت، جاہ و جلال، شرف انسانیت کے تمام مناصب و مراتب، تمہارے حصہ میں آئیں گے۔ تمام تاریکیاں کافور ہو جائیں گی ظلمتوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

ہجرت سے کچھ پہلے اور ہجرت سے کچھ بعد اعدائے اسلام کی شکست و تخریب، اور جیوش حق و صداقت کی فتح و نصرت کی منذرات و مبشرات اس تواتر و تسلسل سے نازل ہوئیں کہ گویا مستقبل کی تمام تصاویر حال کے آئینہ میں کھنچ کر آگئی ہیں۔ (اور یہ حقیقت ہے کہ حال اور مستقبل کی دیواریں ہماری نارسائی نگاہ کی تعمیر کردہ ہیں۔ خدائے علام الغیوب کے سامنے ان حدود فاصل کا کوئی وجود ہی نہیں دن اور رات کے تعینات زمین پر بسنے والوں کی حدود نگاہ کے قائم کردہ ہیں۔ مریخ کی بلندیوں سے کرۂ ارض کو دیکھنے والے کے سامنے ہر وقت دن ہی دن ہو گا، ہجرت کے بعد سرکش قوتوں کی تخریب کے مراحل بتدریج طے پاتے چلے جاتے تھے۔ لیکن ان کی تکمیل کا وقت فتح مکہ میں جاکر ہونا تھا۔ جہاں اللہ کی تائید و نصرت کو یوں بے محابا سامنے آنا تھا کہ کسی آنکھ کو اس کی جلوہ پاریوں سے مجال انکار نہ ہو! تخریب و ہزیمت کے ان مواعید میں سورۂ لہب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس میں ان سرکش قوتوں کے عجز و درماندگی اور فنا و بے بسی کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ پھر اسے سورۂ نصر سے متصل رکھ کر جس معجزانہ بلاغت سے اس کے مفہوم کی وضاحت کر دی گئی ہے، چشم بصیرت جب اسے دیکھتی ہے تو قرآنی حسن اعجاز پر وجد کرتی ہے۔

رؤسائے قریش میں عتبہ، ابوجہل، ابوسفیان، جیسے سرغنے موجود تھے۔ جنہوں نے نبی اکرمؐ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ لیکن غور کیجئے کہ قرآن نے ان میں سے کسی کا نام لے کر نہیں کہا کہ وہ بے دست و پا ہو گیا اور اسے اسلام کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کی ہمت باقی نہ رہی۔

ابی لہب

نام ابی لہب کا لیا گیا ہے۔ یہ کیوں؟ ابی لہب میں یہ کونسی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے اسے خاص طور پر پکارا گیا۔ اور اس کی شکست و ہزیمت کو اسلام کا غلبہ و تسلط شمار کیا گیا۔ یہ چیز غور طلب ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اسلامی نظام حکومت میں کعبہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی تھی اس لئے اس مرکز پر اقتدار فی الحقیقت نظام اسلامی کے اقتدار کی علامت تھی۔ رؤسائے قریش میں سے مختلف افراد مختلف مناصب و مدارج سے متمیز تھے لیکن کعبہ کی تولیت ابی لہب کے پاس تھی، قرآن نے ابی لہب کا ذکر کر کے قلب و نگاہ کی تمام توجہات کو اس طرف مرکوز کر دیا کہ نبی اکرمؐ کی اس تمام تگ و تاز اور جنگ و جدل کا مقصد رؤسائے قریش کی ریاست و قیادت کا حصول نہ تھا۔ بلکہ کعبہ کے صحیح مقام

کی بازیابی تھی۔ ابی لہب اپنے اس دینی منصب کی وجہ سے دین حقہ کا حقیقی دشمن تھا اور باقی رؤسائے قریش اس کے تابع تھے۔ اس شخص نے ایک طرف کعبہ کو، جو خدائے واحد کی عبادت کا مرکز تھا بتوں کا استھان بنا رکھا تھا، اور دوسری طرف اپنی ہوس زر پرستی اور سرمایہ داری کی وجہ سے اپنی اس دینی ریاست سے بہت ناجائز فائدہ بھی اٹھایا تھا۔ افادہ کے مال میں جو محتاجوں اور مساکین کی حاجت روائی کے لئے وقف تھا خرد برد کرتا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ کعبہ کے خزانہ کے سونے کے ہرن چرانے کا الزام بھی اس پر عائد کیا جاتا تھا۔ نبی اکرم کی دعوتِ توحید میں اسے ہر وقت اپنے منصب کے چھن جانے اور اس طرح حصول مال و دولت کے اتنے بڑے سرچشمے کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ نظر آتا تھا اس لئے یہ اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتا تھا۔ سرمایہ داری اور ہوس زر پرستی نے اس کے ان تمام جوہروں کو تباہ کر دیا تھا جو قریش کی قومی خصوصیات تھیں۔ یہاں تک کہ یہ شخص بدر کے میدان میں، کہ جس میں قریش کی قومی غیرت وحمیت اپنے خورد وکلاں سب کو کھینچ لائی تھی۔ خود شریک نہیں ہوا۔ عاص بن ہشام کے ذمے اس سرمایہ دار کے چار ہزار درہم قرض تھے۔ وہ بوجہ تنگ دستی اس قرض کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس بخیل نے اس قرضہ کے عوض عاص کی جان خرید لی اور اسے اپنی جگہ میدان میں بھیج دیا۔ یہ تھا وہ ابولہب جس کے پاس تولیت کعبہ جیسا اشرف و افضل منصب تھا۔ ایسے شخص کے بے دست و پا ہو جانے کی پیش گوئی کا کھلا ہوا مفہوم یہ تھا کہ کعبہ کی تولیت ان ہاتھوں میں آجائے گی جو اسے اپنی ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ نہ بنائیں گے۔ بلکہ اسے نوع انسانی کے قیام (قیامًا للناس) کا واسطہ بنائیں گے۔ ابولہب جان کے خوف سے بدر میں شریک نہ ہوا، لیکن قدرت کے فیصلے دیکھئے کہ بدر کے ساتویں دن اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے چیچک کے عارضہ سے مرگیا۔ اس کے دونوں بیٹے موجود تھے لیکن چھوت کے ڈر سے وہ اس کی لاش کے پاس تک نہ آئے۔ یہاں تک کہ لاش پڑی پڑی سڑ گئی۔ دوسروں کے غیرت دلانے پر انہوں نے اس پر دور ہی سے کچھ پانی چھڑکا اور مکہ سے باہر ایک جگہ رکھ کر دور سے پتھر وغیرہ پھینک کر لاش کو ڈھانپ دیا۔ یہ انجام ہوا اس زمانہ کے سب سے بڑے سرمایہ دار کا مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ یہ انجام تو اس دنیا میں ہوا اور اس کے بعد کی دنیا میں

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ

وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا۔

وہ اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی۔ اس لئے کہ ابولہب کی زر اندوزی کی ہوس اس کی بیوی (ام جمیل) کی وجہ سے تھی۔ یہ اسے مجبور کرتی تھی کہ اس کی زینت و آرائش کے لئے جائز و ناجائز ہر طریق سے مال اکٹھا

کرے تاکہ وہ اپنے ساتھ کی دوسری عورتوں میں اکڑ کر چلتے وہ اپنے دوزخ کا ایندھن خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے گئی (حَمَّالَةَ الْحَطَبِ) اور جس گردن کی بلندی کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا اسی میں مکافاتِ عمل کی رسی بندھی جو اسے کشاں کشاں، ذلت آمیز عذاب کے جہنم میں لے گئی۔ (فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ) ابولہب اگرچہ بدر کے بعد ہی مر گیا لیکن اس سے کعبہ کی تولیت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ آئی۔ اس کا وقت اب آرہا تھا۔ اس لئے ابی لہب کی شکستِ ید (بے چارگی و ناتوانی، مقابلہ سے عاجزی اور مخالفت سے درماندگی) کا اصل وقت فتح مکہ تھا۔ نہ کہ اس کی موت۔ اس لئے ابی لہب کی بے دست و پائی کی تنذیر درحقیقت، فتح مکہ کی بشارت تھی۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرط کے مطابق مسلمان ۷ھ میں مکہ گئے۔ اور تین دن کعبہ کی زیارت کر کے واپس آگئے۔ لیکن اس سے مقصد تو حاصل نہیں ہوا چونکہ معاہدہ کی پابندی ضروری تھی۔ اس لئے مسلمان امن و سکون سے گئے، امن و سکون سے ہی واپس لوٹ آئے۔ لیکن قریش اس معاہدہ کو بھی نہ نباہ سکے۔ صلح حدیبیہ کی بناء پر قبائل عرب میں، خزاعہ مسلمانوں کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف، بنو بکر، قریش کے۔ ان دونوں قبیلوں میں مدت سے پرخاش چلی آرہی تھی۔ بنو بکر نے خزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے معاہدہ کے صریحاً خلاف، بنو بکر کی حمایت کی اور حرم کے اندر خزاعہ کا خون بہا دیا خزاعہ کے کچھ لوگ نبی اکرمؐ کے پاس مدد کے لئے آئے۔ آپ نے جنگ کی بجائے قریش کو کہلا بھیجا کہ ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک مان لی جائے۔

(۱) مقتولین خزاعہ کا خون بہا دیدیا جائے۔ یا

(۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ اور یا پھر

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا صلح نامہ ٹوٹ چکا ہے۔۔۔

معاہدۂ حدیبیہ توڑ دیا گیا

قریش کے نمائندہ نے تیسری شرط مانی اور معاہدہ کالعدم ہو گیا۔ (اگرچہ انہیں اپنی اس حرکت پر بعد میں بڑا افسوس ہوا لیکن اب ان لوگوں کا اعتبار ہی اٹھ چکا تھا) نبی اکرمؐ نے مکہ پر حملہ کی تیاری شروع کر دی اور اس امر کی احتیاط برتی کہ قریش کو قبل از وقت اس کی اطلاع نہ ملنے پائے۔ حاطب ایک معزز صحابیؓ تھے۔ انہوں نے ایک مخفی خط کے ذریعہ قریش کو اس تیاری کی اطلاع دینی چاہی۔ نبی اکرمؐ کو اس واقعہ کا پتہ چل گیا اور قاصد کو راستہ ہی میں روک لیا گیا۔ یہ منافقین میں سے نہیں تھے، اس لئے صدرِ اول میں یہ ایک ہی

واقعہ ہے جس میں اپنی جماعت کے مفاد کے خلاف کسی نے کوئی حرکت کی ہو۔ حضورؐ نے جب ان سے پوچھا تو انہوں نے نہایت ندامت آلود نگاہوں سے اقرار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب، مکہ میں تھے جن کا یہاں کوئی حامی نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو کوئی صدمہ نہ پہنچائیں گے۔ یہ انسانی فطرت کی کمزوری تھی، اور ہر چند قرآنی تعلیم انسان کو ان کمزوریوں سے بلند لیجانا چاہتی ہے، حضورؐ نے اس عذر کو جو پرخلوص ندامت سے پیش کیا گیا تھا قبول کر لیا۔

رمضان ۸ھ میں "دس ہزار قدوسیوں کی جماعت" کی ہم رکابی میں نبی اکرمؐ عازم مکہ ہوئے

مکہ کی طرف روانگی

۲ھ کا پہلا رمضان تھا جب بدر کے میدان پر اس سلسلۂ معارک حق و باطل کی ابتدا ہوئی تھی۔ چھ سال کے بعد پھر روزوں ہی کے مہینہ میں ان معارک و مجادل کی تکمیل کا دن آجاتا ہے۔

مکہ سے باہر ڈیرے ڈال دیئے گئے۔ ابوسفیان اس لشکر کی تحقیق کرنے کے لئے خفیہ طور پر آیا لیکن گرفتار ہو گیا۔ یہ سرخیل جیوش فراعنہ، اب پا بجولاں حضورؐ کے سامنے تھا۔ اس کی ساری عمر انتہائی مخالفتوں میں گذری تھی۔ اس کا ایک ایک جرم اس قابل تھا کہ اس کی سزا میں اس کی گردن اڑا دی جاتی۔ حضورؐ کی نگاہ اٹھی تو اس نے کلمۂ شہادت پڑھ کر سر جھکا دیا۔ اس نے کلمہ پڑھا اور ادھر تمام رنجشیں ختم ہو گئیں۔

سارے گلے تمام ہوئے اک نگاہ میں

اب ابوسفیان اس قدر ذی عزت اور قابل اعتماد تھا کہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا۔ یا دروازے بند کرے گا۔ یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا، اسے امن دیدیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد بغیر جنگ کئے حضورؐ مظفر و منصور مکہ میں داخل ہو گئے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (—)

(اے پیغمبر اسلام! آپ اعلان کر دیجئے کہ دیکھو! حق ظاہر ہو گیا اور باطل نابود ہوا۔ اور باطل اسی لئے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔

فتح مکہ

"وہی بے کس و بے بس انسان" جو آج سے آٹھ سال پہلے اسی مکہ سے، رات کو جان بچا کر نکلا تھا کسی غیر کی مدد لئے بغیر، آج اس جاہ و حشمت سے اسی مکہ میں داخل ہو رہا ہے جو دنیا کے کسی شہنشاہ کو آج تک نصیب نہ ہوئی ہو۔ قدوسیوں کی جان نثار جماعت، جلو میں لوائے حق و صداقت سر پر سایہ فگن، اور اللہ اور اس کے فرشتے اس عدیم النظیر کامیابی اور فقید المثال شادکامی پر ہدایائے تحسین و تبریک و تحائف درود و سلام سے گل افشاں۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳ / ۵۶)

بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی اکرم پر درود و سلام بھیج رہے ہیں۔ اے پیروان دعوتِ ایمانی!

(تم بھی اپنے خدا کے ساتھ) اُن پر اُن کی شایان شان درود و سلام بھیجو!

اس شانِ خسروانہ، اور خدا کے حضور انداز گدایانہ سے حضورؐ کعبہ کی طرف تشریف لائے کعبہ ایک بہت بڑا تبکدہ بن رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے اس آلودگی سے پاک کیا۔ حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ اور یوں قریب اڑھائی ہزار سال بعد، اللہ کے گھر سے اللہ کا نام بلند ہوا۔ کعبہ کے اندر جاکر آپ بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوئے۔ اس کے بعد لوگوں کو جمع کرکے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ دربار حکومتِ الٰہیہ کا پہلا خطبۂ سلطنت تھا۔ خطبہ کیا تھا ان تمام اصول و مبانی کا عظیم القدر مجموعہ تھا۔ جس پر حکومتِ خداوندی کا قصر مشید استوار ہونا تھا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

خطبۂ فتح مکہ

صَدَقَ وَعْدَهٗ قابل ہزار حمد و ستائش اور درخور صد ہزار تشکر و امتنان ہے وہ بارگہ صمدیت جس نے اپنے ان وعدوں کو پورا کیا جو اس وقت کئے گئے تھے جبکہ ساری فضا نا ساعد اور حالات ناسازگار تھے۔ "نَصَرَ عَبْدَهٗ" اس نے اپنے بندے کی تائید و نصرت فرمائی هَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ اور تمام طاغوتی قوتوں کو منہدم کرکے رکھدیا۔

يَا مَعْشَرَ الْقُرَيْشِ! اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ

اے قوم قریش! جاہلیت کا غرور باطل اور نسب کا افتخار سب خدا نے مٹا دیئے

اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ

تمام نوع انسان کی اصل ایک ہی ہے اور اس کا سلسلۂ تخلیق مٹی سے شروع ہوتا ہے

اَلَا كُلُّ مَاثَرَةٍ اَوْ دَمٍ اَوْ مَالٍ يُدْعٰى فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ

تمام مفاخر۔ تمام انتقامات، خون بہائے قدیم سب خون بہامٹ مٹاکر میرے قدموں کے نیچے ہیں

اب مساواتِ انسانی اور احترامِ آدمیت کا دور آگیا۔ اب عزت و تکریم کا معیار، حسب و نسب نہیں، بلکہ تقویٰ ہوگا۔

برخیز! کہ آدم را ہنگام نمود آمد
ایں مشت غبارے را۔ انجم بہ سجود آمد

خطبہ کے بعد مجمع پر نگاہ ڈالی تو تمام متکبرین و مستبدین قریش سامنے کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اس دن اس دعوت حق و صداقت کی تضحیک و تحقیر کی جب حضورؐ نے پہلے پہل صفا کی پہاڑی سے اللہ کا نام ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور پھر جنہوں نے اس دن سے لے کر آج تک اپنی زندگی کی تمام حرکات و سکنات اس تحریک انقلاب کی مخالفت کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے پورے کے پورے خاندان ہاشم کو تین برس تک ایک پہاڑی کے غار میں محصور رکھا تھا اور جنہیں معصوم بچوں کی گرسنگی و تشنگی پر بھی ترس نہیں آیا تھا۔ ہاں! ادھر دیکھئے۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے جتھہ بنا کر سازش کی تھی کہ شب ہجرت، سب مل کر اس داعی الی اللہ کو (معاذ اللہ) ختم ہی کر دیا جائے۔ اور یہ سب اس جرم میں کہ وہ یہ کیوں کہتا ہے کہ "رَبُّنَا اللّٰہُ" میرا رب صرف اللہ ہے۔ اور یہ دوسری طرف وہ ہیں جنہوں نے بدر کے میدان میں اپنی تمام قوتوں کو اس لئے جمع کر دیا تھا کہ یہ مٹھی بھر جماعت جو دنیا میں خدا کا نام لیتی ہے، دنیا سے مٹا دی جائے۔ اور یہ وہ ہیں جنہوں نے اُحد کے میدان میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا۔ اور خود حضورؐ کو بھی زخمی کر دیا۔ اور وہ دیکھو انہیں میں وہ ... خاتون، ہندہ ہے، جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ یہ سب مفتوح و مغلوب سامنے کھڑے ہیں۔ اور اس طرف فاتح و منصور نبی اکرمؐ کہ جنہیں دنیا کا کوئی قانون، اور عدل کا کوئی گوشہ ان مجرمین کے قتل سے نہیں روکتا۔ حضورؐ نے ان کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ انہوں نے کہا یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ تو شریف بھائی ہے، اور شریف زادہ ہے۔ یہ انہوں نے از راہِ تملق نہیں کہا تھا، تملق اور خوشامد تو عرب کے کیرکٹر سے بعید تھی۔ انہوں نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا تھا۔ نبی کی سیرت ہی یہ ہے کہ وہ ہر مقام پر شرافت کا مجسمہ ثابت ہو۔ انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف آج اس حالتِ منکوبانہ ہی

عفوِ عام

میں نہیں کیا تھا بلکہ نجاشی اور ہرقل کے دربار میں، جب یہ ایک فریق غالب کی حیثیت سے گئے تھے۔ تو اس وقت بھی یہی کہا تھا۔ حضورؐ نے نگاہ اٹھائی اور ان سے کہا کہ

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں - جاؤ سب آزاد ہو

یہ ہے وہ عفو جس کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے - نہ کہ "اہمسا" کا وہ عفو کہ جس میں "عصمت بی بی از بیچارگی" کا مظاہرہ ہو - عفو اسی کا قابل ستائش ہے جس میں انتقام کی پوری پوری قوت موجود ہو - قریش نے مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر رکھا تھا - آپ نے مہاجرین سے کہدیا کہ اپنے حقوق سے دست بردار ہوجائیں - اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے - اور یہ دیکھیئے سامنے کون ہے! یہ عثمان ابن طلحہ شیبی ہیں، جن کے پاس کعبہ کی کلید رہتی تھی - ہجرت کے وقت حضورؐ اس کے پاس آئے اور کہا کہ ذرا کعبہ کا دروازہ کھولدو تو میں جانیسے پہلے اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا - آپ خاموشی سے واپس آگئے لیکن اتنا کہا کہ خیر! آج تم میری خاطر دروازہ کھولنے کے لئے تیار نہیں ہو، تم مختار ہو - لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ یہی کنجی میں جس کے ہاتھ میں دیدونگا، قیامت تک اس سے کوئی چھین نہیں سکے گا - آج کعبہ کی وہی کنجی آپؐ کے ہاتھ میں تھی اور وہی عثمان سامنے کھڑا تھا - آپ نے پوچھا تمہیں وہ واقعہ یاد ہے - اسے یاد تھا -

سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ دیکھیں یہ کلید متاع دارین کسے عطا کی جاتی ہے! آپ آگے بڑھے اور معلوم ہے کہ یہ کنجی کس کے ہاتھ میں دیدی؟ اسی عثمان کے ہاتھ میں؟ اللہ اکبر! اس ترحم خسروانہ اور نوازش شاہنشاہانہ کی نظیر اور کہاں مل سکتی ہے؟ یہ کنجی آج تک اسی عثمان کی اولاد میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، اور اسی طرح چلی جائے گی -

---

(۷) جنگ حنین

(شوال ۸ھ)

مکہ عربوں کا قومی مرکز تھا۔ اس کی فتح سے مختلف قبائل عرب کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور انہوں نے جوق در جوق آکر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ (یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا) (واضح رہے کہ مکہ فتح ہونے پر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا) لیکن ہوازن اور ثقیف کے دو جنگجو قبیلے ایسے تھے جن کی آتش حسد و عداوت اور بھی بھڑک اٹھی اور انہوں نے بڑے شد و مد سے مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپ مقابلے کے لئے آگے بڑھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان، حنین کی وادی میں، دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ بدر اور احزاب کے زمانہ میں مسلم کمزور اور قلیل التعداد ہوتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنی قوت بازو سے کہیں زیادہ بھروسہ تائید و نصرت خداوندی پر ہوتا تھا۔ حنین کی جنگ میں قریب بارہ ہزار کے مسلح فوج، ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ اس دبدبہ اور طنطنہ سے صف آرا ہوئی کہ بعض صحابہ کی زبان پر بے اختیار آگیا کہ آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے؟ دنیا میں مادی قوتیں نہایت ضروری ہیں لیکن اگر مادی قوتیں، قوت قلب (جسے قوت ایمانی کہتے ہیں) کو کمزور کرنے کا باعث بن جائیں تو یہی مادی قوتیں اس قوم کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ صحابہؓ کے ان الفاظ میں مادی قوتوں پر بھروسہ کی جھلک نسبتاً زیادہ پائی جاتی تھی۔ قدرت کا کرشمہ یہ کہ پہلے

شکست

ہی حملہ میں ایسی شکست کھائی کہ بارہ ہزار کے لشکر کا کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کہاں تتر بتر ہو گیا۔ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی دشمنوں کا ریلا بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح موجیں مار رہا تھا۔ اپنی فوج شکست کھا کر بھاگ رہی تھی۔ اس خلفشار میں ایک پیکر استقامت تھا جو روشنی کے بلند مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ پریشانی۔ نہ مایوسی تھی نہ ہزیمت کے کوئی آثار۔ یہ پیکر ہمت و استقلال خود ذات گرامی تھی جناب محمدؐ رسول اللہ کی جنہیں اپنے دعوے کی صداقت اور خدا کی تائید و نصرت پر غیر متزلزل یقین تھا۔ اس تشتت و انتشار کے عالم میں آپ نے پوری جمعیت خاطر سے دائیں طرف مڑ کر آواز دی کہ یا معشر الانصار! نہ معلوم اس آواز میں کیا اثر تھا کہ بھاگنے والوں کے قدم وہیں رک گئے، اور پوری دلجمعی سے آواز دی کہ لبیک یا رسول اللہ لبیک! پھر حضورؐ نے بائیں جانب یہی صدا بلند کی اور اس کا یہی جواب گونج کر واپس آیا۔ پھر آپ نے دشمنوں کو مخاطب کر کے آواز دی کہ "اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب" (بحوالہ بخاری) "میں خدا کا پیغمبر ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں"۔ اس سے ہو نہیں سکتا

اور فتح

کہ باطل ہم پر غالب آجائے۔ چند ثانیوں میں پوری فوج پھر اس مرکزِ حق و صداقت کے گرد جمع تھی۔ اور اس کے بعد ایک ہی حملہ میں میدان صاف تھا۔ سورۂ توبہ میں اس واقعہ عظیمہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ (۹/۲۵)

(مسلمانو!) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے، جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی امید نہ تھی) اور جنگ حنین کے موقع پر بھی جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے (اور سمجھتے تھے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لوگے) تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی ساری وسعت پر بھی تمہارے لئے تنگ ہو گئی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔

اس کے بعد:-

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ (۹/۲۶)

پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا۔ اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور (اس طرح) ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے انکار کی راہ اختیار کی تھی اور یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو انکار (کفر) کی راہ اختیار کرتے ہیں (یعنی ان کی بدعملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے۔

طائف کا محاصرہ

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج کفار، طائف میں جا کر جمع ہو گئی۔ حضورؐ نے جا کر شہر کا محاصرہ کیا۔ بیس دن تک محاصرہ رہا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا زور ٹوٹ چکا ہے تو آپ محاصرہ اٹھا کر واپس تشریف لے آئے۔

حنین میں بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا تھا۔ اس کی تقسیم میں حضورؐ نے یہ رعایت ملحوظ رکھی تھی کہ قریش مکہ میں سے جو لوگ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے ان کی تالیف قلوب کے لئے انہیں مال زیادہ دیا

مال غنیمت کی تقسیم

جائے۔ اس سے انصار کے بعض افراد کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ لوگ چونکہ رسول اللہ اور مہاجرین کے اہل قبیلہ اور اعزہ و اقارب ہیں

اس لئے انہیں زیادہ مال دیا گیا ہے۔ نبی اکرمؐ کو بحیثیت امیر ملت تقسیم غنیمت کے کلی اختیارات حاصل تھے۔ آپ کے فیصلوں کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ حضورؐ چاہتے تو ایک لفظ سے اس خیال کو ابھرنے سے روک دیتے۔ لیکن یہ مستبدانہ آمریت تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی تھی۔ حضورؐ نے انہیں جمع کیا اور ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جو ایک طرف فن بلاغت میں اعجاز کا حکم رکھتا ہے اور دوسری طرف ان قلبی تعلقات کو نکھار کر سامنے لا رہا ہے جو حضورؐ کو انصار کے ساتھ تھے۔ حضورؐ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔

کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گمراہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعے۔۔۔ تمہیں ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے۔۔۔ تم میں اتفاق و ائتلاف پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے تمہیں دولتمند کر دیا۔

آپ یہ فرماتے جاتے تھے اور انصار ایک ایک فقرہ پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

آپ نے فرمایا کہ نہیں تم ٹھیک جواب نہیں دے رہے، تم یہ جواب دو کہ

محمدؐ! جب اور لوگوں نے تجھے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، جب لوگوں نے تجھے چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی۔ تو مفلس آیا تھا، ہم نے تیری ہر طرح کی مدد کی!

یہ کہکر آپ نے فرمایا کہ تم یہ کہتے جاؤ، اور میں ایک ایک فقرے پر کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا کہ

اے انصار! یہ سب سچ ہے لیکن کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ یہ لوگ اونٹ، اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ!

اب کسے یارائے ضبط تھا مجمع کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں اور انہوں نے پکار کر کہا کہ یا رسول اللہ! انہیں سب کچھ دیدیجئے۔ ہمیں صرف محمدؐ درکار ہے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بعد حضورؐ نے انہیں سمجھایا کہ اس رعایت سے کیا مقصود[1] تھا۔

---

[1] بحوالہ البخاری، وفتح الباری۔

حنین کے چھ ہزار قیدی ابھی تک محفوظ تھے۔ آپ نے انتظار کیا کہ ان کے اعزہ و اقارب آئیں تو فدیہ کی بات کی جائے۔ لیکن ان میں سے کوئی نہ آیا تو آپ نے ایک سفارت کی درخواست پر سب کو احساناً چھوڑ دیا کہ یہی قرآن کا حکم ہے۔

۸۔ غزوۂ تبوک

رجب سنہ ۹ھ (مطابق نومبر سنہ ۶۳۵ء)

اب تک مسلمانوں کی جنگ و پیکار کا سلسلہ اندرونِ عرب تک محدود تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی قوتوں کو دیکھ کر رومی حکومت کو خیال پیدا ہوا کہ اس قوت کو یہیں دبا دینا ضروری ہے۔ غسانیوں کا عیسائی خاندان رومی حکومت کے زیر اثر شام پر حکمراں تھا۔ اس مقصد کیلئے رومی سلطنت نے اس خاندان کو متعین کیا۔ اس مہم کیلئے بڑی بڑی تیاریاں شروع

رومیوں کی مخالفت

کیں، جن کی تفصیل شامی سوداگروں کی زبانی، اہل مدینہ تک پہنچ رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ خبریں سارے عرب میں پھیل گئیں۔ اب مدافعت ضروری تھی۔ اس لئے حضورؐ نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ موسم سخت گرم تھا اور سوء اتفاق کہ ملک میں قحط پڑ رہا تھا۔ اس لئے حالات سازگار نہ تھے لیکن مہم کی اہمیت کے پیش نظر اسے ملتوی بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہذا یہ معرکہ خلاص و منافقت کی امتحان گاہ تھا۔ چنانچہ ایک طرف صحابہؓ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ کسی کے پاس تھا لیکر حاضر ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ نے نوسو (۹۰۰) اونٹ، ایک سو گھوڑے، اور ایک ہزار دینار پیش کئے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے چالیس ہزار درہم دیئے حضرت عمر کئی ہزار روپے کا نقد و جنس لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے گھر میں اللہ اور رسول کی محبت کے سوا کچھ بھی چھوڑ کر نہ آئے۔ حضرت ابو عقیلؓ انصاری نے دو سیر چھوہارے لاکر حاضر کئے، اور عرض کیا کہ رات بھر کسی کے کھیت پر مزدوری کر کے چار سیر چھوہارے حاصل کئے تھے، دو سیر بال بچوں کو دے آیا ہوں اور دو سیر خدمت اقدس میں حاضر ہیں۔ اس کے باوجود عسرت کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کے لئے سواریاں پوری نہیں ہوتی تھیں۔ اور ان کا کوئی انتظام بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

عسرت

انہیں کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ص تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (۹۲)

اور نہ اُن لوگوں پر کچھ گناہ ہے جن کا حال یہ تھا کہ (خود سواری کی مقدرت نہیں رکھتے تھے اس لئے) تیرے پاس آئے کہ ان کے لئے سواری بہم پہنچا دے۔ اور جب تو نے کہا میں تمہارے لئے کوئی سواری نہیں پاتا، تو (بے بس ہو کر) لوٹ گئے۔ لیکن ان کی آنکھیں اس غم میں اشکبار ہو رہی تھیں کہ افسوس ہمیں میسر نہیں کہ اس راہ میں کچھ خرچ کریں!

منافقین کی کوششیں دوسری طرف منافقین کی یہ حالت تھی کہ عجیب عجیب بہانہ سازیوں سے جنگ سے بچنے کی کوششیں کرتے تھے۔ سورۂ توبہ کا ساتواں رکوع دیکھئے۔ کس شرح و بسط سے قرآن کریم نے ان کی حیلہ جوئیوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ یہ لوگ جھوٹی سچی مجبوریوں کا عذر پیش کر کے جنگ سے رخصت کی اجازت مانگتے۔ ان کے اصرار پر حضورؐ بھی طوعاً و کرہاً اجازت دیدیتے۔ انہیں کے متعلق ارشاد ہوا

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۴۳)

(اے پیغمبر اسلام!) اللہ تجھے بخشے! تو نے ایسا کیوں کیا کہ (اُن منافقین کی منافقانہ عذر داریوں پر) انہیں (پیچھے رہ جانے کی) رخصت دیدی؟ اس وقت تک رخصت نہ دی ہوتی کہ تجھ پر کھل جاتا، کون سچے ہیں، اور تو معلوم کر لیتا، کون جھوٹے ہیں!

اس لئے کہ۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (۴۴)

(اے پیغمبر اسلام!) جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین (ایمان) رکھتے ہیں وہ کبھی تجھ سے اجازت کے طلبگار نہ ہوں گے۔ کہ اپنے مال سے اور اپنی جانوں سے (اللہ کی راہ میں) جہاد کریں اور اللہ جانتا ہے کہ کون متقی ہیں؟

ایسے نازک وقت میں جبکہ ساری ملت کی موت و حیات کا سوال درپیش ہو، وہی پیچھے رہنے کی اجازت مانگ سکتا ہے جس کے ایمان میں خلل ہو۔

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ (۴۵)

(اے پیغمبر اسلام!) تجھ سے اجازت طلب کرنے والے تو وہی ہیں جو (فی الحقیقت) اللہ اور آخرت کے دن پر یقین (ایمان) نہیں رکھتے۔ اور ان کے دل شک میں پڑ گئے ہیں، تو اپنے شک کی حالت میں متردد ہو رہے ہیں!

ان کی تو شروع ہی سے نیت بخیر نہ تھی

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ (۹:۴۶)

اور اگر واقعی ان لوگوں نے نکلنے کا ارادہ کیا ہوتا، تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ سرو سامان کی تیاری ضرور کرتے، مگر (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان کا اٹھنا پسند ہی نہیں کیا پس انہیں بوجھل کر دیا اور ان سے کہا گیا (یعنی ان کے بوجھل پن نے کہا) دوسرے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ تم بھی بیٹھے رہو!

اور اگر یہ تمہارے ساتھ چل بھی پڑتے تو اپنی منافقانہ سازشوں سے فوج میں بددلی پیدا کر دیتے اور اس طرح ایک اور ہی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ (۹:۴۷)

(اے پیروان دعوت ایمانی!) اگر یہ تم مسلمانوں میں (گھل مل کے) نکلتے، تو تمہارے اندر کچھ زیادہ نہ کرتے مگر (ہر طرح کی) خرابی اور ضرور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے دوڑاتے کہ (ادھر کی بات اُدھر لگاتے اُدھر کی اِدھر) اور تم جانتے ہو کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی بات پر کان دھرنے والے ہیں (پس ظاہر ہے کہ ان کی موجودگی سے بجز فتنہ و فساد کے کچھ حاصل نہ ہوتا)، اور اللہ جانتا ہے کون ظلم کرنے والے ہیں؟

اور اُن کی یہ حرکتیں کچھ آج کی نہیں ہیں۔ جنگ احد میں بھی یہ لوگ یہی کچھ کر چکے ہیں۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ (۹:۴۸)

(اے پیغمبر اسلام!) یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں نے اس سے پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوششیں کیں، اور تمہارے خلاف ہر طرح کی تدبیریں اُلٹ پلٹ کر آزمائیں (چنانچہ جنگِ احد میں انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی تھی)، یہاں تک کہ سچائی نمایاں ہو گئی۔ اور اللہ کا حکم غالب ہوا، اور ایسا ہونا

ان کے لئے خوشی گوارا نہ تھا!

ان حرکات سے یہ لوگ اپنے لئے اپنی جہنم آپ تیار کر رہے ہیں۔

وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ائْذَن لِّي وَلَا تَفْتِنِّي ۚ أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ (۹/۴۹)

اور ان منافقوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے "مجھے اجازت دیجئے (کہ گھر میں بیٹھا رہوں) اور فتنہ میں نہ ڈالئے" تو سن لو یہ لوگ فتنہ ہی میں گر پڑے۔ (کہ جھوٹے بہانے بنا کر خدا کی راہ سے منہ موڑا اور فتنہ یہی فتنہ ہے! نہ کہ وہ بھی فتنہ جو ان کے نفاق نے گڑھ لیا ہے) اور بلاشبہ دوزخ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے!

ان کی حالت یہ ہے کہ

إِن تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَإِن تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِن قَبْلُ وَيَتَوَلَّوا وَّهُمْ فَرِحُونَ ۝ (۹/۵۰)

(اے پیغمبر اسلام!) اگر تمہیں کوئی اچھی بات پیش آجائے تو وہ انہیں (یعنی منافقوں کو) بُری لگے اور اگر کوئی مصیبت پیش آجائے تو کہنے لگیں۔ اسی خیال سے ہم نے پہلے ہی اپنے لئے مصلحت بینی کر لی تھی، اور پھر گردن موڑ کے خوش خوش چلدیں!

ان سے کہدیجئے کہ

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِندِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُم مُّتَرَبِّصُونَ ۝ (۹/۵۱-۵۲)

(اے پیغمبر اسلام!) کہدو، ہمیں کچھ پیش نہیں آسکتا مگر وہی، جو اللہ نے ہمارے لئے (اپنی کتاب میں) لکھدیا ہے، وہی ہمارا کارساز ہے، اور مومنوں کو چاہیئے کہ اللہ ہی پر (ہر طرح کا) بھروسہ رکھیں (اس کے سوا بھروسہ کا سہارا کوئی نہیں!) (اے پیغمبر اسلام! تم ان سے) کہو: تم ہمارے لئے جس بات کا انتظار کرتے ہو (یعنی جنگ میں قتل ہو جانے کا)، وہ ہمارے لئے اس کے سوا کیا ہے؟ کہ دو خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے (یعنی فتح اور شہادت)، اور ہم تمہارے لئے جس بات کے منتظر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ اپنے یہاں سے کوئی عذاب بھیجدے، یا ہمارے ہی ہاتھوں عذاب دلائے

(تو اب نتیجہ کا) انتظار کرو! ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔

ان میں سے کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو محض جنگ میں شرکت سے بچنے کی خاطر کچھ مالی امداد پیش کر رہے ہیں۔ ان سے کہدو!

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۹:۵۳)

اور اے پیغمبر اسلام! ان سے کہو: تم (بظاہر) خوشی سے (راہ حق میں) خرچ کرو یا ناخوش ہو کر تمہارا خرچ کرنا کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ تم ایسا گروہ ہو گئے جو (احکام الٰہی سے) نافرمان ہے! یہ اس لئے کہ۔

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ (۹:۵۴)

اور خرچ کرنے کی قبولیت سے وہ محروم نہیں کئے گئے۔ مگر اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے انکار کیا (اگرچہ وہ ایمان کے زبانی دعوے میں کسی سے پیچھے نہیں) وہ نماز کے لئے نہیں آتے مگر کاہلی کے ساتھ، اور (راہ حق میں) مال خرچ نہیں کرتے، مگر اس حال میں کہ خرچ کرنے کی ناگواری ان کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔

ان کا مال، اور اولاد، جن کی کثرت پر یہ نازاں ہیں ان کے لئے وجہ عذاب ہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (۹:۵۵)

تو دیکھو یہ بات کہ ان لوگوں کے پاس مال و دولت ہے اور صاحب اولاد ہیں تمہیں متعجب نہ کرے یہ تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ اللہ نے مال و اولاد ہی کی راہ سے انہیں دنیوی زندگی ہی میں عذاب دینا چاہا ہے (کہ نفاق و بخل کی وجہ سے مال کا غم وبال جان ہو رہا ہے اور اولاد کو اپنے سے برگشتہ اور اسلام میں ثابت قدم دیکھ کر شب و روز جل رہے ہیں۔) اور رہا آخرت کا معاملہ تو، ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں گی کہ ایمان سے محروم ہوں گے۔

ان کی حالت یہ ہے کہ

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝ (۹:۵۶-۵۷)

اور دلے پیروان دعوت ایمانی!) دیکھو، اللہ کی قسمیں کھاکر وہ (تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک گروہ ہے ڈرا سہما ہوا!! (ان کے دلوں کے خوف نفرت کا یہ حال ہے کہ، اگر انہیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے، یا کوئی غار، یا کوئی اور چھپ بیٹھنے کا سوراخ، تو تم دیکھو کہ یہ فوراً اس کا رخ کریں، اور حالت یہ ہے کہ گویا رسی توڑ کر بھاگے جا رہے ہیں!

بعض ایسی خبیث حرکتوں پر بھی اتر آتے ہیں کہ

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ○ (۹/۵۸)

اور ان میں کچھ ایسے ہیں کہ مال زکوٰۃ بانٹنے میں تجھ پر عیب لگاتے ہیں (کہ تو لوگوں کی رعایت کرتا ہے) پھر حالت اُن کی یہ ہے کہ اگر انہیں اس میں سے دیا جائے تو خوش ہو جائیں نہ دیا جائے تو بس اچانک بگڑ بیٹھیں!

حالانکہ ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ○ (۹/۵۹)

اور (کیا اچھا ہوتا) اگر ایسا ہوتا کہ جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں دے دیا، اس پر رضامند ہو جاتے، اور کہتے، ہمارے لئے اللہ بس کرتا ہے، اللہ اپنے فضل سے ہمیں (بہت کچھ) عطا فرمائیگا اور اس کا رسول بھی (عطاء و بخشش میں کمی کرنے والا نہیں) ہمارے لئے تو بس اللہ ہی غایت و مقصود ہے!

ان کی اسلام دشمنی کی یہ حالت ہے کہ خود تو خود، دوسروں کو بھی جنگ میں شرکت سے روکتے ہیں، اور ان کے حوصلے پست کرتے ہیں۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۹/۸۱)

جو (منافقین جہاد میں شریک نہیں ہوئے اور) پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ وہ اس بات پر خوش ہوئے کہ اللہ کے رسول کی خواہش کے خلاف اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور انہیں یہ بات ناگوار ہوئی کہ اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا تھا

"اس گرمی میں (گھر کا آرام چھوڑ کر) کوچ نہ کرو" (اے پیغمبر اسلام!) تم کہو: "دوزخ کی آگ کی گرمی تو اس سے کہیں زیادہ گرم ہوگی!" اگر انہوں نے سمجھا ہوتا (تو کبھی اپنی اس حالت پر خوش نہ ہوتے!)

لیکن ان سے کہدو کہ تمہارے اعمال کے نتائج و عواقب بہت جلد تمہارے سامنے آنے والے ہیں!

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ٥ (۹: ۸۲)

اچھا، یہ تھوڑا سا ہنس لیں، پھر انہیں اپنی ان بدعملیوں کی پاداش میں بہت کچھ رونا ہے جو یہ کماتے رہے ہیں!

جو کچھ یہ کر رہے ہیں اسے اچھی طرح سے یاد رکھو، تاکہ آیندہ ایسے مواقع پر، انہیں بتادو کہ ان کا سابقہ طرز عمل کیا رہا ہے؟

فَإِن رَّجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُم بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ ٥ (۹: ۸۳)

تو (دیکھو!) اے پیغمبر اسلام! اگر اللہ نے تمہیں ان کے کسی گروہ کی طرف (صحیح سلامت) لوٹادیا اور پھر (کسی موقع پر) انہوں نے (جہاد میں) نکلنے کی اجازت مانگی، تو اس وقت تم کہدینا، "تم میرے ساتھ کبھی نکلو۔ اور نہ کبھی میرے ساتھ ہو کر دشمن سے لڑو تم نے پہلی مرتبہ بیٹھ رہنا پسند کیا، تو اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ (گھروں میں) بیٹھے رہو!

اعراب

مدینہ کے ان منافقین کے علاوہ کمزور ایمان والوں کا ایک اور گروہ بھی تھا۔ جو صحرا نشین عرب پر مشتمل تھا۔ یہ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور ہنوز ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین نہیں ہوا تھا۔ ان کے متعلق فرمایا۔

وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥ (۹: ۹۰)

اور (اے پیغمبر اسلام!) اعرابیوں میں سے (یعنی عرب کے صحرائی بدوؤں میں سے) عذر کرنے والے تمہارے پاس آئے کہ انہیں بھی (رہ جانے کی) اجازت دی جائے اور (ان میں سے) جن لوگوں نے (اظہار اسلام کرکے) اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ گھروں ہی میں بیٹھے رہے۔ سو معلوم ہو کہ ان میں سے جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی، انہیں عنقریب عذاب دردناک پیش آئے گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض صورتیں معذوری کی بھی ہوتی ہیں، ایسی صورتوں میں کسی پر کچھ الزام نہیں ہوتا۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ (۹۱/۹)

ناتوانوں پر، بیماروں پر، اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لئے کچھ میسر نہیں، کچھ گناہ نہیں (اگر وہ دفاع میں شریک نہ ہوں)، بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں کوشاں رہیں (کیونکہ ایسے لوگ نیک عملی کے دائرہ سے الگ نہیں ہوئے اور) نیک عملوں پر الزام کی کوئی وجہ نہیں اللہ بڑا ہی بخشنے والا، رحمت والا ہے!

لیکن یہ لوگ جو ہر طرح سے شرکت جنگ کی استطاعت رکھنے کے باوجود بہانہ تراشیاں کر رہے ہیں انہیں کس طرح سے اجازت دی جاسکتی ہے؟

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿ (۹۳/۹)

(اے پیغمبر اسلام!) الزام تو دراصل اُن پر ہے جو تجھ سے (بیٹھے رہنے کی) اجازت مانگتے ہیں۔ حالانکہ مالدار ہیں انہوں نے پسند کیا کہ (جب سب لوگ راہِ حق میں کوچ کر رہے ہوں، تو یہ) گھروں میں رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہیں! (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔ پس یہ سمجھتے بوجھتے نہیں!

اب تو یہ لوگ ایسا کچھ کر رہے ہیں۔ اور اس کے بعد۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءً ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿ (۹۶-۹۴/۹)

جب تم (جہاد سے لوٹ کر) ان کے پاس واپس جاؤ گے تو وہ آئیں گے اور تمہارے سامنے (طرح طرح کی) معذرتیں کریں گے (اے پیغمبر اسلام!) تمہیں چاہیئے (اُس وقت) کہدو "معذرت

کی باتیں نہ بناؤ۔ اب ہم تمہارا اعتبار کرنے والے نہیں۔ اللہ نے ہمیں پوری طرح تمہارا حال بتلا دیا ہے۔ اب آئندہ اللہ اور اس کا رسول دیکھے گا، تمہارا عمل کیا رہتا ہے؟ (نفاق پر مصر رہتے ہو یا باز آتے ہو) اور پھر (بالآخر) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر و پوشیدہ ہر طرح کی باتیں جاننے والا ہے۔ پس وہ تمہیں بتلائے گا کہ (دنیا میں) کیا کچھ کرتے رہے ہو!" جب تم لوٹ کر ان سے ملو گے، تو ضرور یہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے، تاکہ ان سے درگذر کرو۔ سو چاہیئے کہ تم ان سے درگذر ہی کرلو! (یعنی رخ پھیر لو) یہ ناپاک ہیں ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ اسی کمائی کا نتیجہ جو یہ (اپنی بدعملیوں سے) کماتے رہے! یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ اُن سے راضی ہو جاؤ، سو دیاد رکھو! اگر تم راضی بھی ہو گئے، (حالانکہ تمہیں راضی نہ ہونا چاہیئے، اور تم راضی نہ ہوگے) تو اللہ ان سے کبھی راضی ہونے والا نہیں۔ جو (دائرۂ ہدایت سے) باہر ہوگئے ہیں!

ان ہی میں ایسے لوگ ہیں کہ

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ۚ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

اور اعرابیوں ہی میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو کچھ (راہ حق میں) خرچ کرتے ہیں، اسے (اپنے اوپر) جرمانہ سمجھتے ہیں اور منتظر ہیں کہ تم پر کوئی گردش آجائے۔ (تو لوٹ پڑیں) حقیقت یہ ہے کہ بری گردش کے دن خود ان ہی پر آنیوالے ہیں، اور اللہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے!

ان کے برعکس مؤمن حقہ وہ لوگ ہیں۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

اور مہاجرین و انصار میں سے جو لوگ سبقت کرنے والے، سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی تو اللہ ان سے خوشنود ہوا۔ وہ اللہ سے خوشنود ہوئے، اور اللہ نے ان کے لئے (نعیم ابدی کے) باغ تیار کر دیئے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ (اور اس لئے وہ خشک ہونے والے نہیں) وہ ہمیشہ اس (نعمت و سرور کی زندگی) میں رہیں گے، اور یہ بہت بڑی فیروزمندی ہے!

چونکہ مقابلہ بازنطینی شاہنشاہیت سے تھا اس لئے نبی اکرمؐ تیس ہزار کا لشکر جرار لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے، جس میں دس ہزار گھوڑے تھے، (ذرا اس کا مقابلہ بدر کی بے سروسامانی سے کیجئے) تبوک

بغیر جنگ کے کامیابی

کے مقام پر جا کر معلوم ہوا کہ اگرچہ رومیوں میں کھچڑی ضرور پک رہی تھی لیکن ان کی طرف سے فوری حملہ کا کوئی امکان نہیں۔ اس لئے حضورؐ نے وہاں بیس دن تک قیام کیا۔ ادھر ادھر کے عیسائی سرداروں نے جزیہ دے کر اطاعت قبول کی اور آپ واپس تشریف لے آئے۔ اگرچہ جنگ نہیں ہوئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سفر میں مجاہدین کی بھوک پیاس واماندگی سب کو اعمال صالحہ قرار دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سفر جہاد سے بڑھ کر منزل حیات تک لے جانے والا اور کون سا سفر ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس راہ میں ہر تکلیف ابدی کامرانیوں کی کفیل ہے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۹ : ۱۲۰)

مدینہ کے باشندوں کو اور ان اعرابیوں کو جو اس کے اطراف میں بستے ہیں لائق نہ تھا کہ اللہ کے رسول کا (دفاع میں) ساتھ نہ دیں۔ اور پیچھے رہ جائیں، اور نہ یہ بات لائق تھی کہ اس کی جان کی پرواہ نہ کرکے محض اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں اس لئے کہ اللہ کی راہ میں انہیں جو مصیبت بھی پیش آتی، وہ ان کے لئے ایک نیک عمل شمار کی جاتی۔ ہر پیاس جو وہ جھیلتے، ہر محنت جو وہ اٹھاتے، ہر مخمصہ جس میں وہ پڑتے، ہر وہ قدم جو وہاں چلتا، جہاں چلنا کافروں کے لئے غیض و غضب کا باعث ہوتا۔ اور ہر وہ چیز جو وہ (مال غنیمت میں دشمنوں سے پاتے (یہ سب کچھ ان کے لئے نیک عمل ثابت ہوتا کیونکہ) اللہ نیک کرداروں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

⁂

حضورؐ مدینہ واپس تشریف لائے تو متخلفین (پیچھے رہ جانے والوں کا) معاملہ پیش ہوا۔ یہ قریب

حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ

اسی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی معذرت پیش کی اور حضورؐ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن تین صحابہ ایسے تھے جن کے لئے وحی کے

حکم کا انتظار کرنا پڑا ان میں سے ایک کعب بن مالکؓ تھے، باقی دو ہلالؓ بن امیہ اور مرارہ بن ربیع تھے
یہ واقعہ خلوص وصداقت، اور ضبط و انضباط کا ایسا مرقع ہے کہ جس کا ہر گوشہ نگاہوں کے سامنے لانے
کے قابل ہے۔ بہتر ہو کہ یہ ماجرا خود حضرت کعبؓ کی زبان ہی سے سنئے! آپ کا بیان ہے کہ اس سفر میں
میرا گھر پر رہ جانا محض ابتلاء تھا۔ نہ ہی ایسا کرنے کا میرا ارادہ تھا، اور نہ ہی کوئی عذر تھا۔ بلکہ میں نے اس کے
لئے خاص تیاری کر رکھی تھی۔ جس روز لشکر اسلام روانہ ہوا، مجھے کچھ کام تھا۔ میں نے کہا خیر کل چلا جاؤں گا۔
دو تین دن اسی طرح سستی میں گذر گئے۔ اب لشکر اتنی دور نکل چکا تھا کہ جا کر اس سے ملنا مشکل تھا۔ مجھے بہت
صدمہ تھا کہ یہ کیا ہوا؟ میں اسی تذبذب میں رہا کہ اتنے میں رسول اللہ واپس بھی تشریف لے آئے۔ لوگوں نے
مجھ سے کہا کہ جس طرح اور لوگوں نے حیلے بہانے بنا کر، معذرت قبول کرالی ہے تم بھی ایسا ہی کرو! لیکن میری
روح اس تصور سے کانپتی تھی کہ جھوٹ اور وہ بھی رسول اللہؐ کے سامنے! میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور
سارا ماجرا ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "تم اپنے گھر میں ٹھیرو! اور حکم خداوندی کا انتظار کرو!

بلا کسی عذر کے ملت کے اجتماعی امور میں عدم شرکت اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کا فیصلہ رسولؐ اللہ خود
نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان تینوں سے بات چیت نہ کرے، اور نہ ان کے
پاس بیٹھے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اب زندگی اور اس کی تمام جاذبیتیں ہمارے لئے وبال جان بن گئیں۔ زمین
اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی۔ میرے دو ساتھی تو گھروں میں بیٹھ کر روتے رہے۔ لیکن میں باہر
نکلتا تھا اور نماز میں بھی شریک ہوتا تھا۔ لیکن کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ میں حضورؐ کے قریب ہی نماز پڑھتا
اور کنکھیوں سے حضورؐ کی طرف دیکھتا رہتا۔ لیکن نگہ کرم کا میری طرف التفات نہ ہوتا۔ ایک شام میں اپنے
چچازاد بھائی کے باغ میں گیا۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت تھی۔ میں نے جا کر سلام کیا تو انہوں نے میرے سلام کا جواب
تک نہ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی! میں تم سے قسمیہ پوچھتا ہوں کہ بتاؤ۔ کیا میں خدا اور رسول کو دوست
نہیں رکھتا۔ انہوں نے اس پر بھی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر پوچھا تو پھر بھی ساکت رہے۔ میں نے تیسری مرتبہ قسم
دیکر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی جانتا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں واپس
چلا آیا۔ ایک دن میں بازار میں چکر لگا رہا تھا کہ ایک شامی سوداگر میرے پاس آیا۔ اور ملک غستان کا خط مجھے

ملت سے وفاشعاری

دیا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا تم سے خفا ہو گئے ہیں
اور باقی لوگ بھی تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ تمہارا مرتبہ
بہت بڑا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اس طرح چھوڑ دیئے جاؤ۔ تم یہ خط پڑھتے ہی ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہاں آکر
تم دیکھو گے کہ تمہاری قدر و منزلت کس طرح پہچانی جاتی ہے۔

غور فرمائیے! یہ کتنی بڑی آزمائش تھی۔ لیکن جس دل میں ایمان کی حرارت موجود ہو اس کے لئے یہ آزمائش کیا حیثیت رکھتی ہے؟ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اس خط سے میرے غم وغصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے وہ خط اُسی قاصد کے سامنے جلا دیا۔ اور کہا کہ اپنے آقا سے جاکر کہنا کہ تمہاری عنایات والتفات سے مجھے میرے آقا کی بے التفاتی لاکھ درجہ خوشتر ہے! میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ کی طرف سے ایک اور حکم موجود ہے کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ رہو میں نے پوچھا کہ کیا طلاق کا حکم ہے؟ کہا نہیں۔ صرف علیحدہ رہنے کا۔ یہ سُن کر میں نے بیوی کو میکے بھیج دیا۔ پچاس دن اسی کرب والم میں گزر گئے۔ پچاسویں دن میں اسی غم میں اپنی چھت پر بیٹھا تھا کہ میں نے آواز سنی کہ کوئی شخص جبل سلع سے بلند آواز میں پکار رہا تھا کہ اے کعب مبارک ہو! میں سجدہ میں گر گیا کہ اللہ نے میری توبہ قبول کرلی۔! اس کے بعد لوگ بشارت لیکر یکے بعد دیگرے میری طرف آنے لگے۔ لوگ گھوڑوں پر چڑھ کر اس تیزی سے آرہے تھے کہ ہر طرف سے بشارت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ جس نے سب سے پہلے آکر مجھے یہ مژدہ جاں فزا سنایا، میرے پاس دو کپڑے تھے، میں نے دونوں اتار کر اسے دیدیئے۔ اس کے بعد میں جلدی جلدی خدمت نبوی میں حاضر ہوا تو راستہ بھر لوگ جماعت در جماعت مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔ مسجد میں پہنچا تو احباب دوڑ دوڑ کر آئے اور مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ میں نے رسول اللہؐ کو سلام کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اے کعب! مبارک ہو۔ آج کا دن تیرے لئے سب سے مبارک ہے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! یہ آپ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے فرمایا خدا کی جانب سے! میں نے فرطِ مسرت میں عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ خدا کے اس احسان کے شکریہ میں اپنا سب کچھ صدقہ کردوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ اپنے لئے بھی رکھ لو۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ میرے اللہ نے میری صداقت کو اپنے بذل واحسان سے اس طرح نوازا!

یہ واقعہ اس قدر اہم ہے کہ تاریخ کے علاوہ خود قرآن کریم نے اسے اپنے دامنِ حفاظتِ ابدی میں جگہ دی ہے۔ سورۂ توبہ میں ان حضرات کے متعلق ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝ (۹/۱۰۶)

اور (پچھلے تائب گروہ کے علاوہ) کچھ لوگ اور بھی ہیں جن کا معاملہ اس انتظار میں کہ اللہ کا حکم کیا ہوتا ہے، ملتوی ہوگیا ہے، (وہ انہیں سزا دے یا (اپنی رحمت سے) ان پر لوٹ آئے (یہ اسی کے ہاتھ ہے) اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

اس کے بعد فرمایا۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اور (اسی طرح) ان تین شخصوں پر بھی اُس کی رحمت لوٹ آئی، جو (معلق حالت میں) چھوڑ دیئے گئے تھے (اور اُس وقت لوٹ آئی) جبکہ زمین اپنی ساری وسعت پر بھی ان کے لئے تنگ ہو گئی تھی۔ اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے۔ اور انہوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انہیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی۔ مگر خود اسی کے دامن میں۔ پس اللہ (اپنی رحمت سے) ان پر لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں۔ بلاشبہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا۔ بڑا ہی رحمت والا ہے!

عبرت و موعظت ہم نے بھی اس واقعہ کو اس شرح و بسط کے ساتھ اس لئے درج کیا ہے کہ اس میں آج ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں۔ وہاں تو یونہی تکاسل اور سہل انگاری سے ایسا ہو گیا تھا آج ہماری حالت یہ ہے کہ کھلے بندوں ملت کے اجتماعی مفاد کے خلاف غداری کی جاتی ہے اور اس کے بعد یہ غداران ملت اسی طمطراق کے ساتھ اکڑتے پھرتے رہتے ہیں نہ ان کے دل میں خدا کی شرم ہوتی ہے اور نہ ہی قوم میں یہ احساس کہ ایسے ملعونین کا کم از کم معاشرتی بائیکاٹ ہی کیا جائے۔ اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ معاندین کس طرح اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ ایسے ملت فروشوں کو فوراً خرید لیا جائے۔ اس قسم کے سوداگروں کی پیشکش کا جواب وہ تنور ہے جس میں حضرت کعب نے والیٔ غسان کا خط چاک کر کے ڈالا تھا۔ لیکن "جعفران ایں زماں" تو خود ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں، یاد رکھئے ؎

جعفر اندر ہر بدن ملت کُش است   ایں مسلمانے کہن ملت کُش است

۱؎ عام لوگوں کے متعلق فرمایا۔

لَقَد تَّابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ

(اے پیروان دعوت ایمانی!) یقیناً اللہ اپنی رحمت سے پیغمبر پر متوجہ ہو گیا۔ نیز مہاجرین و انصار پر جنہوں نے بڑی تنگی اور بے سروسامانی کی گھڑی میں اس کے پیچھے قدم اٹھایا۔ اور اس وقت اٹھایا، جبکہ ایسی حالت ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جائیں۔ پھر وہ اپنی رحمت سے ان سب پر متوجہ ہو گیا۔ بلاشبہ وہ شفقت رکھنے والا۔ رحمت فرمانے والا ہے۔

ان کا ایک ہی علاج ہے کہ قوم ان کے ساتھ ایسا سلوک کرے کہ قرآن کے الفاظ میں:

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (-)

ان پر زمین اپنی کشادگیوں کے باوجود تنگ ہو جائے۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنی جان سے تنگ آجائیں۔

اور انہیں یقین ہو جائے کہ

لَا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ

خدا سے بھاگے ہوئے کو سوائے خدا کے در کے اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی!

اور وہ اس حقیقت کو محسوس طور پر اپنے سامنے رکھ لیں کہ

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا است

بندہ غدار را مولا کجا است

جب تک وہ ملت کے قدموں پر آکر اپنا سر نہ رکھ دیں۔ انہیں دنیا میں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے۔

حج تبوک کی مہم عہد نبوی کے سلسلۂ غزوات و سرایا کی آخری کڑی تھی۔ تطہیر کعبہ سے حکومت خداوندی کی مرکزیت قائم ہو چکی تھی۔ تبوک سے واپسی پر حضورؐ نے مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ سے حج کے لئے روانہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ سالار کارواں (امیر الحجاج) اور حضرت علیؓ نقیب اسلام تھے۔ حضورؐ نے اپنی قربانی کے اونٹ بھی ساتھ ہی کر دیئے کہ مقام قربانی کعبہ ہی ہے (تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی) اب حج کو قرآنی خطوط پر متشکل کیا گیا (اس کی تفصیل حج کے عنوان میں آئے گی)، اس کے بعد حضرت علیؓ نے سورۂ توبہ کی ابتدائی چالیس آیات پڑھ کر سنائیں اور اس طرح اعلان کر دیا کہ توحید الٰہی کا یہ مرکز آئندہ مشرکین کے قدم سے ملوث نہیں ہوگا۔ مشرکین سے جو وعدے ہو چکے ہیں انکی مدت تک ان کی پابندی کی جائے گی۔ جن سے کوئی عہد نامہ نہیں ہوا انہیں چار ماہ کی مہلت ہے۔ اس کے بعد اللہ اور رسول (یعنی مرکز حکومت الٰہیہ) ان سے بری الذمہ ہیں۔ اس کے بعد مکہ کے باقی ماندہ کفار بھی مسلمان ہو گئے اور عرب کے جو قبائل باقی رہ گئے تھے۔ وہ جوق در جوق حضورؐ کی خدمت میں آکر اسلام میں داخل ہو گئے۔

قطرات خون کا شمار مورخین کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی رو سے عہد نبوی میں ۸۲ مرتبہ جنگی مقاصد کے لئے نقل و حرکت کرنے کی ضرورت پڑی۔ ان میں سے ۱۹ میں خود نبی اکرمؐ نے شرکت فرمائی۔ انہیں اصطلاح میں غزواۃ کہتے ہیں۔ اور بقایا میں حضورؐ تشریف نہیں لیگئے۔ انہیں سرایا کہتے ہیں۔ ان تمام غزواۃ و سرایا میں کل ۲۵۹ مسلمان شہید ہوئے اور ۷۵۹ مخالفین (کل ۱۰۱۸) اس تعداد کو ۸۲ پر پھیلایئے تو

اوسط قریباً ½ ۲ نکلتا ہے۔ یہ ہیں قطرات خون، نچوڑ "وحشت و بربریت" کی ان خونچکاں داستانوں کا جو مخالفین اسلام اسلامی شمشیر کی طرف منسوب کر کے دنیا کو اس دین سے خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔ نو سال کے عرصہ میں تمام لڑائیوں میں مقتولین کی تعداد (۱۰۱۸) کو دیکھئے اور دوسری طرف اس دور تمدن و تہذیب اور عصر علم و عقل کے مناقشات و تنازعات کے نتائج کو سامنے رکھئے۔ صاف نظر آجائے گا کہ وحشت و بربریت کا دور کون ہے؟ چھوڑئیے ان اعداد و شمار کو جو سنہ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم نے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ یا پھر دوسری عالمگیر جنگ سنہ ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ء میں دیدۂ عبرت کے سامنے آئے۔ آج لاکھوں تک کی نوبت تو معمولی فسادات میں پہنچ جاتی ہے۔

پھر اس (۱۰۱۸) کی تعداد میں آپ کو غیر مصافی آبادی کا ایک فرد بھی دکھائی نہ دے گا۔ غیر مصافی آبادی تو ایک طرف، آپ نے غزوۂ بدر کے کوائف میں دیکھا ہے کہ حضورؐ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ جو لوگ قریش کی طرف سے مجبوراً میدان جنگ میں لائے گئے ہیں انہیں بھی قتل نہ کیا جائے۔ نیز ان میں کسی معصوم بچے یا بےگناہ عورت کا سر بھی آپ کو دکھائی نہ دیگا کہ حضورؐ نے تاکیداً حکم دے رکھا تھا۔

لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا ولا صغیرا ولا امرأۃ (ابوداؤد)

یعنی کسی کہن سال یا بچے یا کمسن عورت کو قتل مت کرو!

پھر دیکھئے کہ ان ۱۰۱۸ انسانوں کی جانوں سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا۔ سب سے پہلے عرب کی حالت کو لیجئے۔ عربوں کے عہد جاہلیت کے کوائف و حالات گذشتہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ ان کی ایک ایک لڑائی کا سلسلہ سینکڑوں برس تک مسلسل جاری رہا کرتا تھا۔ ان ایک ہزار انسانوں کی قربانی سے لڑائیوں کے وہ تمام سلسلے یکسر منقطع ہو گئے۔ پھر ان کے انتقامات کا سلسلہ پشت در پشت چلا کرتا تھا۔ عہد جاہلیہ کے تمام انتقامات موقوف ہو گئے۔ شراب، سود خواری، قمار بازی، قبائلی عصبیت، وحشت و بربریت۔ درندگی اور خونخواری اور اس قسم کی دیگر انسانیت سوز رسوم ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان سب کی اصلاح ہو گئی۔ قتل و غارتگری، قزاقی، رہزنی کا یہ عالم تھا کہ حرم کی چار دیواری کے باہر کسی کی جان اور مال کہیں بھی محفوظ نہ تھا۔ اب یہ حالت تھی کہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق جب عدی بن حاتم اسلام لائے تو حضورؐ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ خدا اس کام کو اس طرح سے پورا کرے گا کہ ایک عورت قادسیہ سے چلیگی اور کعبہ کی زیارت کرے گی اور اسے خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا؟ عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا عرب اس قدر پرامن ہو چکا تھا کہ ایک تنہا عورت کو قادسیہ سے حرم تک سفر میں کسی قسم کا کوئی اندیشہ ہی نہ ہوتا تھا۔ ان سلبی خصوصیات سے آگے بڑھئے اور ایجابی منافع کو دیکھئے تو عربوں کی بادیہ نشین، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی قوم کو ان کی اس پست سطح سے اٹھا کر اتنا بلند کر دیا کہ وہ چند ہی سال میں قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کی وارث

اور خوں بہا!

بن گئی۔ پوچھئے تاریخ کے کسی ماہر سے کہ ایک ہزار انسانوں کی قربانی سے اس قدر تحیر انگیز انقلاب کسی اور جگہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ اور عرب سے باہر نکل کر دیکھئے تو صاف نظر آجائے گا کہ اللہ والوں کی مٹھی بھر جماعت جس کے متعلق بدر کے میدان میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اگر یہ مٹ گئی تو دنیا میں خدا کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ اگر خدا کا نام بلند کرنے کیلئے آگے نہ بڑھتی اور باطل کی قوتوں سے مرعوب ہو کر اپنے مقاصد کو ترک کر کے الگ ہو بیٹھتی

عالمگیر انقلاب

تو آج دنیا کی کیا کیفیت ہوتی، دنیا کے تمدنی، معاشرتی، معاشی، عمرانی، ثقافتی، علمی، ادبی، غرضیکہ ہر قابلِ تحسین گوشے میں جو انقلاب اسلام کے ذریعے رونما ہوا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر اسلام دنیا میں ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے باقی نہ رہتا تو دنیا ازمنۂ مظلمہ کی ان ہی تاریکیوں میں ہوتی جن میں یورپ اسلامی تمدن سے روشناس ہونے سے پہلے تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تو بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کی شب تیرہ و تار میں اس قدر نورانی سحر پیدا کرنے کے لئے ایک ہزار جانوں کی قربانی یقیناً کچھ بھی قیمت نہیں رکھتی۔ اور یہ انقلاب نوعِ انسانی پر ایسا احسان عظیم ہے جس سے انسانیت کی گردنِ تشکر کبھی اوپر نہیں اٹھ سکتی۔

یہ محیر العقول انقلاب مادی اسباب و ذرائع سے کہیں زیادہ ایمانی قوتوں کی رو سے عمل میں آیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی انقلاب کے لئے مادی قوتوں کی ازبس ضرورت ہے، اس لئے کہ ایمانی قوت، مادی قوتوں کی رو سے ہی قوتِ نافذہ بن سکتی ہے۔ لیکن اس نظام میں مادی اقتدار ہمیشہ ایمانی اقتدار کے تابع رہتا ہے (۱۱؍۱۷) اس باب میں لکھتا ہے۔

> مسلمانوں کی فوج ان کی تمام امت تھی۔ یعنی پوری کی پوری قتال جماعت۔ ان کی قوت کا راز ان کے اسلحہ اسلحیت یا ان کی تنظیم کے تفوق میں نہ تھا۔ بلکہ ان کے بلند ترین کیرکٹر میں تھا جس کی اساس ان کے مذہب پر تھی۔
>
> (تاریخ عرب صفحہ ۱۴۳)

اس امت کی تمام سعی و کاوش کا مقصد یہ تھا کہ

> ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق پر جھکا دیا جائے (جامع ترمذی تفسیر مائدہ)

حق قرآن ہے (یعنی ضابطۂ قوانینِ الٰہیہ) اور ظالم ہر وہ قوت جو خدا کے سوا کسی اور کے احکامات کی اطاعت کرے اور دوسروں سے ایسی اطاعت کرائے۔ یہ ہے مقصد قتال فی سبیل اللہ کا۔

تیغ بہر عزت دین است و بس!
مقصد او حفظِ آئین است و بس!

سلسلۂ دعوت و ارشاد اور تعلیم و تبلیغ

گزشتہ باب میں جن غزوات کا ذکر آیا ہے، اگر انہیں باقی متن سے الگ کر کے پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا گویا حضورؐ کی ساری زندگی لڑائیوں ہی میں گزری۔ اس میں شبہ نہیں کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے اس مرحلہ میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا بہت سا وقت صرف ہو گیا۔ (اور تاسیس و استحکام حکومتِ الٰہیہ کے لئے یہ ناگزیر بھی تھا) لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ دیگر امور متعلقہ مناصب رسالت و امارت تشنۂ توجہ رہ جاتے تھے۔ ہر کام اپنے ٹھکانے پہ ہو رہا تھا۔ اور باحسن وجوہ مکمل۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شروع شروع میں جب دیگر قبائل عرب کی طرف دعاۃ و معلمین کو بھیجا جاتا تو وہ غداری کرتے اور اکثر اوقات ان حضرات کو ان کی دست درازیوں کا شکار ہونا پڑتا۔ فتح مکہ کے بعد اس قسم کے خدشات بہت کم ہو گئے اس لئے اب سلسلۂ دعاۃ و معلمین باقاعدہ جاری کیا گیا۔ بایں ہمہ جب دعاۃ کو دوسرے قبائل کی طرف بھیجا جاتا تو حفاظت خود اختیاری کی غرض سے کچھ فوج ساتھ کر دی جاتی۔ جماعت میں سے جو شخص سب سے زیادہ قرآن جانتا اسے ان کا امیر مقرر کر دیا جاتا۔ یہ جماعتیں

دعاۃ و مبلغین لوگوں کے سامنے اسلام پیش کرتیں، اور اس طرح اس نیر درخشاں کی کرنیں دور دراز تک پھیلتی چلی جاتیں ان کے علاوہ جو عمال، زکوٰۃ یا جزیہ وصول کرنے کیلئے جاتے وہ بھی اسلام کے مبلغ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں تبلیغ و دعوت کے لئے کوئی "الگ فرقہ" مقرر نہ تھا۔ ہر مسلمان اپنی اپنی استعداد کے مطابق اسلام کا عالم، واعظ، مبلغ اور مدرس ہوتا تھا۔ ان دعاۃ کو بابِ نبوت سے تاکید ہوتی تھی کہ وہ سہولت سے کام کریں۔ سختی نہ کریں۔ لوگوں کو خوشخبری سنائیں۔ نفرت نہ دلائیں۔ پہلے توحید و رسالت کی دعوت دیں۔ اور اس کے بعد بتدریج احکام اسلامی ان تک پہنچائیں[1]۔ چنانچہ یمن۔ نجران۔ بحرین۔ اور شام کے بعض اضلاع تک میں اسلام اسی طرح سے پہنچا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ قبائل عرب کے وفود خود دربارِ رسالت میں تحقیق حال کے لئے پہنچتے، اور اپنے ساتھ اسلام کا بیش بہا تحفہ اپنی قوم کی طرف لے جاتے۔ مزینہ۔ بنو تمیم۔ بنو سعد۔ بنو حرث۔ طے۔ ثقیف۔ وغیرہ کے قبائل میں اسلام اسی طرح پھیلا تھا۔

وفود کی آمد طائف کا وفد آیا تو حضورؐ نے انہیں مسجد نبوی میں اتارا۔ ان لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن ان شرائط کے ساتھ کہ (۱) ان کے لئے زنا جائز رکھا جائے۔ (۲) سود کی ممانعت نہ کی جائے اور (۳) شراب سے نہ روکا جائے۔ یہ شرطیں بھلا کب مانی جا سکتی تھیں؟ حضورؐ نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ رکھے جانے

---

[1] بخاری میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں تبلیغ کے لئے بھیجا تو یہ احکام صادر فرمائے۔

درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نماز سے تو مستثنیٰ نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ زکوٰۃ اور جہاد کے بارے میں صورت رعایت کی جا سکتی ہے۔ جب تم لوگ اسلام میں پختہ ہو جاؤ گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگ جاؤ گے، اور جہاد میں بھی شامل ہوا کرو گے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں مجبور نہ کیا جائے کہ وہ اپنے معبود (منات) کو اپنے ہاتھوں سے توڑیں، یہ درخواست بھی منظور کر لی گئی۔

نجران عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز تھا جہاں ان کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا۔ نبی اکرمؐ نے انہیں دعوتِ اسلام کا خط بھیجا اور اس میں لکھا کہ اگر اسلام قبول نہ ہو تو حکومت خداوندی کی سیاسی اطاعت قبول کر کے جزیہ ادا کرو، اہل نجران نے اپنے بطارقہ اور احبار پر مشتمل ایک وفد خدمت نبوی میں بھیجا۔ ان لوگوں نے حضورؐ سے بہت سی باتیں دریافت کیں جن کا جواب سورۂ آل عمران کی ابتدائی اسی آیات میں شرح و بسط سے آیا ہے۔ ان ہی کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ (۳/۶۴)

(اے پیغمبر اسلام!، تم (یہود و نصاریٰ سے) کہدو کہ اے اہل کتاب! (اختلاف و نزاع کی تمام ساری باتیں چھوڑ دو) اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے، اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر مسلم ہے (یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت (محکومیت و اطاعت اختیار) نہ کریں، کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں، ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے، گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنا لیا ہے، پھر اگر یہ لوگ (اس بات سے) روگردانی کریں، تم کہدو، گواہ رہنا، کہ (انکار تمہاری طرف سے ہے اور) ہم خدا کے ماننے والے ہیں۔

غور کیجئے! اسلام جو دین فطرت ہے اور جس کی اصولی تعلیم شروع سے ایک ہی رہی ہے کس طرح بطور اساس مشترک کے اُن کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن وہ لوگ اس حقیقت کبریٰ کو کیا پہچانتے، وہ دنیاوی امور میں "قیصر" کی حاکمیت کے تابع تھے اور مذہبی معاملات میں اپنے احبار و رہبان کی محکومیت کا طوق گلے میں ڈالے ہوئے۔ جب یہ لوگ دلائل باہرہ اور براہین قاطعہ کے باوجود ان حقائق کے قائل نہ ہوئے جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کے سامنے پیش کئے گئے تھے تو چونکہ انہیں اپنے زہد و اتقا، للہیت اور قرب خداوندی پر بڑا ناز تھا۔ ان سے کہا گیا کہ بہت اچھا۔ اگر تم علیٰ وجہ البصیرت حقائق کو پرکھنا نہیں چاہتے تو آؤ، ہم دعا کریں کہ جھوٹے پر خدا کی لعنت ہو، اس ابتہال کا ذکر سورۂ آل عمران کی اس آیت مقدسہ میں ہے

مباہلہ

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝ (۳/۶۰)

پھر جو کوئی تم سے اس بارے میں جھگڑا کرے، حالانکہ علم و یقین تمہارے سامنے آچکا ہے، تو تم اس سے کہدو، (میرے پاس مسیح کے انسان ہونے کے لئے علم و یقین موجود ہے اگر تم بھی اس کی الوہیت کیلئے ویسا ہی علم و یقین رکھتے ہو تو) آؤ (یوں فیصلہ کر لیں کہ) ہم دونوں فریق (میدان میں نکلیں اور) اپنے اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں

اور خود بھی شریک ہوں، پھر عجز و نیاز کے ساتھ خدا کے حضور التجا کریں، (ہم دونوں میں سے جس کا دعویٰ جھوٹا

ہو، تو جھوٹوں پر خدا کی پھٹکار ہو!

واضح رہے کہ سارے قرآن میں صرف یہی ایک مقام ہے جہاں مباہلہ کا ذکر ہے اور تاریخ سے بھی یہ ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کسی اور مقام پر کسی سے مباہلہ کیا ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خصوصی معاملہ تھا، جو اس وفد سے متعلق تھا۔ اس کا اطلاق عام نہیں ہوسکتا۔ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ میں فیہ (اس معاملہ میں) کی تخصیص خود بتارہی ہے کہ یہ حکم اسی معاملہ سے متعلق تھا۔ اور اس قسم کا مباہلہ صرف رسولؐ ہی کرسکتا تھا اور وہ بھی خدا کے حکم سے۔ یہ مسلک کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ جب کسی معاملہ میں آپ کے پاس دلیل و حجت موجود نہ ہو تو بجائے اعتراف حقیقت کے فوراً مباہلہ پر اتر آئیں، اور اس طرح امر متنازعہ فیہ کا فیصلہ علم و بصیرت کی بناء پر کرنے کے بجائے اسے لعنت و ملامت کی وادیوں میں کھینچ کر لے جائیں،

نجران کے عیسائی نہ مباہلہ کے لئے تیار ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اسلام قبول کیا لیکن اسلام کی سیاسی اطاعت قبول کرلی۔ اور حضورؐ سے کہا کہ ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے۔ غالباً یہ پہلا واقعہ ہے جس میں جزیہ عائد کیا گیا ہو۔

تفقہ فی الدین

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مسلمانوں میں واعظوں اور معلموں کا کوئی خاص طبقہ نہ تھا۔ ہر مسلم خدا کا سپاہی بھی تھا اور معلم و واعظ بھی، کہ اس پوری کی پوری جماعت کا کام "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تھا اور یہ وہ فریضہ تھا کہ جو بحالت جنگ اور بحالت صلح ہر میدان اور ہر مجلس میں سر انجام دیا جاتا تھا۔ لیکن مرکز آئین و دساتیر اور منبع قوانین و ضوابط بہر حال مدینہ ہی تھا۔ جو قبائل اطراف و اکناف ملک میں پھیلے ہوئے تھے ان کیلئے ضروری تھا کہ وہ اس مرکز سے قوانین و ضوابط کی تعلیم حاصل کریں، اس کے لئے خود قرآن نے یہ نظام قائم کردیا کہ ہر قبیلہ اور ہر گروہ میں سے کچھ لوگ مدینہ میں آئیں اور ان احکامات کو سیکھ کر اپنے قبیلہ والوں کے پاس لوٹیں، اور انہیں بھی ان سے آگاہ کریں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝ (۹/۱۲۲)

اور (دیکھو) یہ ممکن نہ تھا کہ سب کے سب مسلمان (اپنے گھروں سے) نکل کھڑے ہوں (اور تعلیم دین کے مرکز میں آکر علم و تربیت حاصل کریں)، پس کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم پیدا کریں، اور جب (یہ جماعت تعلیم و تربیت کے بعد) اپنے گروہ میں واپس جاتی، اور لوگوں کو (جہل و غفلت کے نتائج سے) ہوشیار کرتی۔ تاکہ (برائیوں سے) بچیں۔

واضح رہے کہ یہ گروہ جو تعلیم و تفقہ فی الدین کی غرض سے آتے تھے، کوئی مستقل حیثیت اختیار نہیں کرلیتے تھے، یہ نظام تمدنی ضروریات کے پیش نظر قائم کردیا گیا تھا۔ جب یہ گروہ واپس جاکر دوسروں تک ان احکامات کو پہنچا چکتا تو سکھانے اور سیکھنے والے سب برابر ہوجاتے۔ یہ "علماء" کی جماعت اور "مولوی صاحبان" کا گروہ، جو ایک مستقل فرقہ کی حیثیت لئے ہوئے ہے، بہت بعد کی پیداوار ہے، جب اسلام کا حقیقی نظام اور اس کی اصلی روح نگاہوں سے پوشیدہ ہوچکی تھی، اسلام اس موروثی برہمنیت کو مٹانے کیلئے آیا تھا

نہ کہ اسے قائم کرنے کے لئے۔

مساجد کی حیثیت اس تعلیم و تدریس کے لئے درسگاہیں نہیں تھیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے تمام اجتماعی امور کا مرکز ان کی مساجد تھیں۔ یہ سلسلۂ تفقہ و تعلّم بھی مساجد ہی میں سرانجام پاتا تھا۔ جو قبیلہ مسلمان ہوتا سب سے پہلے مسجد تعمیر کرتا۔ جتنے قبائل مدینہ کے مختلف جوانب میں اقامت پذیر ہو گئے تھے انہوں نے بھی اسی طرح مساجد تعمیر کر لی تھیں؛ قبیلہ کا جو مسلمان سب سے زیادہ قرآن جانتا وہی ان کا امام ہوتا۔ (آپ نے غور کیا ہو گا کہ عہد نبوی میں ترجیح اور تفوق کا ایک ہی معیار تھا اور وہ تھا قرآن دانی؛ مسجد کی امامت کا سوال ہو، یا میدان جنگ میں شہداء کی تدفین کا معاملہ، ہر مقام پر سبقت اسے حاصل تھی جو زیادہ قرآن جانتا تھا)، اکثر یہی ائمہ مساجد عمال حکومت بھی ہوتے تھے کہ اس زمانہ میں نماز اور حکومت دو الگ الگ شعبے نہیں تھے۔

قضا اور محاسبہ مدینہ اور اس کے نواح کے مقدمات کے فیصلے خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔ دوسرے بڑے بڑے مقامات میں قاضی مقرر کر دیئے گئے تھے۔ احتساب کا فریضہ بھی حضورؐ نے خود اپنے ہی ذمے لے رکھا تھا۔ اس زمانہ میں تجارت ہی عام کاروبار تھا، اس لئے اسی میں احتساب کی زیادہ ضرورت تھی۔ آپ اکثر بازاروں میں نکل جاتے اور بیع و شریٰ کے آئین و ساتیر پر عمل پیرائی کو محتسبانہ نگاہ سے دیکھتے۔ ایک دن آپ بازار سے گزرے تو غلہ کا ایک انبار سامنے نظر آیا، اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی، دریافت کرنے پر دکاندار نے کہا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ پھر بھیگے ہوئے غلہ کو اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو۔ یاد رکھو جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں (بروایت مسلم)، اسی طرح عمال اور محصلین کا بھی محاسبہ فرماتے، اور اس انداز سے کہ جزئی سے جزئی معاملہ بھی نظرانداز نہ ہونے پاتا۔ ایک محصل کا جائزہ لیا تو انہوں نے کہا کہ یہ چیز مجھے ان لوگوں نے تحفۃً دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں گھر بیٹھے بیٹھے انہوں نے تحفہ کیوں نہ بھیجا؟ اس کے بعد اس پر عام فیصلہ دیا، اور اس کی سخت مخالفت فرمائی۔

گورنرز ملک کے مختلف حصوں میں والی (گورنر) مقرر کئے جاتے۔ ان کی تربیت حضورؐ خود فرماتے، اور وہ پھر اپنے علاقہ میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنتے۔ ان امور کا ہم نے اس لئے عنوان زیر نظر میں ذکر کیا ہے کہ اگرچہ بظاہر یہ معاملات نظم و نسق حکومت سے متعلق تھے لیکن درحقیقت یہ سب تعلیم و تبلیغ ہی کے شعبے تھے۔ اس لئے کہ ہر عامل، اور ہر محصل، ہر والی۔ اور ہر محتسب، جہاں حکومت کا اہل کار تھا وہاں اسلام کا مبلغ اور معلم بھی تھا۔ اس تبلیغ و تعلیم کے لئے انہیں مدرسے اور مجالس قائم نہیں کرنی پڑتی تھیں، بلکہ چونکہ وہ خود اسلام کے زندہ پیکر تھے۔ اس لئے ان کی ہر نقل و حرکت اسلامی احکام کی چلتی پھرتی تفسیر تھی، اور ان کے تمام اعمال و افعال پر رسالتمآبؐ کی نگہ احتساب رہتی تھی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝ (—)

اے پیروان دعوت ایمانی! ہم نے اسی لئے تم کو درمیانی (اعتدال پسند) امت کا درجہ عطا فرمایا ہے تاکہ تم نوع انسانی (کے اعمال و افعال) کے نگران بنے رہو اور (خود) تمہارے (افعال کے) اوپر رسول کی (محافظت و) نگرانی قائم رہے۔

ان کے اوامر نوع انسانی کے لئے خیر کے پیمانے، اور ان کے نواہی شر کی میزانیں۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اُن کے ارادے　　دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

اسلام سرزمین عرب ہی کے لئے نہ تھا بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے پیغام حقیقت تھا۔ اس لئے صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں کو اندرونی شورشوں سے قدرے اطمینان کی توقع ہوئی تو اس پیغام انقلاب کو آگے بڑھانے کی منزل سامنے آئی، جس کے

دعوت نامے لئے نبی اکرمؐ نے قیصر روم، شاہنشاہ ایران۔ والی مصر۔ شاہ حبش اور رؤسائے یمامہ اور حارث

غسانی رئیس شام) کو دعوت نامے ارسال فرمائے۔ قیصر روم کے پاس جب حضورؐ کا گرامی نامہ پہنچا تو اتفاق سے ابوسفیان بہ سلسلۂ تجارت وہاں گیا ہوا تھا۔ اس نے ابوسفیان کو بلا کر حضورؐ کے متعلق حالات دریافت کئے، غور کیجئے! ابوسفیان اس وقت اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، لیکن رسول کے کیرکٹر کی عظمت (اور اس کے ساتھ ہی عربوں کی قومی خصوصیت کہ وہ دنی الطبع نہیں تھے) دیکھئے کہ ابوسفیان نے بھرے دربار میں بتایا کہ مدعی نبوت بڑے شریف خاندان سے متعلق ہے اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پیمان شکنی اور وعدہ خلافی نہیں کی، اور یہ کہ وہ خدا کی توحید اور پاک دامنی کی تعلیم دیتا ہے۔ ہرقل کے دل پر حضورؐ کی صداقت کا اثر ہو چکا تھا لیکن سلطنت کے مصالح اس کے اعتراف کی راہ میں مانع ہو گئے اور وہ اس شرف عظیم سے محروم رہ گیا۔ شاہنشاہ ایران نے اپنی قوت اور نشہ کی بدمستی میں نامۂ مبارک کی تعظیم نہ کی اور چند ہی سال کے بعد اس کی سرزمین کے ذروں نے دیکھ لیا کہ حق و صداقت کی آواز کے سامنے سرکشی کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ نجاشی شاہ حبش اسلام لایا اور حضرت جعفر طیار کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مقوقس (عزیز روم) نے بھی والا نامہ کا احترام کیا اور اگرچہ اسلام نہیں لایا لیکن خدمت نبوی میں تحائف اور ہدایا بھیجے۔ روسائے عرب نے مختلف جواب دیئے لیکن حارث غسان کی نخوت نے اسے مخالفت پر آمادہ کیا۔ غزوۂ تبوک اسی کا نتیجہ تھا۔

یہ دعوت نامے درحقیقت ایک شجر مقدس کے تخم صالح تھے جو اگرچہ اسی وقت بار آور نہ ہوئے لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ جن جن علاقوں میں دعوت اسلام کی یہ تخم ریزی ہوئی تھی، ان میں کا ایک ایک خطہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا اور ان کی شوکت و عظمت کا گہوارہ بنا۔ حق و صداقت کی صدا کبھی صدا بصحرا نہیں ہوا کرتی۔

———✻———

اسلامی نظام

(رسول کی مختلف حیثیتیں)

اسلامی نظام کی اساس اس اصل عظیم پر قائم ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی کی حکومت جائز نہیں۔ انسانی تصور ابھی تک زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچ سکا ہے کہ اگر کسی خاص خطۂ ارض کے انسان اپنی حکومت آپ قائم کریں، تو اس کا نام آزادی ہوگا۔ لیکن قرآنی تصور انسان کو اس سے کہیں بلند لے جاتا ہے۔ اس کے نزدیک حکومت، حکومت ہی ہے خواہ اپنوں کی ہو یا بیگانوں کی۔ اور (.RENE GUENON) کے الفاظ میں یہ دورِ حاضر کا بہت بڑا فریب ہے کہ حاکمیت کا تصور بغیر محکوم کے بھی ممکن ہے۔ حکومت قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ حاکم اور محکوم دونوں عناصر موجود نہ ہوں۔

حکومت صرف خدا کے لئے ہے

اور انسان کبھی اپنے آپ کو آزاد نہیں سمجھ سکتا جب تک حاکمیت کا اقتدار، انسانوں سے بلند و بالا ہستی کے سپرد نہ کر دیا جائے۔ قرآن یہی پیغام دنیا میں لایا ہے اور تمام نظام ہائے عالم میں واحد نظام ہے جس میں انسان حقیقی معنوں میں حریت اور آزادی کا کامل احساس کر سکتا ہے۔ سارا قرآن اسی اجمال کی تفصیل اور اسی مرکز کا محیط ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ (۱۲/۴۰، نیز ۶/۵۷، ۶۲)

حکومت (حاکمیت و فرماں روائی) اللہ ہی کے لئے (مخصوص) ہے۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اسی کی عبدیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو، اور کسی کی نہ کرو۔ یہی صحیح دین (نظام زندگی) ہے مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو اس (حقیقت) سے واقف نہیں۔

وہ اپنی حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا ۖ لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَبْصِرْ بِهِ

وَاَسْمِعْ ط مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ ج وَّلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝ (۱۸ / ۲۶)

(اے پیغمبر اسلام!) تو کہدے اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ کتنی مدت تک رہے۔ وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے، بڑا ہی دیکھنے والا، بڑا ہی سننے والا! اُس کے سوا کوئی کارساز نہیں۔ اور نہ وہ اپنے حکم (فرماں روائی) میں کسی کو شریک کرتا ہے!

توحید اس حقیقت کبریٰ پر ایمان لانا کہ اطاعت و محکومیت صرف خدا کی جائز ہے، اس کے سوا کوئی مطاع و حاکم نہیں، توحید ہے۔ اور یہی وہ توحید ہے جس کی دعوت رسول دیتا ہے

قُلْ اِنَّمَاۤ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا ۝ (۲۰ / ۷۲)

(اے پیغمبر اسلام!) تو کہدے کہ میں تو صرف اللہ ہی کو پکارتا ہوں اور اس کی (حاکمیت و فرماں روائی کے) ساتھ کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھیراتا!

کوئی اور قوت جو یہ دعویٰ کرے کہ اُسے حکومت کا حق حاصل ہے، طاغوتی قوت کہلاتی ہے۔ اس کے دعویٰ کو تسلیم کرنا شرک ہے، جس سے اجتناب جزو ایمان ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ط فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝ (۱۶ / ۳۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا۔ (تاکہ اُس پیام حق کا اعلان کردے) کہ اللہ کی عبدیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو، اور غیر خدا حکومت کی دعویدار قوتوں سے بچتے رہو۔ پھر ان اُمتوں میں سے بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہو گئی۔ پس ملکوں کی سیر کرو، اور دیکھو، جو قومیں (سچائی کی) جھٹلانے والی تھیں بالآخر کیسا انجام پیش آیا!

رسول کا یہی پیغام تھا ہر رسول یہی کہنے کے لئے آتا رہا۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱ / ۲۵)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی ہم نے نہ بھیجی ہو کہ "کوئی معبود نہیں ہے"، مگر صرف میری ذات، پس چاہئے کہ میری ہی عبدیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو!

اور یہی پکار نبی اکرمؐ کی تھی۔

قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ٥ (۲۱/۱۰۸)

(اے پیغمبر اسلام!) تو کہدے " مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی تنہا معبود ہے اس کے سوا کوئی نہیں) پس بتلاؤ، تم اس کی حکومت اختیار کرتے ہو یا نہیں"!

جس نے رسول کی اس دعوت پر لبیک کہا اور اس حقیقت پر ایمان لے آیا وہ مومن ہے، جس نے اس سے انکار کیا وہ کافر (نہ ماننے والا) اور جو کسی انسان کا حق حکومت تسلیم کرتا ہے وہ مشرک۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ٥ (۴/۶۰)

(اے پیغمبر اسلام!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی! (یعنی منافقوں کی حالت پر) ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن عمل کا حال یہ ہے کہ، چاہتے ہیں کہ اپنے جھگڑے قضیئے غیر خدائی قوتوں کے سامنے لیجائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں، (اور صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کی پیروی کریں)، اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے انھیں اس طرح گمراہ کر دے کہ راہ راست سے بہت دور جا پڑیں۔

خدا پر ایمان کا مفہوم

خدا کو محض ایک پرستش (پوجا پاٹ) کی شے مان لینا اس کے نزدیک ایمان نہیں۔ اس طرح تو بجز چند دہریوں کے، ساری دنیا خدا کو مانتی ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں سے پوچھو کہ خالق ارض و سموات کون ہے؟ تو یہ بلا تامل کہدینگے کہ خدا ہے لیکن اطاعت غیروں کی کرینگے۔ اس لئے خدا کی ہستی پر اس قسم کا ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ خدا پر ایمان لانے سے خدا کا کچھ سنوارنا مقصود نہیں۔ مقصود تو شرف انسانیت کی بالیدگی ہے اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان خدا کے سوا کسی کے حکم کے سامنے سر نہ جھکائے۔ سورۂ مومنون کی ان آیات پر غور کیجئے۔ خدا کے اس قسم کے ایمان کو کس طرح واضح طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ٥ (۲۳/۸۴-۸۵)

(اے پیغمبر اسلام!) ان منکروں سے کہدے " اچھا اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ زمین اور وہ تمام مخلوقات جو اس میں ہے کس کے لئے ہیں؟ وہ فوراً کہیں گے " اللہ کے لئے " تو کہہ " پھر کیا ہے کہ تم غور نہیں کرتے؟"

پھر کہا:-

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (۲۳ / ۸۶-۸۷)

(اے پیغمبر اسلام!) تو اُن سے پوچھ "وہ کون ہے جو ساتوں آسمانوں کا پروردگار ہے۔ اور (جہانداری کے) عرش عظیم کا مالک ہے"؟ وہ فوراً کہیں گے "یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے" تو کہہ "پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ (شرک اور انکار کے نتیجہ سے) ڈرتے نہیں ہو"

بار دیگر پوچھا:-

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ○ (۲۳ / ۸۸-۸۹)

(اے پیغمبر اسلام!) تو ان سے پوچھ "اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ، وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کی بادشاہی ہے؟ اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے، اور کوئی نہیں جو اس سے اوپر پناہ دینے والا ہو؟"

وہ فوراً کہیں گے "یہ صفتیں تو اللہ ہی کے لئے ہیں"

تو کہہ "پھر یہ کیا ہے کہ تمہاری عقل ماری گئی ؟"

اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو یہ سب کچھ مان لینے کے باوجود یہ جھوٹے کے جھوٹے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی حیثیت حاکمیہ سے عملاً انکار کرتے ہیں۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (۲۳ / ۹۰)

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے سچائی انھیں جتلا دی، اور یہ اپنے (انکار وادعا میں) قطعاً جھوٹے ہیں۔

سورۂ الزخرف میں دیکھیے۔ نویں سے چودھویں آیت تک اس اقرار کا بیان ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ○ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ۚ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ○ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ○ۙ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ

مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝ (۴۳/۹-۱۴)

اور اگر تو ان سے پوچھے "وہ کون ہے جس نے زمین و آسمان پیدا کیا ہے"؟ تو وہ فوراً کہہ اٹھیں گے کہ ان کو زبردست جاننے والے (خدا ہی) نے پیدا کیا ہے۔"

جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش (کی طرح) بنا دیا اور اس میں تمہارے راستے بنائے تاکہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو۔

اور جس نے آسمان سے پانی کو خاص انداز سے برسایا پھر ہم نے اس (پانی) سے خشک زمین کو زندہ کیا۔ جس طرح (قیامت کے دن) تم (اپنی قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔

اور جس نے تمام اقسام کے جوڑے بنائے اور تمہارے واسطے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو، تاکہ تم اُن کی پشت پر جم کر بیٹھو، پھر جب بیٹھ چکو، تو، اپنے رب کی (اس) نعمت کو دل سے یاد کرو، اور (زبان سے) یوں کہو، پاک ہے اس کی ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے حق میں مسخر کر دیا، ہم تو استے طاقتور نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے۔ اور ہم کو (بلاشبہ) اپنے رب کی طرف لوٹ جانا ہے۔

لیکن اس کے بعد فرمایا کہ بایں ہمہ اقرار و اعتراف ان کی حالت یہ ہے کہ انسانوں کو اس کا جزو بنا رہے ہیں۔ یعنی جو حق صرف خدا کو حاصل ہے اس میں انسانوں کو بھی شریک کر رہے ہیں۔ اور یہ کھلی ہوئی ناسپاس گزاری ہے

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۴۳/۱۵)

اور ان لوگوں نے خدا کے بندوں میں سے (خدا کا) جز ٹھہرا لیا۔ (یعنی انسان کو خدا کی اطاعت و محکومیت میں خدا کا شریک بنا لیا) واقعی انسان صریح ناشکر گزار ہے۔

قوانین خداوندی

آپ آگے بڑھئے۔ یہ ظاہر ہے کہ حکومت احکام کے ذریعہ قائم ہوتی ہے حاکم کے احکام کی اطاعت کا نام محکومیت ہے۔ جب ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ حکومت کا حق خدا کو حاصل ہے، اور اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں، تو یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا کہ خدا کے وہ احکام کہاں سے ملیں گے جن کی اطاعت کا نام اس کی محکومیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا ہر انسان سے باتیں نہیں کرتا۔ اس لئے اس کے احکام ہر انسان کو فرداً فرداً نہیں ملتے۔ یہ احکامات بذریعہ وحی انسانوں تک پہنچائے جاتے ہیں، پہنچانے والے کو رسول کہتے ہیں، اور ان احکام کے مجموعہ کا نام کتاب اللہ رکھا جاتا ہے۔

(کتاب کے معنی ہی قانون ہیں)، یہ قوانین اب اپنی اصلی شکل میں قرآن کریم[1] کے اندر ہیں۔ لہٰذا یہ کتاب اب حکومت خداوندی کا ضابطہ ہے۔ قوانین خداوندی بھیجے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ وہ انسانوں کے اختلافی امور میں قول فیصل ہوں۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۖ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوع انسانی کے لئے مطابق فطرت یہی زندگی تھی کہ وہ ایک جماعت بن کر رہیں، اس لئے اللہ نے نبیوں کو مبعوث کیا۔ وہ (ایمان وعمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے، اور (انکار وبدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے، نیز ان کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے، ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو۔ (اور تمام لوگوں کو راہ حق پر متحد کر دے) اور یہ جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لئے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ نہیں، وحی الٰہی کے واضح احکام اُن کے سامنے تھے، (اور اُن میں تفرقہ و اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی) مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے (اور دین کی ایک راہ پر مجتمع رہنے کی جگہ الگ الگ گروہ بندیوں میں بٹ جاتے تھے) بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے (اور ایک دوسرے کو جھٹلا رہے تھے) اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے!

نزول قرآن کی یہی غرض تھی اسی غرض کے لئے قرآن نازل ہوا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرٰىكَ اللّٰهُ ۚ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝ (۴/۱۰۵)

(اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تم پر الکتاب سچائی کے ساتھ نازل کر دی ہے تاکہ جیسا کچھ خدا نے بتلا دیا ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، اور خیانت کرنے والوں کی طرفداری میں نہ جھگڑو۔

[1] ظہر الفساد کے عنوان میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ دنیا کی کوئی اور آسمانی کتاب اپنی اصل شکل میں کہیں موجود نہیں۔

دوسری جگہ ہے

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ (۴۲)

(اور اے پیغمبر اسلام! تم مشرکین سے کہدو!) کہ تم جن باتوں میں (اہل حق سے) اختلاف کرتے ہو اس کا صحیح فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے، یہ اللہ ہی میرا رب ہے، میں اُسی پر بھروسہ رکھتا ہوں، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

یہ ضابطۂ قوانین (یعنی قرآن) عدل و صداقت کا مکمل مجموعہ ہے، اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور نہ تحریف۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۶/۱۱۵)

اور (یاد رکھو)، تمہارے پروردگار کا مقام سچائی اور انصاف کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اس کے پیغام کا (یعنی اس کے قوانین کا) کوئی بدلنے والا نہیں، وہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے!

رسول کا فریضہ

رسول کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف اس پر وحی کیا جائے اُسے لوگوں تک پہنچائے۔ یعنی وحی خداوندی صرف رسول کی اپنی ذات کے لئے ہی وجہ ہدایت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعہ انسانوں تک پہنچائی جاتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (۵/۶۷)

(اے پیغمبر اسلام!) تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اُسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو، (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرو)، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فرض رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا وہ اس گروہ پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر (انکار) کی راہ اختیار کی ہے!

رسالت

یہ رسول کی پہلی حیثیت ہے یعنی ابلاغ رسالت، وحی خداوندی کا دوسروں تک پہنچانا۔ اس میں اس کو تصرف یا تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ

إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۱۰/۱۵)

اور (اے پیغمبر اسلام!) جب تم ہماری واضح آیتیں انہیں پڑھ کر سناتے ہو، تو، جو لوگ (مرنے کے بعد) ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے (یعنی حیات اُخروی کے قائل نہیں ہیں) وہ کہتے ہیں "اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن لاکر سناؤ، یا اسی (کے مطالب) میں ردوبدل کردو" تم (صاف) کہدو کہ "میرا یہ مقدور نہیں کہ اپنے جی سے اس میں (کسی قسم کا) ردوبدل کردوں میں تو بس اسی حکم کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے میں ڈرتا ہوں، کہ اگر اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کروں تو عذاب کا ایک بہت بڑا دن آنے والا ہے!"

نہ اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرسکتا ہے۔

وَلَئِن شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ۝ (۱۷/۸۶)

(اور اے پیغمبر اسلام!) جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کی ہے، اگر ہم چاہیں، تو اُسے بھی سلب کرلیں، پھر تجھے کوئی نہ ملے جو اس کے لئے ہم پر اپنی وکالت چلائے۔

اس لئے کہ اس میں اس کے اختیار وارادہ اور خواہش وآرزو کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (۵۳/۳-۴)

اور رسول (قرآن میں) اپنی خواہش اور ارادے سے کچھ نہیں کہتے (بلکہ) وہ تو نری وحی ہے جو اُن پر (خدا کی طرف سے) اُتاری جاتی ہے۔

اگر وہ ایسا کرے تو فوراً خدا کی گرفت میں آجائے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ (۶۹/۴۴-۴۵)

اور اگر (بالفرض محال یہ پیغمبر) ہماری طرف کچھ باتیں یوں ہی منسوب کردے تو یقیناً ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑتے، (یعنی اس کی گرفت کرتے)

رسول خدا اس پیغام پر ایمان لاتا ہے

چونکہ یہ احکامات انسانوں کی اطاعت کے لئے آتے ہیں، اور رسول خود بھی ایک انسان ہوتا ہے، اس لئے سب سے پہلے یہ رسول خود ان کی صداقت پر ایمان لاتا ہے، اور خدا کی حکومیت تسلیم کرتا ہے اسی کو علم کہتے ہیں۔

قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ ۝ (۳۹/۱۱-۱۴)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو "کہ مجھکو حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی عبادت (اطاعت و محکومیت اختیار) کروں اور عبادت (محکومیت و اطاعت) کو اسی کے لئے خاص رکھوں۔

اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ (اس اُمت کے لوگوں میں) سب سے پہلا نظام اطاعت خداوندی کو ماننے والا میں ہوں"۔

تم (یہ بھی) کہدو، کہ اگر (بفرض محال) میں اپنے رب کا کہنا نہ مانوں، تو ایک بڑے دن کے عذاب (کے اندیشہ) سے ڈرتا ہوں" تم کہدو، کہ "میں تو اللہ کی عبادت (اطاعت) اس طرح کرتا ہوں کہ اپنی عبادت (اطاعت) کو اُسی کے لئے خاص رکھتا ہوں"۔

وہ خود قرآن کی اطاعت کرتا ہے۔

قُلْ لَّآ أَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ أَقُوْلُ لَكُمْ إِنِّيْ مَلَكٌ ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوْحٰٓى إِلَيَّ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۚ أَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۶/۵۰)

(اے پیغمبر اسلام!) تم ان سے کہدو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا جاننے والا ہوں۔

نہ میرا یہ کہنا ہے کہ میں (انسانیت سے ماورار) فرشتہ ہوں۔ میری حیثیت تو فقط یہ ہے کہ اُسی بات کی اطاعت کرتا ہوں جو خدا نے مجھ پر وحی کر دی ہے۔

اور اسی کی طرف تم کو بھی بلاتا ہوں" پھر، ان سے پوچھو "کیا وہ، جو اندھا ہے (اور حقیقت کا کوئی علم و یقین نہیں رکھتا) اور وہ، جو بینا ہے (اور حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے)، دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟"

کہ اسی کا اس کو حکم ہوتا ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۶/۱۰۶) نیز (۱/۱۹) [1]

---

[1] اس باب میں ان آیات کو بھی سامنے لے آیئے،

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

(اے پیغمبر اسلام!) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے، تم اُسی کی پیروی کرو، کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اسی کی ذات، اور مشرکوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دو۔

وہ اس اطاعت و تسلیم میں ایک چٹان کی طرح ثابت قدم رہتا ہے اور مخالفتوں کا بڑے سے بڑا ہجوم بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر بفرض محال وہ بھی وحی کے مقابلہ میں کسی انسان کی بات مان لے تو خدا کی عقوبت اس کی بھی کچھ رعایت نہ کرے، کہ کارگہہ فطرت میں رعایت و

(گذشتہ سے پیوستہ) يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ (۶/۱۱۴)

(اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے پوچھو) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ) میں خدا کے سوا کوئی دوسرا حکم تلاش کروں؟ حالانکہ وہی ہے جس نے تم پر الکتاب نازل کر دی، جو تفصیل کے ساتھ (سب کچھ) بیان کرنے والی ہے، اور (دیکھو) جن لوگوں کو (تم سے پہلے) ہم نے کتاب دی ہے (یعنی یہود و نصاریٰ) وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ پس اُن لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ، جو (فیصلۂ الٰہی کے بارے میں) شک کرنے والے ہیں۔

وَّاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ (۳۳/۲)

اور (اے پیغمبر اسلام!) جو تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر وحی کی جائے اس کی پیروی کر بلا شبہ اللہ سب لوگوں کے اعمال و افعال کی پوری خبرداری رکھتا ہے۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (۴۳/۴۳)

(اے پیغمبر اسلام!) تم پر جو (احکام) وحی کئے جائیں اُن پر (مضبوطی سے) جمے رہیے - آپ بے شک سیدھے راستے پر ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۴۵/۱۸)

(اے پیغمبر اسلام!) پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر چلا دیا تو آپ اسی طریقے پر چلتے رہیے، اور ناسمجھ لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ (۴۶/۹)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں اور میں (خود) نہیں جانتا کہ کیا میرے ساتھ ہوگا اور کیا تمہارے ساتھ ہوگا؟ میں تو صرف اُن (احکام) کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کئے جاتے ہیں اور میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں (اور بس)

تسامح ایسے فساد کا موجب بن سکتے ہیں جن سے تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی لئے فرمایا۔

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ۝ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝ (۱۷/۷۳-۷۵)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ان لوگوں نے تو اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تجھے فریب دے کر اُس کلام (کی تبلیغ) سے باز رکھیں جو ہم نے بذریعہ وحی نازل کیا ہے۔ اور مقصود ان کا یہ تھا کہ اس کلام کی جگہ دوسری باتیں کہہ کر تو ہم پر افترا پردازی کرے، اور پھر اس سے خوش ہو کر یہ تجھے اپنا دوست بنالیں۔ اور اگر (راہ حق میں) ہم نے تجھے جما نہ دیا ہوتا تو، تو ضرور اُن کی طرف کچھ نہ کچھ میلان کر ہی بیٹھتا، اور اس صورت میں ضرور ایسا ہوتا کہ ہم تجھے زندگی کا بھی دوہرا عذاب چکھاتے، اور موت کا بھی، اور پھر تجھے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ ملتا۔

رسول کی دوسری حیثیت

یہاں تک رسول کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، حکومت کسی نہ کسی نظام کے ماتحت قائم ہوتی ہے جس کے پیچھے قوت نافذہ موجود ہو۔ وہ فیصلے جن پر عمل درآمد کرانے کے لئے قوت موجود نہ ہو، محض فتاویٰ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ رسول کے ذمے دوسرا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا نظام قائم کرے جس میں خدا کے احکام زندہ فیصلوں کی حیثیت اختیار کر سکیں، اور دنیا انسانوں کی غلامی سے نجات پا کر صرف ایک خدا کی محکوم رہ جائے۔ اس نظام کا نام ہے دین۔ اس نظام میں وضع قوانین کا حق کسی کو حاصل نہیں ہو گا۔ اس کا منصب، قوانین خداوندی کا نفاذ ہو گا اس لئے اس نظام میں قدم قدم پر اس کی تاکید ہو گی کہ اطاعت صرف قرآن کی ہو گی اور کسی کی نہیں۔ رسول بھی اسی کی اطاعت کرے گا اور اس کے ساتھ باقی تمام وہ جماعت بھی جو اس نظام کے تابع ہو گی۔ قرآن میں بار بار یہ تاکید آپ کو نظر آئے گی کہ

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ۝ (۷/۳)

(اے افراد نسل انسانی!) جو تمہارے پروردگار کی جانب سے، تم پر نازل ہوا ہے، اس کی پیروی کرو، اور خدا کو چھوڑ کر (اپنے ٹھہرائے ہوئے) اکابر (اولیاء) کے پیچھے نہ چلو (افسوس تم میں) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پذیر ہو!

منصبِ امارت

لیکن جب یہ اطاعت ایک حکومت کی شکل اختیار کرے گی تو ظاہر ہے کہ اُس کا کوئی نہ کوئی مرکز بھی ہوگا جہاں سے یہ احکام نافذ ہوں گے، اور جس کے ذمے یہ فریضہ ہوگا کہ وہ اس کی نگرانی کرے کہ ان احکام پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس مرکزیت Central Authority کا نام منصبِ امارت یا امامت ہے۔ یہ امیر یا امام وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کا پابند ہوگا۔ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ) اور یہ ظاہر ہے کہ رسول کی موجودگی میں اس سے بڑھ کر قوانین خداوندی کا فرماں بردار اور کون ہوگا؟ اس لئے اس نظام کا اوّلین امیر اور امام خود رسول ہوگا۔ یہ رسول کی دوسری حیثیت ہے یعنی مرکزِ نظامِ حکومت الٰہیہ۔ امیر المومنین۔ امام المسلمین۔ اس امیر کی حیثیت محض احکام خداوندی کو نافذ کرنے والی کی ہوگی۔ یہ اپنی حکومت انسانوں پر نہیں چلائیگا۔ اس لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتلا دیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسانوں کی ہدایت کے لئے) کتاب۔ حکومت، اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے "خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ" (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیے کہ "ربّانی انسان (یعنی اللہ کے احکام کی اطاعت کرنے والے) بنو، اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو، اور اس لئے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو!

وہ یہی کہے گا کہ اللہ میرا اور تمہارا آقا ہے آؤ، مل جل کر اس کی محکومیت اختیار کریں، کہ یہی شرفِ انسانیت کو اس کے منتہیٰ تک لے جانے والی سیدھی راہ ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (۱۹/۳۶)

اور بلاشبہ اللہ ہی میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے پس اُسی کی عبدیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو، یہی بچائی کا سیدھا راستہ ہے۔

اس امیر کا سب سے بڑا شرف، جس کی وجہ سے وہ امیر بنا ہے یہی ہے کہ وہ خدا کی عبدیت میں سب سے سبقت لے گیا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں حضور کو بار بار اسی خطاب (عبدہٗ) سے مخاطب کیا گیا ہے۔ مثلاً

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ (۵۳/۱۰)

پس اللہ کو اپنے بندے (محمد ؐ) پر جو کچھ وحی نازل کرنی تھی، کی۔

اور اس اصل اعظم کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرانے کے لئے کہ اس نظام میں امیر کی حیثیت کیا ہے ہر اس شخص سے جو اس نظام میں داخل ہونا چاہے، سب سے پہلے دو باتوں کا اقرار لینا ضروری سمجھا گیا۔ ایک تو یہ کہ (۱) اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے، اور دوسرے یہ کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ محمدؐ جو اس نظام میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں بیش ازیں نیست کہ وہ اللہ کے عبد (محکوم۔ غلام) اور اس کے رسول ہیں۔ خود رسول سے بار بار اس کا اعلان کرادیا گیا کہ میں خود وحی کی اتباع کرتا ہوں۔ اور اس وحی کے ذریعے تمہیں غیر فطری روش زندگی کے انجام و عواقب سے متنبہ کرتا ہوں۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مُنْذِرٌ ۖۗ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۚ (۳۸/۶۵)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو کہ میں صرف تم کو (غیر فطری زندگی کے انجام و عواقب سے) ڈرانے والا ہوں۔ اور بجز اللہ واحد و غالب کے کوئی لائق عبادت (اطاعت) نہیں ہے!

اس سے ذرا آگے ہے۔

اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۳۸/۷۰)

میرے پاس وحی صرف اس لئے آتی ہے کہ میں (منجانب اللہ) صاف صاف ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

دوسری جگہ ہے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۴۶/۹)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو "کہ میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں، (بلکہ) اور (لو' اور) مجھ کو تو اس بات کا بھی علم نہیں کہ خود میرے اور تمہارے ساتھ کیا (سلوک) کیا جائے گا۔ میں تو اسی بات کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ تک وحی کے ذریعے آتی ہے، اور میں تو بیش ازبیش (خدا کے عذاب و عتاب سے) کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں، (اور بس)

اور اسی لئے بتکرار اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ رسول کو صرف قرآن کے احکام نافذ کرنے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ

وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ط وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَّفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ ط فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُّصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ط وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُونَ ۝

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ط وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوقِنُونَ ۝ (۵ : ۴۸ - ۵۰)

اور (اے پیغمبر اسلام! اسی طرح) ہم نے تمہاری طرف، سچائی کے ساتھ کتاب بھیجی، ان کتابوں کی تصدیق کرنے والی جو پہلے سے موجود ہیں، اور اُن پر نگہبان - سو چاہئے کہ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، اور جو سچائی تمہارے پاس آچکی ہے اُسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کی پیروی نہ کرو - تم میں سے ہر ایک گروہ کے لئے ہم نے ایک "شرع" اور "منہاج" ٹھیرا دی ہے - (یعنی انسانی زندگی کا دستور العمل اور طور طریقہ ٹھیرا دیا) اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا (یعنی اختیار و ارادہ سلب کرکے پتھروں اور حیوانوں کی طرح ایک ہی روش پر چلنے پر مجبور کر دیتا) لیکن (تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا، اور اسی لئے نہیں کیا) تاکہ جو کچھ (احکامات) تمہیں دیئے گئے ہیں اُن میں تمہیں آزمائے، (اور تمہارے لئے ترقی کی راہیں پیدا ہوں) پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ نکلنے کی کوشش کرو، (کہ اس آزمائش کا اصل مقصود یہی ہے) بالآخر تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے - پھر وہ تمہیں بتلائے گا کہ جن باتوں میں باہم اختلاف کرتے تھے ان کی حقیقت کیا ہے -

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تمہیں حکم دیا کہ جو کچھ خدا نے تم پر نازل کیا ہے، اُسی کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، اور اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، نیز اُن کی طرف سے ہوشیار رہو - کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اس کے کسی حکم (کی تعمیل و نفاذ) میں تمہیں ڈگمگا دیں، (یعنی ایسی صورت حال پیدا کر دیں کہ کسی حکم کا نفاذ عمل میں نہ آسکے) پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں، (اور حکم الٰہی نہ مانیں) تو جان لو، خدا کو یہی منظور ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے اُن پر مصیبت ڈالے - اور حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں سے بہت سے انسان (احکام حق سے) نافرمان ہیں!

پھر (جو لوگ احکام الٰہی کا فیصلہ پسند نہیں کرتے، تو وہ کیا چاہتے ہیں؟) کیا جاہلیت کے عہد کا سا حکم چاہتے ہیں (جب علم و بصیرت سے لوگ محروم تھے، اور اوہام و خرافات پر عمل کرتے تھے؟) اور اُن لوگوں کے لئے جو یقین رکھنے والے ہیں اللہ سے بہتر حکم دینے والا کون ہو سکتا ہے۔

اس سے لوگوں کو ان کی فطرت کا فراموش کردہ پیغام یاد دلانا ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ (۵۰/۴۵)

(اے پیغمبر اسلام!) یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں ہم اس (کی حقیقت) سے خوب واقف ہیں۔ اور آپ ان پر جبر و تشدد کرنے والے (بنا کر) نہیں (بھیجے گئے) ہیں۔ آپ تو قرآن سے ایسے لوگوں کو نصیحت (و تبلیغ) کرتے رہئے جو میری وعید سے ڈرتا ہو۔

اس سے انھیں خدا کے راستہ پر لانا ہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ (۱۴/۱)

الف۔ لام۔ را

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اُتاری ہے، تاکہ لوگوں کو اُن کے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں، تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے کہ غالب اور ستودہ خدا کی راہ ہے۔

اور اُن کی راہ نمائی کرنا ہے۔

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ (۲۷/۹۲)

(اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ من جانب اللہ مجکو حکم ہوا ہے کہ) میں قرآن پڑھ پڑھ کر سناؤں۔ سو، جو کوئی (میری تبلیغ سے) راہ ہدایت پر آجائے گا تو وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے ہدایت پائیگا! اور جو شخص گمراہ ہوگا، تو میرا کچھ نقصان نہیں) میں تو محض ڈرانے والے پیغمبروں میں سے ہوں۔
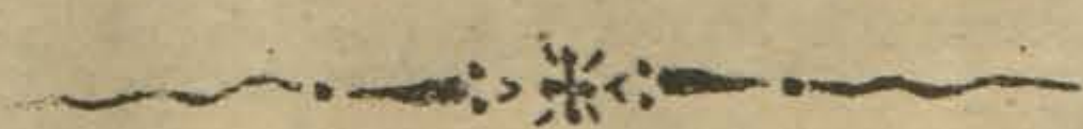
اللہ اور رسول کی اطاعت

لیکن چونکہ نظام دین میں اللہ کے احکام مرکز سے نافذ ہوتے تھے، اور یہ مرکزی قوت نافذہ رسول کی محسوس شخصیت میں تھی، اس لئے ان مرکزی احکام کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت قرار دیا گیا۔ ہمارے دینی نظام میں یہ ایک بڑا

اہم نکتہ ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت سے دو الگ، الگ، مطاعوں کی اطاعت مقصود نہیں۔ اس لئے کہ، جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، یہ تصور قرآن کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے حتیٰ کہ خود رسول کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتلا دیا گیا کہ اُسے بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ لہذا اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکز نظامِ دین (Central Authority) ہے جہاں سے قرآنی احکام نافذ ہوں۔ یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مرکز ملت مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بغور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ جنگ اُحد میں جب مسلمانوں کی فوج میں خلفشار پیدا ہو گیا اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو آپ نے اِن بکھرے ہوئے پروانوں کو آواز دی۔ اس آواز پر وہ سب پھر اس شمع کے گرد جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ آواز نبی اکرمؐ نے دی تھی، لیکن چونکہ یہ بلاوا حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہ تھا، بلکہ آپ نے بہ حیثیت مرکز ملت یہ آواز دی تھی، اس لئے اس آواز کو خدا اور رسول کی آواز قرار دیا گیا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ (۳/۱۷۲)

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے، باوجودیکہ (اس سے ذرا ہی پہلے وہ) زخم کھا چکے تھے، سو یاد رکھو، ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً اُن کے لئے (اللہ کے حضور) بہت بڑا اجر ہے!

اسی لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ رسول کے بُلاوے کو عام بلاوا تصور نہ کیا کرو۔ اس کی دعوت حکومت کے مرکز کی آواز ہوتی ہے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ (۲۴/۶۳)

(اے پیروان دعوت ایمانی!) تم لوگ رسول کے بلاوے کو (عام بلاوا) تصور نہ کرو، جس طرح تم ایک دوسرے کو آپس میں بلا لیا کرتے ہو۔ (یاد رکھو) اللہ اُن لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے جو (دوسروں کی) آڑ لے کر (مسجد نبوی سے) کھسک جاتے ہیں۔ لہذا جو لوگ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں

ان کو ڈرنا چاہئے کہ ان پر دنیا ہی میں) کوئی فتنہ نہ آن پڑے یا (آخرت میں) کوئی دردناک عذاب مسلّط نہ ہو جائے۔

یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے نبی اکرمؐ سے استوار کیا تھا، اس عہد شکنی کو خدا اور رسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے، اس لئے کہ یہ مخالفت نظام اسلامی کی مخالفت تھی۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○
هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ○
وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ○
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (۵۹/۱-۴)

(اے افراد نسل انسانی!) آسمان و زمین کی تمام مخلوقات خدا کی پاکیزگی بیان کرنے میں رطب اللسان ہے اور وہ زبردست حکمت (ودانش) والا ہے۔

وہی ہے جس نے ان اہل کتاب (یہودیوں) کو ان کے گھروں سے پہلی ہی بار اکٹھا کر کے نکال کھڑا کیا، جنہوں نے کفر (انکار) کی راہ اختیار کی (ان کی ظاہری شان و شوکت دیکھ کر) تمہارا یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ (اس طرح اپنے گھروں سے) نکل کھڑے ہوں گے اور وہ خود یہ گمان کئے ہوئے تھے کہ ان کے (مضبوط) قلعے انھیں اللہ (کے انتقام) سے بچائے رکھیں گے۔ چنانچہ ان پر (غضب الٰہی) ایسی جگہ سے پہنچا کہ جس کا ان کو خیال تک نہ تھا اور (اللہ نے) ان کے دلوں (کی گہرائیوں) میں (مسلمانوں کا) رعب و دبدبہ بٹھا دیا (ان کی یہ حالت ہوگئی کہ) خود اپنے ہی گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اور (کچھ کو) مسلمانوں کے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے، سو اے ارباب فکر و دانش! (اس حالت کو دیکھ کر) عبرت حاصل کرو!

اور اگر اللہ ان کی قسمت میں جلاوطنی نہ لکھ چکا ہوتا تو (یقیناً) انھیں دنیا ہی میں (قتل کی) سزا دیتا اور ان کے لئے آخرت میں (بھی) دوزخ کا عذاب (تیار) ہے!

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول (کے احکام و فرامین) کی مخالفت کی ہے اور جو کوئی اللہ (کے حکم) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو) اللہ (پاداش عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے۔

میدان جنگ میں مجاہدین کی تمام نقل و حرکت حضورؐ کی ہدایات کے مطابق ہوتی تھی اس لئے کہ حضورؐ ہی مرکز ملت اور سپہ سالار جیوش اسلامیہ ہوتے تھے، اس اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت کہا گیا۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ع (۸/۴۶)

(اور اے پیروان دعوت ایمانی!) اللہ اور اس کے رسول (کے احکام) کی اطاعت کرو، اور (باہدگر) نہ جھگڑو، (کہ اس سے) تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور (مصائب و آلام پر) صبر اختیار کرو۔ بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرکے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ o (۵/۳۳)

بلاشبہ ان لوگوں کی جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں، (یعنی رہزن اور ڈاکو ہیں) یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں، یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں، یا اُن کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا اُنھیں جلاوطن کر دیا جائے (یعنی جیسی کچھ سزا ان کے لئے ضروری ہو، انھیں دی جائے) یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب عظیم ہے!

منافقین اس نظام کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔ اسے بھی خدا اور رسول کے خلاف حرب و ضرب قرار دیا گیا۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ ط وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا

الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (۹/۱۰۷)

اور (منافقوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں) جنہوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں، کفر (انکار) کریں، مومنوں میں تفرقہ ڈالیں، اور اُن لوگوں کے لئے ایک کمیٹی گاہ پیدا کردیں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو، لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں!

قریش عرب نے نبی اکرمؐ کو مکہ سے نکالا، مسلمانوں کو ہر طرح کی اذیتیں دیں۔ نظام اسلامی کی بیخ کنی میں دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اور پھر بدر کے میدان میں پہنچ کر ان کے خلاف صف آرا ہوگئے، ان کی اس محاربت و مخاصمت کو بھی اللہ اور رسولؐ کے خلاف سرکشی قرار دیا گیا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (۸/۱۳)

یہ سب کچھ (سزا و عتاب) اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول (کے احکام) کی مخالفت کرتا ہے تو (یاد رکھو) بلاشبہ اللہ (پاداش عمل میں) سخت سزا دینے والا ہے!

دوسری جگہ انہی مخالفین کے متعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ (۵۸/۵)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ (دنیا میں بھی) ایسے ذلیل و خوار ہوں گے جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے۔ (کیونکہ) ہم نے کھلے کھلے احکام و دلائل نازل کردیئے ہیں۔ اور منکرین (حق) کو (آخرت میں بھی) ذلت آمیز عذاب (کا برتاؤ) ہوگا!

دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ ○ (۵۸/۲۰)

(اور) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ لوگ ذلیل و خوار لوگوں میں سے ہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، کفار اور منافقین کی عہد شکنی کو خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ کہا گیا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (9/1)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا) معاہدہ کیا تھا، اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا ان کے لئے اعلان ہے!

پھر تیسری آیت میں ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (9/3)

اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج کے بڑے دن عام منادی کی جاتی ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی (یعنی ان میں اور نظامِ حکومتِ خداوندی میں اب کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا) پس اگر تم (اب بھی ظلم و شرارت سے) توبہ کرلو، تو تمہارے لئے اس میں بہتری ہے۔ اور اگر نہ مانو گے تو جان رکھو، تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے، اور (اے پیغمبرِ اسلام!) جو لوگ کفر کی راہ چل رہے ہیں انہیں عذابِ دردناک کی خوشخبری سنادو!

پھر ساتویں آیت میں ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (9/7)

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجدِ حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا) تو ان کا عہد ضرور عہد ہے، اور) جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں

"اللہ اور رسول" سے مراد مرکزِ نظامِ اسلامی ہے

غور کیجئے۔ یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے، اور اسی حکومت کے نمائندہ (حضرت علیؓ) کی وساطت سے یہ اعلانات ہو رہے تھے، لیکن انہیں اللہ اور رسول کے منشورات کہا گیا ہے۔ اس تبیانِ حقیقت سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی توجہات کو اس نقطۂ ماسکہ کی طرف مرکوز کیا جائے کہ اگرچہ یہ تمام احکام رسول کی طرف سے صادر ہو رہے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں، اس لئے

کہ یہ نظامِ حکومتِ خداوندی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے ہیں۔ جنگ احزاب میں جب مخالفین کے جیوش و عساکر سامنے آئے تو ان کے متعلق مجاہدین نے کہا کہ یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کے متعلق حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن اس کو بھی اللہ اور رسول کی طرف منسوب کیا گیا۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۲۲)

اور جس وقت مومنوں کی جماعت نے احزاب (کے جیوش و عساکر) کو دیکھا تو کہنے لگے کہ (ہاں)، یہ تو (بالکل) وہی ہے جس کا اللہ اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور (بلاشبہ) اللہ اور اس کے رسول نے (بالکل) سچ کہا تھا۔ اور (ان کے اس کہنے سے) ان کے ایمان و اطاعت میں (کچھ نہ کچھ) ترقی ہی ہو گئی!

معارف القرآن جلد اوّل (عنوان نصرت) میں بتایا جا چکا ہے کہ اللہ کو مدد دینے سے مراد یہ ہے کہ اس کے دین کی تقویت کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ اس نصرت کو بھی اللہ اور رسول کی نصرت کہا گیا ہے۔ مالِ فے کی تقسیم کے ضمن میں فرمایا۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (۵۹/۸)

(مالِ فے) ان حاجتمند مہاجرین کا بالخصوص حصہ ہے جو اپنے گھروں اور مالوں سے (جبراً و ظلماً) جدا کر دیئے گئے ہیں (اور اپنی اس مظلومانہ روش پر صبر و شکر کی بدولت) اللہ کے فضل و رضامندی کے جویا ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی (قیامِ دین میں) مدد کرتے ہیں یہی لوگ (ایمان و اطاعت میں) سچے ہیں!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے دین کے غلبہ و اسلام کے تمکن، حزب اللہ کی کامیابی و ظفر مندی کے متعدد مقامات پر وعدے کئے ہیں، اس غلبہ اور کامیابی کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ اور رسول کی کامیابی ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۵۸/۲۱)

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرا رسول ہی غالب رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوت و غلبہ والا ہے!

ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اور تسلط اسلامی حکومت ہی کا تمکن و تسلط تھا، ورنہ اللہ تو ہر جگہ غالب ہے۔ لہٰذا اللہ اور رسول کے غلبہ سے مراد نظامِ اسلامی کے غلبہ و استیلا ہی سے ہے۔ منافقین کی یہ حالت تھی

کہ وہ عام مسلمانوں کو خوش رکھنے کی تدابیر سوچتے رہتے تھے، لیکن نظامِ اسلامی کے دل سے مخالف تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ یہ مسلمانوں کو تو راضی رکھنا چاہتے ہیں لیکن اللہ اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَنْ يُحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۚ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ۝ (۹/۶۲-۶۳)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) یہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کرلیں، حالانکہ اگر یہ واقعی مومن ہوتے، تو سمجھتے کہ اللہ اور اس کا رسول اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اسے (اپنے ایمان و عمل سے) راضی رکھیں۔ کیا (ابھی تک) انہوں نے یہ بات (بھی) نہ جانی کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے ہمیشہ اس میں جلے گا؟ اور یہ بہت ہی بڑی رسوائی ہے (جو کسی انسان کے حصہ میں آسکتی ہے)!

مرکزِ نظامِ اسلامی کے مخالفین سے تعلقات

ان آیات کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھئے اس لئے کہ یہ نظامِ اسلامی کے متعلق ایک بڑی اہم حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ اسلام کے پکّے دشمن، نظامِ دینی کے کھلے ہوئے مخالف، ہماری حیاتِ اجتماعیہ (جماعتی زندگی) کی تخریب کے سب سے بڑے حامی، اگر ہم سے انفرادی طور پر خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں تو ہم فوراً انہیں گلے سے لگا لیتے ہیں، اور ان سے قلبی تعلقات کا رشتہ استوار کرلیتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرما دیا ہے کہ جو تمہارے نظامِ ملّی کا مخالف ہو اس سے مودّت و محبت ایمان کے منافی ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولٰئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۵۸/۲۲)

(اے پیغمبرِ اسلام!) جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر (پورا پورا) یقین (ایمان) رکھتے ہیں آپ ان کو اللہ اور اس کے رسول کے مخالفوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ پائیں گے اگرچہ وہ لوگ ان کے

باپ، بیٹے، بھائی، یا قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان (مضبوطی کے ساتھ) ثبت کر دیا ہے، اور ان (کے دلوں) کو اپنے فیض سے قوت و طاقت عطا کر دی اور اللہ ان لوگوں کو نعیم ابدی کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا ان (کی نیک کرداری) سے راضی ہوگا، اور وہ خدا (کے الطاف و عنایات) سے راضی ہوں گے۔ (یاد رکھو) اللہ کا گروہ یہی لوگ ہیں (اور سمجھ رکھو، اللہ ہی کا گروہ فلاح یاب (گروہ) ہے!

ہم اوپر منافقین کا ذکر کر رہے تھے۔ مدینہ میں منافقین مسلمانوں کی کامیابیوں کی وجہ سے دولتمند ہو گئے اس کے متعلق فرمایا کہ یہ دولت انہیں اللہ اور رسول نے دی ہے۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا ط وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ج وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ ج وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ج وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۹/۷۴)

یہ (منافقین) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے ایسا نہیں کہا، اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ضرور کفر کی بات کہی، وہ اسلام قبول کر کے پھر کفر کی چال چلے، اور اس بات کا منصوبہ باندھا جو نہ پا سکے۔ انہوں نے انتقام نہیں لیا، مگر اس بات کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں اپنے فضل سے (مال غنیمت دے کر) تونگر کر دیا ہے۔ بہر حال اگر یہ لوگ اب بھی باز آ جائیں تو ان کے لئے بہتر ہے۔ اور اگر گردن موڑیں، تو پھر یاد رکھیں اللہ ضرور انہیں دنیا اور آخرت میں عذاب دردناک دیگا۔ اور روئے زمین پر ان کا نہ کوئی کارساز ہونے والا ہے، نہ مددگار!

اور آگے بڑھئے [تجدید حافظہ کے لئے ایک بار اس حقیقت کو پھر سامنے لے آیئے کہ بیان یہ ہو رہا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ و رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مرکز نظام حکومت ہے۔ اس باب میں بہت سے نظائر پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔ باقی آگے آتے ہیں]۔ مال غنیمت کے متعلق فرمایا کہ

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ ط قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ ج فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ص وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (۸/۱)

(اے پیغمبر اسلام!) لوگ تم سے پوچھتے ہیں "مال غنیمت کے بارے میں کیا ہونا چاہئے؟" کہہ دو مال غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسول کا ہے پس اگر تم مومن ہو، تو چاہئے کہ (اس کی وجہ سے

آپس میں جھگڑا نہ کرو) اللہ سے ڈرو، اپنا باہمی معاملہ درست رکھو، اور اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت میں سرگرم ہو جاؤ"۔

یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مرکز حکومت ہے۔ چنانچہ رسولؐ کے زمانہ میں جس قدر غزوات میں مال غنیمت ہاتھ آیا، وہ سب کا سب ایک جگہ جمع ہو جاتا تھا۔ اور پھر حضورؐ اس کی تقسیم فرماتے تھے۔ یعنی وہ مال افراد کی ملکیت نہیں تھا، بلکہ حکومت کی ملکیت تھا۔ البتہ اس کی تقسیم کے لئے خدائی اصول مقرر تھے، جن کا ذکر ذرا آگے چلکر ان الفاظ میں آتا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۸/۴۱)

اور جان رکھو، جو تمہیں مال غنیمت میں ملے، اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے، رسول کے لئے، (رسول کے) قرابت داروں کے لئے، یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے، اور مسافروں کے لئے نکالنا چاہیے۔ (اور بقیہ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیے جاسکتے ہیں) اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو، جو ہم نے فیصلہ کر دینے والے دن اپنے بندے پر نازل کی تھی، جب کہ دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے[1] تو چاہیے کہ اس تقسیم پر کاربند رہو۔ اور (یاد رکھو) اللہ کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں!

یہ خمس (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کے لئے تھا۔ اس خمس کی تفصیل مصارف سے ظاہر ہے کہ یہ حصہ بیت المال میں جائے گا۔ اور وہاں سے ان اجتماعی امور میں صرف ہوگا جن کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد مسلمانوں کا امام ہے۔ اسی طرح مالِ فئے[2] کے متعلق فرمایا۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ

---

[1] یعنی جنگ بدر کے دن۔

[2] غنیمت اور فئے دو اصطلاحات ہیں۔ مال غنیمت وہ جو مخالفین سے جنگ کے بعد حاصل ہو، اور مالِ فئے، جسے مخالفین جنگ کئے بغیر چھوڑ جائیں۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوگا اور باقی چار حصے سپاہیوں کو تقسیم ہوں گے۔ مال فئے پورے کا پورا بیت المال میں جمع ہوگا۔

مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹ : ۷)

(اور) جو کچھ اللہ اپنے رسول کو (اسی طرح) دوسری بستیوں سے دلوا دے، سو وہ (بھی) اللہ اور رسول کا حصہ ہے اور (رسول کے) قرابت داروں کا، یتیموں، مسکینوں، اور مسافروں کا (حق) ہے، (یہ اس لئے) تاکہ وہ مال (سفی) تمھارے تونگروں کے قبضہ میں نہ پہنچ جائے اور (اے مسلمانو!) تم کو جو کچھ رسول (اپنی خوشی سے) دے دیا کرے اس کو لے لیا کرو، اور جس (چیز کے لینے) سے منع کر دیا کرے اس سے رکے رہا کرو، اور (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ (پاداش عمل میں) سخت عقوبت دینے والا ہے۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

یہاں بھی اللہ اور رسول کا مطلب واضح ہے۔ اب سورۂ نساء کی اس آیت کی طرف آئیے جس میں یہ نظام وضاحت سے بیان ہوا ہے، (اور جس کے غلط مفہوم نے بدقسمتی سے ملت کو بہت سے مغالطوں میں الجھا رکھا ہے) ارشاد ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (۴ : ۵۹)

اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، اور ان لوگوں کی اطاعت کرو، جو تم میں صاحب حکم و اختیار ہوں، پھر اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو، (یعنی اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے) تو چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو، (اور جو کچھ وہاں سے فیصلہ ملے اسے تسلیم کر لو)، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان (یقین) رکھتے ہو (تو تمھارے لئے راہ عمل یہی ہے) اسی میں تمھارے لئے بہتری ہے، اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے (کیونکہ اختلاف اور نزاع کے ابھرنے کا موقع نہیں رہتا، اور فتنوں فسادوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے)

اس آیت مقدسہ میں عام طور پر اولو الامر سے مراد لئے جاتے ہیں ارباب حکومت (مرکزی اور ماتحت سب کے سب) اور اس کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ اگر قوم کو حکومت سے اختلاف ہو جائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن (اللہ) اور حدیث (رسول) کو سامنے رکھ کر مناظرہ کیا جائے اور جو ہار جائے

فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے۔ ذرا غور فرمائیے کہ دنیا میں کوئی نظامِ حکومت اس طرح سے قایم بھی رہ سکتا ہے کہ جس میں حالت یہ ہو کہ حکومت ایک قانون نافذ کرے اور جس کا جی چاہے اس کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے اور قرآن و احادیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج دیدے! اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اس میں اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکزِ ملت Central Authority ہے اور اولوالامر سے مفہوم افسران ماتحت۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو، امر متنازعہ فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دو، (اسے مرکزی حکومت کی طرف Refer کر دو) مرکز کا فیصلہ سب کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ یعنی اس نظام میں مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف عدالت عالیہ میں مدافعہ (اپیل) کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے۔ یہ کہ اولوالامر سے مراد مقامی حکام ہیں، اس سورۃ کی ایک دوسری آیت سے واضح ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۴/۸۳)

اور جب ان لوگوں کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے، تو یہ (فوراً) اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں اگر یہ اسے (لوگوں میں پھیلانے کی جگہ) اللہ کے رسول کے سامنے، اور ان لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحب حکم و اختیار ہیں پیش کرتے، تو جو بات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے (اور عوام میں تشویش نہ پھیلتی) اور (دیکھو) اگر اللہ کا تم پر فضل نہ ہوتا، اور اس کی رحمت نہ ہوتی، تو (تمہاری کمزوریوں کا یہ حال تھا کہ) معدودے چند آدمیوں کے سوا سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ لئے ہوتے!

یعنی اگر اس قسم کا واقعہ مدینہ میں ظہور پذیر ہو تو اس کی اطلاع رسول اللہ کو دی جائے، اور اگر کہیں باہر ہو تو مقامی حکام کو اس سے مطلع کیا جائے۔

"اللہ اور رسول" کے لئے واحد کا صیغہ

قرآن کریم میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن میں اللہ اور رسول کے الفاظ آئے ہیں، لیکن ان کے لئے صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے، حالانکہ عربی کے عام قاعدے کی رو سے دو (اللہ اور رسول) کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہیے۔ مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝ (۸/۲۰)

اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے روگردانی نہ کرو، اور تم (صدائے حق) سن رہے ہو!

دیکھئے اس میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے لیکن وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ میں (عنه) کی ضمیر واحد غائب کی ہے[۱] اس سے ذرا آگے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ (۸/۲۴)

اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو، جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کر دے اور جان لو کہ (بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ (اپنے ٹھہرائے ہوئے قانون و اسباب کے ذریعہ) انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، اور جان لو کہ (آخرکار) اسی کے حضور جمع کئے جاؤ گے!

اس میں بھی اللہ اور رسول کے الفاظ موجود ہیں لیکن اذ دعاکم میں صیغہ واحد غائب کا ہے۔ سورۂ نور میں ہے

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ۝ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ (۲۴/۴۸-۴۹)

اور جب یہ (منافقین) اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان (کے امر متنازعہ فیہ) کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کر لیتا ہے اور اگر ان کا کوئی حق (کسی پر) واجب ہو تو اس (مرکز ملت) کی طرف سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

دیکھئے اللہ اور رسول کے الفاظ موجود ہیں لیکن لیحکم میں صیغہ واحد کا ہے۔

اسی طرح یاتوا الیہ میں ضمیر واحد غائب کی ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ ۖ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (۲۴/۵۴)

---

[۱] اس آیت میں وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ (جبکہ تم سن رہے ہو) کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ عربی زبان میں اطاعت کے معنی ہی کسی زندہ کے احکام کی تابعداری ہے۔ اسلامی نظام میں اطاعت امام موجود کی ہوگی، جو قائم مقام ہوگا "خدا اور رسول" یعنی مرکز نظام حکومت اسلامی کا۔

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو کہ، (اے مسلمانو!) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم (اطاعت سے) روگردانی کرنے لگ جاؤ تو سمجھ رکھو کہ رسول کے ذمّہ وہ (تبلیغ وارشاد) ہے جس کا اس پر بار رکھا گیا ہے اور تمھارے ذمّہ وہ (اطاعت وانقیاد) ہے جس کا بوجھ تم پر عائد کیا گیا ہے۔ اور اگر تم نے اس کی اطاعت کرلی تو (صحیح) راہ پر لگ جاؤ گے۔ (بہرحال) رسول کے ذمّہ صرف احکام کو صاف صاف طرح پہنچا دینا ہے (اور بس)

مرکزِ نظامِ حکومت اس میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا مطالبہ ہے لیکن علیہ اور تطیعوہ میں ضمائر غائب کی ہیں۔ ان مثالوں سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد، دو الگ الگ، اطاعتیں نہیں ہیں بلکہ اللہ کی وہ اطاعت ہی جو مرکز نظامِ دین (حکومت خداوندی) کی وساطت سے ظہور میں آتی ہے۔ ان ضمائر میں واحد کے صیغے مرکز ملت کے لئے آئے ہیں، جو اس وقت رسول اللہ کی ذات گرامی تھی، یہی وہ اطاعت ہے جس کے متعلق فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ (۳۳/۳۶)

اور کسی مومن مرد و عورت کے لئے گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ صادر کر دے، تو ان (مومنوں) کو اس (فیصلہ کی تبدیلی) میں کوئی اختیار باقی رہے۔ اور جو کوئی (بایں ہمہ) اللہ اور اس کے رسول (کے احکام) کی نافرمانی کرے گا تو (جان لو کہ) وہ کھلی ہوئی گمراہی کی چال چل گیا۔

اگر یہ اطاعت نہیں تو ایمان کا زبانی دعویٰ کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۴/۴۷)

اور یہ (منافقین) لوگ (زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر یقین (ایمان) رکھتے ہیں اور ہم (دل سے) اطاعت کرتے ہیں پھر ایسا ہوتا ہے کہ ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد خدا اور رسول کے حکم سے سرتابی کر بیٹھتا ہے اور یہ لوگ سچ تو یہ ہے کہ ایمان ہی نہیں رکھتے۔

انہی قوانین کا نام حدود اللہ ہے جن کی اطاعت ضروری ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۴/۱۳)

(یاد رکھو) یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی) حد بندیاں ہیں، پس جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا، تو اللہ اسے (ابدی راحتوں کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی (اور اس لئے ان کی شادابی کبھی متغیر ہونے والی نہیں) وہ (سرور و راحت کی) اس حالت میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی ہی کامیابی ہے جو انہیں حاصل ہوگی!

اور جن کی معصیت سے جہنم لازمی ہے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (۴/۱۴ نیز ۷۲/۲۳)

لیکن جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں سے باہر نکل گیا، تو (یاد رہے) وہ (جنت کی ابدی راحتوں کی جگہ) آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا۔ اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہوگا؟

یہ اطاعت ایک امانت ہے، جس میں خیانت کبھی نہیں کی جا سکتی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۸/۲۷)

اے پیروان دعوت ایمانی! ایسا نہ کرو کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کرو، اور نہ یہ کہ آپس کی امانتوں میں خیانت کرو، اور تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ احکام نافذ ہونے کے بعد ان کی اطاعت کی جائے بلکہ یہ بھی کہ کسی معاملہ میں مرکز کے فیصلہ کے انتظار کئے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۴۹/۱)

اے پیروانِ دعوت ایمانی! اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) سے پہلے (کسی معاملہ میں) سبقت نہ کیا کرو، اور اللہ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے!

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ

بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ○ (٤٩/٢)

اے پیروان دعوت ایمانی! تم اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند مت کیا کرو، اور نہ اس سے اس طرح چلا چلا کر بولا کرو، جس طرح باہم دگر بولتے ہو۔ کبھی تمہاری لاعلمی میں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں۔

یہی مرکز ملت کا محافظ و نگراں ہے، اور اس کے تمام مفاد کا بہترین امین۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ○

وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ○

(٥/٥٥-٥٦)

(مسلمانو!) تمہارا رفیق و مددگار تو بس اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں۔ جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور (ہر حال میں) اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔

اور (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کو، اس کے رسول کو، اور ایمان والوں کو، اپنا رفیق و مددگار بنایا تو (وہ اللہ کے گروہ میں سے ہے، اور) بلاشبہ اللہ ہی کا گروہ غالب رہنے والا ہے!

رسول اور قرآن کی اطاعت

بعض مقامات پر اللہ اور رسول کے الفاظ کی بجائے قرآن اور رسول کے الفاظ بھی آئے ہیں، جن کا مفہوم بھی وہی ہے، یعنی مرکز ملت جو قرآنی احکام کو نافذ کرے۔ غور فرمائیے، پہلے یہ ارشاد ہے کہ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ○ (٤/٦٠)

(اے پیغمبر اسلام!) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی؟ (یعنی منافقوں کی حالت پر) ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے، اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر یقین (ایمان) رکھتے ہیں۔ لیکن (عمل کا حال یہ ہے کہ) چاہتے ہیں، اپنے جھگڑے قضیے غیر خدائی طاقتوں کے سامنے لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں،

(اور صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کی پیروی کریں) اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے انھیں اس طرح گمراہ کردے کہ راہ راست سے دور جا پڑیں!

اور اس کے بعد

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝ (۴/۶۱)

اور (اے پیغمبر اسلام!) جب ان لوگوں کو اللہ کے حکم کی طرف جو اس نے نازل کیا ہے، اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو، تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے روگردانی کرتے ہیں اور اُن کے قدم ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۵/۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (عقل و بصیرت کی) اس بات کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے، نیز اللہ کے رسول کی طرف رجوع کرو تو کہتے ہیں "ہمارے لئے تو وہی طریقہ بس کرتا ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے" (ان سے پوچھو کہ) اگر ان کے باپ دادا کچھ جانتے بوجھتے نہ ہوں، اور راہ راست پر بھی نہ ہوں (تو کیا پھر بھی وہ انہی کی اندھی تقلید کرتے رہیں گے۔)

ظاہر ہے کہ ان مقامات میں مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (قرآن) اور رسول کی طرف الگ الگ دعوت نہیں ہے، اس لئے کہ الگ الگ دعوت کے کچھ معنی ہی نہیں۔ ان کفار و منافقین کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی جاتی تھی، اور وہ دعوت، اسلام کے نظام کی تھی۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ نظام قرآنی میں اطاعت مرکز ملت کی ہے اور چونکہ یہ مرکز قوانین خداوندی کی تنفید کرتا ہے اور سب سے پہلا مرکز رسول اکرمؐ کی ذات گرامی تھی اس لئے قرآن کریم میں مرکز ملت کو "اللہ اور رسول" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مصرحہ بالا مقامات کے علاوہ حسب ذیل آیات میں بھی "اللہ اور رسول" (یعنی مرکز نظام ملت) کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ ج فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ○ (۳/۳۲)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو، فلاح وسعادت کی راہ تمہارے لئے ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ) اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں، تو (اطاعت الٰہی سے روگرداں ہونا شیوہ کفر ہے، اور) اور اللہ کفر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا!

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيقًا ○ (۴/۶۹)

اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، تو بلا شبہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جن پر خدا نے انعام کیا ہے اور وہ نبی ہیں، صدیق ہیں، شہید ہیں، اور (تمام) نیک اور راست باز انسان ہیں۔ اور (جس کسی کے رفیق ایسے لوگ ہوں، تو) ایسے رفیق کیا ہی اچھے رفیق ہیں!

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَا عَلٰى رَسُولِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ○ (۵/۹۲ نیز ۶۴/۱۲)

اور (دیکھو) اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو، اور (برائیوں سے) بچتے رہو۔ پھر اگر تم نے روگردانی کی، تو جان رکھو، ہمارے پیغام بر پر تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے (عمل کرنا یا نہ کرنا تمہارا کام ہے، اور جیسا تمہارا عمل ہوگا، ویسا ہی نتیجہ بھی پاؤ گے۔)

اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے رکھ لیجئے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے "اللہ اور رسول" کی اطاعت سے مفہوم "مرکز نظام ملت" کی اطاعت ہے تو اس نظام سے مراد ہے فقط وہ نظام جو قرآن کے خطوط پر متشکل ہو اور اس طرح انسانی زندگی کی ناہمواریوں (فساد) کو دور کر کے، اس کی جگہ متوازن وہموار (صالح) انداز زندگی بروئے کار لائے۔ غیر قرآنی نظام زندگی نہ کسی مومن کیلئے قابل قبول ہو سکتا ہے اور نہ اس کے مرکزی اقتدار کی اطاعت "خدا اور رسول" کی اطاعت۔

اب اس قبیل کی مزید آیات دیکھئے۔ ارشاد ہے:۔

يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ط وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ○ (۳۳/۷۱)

اللہ تمہارے اعمال میں درستی پیدا کرے گا، اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ اور

جو کوئی اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت (فرماں برداری) کرے گا تو وہ بہت ہی بڑی فیروزمندی کو پہنچے گا!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (۴۷/۳۳)

اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو، اور (کفر و نافرمانی کرکے) اپنے اعمال مت بگاڑو۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (۴۸/۱۷)

(ہاں البتہ) اندھے پر اور لنگڑے پر، اور مریض پر کوئی گناہ نہیں اور جس کسی نے اللہ کی اطاعت کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اللہ (جزائے عمل میں) اس کو (ابدی راحتوں کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی (جن کی وجہ سے ان کی شادابی میں تغیر نہیں ہوگا) اور جو کوئی (اطاعت سے) روگردانی کرے گا تو اس کو (پاداش عمل میں) دردناک عذاب کی سزا دے گا!

یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں اللہ یا قرآن یا رسول کی اطاعت کا الگ الگ بھی ذکر ہے اس سے بھی اسی قسم کی اطاعت مقصود ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یعنی نظام دین (مرکز حکومت خداوندی) کی اطاعت۔ اس لئے کہ اطاعت اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں کی جا سکتی۔ اور قرآن کے متعین فرمودہ نظام اجتماعی کے پیش نظر انفرادی طور پر اطاعت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ رسول چونکہ سب سے پہلا مرکز نظام ملت ہوتا ہے اس لئے اس کی اطاعت مستقل اطاعت نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے قوانین کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ (۴/۶۴)

اور (اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں کو جو تمہاری اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو انہی کے ساتھ ہوئی ہو) ہم نے جس کسی کو بھی منصب رسالت دے کر

دنیا میں کھڑا کیا، تو اسی لئے کیا، کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور جب ان لوگوں نے (تمھاری نافرمانی کرکے) اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیا تھا تو اگر اسی وقت تمھارے پاس حاضر ہو جاتے، اور خدا سے (اپنی نافرمانی کی) معافی مانگتے نیز خدا کا رسول بھی ان کی بخشش کے لئے دعا کرتا تو یہ لوگ دیکھ لیتے کہ خدا بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور (ہر حال میں) رحمت رکھنے والا ہے!

اسی اطاعت کا حکم اس سے اگلی آیت میں مسلمانوں کے لئے ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۴/۶۵)

پس (دیکھو) تمھارا پروردگار اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے، جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام جھگڑوں، قضیوں میں تمھیں حکم بنائیں، اور پھر (صرف اتنا ہی نہیں بلکہ) ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو، اس کے خلاف کسی طرح کی دل گرفتگی محسوس نہ کریں، اور وہ جو کسی بات کو پوری طرح مان لینا ہوتا ہے اسی طرح ٹھیک ٹھیک مان لیں۔

اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسول کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام فیصلے قرآن کی رو سے کرے، کہ حکم قرآن ہی کا نافذ ہو گا کسی اور کا نہیں۔

وَكَذٰلِكَ أَنزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۝ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ ۝ (۱۳/۳۷)

اور اسی طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے اسے (یعنی قرآن کو) ایک عربی فرمان کی شکل میں اُتارا۔ اگر حصول علم کے بعد تو نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، تو سمجھ لے کہ پھر اللہ کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی کارساز ہو گا، نہ بچانے والا۔

اسی اطاعت سے خدا کی محبت حاصل ہوتی ہے۔

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۳/۳۱)

(اے پیغمبر اسلام!) ان لوگوں سے کہدو، اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو تمھیں چاہئے کہ میری پیروی کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا، اور تمھاری خطائیں

بخش دے گا۔ وہ بڑا ہی بخش دینے والا، اور رحمت رکھنے والا ہے!

اور یہی وہ صراط مستقیم ہے جو انسان کو اس کے ارتقائی منازل کی انتہا تک پہنچاتا ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (۶/۱۵۳)

اور اس نے بتلایا کہ (خدا پرستی اور نیک عملی کی) یہی راہ میری ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے، سو اسی پر چلو، اور (دوسری) راہوں پر نہ چلو، کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمھیں تتر بتر کر دیں۔ یہ بات ہے جس کا خدا نے تمھیں حکم دیا ہے تاکہ تم (نظامِ خداوندی کی) حفاظت میں آجاؤ۔

اس لئے رسول کا حق سب سے اولیٰ ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِکُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ (۳۳/۶)

نبی۔۔۔۔۔۔ مومنوں کے خود اپنے نفس سے بھی زیادہ حقدار ہے اور اس کی بیبیاں ان (تمام مسلمانوں کی) مائیں ہیں۔ اور اللہ کی کتاب (کے قانون) میں رشتہ دار، بہ نسبت دوسرے مومنین و مہاجرین کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ (میراث کا) زیادہ حق رکھتے ہیں، مگر یہ جائز ہے کہ اگر تم اپنے دوستوں سے (بطور وصیت کے) کچھ سلوک کرنا چاہو، (تو کر سکتے ہو) یہ بات قانونی نوشتہ میں لکھی جا چکی ہے۔

اس لئے کہ مومنین کا جان اور مال اللہ نے خرید رکھا ہے (سورۂ توبہ) اور اس بیع و شریٰ سے مفہوم ہی یہی ہے کہ وہ نظامِ دین کے استحکام و استبقا میں کام آئے۔ چنانچہ اس کی تفسیر سورۂ توبہ کی اس آیت میں موجود ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (۹/۲۴)

ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار، اور وہ مال جسے تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کے خسارے سے تم ڈرتے ہو، اور وہ مکانات جو تمھیں بہت پسند ہیں، تمہارے نزدیک اللہ اور رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں، تو ذرا ٹھہرو یہاں تک کہ اللہ (کا قانونِ مکافاتِ عمل اس) کا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت کی راہ نہیں کھایا کرتا۔

یہاں دیکھئے پھر وہی "اللہ اور رسول" کے الفاظ موجود ہیں۔ اور "جہاد فی سبیل اللہ" کے الفاظ اس غائت کی وضاحت کر رہے ہیں، جس کے لئے جماعت کے نزدیک یہ مرکز ہر عزیز ترین متاع سے بھی عزیز تر ہونا چاہیئے اس لئے کہ

ملّت کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی ہو صاحبِ مرکز تو، خودی کیا ہے خدائی
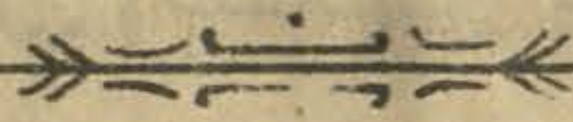
جماعت

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ رسول کی دوسری حیثیت امامت یا امارت (مرکز ملّت) کی ہے۔ اس حیثیت سے وہ تمام فرائضِ حکومت انجام دے گا لیکن اس حکومت میں اس کی حیثیت قوانین الٰہیہ کے نافذ کرنے والے کی ہوگی، واضع قوانین کی نہیں ہوگی۔ یہ مرکز ہوگا اور اس دائرہ کا محیط ملّت اسلامیہ جس کے ذریعے خدا کی حکومت دنیا میں متمکن ہوگی۔ اس لئے کہ کوئی نظام بلا جماعت چل نہیں سکتا۔ قرآن کریم نے نظام دین کے، ان تینوں عناصر کی خود تصریح کر دی ہے۔ سورۂ انفعال میں ہے:۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۸/۶۴)

اے پیغمبر اسلام! اللہ تیرے لئے، اور ان مومنوں کے لئے جو تیرے پیچھے چلنے والے ہیں کفایت کرتا ہے۔

یعنی اقتدار اعلیٰ اللہ کا، اس کے احکام صادر کرنے والا رسول بہ حیثیت مرکز نظام، اور ان احکامات کی عملی تنفید کرنے والی جماعت، ملّت اسلامیہ۔ سورۂ توبہ میں ہے:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (۹/۱۶)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم اتنے ہی میں چھوڑ دیئے جاؤ گے؟

حالانکہ ابھی تو اللہ نے اُن لوگوں کو پوری طرح آزمائش میں ڈالا ہی نہیں، جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہے۔ اور اللہ اور اُس کے رسول، اور مومنوں کو چھوڑ کر کسی کو پوشیدہ دوست نہیں بنایا ہے۔ (یاد رکھو) جیسے کچھ بھی تمہارے اعمال ہیں، خدا ان سب کی خبر رکھنے والا ہے!

سورۂ مائدہ میں ہے

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ○ وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ○ (۵ / ۵۵-۵۶)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تمھارا رفیق و مددگار تو بس اللہ ہی ہے، اُس کا رسول ہے، اور وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں۔ جن لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور (ہر حال میں) اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔
اور (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کو، اللہ کے رسول کو، اور ایمان والوں کو اپنا رفیق و مددگار بنا رکھا ہے، تو (وہ) اللہ کے گروہ میں سے ہے۔ اور بلاشبہ اللہ ہی کا گروہ غالب رہنے والا ہے!

ایک اور مقام پر ہے

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا ○ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۖ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ○ (۱۸ / ۲۷-۲۸)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تیرے پروردگار کی کتاب جو تجھ پر وحی کی گئی ہے اُس کی تلاوت میں لگا رہ، اللہ کی باتیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور تجھے اُس کے سوا کوئی پناہ کا سہارا ملنے والا نہیں!
اور جو لوگ صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں، اور اُس کی محبت میں سرشار ہیں، تو انہی کی صحبت پر اپنے جی کو قانع کر لو۔ ان کی طرف سے کبھی تمھاری نگاہ نہ پھرے کہ دنیوی زندگی کی رونقیں ڈھونڈنے لگو، جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا (یعنی ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانونِ نتائج کے مطابق جس کا دل غافل ہو گیا)، اور وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑ گیا تو، ایسے

آدمی کی باتوں پر کان نہ دھرو، اس کا معاملہ حد سے گذر گیا ہے۔

جماعت کی اہمیّت

نبی اکرمؐ نے اس جماعت کی تعمیر و تشکیل کس طرح سے کی اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس نظام کے اقنوم ثلاثہ میں سے اِس رُکن کی کیا اہمیّت ہے؟ نبی اکرمؐ کی خصوصیت کبریٰ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں معروف (احکام خداوندی جو فطرتِ انسانی کے جانے پہچانے ہوئے ہیں اس لئے کہ وہ عین مطابق فطرت ہیں، اس کے تقاضوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں) کا حکم دے گا، اور منکرات (غیر فطری قوانین و دساتیر) کو روکے گا۔

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَ عَزَّرُوۡهُ وَ نَصَرُوۡهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۷/۱۵۷﴾

جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی امّی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات و انجیل میں لکھی پائیں گے، وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا، بُرائی سے روکے گا پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، اُن پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔ تو جو لوگ اس پر ایمان لائے، اُس کے مخالفوں کے لئے روک ہوئے (راہِ حق میں) اس کی مدد کی، اور اُس روشنی کے پیچھے ہو لئے، جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے، سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔

یہی فریضہ جماعت مومنین کا ہے

کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡکِتٰبِ لَکَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ ؕ مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَکۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۳/۱۱۰﴾

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم تمام امتوں میں "بہتر اُمت" ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لئے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے بُرائی سے روکنے والے اور (اللہ پر سچّا) ایمان رکھنے والے ہو۔ اور اگر اہلِ کتاب (مخالفت و سرکشی کی جگہ) ایمان لے آتے تو یہ

ان کے لئے بہتری کی بات ہوتی (اور ہدایت وارشادِ عالم کا کام ان کے ہاتھوں انجام
پاتا، لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے) ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمان لے آئے ہیں،
لیکن بڑی تعداد انہی کی ہے جو دائرہ ہدایت سے یکسر باہر ہو چکے ہیں!

سورہ توبہ میں ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۹/۷۱)

اور جو مرد اور عورتیں مومن ہیں تو وہ سب ایک دوسرے کے کارساز و رفیق ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے
ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور (ہر حال میں) اللہ اور
اُس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ رحمت فرمائے گا۔
یقیناً اللہ سب پر غالب اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے!

اور اس سے ذرا آگے چل کر

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا
فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا
بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ التَّائِبُونَ
الْعَابِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۹/۱۱۱-۱۱۲)[۱]

---

[۱] ان آیات میں دیکھئے پوری کی پوری ملت اسلامیہ کا فریضہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بیان کیا گیا ہے۔
اس لئے کہ اسلام میں ہر مومن خدا کا سپاہی اور قرآن کا مبلغ ہے۔ اس نظام میں برہمنوں کا کوئی خاص طبقہ نہیں جس کے
ذمے دین کی تعلیم و تبلیغ ہو، اور باقی جماعت دنیاداری کے کام کاج میں مصروف رہے۔ بعض لوگ مندرجہ ذیل آیت
سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جماعت کا ایک طبقہ اس کام کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۳/۱۰۴)

اور دیکھو! ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت

(بقیہ حاشیہ)

بلا شبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں بھی خرید لیں، اور ان کا مال بھی اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کے لئے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو۔ وہ (کسی دنیوی مقصد کی راہ میں نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ وعدہ اللہ کے ذمہ ہو چکا (یعنی اس نے ایسا ہی قانون ٹھہرا دیا) تورات، انجیل، قرآن، (تینوں کتابوں) میں (یکساں طور پر) اس کا اعلان ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون ہے جو اپنا عہد پورا کرنے والا ہو؟ پس (مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے چکایا، خوشیاں مناؤ، اور یہی ہے جو بڑی سے بڑی فیروزمندی ہے!

غور کیجئے ان آیات میں معروف کے حکم دینے، اور منکرات سے روک دینے کا ارشاد ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حکم وہی جماعت دے سکتی ہے جس کے پاس حکومت و قوت ہو۔ بلا قوت، حکم، وعظ رہ جاتا ہے اور بس۔ اسی لئے دوسری جگہ فرمایا کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تمکن فی الارض (حکومت) سے ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22/41)

یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز (کا نظم) قایم کریں گے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے۔ اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے!

(گذشتہ سے پیوستہ) دینے والی ہو، وہ نیکی کا حکم دے، برائی سے روکے، اور بلا شبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح یاب ہیں۔

یہ استدلال بوجوہ غلط ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ باقی تمام مقامات پر جن کا ذکر متن میں کیا جا چکا ہے، یہ فریضہ عام بیان کیا گیا ہے کسی کی تخصیص نہیں کی گئی نہ تبعیض۔ اور چونکہ قرآنی احکام میں تضاد اور تعقیص کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس آیت کا مفہوم دیگر آیات کی روشنی میں متعین کرنا ہوگا۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ میں مِنْكُمْ تبعیض کے لئے نہیں آیا بلکہ عربی میں کسی چیز کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (22/30) بتوں کی نجاست سے پرہیز کرو۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ اور سب نجاستیں پاکیزہ ہیں اور صرف بتوں کی نجاست سے احتراز لازمی ہے۔ رجس تو ہر جگہ رجس ہی ہے اوثان کی اہمیت کی بنا پر "رجس من الاوثان" کہا گیا ہے۔ اس لئے "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ" میں فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت کا بیان مقصود ہے۔

اِسی کا نام استخلاف فی الارض ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل اختیار کیا اللہ ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انھیں (نیک عمل کے صلہ میں) زمین کی حکومت عطا فرمائے گا، جس طرح ان سے پہلے (نیک عمل قوموں کو) حکومت دی تھی۔ اور جس دین کو اللہ نے ان کے لئے پسند کرلیا ہے وہ اسے اُن کے لئے متمکن (طاقتور) بنا دے گا، اور اس (حالت) خوف کے بعد اس کو امن و سکون سے بدل دے گا۔ بشرطیکہ میری عبدیت (محکومیت و اطاعت) کرتے رہیں، اور میری (اطاعت و فرماں پذیری) میں کسی (دوسری ہستی) کو شریک نہ کریں۔ اور جو کوئی اس کے بعد بھی انکار کی روش اختیار کرے گا تو یہ لوگ بے ڈھنگی چال چلنے والوں میں سے ہیں!

اِسی کو وراثت ارض کہہ کر پکارا گیا ہے، جو صالحین کا حصہ ہے

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۱۰۵-۱۰۶)

اور (دیکھو!) ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھدی تھی کہ "زمین کی وراثت اُنہی بندوں کے حصے میں آئے گی جن میں صلاحیت ہوگی۔ اس بات میں اُن لوگوں کے لئے جو عبادت گزار ہیں، ایک بڑا ہی پیام ہے!

اس جماعت کی خصوصیات

اس جماعت کی خصوصیات وہی ہوں گی جو قرآن نے جملہ مومنین کی خصوصیات بیان کی ہیں اور جن کا تفصیلی تذکرہ اس مقام پر ناممکن ہے۔ اس لئے کہ مومن، قرآن کی تعلیم کا عملی پیکر ہوتا ہے۔ اس لئے ایک مومن کی خصوصیات کے حصر کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن کی پوری پوری تعلیم کو سامنے لایا جائے۔ اور یہ مشکل ہے۔ البتہ بعض آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی خصوصی صفات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (۵۴/۵)

اے پیروان دعوت ایمانی! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے پھر جانے سے دین حق کو کچھ نقصان پہنچے گا) قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ (سچے مومنوں کا) پیدا کر دے، جنھیں خدا دوست رکھتا ہوگا اور وہ خدا کو دوست رکھنے والے ہوں گے، مومنوں کے مقابلہ میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلہ میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں (جان و مال سے) جدوجہد کریں گے، اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس گروہ کو چاہے عطا فرما دے، اور وہ اپنے فضل میں بڑا ہی وسعت رکھنے والا اور (سب کا حال) جاننے والا ہے!

وہی خصوصیت کبریٰ جس کا ذکر سورۂ فتح میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝ (۲۹/۴۸)

محمد اللہ کے رسول اور آپ کے ساتھ (قدوسیوں) کی جماعت (جن کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ) وہ باہدگر (سرتاپا) (شفقت و راحت اور ہمدردو) محب ہیں اور منکرین حق کے مقابلہ میں (چٹان کی طرح) سخت (اور برق خاطف کی طرح) مہیب ہیں۔ (وہ کسی طاغوتی طاقت کے سامنے نہیں جھکتے، اگر) جھکتے ہیں تو صرف خدا کے سامنے، وہ اُسی سے فضل و رضامندی و رضاجوئی کے طالب ہیں۔ کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیاں (درخشندہ ستاروں کی طرح) چمکتی ہیں۔ اس کی مثال تورات و انجیل (دونوں کتب سماویہ) میں مذکور ہے (یہ جماعت کیا ہے؟ یوں سمجھے اپنی ساعت تاسیس سے لے کر یوم تکمیل تک اک کشت حق و صداقت ہے) جس طرح کوئی کونپل پہلے پہل اِک نرم و نازک پتی کی طرح (منصۂ شہود پر) ابھری۔ پھر وہ ایک شاخ نو دمیدہ کی

خوب اچھا کر گئی تا آنکہ وہ اِک لہلہاتی ہوئی کھیتی بن کر اپنی جڑوں پر جم کر کھڑی ہو گئی جس سے کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا اور حاسدوں (کافروں) کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ (یہی ہے وہ قدوسیوں کی جماعت) جس سے اللہ نے ایمان و نیک عمل کے صلہ میں مغفرت و اجر عظیم کا وعدہ کیا ہوا ہے۔

ان کے باہمی تعلقات کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ (۵۹)

اور ان لوگوں کے لئے بھی جو ان (مہاجرین) کی آمد سے قبل دار الاسلام (یعنی مدینہ) میں قیام پذیر ہیں، ان کی یہ خصوصیت ہے کہ جو مہاجرین ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے (انتہائی) محبت کرتے ہیں، اور جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے اس کے لئے یہ اپنے دلوں میں کسی قسم کی حاجت مندی نہیں پاتے۔ اور ان (مہاجرین) کو (خورونوش میں) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود ان پر فاقہ ہی کیوں نہ ہو؟ اور (بلاشبہ) جو کوئی اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو تو ایسے لوگ فلاح یاب ہیں!

سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات اِن کا تذکرہ اور بھی جامعیت سے سامنے آ جاتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۳/ ۱۱-۱)

بلاشبہ ایمان لانے والے کامیاب ہوئے (کون ایمان لانے والے؟) جو اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع رکھتے ہیں، جو لغو باتوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے میں سرگرم ہیں، جو اپنے ستر کی نگہداشت سے کبھی غافل نہیں ہوتے، ہاں اپنی بیبیوں سے زناشوئی کا علاقہ رکھتے

ہیں، یا ان سے جو ان کی ملکیت میں آگئیں (یعنی غلامی کی حالت میں پڑی ہوئی عورتیں جو ان کے نکاح میں آگئیں) تو ان سے علاقہ رکھنے پر ان کے لئے کوئی ملامت نہیں۔ اور جو کوئی (اس معاملہ میں) اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نکالے، تو ایسی صورتیں نکالنے والے ہی ہیں جو حد سے باہر ہو گئے نیز جن کا حال یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، تو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنا ورثہ پانے والے ہیں۔ یہ فردوس کی زندگی میراث میں پائیں گے ہمیشہ کے لئے اس میں بسنے والے!

جماعتی زندگی سورۂ عصر میں ان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کا اصولی پیکر پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اسلامی نظام میں جماعت کا ہر فرد اصلح ہوتا ہے۔ جس طرح ایک عمدہ مشینری کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ بہترین ہوتا ہے۔ ان افراد کے مجموعہ سے جو جماعت متشکل ہوتی ہے وہ خود بخود بہترین جماعت (خیر اُمّۃ) بن جاتی ہے۔ افراد اور جماعت کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس مسئلہ پر ماہرین عمرانیت نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن وہ سب بالآخر اسی نقطہ پر پہنچتے ہیں جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ یعنی

وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۝ (۱۰۳-۱ تا ۳)

اور زمانہ (اور اس کے نقوش جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں اس حقیقت پر) شاہد ہیں کہ انسان اگر اپنے ہی نظام کے مطابق زندگی بسر کرے تو) سراسر خسارے میں رہتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے ایمان اور عمل صالح (کا صحیح نظام) اختیار کیا اور باہمدگر حق پر جمے رہنے کی تاکید کرتے رہے اور عمل پیہم کی تلقین (وہ اس خسارہ سے بچ گئے)۔

اس سورہ میں افراد اور جماعت کے متعلقات کا بنیادی اصول بیان کر دیا گیا ہے "یعنی ہر فرد ایمان محکم اور عمل پیہم کا پیکر مشہود، اور پھر اس کے بعد ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین کرنے والے" وہ اُن کی انفرادی کیفیت اور یہ اجتماعی زندگی۔ نہ وہ اس سے الگ نہ یہ اس سے جدا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی یوں ایک دوسرے سے مدغم کہ

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

نظام شمسی پر غور کیجئے۔ ہر کرہ اپنے محور پر بھی گردش کرتا ہے اور پھر سب کرے ایک خاص نظم و ضبط اور کشش و جاذبیت سے اپنے نظامِ فلکی میں بھی گھومتے ہیں۔ یہی تعلق افراد اور جماعت کا ہے۔

زندگی انجمن آرا و نگہبانِ خود است   اےکہ در قافلہ - باہمہ روبے ہمہ شو

قافلہ، افراد کے مجموعہ ہی کا نام ہوتا ہے لیکن ہر فرد جزوِ کارواں ہونے کی حیثیت سے فرد نہیں رہتا

فرد اور جماعت کا تعلق

بجائے خویش قافلہ بن جاتا ہے - یہ کیفیت اتحاد سے بھی ایک قدم آگے ہوتی ہے - قرآن اسے ائتلاف کہتا ہے - بالکل دوسرے میں ضم ہو جانا - اسی کو قرآن نے اللہ کی سب سے بڑی نعمت اور احسان قرار دیا ہے -

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۳/۱۰۳)

اور دیکھو! سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو! اور جدا جدا نہ ہو جاؤ - اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے، اس کی یاد سے غافل نہ ہو - تمہارا یہ حال تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، لیکن اُس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے! تمہارا حال یہ تھا کہ آگ سے بھری ہوئی خندق ہے، اور اس کے کنارے کھڑے ہو (ذرا پاؤں پھسلا اور شعلوں میں جا گرے) لیکن اللہ نے تمھیں اس حالت سے نکال کر (زندگی اور کامرانیوں کے میدانوں میں پہنچا دیا) اللہ اسی طرح اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں واضح کر دیتا ہے تاکہ تم (منزلِ مقصود کی) راہ پالو!

اتحاد میں ہر شخص اپنا تشخص الگ الگ قائم رکھتے ہوئے دوسروں سے تعاون کرتا ہے لیکن ائتلاف میں ہمرنگی اور یگانگت بلکہ یک رنگی اور وحدت کی عجیب کیفیت ہوتی ہے - اتحاد میں ذرات یکجا ہو کر صحرا بن سکتے ہیں لیکن ائتلاف میں وہ ایک دوسرے سے جڑ کر چٹان بن جاتے ہیں - اتحاد میں پانی کے قطرے خواہ دریا بھی کیوں نہ بن جائیں پھر بھی پانی کا پانی رہتے ہیں، کہ جس قالب میں کسی کا جی چاہے ڈھال لے لیکن ائتلاف سے ان میں قلب ماہیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سیال پانی سے، منجمد برف کا ٹکڑا بن جاتے ہیں جس کی خصوصیات ہی کچھ اور ہو جاتی ہیں - پانی، ہائیڈروجن اور اوکسیجن کے اجزا ہی کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن اپنے اجزا سے یکسر مختلف شے، یہ ائتلاف کا کرشمہ ہے - ائتلاف اتنی اہم شے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ آپ اگر دنیا بھر کے خزانے بھی ان کو دیتے تو بھی اس کیفیت کو پیدا نہ کر سکتے -

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۶۳)

اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم ائتلاف پیدا کر دیا۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے، جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا۔ لیکن یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے!

اتحاد، ہنگامی معاملات میں اشتراکِ عمل کا نام ہے، لیکن ائتلاف میں زندگی کا تانا، بانا مشترک ہوتا ہے اس لئے ائتلاف صرف ایمان سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی ائتلافِ قلوب سے اسلامی قومیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ مدنیت کے معاملات میں باہمی معاہدات سے اتحاد پیدا کر سکتے ہیں لیکن باہمی ائتلاف سے ایک قوم نہیں بن سکتے۔ ائتلاف کا تعلق قلب سے ہے اور غیر مسلموں سے قلبی تعلقات (تولا) کی اجازت نہیں (دیکھئے معارف القرآن جلد اول۔ عنوان ولی) ان سے حسنِ سلوک اور معدلت گستری کا برتاؤ ہوگا۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۸)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم کو اللہ ان لوگوں سے حسن سلوک اور عدل گستری کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا (کیوں کہ) اللہ بلاشبہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے!

مؤمنین کی یہ وہ جماعت ہے جو دنیا میں حکومت خداوندی کے تمکن و استحکام کی متکفل ہوگی "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" اسی جماعت کو نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا اور یہی حضورؐ کے دست و بازو تھے۔

شریعت

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اسلامی حکومت کا کام قرآنی احکام کی تنفیذ ہے۔ اسی کا نام شریعت ہے سورۂ جاثیہ کی ان آیات پر غور کیجئے۔ فرمایا:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۚ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۴۵ / ۱۶-۱۷)

اور (اس سے پہلے) ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (قانون) اور حکمت و نبوت عطا کی تھی اور (ساتھ ہی) کھانے کی نفیس و عمدہ چیزیں دیں، اور ان کو (بعض) امور میں دنیا جہان والوں پر فوقیت دی۔ اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں، اور انہوں نے علم (کی روشنی) کے آنے کے بعد ہی باہم اختلاف کیا، بوجہ آپس کی ضد اور ہٹ دھرمی کے بلاشبہ آپ کا پروردگار قیامت کے روز جن امور میں یہ اختلاف کیا کرتے تھے (عملی) فیصلہ کرے گا۔

اس کے بعد فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۵/۱۸)

پھر (بنی اسرائیل میں نبوت ختم ہونے کے بعد ہم نے آپ کو نبوت دی اور) آپ کو دین کے ایک مخصوص طریقہ پر کر دیا، تو چاہیئے کہ تم اُسی طریقہ پر چلتے رہو، اور ایسے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو (قطعاً) جاننے والے نہیں ہیں!

لہذا شریعت، آئین حکومتِ خداوندی کا نام ہے۔ یہ شریعت قرآن میں ہے اس لئے کہ قرآن کے سوا کسی اور آئین کی اطاعت جائز نہیں لیکن قرآن میں غور کیجئے کہیں آپ کو ایسے احکام ملیں گے جن کی جزئیات تک متعین کر دی گئی ہیں، اور کہیں ایسے جنھیں صرف اصولی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بے شک قرآن ان تمام حقائق کو جو سفر زندگی میں انسانی راہ نمائی کے لئے ضروری ہیں بیان کرتا ہے۔

قرآنی احکام کی تقسیم

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (۱۶/۸۹)

اور وہ (آنے والا) دن جب ہم ہر ایک اُمت میں ایک گواہ (یعنی پیغمبر) اُٹھا کھڑا کریں گے جو انہی میں سے ہو گا (اور جو بتلائے گا کہ کس طرح اس نے پیامِ حق پہنچایا، اور کس طرح لوگوں نے اس کا جواب دیا) اور (اے پیغمبر اسلام!) تجھے ان لوگوں کے لئے (جو تجھے جھٹلا رہے ہیں) گواہ بنائیں گے (یہی بات ہے کہ) ہم نے تجھ پر الکتاب نازل کی۔ (دین کی) تمام باتیں بیان کرنے کے لئے اور اس لئے کہ مسلمان کے لئے راہ نمائی ہو، اور رحمت، اور خوش خبری!

اور واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۵/۶)

اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی ہے، اور ایسی کتاب آچکی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے!

اور جس قدر تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے اسے بھی دیتا ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۝ (۶/۱۱۴)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم تلاش کروں، حالانکہ (اللہ وہ ہے) جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کی ہے؟

لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ، بجز اُن جزئیات کے جن کی تعیین اس نے خود کردی ہے، احکام کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے۔ تفصیل و تبیان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر حکم کی جزئیات و فروعات بھی متعین کردی جائیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ بیان کیا جائے کھول کر بیان کیا جائے۔ اصولی بیان بھی مجمل یا مفصل اور مبہم یا مبین ہو سکتا ہے۔ قرآنی اسلوب بیان مجمل اور مبہم نہیں مفصل اور مبین ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ بعض احکام کی جزئیات بھی قرآن نے متعین کردی ہیں، اور بعض احکام صرف اصولی طور پر بیان کئے گئے ہیں؟

ایک اہم بنیادی بحث

یہ ظاہر ہے کہ قرآن تمام نوع انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۶/۲)

یہ (قرآن) تو تمام دنیا جہان کے لئے نصیحت نامہ ہے۔

تمام انسانوں کے لئے

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝ (۳۹/۴۱)

(اے پیغمبر اسلام!) بلاشبہ ہم نے تجھ پر الکتاب (جو) حق ہے تمام نوع انسانی (کی ہدایت و رہ نمائی) کے لئے اُتاری ہے جو کوئی (اس سے) ہدایت پکڑے گا تو خود اپنے نفس کے (فائدہ) کے لئے اور جو کوئی گمراہ ہوگا تو اس کی گمراہی کا وبال اُسی پر پڑے گا۔ اور تو ان پر کچھ نگہبان و گواہ بنا کر مسلط نہیں کیا گیا۔ (کہ ہمہ وقت ان کے افعال و افکار کی ذمہ داری لئے رہے)۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اگرچہ انسان کی فطرت غیر متبدل ہے لیکن مرورِ زمانہ اور تبدیلی احوال و ظروف سے اس کے

مقتضیاتِ فطرت کے مظاہروں میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ چودہ سو سال پیشتر کے اہلِ عرب کی مدنیت کے مسائل اور ہمارے موجودہ زمانہ کے مسائل کی جزئیات میں بیّن فرق ہو چکا ہے۔ ہمارے زمانہ کے معاشی مسائل، بین الاقوامی تعلقات، سیاسی مطامح، عمرانی پیچیدگیاں، حتیٰ کہ عائلی زندگی تک کے بعض تقاضے ایسے ہو چکے ہیں جو اس زمانہ کے لوگوں کے تصور میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ فطرتِ انسانی ان مسائل و معاملات کا حل، حق و صداقت اور عدل و انصاف کی رو سے چاہتی ہے جس میں اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا موقعہ ملے، اور انسانیت اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنی معراجِ کمال تک جا پہنچے۔ قرآن ان مسائل کے حل کے لئے اصولی قوانین عطا کرتا ہے جن کی جزئیات اپنے اپنے زمانہ کے مقتضیات کی روشنی میں متعین کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ وہ فٹ بال کے میدان میں چند حدود و خطوط متعین کر کے کھلاڑیوں کو میدان میں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ان حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے اپنی اپنی صواب دید کے مطابق گیند کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائیں۔ زندگی کے "کھیل" میں قرآن ان خطوط کو حدود اللہ کہتا ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (۵۸/۴)

اور یہ اللہ کی (قائم کردہ) حدیں ہیں۔

فَلَا تَقْرَبُوْهَا (۲/۱۸۷)

پس (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) چاہیئے کہ ان (حدوں) کے قریب نہ ہو جاؤ (مبادا ان سے متجاوز نہ ہو جاؤ)

وہ ان حدود سے زندگی کا راستہ متعین کر دیتا ہے اور اس راستہ کے اندر انسانوں کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ وقتی اور ہنگامی حوادث و مسائل کے حل خود دریافت کریں۔ یوں سمجھیے کہ وہ اصولی قوانین وضع کر دیتا ہے تاکہ ان کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تبعی احکام (Bye lawss) خود متعین کرتا جائے۔ مثلاً قرآن کریم نے ربوٰا (سود) کی حرمت کا حکم دیا ہے تو ربوٰا کی تمام شکلوں کو گنا کر اس کے حکم کا حصر نہیں کر دیا، بلکہ اسے غیر متعین چھوڑ دیا گیا ہے چنانچہ آج ہمارے زمانہ میں ربوٰا کی ایسی ایسی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں کہیں موجود نہ تھیں۔

یا مثلاً قرآن کریم نے حج کے ارکان کی جزئیات تک کا ذکر کر دیا ہے لیکن زکوٰۃ کا تعین کچھ نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہر دور کی اسلامی حکومت یہ خود متعین کرے گی کہ اسے کس قدر روپے کی ضرورت ہے، اور اسی

حساب سے وہ قوم سے ٹیکس وصول کرے گی۔ وقس علیٰ ہذا۔

لہٰذا قرآن کریم نے جن احکام کی جزئیات بھی خود ہی متعین کر دی ہیں وہ سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ وہ جزئیات بھی ایسی ہیں جن میں مرورِ زمانہ سے کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جن احکام کو صرف اصولاً بیان کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کی جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ماتحت بدلی جا سکتی ہیں۔ مرکزِ ملت کا کام یہ ہے کہ وہ قرآنی احکام اور اس کی متعین فرمودہ جزئیات کو نافذ کرے اور اصولی احکام کی جزئیات اپنے زمانہ کے مقتضیات کی روشنی میں مرتب کرے۔ اِن احکامات کی تنفیذ اور تبعی احکام کی ترتیب و تدوین کا کام ملت کے اربابِ فکر و نظر کے مشورہ سے طے پائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ (۳/۱۵۹)

(اے پیغمبر اسلام!) یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لئے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے، اگر تم سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے (اور ان کے دل تمہاری طرف اس طرح نہ کھنچتے جس طرح اب بے اختیار کھنچ رہے ہیں) پس ان لوگوں کا قصور معاف کر دو، اور اللہ سے بھی ان کے لئے بخشش طلب کرو، اور معاملات حکومت میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔ پھر جب ایسا ہو کہ تم نے کسی بات کا عزم کر لیا، تو چاہیے کہ خدا پر بھروسہ کرو، (اور جو کچھ ٹھان لیا ہے اُس پر کاربند ہو جاؤ) یقیناً اللہ انہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اُس پر بھروسہ کرنے والے ہیں[ص۱]۔

دوسری جگہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۚ (۴۲/۳۸)

ص۱ غور کیجئے۔ یہاں مشاورت اور عزیمت دونوں کا ذکر موجود ہے یعنی جب کوئی معاملہ سامنے آئے تو اس میں باہمی مشاورت کی جائے۔ اور اس طرح ملت کی مجموعی استعداد سے استفادہ کیا جائے، لیکن جب وہ معاملہ طے پا جائے تو پھر مرکزِ ملت اس کا نفاذ کرے اور اُس میں عزمِ راسخ سے کام لے کسی کی نکتہ چینی کی پرواہ ہو نہ مخالفت کا ڈر۔ مشاورت اور توکل علی اللہ (عزیمت) یہی دو چپو ہیں جن سے کشتی ملت حوادث زمانہ کے طوفانوں سے صحیح و سلامت ساحل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔

اور (مومن وہی ہیں) جنھوں نے اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیا۔ اور نماز کا نظم، قائم کیا، اور جن کے امورِ حکومت آپس کے صلاح و مشورہ[1] سے طے پاتے ہیں۔ اور ہم نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے اُسے (نیک راہوں میں) خرچ کرتے ہیں!

مجلسِ مشاورت

یہ مجلسِ مشاورت اُن مومنین پر مشتمل ہو گی جن کی خصوصیات کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ سیرت میں بلندی۔ کیرکٹر میں پختگی۔ ذہنوں میں جلا۔ نگاہوں میں بصیرت قرآنی۔ بازوؤں میں قوتِ عمل۔ جگر میں حرارتِ خون اور دل میں خشیتِ باری تعالیٰ۔ قرآنی نظام کی اساسی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی چلانے والی جماعت وہ ہو گی جسے قرآن مومنون حقا (سچے مومن) قرار دیتا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ (۲-۴ نیز ۷۴)

مومنوں کی شان تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں۔ اور وہ ہر حال میں اپنے

---

[1] واضح رہے کہ اس مشاورت اور دورِ حاضرہ کے جمہوری آئین میں بنیادی فرق ہے ایک تو یہاں اصولی قانون موجود نہیں جس کی روشنی میں تبعی احکام کی تدوین، یا نظمِ حکومت کی تنسیق کے لئے مشورہ ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ضروری نہیں کہ کثرتِ رائے کا فیصلہ بہر حال و بہر نوع قانون کی شکل اختیار کر جائے۔ مرکزِ ملت اکثریت کے فیصلوں پر مجبور نہیں ہو سکتا۔

وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ ۚ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝ (۴۹)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ تشریف فرما ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ اگر ان میں تمہارا کہنا مان لیا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے، لیکن اللہ نے (اسی لئے) ایمان و یقین (کامل) کو تمہارے نزدیک پسندیدہ اور تمہارے قلوب میں مرغوبِ خاطر بنا دیا ہے، اور تمہارے لئے انکار، سرکشی، گناہ، ان سب کو ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔ (یاد رکھو!) ایسے ہی لوگ رشد و ہدایت پانے والے ہیں!

پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں، اور ہم نے جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں بھی) خرچ کرتے ہیں! بلا شبہ ایسے ہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لئے ان کے پروردگار کے یہاں مرتبے ہیں، اور بخشائش، اور بڑی خوبی و عزت کی روزی!

آپ دنیا میں اچھے سے اچھا نظام لیجئے۔ اگر اس کے کارپردازوں کے قلب و دماغ کی صحیح تعمیر نہیں ہوگی تو وہ نظام کبھی عمدہ نتائج مرتب نہیں کر سکے گا۔ اسلامی نظام جہاں بہ حیثیت نظامِ اجتماعیۂ انسانیہ، بہترین نظام ہے وہاں اس کے ارباب بست و کشاد کی سیرت بھی محکم ایمان کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ رسول کا کام صرف اس نظام کو چلانا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایسی جماعت کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ایسی جماعت کی تخلیق خود اس نظام کا اہم جزو، یا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

گذشتہ اوراق میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ

(۱) اسلامی نظامِ حکومت میں، حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے۔

(۲) اللہ کی یہ اطاعت، اس کے قوانین کی اطاعت ہے۔

(۳) یہ قوانین قرآن کے دفتین میں محفوظ ہیں۔

(۴) ان قوانین کا انسانوں تک پہنچانا رسول کے ذمہ تھا۔ یہ اس کی رسالت تھی۔

(۵) اس کے علاوہ ان قوانین کا نفاذ بھی اس کے ذمہ تھا۔ یہ منصب امارت تھا۔

(۶) قرآن میں ایسے احکام بھی ہیں جن کی جزئیات قرآن سے خود متعین نہیں ہیں۔

(۷) یہ جزئیات مرورِ زمانہ سے بدلتی رہیں گی اور مرکزِ ملت (نظامِ اسلامی) ان کا تعین کرتا رہے گا۔

(۸) ان کا تعین اربابِ فکر و نظر کی مشاورت سے ہوگا۔

(۹) ان کا تعین سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے بہ حیثیت امامِ ملت، اربابِ ملت کے مشاورت سے کیا۔

اب آگے چلئے۔ یہ ظاہر ہے کہ رسول کی مدتِ حیات بہرحال و بہر حیثیت متعین ہوتی ہے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ○ (۳۹/۳۰ نیز ۲۱/۳۴)

لیکن یہ نظام تو زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں۔ یہ تو قیامت تک کے لئے تمام نوع انسانی کے واسطے متعین کیا گیا ہے اس لئے رسول کی دنیا سے تشریف بری کے بعد بھی اسے اسی طرح قائم رہنا تھا۔ رسول کے بعد، اس نظام کو اس کی جماعت آگے چلائے گی۔ اس لئے کہ اسے وراثتِ کتاب اللہ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ؕ (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے یہ کتاب اُن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا دی جن کو ہم نے اپنے تمام بندوں سے (ایمان و یقین کی آزمائش پر پرکھنے کے بعد) منتخب کرلیا، پھر ایسا ہوا کہ (بعد میں) اُن میں سے بعض اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بن گئے، اور بعض ان میں سے درمیانی درجہ کے لوگ ہیں، اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کی توفیق دہی سے بھلائی کے راستہ میں (دن بدن) ترقی کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ بہت ہی بڑا فضل ہے!

انھیں ایسا نور دیا گیا ہے جس کی روشنی میں یہ دنیا میں چلیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ (۵۷/۲۸)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم اللہ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو، اور اُس کے رسول پر (پورا پورا) یقین (ایمان) رکھو، اللہ تمھیں (جزائے عمل کے طور پر) اپنی رحمت سے (ثواب کے) دو حصے دے گا اور تم کو ایسا نور (ہدایت) عنایت کرے گا کہ تم اس کی روشنی میں چلو گے۔ اور تم کو بخش دے گا۔ اور اللہ بڑا ہی رحم کرنے والا اور بخش دینے والا ہے!

ساری دنیا کی قیادت اِن کے لئے ہوگی اس لئے کہ یہ متقین کے امام ہوں گے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۲۵/۷۴)

اور (مومن) وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار ہماری بیویوں، اور ہماری اولادوں سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی رکھ اور ہمیں پرہیزگاروں کی امامت عطا فرما!"

اِن کا نظام یہ ہوگا کہ یہ اقوامِ عالم کے نگراں ہوں، اور ان کے اعمالِ حیات کی نگرانی ان کا مرکز کرے۔

وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ

یُعۡوَ النَّصِیۡرُ ۲۲/۷۸ نیز ۱۴۳/۲

اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو۔ اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے پوری طرح ادا کرو۔ اُس نے تمھیں برگزیدگی کے لئے چن لیا۔ تمھارے لئے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی، وہی طریقہ تمھارا ہوا جو تمھارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اس نے تمھارا نام "مسلم" رکھا پچھلے وقتوں میں بھی اور اِس (قرآن) میں بھی، اور یہ اس لئے کیا تاکہ رسول تمہارے لئے (اسلوب حیات) پر نگراں ہو اور تم تمام انسانوں کے اعمالِ حیات کے نگراں۔ پس نماز کا نظام قائم کرو، زکوٰۃ کی ادائیگی کا سامان کرو، اللہ کا سہارا مضبوط پکڑلو۔ وہی تمھارا کارساز ہے اور جس کا کارساز اللہ ہوا تو کیا ہی اچھا کارساز ہے اور کیا ہی اچھا مددگار!

اقوام عالم میں اس ملّت شریفہ کی پوزیشن پر غور کیجئے تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگراں و محاسب لیکن اس قوت و اقتدار کے ساتھ خود بدلگام اور بے زمام نہیں، بلکہ اپنے اعمال کے لئے اس مرکز کے سامنے جوابدہ جو احکام الٰہی کی تنفیذ کا ذمہ دار ہے۔ وہ ملّت کہ

نگاہِ او، بہ شاخِ آشیانہ ۔۔۔ پرد در وسعتِ گردوں یگانہ
بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ ۔۔۔ مہ و انجم گرفتارِ کمندش

رسول مامور من اللہ تھا اس لئے اس کی امارت و امامت کبریٰ لوگوں کے انتخاب کی رہینِ منت نہ تھی۔ وہ بہ حیثیت رسول، امیر ملّت اور مرکز امّت تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ حیثیت تو کسی کو حاصل نہ ہوگی۔ اب

انتخاب امیر

امّت میں کوئی رسول نہیں ہوگا، اس لئے اب ملّت اپنا امام خود منتخب کرے گی اور معیار انتخاب تقویٰ ہوگا، کہ "اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ" خدا کا مقرر کردہ معیار ہے

اب یہ امام رسول کا جانشین (خلیفۃ الرسول) ہوگا اور اس کی اطاعت "اللہ اور رسول کی اطاعت" ہوگی، اس لئے کہ، جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے، اللہ اور رسول سے مراد ہی مرکز ملّت ہے۔ اب احکام الٰہیہ کی تنفیذ اس کا فریضہ ہوگا۔ اور ان احکام کی اطاعت اس کی وساطت سے ہوگی۔ وہ سب سے پہلے خود مُسلم (ان فیصلوں کا تسلیم کرنے والا) اور عبد مومن (خدا کا تابع بندہ) ہونے کی حیثیت سے ان

خدا اور رسول کی اطاعت

احکامات پر خود عمل پیرا ہوگا۔ اور اس کے بعد دوسروں سے اس کی پیروی کرائیگا۔ یہ اطاعت، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے خدا اور رسول کی اطاعت ہوگی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے احکامات کی اطاعت، خدا اور رسول کی اطاعت نہ تھی۔ وہ ان احکام کو جن کی جزئیات قرآن سے متعین کردی ہیں، اسی طرح نافذ کریگا لیکن جن

امور کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، وہ اپنے زمانہ کے مقتضیات کی روشنی میں قرآن کے اصولی حکم کے ماتحت ان امور کے تصفیہ کے لئے تبعی احکام (Bye laws) وضع کرے گا۔ اس وضع احکام میں وہ ملت سے مشورہ بھی کر لیگا، اور اپنے پیشرو مراکز ملت (Predecessors) کے فیصلوں سے مستفید بھی ہوگا، وہ فیصلے اس کے لئے (Precedents) ہوں گے، جو اسے اسوۂ حسنہ (اچھے نمونہ) کا کام دیں گے (۳۳/۲۱)۔ وہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر ایسے جزئی احکام وضع کرے گا جو اس کے زمانہ کے تقاضوں پر منطبق ہو سکیں۔ اب یہی شریعت اسلامیہ اور مسلک ملت ہوگا جس سے انحراف جہنم میں لے جائیگا۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ (۴/۱۱۵)

اور جس شخص پر الہدیٰ (یعنی ہدایت کی حقیقی راہ) واضح ہو جائے اور اس پر بھی وہ اللہ کے رسول سے مخالفت کرے، اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے، تو ہم اسے اسی طرف کو لے جائیں گے جس (طرف) کو (جانا) اس نے پسند کر لیا ہے، اور اسے دوزخ میں پہنچا دیں گے۔ اور (جس کے پہنچنے کی جگہ دوزخ ہوئی تو) یہ پہنچنے کی کیا ہی بری جگہ ہے!

تمسک بالجماعت

چونکہ یہی نظام اسلامی تھا، اور یہی دین کا اصل الاصول، اس لئے نبی اکرمؐ نے تمسک بالجماعت اور اطاعت امیر کے لئے اتنی شدت سے تاکید فرمائی ہے کہ کتب روایات میں متعدد تاکیدی ارشادات گرامی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ التزام جماعت کے متعلق حضورؐ نے فرمایا۔[۱]

انا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعۃ، والسمع، والطاعۃ والھجرۃ، والجھاد فی سبیل اللہ، فانہ من خرج من الجماعۃ حین شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ۔ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو من جثی جھنم قالوا یا رسول اللہ وان صام وصلی۔ قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم۔

(روایت احمد والحاکم)

(حضورؐ نے فرمایا کہ) میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم مجھے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔

---

[۱] چونکہ یہ روایات منشاءِ قرآن کے مطابق ہیں اس لئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا ہی فرمایا ہوگا۔ یہی ہمارے نزدیک کسی روایت کی صحت اور سقم کا صحیح معیار ہے، یعنی جو قرآن کے خلاف نہ ہو اسے صحیح قیاس کیا جا سکتا ہے، اور جو قرآن کے خلاف ہو وہ قطعاً غیر صحیح ہے، خواہ اسناد کے لحاظ سے اسے کیسا ہی درجہ کیوں نہ دیا جائے؟

جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، اور جہاد فی سبیل اللہ یقین کرو، جو مسلمان ایک بالشت بھر جماعت سے الگ ہو گیا، تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے جاہلیت کی زندگی (یعنی انتشار و لامرکزیت کی زندگی) کی طرف دعوت دی تو اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا، یا رسول اللہ اگرچہ ایسا شخص روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا، ہاں، اگرچہ وہ نماز بھی پڑھتا ہو، اور روزہ بھی رکھتا ہو، اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتا ہو۔

غور فرمائیے کہ التزام جماعت کی کس قدر تاکید کی گئی ہے اس لئے کہ اسلام کی بنیاد ہی اس اصل پر قائم ہے۔ یہ نہ رہے تو دین ہی باقی نہیں رہتا۔ مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتة الجاهلية

جو شخص اطاعت سے الگ ہو گیا، اور جماعت کو چھوڑ بیٹھا تو وہ (اسلام کی نہیں) جاہلیت (زمانہ قبل از اسلام) کی موت مر گیا۔

اس لئے کہ اطاعت سے نکل جانا، نظام اسلامی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہے، جسے قرآن نے اللہ اور رسول کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے، اور اس کی سزا (اس دنیا میں) سولی ہے اور عاقبت میں جہنم۔ (تفصیل پہلے گذر چکی ہے) بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

ليس احدٌ يفارق الجماعة شبرا فيموت الامات ميتةً جاهلية۔

جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہو جائے گا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ جماعت سے یکسر الگ ہو جائے بلکہ یہ بھی کہ اگر جماعت کے فیصلوں سے ذرا (بالشت بھر) بھی الگ ہو جائے، تو بھی اس کی موت مسلمان کی موت نہیں، کہ

يد الله على الجماعة۔ ومن شذّ شذّ فى النّار (ابن ماجہ)

اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جو جماعت سے الگ ہوا، وہ جہنم میں گرا۔

ان ارشادات گرامی سے معلوم ہو گیا کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی (یعنی نظام دین کے ماتحت جماعتی زندگی) کا ہے۔ انفرادی زندگی اسلام کی زندگی نہیں، اس لئے کہ انفرادی طور پر "مذہب" تو باقی رہ سکتا ہے، دین قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔ جماعتی زندگی کا نظام، امام (یا امیر) کی وساطت سے قائم ہوتا ہے۔ اس لئے جماعتی زندگی، اور طاعت امیر لازم و ملزوم ہیں۔ اس باب میں بھی کتب تاریخ و آثار میں نبی اکرمؐ کے بہت سے ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ

من اتاكم وامركم جميع على رجل واحد يريد ان يشق عصاكم او يفارق

جماعتکم فاقتلوہ (مسلم)

جو شخص تمھارے پاس آئے درآں حالیکہ تمھارا نظام ایک امیر کے تابع قائم ہو، اور وہ چاہے کہ تمھارے جماعتی نظام میں تشتت وافتراق پیدا کر دے، تو ایسے شخص کو قتل کر دو۔

کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ اگر امیر کا کوئی فیصلہ ایسا بھی ہو جس کی اطاعت گراں گذرے، تو بھی اس کی اطاعت ضروری ہے، اس کے فیصلے کے خلاف سرکشی بغاوت ہے۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ

من رای من امیرہ شیئاً یکرھہ فلیصبر فانہ لیس یفارق الجماعۃ شبرا فیموت میتۃ جاھلیۃ[1] (بخاری ومسلم)

جو شخص اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات پائے تو اُسے اس کو برداشت کرنا چاہیئے اس لئے کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا اور اسی حالت میں مر جائے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

انما لکم ما طابت بہ نفس امامہ

یعنی انسان کے لئے وہی ہے جس سے اُس کا امام راضی ہو۔

امام کے فیصلہ کے خلاف تو دل میں کبیدگی تک پیدا ہونا قرآن کی رو سے جرم عظیم ہے اس کی اطاعت نہایت خندہ پیشانی اور بہ طیب خاطر ہونی چاہیئے، کہ اس میں استبداد کو کوئی دخل نہیں۔ بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبدٌ حبشیٌ[2]

یعنی سنو، اور اطاعت کرو، اگرچہ تم پر حبشی غلام ہی امیر کیوں نہ مقرر کیا گیا ہو۔

اِس لئے کہ

فانما علیہم ما حملوا وعلیکم ما حملتم (مسلم)

ارباب امارت کے ذمے وہ چیزیں ہیں جو ان کی ذمہ داری میں ڈال دی گئی ہیں، اور تمھارے ذمے

ص[1] ان مقامات میں ہو سکتا ہے کہ امیر سے مراد اولوالامر ہوں جنھیں مرکز ملت (رسول اللہ) نے مختلف مقامات میں تعین فرمایا ہو، لیکن ان ارشادات کا اطلاق حضورؐ کے بعد مرکز ملت اور مقامی حکام سب پر ہو سکتا ہے۔

ص[2] دوسری جگہ یوں ہے "ان امر علیکم عبد مجدع اسود" اگر کوئی نکٹا بریدہ حبشی غلام بھی تم پر امیر مقرر کر دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو، (مسلم)

وہ چیزیں ہیں جو تمہاری ذمہ داری میں ڈال دی گئی ہیں۔

امیر کا کام ہے کہ وہ احکام خداوندی سے صحیح استنباط کرے اور ان احکام کی تنفیذ بہ طریق احسن کرے۔ اس کے لئے وہ اپنے رب کے حضور جوابدہ ہے۔ جماعت کے ذمّے یہ ہے کہ وہ مرکز ملّت کے فیصلوں کی اطاعت کرے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض فیصلوں کے متعلق ان کے نتائج وعواقب بتادیں کہ ان میں اجتہادی غلطی تھی اس لئے کہ یہ فیصلے بہرحال انسانی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ (اور ایسا خود رسول اللہ کے ساتھ بھی ہوا تفصیل اس کی آگے چل کر آئیگی) لیکن امت کے لئے ان کی اطاعت لازمی ہے۔ فیصلہ کی غلطی ظاہر ہونے پر مرکز خود اس سے رجوع کرے گا اور دوسرا فیصلہ نافذ کرے گا۔ جماعتی زندگی اور اطاعت امیر کی اہمیت اس قدر ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

لا یحل لثلثۃ یکونوا بفلاۃ من الارض الا امروا علیھم احدھم۔

(مسند امام احمد بن حنبل)

یعنی ایسے تین شخصوں کے لئے جو زمین کے کسی گوشے میں بھی زندگی گذارتے ہوں جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ اپنے ہی میں سے ایک کو امیر بنالیں۔

یہ تمام تفاصیل مجموعی طور پر اس قول میں آجاتی ہیں جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ

لا اسلام الا بجماعۃ۔ ولا جماعۃ الا بامارۃ ولا امارۃ الا بطاعۃ،

(جامع ابن عبد العزیز)

اسلام جماعت کے بغیر کچھ نہیں، جماعت کی ہستی امیر کے ساتھ ہے اور امارت کا مدار اطاعت پر ہے۔

اس لئے کہ تفریق کی زندگی کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰-۳۱-۳۲)

اور (اے پیروان دعوت ایمانی!) تم شرک کرنے والوں میں سے مت ہوجاؤ، اُن میں سے مت ہوجاؤ، جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اور بہت سے (الگ الگ) گروہ بن گئے (اور حالت یہ ہوگئی کہ) ہر گروہ اپنے اپنے طریق کار پر نازاں ہے!

تفرقہ اندازی شرک ہے

نظام دین میں تفرقہ اندازی کرنے والوں کے متعلق فرمادیا کہ ان سے رسول اور اس کی امّت کو کچھ سروکار نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (۶/۱۵۹)

(اے پیغمبر اسلام!) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے، تمھیں ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، پھر وہی بتلائے گا کہ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں، اس کی حقیقت کیا تھی؟

رسول کی تیسری حیثیت

اب ہم موضوع زیر نظر کے اہم اور ساتھ ہی نازک ترین گوشے کی طرف آرہے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی ایک حیثیت رسالت کی تھی جس میں حضورؐ کا فریضہ پیغامات الٰہیہ کو لوگوں تک پہنچانا تھا۔ دوسرا منصب امارت و امامت (مرکز ملت) کا تھا، جس کی رو سے نظم و نسق حکومت الٰہیہ کا فریضہ حضورؐ کے سپرد تھا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس تنظیم و تنسیق کا اہم پہلو ایک ایسی جماعت کی تشکیل تھا جو اس نظام کو آگے چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جماعت کی تشکیل، تعلیم و تربیت کے بغیر ناممکن ہے لہذا رسول کی تیسری حیثیت ایک معلم و مربی کی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر حضورؐ کے اس فریضہ کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۳/۱۶۴)

بلاشبہ یہ اللہ کا بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیجدیا، جو انہی میں سے ہے، وہ اللہ کی آیتیں سناتا ہے، ہر طرح کی برائیوں سے انھیں پاک کرتا ہے اور کتاب اور دانشوری کی تعلیم دیتا ہے۔ (اس نے ہدایت کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

مزید تفصیل کے لئے ان آیات کو سامنے رکھیے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۲/۱۲۹)

خدایا! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو، جو انہی میں سے ہو، وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی انھیں تعلیم دے، اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کو مانجھ دے، اے پروردگار بلاشبہ تیری ہی ذات

ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے!

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۱۵۱)

جس طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے تم میں سے ایک شخص کو اپنی رسالت کے لئے چن لیا، وہ ہماری آیتیں تمھیں سناتا ہے (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) تمھارے دلوں کی اصلاح کرتا ہے کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور وہ باتیں سکھلاتا ہے جن سے تم یکسر ناآشنا تھے، (تو اسی طرح ہم چاہتے ہیں، اپنی نعمت تم پر پوری کردیں، اور تم اس مرکز ہدایت سے وابستہ ہو کر، نیک ترین "اُمت ہونے کا مقام حاصل کرلو!)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۶۲/۲)

وہی ہے جس نے (عرب کے) ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) ان کے دلوں کی اصلاح کرتا ہے، اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور یہ لوگ (بعثِ رسالت سے) پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے!

رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝ (۶۵/۱۱)

ایک ایسا رسول (بھیجا) جو تم کو اللہ کی کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح اختیار کیا ان کو (کفر و طغیان کی) ظلمتوں سے نکال کر (ایمان و ایقان کے) نور کی طرف (پہنچا دے)، اور (یاد رکھو) جو کوئی اللہ پر یقین (کامل) رکھے گا اور عمل صالح اختیار کرے گا تو اللہ اُسے (جزائے خیر کے طور پر نعیم ابدی کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی (جن کی وجہ سے ان باغوں کی شادابی اور تروتازگی متغیر ہونے والی نہ ہوگی) وہ ان میں ہمیشہ کی زندگی گذارے گا۔ بلاشبہ اللہ نے (ان کو بہت) خوب روزی عطا کی۔

تعلیم و تربیت سے مقصود

تعلیم و تربیت سے مفہوم یہی ہوتا ہے کہ انسان کی اندرونی استعداد کو اجاگر کیا جائے، اس کے جوہر خوابیدہ کو بیدار کر کے انھیں بروئے کار لایا جائے اور انھیں صحیح نتائج مرتب کرنے کے قابل بنا دیا جائے، جو تعلیم ایسی نہیں وہ نوشت و خواند

(پڑھنا لکھنا) سکھاتی ہے، انسانی تربیت نہیں کرتی۔ خود تزکیہ کے معنی نشو ونما دینا، بالیدگی کی صلاحیت پیدا کرنا، اوپر ابھارنا، آگے بڑھانا ہیں۔ ایک پودے کو کیسے نشو ونما دیتے ہیں؟ اس طرح کہ اس کے لئے مساعد ماحول مہیا کیا جائے، جو چیزیں اس کی بالیدگی میں مدد معاون ہو سکتی ہیں انھیں مہیا کیا جائے اور پھر ان موانع کو دور کیا جائے جو اس کی بالیدگی کی راہ میں حائل ہوں۔ اس طرح اُس بیج کے اندر جس قدر صلاحیتیں موجود ہیں اُنھیں سر ابھارنے کا موقع مل جائیگا۔ اور یہی ننھا سا بیج ایک دن تناور درخت بن جائے گا۔ "کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ"۔ نفس انسانی کی دمیدگی و بالیدگی (تزکیہ) کے لئے بھی ضروری ہے کہ اسے صحیح تعلیم دی جائے، اور اُن تمام موانع کو دور کیا جائے جو اسے ابھرنے سے روکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ موانع، محکومی اور غلامی کے وہ اغلال و سلاسل ہیں جو انسانی حریت فکر آزادی عمل کو چاروں طرف سے جکڑے رہتے ہیں، اور اس کی فطری صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع ہی نہیں دیتے

از غلامی دل بمیرد، در بدن
از غلامی رُوح گردد، بارِ تن

انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالئے، اسی سلسلۂ صید و صیّاد کی مسلسل داستان نظر آئے گی۔ مستبد قوتیں اس قسم کا انتظام کر رکھیں گی کہ محکوم افراد کی فطری صلاحیتیں ابھرنے نہ پائیں۔ وہ ان صلاحیتوں کو صرف اسی حد تک نمود و بالیدگی کا موقع دینگی جس حد تک وہ ان کے نظام استبداد کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔ اگر وہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں تو فوراً پر کاٹ دیئے جائیں۔ فطرت کا قانون ہے کہ جن صلاحیتوں سے کچھ عرصہ تک کام نہ لیا جائے وہ رفتہ رفتہ معطل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد محکوم افراد ان صلاحیتوں سے عاری ہو جاتے ہیں اور حاکم قوم کی مشینری کے پرزے بن کے رہ جاتے ہیں، جن میں نہ اپنا اختیار ہوتا ہے نہ ارادہ، نہ رائے ہوتی ہے نہ فکر۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ قرآن اس استبداد کو نوعِ انسانی کے خلاف سب سے بڑا جرم قرار دیتا ہے، اور اُس کی دعوتِ انقلاب کی غایت یہ ہے کہ دنیا سے اس ظلم عظیم کو مٹا کر ایسا نظام نافذ کیا جائے، جس میں ہر انسان کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے، بڑھنے، پھولنے پھلنے کا پورا پورا موقع ملے۔ اسی کو وہ عدل کہتا ہے۔ چنانچہ وہ نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ قرار دیتا ہے کہ آپ ان زنجیروں کو توڑینگے جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی، اور ان بوجھوں کو اُتار پھینکیں گے جن کے نیچے اس کی صلاحیتیں دبی ہوئی تھیں۔

غلامی سے آزادی

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ

فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۠ (۷/۱۵۷)

جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمّی ہوگا، اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات و انجیل میں لکھی پائیں گے، وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہونگے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے، تو جو لوگ اس پر ایمان لائے۔ اس کے مخالفوں کے لئے روک ہوئے (راہ حق میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہو لئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں!

ان اطواق و سلاسل کی ایک شکل تو مستبدانہ ملوکیت تھی، لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ گراں نشین و محکم گیر صورت، معتقدانہ برہمنیت (یعنی اعتقادی روحانیت) تھی۔ ملوکیت کے آہنی شکنجوں کی گرفت انسان کے جسم تک محدود ہوتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنی روح کو ان سے آزاد رکھ سکتا ہے۔ لیکن روحانیت کی غلامی کی جڑیں انسان کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتی ہیں۔ استبدادی زنجیروں کے لئے ارباب حکومت کو یہ اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ ان کی کڑیاں کمزور اور گسستہ نہ ہو جائیں۔ لیکن روحانیت کی زنجیروں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر ان کی ایک کڑی بھی مضمحل ہو جائے تو یہ بندۂ بے دام اِن بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے ایک ایک کرکے اُٹھاتا اور تقدس کے ہاتھوں سے جوڑ کر پھر سے گلے میں پہن لیتا ہے، جسمانی غلام کو اگر اس کا آقا کہدے کہ جا تو آزاد ہے تو وہ خوشی کے ترانے گاتا اس جیل خانہ سے طرارے بھرتا ہوا نکل جاتا ہے اور پیچھے مڑکر دیکھتا تک نہیں کہ کوئی واپسی کا اشارہ نہ کر دے لیکن اگر کوئی پیر اپنے مُرید سے کہدے کہ جاؤ میں تجھے اپنے حلقۂ ارادت سے الگ کرتا ہوں تو اس پر یہ گھڑی قیامت کی ہوتی ہے۔ وہ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، التجائیں کرتا ہے کہ حضور! مجھے اپنی کفش برداری کی سعادت سے محروم نہ کیجئے۔ مجھے اس سنگ آستاں پر جبہ سائی کے شرف سے تہی دامن نہ کیجئے۔ میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ میری دنیا اور عاقبت خراب ہو جائے گی۔ میں دونوں جہانوں میں راندۂ درگاہ ہو جاؤں گا۔ میں ہر جگہ ملعون و مرجوم قرار پاؤں گا۔ میرے آقا مجھ پر رحم کیجئے! مجھے اپنے حلقۂ غلامی سے آزاد نہ کیجئے۔ میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا، میرے لئے دنیا میں کوئی آسرا باقی نہیں رہیگا۔

برہمنیت

اگر آپ میں احساس انسانیت کی کوئی رمق باقی ہے تو مستبد قوتوں کے احکام کی تعمیل آپ بہ جبرو اکراہ کرتے ہیں، آپ کی روح اس سے ابا کر سکتی ہے۔ آپ کے دل میں بغاوت کے آثار نمودار ہو سکتے ہیں لیکن باب روحانیت سے صادر شدہ فیصلوں کے خلاف اگر آپ کے دل کی گہرائیوں میں کہیں ناخوشگواری کا احساس تک پیدا ہو گیا تو آپ ڈرتے ہیں، کپکپاتے ہیں، خوف کھاتے ہیں کہ نہ معلوم حضرت قبلۂ عالمیان کی نگہ عتاب آلود کیا قیامت برپا کر دے؟ اس لئے کہ آپ کا عقیدہ ہے کہ پیر صاحب دل کے حالات تک سے واقف اور نگاہوں کی لغزشوں تک سے باخبر ہوتے ہیں۔ اگر ان کا کوئی حکم دین و دانش اور فراست و بصیرت کے کھلا ہوا خلاف بھی ہو تو بھی آپ یہ کہہ کر بلا چون و چرا اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

کہ سالک بے خبر نبود، ز راہ و رسم منزلہا

غور کیجئے کہ مستبدانہ ملوکیت اور معتقدانہ روحانیت کی مملکت میں حدیث فکر، اور آزادی رائے کس طرح باقی رہ سکتی ہے؟ اور ایسا ماحول انسانی صلاحیتوں کو اذن برومندی کس طرح دے سکتا ہے؟ یہی وہ غلامی کی زنجیریں تھیں جنھیں توڑنے کے لئے نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی، اور آپ نے دنیا کو قرآن کا پیغام انقلاب آفریں دیا۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

اب نبی اکرمؐ کی مختلف حیثیتوں پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے آپ خدا کے رسول ہیں جن پر ایمان لانا شرط اسلام ہے۔ فرمائیے کہ روحانی اقتدار کا اس سے زیادہ بلند مقام بھی کوئی ہو سکتا ہے؟ پھر آپ ایک عظیم الشان سلطنت کے "حاکم اعلیٰ" بھی ہیں اور حاکم بھی اس انداز کے کہ آپ کے فیصلوں سے روگردانی تو ایک طرف، ان کے خلاف دل میں کبیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ہی آپ کا فریضہ یہ بھی ہے کہ اپنی جماعت (ملت) میں حریت فکر و عمل پیدا کی جائے، اور اس انداز سے کہ ان کی تمام فطری صلاحیتیں نشو و ارتقا کی انتہائی بلندیوں تک جا پہنچیں۔ غور کیجئے کہ یہ تینوں حیثیتیں (یا کم از کم پہلی دو کے مقابلہ میں یہ تیسرا فریضۂ حیات) کس قدر باہمدگر متخالف و متضاد ہیں۔ انسان موٹر کار (یا اسی قسم کی کوئی اور مشین) نہیں کہ اسے آگے چلایا جائے تو پیچھے کی طرف سے جانے والے تمام پرزے خود بخود معطل ہو جائیں، انسانی شخصیت کے تمام پہلو بیک وقت کام کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ایک استاد کے اپنے بچے بالعموم نالائق کیوں رہ جاتے ہیں؟ اور ایک سپہ سالار کی عائلی زندگی کیوں عام طور پر

کامیاب نہیں ہوتی؟ اس لئے کہ ایک معلم کا فریضہ جس نظم وضبط کا متقاضی ہوتا ہے پدری محبت اُس کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے، اور ایک سپہ سالار گھر میں بھی وہی نظامِ عسکریت رائج کرنا چاہتا ہے جس میں کوئی لچک نہیں ہوتی، اور عائلی زندگی کی کامیابی کا راز لچک اور سمائی (Accommodating Spirit) میں ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف تقاضوں اور فریضوں میں امتیاز قائم کرنا، اور ان فاصل حدود کو عمر بھر اپنی اپنی جگہ پر رکھنا، بڑا دشوار ہے۔ کوئی غیر معمولی شخصیت ہی اس کی اہل ہو سکتی ہے۔ جذبات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچکر بھی دانش وبینش کے تقاضوں کو نظر انداز نہ ہونے دینا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

رسول کی زندگی کی عظمت کا راز ہی اس میں ہے کہ وہ اتباع واطاعت کے اتنے بڑے نظام کو قائم رکھے ہوئے انسان کی فطری صلاحیتوں اور حریت وخودی کی استعدادوں کو کہیں بھی کچلے نہیں جانے دیتا، اس لئے کہ اس نظام میں اطاعت وانقیاد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص کو اس اطاعت میں اپنے فطری تقاضوں کی تسکین کا سامان نظر آتا ہے۔ جیسے دھوپ میں چلنے والے مسافر سے کہہ دیا جائے کہ جلدی سے اس درخت کے سائے میں آبیٹھو تو وہ اس "حکم" کی تعمیل میں کوئی گرانی محسوس نہیں کرے گا بلکہ اُسے نظر آئیگا کہ اس کی اپنی فطرت کی آواز تھی جس پر وہ عمل پیرا ہوا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۝ (22/78)

اس نے تمہارے لئے دین میں کوئی گرانی نہیں رکھی۔

کا[1] یہی مفہوم ہے۔

فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں — جز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی، دینِ تو مجبوری است — ایں چنیں دیں، از خدا مہجوری است

بشریت رسول

اس اہم اور نازک فریضہ کی ادائیگی کے لئے سب سے پہلے رسول کی بشریت کو اس درجہ نمایاں طور پر سامنے لایا جاتا ہے کہ وہ جماعت کو محسوس کرا دیتا ہے کہ وہ انہی میں سے ایک ہے۔ کوئی مافوق البشر ہستی نہیں ہے قرآن کریم کی آیات پر غائر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کس قدر عنوانات مختلفہ اور اسالیب متنوعہ سے اس گوشے کو بار بار سامنے لایا گیا ہے۔

[1] تفصیل اس اجمال کی معارف القرآن جلد دوم (عنوانِ وحی) میں گذر چکی ہے۔

اُنھیں بتایا جاتا ہے کہ رسولؐ انھیں میں سے ایک آدمی ہے۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ○ (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہوا کہ اُنہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ اس بات کی وحی، کہ لوگوں کو (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کردے، اور ایمان والوں کو خوشخبری دیدے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے؟ کافروں نے کہا، بلاشبہ یہ شخص جادوگر ہے، کھلا جادوگر!

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ○ (۹/۱۲۸)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تمھارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا ہے، جو تم ہی میں سے ہے۔ تمھارا رنج و کلفت میں پڑنا اُس پر بہت شاق گذرتا ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے!

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ○

(۱۸/۱۱۰ نیز ۴۱/۶)

(اے پیغمبر اسلام!) کہہ دے "میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمھارا معبود وہی ایک ہے، اُس کے سوا کوئی نہیں" پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے، تو چاہیئے کہ اچھے کام انجام دے اور اپنے پروردگار کی (اطاعت و محکومیت) عبدیت میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے، (بس اس کے سوا میری کوئی پکار نہیں)

جو عام لوگوں کی طرح رہتا، سہتا، کھاتا، پیتا، چلتا، پھرتا ہے تمھیں زمین کی اور اپنے آپ کو آسمان کی مخلوق نہیں سمجھتا۔

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ○ (۲۵/۷ نیز ۲۵/۲۰)

اور (یہ منکرین حق یوں) کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ تو ہماری ہی طرح کھانا کھاتا، اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی ڈرانے والا فرشتہ بھیج دیا جاتا؟ (تاکہ وہ لوگوں کو ڈراتا دھمکاتا!)

عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، اور پھر اپنی مدتِ حیات ختم کر کے وفات پا جائے گا۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ○ (۲۱/۳۴ نیز ۳۹/۳۰)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی آدمی کو ہمیشگی نہیں دی (اور نہ تیرے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ہے) پھر اگر تجھے مرنا ہے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟

نہ اس کی پیدائش میں کوئی چیز خارقِ عادت، نہ زندگی میں کوئی انوکھا پن۔ اور نہ ہی موت میں کچھ مافوق البشریت۔ نہ اس کے پاس کچھ غیبی خزانے ہیں، نہ ہی یہ علم غیب رکھتا ہے[1]۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ○ (۶/۵۰)

(اے پیغمبر اسلام! ان لوگوں سے) کہہ دو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا جاننے والا ہوں۔ نہ میرا یہ کہنا ہے کہ میں (انسانیت سے ماوراء) فرشتہ ہوں۔ میری حیثیت تو فقط یہ ہے کہ اُسی بات پر چلتا ہوں جس کی خدا نے مجھ پر وحی کر دی ہے" (اور اسی کی طرف تمہیں بھی بلاتا ہوں۔ پھر ان سے پوچھو "کیا وہ جو اندھا ہے (اور حقیقت کے لئے کوئی علم و یقین نہیں رکھتا) اور وہ جو بینا ہے (کہ حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟"

قوانین فطرت کے کاروبار میں اسے کچھ دخل نہیں۔ اس لئے اور تو اور یہ اپنے لئے بھی نفع اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ بجز اس اختیار و ارادہ کے جو دوسرے انسانوں کو دیا گیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (۷/۱۸۸ نیز ۱۰/۴۹، ۷۲/۲۱-۲۲)

[1] تفصیل جلد اوّل عنوان علم الٰہی میں گذر چکی ہے۔

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو "میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں نہیں رکھتا۔ وُہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔ میں اس کے سوا کیا کہوں کہ ماننے والوں کے لئے خبردار کر دینے والا اور بشارت دینے والا ہوں"

اس کا کام راستہ دکھا دینا ہے کسی کے دل کو بدل کر اسے راستہ پر لگا دینا بھی اس کے اختیار میں نہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ○ (۲۸/۵۶)

(اے پیغمبر اسلام!) تم اس کی قدرت نہیں رکھتے کہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہو لا سکو؟ لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے اور وہی ہدایت پانے والوں کو جاننا بھی ہے۔ (کہ کون ہدایت پانے والا ہے اور کون نہیں؟)

حتیٰ کہ تمہارے قلوب میں ائتلاف پیدا کر کے جو جماعتی یک رنگی پیدا کر دی ہے تو یہ بھی خدائے مقلب القلوب ہی نے کیا ہے۔

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○ (۸/۶۳)

اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی۔ (اے پیغمبر!) اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے، جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا لیکن یہ اللہ ہی ہے جس نے ان میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے!

یہ خود ہمارے لئے (اور نہ ہی اپنے لئے) کسی چیز کو حلال قرار دے سکتا ہے نہ حرام؟ حلت و حرمت کے لئے اسے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۶/۱۴۵)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو "جو وحی مجھ پر بھیجی گئی ہے۔ میں، اُس میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا کہ کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو۔ اِلّا یہ کہ مُردار ہو، یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو

کہ یہ چیزیں بلاشبہ رجس ہیں، یا پھر جو چیز موجب معصیت ہو کہ غیر خدا کا نام اس پر پکارا گیا ہو،
(تو بلاشبہ وہ بھی حرام ہے) پھر اگر کوئی آدمی (حلال چیز نہ ملنے کی وجہ سے) مجبور ہو جائے اور
مقصود نافرمانی نہ ہو، نہ حد ضرورت سے گذر جانا (اور وہ جان بچانے کے لئے ان حرام
چیزوں میں سے کچھ کھالے) تو بلاشبہ تمہارا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے!

اس لئے کہ یہ انسان کو اپنا غلام و محکوم بنانے نہیں آیا، بلکہ خدا کے احکام کی اطاعت کرانے آیا ہے -

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا
عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ
بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اُسے (انسانوں کی ہدایت کے لئے) کتاب، اور "حکومت"
اور نبوت، عطا فرمائے، اور پھر وہ الٹا لوگوں سے کہے، خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی
خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرنے لگ جاؤ) بلکہ چاہئے کہ ربانی انسان (یعنی
قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے والے) بنو اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو، اور اس لئے
کہ تم اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

پھر یہ بھی یاد رکھو کہ یہ نظام کچھ اس کی زندگی ہی تک محدود نہیں کہ اس کی وفات کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ
انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ط وَ
سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۴)

اور محمد اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گذر چکے
ہیں (جو اپنے اپنے وقتوں میں ظاہر ہوئے، اور راہِ حق کی دعوت دے کر دنیا سے چلے گئے)
پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پائیں (اور بہرحال انھیں ایک دن وفات پانا ہے) یا (فرض کرو)
ایسا ہو کہ وہ قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں راہِ حق سے پھر جاؤ گے، (اور ان کے مرنے کے
ساتھ ہی تمہاری حق پسندی بھی ختم ہو جائے گی؟) اور جو کوئی راہ حق سے الٹے پاؤں پھر جائیگا
تو وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور جو لوگ شکر گذار ہیں (یعنی نعمت
حق کی قدر دانی کرنے والے ہیں) تو قریب ہے کہ خدا انھیں ان کا اجر عطا فرمائے!

اس آیت مقدسہ کو سرسری طور پر دیکھ کر نہ گذر جائیے، یہ دین کے بہت بڑے اصول کی حامل ہے۔ غور کیجئے!

اس میں کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ دین میں شخصیت پرستی کو کوئی دخل نہیں۔ اور تو اور، خود ذات رسالت مآبؐ کہ جن کے متعلق ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

نظام دین میں اس ذاتِ اقدس و اعظم کی بھی ذاتی حیثیت (Personal capacity) بجز ایں نیست کہ وہ خدا کے پیغامبر، اور مرکزِ ملت ہیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، یہ پیغامِ خداوندی (یعنی قرآن کریم) اپنی اصل شکل میں قیامت تک باقی رہیگا۔ (کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے) اسی لئے حضورؐ کی رسالت بھی قیامت تک باقی رہے گی۔ باقی رہا منصبِ مرکزِ ملت۔ سو یہ ملت کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اور سلسلہ بہ سلسلہ آگے چلے گا۔ لہٰذا نظام دین کا انحصار کسی شخصیت پر نہیں۔ اسی حقیقت کبریٰ کو متعلمین بارگاہ رسالت، یعنی صحابہ کرامؓ نے کس وضاحت سے سمجھ لیا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے، جو حضورؐ کی وفات کے وقت پیش آیا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وفات نے اس زمرۂ عشاقِ نبوت میں محشر بپا کر دیا ہوگا۔ لیکن عین اس حشر بداماں سانحہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ منبر پر تشریف لائے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

اَیُّھَا النَّاس من کان یعبد محمدؐ فانہ قد مات ومن کان یعبد اللہ فانہٗ حیٌّ لا یموت

اے لوگو! جو شخص محمدؐ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا وہ جان لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے لیکن جو اللہ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ زندہ ہے اُسے کبھی موت نہیں آئیگی۔

اس کے بعد آپ نے وہ آیت پڑھی جو اوپر درج کی جا چکی ہے (وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کی ماہیت، حضورؐ کی صحیح صحیح پوزیشن، اور اس تعلیم و تربیت کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لئے جو حضورؐ نے اپنی جماعت کو دی، اربابِ بصیرت کے لئے صرف یہ ایک واقعہ ہی کافی ہے۔

حضورؐ کا ذاتی اجتہاد

پھر قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا کہ جن معاملات میں حضورؐ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا کرتے تھے ان فیصلوں میں غلطی کا بھی امکان تھا۔ چنانچہ کئی ایک ایسے مواقع پر قرآن میں تادیب بھی آئی ہے۔ مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضورؐ کے فیصلہ پر حکم آیا کہ

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۸/۶۷)

نبی کے لئے سزاوار نہیں کہ اُس کے قبضہ میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرلے، (مسلمانو!) تم دنیا کی متاع چاہتے ہو، اور اللہ چاہتا ہے (تمھیں) آخرت (کا اجر دے) اور اللہ غالب ہے حکمت والا!

جنگ تبوک میں جن لوگوں کی درخواست پر حضورؐ نے انھیں عدم شمولیت کی اجازت دے دی تھی اُن کے متعلق ارشاد ہوا کہ

عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ ۝ (۹/۴۳)

(اے پیغمبر اسلام!) اللہ تجھے معاف کرے! تو نے ایسا کیوں کیا کہ (ان کی منافقانہ عذرداریوں پر) انھیں (پیچھے رہ جانے کی) رخصت دے دی؟ اس وقت تک رخصت نہ دی ہوتی کہ تجھ پر کھل جاتا کون سچے ہیں؟ اور تو معلوم کرلیتا کون جھوٹے ہیں؟

آپ نے ایک مرتبہ ایک خاص قسم کا شہد نہ کھانے کا عہد کیا تو اس پر حکم آیا کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۶۶/۱)

اے پیغمبر اسلام! جو چیز تم پر اللہ نے حلال کر رکھی ہے اس کو قسم کھا کر) خود پر کیوں حرام کرتے ہو؟ (کیا) اپنی بی بیوں کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے؟ اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے!

آپ کے نابینا صحابی (ابن مکتومؓ) کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے، جن کا قریش کی مجلس میں آنا آپ پر گراں گذرا تھا۔ اس پر فوراً زبانِ وحی سے تادیب آگئی کہ

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ ۝ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ ۝ (۸۰/۱-۲)

(پیغمبر) چین بہ جبیں ہوگیا اور متوجہ نہ ہوا اس لئے کہ اُس کے پاس ایک اندھا آیا۔

ان واقعات کا قرآن نے اس لئے ذکر کیا ہے کہ حضورؐ کی عبدیت اور بشریت نکھر کر سامنے آجائے اس ضمن میں حضورؐ سے ارشاد ہوا کہ وہ لوگوں پر اس حقیقت کو واضح کر دیں کہ ۔

قُلْ إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي ۚ

اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ۝ (۳۴/۵۰)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو کہ "اگر میں (بھی بفرضِ محال) گمراہ ہو جاؤں تو میری بے راہ روی مجھ پر ہی (وبال بن کر) پڑے گی۔ اور اگر میں ہدایت پا جاؤں (تو بھی اس میں میری کچھ بڑائی نہیں، بلکہ یہ ہدایت) اس وحی (آسمانی) کی بدولت ہوگی، جو میرا پروردگار مجھ پر نازل کرتا ہے"۔ بلاشبہ وہ (سب کچھ) سننے والا۔ اور بہت قربت رکھنے والا ہے!

اس کی عملی تائید

یہ قرآنی احکام تھے جن کی عملی تفسیر نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک گوشے میں ملتی ہے۔ شروع سے اخیر تک، ہر مرحلہ اور ہر منزل میں۔ بعثت کے ابتدائی ایام کا ذکر ہے کہ آپ کے چچا ابو طالب بیمار ہو گئے۔ انہوں نے آپ سے دعاءِ صحت کی درخواست کی۔ آپ نے دعا کی، وہ اچھے ہو گئے، انھوں نے کہا کہ بھتیجے! خدا تیرا کہنا مانتا ہے۔ اب دیکھئے۔ یہ موقع ایسا تھا کہ ابو طالب کے ذہن پر اپنے روحانی تفوق، قرب الی اللہ، اور ما فوق البشریت کا تصوّر نہایت آسانی سے قائم کیا جا سکتا تھا لیکن حضورؐ نے نہایت سادگی سے فرمایا کہ اس میں میری خصوصیت نہیں۔ اگر آپ بھی خدا کا کہنا ماننے لگ جائیں، تو خدا آپ کا کہنا مان لے۔

اور بعثت کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادہ (ابراہیم) نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اسی روز سورج گرہن لگا[1]۔ وہ تو خیر پھر بھی عرب کا ملک تھا اور آج سے چودہ سو سال پہلے کا زمانہ۔ اس قسم کا واقعہ اگر آج بھی کسی روحانی پیشوا کے متعلق رونما ہو جائے تو لوگ فوراً دستِ عقیدت آگے بڑھا دیں، اور اس کی عام شہرت ہو جائے۔ لوگوں نے اس قسم کا خیال ظاہر کیا کہ آپ کے غم میں اجرام سماوی نے سیاہ کپڑے پہن لئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ روحانی تسلّط جمانے کے لئے اس قسم کے واقعہ سے نہایت عمدہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن حضورؐ نے از خود لوگوں کو جمع کیا اور نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ "سورج اور چاند گرہن فطرت کے قوانین کے تابع لگتا ہے۔ اسے کسی کی زندگی اور موت سے کچھ واسطہ نہیں"۔

توہم پرستی کا استیصال

توہم پرستی کو مذہب کا جزو سا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے کسی مذہب کو لیجئے اس میں اوہام پرستی کا کوئی نہ کوئی شائبہ ضرور ملے گا، اور اسے مذہبی تقدس حاصل ہوگا لیکن قرآن نے جو دین پیش کیا اس کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت[1] تھی [دیکھئے (۱۲/۱۰۸)] اس لئے اس میں توہم پرستی کی کہیں کوئی گنجائش نہ تھی۔ توہم پرستی انسانی عقل و دانش میں تعطل اور فہم و بصیرت میں جمود پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے نبی اکرمؐ نے ہر قسم کی توہم پرستی کا استیصال کر دیا۔ اور اس ملک اور قوم

[1] معجزات کا بیان ذرا آگے چل کر آئیگا۔

سے جن کے رگ وریشہ میں اوہام پرستی سرایت کر چکی تھی۔ عرب میں غیب دانی کے مدعی کاہن قدم قدم پر دامِ تزویر بچھائے رہتے تھے۔ آپ نے تاکیداً ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کاہنوں کے پاس نہ جایا کرے۔ عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے۔ (حتیٰ کہ رسول کو بھی غیب کا علم نہیں ہوتا) کہانت کے علاوہ وہاں فال لینے کا بھی بڑا رواج تھا۔ آپ نے فرمایا کہ فال لینا وہم ہے، اس سے انسان کو اپنے ارادہ سے باز نہیں رہنا چاہئے۔ غور فرمائیے! انسانی اختیار اور ارادے کی اہمیت کو کس قدر واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح (ابوداؤد کی ایک روایت کے مطابق) حضور نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک، گنڈہ، تعویذ، شرک ہیں۔

غیر امتیازی وضعِ زندگی

آپ نے اپنی زندگی اس قدر سادہ رکھی تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی آپ کو اپنے میں سے محسوس کرتا تھا۔ تراش خراش، وضع قطع، لباس، خوراک، کسی چیز میں بھی کوئی امتیازی خصوصیت اختیار نہیں فرمائی، وہی اپنے زمانہ کی معاشرت، انہی عربوں کی سی زندگی جن میں آپ پیدا ہوئے۔ نہ روحانی تقدس کا کوئی امتیازی نشان، نہ بادشاہت اور حکومت کی کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت۔ ہمارے یہاں فرق مناصب و مدارج کی کوئی نہ کوئی امتیازی علامت ضرور دکھائی دے گی، جو صاحبِ منصب کو اور انسانوں سے الگ کر کے دکھلا دے۔ یہ تو دنیاوی وجاہت کا حال ہے، روحانی قیادت میں اس سے بھی بڑھ کر امتیازات کی دنیا قائم ہے۔ وہاں لباس، تراش، وضع قطع، چال ڈھال، نشست برخاست، ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں ایک خصوصیت پیدا کی جاتی ہے، تاکہ یہ لوگ کسی اور دنیا کی مخلوق دکھائی دیں۔ اربابِ شریعت کو دیکھئے تو عام انسانوں سے بالکل الگ تھلگ دکھائی دیں گے۔ عابدِ طریقت کے طائفہ مقدسہ پر نگاہ ڈالئے تو وہاں ایک نرالی دنیا دکھائی دے گی۔ کسی شیخ طریقت کی مجلس میں جائیے۔ حضرت صاحب کی کیفیت یہ ہوگی کہ بت بنے بیٹھے ہیں۔ اپنے بدن سے مکھی تک بھی آپ نہیں اڑاتے۔ اس کے لئے بھی ایک خادم مورچھل بردار کھڑا ہوگا۔ اگر اٹھتے ہیں تو کوئی بیس خدام حلقہ گیر ہوں گے، کوئی جوتہ پہنا رہا ہے، کوئی عصا تھا رہا ہے، کوئی راستہ صاف کر رہا ہے، کچھ سر جھکائے دائیں بائیں جلو میں جا رہے ہیں۔ باقی پیچھے پیچھے خاموش چل رہے ہیں۔ انھوں نے ذرا گردن ایک طرف کو موڑی تو دس خدام سمع ارشاد کے لئے آگے بڑھ گئے۔ لیکن ایک اور مجلس ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس میں "روحانی قیادت" کی یہ کیفیت ہے کہ قیامت

معاشرتِ نبوی

تک کے مسلمان اس پر ایمان لانے کے لئے مکلّف ہیں۔ دنیوی حکومت کا یہ عالم ہے کہ ایک سلطنت کے مالک ہیں۔ لیکن سادگی کا یہ عالم ہے کہ اپنا جوتہ آپ مرمت کر رہے ہیں۔ ایک صحابی عرض کرتے ہیں کہ حضور لائیے میں ٹانک دوں، تو فرماتے

ہیں کہ یہ تشخص پسندی ہے جو مجھے مرغوب نہیں۔ گھر میں اپنے کام کاج خود کرتے ہیں مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر، اور خندق کے کھودنے میں عام مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں دعوت کا سامان تھا سب نے کام بانٹ لیئے، آپ نے فرمایا کہ جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا صحابہ نے تامل کیا تو فرمایا کہ میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔ غذوۂ بدر میں سواریاں کم تھیں اس لئے باری باری سے اونٹوں پر چڑھتے اترتے تھے۔ حضورؐ بھی دوسروں کی طرح ایک اونٹ کے ساتھ دو آدمیوں میں شریک تھے۔ جاں نثار ہمراہی اپنی باری حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے تو آپ فرماتے کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ چل سکتے ہو، اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔ غذوۂ خیبر میں جب آپ کا داخلہ ہوا تو آپ ایک عام گدھے پر سوار تھے، جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی۔ جناب ابن ارث ایک صحابی تھے جنھیں حضورؐ نے کسی غذوہ پر بھیجا۔ ان کے گھر میں پیچھے کوئی مرد نہ تھا، اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا۔ آپ ہر روز ان کے گھر جاتے، اور دودھ دوہ آیا کرتے۔ برابر کے صحابی تو ایک طرف، مدینہ کی لونڈیاں آپ کی خدمت میں آتیں اور جو کام کہتیں حضورؐ اٹھ کر کر دیتے۔ مدینہ کی بیوائیں اور مساکین سب اطمینان سے رہتے تھے کہ ان کے کام حضورؐ نے اپنے ذمّے لے رکھے تھے مجلس میں اپنے لئے کوئی امتیازی مقام متعین نہیں فرمایا تھا ایک مرتبہ صحابہ نے اس خیال سے کہ باہر سے آنے والوں (بالخصوص دوسری سلطنت کے سفیروں) کو حضورؐ کے پہچاننے میں دقّت ہوتی ہے، صدر میں ذرا سی اونچی نشست بنادی، تو حضورؐ سخت برافروختہ ہوئے اور اسے فوراً گرادیا۔ مزدلفہ میں قریشی دوسروں سے ممتاز جگہوں پر بیٹھتے تھے۔ صحابہ نے چاہا کہ آپ کے لئے ایک طرف چھوٹا سا چھپر ڈال دیا جائے۔ آپ نے اس سے منع فرمادیا اور کہا کہ کسی مقام پر کسی کا خاص حق نہیں۔ جو جہاں پہلے پہنچ جائے وہ اسی کی جگہ ہے۔ تخاطب میں بھی کوئی امتیازی لقب پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو مخاطب کر کے سیدنا[صلہ] کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ تقویٰ کی راہ اختیار کرو، شیطان تمھیں تمھارے مقام سے گرا نہ دے۔ میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول۔ ایک مرتبہ حضورؐ تشریف لائے تو صحابہ تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ فرمایا کہ یہ عجمیوں کا دستور ہے ایسا نہ کیا کرو۔ حضرت قیس بن سعدؓ نے ایک مرتبہ حضورؐ سے کہا میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو تعظیماً سجدہ کرتے تھے آپ اس سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس پر آپ نے اس کی سخت ممانعت فرمائی۔ جو ذات گرامیؐ تعظیم کے لئے کھڑا ہونا پسند نہ کرے، وہ خدا بن کر لوگوں سے سجدے کس طرح کرا سکتی تھی؟ (البتہ محبت کے لئے آپ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ حضرت

[صلہ] آج اپنے آپ کو فخر سے سید کہلوانے والے ذرا اسے غور سے دیکھیں۔

فاطمہؓ تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے اور جوشِ محبت میں بیٹی کا ہاتھ چوم لیتے) یہ بظاہر چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں لیکن انسانی سیرت کا صحیح اندازہ تو چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہی لگا کرتا ہے۔ بڑے بڑے واقعات میں تو تصنع کا بھی امکان ہوتا ہے۔ انسان کی صحیح زندگی کی جھلک روزمرّہ کے معمولی کام کاج میں نظر آیا کرتی ہے۔ یہ سادگی، اور عدم تمیز و افضلیت اس تعلیم کا جزو تھی جس سے آپ اپنی جماعت کے دلوں سے "تمیزِ بندہ و آقا" کا طاغوتی خوف دور کر کے ان میں صحیح جذبہ حریت و روح آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا تو نبوت کے رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں! میں فرشتہ نہیں ہوں، کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہوں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

واضح رہے کہ حضورؐ کی یہ سادگی اور فروتنی، مفلسی کے ادبار یا مذہبی تقشف کی بنا پر نہیں تھی۔ آپ ایک سلطنت کے مالک تھے، اس لئے افلاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کی یہ سادگی استغنا کا فقر (یا فقر کا استغنا) تھا جس سے مفہوم یہ ہے کہ سب کچھ رکھتے ہوئے اس سے شانِ بے نیازی پیدا ہو جائے۔ نہ ہی یہ رہبانیت تھی کہ حضورؐ رہبانیت کو مٹانے آئے تھے، مفلسی، جس میں انسان اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کا دست نگر ہو جائے، خدا کا عذاب ہے، اور حضورؐ کے ارشاد کے مطابق سواد الوجہ فی الدارین (دنیا اور آخرت میں روسیاہی کا موجب) اسی لئے جن باتوں پر حضورؐ بیعت لیتے تھے ان میں ایک یہ بھی تھی کہ لاتسئلوا الناس شیئًا۔ (لوگوں سے سوال مت کرنا) کہ سوال کرنے سے انسان کی خودی مٹی میں مل جاتی ہے اور وہ شرفِ انسانیت کے رفیع و وقیع مقام سے ضعفِ خودی کی پستیوں میں گر جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ ہے اس نے کہا کہ ایک بچھونا ہے اور ایک پانی پینے کا پیالہ۔ آپ نے دونوں چیزیں منگالیں اور دو درہم میں فروخت کر دیں۔ ایک درہم کا کھانا اس کے گھر بھیج دیا، اور ایک درہم کی رسی منگا کر اسے دیدی، کہ جاؤ جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچا کرو۔ کچھ دنوں کے بعد وہ آیا تو اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے۔ آپ اس سے بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ حضورؐ کا معمول تھا کہ اگر کسی میت پر کچھ قرض ہوتا تو اسکی نمازِ جنازہ میں شرکت نہ فرماتے۔ صحابہ سے کہتے کہ تم جنازہ کی نماز پڑھاؤ۔ مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز، اور اس کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے۔

بے نیازی ناز ہا دارد بسے ناز ہا انداز ہا دارد بسے

چوں حباب، از غیرتِ مردانہ باش ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

اس میں شبہ نہیں کہ روایات میں ہمارے سامنے ایسے واقعات بھی آتے ہیں کہ حضورؐ کو دو، دو، دن کا فاقہ ہے، گھر میں بھی کچھ نہیں، کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے ہیں، گھر میں کچھ ساز و سامان نہیں۔ بظاہر بڑے عسر اور افلاس کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ چنانچہ انہی روایات کو ہمارے دُوز بخنی کے معلّم حضرات نکبت و زبوں حالی کی مدح و ستائش میں بطور اسناد پیش کر دیتے ہیں، اور خدا سے نہیں ڈرتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟

مفلسی و محتاجی نہیں

حضورؐ کی یہ بے ساز و سامانی استغنار کا فقر تھا، بادشاہت کی بے نیازی تھی، افلاس کے فاقے، اور فلاکت کا عُسر نہ تھا۔ استطاعت کے باوجود خاکساری، یہ قابل ستائش ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن از روئے فروتنی انھیں نہیں پہنتا۔ خدا قیامت میں اسے ایمان کا پسندیدہ حُلّہ عطا کرے گا۔ ترمذی ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے لوگوں کو غرور و تکبر سے منع کیا۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے اچھا کپڑا، اور اچھا جوتا بہت پسند ہے، یہ تو غرور نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خدا جمال کو پسند کرتا ہے۔ غرور یہ ہے کہ حق سے انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔ پھر یہ فروتنی اور سادگی بخل کی بنا پر بھی نہ ہونی چاہیے۔ ابو داؤد کی ایک روایت ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں نہایت کم حیثیت کے کپڑے پہن کر آیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ مال تمھارے پاس ہے۔ اس نے کہا کہ اونٹ، گھوڑے، مال، مویشی، سب کچھ ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جب خدا نے تمھیں مال عطا کیا ہے تو اس کے فضل و احسان کا اثر تمھارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔

پھر جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے حضورؐ کی یہ سادگی اور بے نیازی، رہبانیت اور تقشف کی بنا پر بھی نہ تھی۔ ایک دفعہ دو صحابی خدمت میں آئے، اور کہا کہ ہم میں سے ایک نے ترکِ حیوانات کا عزم کر رکھا ہے؛

نہ ہی مذہبی تقشف

اور دوسرے نے ترکِ نکاح کا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں۔ اس پر انہوں نے بھی اپنا عہد ترک کر دیا۔ قبیلۂ باہلہ کے ایک شخص کوئی سال بھر کے بعد حاضر خدمت ہوئے۔ ان کی صورت ایسی بدل چکی تھی کہ آپ پہچان نہ سکے۔ انھوں نے اپنا نام بتایا تو حضورؐ نے فرمایا کہ تم تو نہایت خوش چہرہ تھے، تمھاری صورت کیوں بگڑ گئی۔ انھوں نے کہا کہ جب سے آپ سے رخصت ہوا ہوں متصل روزے رکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اپنی جان کو عذاب میں کیوں ڈال رہے ہو؟ کسی سفر میں ایک صحابی کا گذر ایک غار پر سے ہوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں۔ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کیا کہ حضورؐ مجھے ایک ایسا اچھا غار مل گیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں موجود ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گزیں ہو جاؤں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ

میں یہودیت اور نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا۔ میں آسان اور سہل دینِ ابراہیمی لے کر آیا ہوں۔
تقدس کی بارگاہوں میں دیکھئے، جہاں کسی مخدوم کا پاؤں پڑ جائے تو اس خاک کو آنکھوں کا سُرمہ بنایا جاتا ہے۔ یہ وہی شخصیت پرستی ہے جو شرک کی طرف منجر ہوتی ہے۔ حضورؐ اس کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے کہ آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہونے لگ جائے۔ ایک مرتبہ آپ وضو کر رہے تھے، جو پانی گرا بعض لوگوں نے اسے تبرکاً بدن پر مل لیا۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کیوں کر رہے ہو؟ عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسولؐ کی محبت میں۔ فرمایا کہ خدا اور خدا کے رسولؐ کی محبت کے حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب بات کرے تو سچ بولے، امین بنایا جائے تو امانت ادا کرے، اور کسی کا پڑوسی ہو تو ہمسائیگی کو اچھی طرح نباہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو اثنائے گفتگو میں کہا کہ "جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں"۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیا کہہ دیا؟ تم نے مجھے خدا کا شریک و ہمسر ٹھہرا دیا۔ یہ کہو کہ "جو خدا چاہے" اور بس! ایک دفعہ ایک شادی کے موقعہ پر آپ تشریف فرما تھے، انصار کی لڑکیاں گا رہی تھیں، گاتے گاتے اُنھوں نے یہ گانا شروع کیا۔
فینا رسول یعلم مافی غد۔ ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے! آپ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو۔ وہی گائے جاؤ جو پہلے گاتی تھیں۔ بخاری میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں۔ میرے سامنے مقدمات آتے ہیں تو ایک فریق دوسرے فریق سے اپنے مدعا کو بہتر طریقہ پر

فیصلوں میں غلطی کا امکان

ادا کرنے والا ہوتا ہے، جس سے گمان ہو جاتا ہے کہ وہ سچا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ[1] دے دیتا ہوں۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو اس فیصلہ کے مطابق اپنا حصہ نہیں بلکہ دوسرے بھائی کا حصہ ملتا ہے تو وہ سمجھ لے کہ وہ آگ کا ٹکڑا ہے اب خواہ (قانونی استحقاق کے مطابق) اسے لے لے خواہ (بنا پر تقویٰ) اسے چھوڑ دے۔
اہلِ مدینہ نر کھجور کا مور، مادہ کھجور پر ڈالا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس گا بھا لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ اہلِ مدینہ نے اسے ارشادِ نبویؐ خیال کر کے گا بھا لگانا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درختوں پر پھل بہت کم آیا۔ اُنھوں نے اس باب میں حضورؐ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے قیاساً کہا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ ان معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ البتہ جب میں کوئی دین کے معاملہ میں

[1] پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اجتہاداتِ نبویؐ میں غلطی کا امکان ہوتا تھا اس لئے کہ حضورؐ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے، مگر درپیش کے احوال و ظروف پر نگہ رکھ کر استنباطِ نتائج کرتے تھے، اس لئے ان میں غلطی بھی ہو سکتی تھی۔ زیرِ نظر روایت اور اس کے بعد کا واقعہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے اور یہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق ہے جو پہلے درج کیا جا چکا ہے۔

فیصلہ دوں تو اس کی تعمیل فرض ہو جاتی ہے۔ غور کیجیے کہ آپ نے اپنی بشریت اور رسالت کی حیثیت کو کس طرح نمایاں طور پر الگ الگ کر کے بتا دیا ہے۔ حضورؐ کی تربیت یافتہ جماعت کی نگاہوں میں یہ تفریق

بشریت و رسالت کا فرق

اس قدر واضح تھی کہ جس معاملہ میں انھیں آپ سے اختلاف رائے ہوتا وہ فوراً دریافت کر لیتے کہ یہ وحی کا فیصلہ ہے یا حضورؐ کی ذاتی رائے۔ وحی کے فیصلے کے بعد کسی کو حق بحث و تمحیص باقی نہیں رہتا تھا۔ حتیٰ کہ خود رسول اللہؐ کو بھی نہیں لیکن اگر وہ حضورؐ کی اپنی رائے ہوتی تو حضورؐ کی تعلیم اس قدر جرأت آفریں، اور حریت آموز تھی کہ صحابہ بلا جھجک مزید استفسارات بھی کرتے اور پھر اپنی بے باکانہ رائے بھی دیتے۔ اور (اگر وہ امارت کا فیصلہ نہ ہوتا) تو اپنی ہی رائے پر عمل بھی کرتے۔ چنانچہ اس قسم کے اکثر واقعات کتب روایات میں موجود ہیں۔ غزوہ بدر میں آپ نے میدان کا انتخاب کر کے ڈیرے ڈال دینے کا حکم دیا۔ جب حضرت جناب کو معلوم ہوا تو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ فیصلہ وحی کی رو سے کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں یہ میری اپنی رائے ہے۔ تو حضرت جناب نے عرض کیا کہ پھر اس حکم کو بدل دیجئے۔ فلاں مقام اس مقام سے بہتر ہے، چنانچہ آپ نے ان کی رائے بہتر تسلیم کی۔ اور لشکر کو اُس طرف جانے کا حکم دے دیا۔

غزوۂ احزاب میں جب آپ نے غطفان سے صلح کرنا چاہی تو انصار نے عرض کیا کہ یہ فیصلہ اگر خدا کا حکم ہے تو مجال انکار نہیں لیکن اگر حضورؐ کی رائے ہے تو پھر ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کے عزم و استقلال کے پیش نظر اپنی رائے میں تبدیلی فرما لی۔ صحابہ تو ایک طرف مدینہ کی عورتوں (حتیٰ کہ لونڈیوں) تک کو یہ جرأت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ حضورؐ کے ارشادات پر استفسار کر لیا کرتی ہیں۔ بریرہ ایک لونڈی تھی جو بوجہ آزادی اپنے شوہر (مغیث) سے الگ ہو گئی تھی۔ حضورؐ نے اس سے مغیث کی زوجیت میں رہنے کی سفارش کی تو بریرہ نے عرض کیا کہ کیا آپ حکم دے رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں حکم تو نہیں۔ تو اُس نے کہا کہ پھر معاف فرمائیے، مجھے مغیث کی حاجت نہیں۔ (بہ روایت بخاری) خود قرآن کریم کی سورۂ مجادلہ میں ایک عورت (خولہ بنت ثعلبہ) کا ذکر موجود ہے جو اپنے خاوند کی قسم ظہار کے متعلق جھگڑا کر رہی تھی۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۵۸)

بیشک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے جھگڑ رہی تھی۔ اور (غم و غصہ میں) اللہ سے شکایت (بھی) کرتی جاتی تھی، اور اللہ تم دونوں کی تیز کلامی سن رہا تھا۔

بلاشبہ اللہ (سب کچھ) سننے والا (سب کچھ) دیکھنے والا ہے!

اس سے ظاہر ہے کہ مرد تو مرد، وہاں عورتوں کو بھی کس قدر آزادیٔ رائے حاصل تھی۔

جب مہاجرین مدینہ آئے تو انصار نے اپنے درخت انھیں دیدئے تھے جو ان کے لئے وجہ کفاف بنے۔ حضرت انس کی والدہ نے حضورؐ کو کچھ درخت دئے تھے جو آپ نے ام ایمن کو دے دئے تھے۔ بعد میں جب مہاجرین کی معاشی حالت درست ہوگئی تو تمام درخت انصار کو واپس کردئے گئے۔ حضورؐ نے بھی چاہا کہ ام سلیم کے درخت انھیں واپس دے دئے جائیں۔ اس لئے ام ایمن سے درختوں کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ لیکن ام ایمن نے درخت واپس دینے سے انکار کردیا، کیونکہ انھیں واپسی کی شرط پر نہیں دئے گئے تھے۔ رسول اللہؐ اس امانت کو ام سلیم کو واپس دینا چاہتے تھے لیکن ام ایمن سے زبردستی درخت واپس نہیں لے سکتے تھے۔ چنانچہ انھیں ایک ایک کے بدلے دس دس درخت دے کر وہ درخت واپس لئے۔

کسی شخص کی کچھ کھجوریں آپ کے ذمّے قرض تھیں۔ چند روز کے بعد وہ تقاضے کے لئے آیا۔ آپ نے ایک انصاری سے کھجوریں لے کر اسے واپس دیدیں، اس نے لینے سے انکار کردیا کہ یہ کھجوریں میری کھجوروں سے ناقص ہیں۔ انصاری نے اس سے کہا کہ یہ کیا ظلم کرتے ہو؟ رسول اللہؐ کی عطا فرمودہ کھجوریں واپس کر رہے ہو؟ اس نے کہا ہاں! اگر رسول اللہؐ ہی عدل نہ کریں گے تو اور کس سے عدل کی توقع کی جائیگی؟

حضورؐ نے سنا تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ ہاں! یہ سچ کہتا ہے۔

اللہ اکبر! عدل مانگنے میں کتنی آزادی تھی! اسی کا نام صحیح تربیت ہے۔

قرآن کریم کی رو سے مومنین کا جان اور مال خدا کے پاس فروخت شدہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس پر قبضہ مرکز ملت ہی کا ہوتا ہے تاکہ وہ دین کے تحفظ میں کام آسکے۔ اس لئے جو کچھ جماعت کے پاس ہو وہ سب کچھ امیر کا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے نبی کا حق سب سے اولیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن اس باب میں بھی حضورؐ اپنی مرکزی حیثیت، اور بشریت کی حیثیت کو اس قدر نمایاں طور پر متمیز رکھتے تھے کہ اس سے حضورؐ کی بلندی سیرت جھلمل جھلمل کرتی سامنے آجاتی ہے۔ صحابہؓ تو عشاق کی جماعت تھی۔ انھیں ہر وقت انتظار رہتا تھا کہ کوئی ایسا موقع ہو جو وہ حضورؐ کی کوئی خدمت کرسکیں۔ ان کے املاک و اموال حضورؐ پر تصدق تھے لیکن حضورؐ ذاتی تصرّف اور ملّی تصرّف کی حد فاصل ہر وقت ملحوظ رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ حضورؐ کے مکان ہی میں رہتے تھے۔ جب ان کی شادی حضرت فاطمہؓ سے ہوگئی تو ان کے لئے ایک الگ مکان کی ضرورت پڑی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مدینہ میں انصار نے اپنے مکانات اور زمینیں مہاجرین کو دے رکھی تھیں۔ حضرت حارث بن نعمان نے اپنے بہت سے مکانات اس ضمن میں حضورؐ کی تفویض میں دے رکھے تھے۔ حضرت فاطمہؓ

سے عرض کیا کہ حضورؐ! اجازت سے ایک مکان مجھے بھی دلا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے کہاں تک کہوں مجھے اب کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ حضرت حارث نے سُنا تو دوڑے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ حضورؐ پر میرے ماں باپ تصدق! یہ جو کچھ ہے سب حضورؐ ہی کا ہے۔ اس میں تامل و توقف کیسا؟ غرض اُنہوں نے ایک مکان حضرت سیدہ کے لئے خالی کر دیا۔

ان معاملات میں حضور اس قدر محتاط تھے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضورؐ کی دعوت مع چار دیگر صحابہؓ کے کی۔ راستہ میں ایک شخص اور ساتھ شامل ہو گیا۔ آپ نے میزبان سے کہا کہ یہ شخص بلا دعوت ساتھ ہو گیا ہے۔ اگر اجازت دو تو اسے ساتھ رہنے دوں، ورنہ اسے جواب دیدوں۔ اُنہوں نے اجازت دیدی تب حضورؐ اُسے ساتھ لے کر گئے۔

محفل نبویؐ میں ترتیب یہ ہوتی تھی کہ اگر کوئی چیز حضورؐ کے سامنے پیش ہوتی تو آپ دائیں طرف سے اس کی تقسیم شروع کرتے۔ ایک مرتبہ کہیں سے دودھ آیا۔ دائیں طرف حضرت عبداللہ بن عباس بیٹھے تھے جو ابھی بچے تھے، بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ تھے۔ آپ نے چاہا کہ دودھ معمر صحابہ کو دیدیا جائے لیکن اس سے اصول ترتیب ٹوٹتا تھا۔ بات کچھ نہ تھی۔ اپنا ہی مقرر کیا ہوا قاعدہ تھا، آپ ہی اُسے توڑ رہے تھے لیکن یہ بات ہمارے لئے معمولی بات ہو سکتی ہے اُس معلّم اُمت کے نزدیک معمولی نہ تھی۔ آپ نے اُس بچے (عبداللہ بن عباسؓ) سے کہا کہ اگر اجازت دو تو دودھ بائیں طرف والوں کو دیدوں، رسول اللہ کا ارشاد؟ اُس میں تامل بھی ہو سکتا تھا؟ لیکن جو یہ جانتے تھے کہ یہ اجازت طلبی یونہی تکلّفاً نہ رکھ رکھاؤ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے، وہ اپنے حق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ نے عرض کیا کہ معاف فرمائیے میں اس عطیہ میں ایثار نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دودھ دائیں جانب ہی دیا گیا۔

شگفتگی و حُسنِ ذوق

مجلس نبوی سنجیدگی و متانت کا تمثیلی پیکر ہوا کرتی تھی، اور اسے ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ لیکن متانت اور افسردگی میں جو لطیف سا فرق ہے اُسے وہاں بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ شگفتگی اور حُسنِ ذوق انسان کے جوہر لطیفہ ہیں، جن سے زندگی کی شاخ میں نمی آتی ہے۔ ہمارے ہاں زہد و تقدس کا نقشہ کچھ اس انداز سے مرتب کر لیا گیا ہے کہ زاہد و عابد کے لئے حادویا اس قسم کا انسان ہونا ضروری ہے جس کے ماتھے پر ہزار، ہزار شکن پڑتی ہو، نگاہوں میں خفگی، لبوں پر اُداسی، چہرے پر پژمردگی، اس انداز سے چھائی ہوئی ہو کہ وہ دُور سے ہی "عبوساً قمطریرا" کی تصویر نظر آجائے جس کی انتہائی آرزو یہ ہو کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

لیکن نبی اکرمؐ کی محفل بااین ہمہ متانت وسنجیدگی اور تعظیم وتقدیس، اس قسم کی یابس ویاردا نجمن نہیں ہوتی تھی جہاں شگفتگی وبشاشت شجر ممنوعہ کا حکم رکھے۔ چنانچہ سنجیدہ اور لطیف مزاح کے کئی واقعات کتب آثار وتاریخ میں مرقوم ہیں۔ ایک مرتبہ ایک محفل میں حضورؐ کھجوریں کھا رہے تھے۔ پاس ہی حضرت علیؓ بیٹھے تھے۔ حضرت علیؓ کھجوریں کھاتے جاتے اور اُن کی گٹھلیاں حضورؐ کی گٹھلیوں میں ملاتے جاتے۔ آخر میں حضرت علیؓ نے کہا کہ بعض لوگ دگنی دگنی کھجوریں کھا جاتے ہیں۔ دیکھئے کتنی گٹھلیاں دھری ہیں! حضورؐ نے فرمایا کہ اور بعض وہ بھی ہیں جو گٹھلیوں سمیت کھا جاتے ہیں، اُن کے سامنے ایک گٹھلی نہیں ہوتی۔

جن معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیا جاتا تھا اگرچہ قرآن کی رو سے آپ اس پر پابند نہیں کئے گئے تھے کہ اس مشورہ کو بطور فیصلہ تسلیم کرلیں، وہ بہرحال مشورہ ہی ہوتا تھا، لیکن ان میں جہاں کوئی ذاتی معاملہ آجاتا اس مشورہ کو بھی فیصلہ کی سی حیثیت دی جاتی۔ آپ نے دیکھا ہے کہ جب اسیرانِ بدر کا زر فدیہ جمع ہوا ہے تو حضورؐ کی صاحبزادی (حضرت زینبؓ) نے اپنے شوہر (ابوالعاص) کے فدیہ میں حضرت خدیجہؓ کا ہار بھیجدیا جس نے حضورؐ کے قلب مطہر کے نرم ترین گوشوں تک کو متاثر کردیا تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ ہار بیٹی کو واپس کردیا جائے، لیکن اس کے لئے جماعت سے اجازت چاہی گئی اور ان کی اجازت کے بعد اُسے واپس کیا۔ غور کیجئے! کہ واقعات کے ان چھوٹے چھوٹے نگینوں میں حقائق وعبر کی بڑی بڑی دُنیائیں جھلک رہی ہیں۔

ایک قائد اور امیر کی زندگی احتساب کی نگاہوں سے ہمیشہ بلند سمجھی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دنیاوی امیر کے حجلۂ زندگی میں جھانکنے کی جرأت کرے لیکن روحانی پیشواؤں کے متعلق تو ایسا خیال کرنے سے بھی روح تھرتھرا اُٹھتی ہے۔ اِن کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر زندگی کا کوئی واقعہ کھلے طور پر خلافِ آئین دکھائی دے، تو بھی یہ کہہ کر اغماض کی تاکید ہوتی ہے

کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

لیکن قربان جائیے اُس ذاتِ گرامیؐ کے کہ اس باب میں بھی ایسی تعلیم دی ہے کہ جس سے حق وباطل نکھر کر الگ الگ ہو جائے۔ ایک دفعہ آپؐ رات کے اندھیرے میں ازواجِ مطہرات میں سے کسی کو پہنچانے جارہے تھے۔ راستہ میں دو انصار آپڑے۔ اُنھوں نے آپؐ کے ساتھ عورت کو دیکھ کر اپنی آمد کو بے موقع سمجھا اور واپس جانے لگے۔ آپ نے فوراً آواز دی کہ یہ میری بیوی فلاں ہیں۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضورؐ! اگر ہمیں کسی کے متعلق بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو کیا وہ آپؐ کے متعلق ہی کرتے؟ آپؐ نے فرمایا کہ شیطان

انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے (بہ روایت مسلم) غور کیجئے! زندگی کے ظواہر و بطون کو کس طرح بے حجابانہ سامنے رکھ دیا ہے؟ کہ جس کا جی چاہے پرکھ کر دیکھ لے۔

واقعہ افک جب منافقین نے حضرت عائشۃ الصدیقہؓ کے خلاف (خاکم بدہن) تہمت لگائی ہے (جسے واقعہ افک کہتے ہیں اور جس کی تفصیل آگے چل کر آئیگی) تو حضورؐ کے لئے یہ کہہ دینا کافی تھا کہ میں اپنی بیویوں کی پاک دامنی کے متعلق خوب جانتا ہوں۔ کون کم بخت ایسی عفت مآب خاتون کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت کرسکتا ہے؟ صحابہ کے لئے حضرت عائشہؓ خدا کے حکم کی رُو سے بمنزلۂ ماں (اُم المومنین) تھیں، اُن کے حیطۂ تصور میں بھی کسی قسم کی بدگمانی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر حضورؐ نے اسے خود ہی چکا دینا نہیں چاہا۔ اللہ کے فیصلے کا انتظار کیا[1]۔ جب خود اللہ نے عصمت حضرت عائشہ کی شہادت دیدی تب اس کا اعلان فرمایا۔

ابھی آگے نہ بڑھئے کہ اس واقعہ میں دو ٹکڑے اور ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر نگہ بصیرت وجد کرتی ہے۔ اس واقعہ فاجعہ سے حضرت عائشہؓ کے دل پر جو کچھ گذری ہو گی اس کا اندازہ ہر غیور انسان لگا سکتا ہے وہ اپنے ماں باپ کے ہاں چلی گئی تھیں اور ہجوم غم سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔ جب زبان وحی نے اُن کی عصمت کی شہادت دیدی، تو رسول اللہؐ نے جاکر بشارت دی کہ عائشہؓ تجھے مبارک ہو، خدا نے تیری پاک دامنی کی گواہی دیدی۔ حضرت عائشہ کے والدین نے کہا کہ بیٹی اٹھو اور رسول اللہؐ کا شکریہ ادا کرو۔ فی الواقعہ یہ موقعہ ہزار تشکر و امتنان کا تھا، لیکن تعلیم نبویؐ نے حضرت عائشہ کو وہ باریک بین نگاہ، اور وہ حریت آگین قلب عطا کر دیا تھا جو لطیف ترین فرق کو بھی بھانپ سکتے تھے اور اس کا اظہار بے باکانہ کیا جا سکتا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میں رسول اللہؐ کا شکریہ ادا کیا کروں، میں شکریہ ادا کروں گی اپنے اللہ کا جس نے میری عصمت پر شہادت دی ہے اور مجھ پر یہ احسان عظیم کیا ہے۔

اور ابھی دوسرا ٹکڑہ بھی باقی ہے۔ تہمت لگانے والوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کی پرورش زمانۂ یتیمی سے حضرت ابوبکرؓ نے کی تھی، اور اب بھی بوجہ محتاجی آپ ہی اس کی کفالت کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ آپ کی بیٹی تھیں، اُم المومنین تھیں، ایک "یار غار" کی بیوی تھیں، کاشانۂ نبویؐ کا نور تھیں۔ آپ کے خلاف تہمت تراشی سے حضرت ابوبکرؓ کو جس قدر صدمہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ آپ نے اس رنج میں اُس شخص کی کفالت سے ہاتھ اٹھا لیا، (اور وہ تھا بھی اس کا مستحق) اللہ تعالیٰ نے بعد میں ان لوگوں کی معذرت قبول کرلی، اور انھیں ان کے جرم سے معافی دیدی۔ اور جب اللہ نے معافی دیدی تو حضرت ابوبکرؓ نے بلا

---

[1] اس لئے بھی کہ حضورؐ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔

توقف اس کی پرورش پر شروع کردی۔

اللہ اکبر! تعلیم قرآن اور تربیت نبویؐ نے ان حضرات کو کس قدر بلند کیرکٹر عطا کر دیا تھا؟ سینے کے ایسے گہرے زخم ایک فیصلہ خداوندی سے مندمل ہو گئے۔ اس لئے کہ نہ ان کی دوستی ذاتی ہوتی تھی نہ دشمنی ذاتی۔ وہ بھی خدا کے لئے اور یہ بھی خدا کے لئے۔ دوست وہ جو نظام دین کا محدو معاون ہو۔ دشمن وہ جو اس نظام کا مخالف ہو۔ اس باب میں خود نبی اکرمؐ نے ایسی ایسی مثالیں پیش کی تھیں، جو ان حضرات کے لئے ان معاملات میں معیار بن چکی تھیں۔ ذاتی انتقامات کو خدا کی راہ میں بھول جانا، یہ عزم الامور میں سے ہے۔ اہلِ مکہ کی تمام ایذا رسانیوں کا جواب فتح مکہ کے دن یہ تھا کہ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ طائف والوں کی سختیوں کا جواب ان کے تمام قیدیوں کو بلا معاوضہ چھوڑ دینا تھا۔

ذاتی انتقام نہیں

ہبار بن اسود وہ شخص تھا جس نے ہجرت کے زمانہ میں حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینب کو برچھی سے مارا تھا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ اس صدمہ کا داغ حضورؐ کے سینہ پر تھا۔ فتح مکہ کے بعد ہبار ادھر اُدھر چھپتا رہا۔ صحابہ اس کی تلاش میں تھے بالآخر تنگ آ کر اُس نے ایک جائے پناہ ڈھونڈھ ہی لی۔ اور وہ جائے پناہ معلوم ہے کونسی تھی! خود ذات رسالتمآبؐ کا عفوِ کریمانہ۔ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضورؐ میں گناہ گار تھا، قصور وار تھا، اللہ نے مجھے ہدایت دی اور میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ آپ کے خلاف مجھ سے بڑی زیادتیاں ہوئیں۔ شرمندہ ہوں، معذرت خواہ ہوں، اور آپ جو سلوک کرنا چاہیں اُس کا سزاوار ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ میں نے معاف کر دیا۔

حضورؐ کے چچا حضرت حمزہ کا قاتل وحشی خدمتِ اقدس میں آکر مسلمان ہوا۔ آپ نے اُسے چھوڑ دیا۔ لیکن جن حالات میں حضرت حمزہ شہید ہوئے تھے وہ ایسے دردانگیز تھے کہ آپ نے اس سے کہدیا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ قریش نے جو سختیاں آپ پر کی تھیں ان کی تفصیل طول طویل ہے لیکن ان میں یہ واقعہ تو کسی کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے پورے کے پورے خاندان ابو طالب کو حضورؐ کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رکھا تھا۔ اور تین برس تک غلہ کا ایک دانہ اندر نہیں جانے دیا تھا۔ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا۔ یمامہ کا رئیس ثمامہ بن اثال جب مسلمان ہوا تو اہل مکہ نے اُسے تبدیل مذہب پر طعنہ دیا۔ اُس نے غصہ میں آکر کہا کہ بہت اچھا مکہ میں ایک دانہ بھی گیہوں کا نہیں آئے گا۔ اس بندش سے مکہ میں قحط پڑ گیا۔ معلوم ہے کہ یہ بندش کس کے حکم سے کھلی؟ اُسی کے حکم سے جسے تین برس تک بال بچوں سمیت انہی اہل مکہ نے بھوکا مار دیا تھا۔ قریش نے حضورؐ سے درخواست کی،

حضورؐ نے ثمامہ کو کہلا بھیجا اور بندش کھل گئی۔

دینی معاملات میں کوئی نرمی نہ تھی

یہ عفو تھا اُن جرائم کی پاداش کے متعلق جو آپ کی ذات کے خلاف سرزد ہوئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں دینی جرائم کی سزا میں پورے عدل سے کام لیا جاتا تھا۔ اور ذرا نرمی نہیں برتی جاتی تھی۔ بنی مخزوم کے ایک نہایت معزز خاندان کی ایک عورت نے چوری کی۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اس قوم میں اس سے بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ سب نے حضرت اُسامہ بن زید کو آمادہ کیا کہ وہ رسول اللہؐ سے سفارش کردیں کہ اُس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ جب حضرت اُسامہ نے اس باب میں حضورؐ سے گفتگو کی تو آپ کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا، اور فرمایا کہ اے اُسامہ! تو حدود اللہ کے خلاف سفارش کرتا ہے؟ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو ہم اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتے۔ یہ اس لئے کہ قرآن میں ہے کہ

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ○ (۲۴)

اور (اے پیغمبر اسلام!) چاہیئے کہ ان دونوں (مجرمین) کے معاملہ میں قانونِ خداوندی کے مطابق سزا دہی میں شمہ برابر نرمی نہ برتی جائے اگر تم خدا اور روزِ قیامت پر (پورا پورا) یقین (ایمان) رکھتے ہو اور چاہیئے کہ ان دونوں (مجرمین) کی سزایابی کے وقت مومنین کی ایک جماعت (بطور شاہد) موجود رہے۔

اور یہ سخت گیری کی تاکید اس ذاتِ گرامی سے کی جاتی ہے جس کی طبعاً نرم خوئی کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے؛

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ص (۳/۱۵۹)

اے (پیغمبر اسلام!) یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے اس قدر نرم مزاج واقع ہوئے۔ اگر سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

طبعاً رقیق القلب، اور نرم خو، لیکن جب عدل و انصاف کا معاملہ سامنے آئے تو نہایت سخت گیر۔ غور کیجئے! کس قدر متناقض جذبات کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک مکتوب (بنام گرامی مرحوم) میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک شخص کو کسی جرم میں قتل کیا گیا[۱]۔ اُس کی بیٹی نے جب باپ کے

۱؎ علامہ اقبال نے اس کا نام نفیر لکھا ہے لیکن غالباً وہ شخص حویرث ابن نقید بن وہب شاعر تھا (باقی صفحہ آئندہ پر)

قتل کی خبر سنی تو نوحہ اور مرثیہ یاد کرتی، اور باپ کی جدائی میں درد انگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربار نبویؐ میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنتے تو حضورؐ اسقدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے، اور جوشِ ہمدردی سے، اس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے۔

"محمد رسول اللہ" اور "محمد بن عبداللہ" میں فرق ملحوظ رکھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لئے بڑی پختہ سیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جس سے باوصفِ اطاعت و انقیاد، متبعین کے جوہر خودی کی پرورش اور جذبات حریت کی تربیت ہوتی ہے۔

اب اس باب میں اس واقعہ عظیمہ پر نگاہ ڈالئے جو اس موضوع پر گویا حرفِ آخریں اور قولِ فیصل ہے اور جسے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، قرآن کریم نے اپنی آغوش میں محفوظ کر رکھا ہے۔ سارے قرآن میں کسی صحابی کا نام آیا ہے تو وہ حضرت زیدؓ ہیں۔ اور وہ نام جس واقعہ کے ضمن میں آیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔

حضرت زیدؓ کا واقعہ

پہلے تو یہ دیکھئے کہ حضرت زیدؓ اور نبی اکرمؐ کے تعلقات کیا کیا تھے۔ سب سے پہلے رسولؐ اور مومن کا تعلق جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی تعلق نہیں ہو سکتا پھر امیر اور متبع کا تعلق، کہ جس میں حضورؐ کے فیصلوں کے خلاف دل میں کبیدگی بھی پیدا نہیں ہونی چاہیئے اب آگے بڑھئے۔ حضرتِ زیدؓ حضورؐ کے غلام تھے اس لئے آقا اور غلام کا تعلق۔ حضورؐ نے انھیں آزاد کیا اس لئے محسن اور شکر گذار کا تعلق۔ آزاد ہی نہیں کیا بلکہ اپنا بیٹا بنا لیا اس لئے ایک گونہ باپ اور بیٹے کا تعلق، حضورؐ نے اپنے گھر میں رکھا، اور وہیں اُن کی پرورش کی، اس لئے مربی اور مربوب کا تعلق۔ پھر خاندان بنو ہاشم کی ممتاز خاتون، اپنی پھوپی زاد بہن سے اُن کی شادی کی۔ یہ رفعتِ منصب اُن کے تصور

(گزشتہ سے پیوستہ) جو اپنے اشعار میں لوگوں کو اسلام کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا اور حضورؐ کی ہجو بھی کہا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد حضرت علیؓ نے اُسے قتل کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے جو واقعہ لکھا ہے مجھے اس کی سند نہیں مل سکی لیکن قرآن کریم کی جو آیات اوپر متن میں درج کی گئی ہیں اُن کے پیش نظر واقعہ کچھ مستبعد دکھائی نہیں دیتا۔ علامہ اقبال کی نگہ بصیرت افروز نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اُنہیں کے الفاظ میں سُنئے۔ فرماتے ہیں "پانی آگ جذب کر لیتا ہے، عدم، بود کو کھا جاتا ہے، پستی میں بلندی سما جاتی ہے۔ مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام متناقضات کی ہو اُسے کون جذب کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی، کہ اس کی قوت، حیات و ممات کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے" اس کے بعد آپ نے واقعہ مندرجہ صدر درج کیا ہے۔

میں بھی نہ آسکتا تھا۔ ان تعلقات کو پیش نظر رکھئے اور پھر اس واقعہ پر غور کرنے کے لئے آگے بڑھیئے۔
آپ نے حضرت زیدؓ کی شادی سارے عرب کے دستور و آئین کے خلاف کی۔ ایک غلام کی شادی بنو ہاشم کی خاتون کے ساتھ؟ دنیائے عرب میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی شادی تھی اس لئے آپ چاہتے تھے کہ یہ عقد کامیاب رہے۔ اس نازک صورت کو بھی سامنے رکھئے۔ شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ میاں بیوی کی ناچاقی ہوگئی، اور نوبت بایں جا رسید کہ حضرت زید اپنی بیوی (حضرت زینب) کو طلاق دینے پر آمادہ ہوگئے۔ آپ خیال کیجئے کہ اس اطلاع سے حضورؐ کے دل پر کیا گذری ہوگی؟ آپ گئے اور حضرت زید سے کہا کہ

أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷)

اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

غور فرمائیے یہ کہنے والا کون ہے اور کہا کس سے جاتا ہے؟
تو اس پر حضرت زید نے کیا کیا؟
بیوی کو طلاق دے دی!!
پھر کیا ہوا؟ ذرا سوچئے کہ اگر کسی پیر کا مرید، کسی حاکم کا محکوم، کسی باپ کا بیٹا، کسی محسن کا احسان مند، کسی بڑے کا چھوٹا، اس درخواست کے باوجود ایسا کچھ کر دیتا تو کیا قیامت نہ برپا ہو جاتی؟ لیکن وہاں کیا ہوا؟ نہ ماتھے پر شکن آیا، نہ زید پر کوئی عتاب نازل ہوا۔ نہ اُسے گھر سے نکالا، نہ باہمی تعلقات میں ذرا سا بھی فرق پڑا۔ وہی زید اور وہی نبی اکرمؐ۔
اس لئے کہ وہاں تو سکھانا ہی یہ تھا کہ جن معاملات میں اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے ان میں کسی دوسرے کا اثر ان اختیارات کو سلب نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو ان اختیارات کے جائز استعمال میں پوری پوری آزادی ہونی چاہئے۔ خواہ اس کا اثر بڑے سے بڑے انسان پر ہی کیوں نہ پڑے۔
کہئے کہ تاریخ کے اوراق اس آزادی و حریت اور اس وسعتِ ظرف کی کوئی اور مثال بھی پیش کر سکتے ہیں؟

یہ تھی عدیم النظیر تعلیم و تربیت اور یہ تھے اس کے فقید المثال نتائج! لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ حتیٰ کہ جب وہ مرکز کے احکام کی اطاعت بھی کرتے تھے، تو مرکزی حکومت کے خوف سے نہیں۔ اطاعت مرکز کی لیکن خشیت خدا کی ہوتی تھی۔

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ (۲۴/۵۲)

اور جس کسی نے اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کی اور خدا سے ڈرتا اور تقویٰ اختیار کرتا رہا تو (یاد رکھو) ایسے ہی لوگ ہیں جو بامُراد ہیں۔

بس یہ ہے اسلامی نظام کا نقطۂ ماسکہ اور عروۃ الوثقےٰ، وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

نگہِ بازگشت

یہ تھا اسلامی نظام۔ بہتر ہو کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک بار پھر اُس کے اجزائے ترکیبی پر نگہِ بازگشت ڈال لی جائے۔

(۱) اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے کسی انسان کی نہیں۔ حتیٰ کہ رسول بھی اپنی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔

(۲) خدا کی اطاعت اُس ضابطۂ قوانین کی رو سے ہوتی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

(۳) یہ اطاعت ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے (انفرادی طور پر نہیں ہوتی) جس کا مرکز اوّل خود رسول ہوتا ہے۔ اس مرکز کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کہتے ہیں۔ یہی خدا کی حکومت ہے۔

(۴) جن احکام کی جزئیات تک قرآن نے متعین کر دی ہیں، اُن میں اس مرکز کو بھی ردوبدل کا اختیار نہیں ہوتا لیکن جو احکام قرآن میں اصولی پر بیان ہوئے ہیں اس سے مقصد ہی یہ ہے کہ اُن کی جزئیات میں اپنے اپنے زمانہ کے مطابق، ردوبدل ہو سکتا ہے۔ احکام کی تنفیذ اور جزئیات کی تشکیل میں مرکزِ ملت اپنی جماعت سے مشورہ لیتا ہے۔

(۵) رسول اللہ کے بعد خلیفۃ الرسول رسول اللہ کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور اب خدا اور رسول کی اطاعت سے مُراد یہی جدید مرکزِ ملت کی اطاعت ہوتی ہے۔

حضورؐ کے بعد

رسول اللہؐ نے یہی نظام قائم کیا اور لوگوں کو دکھلا دیا کہ دین سے یہ مفہوم ہے۔ حضورؐ کے بعد یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس میں خرابیاں آنی شروع ہو گئیں[۱] اور رفتہ رفتہ خلافت، حکومت میں بدل گئی، یعنی خدا کی حکومت و اطاعت کی جگہ پھر سے انسان کی حکومت قائم ہو گئی۔ اب دین اور دنیا میں تفریق ہونی شروع ہو گئی۔ جب دین سے دنیا کو الگ کر لیا جائے تو باقی مذہب رہ جاتا ہے۔ اس لئے اب دین، مذہب بن گیا، یعنی دنیاوی معاملات

---

[۱] یہ سلسلہ بدستور آگے کیوں نہ بڑھا، رُک کیوں گیا۔ اس کی تشریح معارف القرآن جلد دوم میں آچکی ہے وہاں دیکھ لیجئے۔

یں حکومت سلاطین کی تھی اور مذہبی امور میں طبقۂ علماء کی۔ خدا کی اطاعت نہ یہاں تھی نہ وہاں۔ جس استبدادِ ملوکیت اور آئینِ برہمنیت کو مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور نبی اکرمؐ نے اپنے عدیم المثال عمل سے اُسے مٹا کر بتا دیا تھا، مسلمانوں نے پھر سے انہیں متشکل کر کے اپنی جگہ رکھ دیا۔ اور اس طرح وہ بت جو اس قدر جاں کاہ جدّوجہد کے بعد حریم کعبہ سے نکالے گئے تھے، پھر سے کعبہ میں نصب کر دیئے گئے۔

بندۂ مومن ز قرآں بر نہ خورد | در ایاغ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست | خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

دین کا مفہوم بھی بدل گیا

جب دین کا نظام بدل گیا تو آہستہ آہستہ دین کا صحیح مفہوم بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ پٹڑی بدلنے کی دیر ہوتی ہے، اس کے بعد پہیئے کی ہر گردش گاڑی کو اس کی منزل مقصود سے دور لئے جاتی ہے۔ دین کا قرآنی مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہوا تو طرح طرح کے الجھاؤ سامنے آ گئے۔ قرآن نے خدا اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ دین کا نظام سامنے تھا تو خدا اور رسول کی اطاعت کا مفہوم بھی نہایت آسانی سے سامنے آ گیا۔ اب جو نظام گم ہوا تو اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی مفقود ہو گیا۔ خدا اور رسول کی اطاعت کو دو الگ الگ اطاعتیں تصور کیا گیا۔ خدا کی اطاعت کے لئے تو انھوں نے خیال کر لیا کہ اس سے مراد ہے قرآن کی اطاعت۔ لیکن یہ مشکل آن پڑی کہ خود رسول تو موجود نہیں ہیں رسول کی اطاعت کس طرح سے ہو؟ لامحالہ نگاہ اسی طرف اُٹھ سکتی تھی کہ رسول کی اطاعت، رسول کے اعمال و اقوال کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں پھر یہ مشکل تھی کہ نہ رسول اللہؐ اپنے اعمال و اقوال کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے چھوڑ گئے تھے، اور نہ ہی خلفاء راشدین میں سے کسی نے ایسا مجموعہ مرتب و مدون کرایا تھا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے وہ مشکل ہی نہ تھی جو ان پس آئندگان کے سامنے تھی۔ رسول اللہ بھی قرآن ہی چھوڑ کر گئے تھے اور صحابۂ کبار نے بھی اسی کی نشر و اشاعت کی تھی۔

قرآن و حدیث

لہٰذا اس ضرورت کے تحت اب احوال و اقوال رسول اللہؐ کا کوئی مجموعہ مرتب کرنا پڑا تا کہ اس کے ذریعے رسول کی اطاعت کی جائے۔ لیکن تحریری مواد اس کے لئے کوئی موجود نہ تھا، اور رسول اللہؐ کے زمانہ کو ایک مدت گذر چکی تھی۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ رسول اللہ کی جو باتیں لوگوں کو یاد ہوں انہیں اکٹھا کیا جائے۔ اس طرح رسول اللہؐ کے قریب اڑھائی سو سال بعد، روایات کا ایک مجموعہ مرتب ہوا، جسے صحیح بخاری[1] کہتے ہیں۔ اس کی اطاعت کو

---

[1] تاریخ میں ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے (قریب سنہ ۱۰۰ھ) میں امام شہاب بن زہری سے ذاتی طور پر احادیث نبویؐ کا کوئی مختصر سا مجموعہ مرتب کرایا تھا، لیکن اس مجموعہ کا وجود آج کہیں نہیں ہے۔ موطا امام مالک (المتوفی سنہ ۱۷۹ھ) احادیث کا (باقی آئندہ صفحہ پر)

رسول کی اطاعت کہا گیا، لیکن قرآن میں تھا کہ اتباع صرف وحی کی کی جا سکتی ہے، اور ظاہر ہے کہ وحی قرآن ہی کے اندر تھی۔ اس لئے ان احادیث کی اطاعت کا وجوب قرآن کی روشنی میں کس طرح

وحی کی مزعومہ قسمیں

ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے یہودیوں سے ایک خیال مستعار[1] لیا گیا، اور کہا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وحی متلو (جس کی تلاوت کی جائے) اور دوسری وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہ کی جائے)، وحی متلو قرآن ہے، اور وحی غیر متلو احادیث۔ (حالانکہ قرآن میں وحی کی یہ اقسام کہیں مذکور نہیں۔ وہاں تو وحی خداوندی ایک ہی ہے، اور وہ قرآن ہی) اس خیال کی تائید کے لئے قرآنی آیات کی دور از کار تاویلات کی گئیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضورؐ پر جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس میں ان کے اپنے ارادے، اور خواہشات کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وحی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ رسول کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (۵۳/۳-۴)

اور (اے افرادِ نسلِ انسانی!) یہ (پیغمبر) اپنی نفسانی خواہشات سے باتیں نہیں بناتا (بلکہ) یہ نری وحی ہوتی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔

لیکن ان آیات سے یہ مفہوم لیا گیا کہ رسول اللہ جو کچھ بولتا ہے سب وحی ہوتا ہے۔ اس میں سے کچھ قرآن میں آ گیا ہے۔ اور باقی ہم نے احادیث میں جمع کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت خود قرآن سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ کا ہر لفظ وحی نہیں ہوتا تھا۔ اگر آپ جو کچھ کہتے تھے وہ وحی ہوتا تھا تو آپ کے جن فیصلوں پر خود قرآن میں تادیب نازل ہوئی ہے اور آپ سے کہا گیا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ (تفصیل پہلے گذر چکی ہے) اُس سے کیا مفہوم لیا جائے! کیا یہ کہ وحی خود وحی کی تردید کیا کرتی تھی۔ گذشتہ صفحات میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے حضورؐ کی بشریت پر کس قدر زور دیا ہے۔ اور خود حضورؐ نے قدم قدم پر اس کی کس قدر وضاحت فرما دی ہے۔ اس کی بعد یہ کہنا کہ ہر وہ لفظ جو رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے نکلتا تھا وحی ہوتا تھا حقیقت سے کس قدر بعید ہے۔ اگر آپ کا ہر لفظ وحی ہوتا تھا تو جن امور کے متعلق قرآن کریم میں کوئی حکم موجود نہیں ہوتا تھا اُس کے لئے آپ وحی کا انتظار کیوں فرمایا کرتے تھے؟ مثلاً (جیسا کہ پہلے لکھا

(گذشتہ سے پیوستہ) پہلا مجموعہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں مختلف نسخوں کے مطابق تین سو سے پانسو تک روایات ہیں اور اکثر و بیشتر احکام پر مشتمل ہیں۔ اس میں دور ازکار قصص و اساطیر نہیں۔ اس مجموعہ سے ہم کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں دین کی عملی شکل کیا تھی؟ لیکن جس مجموعہ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا گیا ہے وہ مجموعہ امام بخاریؒ ہے جن کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی۔ باقی مجموعے اس کے بعد مرتب ہوئے۔

[1] دیکھئے عنوان "مظہر الفساد"، باب کتب یہود۔

جا چکا ہے) شروع شروع میں آپ بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے لیکن آپ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کعبۃ اللہ آپ کی امت کے لئے قبلہ قرار پا جائے۔ اس غرض کے لئے آپ نے خود کوئی فیصلہ نہیں دیا بلکہ قرآن میں ہے کہ اس کے لئے آپ کی نگاہیں آسمان (وحی) کی طرف لگی رہا کرتی تھیں۔ (قد نریٰ تقلب وجھک فی السماء (۲/۱۴۴) چنانچہ جب قرآن میں اس کے متعلق حکم صادر ہوا تو آپ نے رُخ کی تبدیلی فرمائی۔ اسی طرح، مثلاً افکِ حضرت عائشہؓ کے واقعہ میں آپ وحی آسمانی کے انتظار میں مضطرب و بے قرار تھے۔ حضرت کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کے واقعہ میں (جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے) آپ وحی آسمانی کا انتظار فرماتے رہے اور ان کی معافی اس وقت ہوئی جب اس کے لئے قرآن میں حکم آگیا اس قسم کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ چنانچہ جب تک کسی معاملہ کے متعلق قرآن میں حکم نہیں آجاتا تھا آپ عرب کی عام معاشرت یا اہل کتاب کی تقلید کیا کرتے تھے۔ آپ نے خود اپنی بیٹیوں کی شادی مشرکین سے کی، حالانکہ بعد میں قرآن کریم نے اس سے منع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ قرآنی فیصلہ سے پیشتر آپ کا عمل وحی پر مبنی نہیں تھا۔ وقس علی ہذا۔ ابھی ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں مقدمات کے فیصلے فریقین کے بیانات اور گواہان کی شہادت کے مطابق کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص غلط بیان یا جھوٹی شہادت پیش کرکے غلط فیصلہ لے جاتا ہے تو اس کا عذاب اس کے سر ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے یہ فیصلے وحی پر مبنی نہیں ہوتے تھے پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جن معاملات میں افرادِ امت کو اختلاف رائے ہوتا تھا، وہ دریافت کیا کرتے تھے کہ حضورؐ اپنی رائے سے ایسا فرما رہے ہیں یا وہ وحی کا حکم ہے۔ جب آپ فرماتے تھے کہ وہ حضورؐ کی اپنی رائے ہے، وحی کا فیصلہ نہیں تو اس فیصلہ پر پابندی لازمی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ (واقعات پہلے درج کئے جا چکے ہیں) اس سے بھی ظاہر ہے کہ نہ حضورؐ اپنے ہر منطوق کو وحی قرار دیا کرتے تھے نہ ہی صحابہ آپ کے ہر لفظ کو وحی کہا کرتے تھے۔ اگر آپ کا ہر لفظ وحی تھا تو اس قسم کے استفسارات کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور آپ کے کسی فیصلہ یا رائے سے کسی کو مجال انکار و اختلاف نہ ہوتی۔ سوچئے کہ یہ چیزیں بڑے گہرے تدبر کی محتاج ہیں۔
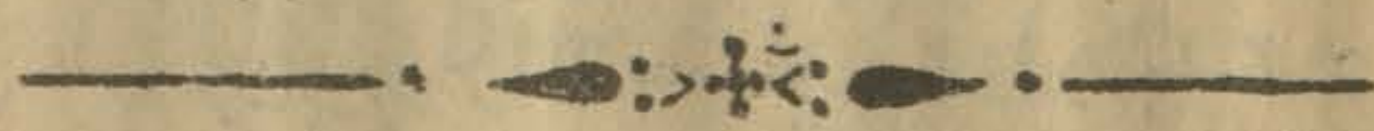
اس ضمن میں ایک اور آیت کو بطور دلیل پیش کیا جا چکا ہے۔ سورۂ حشر میں مالِ فَے کے متعلق آیا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹/۷)

اور جو کچھ اللہ (اسی طور پر) اپنے رسول کو دوسری بستیوں (کے کافروں) سے دلوا دے سو وہ بھی اللہ کا حق ہے اور رسول کا حق ہے اور رسول کے قرابت داروں، یتیموں، اور مسکینوں، اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ مال (فے) اوپر کے طبقہ میں ہی گردش نہ کرتا رہے۔ اور (دیکھو!) جو کچھ رسول (اس قسم کے اموال میں سے) دیا کریں اس کو (برضا و رغبت) لے لیا کرو، اور جس (کے لینے) سے منع کردیں اس سے رک جایا کرو، اور چاہئے کہ (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے ہو۔ بلاشبہ اللہ (پاداش عمل میں) سخت ترین سزا دینے والا ہے!

اس میں سے مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کے ٹکڑے کو الگ کر کے کہا جاتا ہے کہ دیکھئے۔ اس میں بصراحت موجود ہے کہ "رسول جو دے اسے لے لو، جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ" اس سے ظاہر ہے کہ اوامر و نواہی، رسول کی متعین کردہ ہیں۔ اور احادیث میں ہی مل سکتی ہیں اوّل تو یہ آیت ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو تقسیم مال فے سے متعلق ہے لیکن اگر اس حکم کو عام بھی سمجھ لیا جائے تو بھی اس سے مقصود حضورؐ کے ان فیصلوں کی اطاعت ہے جنہیں حضورؐ امام جماعت مسلمین (مرکز نظام دین) کی حیثیت سے صادر فرمایا کرتے تھے اور جن کی پابندی لازمی تھی۔ مالِ فے کی تقسیم بہ حیثیت امیر ہوتی تھی اس لئے تاکید تھی کہ امیر کی تقسیم کو برضا و رغبت قبول کرو۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں یہ تقسیم حضور کے ہاتھوں سرزد ہوتی تھی اس لئے اس حکم کا اطلاق حضورؐ کے فیصلوں پر تھا۔ حضورؐ کے بعد مال فے یا مالِ غنیمت کی تقسیم اس زمانے کے امیر المومنین کے ہاتھوں عمل میں آئیگی اس لئے اس کے فیصلے اس کی جماعت کے لئے واجب التسلیم ہوں گے۔ یہی اس آیت کا مطلب ہے۔

اسی باب میں ایک اور آیت سے بھی اس قسم کا استدلال کیا جاتا ہے۔ غزوۂ احزاب میں جب سرکش قوتیں چاروں طرف سے یلغار کر کے آپہنچی تھیں اور کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ

زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۳۳/۱۱)

اور جب مسلمان سخت زلزلے میں ڈالے گئے۔

اور سطح بین نگاہیں شدتِ خوف سے پکار اٹھی تھیں کہ

يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ (۳۳/۱۳)

اے مدینہ کے لوگو! اب یہاں تمہارے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔

تو ان نامساعد حالات میں نبی اکرمؐ نے جس عزم و استقلال اور ثبات و استقامت کا ثبوت دیا قرآن کریم

نے اسے مسلمانوں کے لئے بطور نمونہ پیش کیا تھا کہ ایسے حالات میں اللہ کے بندوں کے یہ انداز ہوا کرتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (۳۳/۲۱)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) جو شخص اللہ اور روزِ قیامت سے ڈرتا ہو اور بکثرت ذکر الٰہی کرتا ہو ایسے شخص کے لئے رسول اللہ (کی ذات گرامی) میں ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

کہ وہ باطل کی قوتوں سے مرعوب ہونے کے بجائے مردانہ واران کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دنیا کی کوئی قوت انہیں اپنے مقامِ حق و صداقت سے ہلا نہیں سکتی۔ بعینہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ اور آپ کی جماعت نے مستبدانہ و متمردانہ قوتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُن سے کہدیا تھا کہ جاؤ جو جی میں آئے کر لو۔ تمہاری اور ہماری کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ تو اسے بھی اللہ تعالیٰ نے بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ رَّبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (۶۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیم اور آپ کے ساتھیوں میں عمدہ ترین نمونہ تھا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم خدا کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے (قطعاً) بیزار ہیں۔ ہم تم سے انکار کرتے ہیں۔ ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے بغض و عداوت کی ٹھن گئی ہے تاوقتیکہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ لیکن اتنی بات ابراہیم کی اپنے باپ سے ضرور ہوئی تھی کہ میں تمہارے لئے دعاء مغفرت کے علاوہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اور اے ہمارے پروردگار ہم تجھ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور (بالآخر) تیری ہی طرف لوٹنا بھی ہے!

سورۂ احزاب کی مندرجہ صدر آیت سے یہ استدلال لیا گیا کہ نبی اکرمؐ کا ہر قول و فعل قیامت تک کے لئے واجب الاتباع ہے۔ کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کے لئے نمونہ قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ حضورؐ کے اعمال و افعال کی تصریحات و کیفیات روایات ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو یہ امر بالکل بدیہی

ہے کہ حضورؐ کی زندگی کا ہر ہر واقعہ آنے والوں کے لئے نمونہ نہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ آپ نے اپنی بیٹیوں کی شادی مشرکین سے کی۔ یا اہلِ مدینہ سے کہا کہ وہ کھجوروں میں گابھا نہ لگایا کریں۔ ہمارے لئے (جیسا کہ خود حضورؐ کے زمانہ کے مسلمانوں کے لئے) بطور نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اول الذکر کے متعلق قرآن میں حکم آگیا اور وہی حکم مسلمانوں کے لئے قول فیصل ہے۔ اور ثانی الذکر کے متعلق تجربہ نے بتا دیا کہ آپ کا قیاس صحیح نہیں تھا اور اس پر خود حضورؐ نے فرما دیا کہ میں نے قیاساً ایسا کہا تھا۔ ان معاملات کو تم خود مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی زندگی کا ہر واقعہ آنے والوں کے لئے نمونہ نہیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن نے جن احکام کی تفاصیل خود متعین نہیں کیں۔ اُن میں حضورؐ کا عمل قیامت تک کے لئے واجب التعمیل ہے۔ ذرا سوچئے کہ جن احکام کو قرآن نے اصولاً بیان فرمایا ہے اگر ان کی جزئیات قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر و تبدل ہوتیں تو خود قرآن ہی ان کی جزئیات متعین کیوں کر دیتا اللہ تعالیٰ نے جہاں اور احکام کی جزئیات متعین کرائی تھیں، اس کے لئے کون سی مشکل تھی کہ باقی ماندہ احکام کے لئے بھی ایسا کر دیتا؟ ایسا کرنے میں کون سی چیز مانع ہو سکتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے ایسا طریق اختیار کیا کہ کچھ جزئیات خود متعین کر دیں اور باقی رسول اللہؐ پر چھوڑ دیں! سوچئے کہ یہ بات کہاں تک پہنچی ہے؟ حقیقت یہ نہیں۔ حقیقت وہی ہے جو ہم لکھ چکے ہیں۔ جن احکام کی جزئیات کو قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر سمجھا گیا، انھیں قرآن میں متعین کر دیا گیا۔ جن جزئیات کو بدلنے والے احوال و ظروف کے مطابق قابل تغیر و تبدل سمجھا گیا انھیں قرآن نے بلا تعین چھوڑ دیا کہ ہر زمانہ میں ان کا تعین خود کر لیا جائے۔ رسول اللہؐ نے اپنے زمانہ کے احوال و اقتضات کے مطابق، بہ حیثیت مرکزِ نظامِ دین، ان کا تعین فرمایا۔ بعد میں آنے والے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق ان میں ردّ و بدل کر سکتے ہیں۔ اگر ان میں رد و بدل کا امکان و اختیار نہ ہوتا تو ان جزئیات کا تعین بھی قرآن ہی کر دیتا۔ پھر اسے بھی سوچئے کہ اگر خود ذات رسالت مآبؐ اپنے احکام و قضایا کو قیامت تک کیلئے واجب التعمیل خیال فرماتے تو آپ کے لئے ضروری تھا کہ جس طرح قرآن کریم کو محفوظ ترین شکل میں امت کے سپرد کیا تھا، اس طرح اپنے احکام و ارشادات کا ایک مستند و مصدق مجموعہ ملت کے حوالے کر جاتے۔ حضورؐ نے ایسا نہیں کیا۔ ہم ایسا تو کبھی باور ہی نہیں کر سکتے کہ (معاذ اللہ) حضورؐ سے یہ کوتاہی ہوئی۔ اس سے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ (پناہ بخدا) حضورؐ نے دین کے ایک اہم حصہ کے متعلق اپنا فریضہ رسالت ادا نہیں کیا اور اسے آنے والوں کی انفرادی کوششوں پر چھوڑ دیا۔ ایسا خیال کرنا بھی منصب رسالت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس لئے لامحالا

دوسری چیز ہی باقی رہ جاتی ہے اور ثیہ کہ خود حضورؐ بھی اپنے جزئی احکام کو وقتی تصور فرماتے تھے، ابدی طور پر ناقابل تغیر قرار نہیں دیتے تھے۔ وفیھا بصائر للناس۔

یہ ہیں وہ "قرآنی دلائل" جن کی بناء پر نبی اکرمؐ کے ہر قول و فعل کو قیامت تک کے لئے واجب التعمیل قرار دیا گیا اور اس طرح مجموعہ احادیث نبویؐ کو (جو خود مرتب کیا گیا تھا) وحی کا درجہ دے کر اسے مثلہٗ معہٗ (قرآن کے ساتھ اس کی مثل) قرار دیا گیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان حضرات نے (معاذ اللہ) ایسا کچھ کسی خود غرضی یا بدنیتی سے کیا۔ ان کے سامنے مشکل ایسی آگئی تھی جس کا انہیں صحیح حل نہیں ملتا تھا ان کی یہ تمام کوششیں اس حل کی تلاش میں تھیں، جس طرح قفل ابجد کے جب صحیح حروف معلوم نہ ہوں تو انسان اس کے کھولنے کے لئے مختلف حروف ملاتا رہتا ہے۔ اس مشکل کا حل ایک نقطہ میں تھا اور وہی نقطہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا جس طرح آنکھ کی پتلی پر ذرا سی سفیدی آجانے سے سب کچھ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب ان حضرات کے سامنے ہی قرآن موجود تھا جس سے آج نظام دین کو اس طرح سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے، تو اُن کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہ آئی کہ اطاعت خدا و رسول سے صحیح مفہوم کیا ہے؟ یہ سوال بڑا نازک ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے ماحول میں اس طرح گھر جاتا ہے کہ اس کی نگہ اس کی چار دیواری سے آگے نکل ہی نہیں سکتی۔ اُس زمانہ میں ملوکیت نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ کسی اور نظام کو وہ سامنے ہی نہیں آنے دیتا تھا۔ آج زمانہ کے فطری تقاضوں سے ملوکیت خود ذبح ہو رہی ہے اس لئے اس کی موت نے ان بہت سے پردوں کو خود بخود اُٹھا دیا ہے جو مدّت ہائے دراز سے فطری حقائق پر پڑے چلے آرہے تھے۔ پھر ملوکیت کا استبدادی پنجہ بھی بڑا سخت گیر ہوتا ہے۔ اس کا بھی اثر تھا۔ بس یوں ہی سمجھئے کہ جن حالات کے ماتحت ان لوگوں نے ملوکیت جیسی لعنت سے طوعاً و کرہاً مفاہمت کر لی تھی، حالانکہ نظام قرآنی نے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں، ایسے ہی حالات کے ماتحت وہ اس مشکل کا صحیح حل ہی دریافت کرنے سے معذور رہے۔

ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات کا تعین مرکز نظام دین کے ذمہ ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان جزئیات کا تعین کرے یا سابقہ متعین شدہ جزئیات میں تغیر و تبدل کر سکے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مقصد عظیم کے لئے مرکز نظام حکومت کو ایسا ہونا چاہیئے

ص! حالانکہ قرآن نے تحدی کی تھی کہ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (۲۳/۲) و دیگر مقامات) یعنی قرآن کی مثل کچھ اور تیار کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ قرآن خدا کی کتاب ہے اس لئے بے مثال ولاشریک۔ کوئی اس کی مثل نہیں لا سکتا۔ لیکن یہاں خود مسلمانوں نے کہہ دیا کہ یہ دیکھئے ہم لاتے ہیں مثلہٗ معہٗ۔ قرآن کے ساتھ ساتھ اس کے مثل یعنی مجموعۂ روایات

جسے بجا طور پر جانشین رسول اللہ کہا جا سکے۔ جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو مرکز نظام سلطنت میں ملوکیت کی سب خرابیاں آگئیں۔ اس لئے ارباب بصیرت نے اس مرکز کو اس کا اہل ہی نہیں سمجھا کہ وہ متعین شدہ جزئیات میں کسی قسم کا تصرف کر سکے۔ دین کے نقطۂ نگاہ سے یہ زمانۂ انحطاط تھا اور انحطاط کے زمانہ میں، جب کہ صورت یہ ہو گئی ہو کہ

ہر لئیمے رازدار دیں بود است

تقلید، اجتہاد سے بہتر ہوتی ہے۔ اندریں حالات، ایسا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان حضرات نے ان مصالح کے پیش نظر، سابقہ احکام و قضایا کو علیٰ حالہ رہنے دئیے جانے کو مناسب خیال کیا ہو تاکہ اگر اُمّت زمانہ کے ساتھ چلنے سے معذور ہو چکی ہے تو کم از کم خود غرضانہ اجتہادات کے تباہ کن نتائج سے ہی محفوظ رہ جائے۔

بہرحال ان حضرات نے کسی وجہ سے ایسا کیا۔ ان کے لئے میزان احتساب کھڑی کرنا ہمارا منصب نہیں۔ ہمیں تو فقط اتنا دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہم آج سمجھ رہے ہیں وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر ہمارے فہم قرآن کا کوئی نتیجہ ان کے مسلک سے مختلف نظر آتا ہے تو ہم قرآن کے پابند ہوں گے، کسی انسان کے مسلک کے نہیں۔ اس باب میں

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ (۲/۱۳۴)

(اور جو کچھ بھی ہو) یہ ایک امت تھی جو گذر چکی اس کے لئے وہ تھا جو اس نے اپنے عمل سے کمایا۔ تمہارے لئے وہ ہوگا جو تم اپنے عمل سے کماؤ گے۔ تم سے کچھ اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان کے اعمال کیسے تھے۔

کا قرآنی ارشاد ہمارے اطمینان کے لئے کافی ہے۔

مجموعۂ روایات کی ترتیب و تدوین میں ان حضرات (رضی اللہ عنہم) کی کوششوں کے نتائج ہمارے لئے علمی ورثہ ہیں جن سے ہم متمتع ہو سکتے ہیں۔ ان سے ہمیں یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں نظامِ دین کس شکل میں عمل ہوا کرتا تھا۔ اس تاریخی پس منظر سے ہم آج اپنے لئے نظامِ دین کی تشکیل میں مدد لے سکتے ہیں۔

ص۱ اس مقام پر ہم روایات کی جمع و ترتیب کی تاریخی تفاصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ اس باب میں دلچسپی رکھنے والے احباب، راقم الحروف کے مضمون "شخصیت پرستی" کی طرف (جو میرے مجموعہ مضامین "فردوس گم گشتہ" میں شائع ہو چکا ہے) اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مجموعہ مضامین "ہمارے دینی علوم" کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

ان ہی روایات سے ہم حضورؐ کی سیرت سمجھنے میں بھی مدد لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی صحت وسقم کا معیار قرآن کریم کو قرار دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ قرآن پر عمل کرنے اور عمل کرانے کے لئے تشریف لائے تھے، اس لئے کوئی ایسا قول وعمل جو قرآن کے مخالف ہوگا، رسول اللہؐ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا خواہ اُس کا راوی کوئی بھی کیوں نہ قرار دیدیا جائے۔ ہمیں ان تمام مجامع روایات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھتے جانا چاہیئے اور اس طرح حضورؐ کی سیرت کو مرتب کرنا چاہیئے۔ یہی مسلک معارف القرآن میں اختیار کیا گیا ہے۔ وما توفیقی الّا باللہ العلی العظیم۔

بہرحال اس طرح سے خدا اور رسول کی دو الگ اطاعتیں متعین ہوئیں، اور اس کے بعد گاڑی کسی اور سمت کو چل پڑی۔ دنیاوی حکومت بادشاہوں کے سپرد ہوگئی، اور مذہبی قیادت ائمۂ مذہب کے حوالے۔ دین مفقود ہوگیا۔ دنیاوی حکومتیں ایک ایک کرکے ان تمام انسانیت سوز خرابیوں کا مجموعہ بنتی چلی گئیں جو انسانی حکومت کا فطری نتیجہ ہوتی تھیں اور مذہب کی فرقہ پرستی اور گروہ سازی سے ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔

لامرکزیت

غور کیجئے کہ ایک مرکزیت کے فنا ہوجانے سے ملت پر کتنی قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔ قرنہا قرن سے ملت اسی عذاب میں گرفتار چلی آرہی ہے۔ جو علاج سوچا جاتا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ "خواستم پیکاں برآرم، در جگر نشتر شکست"۔ روایات پرستی سے جو مصیبت نازل ہوئی اس کے خلاف ایک صدائے احتجاج "اہلِ قرآن" کی شکل میں بلند ہوئی۔ لیکن چونکہ حقیقت ان کی نگاہوں سے بھی اوجھل تھی اس لئے یہ تفریط کی طرف نکل گئے۔ قرآن کریم نے جن احکام کی جزئیات کا تعین "خدا اور رسول" (مرکزِ ملت) پر چھوڑا تھا، یہ انہیں بھی قرآن ہی سے نکالنے لگے، تاکہ اس سے، روایات کی عدم ضرورت کو ثابت کردیا جائے۔ اس کوشش کا جو نتیجہ ہوسکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ تاویلات کی کھینچا تانی سے قرآن چیستاں بن کے رہ گیا، اور کثرت تعبیر سے یہ خواب پریشاں سے پریشان تر ہوگیا۔ کارواں کے انتشار سے پہاڑوں کے دامن میں چھپے ہوئے ڈاکو فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ابلیسی جنود وعساکر، غارت گریٔ متاعِ دین و دانش کے لئے ان راہوں سے حملہ کرتے ہیں جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔

غارت گرانِ دین ودانش

ملت کی اس پریشان نظری، افراتفری، اور نفسانفسی سے ایران کی بہائیت اور قادیان کی مرزائیت نے فائدہ اُٹھایا۔ ایک نے کہدیا کہ قرآن کا عہد، اثر وتعلیم ختم ہوچکا ہے اب ایک جدید کتاب کی ضرورت ہے۔

دوسرے نے کہا کہ نہیں رسالت محمدیہ کا دور علاً ختم ہوچکا ہے اب ایک نئے نبی کی ضرورت ہے۔ بات ایک ہی تھی۔ کہنے کے انداز جدا گانہ تھے۔ اور یہ سب تشتت وافتراق، یہ تمام پراگندگی، اور انتشار، یہ غارت گری اور قزاقی، اس لئے تھی کہ دین کا حقیقی مفہوم نگاہوں سے اوجھل، اور اس کا نظام آنکھوں سے گم ہوگیا تھا۔ اس نظام کو پھر سے قائم کیجئے۔ نہ روایات کو دین بنانے کی ضرورت رہے گی نہ تاویلات وتعبیرات کے پھندوں کی حاجت۔ نہ قرآن ساقط العمل دکھائی دے گا نہ نبوت محمدیہ محدود لعہد۔ خدا کی زندہ کتاب، قیامت تک کے لئے نافذ العمل اور رسالت محمدیہ ابدیت درکنار نظر آئیگی صحیح مرکز ملت کی اطاعت، "خدا اور رسول" کی اطاعت ہوگی، اور اس اطاعت کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض و رزق کریم۔

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ ۔۔۔ زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی ۔۔۔ جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا

کیوں چمن میں بے صدا مثل رم شبنم ہے تو ۔۔۔ لب کشا ہو جا سرود بربطِ عالم ہے تو

بے خبر تو، جوہر آئینۂ ایام ہے

تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

ایک ضمنی گوشہ

سورۂ فتح میں ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ (۴۸ ـ ۱ ـ ۲)

(اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتمندی عطا فرمائی ہے، تاکہ اللہ تمہاری تمام اگلی پچھلی تدبیری کوتاہیوں کو ڈھانپ لے، اور اپنی نعمت کی (پوری پوری) تکمیل فرمادے، اور آپ کو (علم وہدایت) کی سیدھی راہ لے چلے!

مغفرت ذنوب

اسے ہماری زبان کی کوتاہ دامنی کہئے یا خود ہماری کم فہمی کہ اس آیت (اور اس قبیل کی اور آیات میں) ذنب کا ترجمہ گناہ کر دیا جاتا ہے۔ اور مغفرت کا ترجمہ بخشش، جس سے اس آیت کا ترجمہ یوں ہو جاتا ہے "تاکہ اللہ تیرے اگلے پچھلے گناہ بخشدے" اور اس سے یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا رسول اللہ سے گناہ سرزد ہوا کرتے تھے جنہیں اللہ معاف کر دیا کرتا تھا؟ اس سے آگے بڑھ کر عصمت انبیاء کا اصولی سوال سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ حضرات انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں یا غیر معصوم۔ یہ مسئلہ ایک بہت بڑی اصولی بحث کا محور بن چکا ہے جس کے گرد موافق ومخالف دلائل کے انبار لگ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ

غور کریں گے تو ذنب اور مغفرت کے الفاظ کا صحیح مفہوم سامنے آجانے سے یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں ناروا اعمال کے لئے بہت سے الفاظ آئے ہیں جن پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ہر لفظ اپنے اندر ایک الگ خصوصیت رکھتا ہے۔ اور اس کا محل استعمال دوسرے الفاظ سے جداگانہ ہے۔ مثلاً جرم، عصیان، طغیان، فسق، فجور، اثم، خطا، سیئہ، ذنب، جناح، یہ الفاظ قرآن کریم میں مختلف مفہوم کی ادائگی کے لئے آئے ہیں لیکن ہمارے ہاں ان کا ترجمہ عام طور پر ایک ہی لفظ "گناہ" سے کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح مغفرت کے معنی بھی صرف بخشش کے لئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مفہوم بھی اس سے مختلف ہے (ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اعمال اور ان کے نتائج میں کیا تعلق ہے۔ ان امور کی تفصیل کتاب آخرت میں جا کر ملے گی۔ اس وقت صرف موضوع زیر نظر کے متعلق چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے)

ذنب۔ ذَنَبْ سے ہے جس کے معنی کسی جانور کی دُم کے ہیں۔ چونکہ دُم سب سے اخیر میں چپکی ہوتی ہے اس لئے اس کا مفہوم کسی کام کا انجام یا نتیجہ لیا جاتا ہے۔ بعض امور کی سرانجام دہی کے لئے انسان کوئی تدبیر اختیار کرتا ہے جس کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ امر متعلقہ میں کامیابی ہوگا۔ لیکن جب نتیجہ سامنے آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر غلط تھی۔ اسے ذنب کہتے ہیں جس کی جمع ذنوب ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آپ بڑے بڑے امور کو ہاتھ میں لیں گے تو اس قسم کی غلط تدابیر کا امکان بھی ہوگا۔ یہ نہ گناہ ہے نہ جرم۔ نہ فسق ہے نہ فجور، نہ عصیان ہے نہ طغیان۔ لیکن انسان اپنی ضد اور سرکشی سے اس غلط تدبیر پہ جما رہے اور حقیقت کا علم آجانے کے بعد بھی اس سے احتراز نہ کرے تو یہی ذنب جرم بھی ہو جائے گا اور گناہ بھی، سرکشی بھی اور عدوان بھی۔

مغفرت، غفر سے ہے جس کے معنی ڈھانپ لینے کے ہیں۔ چنانچہ مغفر اس خود کو کہتے ہیں جو دشمن کے وار سے بچنے کے لئے سر پر پہن لیتے ہیں، اور وہ اس طرح سر کو ڈھانپ دیتی ہے۔ چونکہ اس سے دشمن کے حملہ سے حفاظت مل جاتی ہے اس لئے اس کے معنی محفوظ رکھنے کے بھی آجاتے ہیں۔ لہذا مغفرت کے معنی ہیں ڈھانپ لینا یا محفوظ رکھنا۔

اس لئے مغفرت ذنوب کے یہ معنی ہوئے کہ مہمات امور میں اگر کوئی غلط تدبیر اختیار ہو جائے تو اس کے نتائج کے مضر اثرات سے محفوظ رکھ لیا جائے۔ یعنی ان نتائج و عواقب کو ڈھانپ دیا جائے۔ ان کے اثرات کو ابھرنے نہ دیا جائے، نبی اکرمؐ کے سامنے جو عظیم الشان کام تھا اس میں آپ یا آپ کی جماعت کی طرف سے مختلف امور کو بروئے کار لانے میں بعض اوقات تدبیری غلطیوں کا امکان تھا، نبی اکرمؐ کے متعلق اس قسم کے اجتہادی سہو یا بھول چوک کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں خود دیکھ چکے ہیں۔ اس جماعت کی قوت ایمان و عمل کے پیش نظر اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اس قسم کی تدبیری غلطیوں کے مضر اثرات سے ان امور اجتماعیہ کو محفوظ رکھا جائے گا۔ اور آپ کو عظیم الشان

فتح دی جائے گی۔ غور کیجئے اس "فتح مبین" کی غرض و غایت کیا بتائی گئی ہے؟

(۱) مغفرت ذنوب (۲) اتمام نعمت (۳) صراط مستقیم کی طرف رہ نمائی (۴) اللہ کی نصرت۔ فتح و کامرانی سے مغفرت ذنوب کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں (مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ) کی تمام سعی وکاوش، اور تگ وتاز، حق کے غلبہ اور دین کے تمکن کے لئے تھی۔ اس بلند نصب العین کے حصول میں جزئیات کی تدبیری غلطیوں کا امکان تھا، لیکن آخرالامر مخالفت کی سب قوتیں مغلوب ہو جائیں اور یہ کارواں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے تو راستہ کی یہ تدبیری غلطیاں گویا بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہی مغفرت ہے۔ یہ کس طرح بے نتیجہ ہو جاتی ہیں (یا ڈھانپ دی جاتی ہیں) یہ ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص تندرست و توانا ہے۔ اس میں قوتِ حیات (Vitality) کافی موجود ہے تو چھوٹی موٹی نادانستہ بدپرہیزی (یعنی حفظانِ صحت میں معمولی بداحتیاطی) جو مضر اثر پیدا کرتی ہے، قوتِ حیات اس کے اثر کا ازالہ کر دیتی ہے اور یہ بے احتیاطی بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اگر انسان کمزور ہو۔ اس میں قوتِ حیات کی کمی ہو تو ذرا سی بے احتیاطی بھی خطرناک نتائج کا موجب بن جاتی ہے۔ آج زکام ہو رہا ہے۔ کل دردِ سر میں مبتلا ہے، اب نیند نہیں آتی پھر بھوک نہیں لگتی۔ ذرا سا پانی زیادہ پی لیا تو مصیبت آگئی۔ کہیں ہوا کا جھونکا آگیا تو بستر پر پڑ گئے، جماعت میں اگر قوتِ حیات موجود ہو تو چھوٹی موٹی تدبیری غلطیاں بے نتیجہ ہو جاتی ہیں۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (۱۱/۱۱۴)

یاد رکھو، نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

کا یہی مفہوم ہے۔ اسی کا نام مغفرت ذنوب ہے، سورۂ آل عمران میں مومنین کی اس دعا میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ (۳/۱۹۲)

خدایا ہم نے ایک منادی کرنے والے کی منادی سنی، جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا، اور کہہ رہا تھا کہ "لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ" تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لے آئے۔ پس خدایا ہماری تمام تدبیری کوتاہیوں کو بے نتیجہ کر دے۔ ہماری برائیاں مٹا دے، اور (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو!

یہ سیئات وہ ہیں جو سہواً بھول چوک سے سرزد ہو جائیں، وہی خطائیں جن کے متعلق مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی کہ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ (۲/۲۸۶)

خدایا! اگر ہم سے (سعی و عمل میں) بھول چوک ہو جائے تو اس کے لئے ہم سے مواخذہ نہ کیجیو۔

مغفرت اسی سہو و نسیان کی ہوتی ہے جو اضطراری حالت میں سرزد ہو جائے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (۶/۱۴۵)

پھر اگر کوئی آدمی مجبور ہو جائے اور مقصود نافرمانی نہ ہو، نہ حدِ ضرورت سے گذر جانا، تو بلاشبہ تمہارا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے!

اس پر مواخذہ نہیں ہوتا لیکن جس خطا میں دل کا ارادہ بھی شامل ہو اس کی مغفرت نہیں ہو سکتی۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۲/۲۲۵)

تمہاری قسموں میں سے جو لغو اور بے معنیٰ قسمیں ہوں اُن پر اللہ مواخذہ نہیں کرے گا۔ (اور اس لئے فی الحقیقت ان کا کوئی اعتبار نہیں) تم سے جو کچھ مواخذہ ہو گا وہ تو اسی بات پر ہو گا جو (سچ مچ تم نے سمجھ بوجھ کر کی ہے، اور اس لئے) تمہارے دلوں نے (اپنے عمل سے) کمائی ہے اور اللہ (ہر حال میں) بخشنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے!

اس لئے جن ذنوب میں سرکشی و عدوان کے آثار پائے جائیں ان پر خدا کے قانون مکافات کی گرفت لازمی ہوتی ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ نبی اکرمؐ کے جن ذنوب کی مغفرت کا ذکر سورۂ فتح میں ہے وہ ہماری اصطلاح میں "گناہ" نہیں تھے، اجتہادی غلطیاں یا سہو و نسیان کی بھول چوک تھی، اس قسم کی غلطیاں، نہ رسالت کے منافی ہیں اور نہ ہی ان سے نبیؑ کی شان میں کوئی فرق آتا ہے۔ باقی رہا عصمتِ انبیا کا سوال، سو اگر اس سے یہ مفہوم ہے کہ نبی میں معصیت کا امکان ہی نہیں تو پھر اس کی اطاعتِ احکامِ خداوندی میں خوبی کیا ہے؟ معارف القرآن جلد دوم میں ابلیس کا عنوان دیکھئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اسی کی پارسائی قابلِ ستائش ہے جو معصیت کی قدرت رکھتا ہو، جسے گناہ کی استطاعت ہی نہیں، اس کا گناہ سے احتراز کوئی قابلِ قدر عمل نہیں۔ وہ تو انسان نہیں پتھر ہے یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ۔ اس لئے رسول بھی دوسرے انسانوں کی طرح گناہ کی استطاعت رکھتا ہے۔ لیکن وہ خدا کے احکام کی نافرمانی نہیں کرتا۔ وہ مقامِ عبدیت میں پورا اترتا ہے۔ لیکن اجتہادی غلطیوں کا اس سے امکان ہوتا ہے۔ مگر چونکہ وہ ان سے باخبر ہونے کے بعد فوراً رجوع الی اللہ کر لیتا ہے اس لئے ان کے مضر اثرات اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتے۔ یہی مغفرتِ ذنوب ہے۔ جس کے لئے وہ خدا سے دعا کرتا رہتا ہے۔ سورۂ مومن میں ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (۲۴/۵)

پس (اے پیغمبر اسلام!) تم (کفار کی ایذا رسانیوں پر) صبر کرتے رہو بیشک خدا کا وعدہ (نصرت) سچا (وعدہ) ہے اور اپنی تدبیری کوتاہیوں کی معافی چاہو، اور صبح و شام اپنے پروردگار کی حمد و ستائش میں مشغول رہو۔ اپنے لئے بھی اور اپنی جماعت کے لئے بھی۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ۝ (۲۶/۱۹)

جان رکھو، کہ خدا کے سوا کوئی (ہستی) سزاوار حکومت نہیں اور (اے پیغمبر اسلام!) تم کو چاہیئے کہ اپنی اور مومن مردوں اور عورتوں کی تدبیری کوتاہیوں کے لئے معافی چاہتے رہو، اور (یاد رکھو) اللہ تمہارے رہنے سہنے چلنے پھرنے کی (پوری پوری) خبر رکھتا ہے!

اس لئے کہ رسول اور اس کی جماعت ایک مشترکہ مقصد کے لئے مصروف جد و جہد ہوتے ہیں، جماعت کے بغیر دین کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اور یہ مغفرت ذنوب جماعت کی قوت ایمان و عمل اور دین کے تمکن سے ہوتی ہے، ورنہ اگر یہ قوت کمزور ہو اور دین حالت غربت میں، تو پھر ہر ذنب پر مواخذہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر غلطی اپنا مضر اثر پیدا کر کے رہتی ہے۔ اگر دل میں ایمان کی قوت، نگاہوں میں قرآنی بصیرت، اور بازوؤں میں عمل کی توفیق ہو تو تدابیر کی چھوٹی موٹی بھول چوک اور اسباب و علائق کی کمی بھی حصول مقصد میں سد راہ نہیں ہوتی۔

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

معجزات

.... نووارد سیاح اپنے سفرِ دنیا کے عجیب و غریب حالات سنا رہا تھا، سامعین اس کے گرد ہمہ تن گوش بیٹھے، بڑی دل چسپی سے اس کی باتیں سُن رہے تھے،

اس نے کہا کہ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لوہے کا ایک بہت بڑا گولا، بغیر کسی سہارے کے ہوا میں معلق، بڑی تیزی سے گھوم رہا ہے اور نیچے نہیں گرتا۔ سامعین کے حلقہ سے بیک وقت کئی آوازیں اٹھیں کہ کیا وہ گولا بغیر کسی سہارے کے ہوا میں کھڑا تھا؟ اس نے کہا ہاں۔ بغیر کسی سہارے کے ہوا میں معلّق۔ سامعین نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انکی نگاہوں کے اشارے اور چہرے کے آثار صاف بتا رہے تھے کہ اس واقعہ کی صداقت پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے، اس لئے کہ یہ بات انہیں ناممکن نظر آتی تھی کہ لوہے کا گولا بغیر کسی سہارے کے ہوا میں معلق گھوم رہا ہو اور نیچے نہ گرے۔ حالانکہ ان میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ وہ جس زمین پر بیٹھے اس واقعہ کے امکان کو بنظر اشتباہ دیکھ رہے ہیں وہ اس لوہے کے گولے سے کروروں گنا بڑا گولا ہے جو بغیر کسی سہارے کے فضا میں معلق گھوم رہا ہے اور نیچے نہیں گرتا۔ اس حقیقت پر ایمان اور اُس پر شبہ! یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ جو چیزیں ہم عادةً دیکھ رہے ہوں وہ خواہ کتنی ہی محیر العقول کیوں نہ ہوں، ہمیں عجیب و غریب دکھائی نہیں دیتیں

خلافِ عادت واقعہ حیرت انگیز ہوتا ہے

لیکن جو چیز ہمارے سامنے خلافِ عادت آئے اسے ہم عجیب و غریب سمجھتے ہیں۔ اور اگر وہ ہمارے سامنے واقعہ نہ ہو اور کوئی دوسرا اس واقعہ کو بیان کرے تو اس کی صحت پر ہم کبھی یقین نہیں کرتے، اسی عادت کا اثر ہے ورنہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کا ایک ایک ذرہ اور جس نظام کے ساتھ یہ پیوستہ ہے اس کا ایک ایک جزو ایسا تحیر انگیز اور ندرت در آغوش ہے کہ اگر ہم اس کے دیکھنے کے عادی نہ ہو چکے ہوں تو قدم قدم پر ہمیں حیرت و استبعاد کی وادیاں نظر آئیں جن کے الجھاؤ سے کبھی ہمارا ذہن باہر نہ نکل سکے۔ کسی اور دنیا کے رہنے والے کو بڑ کا درخت دکھلایئے اور پھر اس کا بیج، اور اس سے کہیئے کہ یہ درخت اس بیج سے نکلا ہے۔ پھر اس سے پوچھئے کہ آپ کے متعلق وہ کیا رائے رکھتا ہے؛ خود ہماری یہ حالت ہے کہ (مثلاً) جب یہاں پہلے پہل یہ خبر آئی ہے کہ اب ایک ایسی ایجاد ہوئی ہے کہ کوئی شخص لندن میں باتیں کرے تو ہم اپنے مکان میں بیٹھے وہ باتیں بلا تکلف سن لیا کریں گے۔ تو ہماری نگاہوں نے اس خبر کا استقبال استہزار کی ہنسی سے کیا تھا۔ لیکن

آج ہمارے گھروں کے بچّے ریڈیو کے پاس بیٹھے سب کچھ سنتے ہیں اور ان کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ کیسی عجیب وغریب چیز ہے۔ وہ اس کے ایسے ہی عادی ہو چکے ہیں جیسے صبح سویرے سورج نکلتا دیکھنے کے۔ جب ہم کسی واقعہ کو خلافِ عادت دیکھتے ہیں تو اس سے استعجاب پیدا ہوتا ہے اور ذہن اس کی ماہیت سمجھنے سے

معجزہ

عاجز دکھائی دیتا ہے۔ اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔ لیکن ہم جب اسی "معجزہ" کو ہر روز دیکھنے لگ جائیں تو چونکہ ذہن اسے دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس میں استعجابی کیفیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے وہ معجزہ نہیں رہتا روزمرہ کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی واقعہ اپنی نوعیت میں معمولی یا غیر معمولی اور مطابق فطرت (Natural) یا مافوق الفطرت (Super Natural) نہیں ہوتا۔ سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظہور عادۃً ہوتا ہے یا خلافِ عادت۔

ذہن انسانی کا عہد طفولیت

ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں ہر غیر عادی واقعہ یا غیر معمولی چیز سے بیحد متاثر ہوتا تھا۔ بہت اونچا پہاڑ، بہت چوڑا دریا، کوئی بہت بڑا درخت، سب اس کے نزدیک مافوق الفطرت کیفیات کے حامل تھے۔ خاموش فضاؤں میں گرج، سیاہ بادلوں میں چمک، ہوا سے پانی کا نزول، سب عجائب وغرائب کے مظاہر تھے۔ جب اس نے دو پتھروں کی رگڑ سے پہلے پہل آگ پیدا ہوتی دیکھی تو فرطِ حیرت سے سجدہ ریز ہو گیا کہ اس کی کرشمہ زائیاں اس کی سمجھ سے باہر تھیں، اپنے سے بڑی قوت والا انسان اس کے نزدیک انسان نہیں دیو تھا۔ اپنے سے زیادہ سمجھ والا اس کے ذہن میں بشر نہیں خدا تھا۔ اگر کوئی دو چار بوٹیوں کے خواص معلوم کر کے تپ اتار دیتا یا درد ہٹا دیتا تو اس کی پرستش شروع ہو جاتی۔ اور اگر کوئی اپنی قوتِ ارادی کے ارتکاز (Concentra-tion) سے ہسٹریا کے جنونی دوروں کا ذفیعہ کر دیتا تو پھر اس کی خدائی کا تو پوچھنا ہی کیا؟ قدیم مصری اور یونانی اصنامی افسانے اور چین و ہندوستان کے دیوی دیوتا اور اوتار سب اسی زمانہ کی ذہنی کیفیات کی تخلیق ہیں۔ اسی ماحول میں خدا کے فرستادہ حضرات انبیاء کرام تشریف لاتے رہے۔ ان کا منصب یہ تھا کہ وہ ذہن انسانی کو صحیح راستہ پر لگائیں اور انسان کو اس کے اصلی مقام سے روشناس کرائیں، وہ اپنی حقیقت کشا تعلیم سے انسانوں کی صحیح تربیت کرتے، انہیں مظاہر فطرت سے خدمت لینے کا طریقہ سکھاتے۔ آپس میں رہنے سہنے کے ڈھنگ بتلاتے۔ خدا کا صحیح تصور ان کے دلوں میں جاگزیں کراتے۔ انہیں بتاتے کہ انسان کی صحیح عظمت کا معیار اس کی سیرت ہے نہ کہ اس سے ایسی چیزوں کا ظہور جن کی علت ہنوز ان کی سمجھ میں نہ آسکتی ہو۔

حضرات انبیاء کرام کی تعلیم

ذہن انسانی کی اس سطح اور اس کے تقاضوں کو سامنے رکھیے۔ اور پھر سوچیے کہ تعلیم و تربیت کا یہ مرحلہ کس قدر دشوار گزار اور صعوبت آمیز تھا۔ انہیں کیسی کیسی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو گا۔ جو لوگ اس طرح خدا بن چکے تھے ان کی طرف سے مخالفت، اور پھر جن کی تعلیم مقصود تھی ان کے ذہن کی اسی خامی۔ یہ انہیں حقیقت سے آشنا کرنے کی کوشش کرتے اور ان کی طرف سے قدم قدم پر خارقِ عادت مظاہرات کا تقاضا

ہوتا۔ وہ ان تقاضوں کی روک تھام کرتے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ ان حضرات کو اپنے نصب العین کی آخر الامر کامیابی کے لئے حق و باطل کی معرکہ آرائی میں خود ان ہی لوگوں کے ہتھیاروں سے کام لینا پڑتا۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا مقصد پیش نظر

بعض اوقات معجزات کا ظہور ناگزیر ہو جاتا تھا۔

یہ تھا کہ فرعون کی خدائی کے باطل نظام کو درہم برہم کریں، اور بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نکال کر خدا کی محکومیت کے تابع لے آئیں، اس کے لئے انہوں نے ہر طرح سے کوششیں کیں۔ فرعون کو دلائل و براہین سے سمجھایا کہ وہ کتنی بڑی گمراہی پر ہے۔ اس کے عمائد سلطنت و اراکین مملکت کی بصیرت و فراست کو دعوت حق شناسی دی۔ اور انہیں سمجھایا کہ وہ تباہی و بربادی کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اس سے یہی کہتے رہے کہ ہمارے نزدیک تمہارے دعویٰ حق و صداقت کے کذب و صدق کا معیار یہی ہے کہ تم ہمارے ساحرین سے بڑھ کر کرشمے دکھا سکتے ہو یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ کذب و صداقت کا یہ کوئی معیار نہیں تھا اور حضرت موسیٰؑ یہ بھی جانتے تھے کہ ان لوگوں نے یہ بات محض کٹ حجتی کے طور پر محض اس لئے پیش کی ہے کہ انہیں خیال ہے کہ میں اس معرکہ میں شکست کھا جاؤں گا۔ لیکن بایں ہمہ وہ (باذن خداوندی) اس پر بھی آمادہ ہو گئے تاکہ اس سے اتمام حجت ہو جائے۔ اور کم از کم قوم فرعون کے عوام میں فرعون کے برسر حق ہونے کے دعویٰ باطل کی

معجزات کلیمیٰ

طرف سے تذبذب پیدا ہو جائے اور اس طرح مخالفت کی قوت میں کمزوری آ جائے۔ مقابلہ ہوا اور عصائے موسوی نے وہ کرشمہ دکھایا کہ خود ساحرین فرعونی نے صداقت کے سامنے گردنیں جھکا دیں اسے مذہبی اصطلاح میں معجزہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں معجزہ کا لفظ نہیں آیا۔ اس نے اس کے لئے آیت (نشانی) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یورپ میں جب علم طبیعیات (Physical Science) کا چرچا ہوا تو انہوں نے تجارب و مشاہدات سے دیکھا کہ قوانین فطرت (Laws of Nature) ایسے بندھے ٹکے اصولوں کے ماتحت سرگرم عمل ہیں کہ ان میں ایک ذرہ کے برابر بھی کہیں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ ہر واقعہ علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور ہر نتیجہ ذرائع کے صغریٰ و کبریٰ میں بندھا ہوا۔ جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ ہر نئے نظریہ میں شدت اور غلو ہوتا ہے۔ ان میں بعض علت و معلول

یورپ کا انکار

(Cause and Effect) کی سحر کاریوں سے اس درجہ مسحور ہوئے کہ سب کچھ انہی قوانین کو سمجھ لیا اور اس طرح خدا کی ہستی تک سے انکار کر بیٹھے۔ بعض کو خدا کی ہستی سے انکار کی جرأت تو نہ ہوئی لیکن وہ بھی اسے خدائے قادر و مختار کی بجائے ایک ایسی ہستی سمجھنے پر مجبور ہو گئے جو اس سلسلۂ کائنات کو حرکت دے کر ایک عضو معطل کی طرح الگ ہو بیٹھا ہے اور اس میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ بعض متشدد یہاں تک کہنے لگ گئے کہ یہی نہیں کہ خدا ان قوانین میں دخل نہیں دیتا بلکہ

> قوانین فطرت ایسے غیر متبدل ہیں کہ انہیں خدا بھی بدل نہیں سکتا۔[1]

[1] (Hugo grotius (1625) ایک ولندیزی مصنف، اپنی (The Rights of War and Peace

اسی تشدد کے عالم میں معجزات پر بھی بحث چھڑی اور ظاہر ہے کہ اس کے متعلق کیا رائے قائم ہوئی ہوگی؟ متشدد طبقہ نے اس کا اعلان کر دیا کہ کارگہہ فطرت میں خارق عادات واقعہ کا امکان محال ہے۔ ڈیوڈ ہیوم وغیرہ نے اس کا بہت چرچا کیا اور اس طرح معجزات کے وقوع سے انکار کیا گیا۔ ہم اس موضوع پر کسی تفصیلی بحث تمحیص کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ اوّل تو خود یورپ میں قوانین فطرت کے متعلق نظریہ تشدد کا وہ بحران خود بخود ختم ہو رہا ہے۔ طبعیات کے متعلق وہاں مزید تجارب و معلومات نے

ان کی نگاہوں کی تبدیلی

ان میں بڑی حد تک اعتدال پیدا کر دیا ہے۔ فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کے ماہرین اب یہ کہہ رہے ہیں کہ بعض نتائج اس طرح ظہور میں آجاتے ہیں کہ ان کے اسباب و علل (Cause and Effect) کی کئی ایک کڑیاں راستہ میں سے گم ہوتی ہیں[1]۔ حتیٰ کہ بعض ائمۂ علم طبیعیات یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ

> ہمیں ایسا فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ کوئی خاص قوانین فطرت موجود ہیں۔ یا یہ کہ کوئی خاص قوانین فطرت اس وقت تک موجود ہیں تو وہ آئندہ بھی اسی طرح رہیں گے۔ یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ کسی سہانی صبح فطرت کسی ایسے خلاف توقع واقعہ کو ظہور میں لے آئے جس سے ہم سب بکے بکے رہ جائیں[2]۔

علاوہ بریں خود یورپ کے علمائے تحقیق ان کی کتب مقدسہ میں مندرج معجزات کے متعلق سائنٹیفک توجیہات بہم پہنچانے میں کوشاں ہیں۔ مثلاً (E.R. Micklem) نے اپنی کتاب (Miracles and The New Psychology) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جن بیماریوں کا علاج معجزانہ انداز سے کرتے تھے وہ دراصل علم النفس کے ذریعے (Psychotherapy)[3] کا طریق علاج تھا جو اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک فی الواقعہ معجزہ تھا۔ ان معجزات کی توجیہات متعین کرنے کے بعد یہ مصنف لکھتا ہے کہ ابھی ہم قوانین فطرت کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل نہیں کر سکے۔ جب انسانی علم مزید ترقی کرے گا تو دیگر معجزات کے متعلق بھی سائنٹفک توجیہات سامنے آجائیں گی۔ خارق عادات واقعات کے امکان کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اس سے نظام عالم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ نظام عالم میں

---

[1] (تفصیل معارف القرآن جلد دوم) عنوان وحی میں گزر چکی ہے۔

[2] (MAX PLANCK) تفصیل کے لئے دیکھئے، معارف القرآن جلد سوم، پیش آہنگ۔

[3] اس باب میں (J.A. Hadfield) کی کتاب (Functional Nerve-Diseases) اور (Baudouin) کی کتاب (Suggestion and Auto-Suggestion) دل چسپ معلومات بہم پہنچاتی ہے۔

انتشار اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب عناصر فطرت خود بخود قانون شکنی شروع کر دیں۔ اور جس طرح کسی کا جی چاہے کرنے لگ جائے۔ لیکن اگر خالق نظام فطرت خود کسی وقت، خاص مقصد کے پیش نظر کوئی ایسا واقعہ ظہور میں لے آئے اور اس کا انتظام کر دے کہ باقی نظام پر اس کا اثر نہ پڑے تو اس کے امکان پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ قرآن کی رو سے معجزات کے قائل صرف اتنی ہی بات مانتے ہیں۔ وہ نہ مظاہر فطرت میں سے کسی میں اتنی قدرت مانتے ہیں کہ وہ خود بخود خدا کے متعین کردہ قوانین کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں۔ اور نہ کسی انسان میں یہ مقدرت (خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو) کہ وہ قوانین فطرت میں دخل اندازی کر سکے۔ البتہ وہ خدا کو قادر و مختار مانتے ہیں عضو معطل نہیں مانتے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا کو اپنے انتظام کی ہم سے زیادہ فکر ہے۔

معجزات کے قائل

یہ تو ہے اس بات کی پہلی وجہ کہ ہم اس موضوع پر شرح و بسط سے بحث کرنا کیوں ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قرآن کے بعد، معجزات کا وقوع انبیائے سابقہ کے تاریخی واقعات کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کے وقت سے معجزات کا وقوع ختم ہو گیا لہٰذا یہ بحث نظری رہ گئی۔

بعثت نبی اکرمؐ

نبی اکرمؐ کی بعثت، تاریخ انسانیت میں حد فاصل کا حکم رکھتی ہے۔ اگر آپ بغور دیکھیں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ حضورؐ کی بعثت سے فی الواقعہ انسانی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دور انسان کے پورے مستقبل کو محیط ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دور سے تاریخ میں ایک انقلاب عظیم کی ابتدا ہوئی۔ انسانی اقدار ایک ایک کر کے بدلتی گئیں۔ زاویائے نگاہ میں حیرت انگیز تبدیلی ہونی شروع ہو گئی۔ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے پرانے نظام ایک ایک کر کے مسترد ہونے لگے۔ انسانوں کے گرد جو غیر فطری حدود و قیود متعین کر دی گئی تھیں وہ ایک ایک کر کے گرنی شروع ہو گئیں۔ مظاہر فطرت کے متعلق صحیح معلومات نے تسخیر فطرت کی ابتدا کر دی۔ انسانی بصیرت نے ایک مدت کے خواب گراں سے انگڑائی لی۔ دانش و بینش نے کروٹ بدلی۔ جہالت کی شب تیرہ و تار ختم ہوئی اور خاور علم کی روشنی نے ہر شے کو اس کی اپنی جگہ پر دکھایا۔ یہ دور گویا ذہن انسانی کے عہد بلوغت و سن رشد کا پیش آہنگ تھا اس لئے اب جو نظام زندگی انسانوں کو دیا جا رہا تھا اسکی دعوت سرتاسر حکمت و بصیرت اور دلیل و برہان پر مبنی تھی۔ اسی لئے قرآن نے اعلان کر دیا کہ اس دعوت کو کسی مافوق الفطرت کرشمہ کے زور سے نہیں منوایا جائے گا بلکہ یہ علم و بصیرت کے مؤیدات سے آگے بڑھے گی۔ نبی اکرمؐ سے ارشاد ہوا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ

دعوت علیٰ وجہ البصیرت

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ

۱؎ اس آیت میں "مَنِ اتَّبَعَنِیْ" کا ٹکڑہ قابل غور ہے۔ یعنی خود رسول اللہ نے بھی اس دعوت کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کیا اور حضورؐ کے بعد آپ کی امت بھی اسے علم و بینش کی روشنی میں آگے چلائے گی۔ عجائبات و کرامات کے زور سے نہیں۔

وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہہ دو "میری راہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت بلاتا ہوں، اور اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے، وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں۔ اللہ اس سے منزہ ہے کہ اس کی طرف دعوت جہالت اور توہمات کی بنا پر دی جائے۔ میں شریک کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ . . . .

اس نے کہہ دیا کہ میں خدا کی طرف سے ایک کھلی ہوئی دلیل (یعنی قرآن) لایا ہوں اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ (۶/۵۷)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہو۔ بلاشبہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی اور حجت پر ہوں (یعنی اس نے حقیقت ویقین کی راہ مجھے دکھا دی ہے) اور تم نے اسے جھٹلایا ہے۔ (پس اب فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کیوں اُس کا فیصلہ فوراً ظاہر نہیں ہو جاتا، تو تم جس (فیصلہ) کے لئے جلدی مچا رہے ہو وہ کچھ میرے اختیار میں تو ہے نہیں۔ حکم تو بس اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ حق کی باتیں بیان کرتا ہے۔ اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

اس کی تکذیب کرتے ہو تو اس کے لئے کوئی دلیل لاؤ،

هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ (۲/۱۱۱) نیز (۲۱/۲۴، ۲۷/۶۴، ۲۸/۷۵)

اگر تم (اپنے انکار وطغیان میں) سچے ہو تو دلیل پیش کرو!

اس لئے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں وہ خود ایک برہان (دلیل) ہے۔ دلیل کے مقابلہ میں دلیل آنی چاہیئے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ۝ (۴/۱۷۴)

اے افراد نسل انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (یعنی دلیل وحجت) آگئی، اور ہم نے تمہاری طرف واضح وآشکار روشنی بھیج دی۔

یہی تقاضائے علم ہے۔ اس لئے اگر تمہارے پاس علم ہے تو اسے پیش کرو، یونہی ظن وقیاس سے تو علمی حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (۶/۱۴۸)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہو، کیا تمہارے پاس (اس بارے میں) کوئی علم ویقین ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ (اگر ہے تو پیش کرو) اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے، مگر محض وہم وگمان کی۔

اور تم (اپنی باتوں میں) اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بناتے ہو!

میرا پیش کردہ پیغام خدا کی طرف سے ایک دلیل قاطع اور حجت بالغہ ہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۶/۱۴۹)

(اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو، اللہ ہی کے لئے کامل اور پکی دلیل ہے (جو اس نے سمجھ بوجھ رکھنے والوں پر واضح کردی ہے) پس اگر وہ چاہتا تو سب کو راہ دکھا دیتا۔ (کیونکہ اس کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس نے ایسا نہیں چاہا۔ اور اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا۔)

اور تمہارے پاس اپنے دعویٰ کی صداقت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۲۳/۱۱۷)

اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی دوسرے (من گھڑت) معبود کو پکارتا ہے تو اس کے پاس اس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اس کے پروردگار کے حضور اس کا حساب ہونا ہے۔ یقیناً کفر کرنے والے کبھی کامیابی نہیں پائیں گے!

اس لئے تمہارا انجام ہلاکت و تباہی ہے کہ جو قوم اپنا مسلک حیات، ظن و تخمین اور جہالت و تقلید کی بنیادوں پر رکھتی ہے، اور علم و برہان کی روشنی میں رستہ کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ ہونا نہیں چاہتی، وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ اب وہ زمانہ آچکا ہے کہ جسے زندہ رہنا ہوگا، دلیل و برہان کی بنا پر زندہ رہ سکے گا، اور جسے فنا ہونا ہوگا وہ بھی دلیل و حجت کی بنا پر فنا ہوگا۔

لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۴۲)

جسے ہلاک ہونا ہے اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو، اور جو زندہ رہنے والا ہے، اتمام حجت کے بعد زندہ رہے، اور بلاشبہ اللہ سب کی سنتا، اور سب کچھ جانتا ہے!

اس لئے کہ اندھا اور بہرہ، اور سمیع و بصیر برابر نہیں ہو سکتے۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (۱۱/۲۴)

ان دو فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرہ، اور ایک دیکھنے سننے والا، پھر بتلاؤ، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں

جاہل اور صاحب علم ایک سطح پر نہیں رہ سکتے۔

أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ ... (۱۳/۱۹)

(اے پیغمبر اسلام!) کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ دونوں آدمی برابر ہو جائیں؟ وہ جو یہ بات جان گیا ہے کہ جو بات تجھ پر تیرے پروردگار کی جانب سے اتری ہے، حق ہے، اور وہ، جو (اس حقیقت کے مشاہدہ سے) اندھا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ سمجھتے بوجھتے ہیں، جو دانشمند ہیں۔ ...!

عقل و بصیرت سے کام نہ لینے والوں کا انجام ہلاکت ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا، (یعنی بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے) ان کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں، مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل و حواس کا استعمال کھو کر) چارپایوں کی طرح ہو گئے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے ہیں!

اس لئے کہ یہ لوگ بدترین خلائق ہیں کہ جس عطیہ کو فطرت نے وجہ شرف انسانیت قرار دیا تھا، اسی سے کام نہیں لیتے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۸/۲۲)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے، گونگے ہو گئے، جو کچھ سمجھتے نہیں!

کفار کی معجزہ طلبی

کفار کہتے تھے کہ اگر آپ خدا کی طرف سے رسول ہیں تو کوئی معجزہ دکھائیے، اس کے بغیر ہم کیسے مان لیں کہ آپ مامور من اللہ ہیں۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ۝ (۱۳/۲۷)

جن لوگوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کی ہے، وہ کہتے ہیں "ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس شخص پر اس کے

پروردگار کی طرف سے کوئی عجیب وغریب) نشانی اتری؟" (اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو۔ اللہ جسے چاہتا ہے (اپنے قانون مشیت کے مطابق بدبختی و شقاوت کی) راہ میں گم کر دیتا ہے، اور جو اُس کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اسے اپنی طرف بڑھنے کی راہ دکھا دیتا ہے! (اس لئے ہدایت انابت الی اللہ سے حاصل ہوگی نہ کہ معجزات سے)

دوسری جگہ ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳/۷)

اور جن لوگوں نے انکار (کفر) کا شیوہ اختیار کیا ہے، وہ کہتے ہیں" اس آدمی پر اُس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری؟ حالانکہ تو اُس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ (انکار و بدعملی کے نتائج سے) خبردار کر دینے والا ایک رہنما ہے اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما ہوا ہے!

سورہ بنی اسرائیل میں ان کے مطالبات کی وضاحت ان الفاظ میں فرما دی۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۚ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝ (۱۷/۹۰-۹۳)

اور انہوں نے کہا" ہم تو اُس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں، جب تک کہ تو اس قسم کی باتیں کر کے نہ دکھائے۔ (مثلاً) ایسا ہو کہ تو حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے۔ یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اور اُس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کر کے دکھا دے، یا جیسا کہ تو نے خیال کیا ہے، آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر آگرے، یا اللہ اور اُس کے فرشتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوں۔ یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لئے مہیا ہو گیا ہے۔ یا ایسا ہو کہ تو بلند ہو کر آسمان پر چلا جائے۔ اور اگر تو آسمان پر چلا بھی گیا، تو ہم یہ بات ماننے والے نہیں جب تک تو ایک (لکھی لکھائی) کتاب ہم پر نہ اُتار لائے اور ہم خود اُسے پڑھ کر جانچ نہ لیں (اے پیغمبر اسلام!) ان لوگوں سے کہدے "سبحان اللہ! (میں نے کچھ خدائی کا دعوا تو کیا نہیں) میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک آدمی ہوں پیغام حق پہنچانے والا!

سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ○ (۲۹/۵۰)

اور یہ (منکرین حق) یوں کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتریں؟ (اے پیغمبر اسلام!) تو کہدے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں اور میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

اس جواب پر کہ معجزات خدا کے اختیار میں ہوتے ہیں (۶/۱۰۹) اور میں تو ایک انسان ہوں جو تمہیں تمہارے اعمال کے نتائج وعواقب سے آگاہ کرتا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ پھر خدا سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ آپ کو معجزہ دے۔

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○ (۷/۲۰۳)

اور (اے پیغمبر اسلام!) جب ایسا ہوتا ہے کہ تم اُن کے پاس کوئی نشان نہ لیکر جاؤ (جیسی نشانیوں کی وہ فرمایش کرتے ہیں) تو کہتے ہیں کیوں کوئی نشانی پسند کر کے نہ چُن لی؟ (یعنی کیوں اپنے جی سے نہ بنالی)، تم کہدو حقیقت حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کرتا ہوں۔ (میرے ارادے اور پسند کو اس میں کیا دخل؟) یہ (قرآن) تمہارے پروردگار کی طرف سے سرمایۂ دلائل ہے، اور اُن سب کے لئے جو یقین رکھنے والے ہیں ہدایت اور رحمت!

یہود و نصاریٰ کے ہاں چونکہ ان کی کتابوں میں حضرات انبیاءؑ سابقہ کے معجزات کا ذکر تھا اس لیے وہ ان تقاضوں میں پیش پیش تھے۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَٰلِكَ ۚ وَآتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَانًا مُّبِينًا ○ (۴/۱۵۳)

(اے پیغمبر اسلام!) اہل کتاب (یعنی یہودی) تم سے درخواست کرتے ہیں کہ آسمان سے کوئی کتاب اُن پر نازل کرا دو، (تاکہ انہیں تصدیق ہو جائے کہ تم خدا کے نبی ہو) تو (یہ فرمائش تم ہی سے نہیں کی ہے) یہ لوگ اس سے بھی بڑی بات کا سوال کر چکے ہیں۔ انہوں نے (یعنی اُن کے بزرگوں اور

ہم مشریوں نے سینا کے میدان میں) کہا تھا "ہمیں خدا آشکارا طور پر دکھا دو" (یعنی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں خدا ہم سے کلام کر رہا ہے) تو اُن کی شرارت کی وجہ سے بجلی رکی ہولناکی) نے انہیں پکڑ لیا تھا اور اس پر بھی وہ نافرمانی اور شرارت سے باز نہیں آئے تھے) پھر باوجودیکہ (دین حق کی) روشن دلیلیں اُن پر واضح ہو چکی تھیں، وہ (پرستش کے لئے) بچھڑے کو لے بیٹھے (اور بت پرستی میں مبتلا ہو گئے)۔ مگر ہم نے اس سے بھی درگذر کی، اور موسیٰ کو (قیام حق و شریعت میں) ظاہر و واضح تسلط دیدیا!

سورہ آل عمران میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْہُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳/۱۸۲﴾

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا لیتی ہو تو تم اُن سے کہدو، (اگر تمہارے پاس رد و قبول کا معیار یہی ہے تو بتلاؤ) مجھ سے پہلے اللہ کے کتنے ہی رسول سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آئے، اور اُس بات کے ساتھ آئے جس کے لئے تم کہہ رہے ہو، (یعنی سوختنی قربانی کے حکم کے ساتھ) پھر اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو کیوں تم نے انہیں قبول نہیں کیا، اور کیوں ایمان لانے کی جگہ) انہیں قتل کرتے رہے!

اُن سے کہا گیا کہ پہلے تو یہ سوچو کہ کیا معجزہ ایسی چیز ہے جسے دیکھنے کے بعد سب لوگ ایمان لے آتے ہیں؟ تمہارے پاس خود تمہارے انبیاء کی تاریخ موجود ہے، ذرا حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی معرکہ آرائیوں کی داستان پڑھئے اور دیکھئے کہ سرکش قوتوں نے معجزات دیکھ کر بھی کیا کہا تھا۔

فَلَمَّا جَآءَہُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی ؕ اَوَلَمْ یَکْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰہَرَا ۟ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوْنَ ﴿۲۸/۴۸﴾

چنانچہ ہماری طرف سے جب ان کے پاس امر حق پہنچا تو بہانہ سازی سے جھٹ کہنے لگے کہ ان کو ایسی کتاب کیوں نہ ملی جیسی موسیٰ کو ملی تھی۔ کیا اب سے پہلے یہ لوگ موسیٰ کو دی ہوئی کتاب کا انکار نہیں کر چکے ہیں؟ (اب بھی یہ لوگ یہی) کہتے ہیں کہ یہ دونوں جادوگر ہیں جو باہمدگر موافق ہیں اور (اسی لئے) کہتے ہیں کہ ہم تو دونوں ہی کے منکر ہیں!

دوسری جگہ ہے۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَۃٍۭ بَیِّنَۃٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَۃَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (۲/۲۱۱)

(اے پیغمبر اسلام! چاہیئے کہ لوگ پچھلی اُمتوں کی سرگزشتوں سے عبرت پکڑیں) بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انہیں (علم و بصیرت کی) کتنی روشن نشانیاں دیں (اور کس طرح فلاح و سعادت کی تمام راہیں اُن پر کھول دیں؟ لیکن پھر بھی راہ ہدایت پر قائم نہ رہے، اور نعمت الٰہی کی قدر شناسی نہ کی) اور جو کوئی خدا کی نعمت پاکر پھر اُسے (محرومی و شقاوت سے) بدل ڈالے، تو یاد رکھو، خدا (کا قانون مکافات) بھی سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

سورۂ آل عمران کی جو آیت اوپر درج کی جاچکی ہے (۳/۱۸۳) اس میں ان سے کہا گیا ہے کہ اقوام سابقہ نے معجزات دیکھنے کے باوجود انبیار کو قتل کردیا۔ لہٰذا اُن کا یہ مطالبہ حقیقت پر مبنی نہیں کہ یہ لوگ ایمان لانے کے لئے معجزات کے منتظر ہیں۔ اس لئے معجزات کی اب ضرورت نہیں۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِھَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ (۱۷/۵۹)

اور (جو نشانیاں منکرین حق طلب کرتے ہیں، اُن) نشانیوں کے بھیجنے سے ہمیں کون روک سکتا ہے؟ مگر یہ کہ ہم جانتے ہیں، پچھلے عہد کے لوگ ایسی ہی نشانیاں جھٹلا چکے ہیں،

سورۂ انبیار میں ہے۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىہُ بَلْ ھُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَۃٍ کَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَھُمْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا ۚ اَفَھُمْ یُؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۱/۵-۶)

(اتنا ہی نہیں، بلکہ اُنہوں نے کہا "یہ محض خواب و خیال کی باتیں ہیں، بلکہ من گھڑت دعوٰی ہے، نہیں بلکہ یہ شاعر ہے، اگر ایسا نہیں تو کوئی (نزول ہلاکت کی) نشانی ہمیں لا دکھائے، جس طرح اگلے وقتوں کے لوگ نشانیوں کے ساتھ بھیجے جاچکے ہیں! لیکن ان سے پہلے جن جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا ان میں سے تو کوئی بھی (نزول ہلاکت کی نشانیاں دیکھ کر) ایمان نہیں لے آیا تھا۔ پھر کیا یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔

لہٰذا جو لوگ علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے وہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَھُمْ بِاٰیَۃٍ

لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ۝ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۵۸-۵۹/۳۰)

اور ہم نے بنی نوع انسان (کی ہدایت) کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی (سود مند) باتیں بیان کر دی ہیں اور اگر تم، ان کے پاس کوئی نشانی بھی لے آؤ، تب بھی یہ لوگ جنہوں نے انکار (کفر) کی راہ اختیار کر رکھی ہے یہی کہیں گے کہ تم (یعنی رسول اور اُس کے متبعین) سب کے سب نرے اہل باطل ہو، (حقیقت حال یہ ہے کہ) جو لوگ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اللہ اُن کے دلوں پہ اسی طرح (قبول حق سے) مہر لگا دیتا ہے۔

ایمان نہ لانے والوں کے لئے آیات و وعید کچھ کام نہیں دیا کرتے۔

قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَن قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ (۱۰/۱۰۱)

(اے پیغمبر اسلام!) تم ان لوگوں سے کہو، کہ جو کچھ آسمان میں (تمہارے اوپر) ہے اور جو کچھ زمین میں (تمہارے چاروں طرف) ہے، اس سب پر نظر ڈالو اور دیکھو وہ زبانِ حال سے کس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں؟ لیکن جو لوگ یقین نہیں رکھتے ان کے لئے نہ تو (قدرت کی) نشانیاں ہی کچھ سود مند ہیں، نہ (ہوشیار کرنے والوں کی) تنبیہیں!

یہ آپ کی رسالت سے انکار کی وجہ یہی بتاتے ہیں تا کہ وحی ایک غیر محسوس سی کیفیت ہے جس کے متعلق یقینی طور پر نہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کے متعلق دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے یا نہیں۔ لیکن اُن کی محض کہنے کی باتیں ہیں۔ اُن کے حالات یہ ہیں کہ

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (۶/۷)

اور (اے پیغمبر اسلام!) اگر ہم تم پر ایک کتاب کاغذ پر لکھی لکھائی اتار دیتے، اور یہ لوگ اُسے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ لیتے کہ سچ مچ کتاب ہے، پھر بھی جن لوگوں نے انکار کی راہ اختیار کی ہے وہ (کبھی نہ مانتے، وہ) کہتے یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کھلی ہوئی جادوگری ہے!

ذرا آگے چل کر اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ (۶/۲۵)

اور (دیکھو) اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو (بظاہر کلام حق) سننے کے لئے تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، اور (واقعہ یہ ہے کہ) ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ اُن تک بات کی سمجھ پہنچتی نہیں۔ اور اُن کے کانوں میں گرانی ہے کہ سُن نہیں سکتے، (یعنی اُن کے جمود اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اُن کے دل و دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے، اور ہمارا قانون یہی ہے کہ جو کوئی ضد اور تعصب میں مبتلا ہوتا ہے اُس کا حال ایسا ہی ہو جاتا ہے) اگر یہ (سچائی کی) ہر ایک نشانی بھی (جو انسان کے لئے ہو سکتی ہے) دیکھ لیں، جب بھی یقین کرنے والے نہیں یہاں تک کہ جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں اور تم سے جھگڑتے ہیں تو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ کہتے ہیں یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پچھلوں کی داستانیں ہیں (جو ہم ہمیشہ سنتے آئے ہیں)"

غور فرمایئے کیسے واضح الفاظ میں فرمادیا کہ جو لوگ فہم و بصیرت سے کام نہیں لیتے وہ معجزات دیکھ کر کیا ایمان لائیں گے اور آگے چل کر ہے۔

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۶/۳۵-۳۷)

اور (اے پیغمبر اسلام!) اگر ان لوگوں کی روگردانی تم پر گراں گزرتی ہے (اور تم سے یہ بات برداشت نہیں ہوتی کہ لوگ ہدایت سے محروم رہیں) تو تم جو کچھ کر سکتے ہو، کر دیکھو، (یہ کبھی باز آنے والے نہیں) اگر تم سے ہو سکے تو زمین کے اندر کوئی سُرنگ ڈھونڈھ نکالو، یا آسمان میں کوئی سیڑھی مل جائے (تو اُس پر چڑھ جاؤ) اور اس طرح انہیں ایک نشانی لا دکھاؤ، (لیکن پھر بھی وہ انکار ہی کریں گے) اگر خدا چاہتا تو ان سب کو دین حق پر جمع کر دیتا۔ (اور سب ایک ہی راہ پر ہو جاتے، مگر تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔) پس دیکھو اُن میں سے نہ ہو جاؤ، جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔ تمہاری دعوت کا وہی جواب دے سکتے ہیں جو تمہاری پکار سنتے ہیں۔ لیکن جو مُردے ہیں (اُن سے جواب کی امید کیوں رکھتے ہو؟) انہیں تو اللہ ہی (قبروں سے) اٹھائے گا اور پھر اُس کے حضور لوٹائے جائیں گے۔ اور انہوں نے کہا۔ کیوں اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی اس پر نہیں اُتاری گئی؟ (اے پیغمبر اسلام!) کہہ دو، خدا یقیناً اس پر قادر ہے کہ نشانی اتار دے، لیکن اکثر آدمی ہیں جو (حقیقت حال) نہیں جانتے!

اسی سورت کے تیرھویں رکوع کے اخیر میں ہے۔

وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا الْآيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ۝ (۶ / ۱۰۹-۱۱۱)

اور یہ (منکرین حق) خدا کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی معجزہ اُن کے سامنے آجائے تو وہ ضرور اُس پر ایمان لے آئیں گے؟ (اے پیغمبر اسلام!) تم کہدو، معجزے تو اللہ ہی کے پاس ہیں، (کسی بندے کے اختیار میں نہیں، اور (مسلمانو!) تمہیں (ان لوگوں کا حال) کیا معلوم؟ اگر معجزہ آبھی جائے جب بھی یہ یقین نہیں لائیں گے۔ ہم اُن کے دلوں کو، اور آنکھوں کو اُلٹ دیں گے، (یعنی ہمارے مقررہ قانون کے بموجب ان کی سمجھ اور اُن کی نظر کام نہیں دے گی، یہ معجزے دیکھ کر بھی اسی طرح انکار کئے جائیں گے) جس طرح قرآن پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انہیں چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشیوں میں بھٹکتے رہیں! اور یقین کرو، اگر ہم اُن پر فرشتے اتار دیتے، اور (قبروں سے) مُردے (اُٹھ کر) اُن سے باتیں کرنے لگتے، اور جتنی چیزیں بھی دُنیا میں ہیں، سب اُن کے سامنے لاکھڑی کرتے، جب بھی یہ ایسا کرنے والے نہ تھے کہ ایمان لے آئیں، ہاں اگر اللہ کی مشیت ہو (تو اس کی قدرت سے کوئی بات باہر نہیں، مگر اس نے ہر بات کے لئے ایک قاعدہ مقرر کر رکھا ہے) لیکن ان میں اکثر ایسے ہیں، جو (یہ حقیقت) نہیں جانتے!

سورۂ حجر میں ہے۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۝ لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ ۝ (۱۵ / ۱۴-۱۵)

اگر ہم ان پر آسمان کا ایک دروازہ کھول دیں، اور یہ دن دھاڑے اس پر چڑھنے لگیں جب بھی نہیں مانیں گے یہ کہنے لگیں گے کہ ضرور ہماری آنکھیں متوالی ہو گئی ہیں، یا ہم پر جادو کر دیا گیا ہے!

اس حقیقت کو قرآن کریم میں اس شدت و تکرار سے اس لئے دُہرایا گیا ہے کہ ایک طرف انکار کرنے والوں کے دلوں پر اس بات کو ثبت کر دیا جائے کہ بات صرف اتنی نہیں کہ تم لوگ اس لئے ایمان نہیں لاتے کہ رسول معجزہ

ایسا کیوں کیا گیا

کیوں نہیں دکھاتا؟ تم جانتے ہو کہ یہ رسول اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ تم تو اس رسول کو اس طرح پہچانتے ہو جس طرح باپ اپنے بیٹوں کو پہچان لیتا ہے (۲ / ۱۴۶)، تمہارے انکار و جحود اور سرکشی و عدوان کی کئی وجوہات ہیں:۔ اس پر ایمان لانے سے تمہاری مزعومہ خدائی چھن جائے گی۔

اس سے تمہیں ان دسیسہ کاریوں کا موقعہ نہیں مل سکے گا جو اس وقت تمہاری زندگی کا شیوہ بن چکی ہیں۔ دوسری طرف نبی اکرمؐ کی تسکین خاطر بھی مقصود تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ نبی اکرمؐ ایک مشفق و غمخوار طبیب کی طرح ان لوگوں کی بدبختی پر غم کھاتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح یہ لوگ حق و صداقت کی راہ پر آجائیں، اور اس ہلاکت و بربادی سے بچ جائیں، جو اُن کے اعمال کی وجہ سے اُن کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ یہ حسی معجزات مانگتے تھے تو رسول اللہؐ چاہتے ہوں گے کہ ان کی یہ حجت بھی پوری کر دی جائے۔ شاید اسی طرح یہ لوگ بچ جائیں۔ اسی لئے بار بار وضاحت و صراحت سے بتا دیا گیا کہ ان کے متعلق آپ کا یہ خیال بھی محض حسن ظن ہے۔ اُن کے انکار کی یہ وجہ نہیں، اس لئے یہ لوگ اس طرح بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

سورہ شعراء میں ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ ۝ (۲۶/۳-۴)

(اے پیغمبر اسلام!) شاید تم اُن (منکرین حق) کے ایمان نہ لانے پر (رنج و غم کرتے کرتے) اپنی جان دیدو گے اگر ہم چاہیں تو اُن پر آسمان سے ایک نشانی نازل کر دیں، پھر اُن کی گردنیں (خود بخود) اس سے پست ہو جاویں!

سورۂ انعام میں ہے۔

وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ (۶/۳۵)

اور (اے پیغمبر اسلام!) اگر ان لوگوں کی رُوگردانی تم پر گراں گزرتی ہے (اور تم سے یہ بات برداشت نہیں ہوتی کہ لوگ ہدایت سے محروم رہیں، تو تم جو کچھ کر سکتے ہو، کر دیکھو، یہ کبھی باز آنے والے نہیں) اگر تم سے ہو سکے تو زمین کے اندر کوئی سرنگ ڈھونڈھ نکالو، یا آسمان میں کوئی سیڑھی مل جائے (تو اُس پر چڑھ جاؤ) اور اس طرح انہیں ایک نشانی لا دکھاؤ (لیکن پھر بھی وہ انکار ہی کریں گے) اگر خدا چاہتا تو ان سب کو دین حق پر جمع کر دیتا (اور سب ایک ہی راہ پر ہو جاتے، لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہے) پس دیکھو! اُن میں سے نہ ہو جاؤ، جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے!

معجزہ کیوں نہیں دیا گیا

غور فرمائیے ان آیات میں کہا گیا ہے کہ اگر اللہ کی مشیت میں ہوتا تو ان تمام لوگوں کو ہدایت کی راہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا جاتا، یہ تو چھوٹے چھوٹے معجزات طلب کرتے ہیں وہ ان کے سامنے کوئی ایسی چیز لے آتا کہ جس کے بعد فی الواقعہ انہیں مجالِ انکار

نہ ہوتی۔ لیکن یہ اطاعت رضا و رغبت کی نہ ہوتی۔ جبر و اکراہ کی ہوتی۔ اور جبر و اکراہ کی اطاعت مقصود ہی نہیں۔ اطاعت سے مقصود تو یہ ہے کہ وہ شرف انسانیت کی بالیدگی کا موجب بن سکے۔ لیکن جس اطاعت کو بہ جبر منوایا جائے اس میں شرف وسعادت کی نمود و بالیدگی کیا ہو سکتی ہے؟ اس لیئے اس باب میں اُس کا قانونِ مشیت یہی ہے کہ انسان کو عقل وفکر کی روشنی دیکر، دونوں راستے اس کے سامنے واضح کر دیئے جائیں، اور پھر اس پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو، کہ جسکی وجہ سے یہ کوئی خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے جور و اکراہ تو استبداد ہے۔ خواہ وہ جسمانی ہو، یا ذہنی، اور مافوق الفطرت مؤیدات سے ہدایت منوانا ذہنی اکراہ ہے۔ نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد ان اغلال وسلاسل کا توڑنا تھا جس میں ذہن انسانی جکڑا چلا آتا تھا۔ اس لیئے اب کسی کو معجزات کے ذریعے حق پرستی پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح سے حریت فکر کا جوہر عزیز سلب ہو جاتا ہے۔ پھر اگر یہ پیغام صرف اُن مخاطبین کے لیئے ہی ہوتا، تو ہو سکتا تھا کہ ان کا مطالبہ پورا کر دیا جاتا لیکن اس پیغام کو تو قیامت تک کے انسانوں کے لیئے چراغ راہ بننا ہے۔ اس لیئے اس سے کوئی وقتی یا ہنگامی اصلاح مقصود نہیں۔ اس کے لیئے تو ایسی جماعت تیار کرنی تھی جو دنیا کو دکھا سکے کہ اطاعت میں حکومت، جبر میں اختیار، او تسلیم ورضا میں حریت فکر و نظر اس طرح قائم رہتی ہے قائم ہی نہیں رہتی بلکہ پیدا ہوتی ہے، اور نشو و نما پاتی ہے۔ یہ مقصود معجزات سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

قرآن ہمیشہ کیلئے راہ ہدایت ہے

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۹۹)

اور اے پیغمبر اسلام! اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، اور دنیا میں اعتقاد و عمل کا اختلاف باقی ہی نہ رہتا، لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا۔ اُس کی مشیت یہی ہوئی کہ طرح طرح کی طبیعتیں، اور طرح طرح کی استعدادیں ظہور میں آئیں، پھر اگر لوگ نہیں مانتے تو کیا تو اُن پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ میں چھوڑنے والا نہیں۔

لہذا اس قرآن سے دلوں کے بدلنے کا کام لیا جائے گا۔ پتھروں کے تیرانے اور پہاڑوں کے چلانے کا کام نہیں کہ جس سے ذہن مفلوج ہو جائیں تو ہو جائیں دل اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۗ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۗ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۗ (۱۳/۳۱)

اور دیکھو، اگر ہو سکتا کہ کسی قرآن سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین کی بڑی بڑی مسافتیں طے ہو جائیں

یا مردے بول اٹھتے، (تو ضرور اس قرآن سے بھی ایسا ہی ہوتا) مگر نہیں، ساری باتوں کا اختیار اللہ ہی کو ہے۔ (اور اس کی یہ سنت نہیں کہ وہ ایسا کرے، وہ اپنا کلام ارشاد و ہدایت کے لئے نازل کرتا ہے۔ نہ کہ عجائب آفرینیوں کے لئے) پھر جو لوگ ایمان لائے ہیں، کیا وہ (اس بات سے) مایوس نہیں ہو گئے کہ (نہ ماننے والے کبھی ماننے والے نہیں؟ کیا انہوں نے یہ بات نہیں پالی کہ) اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں (ایک ہی) راہ حق دکھا دیتا (مگر اُس نے ایسا نہیں چاہا، اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ یہاں استعداد و عمل کی آزمائشیں ہوں)

فرمایا کہ ان سے کہئے کہ کسی خلاف عادت واقعہ سے حقیقت تک نہیں پہنچا جاتا۔ اس سے ذہن مفلوج ہو جاتا ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کا یہ طریق ہے کہ جو واقعات تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں اور تم اُن سے خوگر ہونے کی وجہ سے ان پر غور نہیں کرتے اور انہیں معمولی سمجھے بیٹھے ہو۔ انہیں دل اور دماغ کی آنکھوں سے دیکھو، ان میں غور و فکر کرو، تمہیں

کائنات کے معجزات کو کیوں نہیں دیکھتے

کائنات کے ایک ایک ذرہ میں آیت (خدا کی نشانی) نظر آئے گی جو ان معجزات سے کہیں بڑی ہوگی جن کا تم مطالبہ کرتے ہو، ذرا اپنے گرد و پیش نظر ڈالو، اور سوچو کہ کائنات کے اس محیر العقول سلسلہ میں عقل و فکر والوں کے لئے کس قدر معجزات بکھرے پڑے ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ٥ (۲/۱۶۴)

بلاشبہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اور کشتی میں جو انسان کی کاربراریوں کے لئے سمندر میں چلتی ہے، اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے، اور اس کی (آبپاشی) سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے، اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہواؤں کے (مختلف رخ) پھرنے میں، اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان (اپنی مقررہ جگہ کے اندر) مسخر ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو عقل و بینش رکھنے والے ہیں بڑی ہی نشانیاں ہیں!

اپنے نخلستانوں کو دیکھو، ان کے چشموں پر غور کرو، پھر زمین سے نظر اٹھا کر، ذرا اجرام فلکی پر نگاہ ڈالو، تنویر شمس و قمر اور تسخیر نجوم و کواکب کو بنظر تعمق دیکھو اور سوچو کہ ان میں کتنی کتنی بڑی نشانیاں مضمر ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ٥ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ٥

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝

(۱۶ : ۱۱-۱۳)

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ اس میں سے کچھ تو تمہارے پینے کے کام آتا ہے۔ کچھ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ اس سے درختوں کے جنگل پیدا ہو جاتے ہیں، اور تم اپنی مویشی ان میں چراتے ہو! اسی پانی سے وہ تمہارے لئے ہر طرح کے غلوں کی کھیتیاں بھی پیدا کرتا ہے، نیز زیتون، کھجور، انگور اور ہر طرح کے پھل۔ یقیناً اس بات میں اُن لوگوں کے لئے ایک بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرنے والے ہیں! اور (دیکھو) اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند مسخر کر دیئے (کہ تمہاری کاربراریوں کے لئے کام کر رہے ہیں) اور اسی طرح ستارے بھی اس کے حکم سے تمہارے لئے مسخر ہو گئے ہیں، یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں! اور زمین کی سطح پر طرح طرح کے رنگوں کی پیداوار جو تمہارے لئے پیدا کر دی ہیں (اُن پر غور کرو) بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے ایک نشانی ہے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں!

تم عجائبات و نوادرات کے تقاضے کر رہے ہو۔ ذرا چشم بصیرت سے دیکھو کہ تمہارے دائیں بائیں، اور اوپر نیچے کس قدر نوادرات پھیلے ہوئے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝ (۱۰ : ۵-۶)

وہی ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو روشن۔ اور پھر چاند کی منزلوں کا اندازہ ٹھہرا دیا، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ نے یہ سب کچھ نہیں بنایا ہے مگر حکمت و مصلحت کے ساتھ، اُن لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں، وہ اپنی قدرت و حکمت کی دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے! بلاشبہ اس بات میں کہ رات کے پیچھے دن اور دن کے پیچھے رات آتی ہے، اور بلاشبہ اُن تمام چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں میں اور زمینوں میں پیدا کی ہیں اُن لوگوں کے لئے (قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں جو متقی ہیں!

ان اجرام فلکی پر غور نہیں کرتے کہ کتنے کتنے بڑے عظیم الجثہ اور ثقیل الہیئت کُرے ہیں جو بغیر کسی سہارے اور آسرے کے فضا کی پہنائیوں میں اپنی اپنی جولانگاہ (فلک) میں تیر رہے ہیں۔ کیا ان سے بڑھ کر کوئی اور معجزہ بھی ہو سکتا ہے؟

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ

وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۝ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝ وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۝ (۱۳ ــ ۲ ــ ۴)

یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو بلند کر دیا۔ اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے پھر وہ اپنے تخت (حکومت) پر نمودار ہوا (یعنی مخلوقات میں اس کے احکام جاری ہو گئے) اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا، کہ ہر ایک اپنی ٹھہرائی ہوئی میعاد تک (اپنی اپنی راہ) چلا جا رہا ہے۔ وہی (اس تمام کارخانۂ خلقت کا) انتظام کر رہا ہے اور (اپنی قدرت و حکمت کی) نشانیاں الگ الگ کر کے بیان کر دیتا ہے تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ (ایک دن) اپنے پروردگار سے ملنا ہے! اور (دیکھو) وہی ہے جس نے زمین کی سطح پھیلا دی اُس میں پہاڑ بنا دیئے، نہریں جاری کر دیں، اور ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے دو دو قسموں کے اگا دیئے۔ اس نے رات اور دن (کے بتدریج ظاہر ہونے) کا ایسا قاعدہ بنا دیا کہ دن کی روشنی کو رات کی تاریکی ڈھانپ لیا کرتی ہے، یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لئے کتنی ہی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرنے والے ہیں! اور دیکھو، زمین میں (طرح طرح کے) ٹکڑے ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے، ان میں انگور کے باغ ہیں (غلہ کی) کھیتیاں ہیں کھجور کے درخت ہیں، باہمد گر ملتے جلتے ہوئے، اور بعض ایسے کہ ملتے جلتے نہیں ہیں، سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر ہم بعض پھلوں کو بعض پر مزہ میں برتری دیتے ہیں، یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں!

اگر طائر نگاہ کو فضا کی بسیط پہنائیوں میں اذن بال کشائی نہیں دینا چاہتے تو اپنے مویشیوں پر اور ان کی چراگاہوں پر ہی غور کرو، کیا یہ ندرت و غرابت کی علامات (نشانیاں) نہیں ہیں؟

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى۝ (۲۰ ــ ۵۳ ــ ۵۴)

وہ پروردگار جس نے تمہارے لئے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی، نقل و حرکت کے لئے اس میں راہیں نکال دیں۔ آسمان سے پانی برسایا، اُس کی آب پاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے، خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی

بھی چراؤ، اس بات میں عقل والوں کے لئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں........؟

اور اگر اتنی بھی تکلیف گوارا نہیں چاہتے تو اپنی اپنی خلوت گاہوں میں بیٹھے خود اپنے آپ پر غور کرو۔ کیا تمہارا وجود، اس کی تخلیق اور اس کا نظام کچھ کم معجزہ ہے؟

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (3/20-21)

اور اُس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک (نشانی) یہ ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر کچھ ہی عرصہ بعد تم (اس قابل ہو گئے کہ) آدمی بن کر چلتے پھرتے (نظر آتے) ہو! اور اسی کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے تمہاری ہی جنس میں سے تمہاری بیبیاں بنائیں، تاکہ تم اُن کے پاس جا کر آرام پاؤ، اور تمہارے میاں بیوی کے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کر دی گئی، اس بات میں اُن لوگوں کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں، جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں!

غرضیکہ کون کون سی چیز گنائی جائے۔ اس حیرت کدۂ ارض وسمٰوٰت میں تو جس گوشے پر نگاہ ڈالو

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

ان آیاتِ الٰہیہ۔ ان معجزاتِ خداوندی سے تو تم آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہو اور ان سے کہیں کمتر درجے کے معجزات کی فرمائش کرتے ہو!

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (12/105)

اور دیکھو) آسمان وزمین میں (اللہ کی قدرت وحکمت کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں، جن پر سے لوگ گزر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔

بصیرت کی آنکھیں کھولو تو یہاں "ہر معمولی" چیز "غیر معمولی" اور ہر "عادی" واقعہ "غیر عادی" دکھائی دے گا۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ ہیں وہ آیات (معجزات) جن کی وساطت سے اب انسان کو خدا کی طرف جانے کا راستہ ملے گا۔ ان ہی کی روشنی میں اس پر حقیقت بے نقاب ہوگی۔

---

[1] آیاتِ الٰہیہ کے متعلق قرآن کریم کی مختلف آیات کا استقصار مقصود نہیں۔ اس مقام پر صرف دو چار آیات لکھدی گئی ہیں، ان کی تفصیل کا اصل مقام علوم القرآن کا عنوان ہے، جو کسی آئندہ جلد میں آئے گا، انشاءاللہ۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (۴۱/۵۳)

ہم عنقریب اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کو آفاق میں (پھیلی ہوئی) بھی دکھائیں گے اور خود اُن کی ذات میں بھی تا آنکہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ (قرآن) حق ہے۔ کیا تیرے پروردگار کی یہ بات (تیری صداقت کی شہادت کے لیئے) کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے!

عالم انفس و آفاق کی یہ آیات، ایمان و ایقان اور دانش و بصیرت سے بے حجاب سامنے آئیں گی۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۵۱/۲۰-۲۱)

اور یقین لانے والوں کے لیئے زمین (کی کائنات) میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں، اور خود تمہاری بھی ذات میں، کیا تم کو پھر بھی بصیرت حاصل نہیں ہوتی؟

اور اگر انفس و آفاق کی ان آیات کی زبان بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی، تو کم از کم ان اقوام گذشتہ و ملل سابقہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو، کہ جن کی داستانیں ہر رات سونے سے پہلے، تمہیں خیموں سے نکال کر الاؤ کے گرد جمع کر لیتی ہیں۔ کیا ان کے انجام و عواقب تمہارے لیئے اس دعوت کی صداقت کی نشانیاں نہیں ہیں؟

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ۝ (۲۰/۱۲۸)

کیا ان لوگوں کو اس بات سے بھی ہدایت نہ ملی کہ ان سے پہلے قوموں کے کتنے ہی دور گزر چکے ہیں، جنہیں ہم (پاداش جرائم میں) ہلاک کر چکے؟ یہ ان کی بستیوں میں چلتے پھرتے ہیں، (اُن کے آثار اُن کی نگاہوں کے سامنے ہیں!) جو لوگ دانشمند ہیں اُن کے لیئے اسی ایک بات میں (تذکیر و عبرت کی) کتنی ہی نشانیاں ہیں؟

اقوام سابقہ کے احوال و کوائف

وہ قومیں کہ جن کی اجڑی ہوئی بستیوں اور ویران کاشانوں سے تم صبح و شام گزرتے ہو، لیکن ان ٹھیکریوں کو بنظر عمیق نہیں دیکھتے جن پر ان کی مٹی ہوئی عظمتوں اور مٹی ہوئی سلطنتوں کی یادداشتیں لکھی ہوئی ہیں[۱]۔

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ۝ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ (۲۲/۴۵-۴۶)

---

[۱] تفصیل کے لیئے دیکھئے معارف القرآن جلد سوم۔ عنوان تلک امۃ قد خلت

پھر دیکھو، کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور وہ ظلم کرنے والی تھیں۔ وہ ایسی اجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کے رہ گئیں، کنوئیں ناکارہ ہو گئے۔ سر بفلک محل کھنڈر بن گئے۔ کیا یہ لوگ ملکوں میں چلے پھرے نہیں کہ عبرت حاصل کرتے؟ ان کے پاس دل ہوتے اور سمجھتے بوجھتے؟ کان ہوتے اور سنتے اور پلٹتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے، تو آنکھیں اندھی ہی نہیں ہو جایا کرتیں (جو سروں میں ہیں) دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں!

غور کرو کہ یہ رسول آخر تم سے کہتا کیا ہے؟ یہی نا کہ زندگی کی جن غلط شاہراہوں پر تم چلے جا رہے ہو، یہ تمہیں بربادی اور ہلاکت کے عمیق غاروں کی طرف لئے جا رہی ہیں۔ تم اس بات کا یقین نہیں کرتے۔ یہ کہتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں سنکھیا کی ڈلی ہے کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ تم کہتے ہو کہ ہم جب مانیں گے کہ سنکھیا ہلاک ہوتا ہے اگر تم اس پتھر کو پانی پر تیرا دو، یہ کہتا ہے کہ کم بختو! میرے دعوٰی اور تمہاری دلیل میں ربط کیا ہے؟ میرے دعوے کی دلیل چاہتے ہو تو ان سامنے کی قبروں کو دیکھو اور ان کے سرہانے گڑی ہوئی الواح کو پڑھو جن پر لکھا ہے کہ انہوں نے سنکھیا کھایا اور اس کا یہ انجام ہوا۔ یہ ہے میرے دعوے کی دلیل، نہ وہ جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو؟ یہ فطرت کا اٹل قاعدہ ہے جو نہ پہلوں کی خاطر بدلا نہ تمہاری خاطر بدلیگا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ج وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۳۳/۶۲)

خدا کا (اٹل) دستور اُن لوگوں میں بھی یہی (جاری) رہا جو پہلے گزر چکے ہیں (اور آئندہ بھی اسی طرح رہیگا، چنانچہ) تم خدا کے دستور (محکم) میں کسی قسم کی تبدیلی نہ پاؤ گے!

ان کھلی ہوئی نشانیوں کے بعد کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا خود ان کے سامنے آجائے یا فرشتے اُن کے پاس پہنچ جائیں؛ اگر فرشتوں کا تقاضا کرتے ہیں تو اُن سے کہہ دیجئے کہ فرشتے اعمال کے ظہور نتائج کے وقت اللہ کا عذاب لیکر آیا کرتے ہیں۔ ان کے آنے کے بعد پھر ایمان لانا کچھ کام نہیں دیا کرتا اس لئے کہ نتائج کا ظہور ہوتا ہی اس وقت ہے جب مہلت کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ عذاب الٰہی کی نشانیاں دیکھ کر پشیمان ہونا کچھ سود مند نہیں ہو سکتا۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (۶/۱۵۸)

پھر یہ لوگ (جو سچائی کی نشانیاں دیکھنے پر بھی سرکشی سے باز نہیں آتے تو) کس بات کے انتظار میں ہیں؟ اس بات کے انتظار میں ہیں کہ (آسمان سے) فرشتے اُن کے پاس آجائیں۔ یا خود تمہارا پروردگار اُن کے سامنے آکھڑا ہو، یا پھر تمہارے پروردگار کی بعض نشانیاں نمودار ہو جائیں (یعنی ظہور نتائج کا وقت آجائے) تو (اگر یہ لوگ اسی بات کی راہ تک رہے ہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ) جس دن تمہارے پروردگار کی

بعض نشانیاں نمودار ہوں گی، اُسی دن کسی انسان کو جو پہلے سے ایمان نہ لاچکا ہو یا اپنے ایمان (کی حالت میں) اُس نے نیکی نہ کمائی ہو، ایمان لانا سود مند نہ ہوگا (اے پیغمبر) تم کہدو۔ (اگر تمہیں انتظار ہی کرنا ہے، تو) انتظار کرتے رہو۔ ہم بھی (فیصلۂ حق و باطل کا) انتظار کرتے ہیں۔

سورۂ حجر میں ہے۔

لَوْ مَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ○ (۱۵/۸)

اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ایسا کیوں نہیں کرتا کہ فرشتے اتار کر ہمیں دکھا دے! ہم فرشتے بیکار کو نہیں اتارا کرتے۔ جبھی اتارتے ہیں کہ کوئی مصلحت ہوتی ہے اور (جب فرشتے اتریں گے) تو اُس وقت انہیں مہلت عمل نہیں ملے گی (وہ تو فیصلۂ عمل کا دن ہوگا)

اسی ظہورِ نتائج کو دوسری جگہ اَمرِ الٰہی کہا گیا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ (۱۶/۳۳)

(اے پیغمبر اسلام!) یہ لوگ جو انتظار کر رہے ہیں، تو اس بات کے سوا اور کونسی بات آباقی رہ گئی ہے کہ فرشتے اُن پر اتر آئیں یا تیرے پروردگار کا (مقررہ) حکم ظہور میں آجائے؟ ایسا ہی ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (کہ سرکشی و فساد سے باز نہ آئے یہاں تک کہ حکم الٰہی ظہور میں آگیا)، اور اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود ہی اُن پر ظلم کرتے رہے!

سورۂ فرقان میں اس حقیقت کی مزید وضاحت فرما دی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ○ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَاۗءً مَّنْثُوْرًا ○ (۲۵/۲۱-۲۳)

اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے، یا ایسا ہو کہ ہم اپنے پروردگار کو دیکھ لیں، یہ لوگ اپنے دلوں میں خود کو بہت بڑا سمجھے ہوئے ہیں اور حد (انسانیت) سے بہت دور نکل گئے ہیں! (حالانکہ) جس روز یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے تو اُس دن مجرموں کے لئے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی اور (بلکہ) یوں پکار اٹھیں گے کہ پناہ (بخدا) پناہ (بخدا) (اس روز) ہم ان (منکرینِ حق) کے کئے ہوئے

(اچھے بُرے) اعمال کی طرف متوجہ ہوں گے چنانچہ اُن (تمام اعمال) کو ایسا (کالعدم) کر دیں گے جیسے پریشان غبار۔

مندرجہ بالا آیات میں آپ نے غور کیا کہ آیت کے معنی ظہورِ نتائج کے وقت کی نشانی کے بھی ہیں۔ اس لئے اس کا مفہوم معجزہ کے مفہوم سے الگ ہے۔ بعض اعمال کے نتائج انسانوں کے سامنے اسی دنیا میں آجاتے ہیں اور بعض کے حیاتِ اُخروی میں (تفصیل ان امور کی کتاب آخرت میں ملے گی) یہاں آیت کے یہ معنی اس لئے واضح کر دیئے گئے ہیں کہ ذرا آگے چل کر اس مفہوم کی ضرورت سامنے آئے گی۔

قرآنی معجزات

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم حسّی معجزات کے بجائے کس قسم کی آیات (نشانیاں) غور و فکر کے لئے سامنے لاتا ہے۔ کارلائل کے الفاظ میں:-

محمدؐ نے کوئی معجزات نہیں دکھلائے۔ (معجزات کا مطالبہ کرنے والوں کو) وہ بلا توقف جواب دیتا کہ میں معجزات نہیں دکھا سکتا۔ میں تو صرف ایک مبلغ ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ خدا کی مخلوق تک اس کا پیغام پہنچا دوں، اس کے نزدیک یہ کائنات خود ایک عظیم الشان معجزہ تھی۔ وہ کہتا کہ ذرا اس دنیا پر غور کرو۔ اگر تمہاری آنکھیں کھلی ہوں تو یہ بہت بڑی آیت الٰہی ہے۔ یہ زمین جسے خدا نے تمہارے لئے بنایا۔ اور اس میں راستے متعین کئے تم اس پر رہائش رکھتے ہو۔ اس میں چلتے پھرتے ہو۔ پھر ان بادلوں کو دیکھو جو خشک زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ سوچو کہ یہ کہاں سے آتے ہیں اور کس طرح ہوا میں معلق رہتے ہیں اور پھر زمین مردہ کو حیات نو بخشتے ہیں اس خاک تفتہ سے سبزہ نورستہ اُگتا ہے اور کھجوروں کے فلک بوس درخت خوشوں سے لدے ہوئے جھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا یہ آیت خداوندی نہیں؟ اور تمہارے مویشی! اللہ نے انہیں تمہاری خدمت گزاری کے لئے پیدا کیا۔ دیکھو کہ گھاس اِن کے اندر پہنچکر کس طرح دودھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انہی سے تم اپنے ملبوسات تیار کرتے ہو۔ کیسی فرمانبردار مخلوق ہے جو ہر شام سر جھکائے ہوئے تمہارے مکانوں کی طرف خود بخود آجاتے ہیں..... تم معجزات دیکھنا چاہتے ہو! کیا تم خود معجزہ نہیں ہو؟ (ذرا ان جوابات پر غور کرو) کیا غیر ملوث فکر اور حقیقت اشیاء پر کیسی گہری نظر ہے! اس ذات گرامی میں خودداری صداقت کی دالہانہ فطانت صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔ ایک ایسی پر زور ذہانت جو کسی معلم کی رہین منت نہیں۔ نگاہوں میں بصیرت۔ قلب میں گہرائی۔ ایک پر شکوہ فرزند خوا۔ ایسا انسان جس قسم کا بطل جلیل چاہے بن سکتا ہے۔ شاعر۔ سلطان۔ یا مبلغ! وہ انسان جس کی نگاہوں کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی تھی کہ یہ ساری کائنات ایک عظیم القدر معجزہ ہے۔

(Heroes And hero worship P. 59-60

لیکن[1] اس کے بعد یہ لوگ کہیں گے کہ اگر تم (اے رسول) عام انسان ہی ہو اور کوئی غیر معمولی اور مافوق الفطرت قوت اپنے اندر نہیں رکھتے تو پھر ہمارے لئے کیا ضروری ہے کہ ہم تمہاری ہی بات مانیں، ہم میں سے جو عقلمند سیانے ہیں ہم ان ہی کی باتوں کو کیوں نہ خضر راہ بنائیں؟ ان سے کہو کہ یہ اس لئے ضروری ہے کہ جو کچھ میں تمہیں دیتا ہوں وہ کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی باتیں نہیں ہیں یہ خدا کا پیغام ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تم اور تمام دنیا جہان کے انسان مل کر بھی چاہو تو اس کی مثل پیغام ہدایت اور ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کر سکتے۔

قرآن معجزہ ہے

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ؀ (۲/۲۳)

اور (دیکھو) اگر تمہیں اس (کلام) کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے (یعنی پیغمبر اسلام) پر نازل کیا ہے (اور تم خیال کرتے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے، یا تمہیں رسالت اور وحی ہی سے انکار ہے) تو (اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض ایک انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو۔) اگر تم (اپنے انکار میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) ایک ہی سورت بنا لاؤ، اور (اللہ کے سوا جن طاقتوں کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے، ان سب کو اپنی مدد کے لئے بلا لو!

یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں دھوکہ دینے والے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو اس کی مثل بنا سکتے ہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاۗءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ؀ (۸/۳۱)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں ہاں ہم نے سن لیا۔ اگر چاہیں تو ہم بھی اس طرح کی باتیں کہہ لیں یہ اس کے سوا کیا ہے کہ جو پہلے گزر چکے ہیں ان کی لکھی ہوئی داستانیں ہیں۔

لیکن اس کا فیصلہ نہ میرے دعوے سے کرو، نہ ان کی باتوں سے (لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ) بلکہ اس میزان کے مطابق کرو جو اوپر واضح کر دی گئی ہے یعنی اس کی مثل[2] بنا کر دکھاؤ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ؀ (۱۰/۳۸، نیز ۱۱/۱۳، ۱۷/۸۸، ۵۲/۳۴)

---

[1] انداز بیان میں قرآنی مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے۔ [2] قرآن کریم نے ۲۸/۴۹ میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ قرآن ضابطۂ ہدایت ہونے کی حیثیت سے بے مثل ہے۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (یعنی پیغمبر اسلام نے) اللہ کے نام پر افترا کیا ہے؟ تم کہو، اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو (اور ایک آدمی اپنے جی سے گھڑ کر ایسا کلام بنا سکتا ہے) تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر پیش کردو، اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو (تمہیں پوری طرح اجازت ہے) بلا لو!

وہ معجزہ مانگتے تھے انہیں معجزہ بھی دیدیا گیا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۹-۵۰-۵۱)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (رسول) پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوتیں۔ تو تم کہدو کہ وہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں اس کے سوا کیا ہوں کہ صاف صاف ڈرانے والا ہوں! (اے پیغمبر اسلام!) کیا ان کے (رفع شک کے) لئے اس قدر کافی نہیں ہو سکا کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب (قرآن) نازل کردی جو ان کو (ہمیشہ) سنائی جاتی ہے۔ بلاشبہ اس کتاب میں ایمان لانے والوں کے لئے بڑی ہی رحمت اور نصیحت ہے۔۔۔!

یہ چیلنج سارے عرب کے سامنے تیئیس برس تک رہا۔ انہوں نے اس پیغام انقلاب کی مخالفت و مزاحمت میں اپنی جانیں تک دیدیں لیکن اس چیلنج کا جواب کوئی نہ دے سکا۔ اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن جس قسم کا (حسی) معجزہ وہ لوگ مانگتے تھے تو اول تو وہ ان ہی مخاطبین کے لئے معجزہ ہوتا اور پھر ان میں سے اکثر لوگ اس کی عجیب عجیب تاویلات کرتے اور اسے نگاہ بندی یا جادو کہہ کر اپنے آپ کو یا دوسروں کو دھوکا دیتے۔ لیکن یہ معجزہ ایسا تھا کہ اس میں اُن لوگوں کے لئے کوئی راہ فرار نہ تھی۔ اس میں کوئی ابہام نہ تھا، نہ ڈھکی چھپی بات تھی۔ کھلے بندوں لاکھوں انسانوں کے سامنے مستقل طور پر ایک چیلنج تھا۔ جس کا جواب دینے سے سب عاجز رہ گئے۔ اور پھر یہ معجزہ ان ہی کے لئے نہ تھا۔ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے۔ تیرہ سو برس سے قرآن ساری دنیا کے سامنے ہے۔ مخالفین نے اسلام کے خلاف ہر طرح کا زہر اگلا اس نور خدا بجھانے کے لئے طرح طرح کے حربے ایجاد کئے۔ ہزاروں کتابیں لکھیں، لاکھوں لکچر دیئے۔ لیکن قرآن کی اس تحدی کا جواب کسی سے بھی بن نہ پڑا۔ اور ایسا ہو ہی کس طرح سکتا تھا؟ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ اس کی مثل بنانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ قرآن فطرت انسانی کا ترجمان ہے۔ یہ عقل انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ وحی کے متعلق (معارف القرآن جلد دوم) میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ ملکہ اکتسابی نہیں جسے انسان کسب ہنر سے حاصل کرسکے۔ بلکہ خالصتاً وہبی ہے جس میں انسانی کوشش یا ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی انسان کے حیطۂ امکان میں نہیں کہ وحی کی مثل لاسکے۔ نہ حضورؐ کی زندگی میں نہ اس کے بعد، کہ آپ کے بعد باب نبوت بند ہو گیا۔ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس لئے قرآن کا چیلنج قیامت تک کے لئے کھلا

رہے گا۔ رسول اللہ کا معجزہ قرآن ہے جو ہنگامی نہیں ابدی معجزہ ہے۔ اور جس رسول کی رسالت ابد سے ہمکنار رہنے والی تھی اس کا معجزہ بھی ابدیت در آغوش ہونا چاہیئے تھا۔

لیکن ٹھہریئے! ابھی ایک اور معجزہ کا بھی ذکر باقی ہے۔ وہ لوگ قرآن کی مثل لانے سے تو عاجز رہ گئے۔ لیکن بایں ہمہ

ایک اور معجزہ!

انہوں نے یہ اعتراض اٹھایا کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ قرآن خود محمدؐ کا بنایا ہوا نہیں؟ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک انسان جو کچھ بنائے دوسرا انسان اس کے مثل نہ بنا سکے۔ اس لئے ہم (کفار عرب) اس دعوے کو صحیح نہیں سمجھتے کہ تم اللہ کے رسول ہو۔

یعنی خود حضورؐ کی زندگی

فرمایا کہ ان تمام دلائل باہرہ اور حجج نیرہ کے باوجود یہ لوگ تمہارے دعویٰ رسالت پر شک کرتے ہیں۔ اور تمہیں (معاذ اللہ) جھوٹا سمجھتے ہیں اُن سے کہدو کہ

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۶)

اور تم کہو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا۔ (مگر اُس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے، تم لوگوں میں ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں۔۔۔۔؟

اللہ اکبر! کتنی عظیم الشان شہادت ہے جو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ "یعنی میں نے تمہارے اندر اپنی عمر گزاری ہے" کیا اس قسم کی زندگی ایک جھوٹے کی زندگی ہو سکتی ہے؟ کیا میری تمام کتاب زندگی میں جس کا ایک ایک صفحہ تمہارے سامنے کھلا ہے، ایک حرف بھی ایسا ہے جس پر تم انگلی رکھ سکو؟ پھر سوچو کہ ایسی بے لوث اور جبین سحر کی طرح بے داغ اور پاکیزہ زندگی، ایسے بڑے فریب کار کی زندگی ہو سکتی ہے جو خدا پر افترا باندھنے سے بھی نہ چوکے۔ کیا تم نے میری زندگی میں کوئی اور بات بھی جھوٹ اور فریب کی دیکھی ہے جس سے تم قیاس کر سکو کہ میرا یہ دعویٰ رسالت بھی جھوٹ ہوگا؟ اس دعوے سے قبل چالیس برس کی زندگی بھی تمہارے سامنے ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا، یہیں بڑھا۔ یہیں چلتا پھرتا رہا۔ تم نے از خود مجھے امین کہکر پکارا۔ اور اپنی عزیز ترین امانتوں کا معتمد علیہ گردانا۔ کیا میری زندگی میری صداقت کی شاہد نہیں ہے؟

قرآن کی تحدی کی طرح صاحب قرآن کی یہ تحدی بھی ان مخالفین کے سامنے رہی۔ اُنہوں نے جوش مخالفت میں حضورؐ کو مجنون کہا۔ ساحر کہا۔ شاعر کہا۔ لیکن آپ کی سیرت کے خلاف ایک لفظ تک زبان پر نہ لا سکے۔ پھر یہ کتاب زندگی تیرہ سو برس سے تمام ساکنان ارض کے سامنے کھلی رکھی ہے۔ بعض سوختہ بختوں نے جوش تعصب میں بعض اوقات بہتان تراشیوں کی جرأت بھی کی لیکن خود ان ہی کے بھائی بندوں نے ان کا منہ بند کر دیا اور وہ حامل خلق عظیم (وانک

لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (۶۸:۴)، انسانی سیرت کے اسی مقامِ محمود (۱۷:۷۹) پر فائز المرام ہے جس پر وہ اپنے عدیم النظیر عمل سے پہنچا تھا اور جس تک پہنچنے کی آرزو ہر سعادتمند روح کے لئے باعثِ شرفِ دارین اور وجہِ عزت کونین ہے - خاک کے ذرات کا منتہیٰ اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے پیکر انسانی میں جلوہ بار ہونا ہے اور انسان کا معراجِ کمال شرف و مجد کے تمام منازل طے کر کے سیرتِ محمدیہ کے مقامِ محمود تک پہنچنا - اس صفحۂ ارض پر نہ اس سے آگے کوئی منزل ہے نہ اس سے بلند کوئی اور مقام -

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفےٰ اورا بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ ست

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینی انتہاست

وَصَلَّى اللهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّبَارَكَ وَسَلَّمَ

گذشتہ صفحات میں جو تصریحات آپ کے سامنے آچکی ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم نے کس شدت اور تکرار سے اس کی صراحت فرمادی ہے کہ نبی اکرمؐ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا اور حضورؐ کا معجزہ صرف قرآن ہی ہے اور قرآن کی دعوت کی بنیاد عقل و بصیرت اور دانش و بینش پر رکھی گئی ہے - اگر آپ کسی سے کہیں کہ دو، اور دو، چار ہوتے ہیں اور وہ کہے کہ نہیں - دو اور دو پانچ ہوتے ہیں - اور اس کی دلیل یہ پیش کرے کہ میں اپنے خشک بالوں سے دودھ نکال کر دکھا سکتا ہوں، تو قرآن اسے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں قرار دیتا اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن نے مذہب کی دنیا

کتنا سادہ مذہب تھا

میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے - یعنی وہ صرف اس قدر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے کہ ان ابدی حقائق کا معلوم کرنا جو فطرتِ انسانی کے ترجمان ہیں اور جن کے مطابق نظام اجتماعیہ قائم کرنے سے کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں - یہ صرف وحی کی مدد سے معلوم ہو سکتے ہیں - اتنے حصے کو آپ مافوق الفطرت کہہ لیجئے یا خارقِ عادت - اس کے بعد وہ دانش و بصیرت کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ ان حدود میں رہتے ہوئے جو وحی نے متعین کر دیئے ہیں اپنے زمانہ کے تقاضوں کے حل خود دریافت کرے - پھر، وحی کو بھی وہ جبر و اکراہ سے نہیں منواتا - اسی لئے اس نے حاملِ وحی کی تحریکِ انقلاب کی تائید حسی معجزات سے نہیں کی - غور فرمائیے کس قدر

حاشیہ صفحہ سابقہ

۱؎ ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے جھک جاتی ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی جراتیں اکثر و بیشتر ان روایات کے بل بوتے پر ہوتی ہیں جو ابتدائی منافقانہ سازشوں کے ماتحت ہماری کتبِ روایات میں داخل ہو چکی ہیں - اور جنہیں مسلمان اپنی نادانی سے آج تک اپنے سینے سے لگائے چلا آرہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ وہ اس سے وہ اُس ذاتِ اقدس واعظمؐ پر کس قدر ظلم برپا کرنے کا موجب بن رہا ہے -

سیدھی سادی ہے یہ تعلیم اور کیسا نکھرا ہوا ہے یہ دین!

لیکن مسلمانوں نے کیا کیا

لیکن جب یہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مسلمانوں کا شوق اعجوبہ پرستی بھی اُبھر کر سامنے آگیا۔ انہوں نے اسے اپنے رسول کی کسر شان، اور اپنے مذہب کا گھٹیا پن سمجھا کہ اس میں کسی خارق عادت عنصر کا دخل ہی نہ ہو۔ ان کے نزدیک مذہب کی صداقت اور رسول کی علو مرتبت کا سب سے بڑا ثبوت معجزات تھے اس لئے انہوں نے قرآنی تعلیم کی اس قدر کھلی ہوئی تصریحات کے باوجود ہزاروں معجزات وضع کئے اور انہیں نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر ڈالا۔ یہودیوں اور عیسائیوں سے مناظرے ہونے لگے۔ وہ اگر اپنے انبیاء کے دس معجزے بیان کرتے تھے تو یہ ان کے مقابل بیس کی فہرست پیش کر دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہوتے ہوتے ان معجزات کا ایک انبار تھا جو ہماری کتب سیر و روایات میں جمع ہو گیا۔ قرآن خاموشی سے ان کا مُنہ تک رہا تھا کہ اِن کا خدا انہیں کن بلندیوں پر لیجانا چاہتا تھا اور یہ اپنے آپ کو کن پستیوں کی طرف لئے جا رہے ہیں (۱۷/۹۳) حیرت اندر حیرت کہ ایک اسی قسم کا حسی معجزہ انہوں نے قرآن سے بھی ثابت کر ڈالا۔ قرآن کریم نے قیامت کے متعلق جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے مترشح

شق القمر

ہوتا ہے کہ موجودہ نظام فلکی کروں کی جس باہمی کشش و جذب سے قائم ہے اس میں کمی آجائیگی۔ جس سے اس نظام میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ مختلف کرے ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور یہ سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا۔ چنانچہ مختلف مقامات پر اس فشار کا ذکر موجود ہے۔ کہیں فرمایا کہ زمین کو سخت زلزلہ آئے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّاۙ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّاۙ (۵۶/۴-۵)

جبکہ زمین کو سخت زلزلہ آئے گا، اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

اور دُھنی ہوئی اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ (۱۰۱/۵)

اور اُس روز پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح ہو جاویں گے۔

آفتاب بے نور ہو جائے گا ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں گے!

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۙ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۙ (۸۱/۱-۲)

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے!

کہیں ہے کہ چاند بے نور ہو جائے گا، اور چاند اور سورج ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے۔

وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ (۷۵/۸-۹)

اور چاند بے نور ہو جاوے گا، اور چاند و سورج (ایک جگہ) جمع ہو کر (ٹکرا) جائیں گے۔

اسی سلسلہ میں متعدد مقامات پر فرمایا کہ آسمان پھٹ جائے گا۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ (55/37) (نیز 69/16؛ 77/9؛ 84/1)

اور جب آسمان پھٹ (کر ٹکڑے ٹکڑے ہو) جائے گا!

ان مقامات میں آسمانوں کے "شق" ہونے کا ذکر ہے اور آسمان سے مراد فلکی کرے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک جگہ چاند پھٹنے کا ذکر ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (54/1)

قیامت قریب آئی اور چاند پھٹا۔

بات بالکل صاف ہے اس سے اگلی آیت میں ہے۔

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ (54/2)

اور اگر وہ (قرب قیامت کی) کوئی نشانی دیکھیں گے تو (بھی) نہیں مانیں گے اور کہیں گے کہ یہ وہی جھوٹ ہے جو چلا آرہا ہے۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ آیت سے مراد قرب قیامت کی نشانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرب قیامت کی اتنی واضح نشانی دیکھنے کے بعد بھی منکرین قیامت کو یقین نہ آئے گا۔ اور ان کی طرف سے پہلی آواز یہی بلند ہوگی کہ نہیں۔ قیامت کہاں کی! وہی جھوٹ ہے جو شروع سے بولا جارہا ہے۔ دوسری جگہ منکرین قیامت کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (11/7)

اور (اے پیغمبر اسلام!) اگر تو ان لوگوں سے کہے "تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے" تو جو لوگ منکر ہیں وہ ضرور بول اٹھیں یہ "تو صریحاً جھوٹی بات ہے"!

صاف ظاہر ہے کہ شق قمر وہی شق سماء ہے جس کا ذکر قرب قیامت کی نشانیوں میں آچکا ہے اس لئے شق قمر بھی قرب قیامت ہی کی نشانی ہے۔ اسے معجزہ سے کیا واسطہ؟ لیکن اسے بھی رسول اللہ کا معجزہ قرار دیدیا گیا اور کہا گیا کہ حضورؐ نے انگلی کا اشارہ فرمایا اور چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے۔

آپ یقیناً متعجب ہوں گے کہ جب قرآن کریم میں اس شرح و بسط سے وضاحت آچکی ہے کہ نبی اکرمؐ کو قرآن کے سوا (جو عقلی معجزہ ہے) کوئی اور معجزہ نہیں دیا گیا۔ تو پھر کتب روایات میں اس قدر معجزات حضورؐ کی طرف کیسے منسوب

---

[1] سحر بمعنی جھوٹ کا بیان معارف القرآن جلد سوم۔ عنوان حضرت موسیٰ میں آچکا ہے۔

کردیئے گئے۔ لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ کتب روایات میں تو ایسی ایسی باتیں حضورؐ کی طرف منسوب کی ہوئی ہیں جن کے تصور سے بھی سعید روحیں کانپتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی چیز کی بنیاد غلط ہو تو اس کی فروعات میں غلطیوں کا وجود وجہ تعجب نہیں ہوتا۔ جمع روایات انسانی کوششیں تھیں۔ انہیں یہی حیثیت دینی چاہیئے تھی۔ لیکن جب انہیں دین

کتب روایات اور معجزات

قرار دیا گیا تو یہ تنقید کی حد سے بالا قرار پا گئیں۔ اس عقیدے کے بعد کسی روایت کا ان کتابوں کے اندر ہونا اس کی صحت کی پوری ضمانت سمجھ لیا گیا اس سے بحث ہی نہیں کہ روایت کا مضمون کیا ہے۔ وہ قرآن کے مطابق ہے یا مخالف۔ اس سے رسول اللہ کی ذات گرامی کے خلاف کوئی اعتراض تو نہیں پڑتا۔ روایات کو دین ماننے والے ان سب چیزوں کو برداشت کرلیں گے، لیکن اس بات کو سننے تک کے لئے تیار نہ ہوں گے کہ روایت میں غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی حضرات جامعین روایات کو معصوم ماننا ضروری ہے خواہ اس سے قرآن کی مخالفت اور خود رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

بہر حال یوں سلسلہ عجائب پرستی شروع ہوا اور رسول سے آگے بڑھ کر ارباب طریقت و معرفت کی خصوصیت کبریٰ

کرامات

اور دین کا مغز قرار پا گیا۔ اب مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ کرامات اولیا کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ جہاں کسی نے قوت ارادی کے ارتکاز سے کوئی محیر العقول کرشمہ دکھایا، معبود خلائق بن گیا جیتے جی بھی سجدے ہوتے رہے اور مرنے کے بعد قیامت تک مسجود انام بن گیا۔ ان حضرات کی مقبولیت و شہرت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے مجاہدین جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ تصدق کردیا کسی کی یاد میں بھی نہیں ہیں۔ اور ان حضرات کے مزار کعبہ مقصود اور قبلۂ حاجات بنے ہوئے ہیں۔ آپ پوچھ کر دیکھئے! بہت کم مسلمان ہوں گے جنھیں اس کا علم ہو کہ (مثلاً) حضرت عمرؓ کی شہادت کی تاریخ کونسی ہے۔ لیکن کسی سائیں گھوڑے شاہ یا بدھن پیر کے عرس کی تیاریاں مہینوں پہلے شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ فاروق سے زیادہ سے زیادہ اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ رسول اللہ کے بعد دوسرے خلیفہ گزرے ہیں۔ اور سائیں صاحب کی کرامات کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، جس کی وجہ سے یہ اعتقاد، دل کی گہرائیوں میں موجود ہے کہ اگر اب بھی سائیں صاحب کی یاد صحیح طریقہ سے نہ منائی گئی تو نہ معلوم وہ کیا کردیں گے؟ یہ ہیں وہ خرافات جن میں مسلمان قرنہا قرن سے الجھا چلا آرہا ہے۔ اور نہیں سمجھتا کہ معجزہ و کرامت وہی ہیں جو خود مرد مومن کے دست و بازو سے ظہور پذیر ہوں۔

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

معراج

معجزات کے ضمن میں معراج کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝ (۱/۱۷)

پاکی ہے اُس ذات کے لئے جو اپنے بندے کو (یعنی پیغمبر اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی برکت دی ہے۔ لے گیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تاکہ اُسے اپنی نشانیاں دکھائے، بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی، دیکھنے والی ہے۔۔۔۔!

اور سورۂ والنجم کی ابتدائی آیات حسب ذیل ہیں۔

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۝ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۝ ذُوْ مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی ۝ وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ۝ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝ اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۝ وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی ۝ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی ۝ عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی ۝ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۝ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ۝ (۱-۱۸/۵۳)

مقام بلند پر پہنچ کر ڈوبنے والا ستارہ، (جو ہمیشہ تمہارے لئے دلیل راہ بنتا ہے، اور اس راہ نمائی میں کبھی تو ہوش) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تمہارا رفیق (محمدؐ) نہ غلط راہ چل رہا ہے نہ بہک گیا ہے۔ وہ خود اپنی خواہش سے نہیں بول رہا بلکہ وہ تو صرف خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہے (جو وہ تم تک پہنچا رہا ہے)۔ جسے اُس سے اُس زبردست طاقتوں کے مالک (خدا) نے تعلیم کیا ہے جو قوت (و شوکت) والا ہے۔ چنانچہ اس نے کمال (علم) کو حاصل کرلیا اور (اب) وہ کائنات کے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ پھر وہ قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اور (عجز و نیاز سے) جھکتا چلا گیا۔ چنانچہ وہ دو کمانوں کی مسافت پر رہ گیا بلکہ اس سے بھی قریب تر۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر خدا نے اپنے بندہ کی طرف وہ وحی بھیجی جو وحی فرمانی تھی۔ اس مقام پر محمدؐ نے جو کچھ دیکھا۔ دل نے اُس کے سمجھنے میں کوتاہی نہیں کی۔ تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (حالانکہ تم میں سے کسی نے حقیقت کو اس طرح بے نقاب نہیں دیکھا) اور یقیناً اس نے اسے ایک اور نزول کے وقت بھی دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے قریب ہی وہ جنت ہے جو اصل ٹھکانا ہے۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ تو (محمدؐ کی) نگہ (حقیقت بیں) نہ تو (دوسری طرف) پھری اور نہ ہی حد سے بڑھی۔ یقیناً اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھا۔

ان دو مختلف سورتوں کی ان آیات کو باہم دگر ملا کر ایک بہت بڑے واقعہ کی بنیاد بنا دیا گیا ہے۔ جو کتب روایات میں شرح و بسط

سے مذکور ہے۔ اسی واقعۂ عظیمہ کو معراج کہتے ہیں۔ مختصراً واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک رات حضورؐ استراحت فرما رہے تھے کہ حضرت جبریلؑ نے آپ کو جگایا۔ پہلے چاہ زمزم پر لیجا کر آپ کا سینہ مبارک چاک کیا اور قلب اطہر کو نکال کر آب زمزم سے دھویا۔ اس کے بعد سونے کے ایک طشت میں ایمان و حکمت کا ایک خزانہ لایا گیا جسے حضرت جبریلؑ نے آپ کے سینہ میں رکھ کر اسے پھر برابر کر دیا۔ ازاں بعد براق نامی ایک خچر پر حضورؐ سوار ہو کر بیت المقدس آئے۔ براق کو باندھ دیا اور مسجد میں نماز پڑھی۔ پھر حضرت جبرئیل کی معیت میں آپ آسمان کی طرف چڑھے۔ ہر آسمان کے دروازہ پر پہنچکر حضرت جبریلؑ دربان کو بتاتے تھے کہ آپ کے ساتھ کون ہیں۔ اس پر وہ دروازہ کھولتا تھا۔ اسی طرح آسمان در آسمان یہ سفر طے ہوتا رہا۔ رستہ میں تمام انبیاء کرامؑ سے ملاقات ہوئی۔ پھر آپ کو جنت و دوزخ کو سیر کرائی گئی۔ پھر حضورؐ اس مقام پر پہنچے جہاں قلم قدرت کی صریر سنائی دیتی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچے۔ وہاں سے بہت سے احکام ملے۔ اب آسمان سے اتر کر حضورؐ پھر بیت المقدس میں آئے جہاں پہنچ کر آپ نے حضرات انبیاء کرامؑ کو نماز پڑھائی۔ ان تمام منازل کے بعد آپ پھر مکہ میں واپس تشریف لائے۔

ہم نے اس واقعہ کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے ورنہ کتب روایات میں اس کے متعلق ایسی ایسی مختلف النوع تفاصیل اور دلچسپ جزئیات ہیں جن سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ رواۃ کے ذوق داستان سرائی نے کس قدر رنگینی بیان سے کام لیا ہے اور کس طرح اپنے ذہنی تخیلات کو ایک واقعہ کی صورت دیکر اسے نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، خود بخاری میں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس موقعہ پر آپ کی امت پر پچاس نمازیں فرض کیں، آپ اس عطیہ کو لے کر جب حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے بنی اسرائیل کا خوب تجربہ ہے۔ آپ کی امت سے یہ بار اٹھ نہیں سکے گا۔ اللہ تعالےٰ کے پاس پھر جائیے اور ان سے کمی کرائیے، چنانچہ آپ واپس آگئے اور اللہ تعالیٰ سے کمی کی درخواست کی تو اللہ نے دس نمازیں معاف کر دیں۔ لوٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر ٹوکا اور کہا کہ یہ بھی بہت زیادہ ہیں۔ آپ دوبارہ گئے اور دس نمازیں پھر معاف کرا لائے۔ اسی طرح آپ بار بار لوٹ کر آئے اور حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے واپس جاتے رہے۔ تا آنکہ اللہ تعالےٰ نے پانچ نمازوں کا حکم دیا۔ اس پر بھی حضرت موسیٰؑ نے رجعت کا مشورہ دیا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ اب مجھے شرم آتی ہے۔ چنانچہ اس طرح پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔

نماز کیسے فرض ہوئی

سارے واقعہ کے علاوہ ذرا اس حصہ پر غور فرمائیے۔ گویا (معاذ اللہ) نہ نمازیں فرض کرنے والے خدا کو اندازہ ہے کہ امت محمدیہ کتنی نمازوں کی متحمل ہو سکے گی (چنانچہ وہ پچاس نمازوں کا حکم دیدیتا ہے) نہ رسول اکرم کو اس کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن رستہ میں حضرت موسیٰؑ مل جاتے ہیں اور آپ پر اس سختی کو واضح کرتے ہیں، اس پر آپ واپس جاتے ہیں تو تھوڑی سی چھوٹ ہو جاتی ہے۔ پھر آتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے پھر جاتے ہیں۔ بار بار جاتے ہیں۔ اور آخر الامر پانچ پر بھی اس لئے رضی ہو جاتے ہیں کہ پھر جانے میں

شرم محسوس ہوتی ہے۔ یعنی قرآنی احکام (اور ان میں سے نماز کا حکم) جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ ابدی حقائق پر مبنی اور فطرتِ انسانی کے صحیح تقاضوں کی تسکین کا سامان در آغوش ہیں، کی تعیین اس طرح سے ہوتی ہے؟ پچاس نمازیں اس خدا کی طرف سے فرض کی جاتی ہیں جس کا ارشاد ہے کہ

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۝ (۲/۱۸۴)

اور خدا تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

اور جس کا فرمان ہے کہ دین میں تمہارے لئے کوئی گرانی نہیں (۲۲) حضرت موسیٰؑ اس حکم کی سختی اور گرانباری کو محسوس کرتے ہیں۔ اور جب خدا سے کہا جاتا ہے تو وہ بھی اس زیادتی کو تسلیم کرکے اس میں تخفیف کر دیتا ہے اور ایک مرتبہ نہیں، بار بار تخفیف کرتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مانگنے والے کو خود ہی مزید تقاضے سے شرم آجاتی ہے۔ غور فرمائیے کہ اس سے اللہ اور اس کے رسول۔ اور دین کے احکام کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہودی سازش گروں نے نبی اکرم پر حضرت موسیٰؑ کی فضیلت ثابت کرنے اور قرآنی احکام کے تعین کو مضحکہ بنانے کے لئے یہ افسانہ طرازی کی، اور اس روایت کو چپکے سے نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا۔ امام بخاری اور امام مسلم نے اسے اپنے مجموعوں میں داخل کر لیا۔ اور اس کے بعد یہ اُمت کے لئے دین بن گئی۔

یا یہ کہ جب حضورؐ بیت معمور میں (بحضور رب العزت) حاضر ہوئے تو آپ کے سامنے شراب اور دودھ کے دو پیالے پیش کئے گئے آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبریل نے کہا کہ آپ نے فطرت کو پسند کیا۔ اگر شراب کا پیالہ اٹھا لیتے تو آپ کی اُمت گمراہ ہو جاتی۔

دودھ اور شراب کے پیالے

غور کیجئے کہ وضعین روایت جس بات کو کہنا چاہتے ہیں (یعنی یہ کہ آپ نے دینِ فطرت کو پسند فرمایا) اسے کیسے قابلِ اعتراض انداز میں کہہ رہے ہیں۔ غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہاں دودھ کا پیالہ پیش ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی شراب کا پیالہ بھی سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اگر حضورؐ کہیں یہ سمجھ کر کہ خدا کی طرف سے کوئی قابلِ اعتراض شے تھوڑی سامنے رکھی جا سکتی ہے دوسرے پیالہ کی طرف ہاتھ بڑھا دیتے تو (پناہ بخدا) آپ کی ساری اُمت گمراہ ہو جاتی۔

ہم نے مثالاً دو جزئی چیزیں پیش کر دی ہیں اور یہ دونوں روایتیں بخاری میں موجود ہیں۔ ورنہ کتبِ روایات میں بڑی عجیب و غریب تفاصیل موجود ہیں۔ اب نفسِ واقعہ کی طرف آئیے۔ واقعہ کی بنیاد اس پر ہے کہ حضورؐ بہ نفس نفیس (بجسد عنصری) بارگاہ ایزدی میں پہنچے۔ اس سے ظاہر ہے کہ (ان روایات کی رو سے) خدا کسی خاص مقام پر تھا۔ جہاں پہنچ کر اس سے ملاقات کی گئی۔ غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کیا انداز پیش کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ

خدا کسی خاص مقام پر نہیں

جو کائنات کے ہر مقام پر موجود ہے مکان و زمان کی تمام نسبتوں سے منزہ

ومیری اور جہت و سمت کے تمام تصورات سے بلند و بالا ہے۔ اسے آسمانوں پر کسی خاص مقام میں متعین کر دینا قرآن کے تصورِ الوہیت کے کس قدر منافی ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (۲۲/۷۴)
تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن جلد سوم عنوان حضرت عیسیٰؑ)

اب ان آیات کو لیجئے جن پر ان تمام روایات کی بنیاد[1] ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت اسریٰ میں کہا گیا ہے کہ خدا اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ تاکہ وہاں اسے اپنی آیات دکھلائے۔ مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس کا ہیکل لیا جاتا ہے (اقصیٰ کے معنی ہیں دور۔ یعنی مکہ سے دور) اس سورت میں آگے چل کر ہے

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (۱۷/۶۰)

اور رؤیا جو ہم نے تجھے دکھائی تو اسی لئے دکھائی کہ لوگوں کے لئے ایک آزمائش ہو!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسریٰ کا واقعہ خواب میں پیش آیا تھا۔ چنانچہ بہت سے صحابہؓ کے متعلق بھی مروی ہے کہ وہ اس واقعہ کو خواب کا واقعہ سمجھتے تھے۔ ان میں حضرت عائشہؓ، حضرت معاویہؓ، اور حسن بصریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مسجد اقصیٰ کے الفاظ قرآن کریم میں اسی جگہ آئے ہیں۔ اس سے مراد بیت المقدس اس لئے لی جاتی ہے کہ (۱) یہ مقام مکہ سے بہت فاصلہ پر واقع ہے اور (۲) قرآن نے یہ جو کہا ہے کہ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ (ہم نے اس کا گرد و پیش بابرکت بنایا ہے) تو قرآن کے دیگر مقامات میں یہ خصوصیت ارض فلسطین کے متعلق آئی ہے مثلاً (۷/۱۳۷ ؛ ۲۱/۷۱ ؛ ۲۱/۸۱) ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ خواب کا نہیں تو یہ حضورؐ کی شب ہجرت کا بیان ہے۔

شب ہجرت کا بیان

اس طرح مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ کی مسجد نبوی ہو گی جسے آپ نے وہاں جا کر تعمیر فرمایا۔ باقی رہا اس کے ماحول کا بابرکت ہونا تو اس میں شبہ کیا ہو سکتا ہے۔ جس سرزمین سے حق کی سرفرازی و سربلندی کا اس طرح ظہور ہوا ہو کہ وہ باطل کی ہر قوت پر غالب آجائے اس سے زیادہ اور خیر و برکت کیا ہو گی؟ آیت اسریٰ میں اس سفر کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (تاکہ اللہ حضور کو اپنی آیات نشانیاں دکھلائے) یہ ٹکڑا بہت اہم ہے اس لئے کہ یہی اس آیت کی غایت ہے۔ اس سے اگلی آیت میں حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا تو اس کی غرض یہ بتائی گئی تھی کہ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى (۲۰/۲۳) "تاکہ ہم تمہیں اپنی بہت بڑی نشانیاں دکھائیں"۔ یہ نشانیاں کیا تھیں؟ باطل کی سرکش قوتوں کی شکست، حق کی کامیابی، اور بنی اسرائیل جیسی

---

[1] واضح رہے کہ قرآن کریم میں معراج کا لفظ کہیں نہیں۔ معراج کے معنی ہیں زینہ یا سیڑھی جس سے اوپر چڑھا جائے۔ چونکہ روایات حضورؐ کے آسمانوں پر چڑھنے کا ذکر کرتی ہیں اس لئے اس واقعہ کا نام معراج رکھ دیا گیا ہے۔

ضعیف وناتوان قوم کا استخلاف فی الارض - ان ہی کے مثل وہ آیات (نشانیاں) تھیں جو ہجرت کے بعد مدینہ میں ظہور میں آئیں - باطل کی نگوں ساری - حق کی سربلندی - مسلمانوں کی ضعیف وناتواں جماعت کا استخلاف فی الارض - قرآن کریم نے ان دونوں انقلابات کو ایک ہی جیسے الفاظ میں بیان فرمایا ہے - بنی اسرائیل کے متعلق ہے -

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ (۲۸/۵)

اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جو لوگ سرزمین (مصر) میں کمزور بنائے جا رہے ہیں ہم اُن پر احسان کریں (اور وہ احسان یہ کہ) ہم انہیں (دنیا میں) پیشوا اور (زمین وحکمت کا) وارث بنا دیں - .. ..

اور حضورؐ کی جماعت کے متعلق -

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (۸/۲۶)

اور وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے - تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک نہ لیجائیں، پھر اللہ نے تمہیں (مدینہ میں) ٹھکانا دیا - اپنی مددگاری سے قوت بخشی - اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا - تاکہ تم شکر گزار ہو! .. ..

بنی اسرائیل کو بھی مخالفین کی زمینوں کا وارث بنا دیا -

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ۝ (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو کمزور وحقیر خیال کرتے تھے، اُسی کو ملک کے تمام پورب کا اور اُس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالامال ہے وارث کر دیا - اور اس طرح (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کا فرمان پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ ہمت وثبات کے ساتھ اچھے رہے تھے اور فرعون، اور اس کا گروہ (اپنی طاقت وشوکت کے لئے) جو کچھ بناتا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں وہ سب درہم برہم کر دیں!

اور مسلمانوں کو بھی مزاحمین کے امصار و دیار کا مالک بنایا -

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝ (۳۳/۲۷)

اور اُن کی زمین، اُن کے گھروں، اور اُن کے مالوں کا تمہیں مالک بنا دیا۔ اور ایسی زمین کا بھی تمہیں مالک بنا رکھا ہے جس پر تم نے (ابھی) قدم (تک بھی) نہیں رکھا۔ اور (یاد رکھو) اللہ ہر چیز پر (پوری پوری) قدرت رکھتا ہے!

اس طرح حق کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو گیا اور یہ اللہ کی بہت بڑی نشانیاں تھیں جن کے لئے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت ہوئی تھی۔ ان قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر اسریٰ کا واقعہ خواب کا نہیں تو یہ ہجرت کا بیان ہے اس صورت میں آیت (۱۷/۶۰) کا خواب اس سے متعلق نہیں ہو سکتا۔

اب سورۂ والنجم[1] کی آیات کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا واقعۂ اسریٰ سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے (اور معارف القرآن جلد دوم باب وحی میں اس کی

رسول، علم کی انتہائی بلندیوں پر

تفصیل گزر چکی ہے) رسول علم کی اُن بلندیوں پر ہوتا ہے جہاں دوسرے انسانوں کا تصور تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ حقیقت کو تماتا دکھا دیکھتا ہے اور اس مشاہدۂ حقیقت میں کسی ابہام کو دخل نہیں ہوتا۔ اس سے اس کے شعور میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوتا ہے۔ اور یہی اس کا معراج کمال ہے۔ نبوت کی اس حقیقت و کیفیت کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ اس لئے اس قسم کے مقامات کا تذکرہ استعارات و تمثیلات کے پردوں میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ سورۂ والنجم میں علمِ نبوت کی بلندیوں کا ذکر ہے اور مقامِ وحی کا تمثیلی بیان۔ یہ مقام یکسر وہبی ہوتا ہے اور مختص بہ رسالت۔ اس لئے ہم اس مقام کی کیفیات سے کیف اندوز نہیں ہو سکتے۔ البتہ وحی کی اتباع کے بعد ہم شرفِ انسانیت کی جن بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچ سکتے ہیں، یہ مقامات انسانی زندگی کے اُس سدرۃ المنتہیٰ کی طرف اشارہ کناں ہیں۔ مادہ اپنے ارتقائی منازل طے کر کے پیکرِ انسانی میں متشکل ہونے کا شرف حاصل کر گیا۔ اب اس کے بعد طبیعی ارتقاء نہیں بلکہ انسانیت کا ارتقاء ہوگا۔ اور مادہ کی چار دیواری اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکے گی۔

انسانیت کا ارتقاء

ایں بدن با جان ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

مُشتِ خاک کی یہ پرواز اُسے طبقاً طبقاً زینہ بہ زینہ (کہ معراج کے یہی معنیٰ ہیں) اور آگے حقیقت کی بلندیوں کی طرف لے جائے گی۔ اور مہر و ماہ و ثریا و کہکشاں سب اس کے بازوئے ہمت کے سامنے پست ہوتے چلے جائیں گے۔ اور اس طرح ہر بلندی (سماء) اس کے لئے پستی (ارض) بنتی چلی جائے گی۔

[1] اس کے ساتھ سورۂ تکویر کی آیات (۸۱/۱۹-۲۴) کو بھی دیکھ لینا چاہیئے۔

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں — ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں — زیر پر آگیا تو یہی آسماں زمیں

جوں جوں یہ اپنے مقام سے آگاہ اور حقیقت سے ہم آہنگ ہوتا جائے گا (کہ اتباع وحی کا فطری نتیجہ یہی ہے)، اس کی معراج کی حدیں بلند ہوتی جائیں گی۔

دے ولولۂ شوق، جسے لذت پرواز — کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

مشکل نہیں یاران چمن معرکۂ باز — پُرسوز اگر ہو نفس سینۂ دراج

ناوک ہے مسلماں۔ ہدف اس کا ہے ثریا — ہے سرِ سراپردۂ جاں، نکتۂ معراج

تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا

ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

مغربی فکر مغربی فکر، اور اس سے متاثر ذہن، نکتۂ معراج انسانیت کو فی الواقعہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے عروج وارتفاع کی حدیں طبیعی قوانین کی بلندیاں ہیں۔ اس کا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج ہے۔ وہ تیس ہزار فٹ کی بلندیوں پر ہوائی جہاز میں اڑنے، یا راکٹ کے ذریعہ مریخ اور کرۂ قمر تک جا پہنچنے ہی کو معراج سمجھتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ اس سے صرف ارتفاع جسم ہوتا ہے ارتقاء جان نہیں ہوتا۔ جس دن اُس نے اس راز کو پالیا (اور یہ وحی کی روشنی کے بغیر ناممکن ہے)، پھر آپ دیکھیں گے کہ انسان ہی نہیں بلکہ انسانیت کتنی بلندیوں پر اڑتی جارہی ہے۔ اور

مشرقی تصوّف نہ ہی اس حقیقت معراج کو خاک کے آغوش میں بیٹھا ہوا عجمی تصوف کا حامل سمجھ سکتا ہے کہ جو ثنویت روح اور مادہ کے (یونانی) باطل تصور سے اس فریب میں مبتلا ہے کہ جب تک مادہ کی کثافتیں الگ نہیں کی جاتیں۔ روح کی لطافتیں مائل پرواز نہیں ہوسکتیں اور نہیں سمجھتا کہ طاقت پرواز ترک مادہ سے نہیں بلکہ تسخیر مادہ (یعنی مادہ کو تابع قوانین الٰہی کر لینے) سے آتی ہے۔ اُسے کون سمجھائے کہ

ایں نکتہ، کشائندۂ اسرار نہان است — ملک است تن خاکی و دیں روح روان است

تن زندہ و جاں زندہ زربط تن و جان است — با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

یہ ہے معراج مسلماں۔ اور یہ ہے وہ سبق جو ہمیں حضورؐ کو سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں تک لے جانے والی آیات مقدسہ سے ملتا ہے۔ وَفِيهَا اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّشْعُرُوْنَ۔

درونِ خانہ

عائلی اور معاشرتی زندگی

مغربی فکر نے جہاں روح اور مادہ، دین اور دنیا، مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انسان کی پرائیویٹ اور پبلک لائف کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ قرار دیدیا یعنی اگر ایک شخص اچھا مدبر ہے۔ اور امور حکومت کو بطریقِ احسن سرانجام دیتا ہے تو وہ ہمارا لیڈر ہے، قوم کا ہیرو ہے۔ ہمیں اس سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کا پرائیویٹ کیرکٹر کیسا ہے۔ انسانی زندگی کی یہی وہ ثنویت ہے جس کی وجہ سے یورپ میں مادی ترقی کی اس قدر بلندیوں کے ساتھ انسانیت اس قدر پستیوں میں گرچکی ہے۔ قرآن انسان کو تماماً وکمالاً دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک جس طرح یہ تصور باطل ہے کہ کائنات میں روح اور مادہ۔ اور حیاتِ اجتماعیہ میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہیں،

زندگی ناقابلِ تقسیم ہے

اسی طرح یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ انسانی سیرت پرائیویٹ اور پبلک شعبوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ جس طرح چندن کا ہر ذرہ چندن اور شہد کا ہر قطرہ شہد ہوتا ہے اسی طرح ایک بلند سیرت انسان کی زندگی کا ہر پہلو بلند ہوتا ہے۔ قرآن انسانی سیرت کی تماماً تعمیر کرتا اور اس کا کمالاً ارتقاء چاہتا ہے۔ اس کے کسی ایک گوشے کو باقی زندگی سے الگ کر کے نہیں لیتا۔ نبی اکرمؐ نے جب تمام مخالفین عرب کے سامنے اپنے دعوے کی صداقت میں یہ ثبوت پیش کیا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ 10/16

کہ میں نے تمہارے اندر زندگی بسر کی ہے۔ کیا اس سے تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ایسی زندگی ایک جھوٹے انسان کی زندگی ہو سکتی ہے۔

تو اس سے آپ نے صرف اپنی پبلک لائف ہی کو بطور حجت پیش نہیں کیا تھا، اس میں پرائیویٹ لائف بھی شامل تھی کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلام میں ان دونوں میں کوئی فرق اور تمیز ہی نہیں۔

انسان کی عائلی اور عام معاشرتی زندگی اس کے کیرکٹر کے پرکھنے کی سب سے بڑی کسوٹی ہوتی ہے:۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نبی اکرمؐ پچیس برس کے تھے کہ آپ کی شادی

حضرت خدیجہؓ سے شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی جن کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی اور جن کے دو شوہر اس سے پیشتر فوت ہو چکے تھے اور ان کے اولاد بھی تھی ۶۵ برس کی عمر تک وہ آپ کی شریک زندگی رہیں، بظاہر یہ جوڑ کس قدر بے میل نظر آتا ہے۔ لیکن تاریخ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکتی جس میں کسی معاملہ میں بھی ناخوشگواری تعلقات کی ذرا سی بھی جھلک پائی جاتی ہو میاں بیوی کے تعلقات کو قرآن کریم نے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ[1] کے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ یعنی: وہ تمہارے اسرار و بطون سے واقف، تم اُن کے سرائر و محجوبات سے باخبر۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ انسان کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق اس کی بیوی سے زیادہ کون باخبر ہو سکتا ہے؟ (اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بڑے بڑے مشاہیر قوم کی خانگی زندگی اکثر تلخ و ناکام رہتی ہے) حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی پرائیویٹ لائف سے حضورؐ کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچی تھیں اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جب آپ نے اپنی پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بلا تامل کہہ دیا کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ میں آپ کی رسالت پر ایمان لاتی ہوں۔ حضرت خدیجہؓ صاحب مال و متاع تھیں لیکن وہ سب کچھ تبلیغ اسلام کی نذر ہو گیا اور آپ نے ان مشکلات و صعوبات، اور مصائب و شدائد میں حضورؐ کا ساتھ دیا، جو مخالفین کی طرف سے حضورؐ پر یورش کر کے آئیں۔ دعوتِ اسلام کی ابتدائی زندگی کی اندوہناکیاں گزشتہ صفحات میں ہماری نگاہوں سے گزر چکی ہیں حضرت خدیجہؓ نے ان سب کو بسکون خاطر جھیلا

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک سچی رفیقۂ حیات کی طرح سفرِ زندگی میں اپنی رفاقت کا ثبوت دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات کس قدر خوشگوار و استوار تھے، اس قدر خوشگوار کہ اُن کی یاد عمر بھر نبی اکرمؐ کے لیے وجہ تسکین خاطر رہی۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ اگر گھر میں کوئی جانور ذبح ہوا ہے تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت خدیجہؓ کی ہم نشین عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بڑھیا آئی جس سے حضورؐ نے بڑے التفات سے خیریت پوچھی، اس کے حالات دریافت فرماتے رہے۔ جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا یہ کون تھی؟ حضورؐ نے فرمایا کہ خدیجہؓ کے زمانہ میں یہ ہمارے ہاں آیا کرتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے حسن تعلقات کی یاد حضورؐ کے قلب منور کے کس قدر نرم گوشے میں تھی۔

ذاتی ملازم بھی انسان کی پرائیویٹ زندگی کے بڑے راز داں ہوتے ہیں۔ حضرت زید بن حارثؓ غلام تھے۔

ذاتی ملازم (یوں سمجھئے کہ گھر کے ملازم) حضورؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ ان کے والد نے یہ سنا تو بیٹے کو لینے کیلئے

[1] تم ان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو اور وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس

آئے۔ غور کیجئے کہ ایک غلام لڑکے کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کا موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُسے آزاد کر دیا جائے اور اُسے اُس کے گھرلے جانے کے لئے اس کا باپ آجائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ بیٹا، تم آزاد ہو! اپنے باپ کے ساتھ گھر جاؤ۔ زید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور عرض کیا کہ حضورؐ! میں باپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتا آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ اللہ اکبر! یہ حسن سلوک اور یہ پاکیزہ زندگی کہ غلام لڑکا یہ کہتا ہو کہ میں آزاد ہو کر ماں باپ کے پاس نہیں جانا چاہتا، یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ نوکر سے، اس کے باپ سے بھی بڑھ کر حسن سلوک! یہ ہے پرائیویٹ زندگی کا کمال!!

تو نخل خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش برید ند و با تو پیوستند

تعدد ازدواج

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد نبی اکرمؐ نے متعدد شادیاں کیں۔ وہ معاندین اسلام جو نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ کو ہمیشہ تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس تعدد ازدواج پر شدت سے اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ یہ اعتراضات زیادہ تر عیسائی مشنریوں یا ان کی دیکھا دیکھی ہندو متعصبین کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اکثر و بیشتر ان اعتراضات کے جوابات ان ہی لوگوں کے ہاں سے .... انہیں ملجاتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان اعتراضات کو خود ان کے ہاں بھی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہم تو اس چیز کو سمجھ ہی نہیں سکے کہ عیسائی مشنری یا ہندو پرچارک اس باب میں کس طرح اعتراض کر سکتے ہیں جبکہ خود ان کے مذہبی راہ نماؤں (عیسائیوں کے پیغمبروں اور ہندوؤں کے اوتاروں) کے ہاں تعدد ازدواج کی مثالیں موجود ہیں۔ تورات میں (جو انجیل کا عہد نامہ عتیق ہے) حضرت داؤدؑ کی نو بیویوں اور دس حرموں کا ذکر موجود ہے (دیکھئے کتاب سموئیل ۲/۱ و ۲/۲) حضرت سلیمان کے متعلق سلاطین ۱/ باب (۱۱/۳) میں ہے کہ آپ کی سات سو بیویاں اور تین سو حرم تھیں۔ لونڈیوں کو بیوی بنانے کا حکم بھی تورات میں موجود ہے۔ جہاں حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

> جب تو لڑائی کے لئے اپنے دشمنوں پر خروج کرے اور خداوند تیرا خدا ان کو تیرے ہاتھوں سے گرفتار کرے اور تو انہیں اسیر کر لائے اور ان اسیران میں خوبصورت عورت دیکھے اور تیرا جی اسے چاہے کہ تو اسے اپنی جورو بنائے۔ تو تو اسے اپنے گھر میں لا۔ اس کا سر منڈا۔ اور ناخن کٹا۔ تو وہ اپنا اسیری کا لباس اتار دے اور تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینہ بھر اپنے باپ اور اپنے ماں کے سوگ میں بیٹھے۔ بعد اس کے تو اس کے ساتھ خلوت کر اور اس کا خصم بن اور وہ تیری جورو بنے۔ (استثنا ۲۱/۱۰-۱۳)

ہندوؤں کے ہاں شری رام چندر جی مہاراج کے والد مہاراج دسرتھ کی تین بیویوں کا ذکر رامائن میں موجود ہے۔ لالہ لاجپت رائے

نے اپنی کتاب "کرشن چرتر" میں شری کرشن جی کی کم از کم آٹھ رانیاں تسلیم کی ہیں۔ ہم اس سوال پر شرح و بسط سے گفتگو کرنا ضروری نہیں سمجھتے اس لئے کہ آج اس کی زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ انسان کے لئے مشکل یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تاریخی احوال کو اپنے زمانہ کے ماحول کی عینک سے دیکھتا ہے اور جو باتیں اس کی معاشرت کی رو سے نامحمود سمجھی جاتی ہیں انہیں ابدی مذموم[1] خیال کر کے تاریخ کا محاکمہ کرتا ہے۔ یہ مسلک غلط ہے۔ ہر تاریخی واقعہ کو اس کے ماحول میں رکھ کر دیکھنا چاہیئے۔

عرب کا عام رواج

نبی اکرمؐ کی بعثت کے وقت عرب میں تعدد ازواج کا عام رواج تھا اور اس تعداد کی کوئی حد متعین نہ تھی۔ چنانچہ قبیلہ ثقیف کے ایک نامور سردار غیلان سلمہ کی دس بیویاں تھیں۔ جب وہ مسلمان ہوا تو اس نے چار بیویاں رکھ لیں اور باقیوں کو چھوڑ دیا۔ وہب اسدی نے اسلام قبول کیا تو اس کی آٹھ بیویاں تھیں (یہ بیویوں کی حالت تھی۔ لونڈیاں ان پر مستزاد تھیں اور ان کی بھی کوئی حد مقرر نہ تھی) نبی اکرمؐ کے سامنے اپنے ملک کا یہ معاشرتی اسلوب تھا۔ پھر انبیاء بنی اسرائیل میں بھی اکثر و بیشتر تعدد ازواج کی مثالیں موجود تھیں۔ قرآن نے اس باب میں ابھی تک کوئی حد بندی[2] نہیں کی تھی اس لئے آپ کا تعدد ازواج نہ عرف عام کے مخالف تھا نہ گزشتہ انبیاء کے اسوہ کے خلاف۔ آپ نے جس قدر شادیاں کیں اگر اُن پر بنگہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ وہ محض شادی کی خاطر نہ تھیں بلکہ ان میں کوئی نہ کوئی بلند مقصد پوشیدہ تھا آپ کی ان تمام بیویوں میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری تھیں باقی سب بیوہ یا مطلقہ۔ اور بعض ایسی کہ اس سے پیشتر ان کے دو دو خاوند فوت ہو چکے تھے۔ رسول کی حیثیت اس قدر بلند تھی کہ جس قسم کی عورتوں سے آپ چاہتے شادی کر سکتے تھے۔ وہ حضورؐ کی رفاقتِ زندگی کو اپنے لئے باعث ہزار فخر و ناز سمجھتیں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ حرم نبوی میں (بہ استثناء ایک) بیوگان آئیں۔ اس وقت مسلمانوں کی حالت عجیب تھی۔

حضورؐ کے پیش نظر مصالح

اپنی جماعت بڑی مختصر، جماعت سے باہر کے لوگ، جو اپنے خاندان اور قبیلہ ہی کے لوگ تھے۔ خون کے پیاسے۔ عرب میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کثرت

---

[1] بعض امور ابدی مذموم ہوتے ہیں اور بعض محض وقتی معاشرت کی رو سے نامحمود۔ زنا ابدی مذموم ہے اور نکاح محمود۔ لیکن ایک زمانہ تھا۔ جب بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہ تھی اس لئے اس زمانہ کی معاشرت میں تعدد ازواج بلا قید مذموم نہ تھا۔

[2] قرآن کی رو سے تعدد ازواج (چار تک) کی اجازت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے متعلق تفصیلی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہ اجازت انفرادی نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے دھڑا دھڑ بیویاں کرتا چلا جائے۔ بلکہ یہ اجازت کسی اجتماعی حادثہ (NATIONAL CALAMITY) کے حل کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے اور وہ بھی اس وقت جب حکومت یہ فیصلہ کرے کہ ملی مصالح کے پیش نظر اس کی ضرورت آن پڑی ہے۔

نتیجہ یہ کہ جو مسلمان عورت بیوہ ہو جاتی، وہ بے یار و مددگار رہ جاتی اور معاشرتی زندگی میں وہ ایک بارگراں بن جاتی اس کس مپرسی کے عالم میں ان کے لئے باعزت حفاظت (Protection) اور باوقار زندگی کا سامان ہیا کرنا ضروری تھا۔ اس بار کو نبی اکرم حتی الامکان اپنے کندھوں پر لے لیتے تھے۔ غور کیجئے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد

حضرت سودہؓ

آپ نے سب سے پہلے حضرت سودہؓ سے شادی کی۔ یہ سکران بن عمر کی زوجیت میں تھیں۔ میاں بیوی دونوں نے اسلام قبول کیا اور مکہ کی صعوبت انگیز حالات میں حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں ان کے خاوند نے انتقال کیا۔ اور یہ مسلم خاتون دیار غیر میں کس مپرسی کے عالم میں رہ گئیں۔ نبی اکرمؐ نے انہیں اپنی زوجیت میں لے کر ان کے سکون و دلجمعی کا سامان ہیا کر دیا۔

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی، خنیس بن خذافہ کے گھر میں تھیں انہوں نے بھی حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ہجرت سے واپسی پر حضرت خنیس بدر و احد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگ احد میں زخمی ہو کر مدینہ میں وفات پائی۔ حضرت عمرؓ کو اپنی بیوہ بیٹی کا بڑا صدمہ تھا۔ انہوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ سے اس کا ذکر کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ سے۔ لیکن دونوں میں سے ایک نے بھی نکاح پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ مسلمان اس وقت کن معاشرتی مشکلات میں تھے۔ حضرت عمرؓ کی حیثیت اور وجاہت، کیا زمانۂ جاہلیت و کیا بہ عہدِ اسلام، کچھ کم نہ تھی۔ یہ وقت انہیں خود اپنی لڑکی کے متعلق پیش آ رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس مشکل کا ذکر رسول اللہ سے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ حفصہ کی شادی اس شخص سے ہو جائے گی جو عثمانؓ سے بھی بہتر ہے۔ اس طرح حضرت حفصہؓ سے آپ کی شادی ہوئی۔

حضرت زینبؓ

اس کے بعد ام المؤمنین حضرت زینبؓ کو لیجئے۔ ان کا پہلا نکاح طفیل سے اور دوسرا عبیدہ سے ہوا۔ ان کے بعد تیسرا نکاح عبداللہ بن جحش سے ہوا۔ یہ جنگ اُحد میں شہید ہو گئے۔ ان حالات میں رسول اللہؐ نے ان سے نکاح کیا۔ وہ نکاح کے بعد صرف دو یا تین مہینے زندہ رہیں۔

حضرت ام سلمہؓ

حضرت ام سلمہؓ حضرت ابو سلمہ کے نکاح میں تھیں۔ انہوں نے اپنے خاوند کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہاں سے واپس آ کر حضرت ابو سلمہ جنگ بدر میں شریک ہوئے اور جنگ احد میں زخمی ہو کر شہید ہو گئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، اور حضرت ام سلمہؓ کی تمام عمر اسلام کی خاطر اندوہ و مصائب میں گذری تھی۔ ان حالات کے پیش نظر حضورؐ نے اس کنبہ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

حضرت زینبؓ

حضرت زینبؓ آپ کی پھوپی زاد بہن تھیں جن کی شادی حضورؐ نے اپنے آزاد فرمودہ غلام حضرت زیدؓ سے کی تھی اور انہوں نے انہیں طلاق دیدی تھی (تفصیل پہلے گزر چکی ہے)، ایک تو بنو ہاشم کی

۱؎ عنوان "اسلامی نظام"

ممتاز ترین خاتون کی شادی ایک غلام کے ساتھ پھر اس کے بعد طلاق - اس طلاق کا اثر حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان پر کیا پڑا ہوگا اور خود نبی اکرمؐ کے دل پر کتنا بڑا صدمہ ہوگا؟ اس کی تلافی اسی صورت میں ممکن تھی کہ حضرت زینبؓ کو وہ جگہ دیدی جاتی جو اس زمانہ میں ایک عورت کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا تھا - یعنی ام المومنین ہونے کا شرف - لیکن نبی اکرمؐ حضرت زید کو منہ بولا بیٹا بنا چکے تھے اور اس زمانہ کی رسم کے مطابق متبنّیٰ کو مثل بیٹے کے سمجھا جاتا تھا اس لئے اس کی مطلقہ بیوی سے شادی کو معیوب خیال کیا جاتا تھا - بنا بریں نبی اکرمؐ کو اس باب میں بڑا تامل تھا اور تذبذب - اس کا فیصلہ خود وحی نے کر دیا - اور بتا دیا کہ متبنّیٰ، بیٹا نہیں ہو سکتا - اس کے بعد نبی اکرمؐ نے حضرت زینبؓ کی دلشکنی کا مداوا فرما دیا - اور انہیں اپنے حلقۂ زوجیت میں لے لیا - سورۂ احزاب میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے -

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۳۳/۳۷)

اور (اے پیغمبر اسلام!) جب تم (مشورۃً) اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور آپ نے انعام کیا تھا کہ اپنی بیوی (زینب) کو اپنی زوجیت میں برقرار رکھو اور (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتے رہو - تم محض لوگوں کے طعن کی وجہ سے اس بات کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے - حالانکہ تمہیں (لوگوں سے نہیں بلکہ) اللہ سے ڈرتے رہنا زیادہ سزاوار ہے[1]

پھر جب زید کی طبیعت اپنی بیوی کی طرف سے سیر ہو گئی تو ہم نے آپ (رسول اللہ) سے اس کا نکاح کر دیا - تاکہ مومنین پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ رہے - جب وہ (منہ بولے بیٹے) اُن سے دل بھر (کر، دل برداشتہ) ہو چکیں، اور خدا کا یہ حکم ہونے والا تھا ہی (چنانچہ اسی طرح ہو کر رہا -)

---

[1] ہمارے اکثر مترجمین نے ان الفاظ کے متعلق یہ سمجھ کر کہ یہ اللہ کی طرف سے نبی اکرمؐ کے لئے استعمال ہوئے تھے، اتنی بڑی غلطی کی ہے جس سے اس سیدھے سادے واقعہ کو گوناگوں پیچیدگیوں کا موجب بنا دیا ہے اور اتنا بھی نہیں سمجھا کہ اس سے خود نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے خلاف کتنا بڑا طعن پایا جاتا ہے - بات بالکل صاف ہے یہ تمام تقریر امسك عليك زوجك سے لیکر واللہ احق ان تخشٰہ تک کی خوشگواری سے استوار ہوتی ہے، جو کچھ ان کے دل میں ہے اسے صاف صاف کہدیں کہ یہ باتیں زیادہ عرصہ تک چھپی نہیں رہا کرتیں نبی اکرمؐ نے حضرت زید کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی ہے جس میں انہیں نصیحت کی ہے کہ وہ لوگوں کی باتوں کی پرواہ

حضرت اُم حبیبہ رضؓ ام المؤمنین حضرت اُم حبیبہؓ مکہ کے سردار، ابوسفیان کی بیٹی۔ عبداللہ بن جحش کی بیوی۔ خاوند کے ساتھ حبش کو ہجرت کی۔ عبداللہ دائم الخمر تھا۔ حبشہ میں جاکر عیسائی ہوگیا لیکن حضرت اُم حبیبہ مسلمان رہیں۔ باپ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن، خویش و اقارب تمام غیر مسلم۔ ایک خاوند کا سہارا تھا وہ اس طرح ختم ہوگیا۔ پردیس کا معاملہ۔ بےکسی کس مپرسی کا عالم! رسول اللہ کو ان کی حفاظت کا اتنا خیال ہوا کہ وہیں ایک پیغامبر کی زبانی، شاہ حبش کی وساطت سے شادی کا پیغام بھیجدیا۔ حضرت اُم حبیبہؓ اس پیغام سے اس قدر خوش ہوئیں کہ بادشاہ کی جس لونڈی نے جاکر یہ مژدہ سنایا، اپنا تمام زیور اتار کر اُسے دیدیا۔ غور فرمائیے کہ نبی اکرمؐ کو اُن مشکل ایام میں کن کن معاملات پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی اور انہیں کس کس طرح سلجھانا پڑتا تھا۔ یہی حضرت اُم حبیبہ ہیں کہ جب ان کا باپ (ابوسفیان) ملنے کے لئے آیا ہے تو انہوں نے بستر لپیٹ کر ایک طرف کردیا۔ کہ اس پر نہ بیٹھے۔ اس نے کہا کہ بیٹی! مجھ سے بستر الگ رکھتی ہو؟ فرمایا کہ یہ بستر وہ ہے جس پر رسول اللہ استراحت فرماتے ہیں ایک مشرک اسے نہیں چھو سکتا۔

حضرت میمونہ رضؓ حضرت میمونہؓ پہلے مسعود کے نکاح میں تھیں۔ اس نے طلاق دیدی تو عبدالعزیٰ کے نکاح میں آئیں۔ جب نبی اکرمؐ نے ۷ھ میں عمرہ فرمایا ہے تو اس وقت آپ بیوہ ہو چکی تھیں۔ مکہ میں اس وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی وہ ظاہر ہے۔ حضرت عباس نے نبیؐ اکرم سے ان کی شادی کی تحریک کی اور آپ نے اسے قبول فرمالیا۔ یہ نبیؐ اکرم کی آخری شادی تھی۔

حضرت سودہؓ سے نکاح ہجرت سے پہلے مکہ میں ہوا تھا۔ ان کے علاوہ باقی تمام مندرجہ بالا شادیاں ۲ھ سے ۷ھ تک کے زمانہ میں ہوئیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ زمانہ مسلمانوں پر انتہائی مصائب و صعوبات کا دور تھا۔ مخالفین نے اس تمام زمانہ میں ایک دن بھی آرام سے بیٹھنے نہیں دیا۔ مدینہ میں نئی نئی آبادی۔ معاش کی تنگی۔ اسباب و ذرائع کی کمی۔ تمام قبائل سے جنگ۔ ان حالات میں جبکہ ملت کے افراد کا سب ہی خوبخت پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ بیوگان اور یتامیٰ کا خاطر خواہ انتظام کیا سوچا جاسکتا تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ممکن تھا کہ جو لوگ صاحب استطاعت و مقدرت ہوں وہ ان کس مپرس اور بے یار و مددگار کنبوں کو (جن کی تعداد لڑائیوں کی وجہ سے غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی) اپنی حفاظت میں لے لیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک بیوہ اور اس کے بچوں کی حفاظت اور باعزت کفالت کا بہترین انتظام یہی ہوسکتا ہے کہ اس کی کہیں شادی کردی جائے۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۴۵

ذکر ہیں جوان میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی کا موجب بن رہی تھیں۔

یہی حالات ہیں جن کے ماتحت قرآن نے تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے۔ اس معاشرتی اور تمدنی ضرورت کے ماتحت نبی اکرمؐ نے بھی ایسا ہی کیا۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوگیا تو حالات نے پلٹا لیا۔ بیرونی مخالفت کم ہوگئی۔ خوش حالی کا زمانہ آگیا۔ مساعدتِ وقت نے اکثر و بیشتر مشکلات کا حل خود تجویز کر دیا۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ نے کوئی اور شادی نہیں کی حالانکہ اگر نفس پرستی کی خاطر شادی کرنی ہوتی تو اس کے لئے بہترین زمانہ اب ہی آیا تھا۔ جب ہر طرف سے فراغت تھی اور حضورؐ کی حیثیت ایک بادشاہ کی ہو چکی تھی۔

اب بقایا تین شادیوں کو لیجئے۔ مشکلات کے ان ہجوم میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ جن جن قبائل سے بھی ممکن ہو خوشگوار تعلقات وابستہ ہو جائیں۔ اصول کو ہاتھ سے دیکر تعلقات کی وابستگی تو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہ ہو سکتی تھی۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو مخالفت ہی کیوں پیدا ہوتی؟ دوسری صورت یہی تھی کہ جن قبائل سے ممکن ہو رشتہ داریوں کے تعلقات قائم کرلئے جائیں۔

حضرت جویریہؓ

نبی اکرمؐ کی دو شادیاں اسی مصلحت کے ماتحت عمل میں آئیں۔ حضرت جویریہؓ قبیلہ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں۔ ان کا شوہر غزوۂ مریسیع میں قتل ہوگیا اور یہ خود اسیر ہوگئیں۔ انہوں نے رسول اللہ سے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور ان مصائب کی شکار۔ حضورؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ اس وقت اس قبیلہ کے قریب سات سو جنگی قیدی مسلمانوں کے پاس تھے۔ حضرت جویریہؓ قبیلہ کے رئیس کی بیٹی تھیں اور بیوہ۔ ان تمام الجھنوں کا نہایت عمدہ اور خوشگوار حل یہ تھا کہ اس قبیلہ سے حضورؐ کے تعلقات مصاہرت پیدا ہو جائیں۔ حضرت جویریہؓ حضورؐ کے ساتھ عقد پر رضامند ہوگئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام جنگی قیدی رہا ہوگئے اور اس قبیلہ سے خوشگوار تعلقات وابستہ ہوگئے

حضرت صفیہؓ

جنگ خیبر کا حال پہلے گزر چکا ہے۔ یہ یہودیوں کی سازشوں کا نتیجہ تھی۔ اس جنگ کے قیدیوں میں حضرت صفیہؓ بھی تھیں۔ باپ بنی نضیر کا رئیس اور ماں بنو قریظہ کے رئیس کی بیٹی۔ یہی یہودیوں کے ممتاز ترین قبائل تھے جن سے جنگ تھی۔ حضرت صفیہؓ کا پہلا خاوند سلام بن مشکم تھا۔ اس نے طلاق دیدی تو دوسرا نکاح کنانہ سے ہوا۔ اس جنگ میں کنانہ، اور حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی سب مارے گئے۔ اتنی بڑی ممتاز خاتون کے لئے ان حالات میں کاشانۂ نبوتؐ سے بڑھ کر اور کون مقام رفیع و منیع ہو سکتا تھا اس رشتہ سے یہودیوں اور مسلمانوں میں باہمی رابطہ کی ایک راہ نکل آئی۔

حضرت عائشہؓ

اب رہ گئیں حضرت عائشہؓ۔ حضرت خدیجہؓ نے ۱۰ھ میں وفات پائی۔ عام حالات میں بھی بیوی کی وفات گھر کے لئے کچھ کم ویرانی کا باعث نہیں ہوتی۔ جن ناساعد حالات میں اس زمانہ میں رسول اللہؐ گھرے ہوئے تھے ان میں یہ حادثہ بڑی پریشانی کا موجب تھا اور صحابہؓ کو اس کا خاص خیال تھا۔ حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں اور حضرت ابوبکرؓ کے جو قلبی تعلقات رسول اللہؐ کے ساتھ تھے ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔

ان حالات کے ماتحت یہ شادی ہوئی تھی۔

یہ تھے وہ امیال وعواطف اور مصالح ومقتضیات جن کے ماتحت نبیؐ اکرم نے متعدد نکاح کئے۔ آپ غور فرمایئے کہ ان کے پیش نظر کونسی بات محل اعتراض ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ غیر مسلم مورخ جنہوں نے احوال وظروف کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا ہے وہ خود معترف ہیں کہ ان تعدد ازواج سے رسولؐ اللہ کے خلاف نفس پرستی کا الزام کسی صورت میں بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ چنانچہ (Boswarth Smith) اپنی کتاب Mohamad and (Mohammadan Ism) میں لکھتا ہے۔

محمد کی شادیوں کی توجیہ جس طرح اور جن مقاصد کے ماتحت کی جا سکتی ہے اسی طرح اس مقصد کے ماتحت بھی کہ اس سے کس مپرسی بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن وجمال اور نہ مال ودولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں بلکہ صورت حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔

کارلائل اس باب میں رقمطراز ہے

ہوس پرستی!

محمد کے متعلق سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ وہ نفس پرست انسان نہ تھا۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہوگی اگر ہم اس شخص کو ایک عام ہذۂ ہوس تصور کریں جو اپنے آپ کو بہت حظائظ میں مشغول رکھے نہیں! یہ شخص حظ وکیف پر کبھی گرنے والا نہ تھا۔ اس کے گھر کا ساز وسامان نہایت غریبانہ تھا۔ اس کی خوراک جو کا آٹا اور پانی۔ اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوا کہ مہینوں تک اس کے گھر آگ نہیں جلی، وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتا تھا۔ اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتا تھا۔ ایک غریب۔ محنتی۔ مستغنی انسان ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن کی خاطر عام سطح کے انسان مرتے رہتے ہیں۔ اس قسم (کا ہوس پرست) انسان بڑا انسان نہیں ہو سکتا۔ اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایسا ہوتا تو وہ وحشی عرب جو تیئیس سال تک اس کے اشارہ پر جان پر کھیلتے رہے اور عمر بھر اسے اتنا قریب سے دیکھتے رہے کبھی اس کی تعظیم نہ کرتے۔ وہ بات بات پر کٹ مرنے والے وحشی تھے۔ منافقت سے دور۔ ایسے لوگوں سے اپنی اطاعت کرانا کسی عام انسان کا کام نہ تھا۔ وہ اسے رسول کہتے تھے اس لئے کہ اس کی ساری زندگی اُن کے سامنے بے نقاب تھی۔ اس میں کوئی راز نہ تھا سیدھی سادی زندگی۔ کبھی وہ اُن کے ساتھ جنگ میں شریک ہے کبھی مجلس مشاورت میں۔ کہیں اُن میں کھڑا ان سے احکامات کی اطاعت کرا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کا انسان ہے اسی لئے وہ اس کو پیغمبر کہتے تھے (وہ یونہی پیغمبر مان لینے والے لوگ نہ تھے) کوئی شہنشاہ اپنی

خلعت فاخرہ میں ملبوس لوگوں سے اس قسم کی اطاعت نہیں کرا سکتا تھا جس قسم کی اطاعت اس انسان نے کرائی جو اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگایا کرتا تھا۔ اور یہ سب کچھ تیئیس سال کی عملی جانچ اور پرکھ کے بعد ہوا۔ (۵۲ ج)

بیویوں کو اجازت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہ شادیاں سنہ ۷ھ تک ہو چکی تھیں اس کے بعد مسلمانوں پر فراغت اور مرفہ الحالی کا زمانہ آگیا۔ لیکن اس دور میں وہ گھر جسے سب سے زیادہ امیر ہونا چاہیئے تھا۔ سب سے زیادہ غریب تھا۔ اور وہ گھر تھا خود امیر ملت نبی اکرمؐ کا کاشانۂ مبارک۔ اس لئے کہ حضورؐ نے اپنے مصارف سب سے قلیل رکھے تھے، اس تبدیلیٔ احوال پر خود قرآن کریم نے ازواج مطہرات کو اجازت دیدی کہ چونکہ وہ مجبوری کا زمانہ گزر چکا ہے اس لئے ان میں سے جو نبی اکرمؐ کے گھر کے معیار زندگی پر مطمئن ہوں وہ حضورؐ کے ساتھ رہیں، اور جو اس سے بہتر معیارِ زیست چاہیں تو ان کے لئے رخصت ہے۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۳۳/۲۸-۲۹)

اے پیغمبر اسلام! آپ اپنی بیویوں سے کہدیجئے کہ اگر دنیوی زندگانی (کا عیش) اور اس کی خوش نمائی چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ (دنیوی) مال و متاع دیدوں اور (دے دلا کر) تمہیں خوبی کے ساتھ رخصت کردوں۔ اور اگر تم اللہ اور اُس کے رسول کو چاہتی ہو اور عالم آخرت (کی بھلائیوں) کو اپنے لئے پسند کرتی ہو، تو (جان رکھو کہ) اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کے لئے بہت بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے!

یہ اذن خداوندی ازواج مطہرات تک پہنچا لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی کاشانۂ نبوی سے علیحدگی کا خیال ظاہر کیا اس ایک واقعہ سے ظاہر ہے کہ

(۱) یہ شادیاں کن حالات کے ماتحت عمل میں آئی تھیں۔

(۲) حضور کا حسن سلوک کس انداز کا تھا اور

(۳) حالات کی تبدیلی کے بعد قرآن کریم نے انہیں خود اجازت دیدی کہ وہ چاہیں تو کسی اور مسکن میں چلی جائیں اور اس کے ساتھ ہی نبی اکرمؐ کو بھی اجازت دیدی گئی کہ وہ بیویوں میں سے جسے چاہیں رکھ لیں اور جسے چاہیں رخصت کردیں۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ

أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۗ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۞ تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ۖ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ ۳۳ ۵۱

اے پیغمبر اسلام! ہم نے آپ کے لئے آپ کی یہ بیبیاں (جو تمہارے نکاح میں ہیں اور) جن کو تم ان کا مہر دے چکے ہو، حلال کردی ہیں۔ اور وہ عورتیں بھی حلال کردی ہیں جو تمہاری مملوکہ ہیں جو اللہ نے غنیمت میں تم کو دلادی ہیں، اور تمہارے چچا کی بیٹیاں، تمہاری پھوپیوں کی بیٹیاں، اور تمہارے ماموں کی بیٹیاں اور تمہاری خالاؤں کی بیٹیاں بھی جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی۔ اور (نیز) وہ مسلمان عورت خود، بلا عوض (مہر) پیغمبر کو پیش کردے، بشرطیکہ نبی اس کو نکاح میں لانا قبول کرے یہ سب (احکام) آپ کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں، مومنین کے (احکام اس کے علاوہ ہیں) ہم کو وہ احکام بھی معلوم ہیں جو ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور ان کی مملوکہ لونڈیوں کے بارے میں مقرر کئے ہیں۔ تاکہ تم پر (تقرر احکام میں) کسی قسم کی تنگی پیش نہ آوے، اور اللہ بخشنے والا رحمت کرنے والا ہے۔ ان میں سے تم جس کو چاہو اپنے سے دور رکھو، اور جس کو جب تک چاہو اپنے نزدیک رکھو، اور جن کو (اب تک) دور رکھ چھوڑا تھا تو ان کے طلب کرلینے میں بھی تمہارے لئے کوئی نقصان کی بات نہیں۔ اس صورت میں زیادہ توقع ہے کہ ان سب کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور (دوری رفاقت سے جو صدمہ تھا وہ اب نہ ہوگا اور) وہ آزردہ خاطر نہ ہوں گی۔ اور تم جو کچھ بھی دیدوگے اس پر سب کی سب رضامند رہیں گی۔ اور اللہ کو تمہارے دلوں کی تمام باتیں معلوم ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا بردباری رکھنے والا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب مسلمانوں کی عسرت و فلاکت کا زمانہ خوشحالی و کشادہ دستی سے بدلا تو بہ تقاضائے بشریت بعض ازواج مطہرات نے خواہش ظاہر کی کہ ان کے گھروں میں بھی آسائش و زینت کا سامان ہونا چاہیئے۔ یہ خواہش کچھ معیوب نہ تھی لیکن امیر ملت کے لئے یہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی محاصل میں سے کم از کم اپنی ذات پر صرف کرے۔ حضورؐ اس باب میں بہت زیادہ محتاط تھے، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ حضورؐ کی زندگی کو دوسروں کے لئے مشعل ہدایت بننا تھا۔ بنا بریں حضورؐ کو ازواج کی طرف سے یہ مطالبہ گراں گزرا تھا۔ اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ان کا یہ تقاضا کچھ خوش آیند نہیں آپ نے کچھ وقت کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کرلی۔ جب ازواج مطہرات نے یہ محسوس کیا کہ یہ مطالبہ آپ پر گراں گزرا ہے تو وہ اپنے مطالبہ سے دست کش ہوگئیں۔ حالانکہ ان کے لئے

خدا کی طرف سے یہ اجازت موجود تھی کہ وہ چاہیں تو حضور کی رفاقت سے رخصت حاصل کر لیں، آیہ (۳۳/۲۸) میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

افشائے راز کا واقعہ

اسی طرح سورہ تحریم میں بھی ایک واقعہ کا ذکر ہے۔ نبی اکرم نے اپنی ازواج میں سے کسی سے کوئی راز کی بات کہی اور انہوں نے اس کا ذکر آگے کر دیا۔ اس ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور کو اس کی اجازت دیدی کہ آپ نے ان میں سے جس کے متعلق مناسب سمجھیں اسے رخصت کر دیں۔

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَن بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ۝ إِن تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ۖ وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ ۝ عَسَىٰ رَبُّهُ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنكُنَّ مُسْلِمَاتٍ مُّؤْمِنَاتٍ قَانِتَاتٍ تَائِبَاتٍ عَابِدَاتٍ سَائِحَاتٍ ثَيِّبَاتٍ وَأَبْكَارًا ۝ (۶۶/۳-۵)

اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے کوئی بات پوشیدگی سے کہی، پھر جب اس بیوی نے وہ بات (دوسری کسی بیوی پر) ظاہر کر دی، تو اللہ نے پیغمبر کو اس (واقعہ) کی خبر کر دی چنانچہ نبی نے (ظاہر کرنے والی بیوی پر) کچھ بات تو جتلا دی اور کچھ حصے سے اعراض برتا۔ چنانچہ جب آپ نے اس بیوی کو وہ بات تبلائی تو انہوں نے کہا کہ مجھ کو تو سب سے بڑے جاننے والے اور سب سے بڑے خبر رکھنے والے نے خبر کی ہے! (اے پیغمبر کی دو تو بیویوں!) اگر تم اللہ سے توبہ کر لو، تو (فبہا) کیونکہ تمہارے دل مائل توبہ ہو رہے ہیں اور اگر (اسی طرح) نبی کے مقابلہ میں تم کارروائیاں کرتی رہیں تو (یاد رکھو) پیغمبر کا رفیق (و مددگار) خدا ہے، جبریل ہے، اور نیک عمل مسلمان ہیں اور ان کے علاوہ فرشتے آپ کے مددگار ہیں! (پیغمبر اسلام!) اگر تو سب عورتوں کو طلاق دیدے تو تمہارا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے میں اس کو تم سے بہتر بیویاں دے گا جو مسلمان، مؤمن، فرماں بردار، تائب، عبادت گزار، روزہ دار، کچھ بیوہ، اور کچھ کنواری ہوں گی!

اس اجازت سے نہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے الگ ہونا چاہا اور نہ ہی رسول اکرم نے کسی کو الگ کیا۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ سے کہدیا گیا کہ اب آپ نہ اور کوئی نکاح کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان بیویوں میں تبدیلی، حالانکہ مخصوص حالات میں طلاق کی اجازت ہر مسلمان کو حاصل تھی۔

لَّا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِن بَعْدُ وَلَا أَن تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيبًا ۝ (۳۳/۵۲)

(اے پیغمبر اسلام!) ان کے علاوہ اور دیگر عورتیں تمہارے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ ہی یہ درست ہے کہ تم ان (موجودہ) بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں کرلو، باستثنائے مملوکات اگرچہ آپ کو ان (دوسری عورتوں) کا حسن کتنا اچھا کیوں نہ معلوم ہوتا ہو اور اللہ ہر چیز (کی حقیقت اور آثار و مصالح) کا پورا پورا نگراں ہے!

مرکز تعلیم و تبلیغ

نبی اکرم کا گھر تبلیغ کا مرکز تھا اس لئے ازواج مطہرات بھی اس مقدس تعلیم کی مبلغ تھیں لہٰذا، ان سے کہدیا گیا کہ وہ عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کا عکس دوسری عورتوں پر پڑتا ہے۔ اس لئے انہیں اپنے مقام سے ہر وقت باخبر رہنا چاہیئے۔ اس لئے فرمایا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ○ (۳۳/۳۰-۳۱)

اے نبی کی بیویو! جو کوئی بھی تم میں سے صریح بیہودگی اختیار کرے گی اس کو (مکافات عمل میں) دوہری سزا دی جائے گی اور یہ بات اللہ کے لئے بہت آسان (سی بات) ہے! اور تم میں سے جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے فرماں برداری، اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گی (تو سن رکھو) ہم اس کو (جزائے عمل کے طور پر ہر نیک عمل کا) ثواب بھی دوگنا کر کے دیں گے اور ہم نے اس کے لئے ایک عمدہ ترین روزی تیار کی ہوئی ہے!

اس کے بعد فرمایا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ○ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ○ (۳۳/۳۲-۳۴)

اے رسول کی بیویو! اگر تم تقویٰ کی راہ اختیار کرو تو (یہ حقیقت ہے کہ) تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تمہیں چاہیئے کہ (نامحرم مرد سے بولتے وقت) گفتگو میں لوچ پیدا نہ ہونے دو کیونکہ (اس سے) ایسے شخص کو جس کے دل میں کھوٹ اور خرابی ہے خیال (فاسد پیدا) ہونے لگتا ہے اور تمہیں لازم ہے کہ عام قاعدے کے مطابق بات چیت کیا کرو! اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہتی رہو، اور قدیم دور جاہلیت کے دستور کے

مطابق مت پھرو، اور چاہیئے کہ نماز کا نظم) قائم کرو، زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم رہو اور اللہ اور اس کے
رسول (کے احکام کی) اطاعت (فرماں پذیری) اختیار کرو، چونکہ اللہ کو منظور ہے کہ (اے نبی کے) گھر والو!
تم سے (معصیت و نافرمانی کی تمام) آلودگیاں دور کردے اور تم کو ہر طرح (یعنی ظاہری و باطنی طور پر)
پاک و صاف فرما دے! اور تم کو چاہیئے کہ تم اللہ کی اُن آیات اور اس کی حکمت کی باتوں کو یاد رکھو جن کا
چرچا تمہارے گھر میں رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ (پورا پورا) راز داں اور خبر رکھنے والا ہے!

اور زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کا طریقہ یہ ہے کہ

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا (۳۳/۳۴)

(اور اے ازواج النبی!) تم کو چاہیئے کہ اللہ کی اُن آیات اور حکمت کی باتوں کو یاد رکھو، جن کا چرچا
(دن رات) تمہارے گھر میں رہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ (پورا پورا) راز داں اور خبردار ہے۔

غور کیجیے کہ ازواج مطہرات کے متعلق قرآن کریم میں بہ نص صریح موجود ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے بمنزلہ ماں کے
تھیں۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳/۶)

(اے پیروان دعوت ایمانی جان رکھو!) نبی اکرم مومنوں کے لئے اُن کی اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہیں
اور اُن کی ازواج مطہرات اُن کے لئے (بمنزلہ) ماں ہیں!

جو اُن کی محرمات میں داخل تھیں۔

وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا (۳۳/۵۳)

اور دیکھو، آپ کی ازواج سے آپ کے بعد تم ہرگز نکاح نہ کرنا![1]

حالانکہ حضورؐ کا اپنا بیٹا کوئی زندہ نہ تھا لیکن یہ سب امت کی مائیں تھیں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۳/۴۰)

محمد رسول اللہ گو کہ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول، اور نبیوں کے ختم پر ہیں اور
اللہ ہر چیز کی مصلحت خوب جانتا ہے۔

[1] یہی وجہ ہے کہ حضورؐ دیگر مسلمانوں کی طرح، چار تک کو ساتھ رکھ کر، باقیوں کو الگ نہیں کر سکتے تھے کہ یہ الگ شدہ بیویاں کسی اور
کے نکاح میں نہیں آسکتی تھیں۔

لیکن اس کے باوجود ان سے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ غیر مردوں کے ساتھ ان کا رویہ کس قسم کا ہونا چاہیئے اور تاکید کی جاتی ہے کہ وہ کس طرح با پردہ باہر نکلیں۔ پردہ کے تاکیدی احکام کی اس لیے بھی زیادہ ضرورت تھی کہ مدینہ میں منافقین کا گروہ مسلمانوں کے لیے ایک مستقل مصیبت تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے جن سے وہ مسلمانوں کے اجتماعی امور میں انتشار، اور معاشرتی و تمدنی معاملات میں اختلال پیدا کر سکیں۔ ازواج مطہرات کی طرف انگشت نمائی یا اُن کے خلاف بہتان تراشی اُن کے اس مقصد شنیعہ کے لیے بہت مفید مطلب حربہ تھا (جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ انہوں نے فی الواقعہ ایسا فتنہ پیدا کر دیا) اس لئے اس باب میں امہات المومنین کو خاص طور پر تاکیدی احکام دیئے جاتے تھے اور ان کی وساطت سے دیگر خواتین ملت کو اسی ضمن میں ذرا آگے چل کر فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳/۵۹)

اے پیغمبر اسلام! اپنی بیویوں، اپنی صاحبزادیوں، اور دوسرے مسلمان کی عورتوں سے کہدو کہ اپنے (چہرے کے) اوپر چادروں کو (سر سے) تھوڑی سی نیچی کر لیا کریں، اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو وہ (اس طرح) پریشان نہ کی جاسکیں گی۔ اور اللہ بڑا بخشش دینے والا مہربان ہے۔

اور اس کی وضاحت میں فرمایا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (۳۳/۵۵)

پیغمبر کی بیویوں پر اپنے باپ، اپنے بیٹوں، اور اپنے بھائیوں، بھتیجوں، اپنے بھانجوں، اور اپنی (ہم مذہب) عورتوں، اور اپنی مملوکہ لونڈیوں کے (سامنے آنے کے) بارہ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور تم کو چاہیئے کہ (ہر حال میں) اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز پر نگران (و محافظ) ہے!

افک عائشہ رضؓ

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ حضورؐ کی خانگی زندگی کے متعلق کوئی فتنہ پردازی کی جائے جس سے مسلمانوں کی اجتماعیت میں انتشار و افتراق پیدا ہو جائے۔ غزوہ بنو مصطلق میں حضرت عائشہؓ ساتھ تھیں۔ واپسی کی شام آپ ضروریات کے لیے باہر تشریف لے گئیں اور وہاں اپنا ہار تلاش کرنے لگیں، انہیں دیر لگ گئی کوچ کا وقت آگیا۔ ساربان نے یہ سمجھ کر کہ آپ محمل میں تشریف فرما ہیں۔ ناقہ کو شریک کارواں کر لیا۔ جب حضرت عائشہ لوٹ کر آئیں تو لشکر دور نکل چکا تھا۔ وہ اس خیال میں

وہیں رُک گئیں کہ جب اُن لوگوں کو معلوم ہو گا کہ آپ محمل میں نہیں ہیں تو کوئی نہ کوئی آدمی تلاش کے لئے بھیجیں گے۔ اتنے میں ایک اور صاحب ادھر سے آ نکلے اور آپ ... ان کے ساتھ لشکر کی طرف آ گئیں مفسدہ پرداز منافقین کے لئے اتنی سی بات کافی تھی۔ انہوں نے اس سے ایک پورا افسانہ تراشا اور اسے خاص طور پر نشر کیا۔ حتیٰ کہ بعض سادہ لوح مسلمان بھی ان کے دام فریب میں آ گئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک تھا۔ اس لئے حضورؐ نے اس میں خود فیصلہ نہیں دیا۔ حتیٰ کہ خود قرآن میں حضرت عائشہؓ کی عفت کی شہادت آ گئی۔ سورۂ نور میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِنْكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَكُمْ ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُبِينٌ ۝ لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۲۴ : ۱۱-۱۴)

جن لوگوں نے یہ طوفان (عائشہؓ کی نسبت) برپا کیا ہے وہ تمہارے ہی میں کا ایک گروہ ہے (یعنی منافقوں کا گروہ جو مسلمانوں میں بظاہر شامل تھا) تم اس (طوفان انگیزی کو) اپنے حق میں بُرا نہ سمجھو بلکہ (باعتبار نتیجہ کے) تمہارے حق میں تو بہتر ہی بہتر ہے۔ یاد رکھو ان میں سے ہر شخص کو جس نے جتنا کچھ کیا (اتنا ہی) گناہ ہوا اور جس شخص نے ان میں سے اس (بارے میں) سب سے بڑا حصہ لیا اس کو سخت ترین سزا ہو گی۔ جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان اور مسلمان عورتوں نے اپنے آپس والوں کے ساتھ دل سے نیک گمان کیوں نہ کیا (وہ زبان سے) کہہ دیتے کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے یہ لوگ اپنے (اس) قول پر چار گواہ کیوں نہ لائے؛ چنانچہ جب یہ لوگ (حسب قاعدہ) گواہ نہیں لا سکے تو اللہ کے نزدیک یہ لوگ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں (اے پیروان دعوت ایمانی!) اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم جس شغل میں پڑے تھے تم پر سخت عذاب واقع ہوتا

اس کے بعد فرمایا۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ۝ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (۲۴ : ۱۵-۱۸)

غور کیجئے دنیا میں رہبانیت حلال چیزوں کے ترک کر دینے سے پیدا ہوتی ہے آپ دنیا تیاگنے والے سنیاسیوں، اور عیسائی خانقاہوں کے احبار و رہبان کو دیکھئے کسی نے اپنے اوپر روٹی حرام کر رکھی ہے، کسی نے کپڑا، کسی نے بیٹھنا، کسی نے لیٹنا، زینت کی اشیاء کلھم حرام" ان ہی بنیادوں پر ترک دنیا کی وہ عمارت قائم ہوتی ہے جس کی تعمیر میں انسانیت کی خرابی کا راز مضمر ہے رسول اللہؐ کا یہ (بظاہر بالکل بے خطر و معصوم) عمل، قرآن کی نگہ احتساب سے کس طرح بچ سکتا تھا؟ اسے فوراً روک دیا گیا۔

بہر حال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ نبی اکرمؐ کا اپنے اہل خانہ کے ساتھ اس درجہ عاطفت و مرحمت کا سلوک تھا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا

خیرکم خیرکم باھلہٖ و انا خیرکم باھلی

سب لوگوں میں اچھا وہ ہے جو اپنے اہل خانہ سے اچھا ہے اور میں تم سب سے بڑھ کر اپنے اہل خانہ سے حسن سلوک سے پیش آتا ہوں۔

حسن سلوک

اور اپنے اہل خانہ تک ہی محدود نہیں۔ آپ کا حسن سلوک، اپنے اور غیر کی حدود سے ناآشنا تھا۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تم کو ایسی بات بتاؤں جو نماز اور روزہ سے بھی بڑھ کر ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ ارشاد فرمایئے! فرمایا کہ "باہمی تعلقات کا خوشگوار رکھنا" اس حسن معاشرت میں سب سے مقدم حق ہمسایہ کا ہوتا ہے۔ ہمسایہ کے حق کے متعلق آپ نے یہاں تک تاکید فرمائی کہ وہ شخص صاحب ایمان نہیں جس کی برائیوں سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

اس حکم کو آگے پھیلایئے اور پھر دیکھئے کہ ہمسایہ در ہمسایہ کا یہ سلسلہ کس طرح عالمگیر ہو جاتا ہے۔ ہمسایوں میں مسلم

ہمسایہ کے حقوق

و غیر مسلم کی تمیز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ بکری ذبح کی تو گھر والوں سے دریافت کیا کہ انہوں نے ہمسایہ کو (جو یہودی تھا) گوشت بھیجا ہے یا نہیں۔ کیونکہ حضورؐ نے ہمسایوں سے حسن سلوک کی تاکید فرمائی تھی (بحوالہ ابوداؤد) بیماروں سے شفقت کا یہ عالم تھا کہ آپ دور دور تک ان کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اور اس میں بھی مسلم و غیر مسلم کی تفریق نہ تھی (بحوالہ بخاری) حسن اخلاق (کیرکٹر کی عمدگی) در حقیقت ایمان و اعمال صالح کی اصل ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس شجر مقدس کا یہی پھل ہے جس سے وہ درخت پہچانا جاتا ہے۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا

اکمل المومنین ایماناً احسنھم خلقاً (بحوالہ ترمذی)

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق (کیرکٹر) سب سے اچھا ہے

بلندی کیرکٹر

اس عمدگی اخلاق اور بلندی کیرکٹر کے متعلق آپ نے ایک ایسا اصول ارشاد فرمایا ہے کہ

اگر اس سلسلہ کو پھیلا دیا جائے تو ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داریوں کی کڑی میں جکڑا چلا جاتا ہے۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔
"تم میں سے ہر شخص کچھ نہ کچھ لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے اوپر رکھتا ہے اس سے ان ذمہ داریوں کی نسبت باز پرس ہوگی"۔ حسنِ اخلاق (کیرکٹر) سے انسان کے اندر بلند حوصلگی اور کشادہ نگہی آجاتی ہے اور یہ شرفِ انسانیت کے بہترین جوہر ہیں۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ ان اللہ یحب معالی الامور ویبغض سفسافھا۔ یقیناً اللہ بلند امور کو پسند کرتا ہے اور دنائت کی پست ذہنیت کو ناپسند رکھتا ہے۔

حبور وغیور و کلاں گیر زی!

اس باب میں آپ کی نگہ باریک بین نے حسنِ اخلاق کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ اس لئے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، انسانی کیرکٹر کی جھلک روزمرہ کی معمولی حرکات و سکنات میں غیر شعوری طور پر اُبھر آتی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تبسمك فی وجہ اخیك صدقۃ۔ تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر متبسم ہونا بھی خیرات ہے۔ یہ تبسم اور خندہ پیشانی (بشرطیکہ یہ خلوص پر مبنی ہو اور آج کل کے پاپولر بننے کی اسکیم کا منافقانہ جزو نہ ہو) اخلاص و محبت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ حسنِ اخلاق (بلندی کیرکٹر) کی یہ تاکید اس لئے تھی کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

بعثت لاتمم حسن الاخلاق (مؤطا)

میری بعثت کی غرض ہی اخلاق (کیرکٹر) کی تکمیل ہے۔

جب تک انسان خود اپنے کیرکٹر کی تکمیل نہ کرے دوسروں کے کیرکٹر کی اصلاح کیا کرے گا؟ اسی لئے قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں فرما دیا

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۶۸: ۴﴾

یقیناً آپ انسانی کیرکٹر کی انتہائی بلندیوں پر ہیں۔

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ

یہ کیرکٹر کیا تھا؟ اس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے ایک چھوٹے سے فقرے میں تمام تفاصیل و اطناب کو یوں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس طرح آنکھ کے تل میں آسمان مع اپنی تمام محفل انجم و مہر و ماہ کے جلوہ فگن ہو۔ کان خلقہ القرآن! (ابوداؤد) حضورؐ کا کیرکٹر کیا تھا؟ قرآن! قرآن حروف و نقوش کی صورت میں شرفِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں کا ترجمان، اور سیرتِ محمدیہ ان ہی بلندیوں کا چلتا پھرتا حسین پیکر۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

خاک کے ذرے اپنی ارتقائی منازل طے کر کے پیکرِ انسانی میں متشکل ہو گئے۔ اب پیکرِ انسانی کا منتہائے کمال

یہ ہے کہ وہ سیرت محمدیہ کے قالب میں ڈھل جائے کہ وہ سیرت دنیا میں قرآن کی تفسیر ناطق ہے اور قرآن ہی کے اندر محفوظ۔

بروح اعظم و پاکش درود لامحدود

یہ ہیں مختصر سے کوائف حیات ایک ایسے انسان کے جس نے اپنے آپ کو کبھی عام انسانوں سے الگ نہیں سمجھا۔ آپ اس داستانِ زندگی کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس پیکر میں پہنچ کر انسانیت کس قدر بلند ہو گئی تھی۔ اور انسانیت جب اپنی پوری قامت اختیار کر لیتی ہے تو وہ زندگی کے ہر شعبہ میں جھلکتی ہے، صرف کسی ایک گوشہ میں منعکس نہیں ہوتی۔ آئینہ کے ہر ٹکڑے میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو پورے آئینہ میں دکھائی دیتا ہے۔ مغرب کی میکیاولی سیاست نے اخلاقیات (Morality) کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک پبلک (باہر کی دنیا کے معاملات سے متعلق) اور ایک پرائیویٹ (نجی معاملات سے متعلق) اور ان کا "عقیدہ" یہ ہو چکا ہے کہ "پبلک معاملات" "پرائیویٹ اخلاق" کے اصولوں کے ماتحت کبھی کامیابی سے طے نہیں پا سکتے۔

(LORD GREY) کے الفاظ میں

> میں اخلاقیات کا مداح ہوں پبلک بھی اور پرائیویٹ بھی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قوموں کے معاملات ان قانون کے مطابق کبھی حل نہیں ہوتے۔

اس لئے کہ بقول (WALPOLE)

> نیک انسان آج تک کبھی کسی قوم کو بچا نہیں سکے۔ اس لئے کہ نیک انسان اپنی اخلاقی پابندیوں کی بنا پر کبھی اس حد تک نہیں جا سکتے جس حد تک جانا امورِ سیاسیات میں ضروری ہو جاتا ہے۔

(Quoted in Ideals and Illusions)

مغرب کے اخلاق و سیاست کے ائمہ کے نزدیک یہ ناممکن ہے کہ ایک انسان جس طرح اپنی پرائیویٹ زندگی میں نیک کردار ہوتا ہے، امور سیاست میں بھی ایسا ہی با اصول رہے۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ اخلاق (Morality) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک پرائیویٹ اور ایک پبلک۔ لیکن ہمارے سامنے یہاں ایک ایسے انسان کی زندگی ہے جس نے عملاً بتا دیا کہ جسے تم ناممکن کہتے ہو وہ اس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیرت محمدیہ ہمیں بتاتی ہی یہ ہے کہ انسانی ممکنات کی آخری حدیں کونسی ہیں۔ اس حیات طیبہ میں انسانیت اپنے معراج تک پہنچ گئی اور اسی لئے تمام نوع انسانی کے لئے نصب العین حیات قرار پا گئی۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (۱۵۸/۷)

ل لہٰذا حضورؐ کی سیرت نگاری میں بنیادی اصول یہ ہے کہ حضورؐ کی طرف کسی ایسے واقعہ کو منسوب نہ کیا جائے جو قرآن کے خلاف جاتا ہو۔ اس لئے کہ یہ ناممکن تھا کہ حضورؐ کا کوئی عمل یا قول، قرآنی تعلیم کے خلاف ہو۔ تاریخ سیرت (احادیث) کی صحت و سقم کا یہی معیار ہمارے نزدیک قابل قبول ہے اور بس۔

تکمیلِ کار

طوبیٰ لکم وحسن مآب

اب ہم سنہ ۱۰ھ میں آپہنچے ہیں۔ حیات نبوی کی کتاب مقدس کے تئیس اوراق پیچھے کو الٹئے اور ایک طائرانہ نگہ بازگشت ڈالئے ان تمام احوال وظروف اور کوائف وحوادث پر جو اس داستان اطہر اقدس کے اجزاء وعناصر ہیں۔ دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس پوری داستان حیات میں کس طرح زندگی اپنی انتہائی تابناکیوں اور ضوفشانیوں، سرگرمیوں اور حرارت آمیزیوں، جمال آفرینیوں اور جلال انگیزیوں، سیرابیوں اور شادابیوں، کامرانیوں اور کامجوئیوں ناپیداکنار وسعتوں اور بے پایاں گہرائیوں، کے ساتھ مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ زندگی نہیں ایک کاروان ذوق وشوق ہے، جو یقین کامل اور ایمانِ محکم حسن عمل اور جوشش کردار، تطہر فکر اور پاکیزگیٔ نگاہ، کشادہ ظرفی اور بلند نگہی، سوز وساز اور تپش وخلش، کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے انتہائی جذب وانہماک کے ساتھ این و آں کی دامن کشیوں سے بے خبر اور گردو پیش کی عناں گیریوں سے بے نیاز اپنی متعین منزل کی طرف مستانہ وار بڑھے چلا جارہا ہے۔ نہ راستہ کے خطرات اس کے دل میں خوف وہراس پیدا کرتے ہیں نہ سفر کی صعوبات اس کے پائے استقامت میں لغزش کے آثار نمودار کرتے ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں زندگی نہیں، ایک جوئے رواں ہے کہ ناسازگار حالات وناموافقت زمانہ کی ہر چٹان اس کی رفتار میں اور تیزی اور اس کی موجوں میں مزید خوش خرامی پیدا کر دیتی ہے۔

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود — مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار
دو خواب ناز بود بہ گہوارۂ سحاب — واکرد چشم شوق بآغوش کوہسار
از سنگ ریزہ نغمہ کشاید خرام او — سیمائے او چوں آئینہ بے رنگ بے غبار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ جوئے رواں نہ صرف ہجوم تزاحم اور انبوہ تصادم کی سنگلاخ زمینوں ہی سے مستانہ وار گزرتی آئی ہے بلکہ کشش وجاذبیت کی ہر وادئ رنگ وتعطر اور امیال وعواطف کے ہر دامنِ کیف ونکہت پر ایک نگہ تبسم آلود ڈالتی کہیں کھلتی

انداز سے آگے بڑھتی چلی آتی ہے

در راہ او بہار پریخانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیش ما بایست — خندید غنچہ و سر دامان او کشید
نا آشنائے جلوہ فروشان سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

غور کیجئے - ایک یتیم - غریب - ان پڑھ انسان - روزمرہ کے کاروبار حیات میں مشغول دکھائی دیتا ہے کہ یکایک حقیقت اپنا نقاب الٹ کر بے حجابانہ اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے اس کی زندگی میں بس اتنا حصہ مافوق الفطرت ہے - وہ نیر حقیقت کی روشنی میں جب اپنے گرد و پیش پر غور کرتا ہے تو کائنات انسانیت کی کوئی شے اسے اپنی صحیح حالت پر نظر نہیں آتی - وہ سمجھ لیتا ہے کہ حقیقت کی اس پردہ کشائی سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس بگڑی ہوئی دنیا کی ہر شے کو اس مقام پر لے آئے جو فطرت نے اس کے لئے متعین کر رکھا ہے - وہ اسے اپنی زندگی کا مقصد اور نگاہوں کا منتہیٰ قرار دے لیتا ہے - چونکہ وہ دنیائے انسانیت کے ہر شعبہ میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے - اس لئے ساری دنیا اس کی مخالف ہو جاتی ہے - وہ اس وسیع و عریض دنیا میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے - کوئی اس کا شریک فکر نہیں - کوئی ہمنوا محرم راز نہیں - وہ اپنی آواز بلند کرتا ہے تو دنیا بھر کا شور چاروں طرف سے امنڈ کر آجاتا ہے کہ اس کی اس دعوت کو کسی باہوش کان تک نہ پہنچنے دیا جائے - لیکن وہ اپنی پکار کو برابر جاری رکھتا ہے - اس کے پاس کچھ ساز و سامان نہیں - کوئی وسائل و ذرائع نہیں - لیکن اسے اپنے نصب العین کی صداقت پر ایسا محکم یقین ہے کہ بے سر و سامانی کا ہر حوصلہ شکن مرحلہ اس کے لئے ہزار ساماں ویراں بن جاتا ہے اور وہ انتہائی مایوسیوں میں گھرے ہونے کے باوجود نہایت عزم و استقلال سے پکار کر کہتا ہے کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از وفور عشق — سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

سعید روحیں اس کی اس دعوت میں حقیقت و صداقت کی جھلک پاتی ہیں اور اس طرح وہ ایک سے دو اور دو سے چار ہونے شروع ہو جاتے ہیں - کامل تیئس برس اسی تگ و تاز اور اسی جد و جہد میں گزر جاتے ہیں - اس تمام عرصہ میں اس مدعی حق و صداقت کی زندگی دامن صحرا کی طرح ہر رہ نورد منزل ہستی کے سامنے کھلی ہوئی رہتی ہے - کوئی سازش نہیں - کوئی راز نہیں - کوئی سر مستور نہیں کوئی مافوق العادت عنصر نہیں - لین دین، میل جول بود و ماند، سب اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی طرح - دشمن سے لڑائی ہے تو اس کے لئے پوری پوری تیاری کی جاتی ہے - شمشیر و سناں - تیر و تفنگ - آلات و اسلحہ سب مہیا کئے جاتے ہیں - جنگ کے میدانوں میں کامیابیاں

بھی ہوتی ہیں اور ناکامیاں بھی - کامیابیاں مستقل لیکن ناکامی بالکل عارضی - اس لئے کہ ایک ناکامی سے اس کے اسباب و وجوہات پر غور کر کے آئندہ کے لیے اس کی تکرار کے امکانات کو زائل کر دیا جاتا ہے - اپنی جماعت کی تنظیم بھی ہو رہی ہے اور اس تنظیم میں ہی ان کی تعلیم و تربیت بھی - اسی تعلیم و تربیت سے ان کی سیرتوں کو بلند اور کیرکٹر کو پختہ کیا جاتا ہے - مخالفین کی قوت ٹوٹتی جاتی ہے اور مخالفین کی جمعیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے - بتدریج، رفتہ رفتہ حق و صداقت کا نظام روشنی کی طرح بڑھتا اور ہر غیر فطری آئین سائے کی طرح سمٹتا جا رہا ہے - حتیٰ کہ وہ وقت آگیا کہ باطل کی ہر قوت سرنگوں ہو گئی اور حق کا ہر سمت غلبہ ہو گیا - ملوکیت برہمنیت، سرمایہ داری غلامی شخصیت پرستی نسبی تفریق، قبائلی تقسیم، کے ہر نظام کہن کی بساط الٹ گئی - قزاقی، غارتگری، درندگی، خونخواری، قمار بازی، شراب خواری، تعصب، جہالت، کینہ توزی. ظلم و استبداد کی ہر روش مٹ گئی -

دریائے پُرخروش! ز بند و شکن گزشت   از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گزشت

یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را   از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گزشت

بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار   در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود

در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ زندگی ہمیں بتا رہی ہے کہ ایک انسان کا ایمان محکم اور عزم راسخ دنیا میں کیا انقلاب برپا کر سکتا ہے تئیس سال کی مسلسل جد و جہد اور پیہم سعی و عمل کے بعد اب وہ وقت آگیا کہ اس مقصد عظیم کی تکمیل کا اعلان کر دیا جائے جس کا آغاز اس بے سر و سامانی کے عالم میں ہوا تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے - یہ اعلان اس محیطِ نشر الصوت (Broad-casting Station) سے ہونا چاہیئے تھا جو نظام شرف انسانیت کا مرکز تھا - اس مقصد کے لئے سنہ ۱۰ھ

مکہ کی طرف روانگی

میں حضورؐ نے حج کا ارادہ فرمایا - اس خبر کا عام ہونا تھا کہ سارا عرب ہمرکابی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے امنڈ آیا - ذیقعدہ کی چھبیسویں (۲۶) تاریخ حضورؐ مدینہ منورہ سے جانب کعبہ روانہ ہوئے - مدینہ سے باہر چھ میل کے فاصلہ پر قیام فرمایا - دوسری صبح حضورؐ نے احرام باندھا اور بلند آواز سے فرمایا کہ

لبیک اللّٰھم لبیک - لا شریک لک لبیک - ان الحمد والنعمۃ لک لبیک
والملک لا شریک لک

ہم حاضر ہیں - اے خدائے بزرگ و برتر - تیرے بندے تیرے حضور میں حاضر ہیں - حمد و ستائش کی مرکز تیری ہی ذات ہے اس میں کوئی اور شریک نہیں - حکومت صرف تیرے لئے ہے - اس میں کسی اور کا

حصہ نہیں۔ لبیک اللھم لبیک

حضورؐ نے یہ کلمات بلند کئے اور سننے والوں نے سنا کہ لبیک اللّٰھُمَّ لبیک کی صدائے بازگشت سے تمام دشت وجبل گونج اٹھے کہ یہ کاروان عشق وذوق تمام دامن صحرا پر ریت کے چمکتے ہوئے ذروں کی طرح تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ تقدیس وتمجید کی ان زمزمہ باریوں سے یہ قافلۂ نور ونکہت منزل بمنزل آگے بڑھتا گیا۔ سینوں میں تڑپتے ہوئے دل۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی فراست۔ پیشانیوں میں مچلتے ہوئے سجدے۔ ذوقِ عبودیت کی متاع گراں بہا در آغوش۔ حسن عمل کی کامرانیوں اور سعی پیہم کی شادکامیوں کی ایک جنت اپنے جلو میں لئے، یہ زبدۂ کائنات گروہ، یہ عصارۂ روزگار جماعت، یہ جیش خدامست، یہ عسکر خود آگاہ، یہ حریت ومساوات کے علم بردار، یہ احترام انسانیت کے پیغامبر۔ یہ لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون کے زندہ پیکر، ذی الحجہ کی چار تاریخ کو، صبح کے سہانے وقت، تاروں کی خنک وحسین چھاؤں میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ جب کعبہ پر نگاہ پڑی تو حضورؐ نے وجد ومسرت کے والہانہ انداز میں فرمایا۔

مکہ میں داخلہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ۔ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ۔ یحی ویمیت
وھو علی کل شیءٍ قدیر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ۔ انجز وعدہٗ
نصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ

(ہاں! آج اس حقیقت کبریٰ کا عملی اعلان ہو رہا ہے کہ) خدا کے سوا کوئی حاکم اور آقا نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ سروری اور ستائش سب اس کے لئے زیبا ہے۔ وہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو موت دیتا ہے وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اس خدائے واحد کے سوا کوئی حاکم نہیں (میرا سر نیاز اس کی بارگاہ صمدیت میں جھکا ہوا ہے کہ جس نے) اپنا وعدہ (یوں) پورا کیا۔ اس نے اپنے (بے سروسامان) بندے کی مدد کی اور باطل کے تمام جیوش وعساکر کو شکست دیدی (اور حق کی اس طرح فتح ہوئی)

نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز، یہ تمام جمعیت اسلامیہ، یہ امت قانتہ، یہ ملت مسلمہ، یہ قدسیوں کی جماعت، عرفات کے میدان میں جمع ہو گئی کہ اپنے امام ومقتدا سے تاسیس حکومت الٰہیہ کا اعلان عظیم اپنے کانوں سے سن لیں تاکہ اس کے بعد اسے کامل حتم ویقین کے ساتھ دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں۔ دوپہر ڈھل گئی تو کمل کے خیمہ سے

خطبہ حجۃ الوداع

وہ ذات گرامی جلوہ بار ہوئی جس کے ایمان وعمل کے درخشندہ نتائج اس وقت یوں سامنے ضو فشاں تھے۔ حضورؐ ناقہ پر سوار ہوئے تو تکبیر کے غلغلہ انگیز نعروں سے فضا مرتعش ہو گئی۔ آپ نے ناقہ کے اوپر ہی سے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو قیام نوع انسانی کے لئے منشور

بالغہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

الا کل شیئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع

ہاں! جاہلیت کے زمانۂ ظلمہ کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ اعلان اس کی طرف سے ہو رہا ہے جسے اس مقام سے آج سے دس سال قبل، ان ہی آئین و دساتیر کے علمبرداروں نے چاروں طرف سے یورش کر کے نکالا تھا۔

اس کے بعد فرمایا۔

ایھا الناس۔ الا ان ربکم واحد۔ وان اباکم واحد۔ الا لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علیٰ عربی۔ ولا لاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر۔ الا بالتقویٰ۔

اے نوعِ انسانی دُسن رکھو کہ، تمہارا سب کا رب ایک ہے۔ اور تم تمام ایک ہی اصل کی شاخیں ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر۔ کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

ذرا دیکھئے۔ شرف انسانیت کی نمو و بالیدگی اور مذلت آدمیت کے عروج و ارتقا کی راہ میں سب سے بڑے سنگ راہ، انسانوں کی جغرافیائی تقسیم (وطنیت) اور نسبی تفوق (نیشنلزم) کی ابلیسانہ حدود و قیود ہیں۔ اس لئے اس منشور حریت و مساوات انسانیہ میں سب سے پہلے باطل کے ان ہی انسانیت سوز معیاروں پر خط تنسیخ کھینچا گیا۔ اس طرح تمام نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری قرار دے کر، صرف شرف انسانیت کو باعث تکریم اور وجہ تعظیم بتا دیا گیا جو اتباع قوانین الٰہیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس فطری تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا۔ جس کی رو سے انسان دو جماعتوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک وہ جماعت جو ہر ایک کی محکومیت سے انکار کر کے صرف ایک خدا کی حکومت کو جائز تسلیم کرے۔ اور دوسری وہ جماعت جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کے سامنے اپنی گردن جھکا دے، خواہ وہ قوانین خود اپنے وضع کردہ ہوں یا دوسرے انسانوں کے مسلط کردہ۔ اول الذکر جماعت (امت مسلمہ) اس یک نگہی اور ہم رنگئ اشتراک نصب العین اور وحدت مقصد کی بنا پر باہمد گر بھائی بھائی اور اس حقیقت کبریٰ سے انکار کرنے والے تمام انسان (کافر ہیں) ایک دوسری سوسائٹی کے افراد ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ

ان کل مسلم اخو مسلم وان المسلمین اخوۃ

یاد رکھو۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور اس طرح تمام روئے زمین کے مسلمان رشتۂ اخوت میں منسلک اور سلک مودت سے منوط

اور یہ رشتۂ اخوت و ناطۂ مؤدت محض ایک نظری عقیدہ نہیں بلکہ یاد رکھو کہ

ان دمائکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شہرکم ھذا۔ فی بلدکم ھذا۔ الی یوم تلقون ربکم

تمہارا خون اور تمہارا مال اور تمہاری آبرو قیامت تک کے لئے ایک دوسرے کے نزدیک اسی طرح محترم ہونا چاہیئے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں وجہ احترام ہے۔

یاد رکھو۔

لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم

کہیں میرے بعد (ائتلاف و مرکزیت کی صراط مستقیم چھوڑ کر تشتت و افتراق کی) گمراہی نہ اختیار کر لینا کہ خود ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو کہ تمہیں خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑیگا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

یہ وحدت و یکجہتی صرف تمہارے نظام سے قائم رہ سکے گی۔ اس نظام کی بنیاد ہے قرآن پر، اور یہی قرآن ہے جسے میں اپنے بعد تمہارے لئے چھوڑ جاؤں گا۔

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہٗ، ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ

میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ!!

یہ ہے تمہارے نظام کا ضابطۂ قانون۔ اور اس قانون کو نافذ کرنے والا تمہارا امیر جس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہوگی۔

ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ۔ فاسمعوا لہ واطیعوا

اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تمہیں قرآن کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔

اس نظام دینی میں ہر رکن کو اس کی اپنی جگہ پر رکھو اس کے مقام سے اسے اونچا نہ لے جاؤ کہ قوموں کی ہلاکت و بربادی اسی غلو سے ہوتی ہے

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین۔

دین میں غلو مت کرو کہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

پھر فرمایا کہ یاد رکھو قوموں کی تعمیر و تربیت میں آغوشِ امومت کا بڑا بنیادی حصہ ہوتا ہے اسی لئے اپنے نظام مدنیت میں عورتوں کی صحیح پوزیشن کو نظر انداز نہ کر دینا۔

فاتقوا اللہ فی النساء۔ ان لکم علیٰ نسائکم حقا و لھن علیکم حقا

عورتوں کے معاملہ میں بھی (قانون خداوندی کی حفاظت میں رہو۔ یاد رکھو تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر حقوق ہیں (ان حقوق کو نظر انداز مت کرو۔)

یہ فرما کر آپ نے مجمع پر ایک غائر نگاہ ڈالی۔ قریب ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم اس شمع نبوت کے گرد تھا۔ وہ گروہ عظیم کہ جس کی گردنیں دنیا کی کسی طاغوتی قوت کے سامنے نہیں جھک سکتی تھیں، اپنے خدا کے حضور سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس سعادت عظمیٰ کی فراوانی پر شاداں و نازاں جو انہیں مجاہدانہ سعی و عمل کے سلسلہ میں بارگاہ رب العزت سے اس طرح عطا ہوئی تھی اور ان ذمہ داریوں کے بارگراں کے احساس سے لرزاں و ترساں جو نوع انسانی کی امامت و قیادت کے سلسلہ پر ان پر عائد ہو رہی تھیں۔ حضورؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون۔

تم سے خدا کے ہاں پوچھا جائے گا۔ کہو تم کیا جواب دو گے!

لاکھوں زبانیں ایک ہی وقت پکار اٹھیں کہ "ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا"۔

کتنی عظیم الشان ہے یہ شہادت جو کسی انسان کو اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد میسر آ جائے۔ آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا۔

اللھم اشھد اے خدا! تو گواہ رہنا۔

جس شاہد عادل کی گواہی کی استدعا کی گئی تھی اس نے اپنی شہادت کو کل پر اٹھا رکھنے کے بجائے اسی وقت اعلان کر دیا کہ

تکمیل دین کا اعلان

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ (اور اس طرح) اپنی نعمت کا اتمام کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کا دین انتخاب کر لیا۔

ہزاروں آنکھیں تھیں جو اتمام نعمت کی اس بشارت عظمیٰ پر فرط مسرت سے عطر بیز تھیں۔ لیکن سینکڑوں آنکھیں تھیں جو اپنے محبوب کی جدائی کے احساس سے شبنم فشاں بھی تھیں کہ انہوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ تکمیل دین

کے بعد رسول کی دنیا میں ضرورت نہیں رہے گی اور یہ آیۂ مقدسہ اس آنے والی ساعتِ فراق کی پیش آہنگ ہے۔

خطبہ سے فارغ ہو کر حضور جانب منیٰ روانہ ہوئے۔ اس شاہانہ جلوس کا انداز یہ تھا کہ ایک حبشی غلام (حضرت بلالؓ) ناقہ کی مہار پکڑے تھے اور ایک غلام ابن غلام (حضرت اسامہؓ بن زید) شریک سواری، کپڑا تان کر فرق مبارک پر سایہ کئے تھے۔ اور اونٹنی پر ایک پالان تھا جس کی قیمت ایک روپے سے زائد نہ تھی۔ خدا کی طرف سے تکمیل دین کا اعلان ہو چکا تھا اور یہ دین اپنی عملی شکل میں خدا کی زمین پر نافذ۔ یعنی نظام انسانیت فطرت کے صحیح خطوط پر متشکل وہ نظام جس پر چلنے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا لیکن جس میں انسان کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کی آمیزش نے اس کی ہیئت بدل ڈالی تھی۔ آج انکی تمام کثافتیں اور آلودگیاں یکسر دور ہو گئیں اور وہ نظام اسی حالت پر آگیا جس پر اسے خلاقِ فطرت نے متعین کیا تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ

زمانہ اپنے مرکزِ اصلی پر

ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض

زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطہ پر آگیا جس پر اللہ نے اسے تخلیق ارض و سمٰوٰت کے وقت متعین کیا تھا یہی مقصود فطرت تھا۔ یہی انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ تھا۔ یہی اس کاروانِ رشد و ہدایت کی آخری منزل تھی جو کبھی جودی کی چوٹیوں پر ٹھہرا اور شام کے سبزہ زاروں میں رکا کبھی نیل کی وادیوں میں گھوما اور سینا کے پہاڑوں سے گزرا۔ کہیں یروشلم کے میدانوں میں اترا اور پھر بطحا کے صحراؤں میں فروکش ہوا۔ یہی وہ جنت تھی جو جنت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کے اعمال کے بدلے میں ملنی تھی اور مل کر پھر نہ چھننی تھی۔

اس اعلان عظیم کے بعد حضورؐ نے پھر مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

الا ھل بلّغت

کیوں؟ میں نے پیغام خداوندی تم تک پہنچا دیا؟

سب بول اٹھے۔ ہاں پہنچا دیا۔ آپ نے پھر فرمایا کہ

اللّٰھُمّ اشھد

اے خدا تو گواہ رہنا۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ

فلیبلّغ الشاھد الغائب

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

اور اس طرح اس پیغام خداوندی کی وسعتوں کو ابدیت سے ہمکنار کر دیا۔

مدینہ کو واپسی

تکمیل دین کے اس فریضہ مہمہ سے فارغ ہو کر یہ کاروان سعادت و رحمت، مراجعت فرمائے مدینہ ہوا۔ نواحِ مدینہ پر نگاہ پڑی تو فرمایا۔

اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ۔ لہ الملک و لہ الحمد وھو علٰی کل شیء قدیر۔ آئبون۔ تائبون۔ عابدون۔ ساجدون۔ لربنا حامدون

صدق اللہ وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ

کبریائی و جبروت سب خدا کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ وحدہٗ لا شریک۔ حکومت صرف اسی کے لئے ہے اور ستائش و نیائش کی مرکز اسی کی ذات۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ لوٹے آرہے ہیں اس کے بندے۔ ساری دنیا سے منہ موڑ کر صرف اُسی کے آستانہ کی طرف رُخ کئے ہوئے (تائبون)، تمام طاغوتی قوتوں کی سرکشیوں کو پامال کر کے صرف اسی کی محکومیت کا قلادہ زیب گلو کئے ہوئے (عابدون)، ساری دنیا کے سامنے غیورانہ اٹھنے والی پیشانیاں اس کے سنگ آستاں پر سجدہ ریز (ساجدون)، تمام دنیا سے خراج تحسین وصول کرنے والے اس مرجع حسن و خوبی کی حمد و ستائش میں زمزمہ بار کہ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور تمام مخالف قوتوں کو تنہا شکست دی۔ آرہے ہیں خدا کے بندے لوٹ کر۔

استقبال خسروانہ

نظام انسانیت کی امامت کبریٰ کا یہ مرکز اولین تکمیل دین و اتمام نعمت کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے بہ کمال حسن و رعنائی اور بہمہ شان و زیبائی آرہا ہے۔ اور مدینہ کی گلیوں کا ذرہ ذرہ ابھر کر کہہ رہا ہے کہ

اے سوار اشہب دوراں بیا	اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
اے زمیں از بارگاہت ارجمند	آسماں از بوسۂ بامت بلند
از تو بالا پایۂ ایں کائنات	فقر تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں ذکر و فکر و انس و جاں	تو صلوٰتِ صبح تو بانگ اذاں

سجدہ ہائے طفلک و برناؤ پیر
از جبین و چشم ہائے ما بگیر

سکان ارضی حمد و ستائش میں اس طرح نغمہ سنج و زمزمہ بار تھے۔ اور آسمان سے خدا اور اس کے فرشتے، اس تکمیل کار اور حسن مآب پر یہ کہکر تبریک و تہنیت کے پھول برسا رہے تھے کہ

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کس قدر مبارک ہے وہ آغاز جس کا انجام اس قدر حسین ہو۔ اور کیسی پُر بہار ہے وہ شاہراہ زندگی جو اس آغاز و انجام کے نقاط سے مربوط ہو۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ حَمْدًا کَثِیْرًا

دین کی تکمیل ہو گئی۔ فطرت انسانی کے غیر متبدل تقاضوں کی تسکین کے لئے جس قدر اصولی قوانین کی ضرورت تھی، وہ قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ ان اصولی قوانین کی عملی تشکیل سے اس زمین پر "آسمان کی بادشاہت" متمکن کر دی گئی۔ انسان کی نگۂ بصیرت نے اس صراطِ مستقیم کو واضح طور پر دیکھ لیا جس پر گامزن ہونے سے وہ اپنے شرف و مجد کے نقطۂ آخریں تک پہنچ سکتا ہے۔ ان ارباب قلب و نظر کی ایک جماعت تیار ہو گئی جو خود اس شاہراہ زندگی پر جادہ پیما ہوں اور دوسروں کے لئے دلیل راہ بنیں اور اس طرح وارث کتاب الٰہی بن کر اس نظام اجتماعیہ انسانیہ کو آگے چلائیں۔ رسول اپنا فریضہ ادا کر چکا تھا

وفات

ہر انسان کی طبیعی زندگی کے لئے خاتمہ یقینی ہے۔ رسول بھی ایک انسان ہوتا ہے اس لئے اس کی حیات ارضی کے لئے بھی خاتمہ کا دن ضروری ہے۔ گزشتہ اوراق میں جہاں نبی اکرمؐ کی بشریت کے متعلق بحث آئی ہے آپ نے دیکھ لیا ہے کہ آپ کے متعلق واضح الفاظ میں بتا دیا گیا کہ انک میت وانھم میتون۔ ہر پیدا ہونے والے کے لئے مرنا ہے لیکن خوش بخت ہے وہ موت جو مقصد حیات کی تکمیل کے بعد آئے۔ یہی وہ موت ہے جس پر نفس شماری کی ہزاروں زندگیاں تصدق کی جا سکتی ہیں۔ اسی موت میں حیات ابدی کا راز پوشیدہ ہے کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی ماپنے کا ایک ہی مقیاس ہے اور وہ یہ کہ جس وقت وہ دنیا میں آیا اور جس وقت اس نے دنیا کو چھوڑا ان دونوں حالتوں میں اس نے کیا تغیر پیدا کیا۔ اگر اس نے دنیا کو اسی حالت میں چھوڑا ہے جس میں پایا تھا تو یہ زندگی انسانی زندگی نہیں ہے۔ خواب و خور کی حیوانی زندگی ہے۔ اور اگر اس نے اس میں صحیح خطوط پر تغیر و تبدل کیا اور حک و اضافہ، تو اس کی عظمت اسی تغیر و تبدل اور حک و اضافہ کے بمقدار ہے۔ پس کس قدر عظیم المرتبت ہے وہ حیات بلند جس نے دنیائے انسانیت میں ایسا انقلاب پیدا کیا جس کی وسعتیں دنیا کے آخری انسان کی زندگی تک کو محیط ہیں۔ یہی انقلاب، مقصود فطرت تھا جس نے انسانی ممکنات کے لئے ایک نئی دنیا کا راستہ کھول دیا ایسے انسان کی موت محسودِ صد حیات ہے۔

تکمیل دین کا اعلان ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ میں ہوا۔ ۱۸ یا ۱۹ صفر سنہ ۱۱ھ کو نبی اکرمؐ کا مزاج ناساز ہوا۔ قریب ۱۳ روز علالت رہی۔ زمانۂ علالت میں حضورؐ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں اسی جذب و انہماک سے مصروف رہے

اور دین کے ان اساسی اصولوں کو بار بار سامنے لاتے رہے جن میں تبدیلی پیدا کر دینے سے اس کی رفیع الشان عمارت اپنی بنیادوں سے ہل جاتی ہے۔ دین کا نقطہ ماسکہ اور عروۃ الوثقی یہ اصل عظیم ہے کہ قانون سازی کا حق صرف ذات خداوندی کو ہے۔ کسی انسان۔ حتیٰ کہ خود رسول کو بھی نہیں۔ اور مکافات عمل کا قانون فطرت اٹل ہے اس لئے ہر انسان کو اپنی نگاہ کی ہر جنبش اور قلب کی ہر حرکت کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اپنے آخری خطبہ میں ان ہی بنیادی اصول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ

حلال اور حرام کی نسبت میری طرف نہ کرنا۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے۔ اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

پھر فرمایا۔

اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ اور اے پیغمبر خدا کی پھوپی صفیہ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کرو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

علالت کے تیرھویں روز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ - مئی سنہ ۶۳۲ء صبح کے وقت طبیعت میں کچھ سکون تھا لیکن نقاہت زیادہ تھی۔ اس لئے آپ نے حجرہ مبارک سے لیٹے لیٹے پردہ اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا تو لوگ نماز میں مشغول تھے۔ اللہ کے بندوں کو اپنے اللہ کے سامنے سجدہ ریز دیکھ کر فرط مسرت سے چہرہ بشاش ہو گیا۔ جھکی ہوئی نگاہوں سے درگاہ رب العزت میں شکر و امتنان کے سجدے ادا کئے۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ نقاہت سے بار بار غشی طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن جب ہوش آتا تھا تو زبان مبارک پر یہ الفاظ ہوتے تھے کہ مع الذین انعم اللہ علیھم

رفیق اعلیٰ

"ان سعادت مند روحوں کی معیت جنہیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا"۔ اور کبھی یہ کہ اللھم فی الرفیق الاعلیٰ سب سے بڑی رفاقت خدائے بزرگ و برتر کی ہے۔ سہ پہر کے قریب تین مرتبہ فرمایا۔ بل الرفیق الاعلیٰ[1] قلب کا سکون و اطمینان ایک ہلکے سے تبسم جاں نواز کی صورت میں چہرہ پر نکہت پاش و نور افشاں ہو اٹھا۔ فطرت کو یہ معصومانہ انداز ایسا خوش آیا کہ اس نے اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح اس پُر بہار زندگی کی جوئے رواں دامن صحرا سے صحن گلستاں میں داخل ہو گئی۔ اور آسمانوں کے افلاک سے ندائے جاں یہ کہتی ہوئی استقبال کے لئے آگے بڑھی کہ

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (۸۹/۲۷-۳۰)

اے وہ روح کہ جسے کامل اطمینان نصیب ہے، اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے

[1] نبی اکرمؐ کے یہ آخری الفاظ دنیا کے مذہب میں فی الحقیقت آخری لفظ (Last word) کی حیثیت رکھتے ہیں

باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۷۱

خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ ہے وہ سوال! - جس کا جواب دنیائے مذاہب کے تمام دساتیر اور جہان فلسفہ کے جملہ دفاتر ہیں۔ اگر ان افسانہ ہائے عہد کہن کو چھوڑ بھی دیا جائے جنہیں ذہن انسانی نے اپنے بچپن کے زمانہ میں وضع کیا اور جن کی یاد آج بھی مختلف معابد وصوامع میں پتھر کی مورتیوں کی شکل میں ملتی ہے تو بھی آپ دیکھیں گے کہ مختلف مذاہب میں خدا کا تصور ایک پرستش کی شے (Object of Worship) یا حاکم مستبد سے آگے نہیں بڑھتا جو کائنات سے الگ تھلگ شخصی طور پر اپنے احکام نافذ کر رہا ہے اور انسان کے لئے اس کی پرستش کرنا یا اس کے احکام ماننا ضروری ہیں۔ لیکن قرآن خدا اور انسان کے باہمی تعلق کا ایک جداگانہ اور عجیب وغریب تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا، حیات کائنات کی اصل واساس ہے۔ وہ حق مطلق (Absolute Truth) ہے۔ اور یہ تمام سلسلۂ کائنات حق پر قائم ہے۔ انسان کی فطرت خود اسی حق پر متفرع ہے اور اس کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اس مقصد کے بروئے کار لانے میں صرف کرے جس کے لئے کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ انسان اپنی قوتوں کو اس مقصد عظیم کی تکمیل میں صرف اسی صورت میں صرف کر سکتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ وہ مقصد کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اس ذات حق مطلق کی صفات اپنے اندر منعکس کرتا جائے چونکہ اس اصل واساس کائنات یعنی حق مطلق (خدا) کا بھی یہی منشاء ہے کہ کائنات اپنے مقصود حقیقی کی طرف چلتی جائے۔ اس لئے اس منشاء کی تکمیل میں انسانی جدوجہد مشیت ایزدی کی تکمیل میں ایک قسم کی اعانت ہوتی ہے۔ لہذا خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ذات خداوندی تمام حسنات وصفات کی سرچشمہ ہے اور قوتوں کی منبع اور انسان یہ صفات وقویٰ اسی سرچشمہ سے مستعار لے کر اپنے اندر جذب کرتا ہے اس لئے اس رفاقت میں ذات خداوندی کی حیثیت "رفیق اعلیٰ" کی ہوتی ہے جس قدر انسان اپنے اندر اس "رفیق اعلیٰ" کی صفات منعکس کرتا جائے گا۔ یعنی جس قدر اس چشمۂ حسن وخوبی سے ہم آہنگی ویک رنگی۔ توافق وتطابق پیدا کرتا جائے گا اسی قدر اسے اس کا "قرب" حاصل ہوتا جائے گا اور اسی قرب کی نسبت سے اس کی اپنی ذات کی تکمیل اور خودی کا استحکام ہوتا جائے گا۔ لیکن ہر قدم میں خدا کی حیثیت رفیق اعلیٰ ہی کی رہے گی کہ وہ اپنی ذات میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ یہی وہ "رفاقت اعلیٰ" کا تصور ہے جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنے آخری الفاظ میں اس حسن وخوبی سے اشارہ فرمایا ہے۔ اور جو خدا اور بندے کے تعلق کے باب میں فی الحقیقت آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے (تفصیل ان امور کی اپنی جگہ آئے گی)

راضی۔ سو میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ میری جنت میں داخل ہو جا۔

سحر ہا در گریبان شب اوست دو گیتی را فروغ از کوکب اوست

نشان مرد حق دیگر چہ گویم چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

شمع نبوت کے پروانوں کے لئے محبوب کی یہ جدائی قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی۔ ان کے دلوں کی بستیوں میں ایک حشر برپا ہو گیا۔ دردِ فراق سے سینے شق ہو رہے تھے۔ دل کا خون آنکھوں میں کھنچا آ رہا تھا۔ دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ بزمِ کائنات انہیں بے کیف نظر آتی تھی اور بہارِ زندگی افسردہ و پژمردہ۔ شدت کرب و انتہائے درد سے صبر و سکون اور ضبط و ہوش ہر ایک سے وداع ہو رہا تھا۔ لیکن کہرام و خلفشار کے اس ہوش ربا عالم میں ایک ایسا پیکر ضبط و سکون بھی تھا جسے تربیت نبوئی نے جبر میں اختیار، اور بے قراری میں قرار کا سلیقہ اور شدت جذبات میں بقائے تسکین و ہوش اور انتہائے احساسات میں قائمیٔ حواس اور "از خود رفتن" کا قرینہ سکھایا تھا۔ وہ جسے غار کی یاس انگیز تنہائیوں میں لا تحزن ان اللہ معنا کی تعلیم ایمان افروز و استقامت بخش سے نا امیدیوں کے ہجوم میں امیدوں کا روشن مستقبل دیکھنے کا انداز بتایا تھا۔ وہ پیکر ضبط و استقامت وہ یار غار نبوئی، وہ جس کے کندھوں پر جانشینیٔ رسول کا بار عظیم آنے والا تھا۔ غم و اندوہ کے اس تلاطم میں، روشنی

ایک عظیم القدر اعلان

کے بلند مینار کی طرح اٹھا اور دو جملوں میں مجمع کے سامنے اس حقیقت کبریٰ کو بے نقاب کر گیا کہ اسلام کا نظام حق و صداقت اپنی داخلی قوتوں کے زور پر آگے چلنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ شخصیتوں کا وابستۂ دامن نہیں ہے کہ کسی ایک کی وفات سے سارے نظام کا خاتمہ ہو جائے۔ آپ (حضرت ابو بکرؓ صدیق) ممبر نبوئی پر تشریف لائے (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔) مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔

أَيُّهَا النَّاسُ! من كان يَعْبُدُ مُحَمَّداً فانه قد مات ومن كان يعبد الله فانه حي لا يموت

(لوگو جو شخص محمد کو اپنا معبود سمجھتا تھا وہ جان لے کہ اس کا معبود یقیناً مر گیا۔ لیکن جو اللہ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے ہے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے۔ اسے کبھی موت نہیں۔

اور اس کی سند میں فرمایا کہ

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل ...... الخ

حضور کی تجہیز و تکفین کا کام بہت ضروری تھا۔ لیکن اس سے بھی مقدم ایک اور کام تھا۔ دین کی یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ چکی تھی کہ ملت ایک ثانیہ کے لئے بھی بے امام نہیں رہ سکتی۔ نظام کی مرکزیت ہر وقت موجود رہنی چاہیئے اس لئے انہوں نے سب سے پہلے انتخاب امام کا اہم ترین فریضہ ادا کیا۔ اس طرح اس نظام کو بلا انقطاع آگے بڑھا دیا جسے خدا نے ترتیب دیا اور اس کے رسول نے متشکل کیا تھا اور جسے اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے تھا۔ ھی حتی مطلع الفجر۔

یہ سلسلۃ الذہب کہاں تک آگے بڑھا اور پھر رکا کیوں؟ یہ حصہ اس داستان کی اگلی کڑی سے متعلق ہے جس کے لئے آپ کو کچھ وقت کے لئے زحمت کش انتظار ہونا پڑے گا۔

جہانِ نو

نوع انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا
شرارہ اس بطل جلیل کے پیکر میں آسمان سے آیا اور تمام نوع انسانی کو شعلہ
صفت بنا گیا۔ (کارلائل)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا تو اس نے دنیا کو کیسے پایا اور جب وہ یہاں سے گیا تو دنیا کو کس حالت میں چھوڑا اگر اس نے دنیا کو حق وصداقت کے لئے ناسازگار اور عدل وانصاف کے لئے نامساعد پایا تو دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے اس ناسازگاری کو سازگاری اور نامساعدت کو مساعدت میں بدلنے کے لئے کیا کچھ کیا اور اس کی اس تگ وتاز وسعی وکاوش کا نتیجہ کیا نکلا۔

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار — بامزاج او بسازد روزگار
گر نہ سازد بامزاج او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیاد موجودات را — می دہد ترکیب نو ذرات را
می کند از قوت خود آشکار — روزگار نو کہ باشد سازگار

جس حیات طیبہ کے تذکار جلیلہ و کوائف جمیلہ ہمارے لئے وجہ شادابیٔ قلب ونگاہ اور باعث افزائش ایمان وبصیرت ہوئے ہیں اس نے جب اس مسکنِ انسانی میں چشم نبوت وا کی تو اسے جس عالم میں پایا اس کا

ظہورِ نبوت کے وقت دنیا کی حالت

اجمالی تذکرہ کتاب زیر نظر کے ابتدائی عنوان (ظہر الفساد) میں آ چکا ہے۔ اس عنوان کو دہرانا تحصیل حاصل ہوگا۔ البتہ تجدید یادداشت کے لئے اس کے ایک اقتباس کے تکرار کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ جس میں عصر حاضر کے تاریخ تہذیب کے مورخ نے بتایا ہے کہ

اُس وقت دنیائے تہذیب و تمدن کی کیا حالت ہو چکی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔

اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے تھے منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور نوع انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین و مسالک اپنی قوت و احترام کو کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے پرانے طرق و انداز کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد و ضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یک جہتی کی بجائے تشتت و افتراق اور بربادی و ہلاکت کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں۔ اور آرٹ۔ سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں۔ اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جنگ و جدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یک جا کھڑے تھے۔ اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔ کیا (ان حالات میں) کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوع انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے! اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ پرانی رسومات و آئین سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور قوانین مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

یہ تھی وہ حالت جس میں اُس داعیٔ انقلاب نے دنیا کو پایا۔ جو دنیا کو ایک "طرح نو" سے آشنا کرنے کے لئے آیا تھا۔ کیا اُس نے دنیائے تہذیب و تمدن کے ان تقاضوں کو پورا کیا جس کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود اس اقتباس کے مصنف کی زبان سے سنیئے جو کہتا ہے کہ

انقلاب کے نتائج

یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

یہ حیرت انگیز کلچر اسی ذاتِ گرامی کی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل کا درخشندہ نتیجہ تھا۔ جس کی تعلیم و عمل نے دنیا کو بتا دیا کہ ایک انسان دنیا میں کیا کچھ کر سکتا تھا۔

ہم میں سے ان لوگوں کے لئے جن کے نزدیک **انسان** ہی سب کچھ ہے۔ ماحول کچھ نہیں۔ محمدؐ اس

حقیقت کی عظیم الشان مثال ہے کہ ایک انسان کیا کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ لوگ بھی جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تاریخ کے انقلابات کسی ایک فرد کی کوششوں سے کہیں زیادہ ماحول کی خصوصیات اور غلبِ انسان کی استعداد وقبولیت کے رہینِ منت ہیں اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر تاریخ میں ایسا انقلاب آنا ہی تھا جو عرب میں آیا) تو محمدؐ کے بغیر یہ انقلاب ایک غیر متعین عرصہ تک معرضِ التوا میں رہتا!

Pringle Kennedy in Arabian Society at
The time of Mohamad p. 21

یہ انقلاب کیا تھا؟

عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی ان کی طرف ایک رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چلے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی وتابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

وہ عرب یہ محمدؐ اور ایک سو سال کا عرصہ!

کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آگرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اُڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے؟

نوعِ انسانی خشک نیستان کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا۔ اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

Thomas Carlyle in Heroes and Hero
Worship p. 66

اس نے کیا کیا؟

محمدؐ کے اثر سے عربوں کی قبائلی عصبیت کا خاتمہ ہوگیا اور وہ ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہوگئے جس سے وہ اس سے پیشتر ناآشنا تھے۔ یہ رشتہ توحید کا عقیدہ تھا جو انہیں ایک مرکز پر لے آیا اور ان کی فتوحات کو ان کے لئے ممکن بنا دیا۔

The Eclipse Of christianity in Islam

By L.E. Browne p.p. 24-28

تاریخ عرب کے مصنف (Hitti) کے الفاظ میں

یہ عرب کی تاریخ میں پہلی کوشش تھی کہ انہیں خون کے بجائے مذہب کے نام ایک مرکز پر جمع کیا جا رہا تھا۔ اللہ اس سلطنت کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس کا رسول اپنی زندگی بھر اس کا نائب اور ملک کا فرمانروا۔ بنا بریں محمدؐ اپنے روحانی فرائض کے علاوہ ایسے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے جیسے سلطنتوں کے حکام۔ اس کی ملت میں سب کے سب، قبائلی رشتوں اور پرانے علاقات سے یکسر منقطع ہو کر اصولاً بھائی بھائی بن چکے تھے۔

Hitti; History of The Arabs p. 120

اور (Rev. Stephenson) کے الفاظ میں

سب سے پہلے اس حقیقت کا بلا تکلف اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اپنی قوم کے لئے محمدؐ کی ذات بڑے احسانات کی موجب تھی وہ اس ملک میں پیدا ہوئے جہاں سیاسی تنظیم۔ معقول عقائد اور پاکیزہ اخلاق سے کوئی شناسا نہ تھا۔ انہوں نے یہ تینوں چیزیں پیدا کر دیں۔ انہوں نے اپنی پختہ نظانت سے بیک وقت سیاسی حالت۔ مذہبی عقائد اور ضابطۂ اخلاق سب کی اصلاح کر دی۔ انہوں نے مختلف قبائل کی جگہ انہیں ایک قوم بنا دیا مختلف دیوتاؤں اور آقاؤں کی جگہ ایک خدا پر ایمان کی تعلیم دی۔ اور بڑی بڑی معیوب اور قبیح رسومات کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا۔ جوں جوں اسلام اپنے قدم عرب کی سرزمین سے باہر رکھتا گیا کئی وحشی قومیں، جنہیں اس نے اپنے آغوش میں لیا نمائے اسلام کی وارث بنتی چلی گئیں...... اسلام (نوع انسانی کے لئے) برکات کا موجب تاریکی سے نور اور شیطان سے خدا کی طرف رجوت کا باعث ہے۔

نیز باسورتھ سمتھ کے الفاظ میں

ایک ایسی خوش بختی کی بنا پر جو تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ محمد تین عناصر کا بانی ہے۔ ایک قوم ایک سلطنت اور ایک مذہب۔ تینوں کا بانی خود ان پڑھ تھا۔ لیکن اس نے دنیا کو ایک ایسی کتاب دی جو شعر بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور آئین وقانون بھی۔ محمد کا یہی معجزہ ہے۔ مستقل معجزہ۔ فی الحقیقت معجزہ۔

Rev. Bosworth Smith

ہر قسم کی توہم پرستی کا استیصال۔

ہمیں بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ تعلیم نبوی نے ان تاریک توہمات کو ہمیشہ کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکال دیا جو صدیوں سے اُس ملک پر چھا رہے تھے۔ بت پرستی خارج البلد ہو گئی توحید اور خدا کی لامحدود رحمت کا تصور، محمد کے متبعین کے دلوں کی گہرائیوں اور زندگی کے اعماق میں جاگزین ہو گیا۔۔۔۔ معاشرتی اصلاحات کی بھی کوئی کمی نہ رہی۔ ایمان کے دائرہ میں برادرانہ محبت، یتیموں کی پرورش۔ غلاموں سے احسان۔ حرمتِ خمر۔ سب جو ہر نمودار ہو گئے۔ امتناعِ شراب میں جو کامیابی اسلام نے حاصل کی کسی اور مذہب کو نصیب نہیں ہوئی۔

Sir william muir — Life of Mohamad

ہر عقیدہ باطل کی اصلاح۔

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ محمدؐ کے مذہب نے ہر اس عقیدہ کی اصلاح کر دی جو اس سے قبل وہاں رائج تھا۔ اس نے متفارق ومتخالف قبائل کو باہم ملا دیا۔ اور اسی طرح اس قوم کو دنیا کی بڑی بڑی قوتوں سے بھی آگے کھڑا کر دیا۔

Dr. Marcus Dods — in Mohd, Budha
& christ

محض "مذہبی ریفارمر" ہی نہیں۔ ایک عدیم النظیر طرزِ حکومت کے بھی طرح انداز

محمد ایک مذہب کے بانی نہ تھے ایک سلطنت کے بھی تھے۔ لیکن ایک ایسی سلطنت کے جو شروع ہی سے دینی سلطنت تھی۔ یعنی جس میں دنیا اور آخرت دونوں کا امتزاج تھا۔ اسلام کے پیش نظر یہ تھا کہ تمام انسانوں کے امتیازات مٹا کر انہیں ایک جماعت بنا دیا جائے جس کا مسلک قانون خداوندی اور اس کے

رسول کی اطاعت ہو۔ اور اس طرح حق کو ساری دنیا پر پھیلا دیا جائے۔ محمدؐ دنیا میں "خدا کی مرضی" کی تنفیذ و اشاعت کے لئے سب سے بڑے ایگزیکٹو آفیسر تھے انہوں نے اپنے پیشرو انبیاء کی طرح محسوس کر لیا تھا کہ تمام نوع انسانی ایک دن ایک ملت واحدہ بنکر رہے گی۔ ایک خدا کے ماتحت ایک حکومت للّٰہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

Spalding — Civilisation in East & West
P. 164

اور Georges Rivorie کے الفاظ ہیں۔

اسلام، اس دنیا کے لئے پیغام نجات وسعادت تھا جو جسمانی اور ذہنی مصائب میں مبتلا تھی اور دوسروں کی غلامی نے جسے چکنا چور کر رکھا تھا۔ اس نے عدل و انصاف کے عصر جدید کا اعلان کیا۔ جس عالمگیر حکومت کی طرح اسلام نے رکھی اس میں نہ نسلی امتیاز کو کوئی دخل تھا نہ معاشرتی حدود کو۔ اس کا ایک ہی قانون تھا۔ سب کے لئے یکساں عدل اور محبت۔

اس حقیقت کبریٰ کو جتنی مرتبہ دہرایئے کم ہے کہ محمدؐ نہ صرف ایک ایسے عظیم القدر مذہب کا پیغمبر تھا جس نے اس دنیا کی روحانی تسکین کا سامان فراہم کر دیا جو خالص توحید کے لئے پیاسی تھی، بلکہ وہ ایک ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کا مسلن تھا جس کی نظیر تاریخ نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

(Visages De L'Islam)

ایک ایسی حکومت جس میں جبر سے اختیار پیدا ہو اور جس کی مثال دنیا نے نہ دیکھی ہو۔

انسان کے تمام فرائض حیات کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اور وہ لفظ ہے اسلام۔ یعنی اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیت ایزدی کے تابع رکھنا۔ یہ تسلیم و رضا اس اطاعت و انقیاد سے یکسر مختلف ہے جو مادی ریاست میں حکومت کی طرف سے مطلوب ہوتی ہے۔ کسی مسولینی کے سامنے جھکنے اور خدا کے سامنے جھکنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جو خدا کے سامنے جھک کر مسلم بن جاتا ہے اس کے ذمہ اس دنیا اور اگلی دنیا دونوں کے فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ یعنی اخلاقی بھی اور روحانی بھی۔ خدا کی مرضی کا معلوم کرنا اور اس کی تعمیل کرانا۔ اس طرح مسلم بیک وقت ایک راہب اور ایک سپاہی بن جاتا ہے۔ نمازی بھی بنتا ہے اور میدان جنگ میں جانے کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے لیکن صرف اسی

جنگ کے لئے جو دنیا سے شر کے استیصال کے لئے کی جاتی ہے۔

(Spalding P. 16)

اور (Raymond Lerouge) کے الفاظ میں

نبی عربی اس معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کے بانی ہیں جس کا سُراغ اس سے قبل تاریخ میں نہیں ملتا۔ انہوں نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جسے تمام کرۂ ارض پر پھیلنا تھا اور جس میں سوائے عدل اور احسان کے اور کسی قانون کو رائج نہیں ہونا تھا۔ ان کی تعلیم تمام انسانوں کی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت تھی۔

(Vie De Mahomet PP 18-19)

انسانی مساوات کی ایسی دنیا جس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

محمد کے مذہب نے اس حقیقی اور اولین جمہوریت کا اعلان کیا جو کسی انسان کے ذہن میں نہ آسکی تھی۔ اس کا خدا اتنی بلند و بالا کبریائی کا مالک تھا کہ اس کی نگاہ میں دنیا کے تمام امتیازات ہیچ اور رنگ و نسل کی تمام گہری خلیجیں ناپید تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کی مانند معاشرتی طبقات مسلمانوں میں بھی موجود ہیں لیکن بنیادی (یعنی روحانی) طور پر تمام مسلمان برابر ہیں۔ اور یہ بنیادی مساوات عیسائیوں کی مساوات کی طرح محض افسانہ نہیں۔ بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔ یہ صرف مسلمانوں کی ہی خصوصیت ہے کہ وہ اسود و احمر کے ظاہری امتیاز کے باوجود، ہر جگہ بطور ایک بھائی کے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس جذبہ اخوت کی بنیاد رنگ و نسل نہیں بلکہ اس کا عقیدہ ہوتی ہے۔

Dr. Mawde Royden in the Problem Of Palestine P. 37

دنیائے مذہب میں ایک نئے باب کا اضافہ

اسلام مذہبی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ معتقدات و رسومات کا مجموعہ نہیں۔ یہ تو ایک روحانی توانائی ہے۔ ایک تخم صالحہ اور زندہ۔ یہ اپنی زندگی میں بالیدگی پیدا کرتا ہے اور دوسری روحانی زندگیوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے آئینی ضابطہ کی رو سے کرتا ہے جس کا صحیح

مفہوم اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب اسے وسیع پیمانہ پر عمل میں لایا جائے۔

Tor Andrae Mohd- The Man and His Faith P. 11

کھلا کھلا دین۔ آیات بینات۔ واضح تعلیم۔

اسلام کوئی ناممکن الحصول نصب العین متعین نہیں کرتا۔ کوئی الٰہیاتی پیچیدگیاں نہیں۔ کوئی باطنی رموز و اسرار نہیں۔ کوئی برہمنیت کی وراثت نہیں۔ (Hitti P. 129)

ایک مکمل تہذیب۔

اسلام ایک ضابطہ الٰہیات سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک مکمل تہذیب ہے۔

Gibb – Whither Islam P. 12

ابدی حقائق کی بنیادوں پر قائم۔

محمد کا مذہب شک و ابہام سے بالکل مبرّی ہے اور قرآن، خدا کی توحید کی درخشندہ شہادت۔ نبی عربی نے بتوں۔ انسانوں اور اجرام سماوی کی پرستش کو اس بصیرت افروز دلیل کی بنا پر رد کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے۔ جس کی بنیاد میں فساد ہے اس کا مآل ہلاکت اور تباہی ہے۔ آپ کے دینی جوش اور ولولہ نے جو یکسر مبنی علی البصیرت تھا۔ خالق کائنات کی صورت میں اس لا انتہا ذات سرمدی کا اقرار کر کے اسے مرکز حمد و ستائش قرار دیدیا۔ جو صورت اور مکان کی جہت سے بلند اور اولاد اور تمثیل کی نسبتوں سے بالا تھی۔ وہ ذات جو ہمارے پوشیدہ خیالات تک میں موجود اور خود اپنی ذات سے قائم ہے اور جس کے سرچشمہ سے عقل و اخلاق کے جوہروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ مسلک توحید اس قدر بلند ہے کہ ہماری موجودہ استعداد کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ وجہ حیرت ہے وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں بلکہ یہ کہ اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ وہی سادہ لیکن مکمل نقش جو محمد عربی نے مکہ اور مدینہ میں انسانی قلوب پر مسکوک کیا ان بارہ صدیوں کے انقلابات کے باوجود ہندوستان سے

افریقہ تک قرآن کے متبعین کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مقصود کو عام انسانی حواس وتخیل کی سطح پر اُترنے نہیں دیا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسلام کا نہایت سادہ اور غیر متبدل عقیدہ ہے۔ ان کا خدائی تصور کبھی کبھی مرئی ہستیوں کا شرمندہ نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ کا درجہ کبھی بشریت کی حد سے تجاوز نہیں کر سکا۔ اس کی زندہ تعلیمات نے اس کے متبعین کے جذبات عقیدت کو دین ودانش کے حدود سے باہر نہیں جانے دیا۔ یہ ہے اسلام کی سادہ اور ابدی تعلیم۔

Gibbon - Decline & Fall Of Roman Empire P.P 287 & 352

وہ ضابطہ حیات جس نے انسانیت کو ایک نئی فکر سے روشناس کرایا۔

دنیا کی مقدس کتابوں میں قرآن ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ اپنی نوع کے لٹریچر میں سب سے کمسن واقع ہوا ہے لیکن اس اثر کے اعتبار سے جو اس نے نوع انسانی کے دلوں پر کیا ہے کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا۔ اس نے انسانیت کو ایک نئے فکر سے روشناس کرایا ہے اور اسے ایک جدید انداز کی سیرت عطا کی ہے۔ اس نے جو محیر العقول اصلاحات کیں اور تعجب انگیز کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ محض عہد کہن کی داستانیں نہ تھیں وہ آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔

(MARGOLIOUTH)

زندگی کے ہر شعبہ میں خضر راہ۔

اسلام میں، قرآن، وسیع ترین مفہوم میں، ضابطہ حیات تھا جو ایک فرد کی زندگی کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں کو محیط تھا اور اس کی ہر شعبہ میں ہدایت کرتا تھا۔ آج تک مسلمانوں کی ہر جماعت کے لئے قرآن ایک ناقابل تغیر اصول زندگی ہے۔ یہ الٰہیات، شعائر ومناسک، دیوانی اور فوجداری قوانین اور اخلاقی ضوابط سب کا مجموعہ ہے۔

Religion in Science and Civilisation By Sir Richard Gregory P. 80

ایک وقتی اور ہنگامی انقلاب نہیں کہ جو بگولے کی طرح اٹھے اور حباب کی طرح بیٹھ جائے۔ بلکہ ایک ایسا انقلاب

مستقل انقلاب

جس نے حیات کائنات کو متاثر کر دیا جس نے انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں جگہ پکڑی جس نے دنیا کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا۔ وہ انقلاب جس نے جہالت کی تاریکیوں کو علم کی روشنی سے بدل دیا۔ جس نے "مذہب" جیسی خالصتہً جذباتی چیز کی بنیاد بصیرت پر رکھ دی اور عقل و دانش کی بے کیف و بے رنگ دنیا کو عشق کی مستیوں اور رنگینیوں سے معمور کر دیا۔ جس نے ایاز کو آئین غزنوی اور غزنوی کو آداب ایازی سکھا دیئے۔ وہ بانگ درا جس نے انسانیت کے راہ گم کردہ قافلہ کو صحیح راستہ پر لگا دیا۔ جس نے علم وعقل سے راستہ کے چراغ روشن اور ایمان وایقان سے منزل کے نشان متعین کئے۔ غرضیکہ وہ انقلاب جس نے دنیا کو وہ سب کچھ دیا جس پر آج دنیا اس طرح فخر کر رہی ہے۔ اگر تاریخ انسانیت میں یہ انقلاب نہ آتا تو دنیا آج مٹی کے گھروندے سے زیادہ کچھ نہ ہوتی اور انسان ابھی تک اپنے ارتقار کی ابتدائی منازل میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔ سنئے کہ خود یورپ کے ارباب علم وہنر اس حقیقت کا اعتراف کیسے واضح الفاظ میں کرتے ہیں۔

> اس (عہد ظلمت کے بعد) ازمنہ متوسطہ میں جو جو ترقیاں ہوئیں وہ عربوں کے اثر کا نتیجہ تھیں۔ عیسائیت اور اسلام، صلیبی جنگوں کے سلسلہ میں ایک دوسرے کے قریب آئے۔ جس طرح بلعم بنی اسرائیل پر لعنت بھیجنے کے لئے آیا لیکن ان کے لئے برکت کا موجب بن گیا، اسی طرح مسیحی دنیا مسلمانوں کے خلاف صلیبی لڑائیاں لڑنے کے لئے آئی لیکن مسلمانوں کے قدموں میں بیٹھ گئی تاکہ ان سے تحصیل علم کرے۔ صلیب کے نیم وحشی سپاہیوں نے دیکھا کہ یہ "کفار" (یعنی مسلمان) اگرچہ مذہبی طور پر (ان کے نزدیک) قابل ہلاکت ہیں لیکن وہ ایک ایسی تہذیب کے مالک ہیں جو ان کی اپنی تہذیب سے بدرجہا فائق ہے۔ مسلم ثقافت کا یہی اثر تھا جس نے ازمنہ متوسطہ کی تاریکیوں کا خاتمہ کر کے عہد حاضر کی روشنی کا آفتاب طلوع کیا۔
>
> The Science of History By F. J. C Hearushaw
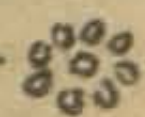
اسی انقلاب سے یورپ کی زندگی کی ابتدا ہوئی۔

مسلمانوں نے صرف ملکوں کو فتح نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی مفتوحہ زمینوں میں اسلام کی تخم ریزی کی۔ اس تخم سے مساجد کا وجود منصۂ شہود پر آیا۔ ہر مسجد کا اپنا مکتب تھا۔ علم کے متلاشی سیاسی مدبرین سے بھی زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک قافلۂ تجارت جہاں ریشم اور سوتی کپڑے

لاد کر لاتا تھا اس کے ساتھ ہی اس کے اونٹوں پر ہندوستان اور بازنطین کی کتابوں کے مسودے۔ اُدر
اقصائے عالم سے معدنیات اور نباتیات کے نمونے بھی لدے ہوتے تھے .... کتب خانے اور رسدگاہیں
زندگی کا جزو بن چکی تھیں .... یہ انسانی ذوق کا ایک نیا کھیل تھا جسے نہایت جوش وانہماک سے کھیلا
گیا ... اس کھیل کو یونانیوں نے بھی اس حسن وخوبی سے نہیں کھیلا .... ان ہی عربوں کے ہاتھوں
یورپ نے زندگی کی ابتدا پائی اور ان ہی سے اس نے فلکیات۔ نباتیات۔ کیمیا۔ قانون۔ ریاضی
طب اور فلسفہ کا پہلا سبق لیا۔

Dorsey; Civilisation P.P. 644-45

اسی سے ساری دنیا حیات نو سے روشناس ہوئی۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی۔ بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے
متاثر ہوا۔ یورپ کی خلقت جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے۔ ادھر روما کی تہذیب، گرتے گرتے
بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور ادھر دنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ)، تہذیب و ذہنی تحریکات
کے مرکز بن رہے تھے۔ ان ہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے
باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیات نو سے شناسا ہوئی
...... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت
کو حاصل نہ کرسکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ مغربی کلچر میں
کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ
اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصر حاضر کی حقیقی قوت کا باعث
اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء۔ سائنس کی روح! ہماری سائنس صرف اسی حد تک
عربوں کی رہین منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب وغریب نظریات وانکشافات سے روشناس کردیا۔
نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا، درحقیقت زمانہ
قبل از سائنس (Pre-scientific) تھا۔ پندرھویں صدی تک یورپ ان ہی علوم
وفنون کو اپناتا رہا جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کرسکا ...... جب اندلس
میں تہذیب وثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ "جن" نمودار ہوا جسے اندلس
کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی (صرف) سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات

اس کی حرارت کا موجب بنے۔

Briffault — Making of Humanity.

اور یہ سب قرآن کی بدولت تھا۔

تحقیق جدید نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ یورپ کے علماء، نشأۃ ثانیہ سے پہلے، یونانی فلسفہ۔ ریاضی فلکیات اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے ان کا منبع لاطینی کتابیں تھیں۔ اور ان کا سرچشمہ عربی علوم تھے۔ اور جس قوت نے عربوں کے دل میں ان علوم کا شوق پیدا کیا وہ قرآن تھا۔ (نہ صرف فنی علوم ہی بلکہ) لسانیات۔ شاعری اور ادب کی دوسری شاخیں بھی قرآن کی اشاعت کے ساتھ ہی نمودار ہوئیں اور اس طرح جس ادبی تحریک کی ابتدا ہوئی اس سے علم و ہنر اور ذہانت و فطانت کے شاندار ثمرات ظہور میں آئے۔

Margoliouth

پھر جس طرح اس انقلاب عظیم نے دنیا کو وہ سب کچھ دیا جس پر دنیا آج فخر کر رہی ہے اسی طرح یہ دنیا کو وہ سب کچھ بھی دے سکتا ہے جس کی تلاش میں دنیا آج اس طرح مضطرب و پریشان ماری ماری پھر رہی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف برنارڈشاہ کی زبان سے سنئے۔ وہ کہتا ہے۔

میں نے محمدؐ کے مذہب کو اس کی توانائی کی بناء پر ہمیشہ بنگاہِ احترام دیکھا ہے۔ میرے نزدیک دنیا میں تنہا یہی مذہب ہے جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پیغام ہر زمانہ کے لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے۔ میں نے اس حیرت انگیز شخصیت کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مسیح کا نقیض ہونے کے بجائے بجا طور پر نوع انسانی کا نجات دہندہ کہلا سکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر آج اس جیسا کوئی انسان دنیا کی آمریت سنبھال لے تو وہ اس کے مسائل کا اس خوبی سے حل پیدا کر سکتا ہے کہ یہ دنیا پھر سے اس امن و مسرت کی زندگی کو پالے جس کی آج اشد ضرورت ہے۔ میں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ جس طرح آج کا یورپ اس مذہب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے اسی طرح کل کا یورپ بھی اس مذہب کو قبول کرے گا۔

پوچھئے تاریخ کی رصدگاہوں سے کہ دنیا میں اس قسم کی کامیاب زندگی کسی اور کے حصہ میں بھی آئی ہے؟ اور یہ تمام کامیابی، نہایت سادگی اور متانت کے ساتھ۔

آج جبکہ خود ہمارے عہد کے انسانوں نے ان تمام تفاصیل کو بے نقاب کر دیا ہے جو اس انقلاب آفریں شخصیت کی زندگی سے متعلق ہیں۔ اس کی ابتدائی اور آخری، ہر دو ادوارِ حیات سے متعلق۔ اس حقیقت کا کماحقہٗ سمجھنا پھر بھی آسان نہیں ہوا کہ اس عظیم القدر ہستی کا کردار کس قدر بلند اور اس کی محیر العقول کامیابی کا راز کیا تھا۔ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسے خدائی قوتیں حاصل ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک عام انسان اور خدا کے پیغامبر سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی۔ بایں ہمہ، اس نے اپنی قوم کے ممتاز ترین افراد کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور ان پر اپنے کردار کا ایسا گہرا اثر ڈالا کہ نہ اس زمانہ میں جبکہ اسے چاروں طرف سے مصائب و افلاس نے گھیر رکھا تھا اور نہ اس وقت جب وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا، اسے اپنی جماعت کے کسی ایک فرد کے خلاف غداری کی شکایت نہیں ہوئی۔ اسے اپنی ذات پر اعتماد اور نصرتِ خداوندی پر یقین محکم، شکست اور مایوسی کی حالت میں اس سے بھی کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ جب وہ فتح و ظفر کے عالم میں دشمنوں سے اپنی شرائط منواتا تھا۔ (اس نے اسی طرح زندگی بسر کی اور اس کے بعد) اپنے دورِ اول کے متبعین، عقیدتمندان اور احباب کے حلقہ میں (نہایت سکون سے) آنکھیں بند کر لیں۔ نہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ زیرِ نقاب رہا نہ اس کی موت کسی رازداری کی موت ہوئی۔

(M.H. Hyndman; The Awakening Of Asia P. 9)

یہی وہ حقائق ہیں جن کے پیشِ نظر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو گیا کہ

تمام پیغمبروں اور مذہبی شخصیتوں میں محمدؐ سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر وہ اور کونسی شخصیت ہو سکتی ہے جسے مقامِ محمودیت پر جلوہ فرما ہونے کا حق .... پہنچ سکتا ہے۔ اس میں کسی جذباتی عقیدت کو دخل نہیں بلکہ

مقامِ محمودیت

یہ ایک واقعہ نفس الامری کا اظہار ہے کہ دنیائے انسانیت میں آج جو کچھ قابلِ حمد و ستائش اور درخورِ تحسین و تبریک نظر آتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک نسبت رکھتا ہے ذاتِ محمدؐ رسول اللہ سے اور جو انسان چاہتا ہے کہ وہ درخورِ حمد و ستائش ہو جائے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس

عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا (17/79)، وہ مقام جو حمد و ستائش کے ہر عنوان کا مرجع ہو۔

کوشش میں ہے کہ اس راستہ پر چل نکلے جو سیرت محمدیہ نے دنیا میں متعین کر کے دکھایا۔

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نور مصطفےٰ او را بہا است — یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

دنیا کس طرف جا رہی ہے؟

آج محفل کائنات میں کوئی شمع جلوہ فگن نہیں جو اس سراج منیر سے کسب ضیا نہ کر رہی ہو۔ اس تیرہ سو برس کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ دنیا آہستہ آہستہ اسی نظام کی طرف آ رہی ہے یا نہیں جو محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے اس دنیا میں متشکل کر کے دکھایا تھا۔ دیکھئے کہ اس عرصہ میں جس قدر انقلابات دنیا میں آئے اور جنہیں دنیا نے نوع انسانی کے لئے موجب خیر و برکت قرار دیا۔ ان کا سرچشمہ کہاں تھا؟ دنیا نے ملوکیت کو لعنت قرار دیا اور نوع انسانی کی حریت اور آزادی کو مطابق فطرت سمجھا۔ لیکن غور کیجئے کہ دنیا میں سب سے پہلے ملوکیت کو نظام انسانیت کے لئے فساد عظیم کس نے قرار دیا! اور کس نے انسانیت کو صحیح حریت فکر و عمل کا پیغام دیا۔؟

دنیا نے دینی پیشوائی (PriestHood) کو انسانی استبداد کا مقدس نقاب بتایا۔ لیکن دیکھئے کہ سب سے پہلے کس نے اس نقاب کی دھجیاں فضائے عالم میں بکھیریں؟ اور کس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہیں ہو سکتی۔

دنیا نے غلامی کو جسد انسانیت کے لئے جذام قرار دیا۔ لیکن سوچئے کہ سب سے پہلے کس نے غلامی کو جرم عظیم قرار دیا اور ان تمام راہوں کو بند کر دیا جن سے یہ جراثیم داخل ہوا کرتے تھے؟ آج دنیا ذات پات کی تمیز کو انسانیت کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں محسوس کر رہی ہے اور ہندوستان میں ویدوں اور شاستروں کی تعلیم کے علی الرغم اس کے استیصال کی کوششیں جاری ہیں۔ لیکن غور کیجئے کہ دنیا میں سب سے پہلے کس نے یہ اعلان کیا کہ تمام نوع انسانی کی تخلیق نفس واحدہ سے ہوئی ہے اور پیدائش کے اعتبار سے کسی کو کسی دوسرے پر کوئی فوقیت یا افضلیت نہیں۔ عزت و تکریم کا معیار، انسانی سیرت کی بلندی ہے نسلی تفوق نہیں۔

آج دنیا انسانوں کی جغرافیائی اور نسلی یا لسانی تقسیم (وطنیت۔ نیشنلزم) میں جہنم کی آگ محسوس کر رہی ہے لیکن دیکھئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے حبش کے غلام اور قریش مکہ کے نجیب الطرفین سردار کو ایک قوم کے افراد بنا کر عملاً ان غیر فطری حدود و قیود کو مٹایا!

آج دنیا نوع انسانی کی امن و سلامتی کا خواب تمام انسانوں کے لئے ایک نظام کی شکل میں دیکھ رہی ہے لیکن سوچئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے آواز دی کہ۔ تمام نوع انسانی ایک امت واحدہ ہے اس لئے اسے ایک ہی نظام کے رشتہ میں منسلک ہونا چاہئے۔

آج دنیا سرمایہ داری کے نظامِ معیشت کو موجودہ عالمگیر مصائب و نوائب کا بنیادی سبب قرار دے رہی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ تاریخ انسانیت میں سب سے پہلے اس مردود نظام کے خلاف کس نے صدائے احتجاج بلند کی وہ کون تھا جس نے احتکار و اکتناز کو بہت بڑا جرم قرار دیا۔ زمین پر انفرادی ملکیت کو ناجائز ٹھیرایا۔ دولت کو امراء کے طبقہ میں گردش کرتے رہنے سے روکا اور انسان کی جائز ضروریات کے بعد جو کچھ باقی بچے اسے نظام اجتماعیہ کی امانت قرار دیا۔ اور اس نظام کو ان تمام انسانوں کی معاش کا ذمہ دار ٹھیرایا جو اس کے حیطۂ اثر میں ہوں۔

آج دنیا میں قیام امن کا واحد ذریعہ یہی سوچا جا رہا ہے کہ کوئی ایسی جماعت موجود ہونی چاہیئے جو اقوام عالم کے متنازعہ فیہ معاملات میں حکم کا کام دے اور جس کے فیصلوں سے سرتابی کی مجال کسی کو نہ ہو۔ لیکن تاریخ انسانی سے پوچھئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے یہ تخیل دنیا کو دیا اور ایک "اُمّت وسطیٰ" کو نوع انسانی کیلئے امن و مسرت کا ضامن ٹھیرایا۔

آج استقرائی علم کو نوع انسانی کے لئے احسان عظیم تصور کیا جاتا ہے کہ سائنس کے یہ تمام انکشافات و اختراعات اور علوم انسان کے دیگر شعبوں میں سب فروغ و ارتفاع اسی کا رہین کرم ہے لیکن پوچھئے ارباب علم و فن سے کہ ذہن انسانی کو سب سے پہلے استقرائی علم سے کس نے روشناس کرایا۔ اور کس نے اسے عملاً رائج کیا؟

عائلی زندگی میں آج طبقۂ نسوان کے حقوق و واجبات پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے لیکن سوچئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے ان کے اخلاق و واجبات کی طرف دنیا کو متوجہ کیا اور انہیں صنف زندگی میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا لیکن اس کے ساتھ ہی ان ہر دو اصناف کے فطری وظائف حیات کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

آپ ان سوالات کو ایک ایک کر کے سامنے لاتے جائیے اور پھر عقیدتمندانہ نگاہ سے نہیں بلکہ خالصتہً غیر جانبدارانہ انداز سے خالی الذہن ہو کر تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جس قدر بھی انقلابات آئے ہیں جن کے نتائج تعمیر انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں کیا ان کا سرچشمہ وہی تعلیم نہیں جو محمدؐ رسول اللہ نے تیرہ سو سال پہلے دنیا کو دی تھی اور جو آج تک دنیا میں محفوظ چلی آ رہی ہے! یہ ایک خالص علمی سوال ہے۔ علمی انداز سے اس کا جواب مرتب کیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں آپ جب اس نگاہ سے رسالت محمدیہ کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ یہ رسالت نوع انسانی کی تاریخ میں ایک حد فاصل ہے جو اپنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ میں نمایاں امتیاز قائم کرنے کے لئے کھڑی ہے۔ اس رسالت سے نوع انسانی کو ایک نیا پیغام ملا جس نے شرف انسانیت کی تمام راہوں کو ایک ایک کر کے کھول دیا۔ یہ وہ پیغام ہے جو ضمیر انسانی کی انتہائی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اور اس کی فطرت سعیدہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی لئے یہ کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔

حدِ فاصل

صد جہان تازہ در آیات اوست　　　عصرہا پیچیدہ در آنات اوست

بندۂ مومن ز آیات خداست　　　ہر جہاں اندر بر او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش　　　می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دنیا کو نہ کسی نئے آئین کی ضرورت ہے نہ کسی دوسرے آئین لانے والے (رسول) کی۔ نوع انسانی کی تمام مشکلات کا حل اسی آئین کے اتباع میں ہے کہ سفرِ زندگی میں یہ آئین اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھی اور محکم راہ ہے ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

اور گوئٹے کے الفاظ میں

اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے تمدن کے باوجود اس کی حدود سے آگے نہیں جا سکتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

(Goethe to Eckermann)

ختم نبوت

اس نقطۂ خیال سے دیکھئے تو پیغمبر اسلام، دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان (بطور حد فاصل) کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے تو آپ کی ذات گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لئے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہد طفولیت کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کریم غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے۔

پھر عقیدۂ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات (Mystic Experiences) کے متعلق ایک آزاد اور ناقدانہ طرز عمل قائم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار (Supernatural authority) کی بناء پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوے اقتدار کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اب کسی کے باطنی مشاہدات کیسے ہی غیر معمولی کیوں نہ ہوں ان پر اسی طرح تنقیدی نگاہ ڈالی جا سکتی ہے جس طرح انسانی مشاہدات کے دوسرے پہلوؤں پر۔

(علامہ اقبالؒ　　خطبات تشکیل جدید صفحہ ۱۲۰)

ختم نبوت

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)

بچہ جب پہلے پہل چلنا سیکھتا ہے تو اسے اٹھنے کے لئے بھی کسی آسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سہارا لیکر اُٹھتا ہے اور ابھی دو چار قدم بھی چلنے نہیں پاتا کہ لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ گرتا ہے تو اِدھر اُدھر حسرت بھری نگاہوں سے مدد کی تلاش کرتا ہے۔ مایوس ہو جاتا ہے تو رو کر کسی اٹھانے والے کو پکارتا ہے (کہ اُس وقت اس کے پاس پکار کا یہی ایک ذریعہ ہوتا ہے) کوئی انگلی پکڑ کر اٹھانے والا مل جائے تو پھر چار قدم چل لیتا ہے۔ ذرا اور بڑا ہو جائے تو گنڈ یلنے کے سہارے چلتا ہے۔ وہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر مشکل ہو جاتی ہے۔ اور بڑا ہو جائے تو اپنے پاؤں پر کھڑا ضرور ہو جاتا ہے لیکن چلتا پھرتا ان ہی مقامات میں ہے جن سے وہ مانوس ہوتا ہے۔

عالم طفولیت

غیر مانوس مقامات کی طرف جانے سے گھبراتا ہے۔ جانا ہی پڑے تو کسی کا ساتھ ڈھونڈتا ہے۔ پھر اگر راستہ میں چھوٹی سی نالی بھی آجائے تو اسے دریا نظر آتی ہے۔ صحن کے نشیب سے برآمدے کا فراز، ایک پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ اور بڑا ہو جائے تو دن کی روشنی میں ہر طرف جا نکلتا ہے لیکن اندھیرے میں ہر طرف اسے چھلاوے نظر آتے ہیں۔ اس وقت پھر کسی رفیق سفر کی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اسی طرح اٹھتے بیٹھتے، گرتے پڑتے، گھبراتے سنبھلتے، پوری جوانی کو پہنچ جاتا ہے تو پھر اسے انگلی پکڑنے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مانوس و غیر مانوس مقامات کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ روشنی اور اندھیرے کا فرق بھی باقی نہیں رہتا۔ اب وہ ہر جگہ بلا خوف و خطر چلا جاتا ہے۔ اگر کہیں ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑے تو خود بخود اٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح یہ بتانا چاہتا ہے کہ اسے کسی خارجی مدد کی احتیاج نہیں۔ وہ اس مدد کو اپنی شان جوانمردی کے خلاف سمجھ کر اس میں خفت محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے پاؤں آپ چلنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی حفاظت خود کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ وہ اپنی منزلیں آپ قطع کرنے میں لذت

جوانی کا زمانہ

محسوس کرتا ہے۔ البتہ اس مقام پر اسے ایک چیز کی ضرورت باقی رہتی ہے جس کے بغیر نہ تو وہ راستہ کی پر خطر گھاٹیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ہی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ چیز جس کی ضرورت لاینفک اور جس کی احتیاج یقینی ہے اور اس احتیاج میں وہ کوئی شرم وندامت اور سبکی وخفت بھی محسوس نہیں کرتا۔ فقط یہ ہے کہ شاہراہ زندگی میں جہاں جہاں دوراہے آئیں وہاں نشانِ راہ (sign posts) نصب ہوں جن پر واضح اور بین الفاظ میں لکھا ہو کہ یہ راستہ کدھر جاتا ہے اور دوسرا راستہ کس طرف؟ اب اگر راہ رو کی آنکھوں میں بصارت ہے اور فضا میں روشنی کہ جس کی مدد سے یہ نشانات راہ پڑھے جا سکیں تو پھر راستہ قطع کرنے پر منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے لاخوف علیھم ولاھم یحزنون

افراد کی طرح نوع انسان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ جب ذہن انسانی عالم طفولیت میں تھا تو اسے چھوٹے چھوٹے معاملات کے فیصلوں کے لئے بھی خارجی امداد کی ضرورت پڑتی تھی وہ دو قدم بھی آسرے کے بغیر نہیں چلتا تھا۔ خدا کی شانِ ربوبیت سے یہ بعید تھا کہ وہ بچے کو یوں تنہا اور بے آسرا چھوڑ دیتا۔ جس خلاقِ فطرت نے اس کی طبیعی زندگی کی پرورش کے لئے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کے لئے دودھ کے چشمے نہ نکلیں وہ اس کی انسانی زندگی کے تقاضوں کی تسکین سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے انسان کی اجتماعی زندگی کے آغاز میں کہہ دیا تھا کہ

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (7/35)

اے نوع انسانی! جب تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئیں جو میری آیات تمہیں سنائیں۔ تو تم میں سے جو کوئی تقویٰ اور اصلاح اختیار کرے۔ تو اُن پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

انسانی تمدن وعمرانیت کے ابتدائی ادوار میں دیکھئے، ہدایت آسمانی کا یہ سلسلہ کس طرح غیر منفصل ومتواتر چلا آتا ہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (23/44)

پھر ہم نے اپنے رسول پے در پے بھیجے۔

ہر عہد میں رسول، ہر قریہ میں رسول، ہر قوم میں رسول، ایک ہی زمانہ میں مختلف بستیوں میں مختلف رسول، معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلد میں تاریخ رسالت کا جو سلسلہ آپ کے سامنے آچکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر دیکھئے۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ ایک رسول آتا۔ جب تک وہ اپنی قوم یا قبیلے میں رہتا۔ لوگ رشد وہدایت کی روشنی میں چلتے رہتے۔ جونہی وہ منہ موڑتا۔ وہ رفتہ رفتہ اس آسمانی روشنی کو گم کر دیتے اور پھر اندھیرے میں راستہ ٹٹولنے لگتے۔ مانوس مقامات کے جس قدر دھندلے سے نقوش ذہن میں محفوظ ہوتے ان میں

کہیں کہیں چل پھر لیتے لیکن نہ حتمی طور پر راستہ کا تعین کر سکتے نہ منزل کا اندازہ۔ ایسے میں پھر ایک اور رسول آجاتا۔ پھر روشنی سامنے ہوتی تو سیدھے راستے پر ہو لیتے۔ کُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (۲۰/۲)

پھر یہ بھی دیکھئے کہ جس طرح بچے کی زندگی کی ضروریات سیدھی سادی اور اس کے تقاضے محدود ہوتے ہیں اسی طرح انسانی حیات اجتماعیہ کے ابتدائی ادوار میں ان کے معاملات زندگی سادے اور آسان اور ان کے عمرانی تقاضے محدود ہوتے تھے۔ اس لئے آسمانی ہدایت بھی ان ہی محدود مسائل حیات کے لئے متکفل ہوتی تھی۔ پھر ذرائع رسل و رسائل اور اسباب نقل و حرکت کی کمی (بلکہ بعض حصوں میں فقدان) کی وجہ سے ان کی اجتماعی زندگی مختصر قبائل یا چھوٹی چھوٹی اقوام پر مشتمل تھی۔ اس سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ اس لئے اس آسمانی ہدایت کا دائرۂ اثر و نفوذ بھی اسی وسعت کے مطابق محدود و مقید ہوتا تھا۔ مہذا ذہن انسانی کی ناپختگی کا تقاضا تھا کہ اس تعلیم کو صرف اصولوں تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کی جزئیات تک بھی خود ہی متعین کر دی جائیں۔ کیونکہ ان میں ہنوز اس کی صلاحیت نہ تھی کہ اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود مرتب کر لیں۔ الغرض ہوتا یہ کہ ایک رسول کی تشریف برادری کے بعد کچھ وقت تک اس کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی رہتی۔ پھر اس میں تحریف و الحاق شروع ہو جاتا۔ ادھر ان کی زندگی کی ضروریات بھی بڑھ جاتیں اور احوال و ظروف کی تبدیلی سے ان کے تقاضوں میں تغیر و تبدل ہو جاتا۔ اس لئے اب بچہ پھر گر پڑتا اور لے کسی انگلی پکڑ کر اٹھانے والے کا انتظار شروع ہو جاتا۔ اتنے میں پھر ایک رسول آجاتا۔ وہ سابقہ آسمانی ہدایت کو ذہن انسانی کی آمیزشوں سے پاک و صاف کرتا۔ جزئیات میں جہاں کہیں حک و اضافہ اور تغیر و تبدل کی ضرورت ہوتی اسے بھی پورا کرتا اور اس طرح بچے کو اٹھا کر پھر راستے پر لگا دیتا۔ قرآن میں آسمانی ہدایت کے نسخ و تبدل کی آیات پر غور کیجئے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۱۰۶/۲)

ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم (پھر) نازل کر دیتے ہیں (پس قرآن کے نزول پر لوگوں کو حیرانی نہیں ہونی چاہیئے۔) کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

سورۂ نحل میں اسی تبدیلی آیات کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۰۱/۱۶)

اور جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بدل دیتے ہیں (اور یہ اس لئے کہ، اللہ خوب جانتا ہے کہ کب، کیا، نازل کرنا چاہیئے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ تو (اے رسول) افترا کرتا ہے (کیونکہ تیری وحی سابقہ احکام سے بعض جگہ مختلف ہوتی ہے)۔ لیکن ان میں سے اکثر (تبدیلیٔ احکام کی) علم سے واقف نہیں۔

محو و ثبت کا یہی وہ اصول ہے جس کے متعلق سورۂ رعد میں فرمایا۔

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۖ وَ عِنْدَہٗۤ اُمُّ الْکِتٰبِ (۱۳/۳۹)

اللہ اپنے سابقہ احکام میں سے، جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے قائم رہنے دیتا ہے۔ (اس لئے کہ) ام الکتاب (جو تمام قوانین و احکام کا سرچشمہ ہے) اللہ کے پاس ہے۔

باقی رہی انسانی تحریف و الحاق، سو اس کے متعلق فرمایا۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِہٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ نبی کہ (اس کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو کہ) جب اس نے (احکام الٰہیہ کی) تلاوت کی تو (وحی کے دشمن) شیطان نے اس کی تلاوت کردہ (وحی) میں کچھ ملاوٹ کر دی۔ پس اللہ (دوسرا رسول بھیج کر) ان کی اس آمیزش کو مٹا دیتا رہا اور اپنے احکام کو محکم کرتا رہا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

ہدایت آسمانی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا حتیٰ کہ ذہن انسانی سن رشد و شعور کو پہنچ گیا۔ اب اس میں پختگی آگئی۔

ذہن انسانی کا سن شعور

اب بچہ جوان ہو گیا۔ اس کے پاؤں میں راستہ طے کرنے کی طاقت، دل میں خطرات کا مقابلہ کرنے کے حوصلے اور دماغ میں نشیب و فراز کے سمجھنے کی صلاحیت آگئی اب ہر چار قدم پر گر گر کسی، انگلی پکڑ کر اٹھانے والے کی احتیاج نہ تھی۔ اب صرف اس قدر ضرورت تھی کہ زندگی کے دوراہوں پر نشانات راہ لگا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایسا انتظام کر دیا گیا کہ سفر حیات میں ہر شاہراہ پر اور شاہراہ کے ہر موڑ پر ایسے ایسے محکم و استوار نشانات نصب کر دیئے کہ حوادث زمانہ کے سیلاب آئیں لیکن روشنی کے بلند میناروں کی طرح نشانات خداوندی کے ان پختہ کھمبوں کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ ہر شعبۂ حیات کے اصول، ہر گوشۂ زندگی کے آئین۔ اصولی طور پر قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ ان کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۵/۹﴾

یقیناً ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ساری دنیا کی قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ اس صحیفۂ خداوندی میں ایک نقطے کا بھی تغیر و تبدل کر سکیں تو ناکام

ونامرادیں۔ یہ محض ہماری خوش عقیدگی ہی نہیں بلکہ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اپنے اور بیگانے اس پر گواہ ہیں۔ جس کا جی چاہے مسلمانوں سے نہیں، غیر مسلموں سے پوچھ لے ان کی شہادات بتادیں گی کہ

عصر حاضرہ کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخہ کا ہو بہو عکس ہیں جسے (حضرت) زید نے لکھا تھا۔ اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے جسے محمد نے لکھا کر دیا تھا۔[۱]

پہلے صحائف آسمانی چونکہ ایک وقت معینہ کے لئے نافذالعمل رہنے کے لئے آتے تھے اس لئے ان میں انسانی اختراعات، تلبیسات کی آمیزش ہو جاتی تھی۔ لیکن قرآن چونکہ ہمیشہ کے لئے نافذالعمل رہنے کے لئے آیا تھا اس لئے اس میں باطل کی آمیزش ناممکن تھی اب باطل لوٹ کر نہیں آسکتا تھا۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۴/۴۹)،

کہو کہ حق آگیا۔ اب باطل نہ پہل کرنے کے لئے ابھر اٹھا سکتا ہے، نہ لوٹ کر آسکتا ہے۔

اسی حقیقت کے پیش نظر (Baroness Margarate von Stein) نے لکھا ہے کہ

اگرچہ تمام مذہبی صحائف خدا کی طرف سے نازل ہوئے تاہم صرف قرآن ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں ذرا بھی ردوبدل نہیں ہوا۔ اور وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔

تمدنی ضروریات کی وسعتیں

ذہن انسانی کے سن رشد و شعور کے ساتھ ہی اس کی تمدنی زندگی کی وسعتوں میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور اس کی حدود اس قدر پھیلنے لگیں کہ وہ رفتہ رفتہ تمام نوع انسانی کو محیط ہونے لگیں۔ چنانچہ آج سامان رسل و رسائل اور ذرائع نشر و اشاعت کی ہمہ گیریت سے تمام دنیا سمٹ سمٹا کر ایک بستی اور اس کے رہنے والے ایک خاندان کے افراد بن رہے ہیں اس لئے اب رسالت بھی قومی اور قبائلی ادوار و انحصار سے نکل کر عالمگیر بن گئی اور جماعتوں کے بجائے اس کا تخاطب نوع انسانی سے ہو گیا۔ قرآن کے صفحات کو الٹیے اور دیکھتے جائیے کہ اس نے اس حقیقت کو کس شدت و تکرار سے نمایاں کیا ہے کہ نبی اکرمؐ تمام نوع انسانی کے لئے رسول اور قرآن قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے شمع زندگی ہے۔ کہیں ہے کہ

وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا (۴/۷۹)،

ہم نے تمہیں تمام نوع انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے

---

[۱] Hartwig Hirschfeld - New Researches into The Composition and Exegesis of The Quran.

قرآن کی جمع و تدوین اور نشر و اشاعت کی تاریخ اپنے مقام پر آئیگی جہاں اس اجمال کی تفصیل پیش کی جائے گی کہ قرآن میں آج تک ایک حرف کا تغیر و تبدل بھی نہیں ہوا۔

کہیں ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّکُمْ

اے نوعِ انسانی! تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے رسول آگیا۔

کہیں ہے۔

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (۷/۱۵۸)

تمام نوعِ انسانی سے کہدو کہ میں تم سب کی طرف رسول ہوں۔

اور کہیں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا (۳۴/۲۸)

اور ہم نے تمہیں تمام نوعِ انسانی کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

جن اقوام کی طرف پہلے رسول آچکے تھے ان کی طرف بھی یہی رسول۔ اس لئے کہ ان کے پاس آسمانی روشنی اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہ تھی، کیونکہ وہ بھیجی ہی گئی تھی ایک وقتِ معینہ کے لئے واجب التعمیل رہنے کے لئے۔

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ (۵/۱۵)

اے اہل کتاب۔ یقیناً ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے جو اس میں سے بہت کچھ کھول کر بتاتا ہے جو تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر دیتا ہے (کیونکہ وہ منسوخ کر دی گئی ہیں اور ان کے دہرانے کی اب ضرورت نہیں)

ان ہی تفاصیل کو سورۂ نحل میں اس اجمال میں سمیٹ کر رکھ دیا۔

وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ شَھِیْدًا عَلَیْھِمْ مِّنْ اَنْفُسِھِمْ وَجِئْنَا بِکَ شَھِیْدًا عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ۝ (۱۶/۸۹)

جس دن ہم ہر امت میں سے ان کے اندر ہی سے گواہ کھڑا کر دیں گے اور تمہیں (اے رسول) ان تمام (اقوام امم یا اُن کے شاہدین) پر گواہ کھڑا کریں گے۔ اس لئے کہ ہم نے تم پر وہ کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے اور جو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اُن کے لئے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری ہے۔

اس لئے کہ قرآن ان تمام اصولی سچائیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو انبیائے سابقہ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً

امم گذشتہ کی طرف آتی رہیں لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں کہیں محفوظ نہ رہ سکیں ہی لیے قرآن کو مہیمن کہا گیا ہے۔

۵/۴۸ نیز ۲۶/۱۹۱ نیز ۳۲/۵۶ نیز ۲۱/۲۲) اسی لیے قرآن اب تمام اقوام عالم کے لئے ضابطۂ زندگی اور آئین حیات ہے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ (۶/۹۰ نیز ۳۸/۸۷ نیز ۶۸/۵۲ نیز ۸۱/۲۷) [یہ تمام اقوام عالم کے لئے ان کی فراموش کردہ صداقتوں کی یاددہانی ہے] اور اسی لئے اب تمام نوع انسانی سے مطالبہ ہے کہ وہ اس ضابطۂ قوانین کو اپنا نصب العین حیات بنائیں (۷/۳) کہ نوع انسانی کے لئے منزل مقصود تک پہنچانے والی یہی صراط مستقیم ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں۔ (۶/۱۶۲-۱۶۵)

جب راہرو جادۂ حیات کی ضروریات یوں پوری ہوگئیں اور زندگی کی شاہراہوں پر ایسے ایسے محکم نشانات راہ نصب کر دیئے گئے تو دین مکمل ہو گیا۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا کہ انسانیت کی خودداری و خود اعتمادی کا تقاضا تھا کہ اسے اب پختہ تصور کیا جاتے۔ ضرورت صرف اس قدر تھی کہ اسے راستے بتا دیئے جائیں۔ نشانات لگا دیئے جائیں۔ فضا میں روشنی پیدا کر دی جائے اور اسے دیکھنے والی آنکھیں عطا کر کے کہہ دیا جائے کہ ان نشانات وحی کی روشنی میں علم و عقل کی راہ نمائی سے منازل زندگی طے کرتا چلا جائے۔ قد تبین الرشد من الغی صحیح اور غلط راہیں متمیز و متفارق ہوگئیں انا ھدینہ النجدین انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر دونوں راستے الگ الگ کر کے دکھا دیئے گئے اور اسے چھوڑ دیا گیا کہ ایک مرد جواں ہمت کی طرح اپنا راستہ خود طے کرلے اب ہر معاملہ کے جانچنے کے لئے اصول اس کے سامنے تھے۔ ان اصولوں کی روشنی میں جزئی امور کے متعلق فرعی قوانین مرتب کرنے کے لئے علم و عقل اس کے پاس تھی۔ معلم کا کام اصول سمجھا دینا تھا۔ بنیادی قاعدے بتا دینا تھا اگر ہر جزوی سوال کا جواب بھی وہ خود ہی بتا دے تو متعلم میں اصابت رائے، قوت فیصلہ، معاملات کے افہام و تفہیم کی صلاحیت اور اعتماد نفس کے جوہر کبھی اجاگر نہ ہوسکیں۔ ذہن انسانی کو جلا دینے اور اس کی نگاہوں میں بصیرت اور عقل و خرد میں نشوونما ارتقاء پیدا کرنے کے لئے چاہیئے ہی یہی تھا کہ اسے اصولوں کا مکمل ضابطۂ حیات دیکر، کارگہ زندگی میں آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو قوائے عقلیہ مضمحل اور جوہر انسانیہ مفلوج ہو کر رہ جاتے۔ عقل و ہوش کا بچپن کبھی جوانی کی پختگی حاصل نہ کر سکتا اور انسانی قلب و دماغ لاڈلے بچے کے قوائے ذہنیہ و عملیہ کی طرح (Un-Developed) رہ جاتے۔ لہذا اگر انسانیت کے عہد طفولیت میں قدم قدم پر آسرے اور سہارے

اب آسروں کی ضرورت نہ تھی

بہم پہونچانا ہی تقاضائے ربوبیت تھا تو جوانی کے زمانہ میں اسے اپنے پاؤں چلنے دینا اس کے حق میں رحمت و شفقت۔ اس کے قوائے عقلیہ کے بڑھنے۔ پھولنے پھلنے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ اس کے جواہر مضمر میں جلا پیدا کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ نہیں! بلکہ

یوں کہئے کہ انسانیت کی خودداری کا یہی تقاضا تھا۔ کسی نوجوان لڑکے سے بچوں جیسا سلوک کیجئے۔ راستے میں اس کی انگلی پکڑ کر چلائیے اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کیجئے۔ دیکھئے اس کی خودداری کو کیسے ٹھیس لگتی ہے۔ وہ کس طرح انگلی چھڑانے کی کوشش کرتا ہے وہ کیسے گود سے اچھل کر بھاگتا ہے۔ فرط ندامت سے اس کا چہرہ تمتما اٹھے گا۔ احساس خودی سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو جائے گی۔ آپ نے اندازہ فرمایا کہ تکمیل دین اور ختم نبوت کس طرح اصول فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ کیا جاتا تو ذہن انسانی کی گرہ کیاں کبھی نہ کھلتیں۔ انسان اپنے پاؤں چلنا کبھی نہ سیکھتا۔ یہ بچہ کبھی جوان نہ ہونے پاتا۔ چشم کائنات نمو و آدم اور بلوغ انسانیت سے کبھی روشناس نہ ہو سکتی! ہم نے جب بعثت حضور خاتم النبیینؐ کو رحکیم الامتؒ کے الفاظ میں "ہنگام نمو و آدم" سے تعبیر کیا ہے تو یہ حقیقت کی ترجمانی ہے۔ شاعری نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ختم نبوت کے عقیدہ نے تاریخ انسانیت میں ایک نئے باب کا اضافہ اور ایک نئے دور کی ابتدا کی ہے۔ اس سے پہلے مذہب کا تعلق یکسر جذبات (EMOTIONS) سے ہوتا تھا اور اُسے دنیا کے عقل کا خفیف سمجھا جاتا تھا۔ اب آفتاب وحی، چشم عقل و خرد کے لئے روشنی بن کر آیا اور اسی لئے دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت قرار پا گئی

ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی (۱۲/۱۰۸)

ہم (یعنی رسول، اور اس کے متبعین خدا کی طرف دعوت علی وجہ البصیرت دیتے ہیں۔

کی آواز دنیائے انسانیت میں پہلی آواز تھی۔ اب عقل صرف ان مقامات میں وحی کی راہ نمائی کی محتاج رہ گئی جو اس کی سرحد سے ماوراء تھے۔ اور یہ مقامات وہ اصولی قوانین تھے جو منبر انسانی کے ترجمان تھے اور قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ یہ اصول وہ اقدار مستقلہ (PERMANENT VALUES) تھیں جن کی حدود کے اندر عقل کی کامل حکمرانی متصور تھی۔ گذشتہ اوراق میں اسلامی نظام کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیئے اور دیکھئے کہ اس کے پیش نظر ختم نبوت کس طرح ایک عین قرین عقل عمل (Rational process) دکھائی دیتا ہے اور اس میں صحیح حریت فکر و نظر کے کس قدر امکانات پوشیدہ ہیں؟ اس نے شخصیت پرستی کا وہ کاسہ توڑ گیا جس کے نیچے انسان قرنہا قرن سے دبا چلا آتا تھا۔ اب انسان کو صرف ان چند اصول حیات کو تنقید سے بالاتر سمجھنا ہے جسے اس کی عقل وضع نہیں کر سکتی[1]۔ ان اصول زندگی کو صحیح ماننے کے بعد انسان ہر قسم کی شخصی محکومیت (Personal authority) سے آزاد ہو جاتا ہے اور اپنا تمام کاروبار اپنی صوابدید کے مطابق آپ چلاتا ہے۔ جذباتی (Emotional) اور عقلی (Rational) پہلو انسانی زندگی کے لاینفک عناصر ہیں۔

---

[1] ان اصول حیات کو عقل کیوں وضع نہیں کر سکتی۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث عنوان وحی (جلد دوم) میں گزر چکی ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن نے کس طرح ان دونوں میں ایک حسین امتزاج پیدا کر کے نظام زندگی کو فطرت کے ہموار خطوط پہ استوار کر دیا ہے اور پھر ان دونوں کو الگ الگ رکھ کر ان میں غیر فطری تلبیس بھی پیدا نہیں ہونے دی - یہ صرف ختم نبوت (تکمیل دین) اور حفاظت کتاب اللہ سے ہی ممکن تھا، ایک چیز فطرت انسانی کے تقاضے ہیں جو انسانی ضمیر کی انتہائی گہرائیوں میں کروٹیں لیتے ہیں - یہ تقاضے شروع سے آخر تک ایک چلے آتے ہیں اس لئے کہ فطرت انسانی ایک ہے اور غیر متبدل ... - دوسری چیز ان تقاضوں کے عملی مظاہر ہیں

اصول و فروعات

جو احوال و ظروف سے بدلتے رہتے ہیں - فطرت انسانی کے غیر متبدل تقاضوں کے لئے اصولی قوانین، قرآن میں محفوظ کر دیئے گئے - ان ہی قوانین کو تمام نوع انسانی کا مشترکہ (اور واحد) دین قرار دیا گیا ہے - باقی رہے ان کے عملی مظاہر سے جو احوال و ظروف اور زمان و مکان کے تاثرات سے بدلتے رہتے ہیں ان کے حل کے لئے ان اصولی قوانین کی روشنی میں وقتی آئین مرتب کرنے کا فریضہ عقل انسانی کے سپرد کر دیا گیا ہے - تاکہ انسانی حیات اجتماعیہ مستقل اقدار کے مرکز سے کبھی الگ نہ ہونے پائے اور اس کے ساتھ ہی نت نئے دن کے بدلنے والے تقاضوں کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچ جائے - ان اشارات کی روشنی میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اب ایک دین کس طرح تمام نوع انسانی کی کفالت کر سکتا ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) آج مختلف ایجادات نے زمان و مکان (Time and Space) کے بعد کو مٹا کر زمین کی طنابیں اس طرح کھینچ دی ہیں کہ تمام کرۂ ارض ایک وحدت (UNIT) بن چکا ہے - آپ ایک مقام پر بیٹھے ..... تمام نوع انسانی تک اپنا پیغام پہنچا سکتے اور ایک مرکز سے تمام دنیا کا نظام چلا سکتے ہیں - آج دنیا کی جغرافیائی حدود بندیاں عہد کہن کی یادگار بن چکی ہیں - آج انسان ان غیر فطری حدود و ثغور سے خود گھبرا اٹھا ہے اور کسی ایسے نظام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے جس سے یہ حدود ٹوٹ جائیں اور ساری دنیا ایک وحدت

وحدت نظام

(Single Unit) میں تبدیل ہو جائے - یورپ کے ارباب سیاست اس نظام کا خاکہ ایک عالمگیر فیڈریشن کی شکل میں دیکھ رہے ہیں - Federation And World Orders) - کا مصنف اس باب میں لکھتا ہے۔

> بعد مکانی مٹ جانے کے بعد انسانی عمرانیت و مدنیت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ محیر العقول ہیں، ہمارا عمرانی نظام ہمارے اسلاف سے اس قدر مختلف ہو چکا ہے لیکن بایں ہمہ ہمارا سیاسی نظام ابھی تک وہی چلا آتا ہے - دنیا سمٹ کر ایک براعظم بن چکی ہے لیکن دنیا میں قومی حکومتوں کے حدود و قیود بدستور قائم ہیں (اس بوالعجبی کو مٹانے کے لئے) ایک بدیہی طریق کار یہی ہے کہ کوئی ایسا نظام وضع کیا جائے جس سے یہ حدود و قیود مٹ جائیں

اسلام اس عالمگیر نظام کی بنیاد وحدتِ فکر اسی صورت میں ممکن تھی کہ نوعِ انسانی کے لئے ایک ضابطۂ حیات بطور اصول و اساس زندگی دیدیا جاتا اور اس کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دیا جاتا۔ آج چونکہ مغرب سرے سے وحی کی اصولی راہ نمائی کا بھی منکر ہو رہا ہے اور مشرق کی فکر ایک خواب پریشان سے زیادہ کچھ نہیں اس لئے دنیا نے ختم نبوت کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا۔ جب انسان اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہوگا اور ایک طرف ضابطۂ وحی کی اساسی ضرورت اور دوسری طرف عقل انسانی کے امکانات کا صحیح صحیح اندازہ لگائے گا تو اس وقت اسے معلوم ہو سکے گا کہ نوعِ انسانی کے عروج و ارتقار کے لیے ختم نبوت کس قدر ضروری تھی اور اس کے لئے قرآن نے جو نظام عطا کیا ہے وہ انسانیت پر کتنا بڑا احسانِ جلیل ہے۔

~~~~~~ ✲ ~~~~~~

ختم نبوت

قرآن کریم نے تکمیل دین۔ عالمگیریتِ رسالت اور حفاظتِ قرآن کے اعلانات سے ختم نبوت کی تصریح فرما دی لیکن اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ان ہی اعلانات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کھلے کھلے الفاظ میں اس اجمال کی تشریح بھی کر دی تاکہ کسی کو اس باب میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ ایک طرف اگر یہ فرمایا کہ نبی اکرمؐ کافۃ للناس (تمام نوعِ انسانی) کے لئے رسول ہیں تو اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی تصریح کر دی کہ الناس سے مراد صرف زمانۂ نبوی کے انسان ہی نہیں ہیں بلکہ بعد کے آنے والے انسان بھی ہیں۔ سورۂ جمعہ میں ہے

هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا ..... وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲/۲)

خدا کی ذات وہ ہے جس نے ایک اُمّی قوم میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ جو انہیں اس کے احکامات بتاتا ہے۔ اور ان کا تزکیہ کردار کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ گو وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (صرف ان ہی کی طرف رسول نہیں بلکہ) ان کی طرف بھی جو بعد میں آنے والے ہیں۔

اسی طرح قرآن کے متعلق جہاں یہ ارشاد ہوا کہ یہ الناس کے لئے ضابطۂ زندگی ہے اس کی تشریح میں بھی وضاحت فرما دی کہ الناس سے مراد صرف مخاطبین عہد رسالتمآب ہی نہیں بلکہ ہر وہ انسان جس تک قرآن پہنچے۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (۶/۱۹)

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی (تمہارے اعمال بد کے نتائج سے) ڈراؤں اور انہیں بھی جن تک یہ پہنچے ۔۔۔!

جہاں یہ فرمایا کہ اللہ نے دین کی تکمیل کر دی وہاں یہ بھی فرما دیا کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب رہے گا۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝ (۹/۳۳)
~~~~~~

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے کل ادیان پر غالب کرے

خواہ اسے مشرک برا ہی کیوں نہ مانیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ دین کلہ میں قیامت تک کے نظامہائے زندگی شامل ہیں۔ ان سب کے ساتھ یہ آیۃ جلیلہ اس موضوع پر قول آخریں ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۳/۴۰)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے

اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ان تمام تصریحات و تشریحات کے بعد، قرآن کریم نے جو نظام دین عطا کیا (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے)، یعنی قرآن بطور اساس آئین اور ملت کی مرکزیت اس کی قوتِ نافذہ۔ اس کی موجودگی میں نبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ ختم نبوت کا عقیدہ اتنا واضح تھا کہ جس طرح توحید خداوندی کے متعلق کسی بحث کی گنجائش نہ تھی اسی طرح اس کے متعلق بھی کسی سوال کی ضرورت باقی نہ تھی۔ آپ قرن اوّل کے تمام محفوظات چھان ڈالیئے۔ آپ کو کہیں کسی جگہ بھی اس مسئلہ کے متعلق کوئی بحث نہ ملے گی۔ ان کے نزدیک نبوت کی ختمیت، خدا کی وحدت کی طرح مسلم تھی۔ کسی دل میں نہ اس کے متعلق کوئی سوال پیدا ہوا نہ اس کے متعلق۔ رسول کی رسالت قرآن میں محفوظ تھی اور اس کی امامت، مرکز ملت کی شکل میں موجود۔ اس لئے اجرائے نبوت کا سوال ہی بے معنی تھا۔ کسی "آنے والے" کا تصور ہی باطل تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے کو کسی اٹھانے والے کا خیال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ گر پڑتا ہے۔ جب تک وہ اپنے پاؤں چلتا رہتا ہے اسے خیال تک بھی نہیں آتا کہ اسے کسی اٹھانے والے کی ضرورت ہے۔ یہی کیفیت قوموں کی ہے۔ جب تک کوئی قوم سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ جب تک وہ شوکت و حشمت، حکومت و سطوت کی مالک ہوتی ہے۔ جب تک اس کے سینے میں دل اور دل میں ایمان کی تڑپ، اس کے بازوؤں میں خون اور خون میں حرارت کردار موجزن ہوتی ہے۔ اس وقت تک اسے کسی آسرے کی تلاش نہیں ہوتی۔ وہ کوئی سہارا نہیں ڈھونڈتی۔ اس وقت تو وہ خود بے آسروں کا آسرا اور بے سہاروں کا سہارا ہوتی ہے اس کی قوت بازو اس کا آسرا اور نصرت خداوندی اس کا کافی سہارا ہوتا ہے۔ لیکن جب اس پر ادبار چھا جاتا ہے اس کی دولت و حشمت چھن جاتی ہے۔ اس کی سطوت و حکومت لٹ جاتی ہے تو اس کے قوائے عملیہ مضمحل اور اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ آرزوئیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ وہ جہاد زندگی میں سپر انداختہ، شکست خوردہ بیٹھ جاتی ہے وہ کشمکش حیات سے گھبراتی، میدان عمل سے گریز کرتی ہے اور خطرات کا مقابلہ کرنے سے جی چراتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ کمزور بچے کی طرح کسی اٹھانے والے کی راہ تکنے

لگتی ہے۔ اس کی تمام توجہات کسی آنے والے کے پاؤں کی آہٹ پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی امیدوں کا آخری سہارا "مردے از غیب بروں آید وکارے بکند" کے خوش آیند تصور میں تلاش کرتی ہے۔ وہ ہر اٹھتی ہوئی گرد کو ہزار حسرتوں سے دیکھتی ہے کہ شاید اسی میں وہ شاہسوار درماں چھپا چلا آرہا ہو جو اس کی نگہِ انتظار کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ غرضیکہ ایسی حالت میں وہ قوم خود کچھ نہیں کرتی اور اپنے ذہن کو اس خوش فہمی کے کھلونوں سے بہلاتی رہتی ہے کہ تھوڑی دیر اور ٹھیرو، آنے والا آئے گا اور تمام تباہ حالیوں اور بدبختیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے گا۔ جماعتِ صحابہؓ کے سرتاعمل دور میں "آنے والے" کا عقیدہ بھلا کس طرح بار پا سکتا تھا؛ یہ عقیدہ سب سے پہلے ہمیں شیعہ[1] حضرات کے ہاں ملتا ہے۔ ہمیں اس وقت اس فرقہ کے تاریخی پس منظر یا سیاسی اور مذہبی عقائد سے بحث نہیں۔ اس وقت ہم صرف اس حصہ تک محدود رہیں گے کہ "آنے والے" کے عقیدہ کی ابتدا کس طرح سے ہوئی۔ اسلامی نظام کے مطابق (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) رسول اللہ کے بعد، امورِ ملت کا انصرام، جماعت اور اس کے منتخب کردہ امیر (امام) کے ہاتھوں سرانجام پاتا تھا۔ اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ امیرِ ملت، ملت کا منتخب کردہ نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح رسول مامور من اللہ ہوتا ہے اسی طرح امام بھی مامور من اللہ ہوتا ہے۔ لہٰذا امامت بھی رسالت کی طرح

آنے والے کا تصور

مخصوص ہے جس طرح رسول اپنی رسالت کے لئے لوگوں کے انتخاب کا محتاج نہیں ہوتا، اسی طرح امام اپنی امامت کے لئے انتخاب کا محتاج نہیں ہوتا۔ رسول، رسول ہوتا ہے خواہ اسے ایک شخص بھی نہ مانے اور امام، امام ہوتا ہے خواہ اسے کوئی بھی منتخب نہ کرے۔ اس عقیدہ کی رو سے وہ حضرت علیؓ کی امامتِ منصوص کے قائل ہیں۔ ان کا دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ امامتِ منصوص، حضرت علیؓ کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی ہے۔ اور تیسرا یہ کہ کوئی زمانہ امام کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے بعد یہ سلسلۂ امامت آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا چلا آیا۔ لیکن بارہویں امام، حضرت محمد بن عسکریؒ کے ساتھ یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو اس وقت یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ یہ بارہویں امام وفات نہیں پاگئے بلکہ عراق کے ایک تہ خانہ میں زندہ موجود ہیں اور قیامت کے قریب ان کا ظہور ہوگا۔ انہی کا نام امام مہدی آخر الزمان ہے {یہ عقائد جمہور شیعہ حضرات کے ہیں}

غیر شیعہ حضرات کے ہاں یہ عقیدہ بالکل نہیں تھا لیکن شیعہ حضرات نے اپنے عقائد کی نشر و اشاعت اس انداز

---

[1] معارف القرآن میں فرقہ پرستی کی بحث کو کہیں نہیں چھیڑا گیا۔ اس لئے کہ یہ کتاب قرآن کی تعلیم کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے لکھی گئی ہے اور قرآن کو فرقہ پرستی سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن بعض مقامات پر کسی معاملہ کو سمجھانے کے لئے تاریخی پس منظر کا سامنے لانا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس وقت "بحث امامت" اس لئے درمیان میں آگئی ہے کہ اس کے بغیر یہ سمجھ میں نہیں آسکے گا کہ مسلمانوں میں مہدی کا عقیدہ کیسے پیدا ہوا اس لئے اس ضمن میں شیعہ حضرات کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ لیکن اس ذکر سے کسی کی تنقیص و تنکیر مقصود نہیں۔

سے کی کہ غیر شیعہ (اہل سنت والجماعت) مسلمانوں کے عقائد بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ آپ ان کے مجامیع احادیث اور کتب تاریخ وسیر کو دیکھئے، اکثر و بیشتر مقامات ان ہی کے تصورات و معتقدات سے ملوث نظر آئیں گے۔ اور یہ اثر اندازی اس طریق سے ہوگی کہ سطحی بیں نگاہیں اسے بآسانی محسوس تک بھی نہ کر سکیں گی۔ ایک "آنے والے" امام کا عقیدہ تو شیعہ حضرات کے ہاں قو اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا میں ایک "امام منصوص" کی موجودگی ضروری ہے۔ سطح ارض پر نہیں تو غار کے اندر ہی سہی۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ غیر شیعہ مسلمانوں کے ہاں بھی "آنے والے" کا عقیدہ موجود ہے۔ حالانکہ ان کے نظام میں (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) کسی ایسے امام کے لئے کوئی گنجائش نہیں جسے ملت منتخب نہ کرے اور وہ ملت میں موجود نہ ہو۔ آپ بغور دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جب تک مسلمانوں کا وہ نظام موجود رہا جو انہیں قرآن نے عطا کیا تھا۔ کسی "آنے والے" کا عقیدہ ان کے ہاں بار نہ پا سکا۔ لیکن جب وہ نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ان کے ہاں بھی اس عقیدہ نے جگہ پالی۔ قرآن کی موجودگی میں اس قسم کے عقائد کی گنجایش نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب روایات کو بھی دین کا درجہ دیدیا گیا تو پھر دین میں ہر عقیدہ کی گنجائش نکل آئی۔ قرآن میں تغیر و تبدل تو حک و اضافہ ناممکن تھا۔ لیکن روایات سازی تو بڑی آسان چیز تھی۔ جس کے جی میں آیا چار روایتیں وضع کر ڈالیں۔ اور پانچ سات راویوں کا فرضی سلسلہ قائم کر کے انہیں ذات رسالتمآب تک پہنچا دیا۔ اس طرح وہ عقیدہ دین بن گیا یہ تھی عقیدہ مہدی آخر الزمان کی ابتدا شیعوں کی طرح سنیوں نے اس امام کو غار میں زندہ تسلیم نہیں کیا۔ لیکن اس سے ایک کمی یہ واقع ہو گئی کہ جب تک امام مہدی کا ظہور نہ ہو جائے یہ لوگ بلا امام رہے جاتے تھے۔ یہ کمی عقیدۂ مجدد سے پوری کر لی گئی۔ اس نقطہ کی ابتدا بھی عجیب اتفاق سے ہوئی۔ بنی امیہ کے زمانہ میں ملوکیت کا استبداد و تغلب بڑھ گیا تھا پہلی صدی کا اخیر تھا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے انہوں نے اس تغلب کو مٹا کر حکومت کو پھر سے خلافت کے خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اس آئین کہن کی تجدید کی۔ بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد دلایا۔ مٹے ہوئے نقوش کو اجاگر کیا۔ اس کارنامۂ احیاء و تجدید کی بناء پر وہ مجدد کہلائے۔ لیکن ان کے بعد یہ تصور ایک سلسلۂ جاریہ (Regular feature) کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز پہلی صدی کے اخیر پر سریر آرائے حکومت ہوئے تھے۔ اس لئے یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ ہر صدی کے آخیر پر ایک مجدد آیا کرے گا۔ یعنی بجائے اس کے کہ یہ خیال پیدا ہوتا کہ اب اگر نظام دین کا قیام پھر سے ہو گیا ہے تو اس سلسلہ کو مسلسل آگے بڑھایا جائے اور اس طرح ملت میں مجددی و مجدد (مرکز کی شکل میں) ہر وقت موجود رہیں۔ خیال یہ پیدا ہوا کہ اس مجدد کے بعد یہ سلسلہ پھر بگڑ دیگا۔ سو سال تک بگڑتا جائے گا۔ اس کے بعد پھر ایک مجدد پیدا ہو گا، اور اسی نظام کہن کی تجدید کرے گا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے پاس سلطنت و حکومت تھی۔ اس لئے انہوں نے حکومت الٰہیہ (نظام قرآنی) کی تجدید چاہی۔ لیکن بعد کے آنے والے مجددین حضرات کے لئے یہ شرط بھی ضروری نہ رہی

مجدد

بعد میں دین چونکہ مذہب میں بدل چکا تھا اور اسلام نام رہ گیا تھا چند رسمی عبارات و نظری عقائد کا۔ اس لئے اب احیاء و تجدید بھی ان ہی عقائد کی اصلاح تھا۔ ذرا تصور میں لائیے اس "نظام" کو کہ سارے عالم اسلامی میں سو سال کے بعد ایک انسان پیدا ہوگا اور وہ بھی چند نظری مسائل کی تجدید کر کے چلا جائے گا۔ وہ قوم جس میں "انسان" پیدا ہونے کی رفتار یہ ہو اس قوم کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

خدا ایں سخت جاں را یار بادا

کہ افتاد ست از بام بلند سے

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ "آنے والے" کا انتظار اس وقت ہوتا ہے کہ جب قوم میں بڑھنے اور زندہ رہنے کی قوت باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم اس درجہ شکستہ بازو ہو چکی ہو اس کی متاع حیات خوان یغما بن جاتی ہے کہ جس کا جی چاہے چھین جھپٹ کرے جائے اپنی ہزار سال کی تاریخ پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ کس قدر رہزن ایمان و آگہی اس "آنے والے" کے عقیدہ کے چور دروازہ سے آئے اور خرمن ملت کے لئے کس درجہ غارت گر واقع ہوئے۔ عہد گزشتہ کے مدعیان کو چھوڑیئے۔ عہد حاضر میں ایران کے سید علی محمد باب اور مرزا حسین علی بہاء اللہ، مہدویت کے اسی دروازے سے نبوت اور پھر مظہر الوہیت کے ادعائی مقام تک جا پہنچے۔ پنجاب میں مرزا غلام احمد صاحب کو یہی دروازہ کھلا نظر آیا اور وہ بھی دبے پاؤں مجددیت، مہدویت، مسیحیت کے منازل طے کرتے کرتے نبوت کی چوکی تک جا پہنچے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

> ہمارے زمانہ کی ان دو تحریکوں میں جنہوں نے زمانہ قبل از اسلام کے مجوسی تصور کا احیاء کرنا چاہا بہائیت قادیانیت سے دیانتدار ہے۔ اس لئے کہ بہائیت اپنے آپ کو علانیہ اسلام سے الگ قرار دیتی ہے۔ لیکن قادیانیت اسلام کے بعض خارجی علامات کو برقرار رکھ کر اندرونی طور پر ایک ایسا تصور پیش کرتی ہے جو اسلام کی روح اور مقاصد کے یکسر خلاف ہے۔ (احمدیت اور اسلام)

قادیانیت

ہمارے مولوی صاحبان پچاس برس سے قادیانیوں کے ساتھ مناظرے، مباحثے، مجادلے، مباہلے کرتے چلے آرہے ہیں لیکن بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ مولوی صاحبان خود ایک آنے والے کے انتظار میں ہیں اور بحث کا مدار روایات و آثار پر ہوتا ہے جن میں موافق اور مخالف دونوں کو اپنے دعاوی کی تائید میں کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ خود مرزا صاحب کے دعاوی کا مدار روایات پر تھا لیکن بایں ہمہ، روایات کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ

> حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کی پٹاری کی ہے جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔ (الفضل قادیان۔ بابت ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

اگر بحث کا مدار قرآن پر ہوتا اور قرآنی نظام صحیح طور پر سمجھ لیا جاتا تو سارا نقشہ دو منٹ میں ختم ہو جاتا۔ رسالت قرآن میں محفوظ ہے اور جب تک قرآن باقی ہے رسالت بھی باقی ہے۔ باقی رہی امامت (امارت) سو اس کا نظام ملت خود قائم کر سکتی ہے۔ اسی کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت ہی نہیں۔ مہدی، مجدد، مسیح موعود کے تصورات غیر قرآنی ہیں اور ظل و بروز کے نظریات یکسر مجوسی حلول اور آریائی اوتار کے چربے جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم معارف القرآن کو اس قسم کی بے سود اور فرسودہ بحث و تمحیص کی آماجگاہ نہیں بنانا چاہتے جس میں مرزائی حضرات الجھنے اور الجھانے کے عادی ہیں اس کی وجوہات واضح ہیں۔ ان لوگوں کے دعاوی کا مدار بالعموم روایات پر ہوتا ہے اور ہم روایات کو دینی حجت تسلیم نہیں کرتے۔ دین کا مرکز نقطہ قرآن ہے۔ ان کے لٹریچر میں اس قدر تضاد سوقیانہ پن، رکاکت اور مہملیت ہے کہ وہ کسی سنجیدہ اور علمی موضوع کے لئے محل بحث ہو نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا لٹریچر ایک خاص قسم کی نفسیاتی کیفیت کی تخلیق ہوتا ہے اور ایک خاص قسم کی ذہنیت ہی اسے گوارہ کر سکتی ہے۔ عام سلیم الطبع اور خوش ذوق انسان کے لئے تو اس لٹریچر کا پڑھنا بھی تکدر روح اور دماغی کوفت کا موجب ہو جاتا ہے چہ جائیکہ اسے علمی دلائل و براہین کا موضوع تصور کیا جائے۔ اندریں حالات ان لوگوں کے "اعتراضات" و "دلائل" کو معرض بحث میں لانا کار بیکاراں ہے۔ بقول اکبرؒ

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

ہم صرف اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کے جن دو ایک مقامات کو یہ لوگ توڑ مروڑ کر اپنے آپ کو دھوکا اور دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی وضاحت کر دی جائے۔

نبی بغیر کتاب نہیں ہو سکتا

میرزا صاحب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے قرآن کریم کی اکملیت و محفوظیت کا تو انکار کر نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے دعوئے نبوت کی ایک اور راہ نکالی۔ یعنی انہوں نے کہا کہ میں رسول نہیں، نبی ہوں اس لئے بلا کتاب آیا ہوں۔

"من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب"

لیکن قرآن کی رو سے یہ بنیاد ہی باطل ہے کہ ایک شخص خدا کا نبی یا رسول ہو اور وہ کتاب نہ لائے۔ قرآن کے مطابق کوئی نبی بغیر کتاب کے آ ہی نہیں سکتا۔ جب چٹھی ہی نہیں تو چٹھی رساں کے آنے سے کیا مطلب؟ رسول کا فریضہ ہی پیغام خداوندی کا پہنچانا ہوتا ہے۔ بغیر پیغام کے قاصد اگر مضحکہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ خود قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس کی صراحت فرما دی کہ

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ...... (۲/۲۱۳)

چونکہ نوع انسانی کو ایک امت بن کر رہنا ہے اس لئے اللہ نے نبیوں کو بھیجا۔ خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان سب کے ساتھ کتاب بالحق نازل کی!

یہاں النبیین (انبیار) فرمایا۔ دوسری جگہ رسول کہا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ..... (۵۷/۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی...

معھم (سب کے ساتھ) میں کسی نبی یا رسول کی استثنار نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ یہ لوگ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضرت ہارون رسول تھے لیکن کتاب کے بغیر۔ کیونکہ تورات حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔ لیکن قرآن کا ارشاد ہے کہ تورات حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں کو دی گئی تھی (۲۱/۴۸) لیکن یہ بھی ان لوگوں کی فریب دہی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ میرزا صاحب رسول بلا کتاب اور غیر تشریعی[۵۲] نبی تھے حقیقت میں وہ اپنی وحی اور شریعت دونوں کے مدعی تھے۔ اپنی وحی کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

اور میں جیسا کہ قرآن شریف کی آیات پر ایمان رکھتا ہوں ایسا ہی بغیر فرق ایک ذرہ کے خدا کی اس کھلی وحی پر ایمان لاتا ہوں جو مجھے ہوئی اور جس کی سچائی اس کے متواتر نشانوں سے مجھ پر کھل گئی اور میں بیت اللہ میں کھڑے ہو کر یہ قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوئی ہے وہ اس خدا کا کلام ہے جس نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفےٰ پر اپنا کلام نازل کیا تھا۔

(ایک غلط فہمی کا ازالہ مصنفہ میرزا غلام احمد قادیانی)

نبی کی وحی اس کی کتاب نہیں ہوتی تو کتاب اور کسے کہتے ہیں؟ اس کی تصدیق خود متبعین میرزا صاحب کر رہے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

نبوت اگر کچھ ہو سکتی ہے تو ما انزل الیہ من ربہ میں ہو سکتی ہے چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک اور نبی کی کتاب یہی ہوتی ہے کہ ما انزل کو جمع کر لیا جائے۔ کیونکہ حضرت میرزا صاحب علیہ الصلوٰۃ والسلام سب انبیار کے مظہر اور بروز ہیں تو ان کا ما انزل الیہ من ربہ، بہ برکت حضرت محمدؐ و قرآن شریف اس قدر زیادہ ہے کہ کسی نبی کے ما انزل الیہ سے کم نہیں بلکہ اکثروں سے زیادہ ہوگا..... فالحمد للہ حضرت میرزا صاحب علیہ الصلوٰۃ

---

۵۱ یہ حقیقت کہ نبی اور رسول ایک ہی منصب کے دو نام ہیں۔ معارف القرآن جلد سوم میں بالوضاحت بیان ہو چکی ہے۔

۵۲ تشریعی اور غیر تشریعی کی تفریق یکسر غیر قرآنی ہے۔ ہر نبی خدا کا پیغام لاتا تھا جو اس کی شریعت ہوتی تھی۔

والسلام کا ایک لحاظ سے صاحب کتاب ہونا ثابت ہوگیا۔

(الفضل قادیان۔ مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۱۹ء)

اور واضح الفاظ میں دیکھئے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنی وحی اپنی جماعت کو سنانے پر مامور ہیں جماعت احمدیہ کو اس وحی پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا فرض ہے کیونکہ وحی اللہ اسی غرض کے واسطے سنائی جاتی ہے ورنہ اس کا سنانا اور پہنچانا ہی بے سود اور لغو فعل ہوگا جبکہ اس پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا مقصود بالذات نہ ہو۔ یہ شان بھی صرف انبیاء ہی کو حاصل ہے کہ ان کی وحی پر ایمان لایا جائے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی قرآن شریف میں یہی حکم ملا اور ان ہی الفاظ میں ملا۔ اور بعدہ حضرت احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملا۔ پس یہ امر بھی آپ کی (مرزا صاحب) کی نبوت کی دلیل ہے۔

(رسالہ احمدی نمبر ۵، ۶، ۷ بابت ۱۹۱۹ء موسومہ النبوۃ فی الالہام مؤلفہ قاضی محمد یوسف قادیانی)

اسی بناء پر یہ دعویٰ کیا گیا کہ مرزا صاحب اپنا دین لے کر آئے۔ چنانچہ ان کے الہامات میں سے یہ بھی ہے کہ میں (خدا) تیرے نام کو دنیا کے کناروں تک پہنچاؤں گا اور حملوں سے تیری تائید کروں گا اور جو دین تو لیکر آیا ہے اسے تمام دیگر ادیان پر بذریعہ دلائل و براہین غالب کروں گا اور اس کا غلبہ دنیا کے آخر تک قائم رکھونگا

(بحوالہ الفضل بابت ۳ر فروری ۱۹۳۵ء)

صاحب شریعت نبی

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ میرزا صاحب پر وحی نازل ہوتی تھی۔ اس "منزل من اللہ" وحی کا مجموعہ ان کی کتاب ہے۔ اس پر ایمان لانا اور عمل کرنا فرض ہے۔ یہی وہ دین ہے جسے میرزا صاحب لیکر آئے۔ یہ دین تمام ادیان (اسلام سمیت) پر غالب آئے گا اور چونکہ اس کا غلبہ قیامت تک قائم رہے گا۔ اس لئے یہ دین خدا کا آخری دین ہے۔ میرزا صاحب آخری رسول۔ یہ توجیہات میرزا صاحب کے متبعین کی خود ساختہ نہیں ہیں بلکہ خود میرزا صاحب اپنے آپ کو صاحب شریعت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے؟ جس نے اپنی وحی کے ذریعے سے چند امر و نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا۔ وہی صاحب شریعت ہوگیا...... میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی..... چونکہ میری میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے میری تعلیم کو اور اس وحی کو جو میرے پر ہوتی ہے فلک یعنی کشتی کے نام سے موسوم کیا...... اب دیکھو خدا نے میری وحی اور میری تعلیم اور میری بیعت کو نوح کی کشتی قرار دیا اور تمام انسانوں کے لئے اس کو معیار نجات ٹھہرایا۔

(اربعین ۴ صفحہ ۶ (مع حاشیہ) مصنفہ میرزا غلام احمد صاحب)

چنانچہ ان کی وحی قرآن کے احکام کی ناسخ بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا۔ حضرت موسیٰ کے وقت میں اس میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے نہیں بچا سکتا تھا اور شیر خوار بچے بھی قتل کئے جاتے تھے۔ پھر ہمارے نبی کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا اور پھر بعض قوموں کے لئے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دیکر مواخذہ سے نجات پانا قبول کیا گیا۔ اور پھر مسیح موعود (یعنی میرزا صاحب) کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔ (اربعین ع۴، ص۱۵ حاشیہ۔ مصنفہ میرزا صاحب)

ان تصریحات کی موجودگی میں "من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب" کا دعویٰ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس تمام لٹریچر کو نہ پڑھا ہو، فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر اپنی وحی۔ اپنی کتاب۔ اپنا دین۔ اپنی شریعت الگ رکھتے ہوئے اپنے آپ کو متبعین قرآن اور امت محمدیہ بتانا، کھلی ہوئی منافقت کے سوا اور کیا ہے؟ اسی لئے تو علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ بہائیت اور قادیانیت میں سے بہائیت دیانتداری پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ وہ کھلے الفاظ میں اپنے آپ کو ایک الگ ملت قرار دیتی ہے۔ لیکن یہ قادیانیت ہے کہ اس میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں کہ خود اپنے دعاوی کے منطقی نتائج کا دیانتداری سے اقرار کرلیں اور یہ صرف اس لئے کہ انہیں مسلمان کہلانے میں کچھ معاشی اور سیاسی مفاد نظر آتے ہیں۔ یہ دین سے مذاق نہیں تو اور کیا ہے: ذرا سوچئے کہ رسول اور امت کا تعلق کیا ہوتا ہے۔

رسول اور امت کا تعلق

خدا کو (بجز چند منکرین کے)، ساری دنیا مانتی ہے۔ لیکن ایک امت (ملت) کی جداگانہ ہستی اس کے رسول سے متشخص و متعین ہوتی ہے۔ یہودی خدا پر ایمان لانے سے نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کی نسبت سے یہودی ہیں۔ عیسائی حضرت موسیٰ کو بھی نبی مانتے ہیں لیکن ایک نئے ظہور (حضرت عیسیٰؑ) پر ایمان لانے کی وجہ سے یہودیوں سے الگ امت بن گئے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان کی شق کو نکال دیجئے۔ عیسائیوں کی جداگانہ ہستی ختم ہو جائے گی۔ مسلمان، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن چونکہ ان کے بعد ایک نئے ظہور (محمدؐ رسول اللہ) پر بھی ایمان رکھتے ہیں اس لئے یہ ان دونوں سے ایک الگ امت بن گئے ہیں۔ اب اگر محمدؐ رسول اللہ کے بعد کوئی شخص ایک نئے ظہور پر ایمان لائے گا تو وہ ایک نئی ملت کا فرد ہو گا۔ اس نئے ظہور پر ایمان لانے کے باوجود (محض چند سیاسی مفاد کی خاطر) اپنے آپ کو سابقہ ملت قرار دینا . . . . اور بوالعجبی یہ کہ اس سابقہ ملت کو اس نئے ظہور پر ایمان نہ لانے کی پاداش میں اس ملت کے دائرے سے خارج قرار دیدینا اور اس کی جگہ خود ہی وہ ملت بن بیٹھنا) انتہائی بد دیانتی اور منافقت ہے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ کسی نئے رسول پر ایمان لانے سے، سابقہ رسل اور ان کی کتب کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ نقطہ یہ کہ سابقہ رسولوں اور ان کی کتابوں کی جن باتوں کو یہ نیا رسول صحیح قرار دے

ان ہی کو صحیح سمجھا جائے (مثلاً) آج ہم حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے کوائف حیات اور توریت و انجیل کی تعلیمات میں سے صرف ان ہی ....

.... باتوں کو درست سمجھتے ہیں جن کی تصدیق قرآن کریم کرتا ہے۔ باقی حصے ہمارے نزدیک یا تو محرف ہیں یا منسوخ۔ بعینہٖ یہی پوزیشن میرزائی صاحبان میرزا صاحب کی آمد کے بعد رسولؐ عربی اور قرآن کریم کی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میرزا محمود احمد صاحب اس باب میں لکھتے ہیں۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کوئی نبی آجائے تو پہلے نبی کا علم بھی اسی کے ذریعے سے ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا۔ اور بعد میں آنے والا نبی پہلے نبی کے لئے بمنزلہ سوراخ کے ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعے دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں سوائے اس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا۔ اور کوئی حدیث نہیں سوائے اس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں نظر آئے اور کوئی نبی نہیں سوائے اس کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دکھائی دے اس طرح رسول کریمؐ کا وجود اسی ذریعہ سے نظر آئے گا کہ حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اگر کوئی چاہے کہ آپ سے علیحدہ ہو کر کچھ دیکھ سکے تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی قرآن کو بھی دیکھے گا تو وہ اس کے لئے یھدی من یشآء والا قرآن نہیں ہوگا بلکہ یضل من یشآء والا قرآن ہوگا۔

(میاں محمود احمد صاحب کا خطبہ جمعہ مندرجہ الفضل بابت ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

اس کے بعد آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ ان لوگوں کو یہ کہنے کا کس طرح حق پہنچ سکتا ہے کہ یہ امت محمدیہ ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے سرکاری ملازمت میں عیسائیوں کے لئے کسی مخصوص اسامی کے لئے کوئی مسلمان یہ کہکر امیدوار بن بیٹھے کہ میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہوں لہٰذا عیسائی ہوئی۔

پھر لطف یہ کہ اس نبوت کو مرزا صاحب وہبی نہیں بلکہ اکتسابی قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ نبوت نہیں جو خدا سے ملے بلکہ وہ نبوت جسے دوسرے نبی سے حاصل کیا جائے۔ اور اس کی سند خاتم النبیین سے لاتے ہیں۔ یعنی جس خاتم النبیین سے امت قرون اولیٰ سے آج تک اختتام نبوت سمجھتی چلی آئی ہے اور جس پر خود قرآن شاہد ہے۔ اسی خاتم النبیین سے میرزا صاحب اجرائے نبوت ثابت کرتے اور اپنی نبوت کی دلیل لاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اتباع نبی اکرمؐ سے خود نبی بن گیا ہوں۔

نبوت اکتسابی نہیں ہوتی نبوت کے متعلق جو کچھ سابقہ مجلدات میں لکھا جا چکا ہے (بالخصوص عنوان وحی جلد دوم میں) اس پر غور کیجئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے

کہ نبوت کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ اکتسابی ملکہ نہیں بلکہ خالصتہً وہبی کمال ہے۔ اگر نبوت اتباع نبوی سے مل سکے تو جو شخص چاہے اس طرح نبوت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے کسی کو نبوت کسب و ہنر اور ذاتی کوشش سے نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت ملنے سے پہلے خود نبی کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ اسے نبوت ملنے والی ہے۔ (۴۲/۵۲) (تفصیل اس اجمال کی پہلے گزر چکی ہے اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں) خاتم النبیین کے معنی ہیں "نبیوں کی مہر" مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی مہر سے دوسرے لوگ بھی نبی بن سکتے ہیں یہ مفہوم نہ عربی لغت کی رو سے درست ہے اور نہ ہی قرآن کی رو سے جائز۔ ختم کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے۔[۵] قرآن کریم میں خاتم کا لفظ خاتم النبیین کے علاوہ اور کہیں نہیں آیا لیکن اسم کے معنوں میں ختام اور فعل کے معنوں میں ختم یختم کئی جگہ آیا ہے۔ ان مقامات سے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ خاتم۔ ختام اور ختم کے کیا معنی ہیں۔ سورۂ تطفیف میں جنت کی شراب کے متعلق کہا ہے "رحیق مختوم" سربمہر شراب۔ سربمہر کے معنی ہیں (Sealed) اس سے آگے ہے۔ ختامہٗ مسک جس کی مہر مشک کی ہے۔ معنی بالکل واضح ہیں۔ کسی چیز کو بند کر کے اس پر جو مہر (Seal) لگائی جاتی ہے اسے ختام کہتے ہیں اور وہ شے مختوم (Sealed) ہو جاتی ہے ختم اللہ علی قلوبھم متعدد بار آیا ہے جس کے معنی دلوں پر مہر کر دینے کے ہیں۔ یعنی وہی جو دوسری جگہ طبع اللہ علی قلوبھم کے الفاظ میں آیا ہے۔ یا (الیوم نختم علی وجوھھم (یسٓ)۔ اس دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے" معنی بالکل واضح ہیں۔ ختم اللہ علی سمعھم (اللہ نے ان کے کانوں پر مہر لگا دی) کے معنی بھی کان بند کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ہے والذین لا یؤمنون فی اٰذانھم وقر (جو ایمان نہیں لاتے ہم ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیتے ہیں) دیکھئے ہر مقام پر ختم، ختام کے معنی بند کرنے کے ہیں۔ مجازاً نگینہ دار انگوٹھی کو بھی خاتم کہتے ہیں کیونکہ نگینہ کی مہر سے تحریر کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ ان مقامات سے خاتم النبیین کے معنی واضح ہیں۔ یعنی جس پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ خود مرزا صاحب بھی اس کے یہی معنی سمجھتے تھے۔ ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۴ پر انہوں نے یہ آیت درج کی ہے اور اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین

یعنی محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا نبیوں کا۔ (۳۳/۴۰)

اب اس "ختم نبوت" کی تشریح خود ان ہی کی زبان سے سنئے حمامۃ البشریٰ صفحہ ۳۴ پر فرماتے ہیں۔

---

۵ دیکھو لسان العرب و اساس البلاغۃ زمخشری

کیا تو نہیں جانتا کہ پروردگار رحیم و صاحب فضل نے ہمارے نبیؐ کا بغیر کسی استثناء کے خاتم النبیین نام رکھا اور ہمارے نبی نے اہل طلب کے لئے اس کی تفسیر اپنے قول لا نبی بعدی میں واضح طور پر فرمادی۔ اور اگر ہم اپنے نبی کے بعد کسی نبی کا ظہور جائز قرار دیں تو گویا ہم باب وحی بند ہو جانے کے بعد اس کا کھلنا جائز قرار دیں گے۔ اور یہ صحیح نہیں جیسا کہ مسلمانوں پر ظاہر ہے۔ اور ہمارے رسول کے بعد نبی کیونکر آسکتا ہے، دراں حالیکہ آپ کی وفات کے بعد وحی منقطع ہو گئی اور اللہ تعالےٰ نے آپ پر نبیوں کا خاتم فرمادیا۔

اور دیکھئے۔ کتاب البریہ صفحہ ۱۸۴ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

آنحضرت نے بار بار فرمادیا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور حدیث لا نبی بعدی ایسی مشہور تھی کہ کسی کو اس کی صحت میں کلام نہ تھا۔ اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے اپنی آیت ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین سے بھی اس کی تصدیق کرتا تھا کہ فی الحقیقت ہمارے نبی پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔

ازالہ اوہام صفحہ ۵۳۴ پر رقمطراز ہیں

حسب تصریح قرآن کریم رسول اسی کو کہتے ہیں جس نے احکام وعقائد دین جبریل کے ذریعے حاصل کئے ہوں۔ لیکن وحی نبوت پر تو تیرہ سو برس سے مہر لگ گئی ہے۔ کیا یہ مہر اس وقت (نزول مسیح کے وقت) ٹوٹ جائے گی۔

پھر ارشاد ہے۔

اور اللہ کو شایاں نہیں کہ خاتم النبیین کے بعد نبی بھیجے اور نہیں شایاں کہ سلسلۂ نبوت کو دوبارہ از سرنو شروع کردے بعد اس کے کہ اسے قطع کر چکا ہو۔ اور بعض احکام قرآن کریم کے منسوخ کردے اور ان میں بڑھادے

(آئینہ کمالات احمدیہ صفحہ ۳۷۷)

دوسرے مقام پر اعلان ہوتا ہے

میرا یقین ہے کہ وحی رسالت حضرت آدم صفی اللہ سے شروع ہوئی اور جناب رسول اللہ محمد مصطفیٰ پر ختم ہو گئی۔

(اشتہار مورخہ ۲ر اکتوبر ۱۸۹۱ء)

اسی طرح ایک اور جگہ

اور میں ایمان لاتا ہوں اس بات پر کہ آنحضرت نبیوں کے خاتم ہیں اور کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵)

"الوہیت" کے صفحہ ۱۱ پر لکھا ہے۔

آنحضرت کی نبوت پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہے۔ اور ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ جس چیز کا ایک آغاز ہے اس کے لئے ایک انجام بھی ہے۔

"حقیقت الوحی" کے صفہ ۶۴ پر فرماتے ہیں۔

وان رسولنا خاتم النبیین وعلیہ انقطعت سلسلۃ المرسلین

آنحضرت خاتم النبین تھے اور ان پر انبیاء کا سلسلہ ختم ہوچکا۔

رسول اللہ کے بعد مدعی نبوت کے متعلق ارشاد ہے۔

میں رسول اللہ کے بعد کسی دوسرے مدعیٔ نبوت کو کافر دکاذب سمجھتا ہوں۔ (زین الحق صفہ ۲۷)

نیز:

کیا ایسا وہ شخص جو قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہے اور آیہ ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کو خدا کا کلام یقین کرتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی آنحضرت کے بعد رسول اور نبی ہوں۔

(انجام آتھم صفہ ۲۷ حاشیہ)

مزید

مجھے کب جائز ہے کہ میں نبوت کا دعویٰ کرکے اسلام سے خارج ہو جاؤں اور کافروں کی جماعت سے جا ملوں۔ (ترجمہ، حمامۃ البشریٰ صفہ ۹۶)

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ خاتم النبیین کی ایسی واضح تشریح اور ختم نبوت کے متعلق اس قدر حتمی اور یقینی تصریحات کے بعد میرزا صاحب کس طرح مدعیٔ نبوت بن گئے؟ لیکن آپ کی اس حیرت کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں جبکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ باایں ہمہ تشریحات و تصریحات مدعی نبوت بنے اور بڑے دھڑلے سے بنے۔ اب آپ نے خود دیکھ لیا ہوگا کہ ان لوگوں کے لٹریچر میں کس قسم کا تضاد موجود ہے۔ اس قسم کے تضاد کی مثال آپ کو شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اسی بنا پر بعض اطباء اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان تحریروں کے مصنف کے دماغ میں خرابی تھی۵ اور اس کے معترف خود مرزائی حضرات بھی ہیں۔ چنانچہ سیرۃ المہدی مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد قادیانی میں لکھا ہے

ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے کئی دفعہ حضرت مسیح موعود سے سنا ہے کہ مجھے ہسٹریا ہے۔ بعض اوقات آپ مراق بھی فرمایا کرتے تھے۔ (صفہ ۵۵)

خرابی حافظہ کے متعلق مرزا صاحب نے خود لکھا ہے کہ

۵ دیکھئے "سودائے مرزا" مصنفہ حکیم محمد علی امرتسری۔

میرا حافظہ بہت خراب ہے۔ اگر کئی دفعہ کسی سے ملاقات ہو تب بھی بھول جاتا ہوں.... حافظہ کی یہ ابتری ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔

(مکتوبات احمدیہ جلد پنجم ع ۳ صفحہ ۲۱)

یہیں سے میرزا صاحب کے دعویٰ نبوت کی بھی "دلیل" مل جاتی ہے۔ مالیخولیا کے مریضوں کے متعلق طب کی مشہور کتاب اکسیر اعظم جلد اول صفحہ ۱۸۸ میں لکھا ہے۔

مریض صاحب علم ہو تو پیغمبری اور معجزات و کرامات کا دعویٰ کردیتا ہے۔ خدائی دعویٰ کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی تبلیغ کرتا ہے۔

آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ خود میرزا صاحب کا بیان ہے کہ انہیں ہسٹریا اور مراق کا مرض ہے ایسے مریض کے دعویٰ نبوت کے متعلق اکسیر اعظم کا بیان بھی آپ نے دیکھ لیا۔ اب اس کی تصدیق خود میرزائی صاحبان سے بھی سن لیجئے

ایک مدعی الہام کے متعلق اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس کو ہسٹریا یا مالیخولیا یا مرگی کا مرض تھا تو اس کے دعوے کی تردید کے لئے کسی اور ضرب کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ یہ ایک ایسی چوٹ ہے جو اس کی صداقت کی عمارت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتی ہے۔

(مضمون ڈاکٹر شاہ نواز صاحب قادیانی۔ مندرجہ رسالہ ریویو اوف ریلیجز بابت اگست ۱۹۲۶ء)

منعم علیہم ایک دلچسپ دلیل اور بھی سنئے۔ سورۂ فاتحہ میں مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے کہ وہ دعا مانگیں اهدنا الصراط المستقیم اور صراط مستقیم کے متعلق ارشاد ہے صراط الذین انعمت علیهم (ان لوگوں کی راہ جن پر اللہ نے انعام کیا) اور دوسری جگہ ہے کہ "جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے تو اسے بلاشبہ ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہو جاتی ہے جن پر خدا نے انعام کیا ہے۔ وہ نبی ہیں اور صدیق، شہید، اور صالحین۔ اور جس کسی کے ساتھی ایسے لوگ ہوں ایسے ساتھی کیا ہی اچھے ساتھی ہیں" (۴/۶۹)

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ

(۱) جس طرح صدیق، شہدا، صلحا کے راستے پر چل کر ایک مومن خود صدیق، شہید یا صالح بن سکتا ہے اسی طرح انبیاء کے راستہ پر چل کر وہ نبی بھی بن سکتا ہے۔

(۲) جس طرح صدیقین، شہدا، صلحا کی معیت (ساتھ) سے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مرد مومن خود صدیق شہید، صالح ہو۔ اسی طرح انبیاء کی معیت کے یہ معنی ہیں کہ وہ نبی بھی ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے یہ دلیل اور اس سے مستنبط نتائج دونوں غلط ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ جس کے راستہ پر کوئی چلتا ہے

وہ خود بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں صراط مستقیم پر چلنے کی دعا ہر مسلمان کو سکھائی گئی ہے اور صراط مستقیم کے متعلق اسی قرآن میں ہے کہ

إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱۱)

بے شک میرا رب صراط مستقیم پر ہے۔

یعنی صراط مستقیم خود خدا کی راہ ہے۔ اللہ خود صراط مستقیم پر ہے۔ اگر یہ دلیل صحیح مانی جائے کہ جو جس کے راستے پر چلتا ہے خود بھی وہی بن سکتا ہے۔ تو صراط مستقیم پر چلنے والے انسان کو خدا بھی بن جانا چاہیئے (نعوذ باللہ من ذالک)

اب سنئے دوسرا نتیجہ۔ یعنی جو جس کی معیت میں ہوتا ہے خود بھی وہی کچھ بن سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (۲۶)

محمد اللہ کے رسول اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلہ میں سخت اور ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں۔

تو اس دلیل سے یہ ماننا پڑے گا کہ نبی اکرم کی معیت میں جس قدر صحابیؓ تھے سب کے سب نبی تھے۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن کریم میں ہے ان اللہ مع المومنین۔ ان اللہ مع الصابرین بلکہ یہاں تک کہ ہو معکم اینما کنتم جہاں بھی تم ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے) اگر یہ دلیل صحیح مانی جائے کہ جو جس کے ساتھ ہوتا ہے وہ وہی بن جاتا ہے تو تمام مومنین (بلکہ تمام انسان) خدا بن سکتے ہیں۔ اور اگر نبی کی اطاعت سے انسان نبی بن سکتا ہے تو اسی منطق کی رو سے خدا کی اطاعت سے انسان کو (معاذ اللہ) خدا بھی بن جانا چاہیئے۔ یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ انسان خدا کی اطاعت سے خدا نہیں بن سکتا بلکہ وہ صرف اتنے مدارج ہی طے کر سکتا ہے جتنے مدارج کی قرآن کریم میں تصریح ہے۔ اسی طرح نبی کی اطاعت سے بھی انسان نبی نہیں بن سکتا کہ نبوت تو ختم ہو گئی نبوت کے نیچے جتنے مقام ہیں جن کی تصریح قرآن نے بیان کر دی ہے ان مقامات تک ہی پہنچ سکتا ہی چنانچہ خبط نبوت سے پہلے خود میرزا صاحب بھی انعام خداوندی کو ان ہی مقامات تک محدود سمجھتے تھے۔ چنانچہ حمامۃ البشریٰ صفحہ ۷۹ پر ارشاد ہے۔

.....اور ہمیں محمدؐ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کیونکہ آپ کی برکات ہر زمانہ پر محیط اور آپ کے فیض ادبیار اور اقطاب اور محدثین کے قلوب پر... وارد ہیں۔

اور اسی لئے اپنے آپ کو بھی ایک ولی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

ان پر واضح رہے کہ ہم بھی نبوت کے مدعی پر لعنت بھیجتے ہیں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کے قائل ہیں اور آنحضرت کے ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور وحی نبوت نہیں بلکہ وحی ولایت جو زیر سایہ نبوت محمدیہ اور بہ اتباع آنحضرت، اولیاء اللہ کو ملتی ہے۔ ہم اس کے قائل ہیں اور اس سے زیادہ جو شخص ہم پر الزام لگائے وہ تقویٰ اور دیانت کو چھوڑتا ہے۔

(اشتہار مرزا صاحب مورخہ ۲۰ شعبان ۱۳۱۴ھ)

لیکن جب مرزا صاحب خود نبی بن بیٹھے تو ان حدود کی توجیہ یوں کر دی گئی۔

پہلے نبیوں کی امت کے لوگ ایک حد تک پہلے نبی کی تربیت کے نیچے ترقی پاتے پاتے رک جاتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر نظر فرماتا تھا اور جن کو اس قابل پاتا کہ وہ نبی بن سکیں ان کو اپنے فضل سے بڑھاتا اور براہ راست نبی بنا دیتا تھا۔

لیکن ہمارے آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس مقام بلند پر کھڑا کیا اور آپ نے استادی کا ایسا اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا کہ آپ اپنے شاگردوں کو اس امتحان میں پاس کر سکتے ہیں..... ان کے یعنی گزشتہ انبیاء کے مدرسہ کا آخری امتحان نبوت نہ تھا بلکہ ولایت تھا۔ پھر نبوت بلا واسطہ موہبت سے ملتی تھی لیکن ہمارے آنحضرت کو ایسا درجہ استادی ملا کہ مدرسہ کو کالج تک بڑھا دیا گیا۔ اور آپ کی شاگردی میں انسان نبی بھی بن سکتا ہے۔

(القول الفیصل صہ ۱۵-۱۷ مصنفہ میرزا محمود احمد خلیفہ قادیان)

لیجئے۔ اب نبوت کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک نبی اکرمؐ سے پہلے کی نبوت جو وہبی طور پر ملتی تھی اور ایک رسول اللہؐ کے بعد کی نبوت جو اکتساباً ملتی ہے۔ آپ ذرا دجل و فریب کے اس لطیف پردے پر نگاہ رکھئے کہ اپنی نبوت کے جواز میں مسلمانوں کے جذبات کو کس طرح ہاتھ میں رکھا گیا ہے۔ یعنی مسلمانوں سے کہا یہ گیا ہے کہ میرزا صاحب کی نبوت تو نبی اکرمؐ کی عظمت کی دلیل ہے۔ جو بات کسی اور نبی کو حاصل نہ تھی وہ رسول اللہؐ کو حاصل ہو گئی۔ یعنی بالفاظ دیگر جو چیز پہلے خدا نے اپنے اختیار میں رکھی ہوئی تھی اسے رسول اللہؐ کے اختیار میں دیدیا۔ ظاہر ہے کہ اس دلیل سے سادہ لوح مسلمان ضرور فریب کھا جائے گا۔ اس لئے کہ اسے رسول اللہؐ سے ایسی عقیدت ہے کہ وہ حضورؐ کے علو مرتبت کے اس زنگاہ فریب دام تزویر کو حقیقت پر محمول کر لے گا۔ اور جھٹ سے نبوت میرزا کا قائل ہو جائے گا۔ لیکن جب میرزا کی نبوت پر ایمان لے آئے گا تو رفتہ رفتہ اس نئے نبی کو تیرہ سو سال پرانے نبی پر ترجیح دے گا۔ اور یوں جذباتی طور پر اسے بھی مان لے گا کہ میرزا صاحب کا رتبہ رسول اللہؐ سے بھی بڑا ہے۔ اس لئے کہ خود میرزا صاحب کا ارشاد ہے کہ

ہلاک ہو گئے وہ جنہوں نے ایک برگزیدہ رسول کو قبول نہ کیا۔ مبارک ہیں وہ جس نے مجھے پہچانا میں

خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں اور اسی کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بدقسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۵۶)

اور اس کی تشریح میں خلیفہ صاحب فرماتے ہیں۔

(میرزا صاحب کے متعلق) "آخری زمانہ کا نبی" ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے توسط کے بغیر کسی کو نبوت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب کوئی نبی ایسا نہیں آسکتا جو یہ کہے کہ رسول اللہ سے براہ راست تعلق پیدا کر کے نبی بن سکا۔ حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں۔ میری اتباع کے بغیر کسی کو قرب الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس آئندہ خواہ کوئی نبی ہو اس کے لئے حضرت مسیح موعود پر ایمان ضروری ہے۔

(الفضل۔ بابت ۷ رمئی ۱۹۳۳ء)

ہم نے دل پر جبر کر کے ان اقتباسات کو معارف القرآن میں جگہ دی ہے اور یہ محض اس لئے کہ وہ سادہ لوح مسلمان جوان لوگوں کے چند تراشے ہوئے فقروں اور گھڑی ہوئی دلیلوں سے ان کے دام ہمرنگ زمین کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خود دیکھ سکیں کہ یہ لوگ، خدا، رسول، قرآن اور اسلام کے ساتھ کس قدر مذاق کر رہے ہیں۔ یہ مدعی نبوت نہ نبوت کے مقام کو سمجھتا ہے نہ اس کے منصب کو۔ نہ اسے قرآن کا کچھ علم ہے نہ نظام دین کا کوئی پتہ۔ نہ اسے اپنے ہی متعلق یاد رہتا ہے کہ میں آج کیا کہہ رہا ہوں اور کل کیا کہہ گیا تھا؛ پھر ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کو کافر بھی کہتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے مخصوص سیاسی اور معاشی مراعات ومفاد کے حصول کے لئے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کراتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) مشرکین اور کفار نے اسلام کو کبھی اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جس قدر منافقین نے پہنچایا ہے۔ قرآن کریم کو دیکھئے وہ شروع ہی سے مسلمانوں کو ان کی سازشوں سے آگاہ کرتا چلا آیا ہے۔ یہی وہ منافق ہیں جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ بڑھ بڑھ کر قسمیں کھائیں گے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم رسول اللہ کو خدا کا رسول مانتے ہیں۔ (نشہد انک لرسول اللہ) لیکن خدا شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں (واللہ یشہد ان المنافقین لکذبون ۶۳/۱) یہ اپنی ان جھوٹی قسموں کو خطرات سے بچنے کی سپر بناتے ہیں (اتخذوا ایمانہم جنۃ ۶۳/۲)، یہ اس لئے کہ یہ لوگ ایمان کے بعد پھر چکے ہیں اور کھلا ہوا کفر اختیار کر چکے (ذالک بانہم امنوا ثم کفروا ۶۳/۳) یہ وہ ہیں کہ ہر جگہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ امنا باللہ وبالیوم الآخرۃ (۲/۸) (ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ ما ھم بمومنین (۲/۸)۔ یہ قطعاً مومن نہیں ہیں۔ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں (واذا لقوا الذین امنوا قالوا آمنا۔ ۲/۱۴) لیکن جب اپنے زعماء کے پاس جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تو ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ واذا خلوا الیٰ شیاطینہم قالوا انا معکم انما

نحن مستہزءون (۲/۱۴)۔ آپ ان لوگوں سے بات کیجئے ان میں عجیب قسم کی نفسیاتی کیفیت محسوس کریں گے۔ ضد۔ ہٹ دھرمی۔ کور فہمی۔ نہ دلیل و برہان سے کوئی واسطہ نہ علم و عقل سے کوئی تعلق۔ قرآن اس نفسیاتی کیفیت کو "دل کی بیماری" سے تعبیر کرتا ہے (۲/۱۰) اگر ان میں کچھ ذہنی دیانت (Intellectual honesty) بھی ہوتی تو یہ لوگ بہائیوں کی طرح کھلے طور پر قرآن سے انکار کر کے ایک الگ گروہ بن جاتے اس صورت میں ان کا شمار منافقین میں نہ ہوتا منکرین میں ہوتا اور ان کی طرف سے آنے والے خطرات کی نوعیت بھی ایک کھلے ہوئے دشمن کے وار کی سی ہوتی۔ مارِ آستین کے نیش کی سی نہ ہوتی۔ غور کیجئے کہ گزشتہ پچاس سال سے ان لوگوں نے ملتِ اسلامیہ کی توجہات کو کن لاحاصل مباحث پر مرکوز کر کے اس کی قوت و توانائی کو کس بری طرح سے ضائع کیا ہے! یہ ان کی بڑی گہری سازش تھی۔ ادھر ہمارا سادہ لوح مُلّا۔ وہ بھلا ان حربوں کو کیا سمجھ سکتا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ یہ بحث خاتَم بالفتح اور خاتِم بالکسرہ کی ہے اور نہ سمجھ سکا کہ اس بحث کے پردہ میں کھیل کیا کھیلا جا رہا ہے۔ اسی حقیقت کو سب سے پہلے اس حکیم امت نے بھانپا جسے قرآن نے مومنانہ فراست سے نوازا تھا۔ مولوی صاحبان کی پچاس برس

علامہ اقبال کا بیان

کی بحث ایک طرف اور علامہ اقبالؒ کا ایک بیان[1] ایک طرف۔ اس بیان نے اس فریب کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں اور مسلمانوں نے حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کوئی مذہبی تحریک ہے ہی نہیں۔ اس لئے ان سے مذہب کی راہ سے بحث ہی لاحاصل ہے۔ اس تحریک کے پس منظر کو سامنے رکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ انیسویں صدی (سلطان ٹیپو کی شکست کے بعد جو ۱۷۹۹ء میں واقع ہوئی تھی) مسلمانوں پر نکبت اور زوال کی قیامت لیکر آئی اور انہیں اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ اس تغیرِ حالات نے ان کے دلوں میں بہت سے سوالات پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ کیا خلافت کی بنیاد مذہب پر ہے؟ مسلمانانِ عالم کا بالعموم اور مسلمانانِ ہندوستان کا بالخصوص ترکی خلافت سے کیا تعلق ہے؟ کیا ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام۔ قرآن نے جو اولی الامر منکم کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہے؟ اسلام میں جہاد سے کیا مراد ہے؟ ظہورِ مہدی کے متعلق روایات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

یہ اور اسی قبیل کے اور سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق تھے لیکن مغربی استعماریت جو اُس زمانہ میں آہستہ آہستہ عالمِ اسلامی میں اپنے قدم جما رہی تھی ان سوالات سے گہری

---

[1] Ahmadism and Islam

دلچسپی رکھتی تھی۔ ان سوالات نے بحث و نظر کے جن دروازوں کو کھولا وہ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ میں ایک دلچسپ باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ داستان طول طویل ہے اور ابھی تک کسی پر زور قلم کی محتاج۔ وہ مسلم سیاستدان جن کی نگاہیں ان حالات کی واقعیت پر مرکوز تھیں انہوں نے علماء کے طبقہ کو اس باب میں اپنا ہم خیال بنا لیا کہ وہ اس قسم کے مذہبی دلائل وضع کر لیں جو حالات کے سازگار ہوں لیکن محض منطق کے ذریعے ان معتقدات کو دلوں سے نکال دینا جو صدیوں سے مسلم عوام کے تحت الشعور میں جاگزیں تھے آسان کام نہ تھا...... ان معتقدات کے استیصال کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مذکورہ صدر سوالات کے جوابات کو جدید سیاسی رنگ دیا جائے اور اس کے لئے وحی کی سند بہم پہنچائی جائے۔ یہ وحی کی سند احمدیت نے مہیا کر دی۔ چنانچہ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس طرح برطانوی استعماریت کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے..... مسلمانوں کے مذہبی افکار کی تاریخ میں احمدیوں نے جو کارنمایاں کیا ہے وہ یہی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ غلامی کے لئے وحی کی سند پیش کر دی جائے۔ (احمدیت اور اسلام)

ہوا یہ کہ انگریزوں نے جب یہاں اپنے قدم جمانے شروع کئے تو ان کی نگہ دور بیں نے بھانپ لیا کہ ہر چند مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو رہا ہے لیکن با ایں ہمہ، اس راکھ کے نیچے دبی ہوئی ایسی چنگاریاں ہنوز موجود ہیں جو پھر سے بھڑک اٹھ سکتی ہیں۔ پہلے ان کا یہ خدشہ محض نظری تھا لیکن حضرت سید احمد بریلویؒ کی تحریک جہاد اس خدشہ کو واقعہ کی صورت میں سامنے لے آئی اس تحریک کو کس طرح سے ختم کیا گیا اور اس کے بعد جن جن افراد کے متعلق دور کا گمان بھی ہو سکتا تھا کہ انہیں اس تحریک سے ہمدردی تھی، ان پر کس کس قسم کے ظلم توڑے گئے، یہ ایک حدیث ہے الم انگیز اور ایک داستان ہے جگر خراش جو الگ فرصت کی محتاج ہے۔ اس تحریک کو تو انگریزوں نے ختم کر دیا۔ لیکن اس خطرے کے امکان کا خیال ان کے دل سے دور نہ ہوا۔ چنانچہ ہنٹر کی مشہور کتاب Our Indian Musalmans) اور "تحریک وہابیت کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ" انگریزوں کے اس خطرہ اندیشی کی صاف غماز ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس خطرہ کا اصلی سبب مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جہاد، دین کا سب سے بڑا فریضہ اور جنت کا کفیل ہے۔ اور اس فریضہ کی تکمیل اس وقت ہوگی جب مہدی آخر الزمان آئیں گے اور پھر ساری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک مسلمانوں کے دلوں میں یہ عقائد موجود ہیں، انگریزوں کی سلطنت کو بقا حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذہ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں ایک ایسا مہدی دیدیا جائے جو جہاد کو حرام قرار دیدے اور انگریزوں کی وفاداری کو عین اسلام ثابت کر دے۔ انگریزی استعمار کی یہ ضرورت تھی جسے تحریک قادیانیت نے پورا کر دیا۔ انگریزی سیاست نے مسلمانوں کی توجہ کو نظری مسائل میں الجھائے رکھنے کے لئے پادریوں کے جھنڈ کے جھنڈ یہاں بھیج رکھے تھے۔ چنانچہ آپ انیسویں صدی کے آخری ربع میں دیکھیں گے تو پوری

پوری قوم پادریوں کے ساتھ مناظروں میں الجھی ہوئی دکھائی دے گی۔ میرزا غلام احمد صاحب نے سب سے پہلے عیسائیت کی مخالفت کے رنگ میں اپنے آپ کو متعارف کرایا اور جب اس طرح سے مسلمانوں کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا تو پھر انہیں آہستہ آہستہ جہاد کی حرمت اور انگریزوں کی وفاداری کی افیون پلانی شروع کی۔ اور اس مقصد کے لئے کہ اس افیونی اثر کو عقیدت کی گہرائیاں بھی میسر ہو جائیں، مجددیت، مہدویت، بروزیت، مسیح موعودیت اور بالآخر نبوت کے جال پھیلائے گئے۔ چنانچہ سادہ لوح مسلمان اس جال میں پھنستے گئے اور جو نہ پھنسے ان کی تمام قوتیں اس تحریک کی مخالفت میں ضائع ہو گئیں۔ یہی انگریز کا مقصود تھا کہ مسلمان کو اس طرح الجھایا جائے کہ اس کی توجہ کسی اور طرف ہٹنے ہی نہ پائے۔

اس پس منظر میں جب آپ میرزائی لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر عجیب "نوادرات" منکشف ہوں گے اور آپ خود دیکھ لیں گے کہ اس تحریک سے مقصد کیا تھا۔ ہمارے لئے اس باب میں استقصار ناممکن ہے اس لئے کہ اس کے لئے اس لٹریچر کے صفحوں کے صفحے نقل کرنے پڑیں گے اور یہ مشکل ہے اس لئے ہم چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ میرزا صاحب لکھتے ہیں۔

استعمار انگریز کے آلۂ کار

میں نے برابر سولہ برس سے اپنے پر حق واجب ٹھہرا لیا کہ اپنی قوم کو اس گورنمنٹ کی خیر خواہی کی طرف بلاؤں اور ان کی سچی اطاعت کی طرف ترغیب دوں۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کے انجام کے لئے اپنی ہر ایک تالیف میں یہ لکھنا شروع کیا کہ اس گورنمنٹ کے ساتھ کسی طرح مسلمانوں کو جہاد درست نہیں۔

(اشتہار مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء)

سنہ ۱۸۹۸ء میں لکھتے ہیں۔

میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیردوں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کو دور کر دوں ......

اور میں نے نہ صرف اس قدر کام کیا کہ برٹش انڈیا کے مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی اطاعت کی طرف جھکایا بلکہ بہت سی کتابیں عربی فارسی اور اردو میں تالیف کر کے ممالک اسلامیہ کے لوگوں کو بھی مطلع کیا کہ ہم لوگ کیونکر امن و امان اور آرام اور آزادی سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہے ہیں

(درخواست بحضور نواب لفٹننٹ گورنر بہادر منجانب خاکسار میرزا غلام احمد مورخہ ۲۴ رفروری سنہ ۱۸۹۸ء)

پھر لکھتے ہیں۔

میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکھٹی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔

(تریاق القلوب صفحہ ۱۵)

اس سے بھی واضح الفاظ یہ ہیں۔

..... سو اگر ہم گورنمنٹ برطانیہ سے سرکشی کریں تو گویا اسلام اور خدا اور رسول سے سرکشی کرتے ہیں۔

(رسالہ بعنوان "گورنمنٹ کی توجہ کے لائق" صفحہ ۲)

اولوالامر منکم کی تفسیر

میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو اپنے اولوالامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں۔ (ضرورۃ الامام صفحہ ۲۳)

چنانچہ میرزا صاحب کتاب البریہ کے ضمیمہ کے صفحہ ۹ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ باتیں ان کے "مریدوں کی شرائط بیعت میں داخل ہیں"۔ اس حکومت کے اقبال و شوکت کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے اور ان دعاؤں کے جواب میں خدا کی طرف سے الہام بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

لہٰذا وہ اس الہام میں اشارہ فرماتے ہیں کہ اس گورنمنٹ کے اقبال اور شوکت میں تیرے وجود اور تیری دعا کا اثر ہے اور اس کی فتوحات تیرے سبب سے ہیں کہ جدھر تیرا منہ ادھر خدا کا منہ۔

(اشتہار مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء)

اور یہ چیز صرف میرزا صاحب کی زندگی تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان کے بعد بھی بدستور قائم چلی آتی ہے اس لئے کہ یہی اس تحریک کی غایت تھی۔ چنانچہ خلیفہ قادیان میرزا محمود احمد صاحب یکم اپریل ۱۹۳۰ء کے الفضل میں رقمطراز ہیں

ہم حکومت کی ایسی خدمت کرتے ہیں کہ اس کے پانچ پانچ ہزار روپیہ تنخواہ پانے والے ملازم بھی کیا کریں گے۔

اور یہ اس لئے کہ اس خدمت کو وہ اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ۲۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو قادیانی جماعت نے لارڈ ولنگڈن (وائسرائے ہند) کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جس میں انہوں نے لکھا کہ

جماعت احمدیہ کا سیاسی مسلک ایک مقررہ شاہراہ ہے جس سے وہ کبھی ادھر ادھر نہیں ہو سکتے اور وہ

حکومت وقت کی فرمانبرداری اور امن پسندی ہے۔

ان "مقاصد جلیلہ" کی سر انجام دہی کے لئے انہیں یقیناً حکومت کی مدد درکار تھی۔ چنانچہ اس کے لئے حکومت کی توجہ بار بار منعطف کرائی جاتی تھی خود میرزا صاحب نے ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء کی درخواست میں لکھا تھا کہ

(گورنمنٹ) اس خود کاشتہ پودہ کی نسبت نہایت حزم احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو ارشاد فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔

حکومت برطانیہ کی مدد

چنانچہ اس "خاص عنایت" کا اعتراف بھی ان کے ہاں موجود ہے۔ میاں محمود احمد صاحب (خلیفہ قادیان) "برکات خلیفہ" کے صفحہ ۶۵ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

گورنمنٹ برطانیہ کے ہم پر بڑے احسان ہیں اور ہم بڑے آرام اور اطمینان سے زندگی بسر کرتے اور اپنے مقاصد پورا کرتے ہیں..... اور اگر دوسرے ممالک میں تبلیغ کے لئے جائیں تو وہاں بھی برٹش گورنمنٹ ہی ہماری مدد کرتی ہے۔

چنانچہ وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ جب مالابار کے مسلمانوں نے میرزائیوں کی مخالفت کی تو

ڈپٹی کمشنر نے یہ حکم دیا کہ اب اگر احمدیوں کو کوئی تکلیف ہوئی تو مسلمانوں کے جتنے لیڈر ہیں ان سب کو نئے قانون کے ماتحت ملک بدر کر دیا جائے گا۔ (انوار خلافت صفحہ ۹۶)

اور یہ کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ یہ تحریک پہلی ہی اس حفاظت میں ہے۔

یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ فی الواقعہ گورنمنٹ برطانیہ ایک ڈھال ہے جس کے نیچے احمدی جماعت آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس ڈھال کو ذرا ایک طرف کر دو اور دیکھو زہریلے تیروں کی کیسی خطرناک بارش تمہارے سروں پر ہوتی ہے۔ (الفضل، مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

ان "حقائق" کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتے صرف ان احساسات کو پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو انہیں دیکھ کر خود احمدیوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ میاں محمود احمد صاحب اپنے ایک خطبہ جمعہ میں فرماتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فخریہ لکھا ہے کہ میری کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں میں نے گورنمنٹ کی تائید نہ کی ہو۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں نے غیروں سے نہیں بلکہ احمدیوں کو یہ کہتے سنا ہے (میں انہیں احمدی ہی کہونگا کیونکہ نابینا بھی آخر ان ہی کہلاتا ہے) کہ ہمیں حضرت مسیح موعود کی ایسی تحریریں پڑھ کر شرم آجاتی ہے۔ انہیں شرم کیوں آتی ہے؟ اس لئے کہ ان کے اندر کی آنکھ نہیں کھلی۔

اگر اندر کی آنکھ کھل جاتی تو وہ دیکھ لیتے کہ اس تحریک سے تو مقصد ہی یہی تھا پھر اس میں شرم کا ہے کی؟ یہ پودا تو لگایا

ہی اسی لئے گیا تھا۔ پھر اس کے ثمر آور پھلوں سے نفرت کیوں؟ ان اعتراضات کی مت پرواہ کرو۔

ہمارے مخالفین کا یہ ایک پرانا اعتراض ہے جو وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف پیش کرتے رہتے ہیں کہ آپ نعوذ باللہ[1] گورنمنٹ کے خوشامدی تھے اور اس وقت ہم سے جدا ہونے والا احمدیوں کا گروہ بھی ہم پر اعتراض کرتا ہے کہ تم گورنمنٹ برطانیہ کے خوشامدی ہو...... اسی طرح غیر احمدی بھی اعتراض کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود نے نہ ان اعتراضوں کی پرواہ کی اور نہ ہم پرواہ کرتے ہیں

(الفضل بابت ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۵ء)

یہ ان انگریزوں کی قوت کے استحکام کے لئے کیا گیا جن کی "اسلام دوستی" اور "مسلم نوازی" کسی تعارف اور تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس کے بعد آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ یہ بیچارے کیا سمجھ سکتے ہیں کہ قرآنی آئین حیات کیا ہے۔ طاغوتی نظام کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے! دنیا میں مسلمان کا نصب العین زندگی کیا ہے؟ مقام نبوت کیا ہے؟ نبوت کا مقام تو اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی۔ نگاہوں میں بصیرت۔ ذہن میں جلا۔ قلب میں روشنی۔ خون میں حرارت۔ بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی۔ فضا میں تابندگی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبی کا پیغام انقلاب آفریں دین و دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک دیتا ہے۔ اس سے قوم کے عروق مفلوج میں پھر سے خون حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دیدیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئین کائنات کو ضابطہ خداوندی ر[illegible]کل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ آرزوئیں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی مسرتوں کے چشمے ابلتے ہیں قلب و جگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ امیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چٹخنے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحن چمن، دامان صد باغبان و کف ہزار گل فروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے۔ حکومت الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانین خداوندی کا نفاذ اس کا منتہیٰ ہوتا ہے۔ جب اس کے ہاتھوں خدا کی

---

[1] نعوذ باللہ کے الفاظ کا استعمال سمجھ میں نہیں آیا۔ جب مرزا صاحب کو اس خوشامد پر فخر تھا تو پھر نعوذ باللہ کیوں؟ بعض اوقات حقیقت کیسے غیر شعوری طور[illegible] بے نقاب ہو جاتی ہے

بادشاہت کا تخت جلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت پہاڑوں کے غاروں میں سر چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصر فلک بوس کے کنگورے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتشکدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں وہ اپنے ساتھیوں کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قومیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے، ان انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی۔

مقام نبوت تو ایک طرف، شمع نبوی سے اکتساب ضیا کرنے والے مرد مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس کی شمشیر جگردار کے سامنے لرزہ براندام ہوتی ہیں۔ اس کی قوت بازو حکومت خداوندی کے تمکن و بقا کی کفیل ہوتی ہے۔ وہ قوانین خداوندی کا عملاً نفاذ کرتا ہے۔ یہ وہ "مجدد" ہوتا ہے جس کی قوت ایمانی اور بصیرت فرقانی سے محمد رسول اللہ والذین معہ کے عہد سعادت مہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مسیحا ہوتا ہے جس کے اعجاز نفس سے مردہ قوم میں از سر نو زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے وہ "مہدی" ہوتا ہے جو خود اللہ کے صراط مستقیم پر گامزن ہو کر ساری دنیا کے لئے ہدایت و رشادت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ مرکز ہوتا ہے جس کے گرد ایسی جماعت کا دائرہ کھنچ جاتا ہے جس کے متعلق فرمایا کہ

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ... (۵۴)

اللہ ان سے محبت رکھتا ہے اور وہ اللہ سے۔ وہ مومنوں کے سامنے جھکے ہوئے اور مخالفین کے مقابلہ میں غالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔

اس کے برعکس دیکھئے کہ آپ کو اس عہد کی مجددیت، مہدیت، مسیحیت اور نبوت سے

محکومی و مسکینی و نومیدی جاوید

کے سوا اور کیا ملا؟ یہ آنے والے آئے۔ آکر چلے بھی گئے اور قوم کی یہ حالت کہ

وہی نالہ سحری رہا وہی آہ نیم شبی رہی

کچھ ملنا تو ایک طرف، اس خاکستر پارینہ میں کہیں کوئی دبی ہوئی چنگاری تھی تو وہ بھی ان کے قدموں کی برکت سے بجھ بجھا گئی۔ یہ فرق ہے ایک زندہ قوم کے ارکان اور مردوں کی بستی کے افراد میں۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام — ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز

اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی — ہو جاتی ہے خاکِ چمنستاں شرر آمیز

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار — کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز

اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت — دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے

غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، نبی اکرمؐ کے بعد تو نبوت کا تصور بھی ذہن میں نہ لائیے۔ نبوت کی قسمیں نہیں ہوتیں۔ نبوت کی ایک ہی قسم ہے اور وہ اصلی اور حقیقی نبوت ہے جو اللہ کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے۔ ظلی۔ بروزی۔ تدریجی اتباعی نبوت کا تخیل غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں ان نبوتوں کا کوئی ذکر نہیں۔ باقی رہے مجدد اور مہدی سو ان کے متعلق بھی پہلے لکھا جا چکا ہے کہ "آنے والے" کا نظریہ بھی غیر قرآنی[1] ہے۔ رسول اللہ کی رسالت۔ قرآن کی دفتین میں قیامت تک کے لئے محفوظ ہے۔ اس رسالت کا عملی نفاذ قرآنی نظامِ حکومت کی شکل میں ہوگا۔ اس نظام کی وارث ملتِ اسلامیہ خیرِ امت ہے۔ بہترین قوم ہے۔ اس "بہترین قوم" کے منتخب افراد مہدی ہیں۔ مجدد ہیں۔ امام للناس ہیں۔ قوموں کی امامت و قیادت کرنے والے ہیں۔ ان کے لئے کوئی خاص وقت متعین نہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ یہ خیرِ امت اپنی حالت کو جیسا جی میں آئے رکھے۔ دنیا کی ذلیل ترین قوموں میں ان کا شمار ہو۔ بے کسی اور بے بسی۔ ذل و مسکنت۔ محکومی و غلامی کے عذابِ خداوندی میں گرفتار رہے۔ اس عذابِ خداوندی سے نجات حاصل کرنے کے لئے اسے کسی کوشش و عمل کی ضرورت نہیں۔ آخری وقت میں ایک آنے والا آئے گا اور ان کی ذلت و رسوائیوں کو شوکت و عظمت میں بدل دے گا۔ خود فریبی اور خدا فریبی ہے۔ کہ خدا کا یہ قانون واضح اور غیر مبہم طور پر ہمارے سامنے موجود ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے ضمیر میں انقلاب نہیں پیدا کرتی اس کے حوالی میں انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔ (۱۳/۱۱) جب تک آپ کے اندر تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔ جب تک آپ کے قلب و نگاہ میں تغیر واقع نہ ہوگا۔ آپ کی ذلت اور رسوائیاں کبھی سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل نہیں سکیں گی۔ جب آپ کے اندر یہ قرآنی انقلاب پیدا ہوگا تو آپ میں وہ مجددینِ ملت اور مہدیانِ امت پیدا ہوں گے جو پھر سے قرآن کے نظامِ حکومت کی احیاء و تدریج کریں گے

---

[1] علاوہ اس کے کہ کسی آنے والے، مہدی، مسیح یا مجدد کے عقیدے کی سند ہی قرآن سے نہیں ملتی یہ بھی سوچئے کہ جس شخص کی تعلیم وہ ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اُسے کسی مہدی یا مجدد سے کیا نسبت؟

[illegible]

اور جن کے نقش قدم میں ساری دنیا فلاح و سعادت کا راستہ دیکھیگی - آج مسلمانوں ہی کو نہیں ساری دنیا کو اس قسم کے نظام زندگی کی ضرورت ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ہر نظام کہن سے تنگ آچکا ہے اور اس کے بعد اس کے پاس کوئی ایسا نظام نہیں جو اس کے پیدا کردہ جہنم کو مبدل بہ جنت کر سکے۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدت گفتار ہے نے جدت کردار

دنیا کو ہے اس "مہدی برحق" کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

جب مسلمان پھر سے قرآن کے نظام حکومت کو قائم کرلیں گے تو اس وقت اسیر آن کے باب اور بہاء اللہ کی سمجھ میں بھی آجائے گا کہ قرآن، "ریلوے کے سابقہ ٹائم ٹیبل" کی طرح ساقط العمل نہیں ہوگیا بلکہ وہ فطرت انسانی کے تمام تقاضوں کے لئے ابدی اصول حیات اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور قادیانی نبوت پر بھی یہ حقیقت کھل جائے گی کہ رسالت محمدیہ کس طرح ابدیت سے ہم کنار ہے اور پھر دنیا کی ہر قوت سمجھ لے گی کہ اس کی زندگی کا راز اس ملت شریفہ کے ساتھ روابط حسنہ قائم کرنے میں ہے نہ کہ ابلیسی راہوں سے انہیں دام تزویر میں گرفتار کرنے کی مذموم کوششوں میں۔ وفیہا آیات لقوم یعقلون۔

اس نظام کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ یہ آج مسلمانوں کے ہاں کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟ یہ ساری دنیا میں کیسے پھیلایا جا سکتا ہے؟ دنیا کو اس کی کیوں ضرورت ہے؟ اس سے انسانیت کو کیا ملے گا؟ ان مباحث کے لئے معارف القرآن کی آئندہ مجلدات کا انتظار کیجئے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

معراجِ انسانیت

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا کائناتی شعور بیدار ہو جاتا ہے، اس میں ابتداءً کچھ خوف و حیرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ محمدؐ اسی لئے شروع شروع میں کچھ خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد، اس انسان کے ادراک میں ایک ایسی نورانیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔ اس انسان کے شعور کے سامنے، کائنات کا مقصود و مفہوم، بجلی کی سی چمک کے ساتھ، غیر مبہم طور پر بے نقاب ہو جاتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو محض عقیدۃً نہیں مانتا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ یہ عظیم القدر کائنات، جو عام نگاہوں میں، ایک غیر ذی حیات مادہ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں، فی الحقیقت حیات مشہود ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے کہ انسانی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے، اسے فنا نہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ محسوس کرتا ہے کہ کائنات جو کچھ دکھائی دیتی ہے فی الحقیقت ایسی نہیں۔ اس میں جن باتوں کو در اصل اہمیت دینی چاہیئے، وہ وہ نہیں جنہیں عام طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک زندگی کی اقدار، اور حقیقت کے متعلق اس کے شعور کے تمام تصورات بدل جاتے ہیں۔ جسے اس سے پہلے اصل سمجھا جاتا تھا وہ سراب بن جاتا ہے اور جسے سراب قرار دیا جاتا تھا وہ اصل اور حق بن جاتا ہے۔

لیکن شعور کی یہ بیداری کسی کے اندر خارج سے داخل نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک یکسر داخلی ملکہ ہوتا ہے۔ اس کے امکان کو جلا اور بالیدگی دی جا سکتی ہے کسبِ ہنر سے اسے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ حق کو باطل سے متمیز دیکھ لینا ہر ایک کا کام نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جسے اس قسم کی نگاہ عطا ہوتی ہے وہ یونہی مفت میں مل جاتی ہے اس کے لئے اسے بڑے بڑے صبر آزما مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے لئے جراءتِ فکر و بسالتِ احساس، دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے آپ کو مادہ کی چار دیواری سے بہت اوپر لے جانا پڑتا ہے۔

وہ اس طرح ایک [illegible] مقام پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ ان تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل کو جو [illegible] حاضرہ [illegible] طرح ہمارے گلو گیر [illegible] اس انداز سے حل کر کے رکھ دیتا ہے جس کا ہم [illegible] نہیں [illegible] سے ایک [illegible] ہو جاتی ہے جو اپنے مقام کو [illegible] ہے

اور تمام اقوام و ملل سابقہ کے اعمال و کردار کے لئے میزان بن جاتی ہے"

اس کائناتی شعور کی بیداری کے بغیر، زندگی میں نظم و ربط نا ممکن ہے۔ ایک عرصۂ دراز سے مادہ کے ڈھیر کے نیچے دبے ہوئے انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض عقل کے [illegible] پر دنیا میں زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ حقیقت ان پر منکشف ہوتی جا رہی ہے جنہیں فطرت نے آنکھیں عطا کی ہیں، کہ محض عقلی منطق سے دنیا میں زندگی میں نظم نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اگر موجودہ انسان اسی روش پر قائم رہے تو وہ، اگر ان قبائل و اقوام کی طرح جن کا وجود، طبیعی طور پر، دنیا سے ہٹ چکا ہے، فنا نہ بھی ہوئے، تو بھی اپنے لئے وہ ایسے حالات پیدا کر لیں گے (جو ابھی سے پیدا ہو چکے ہیں) جن کے ماتحت زندگی ناممکن ہو جائے گی۔ ایسے حالات جن میں ہر وہ متاع جو انسان کے پاس ہے اس سے چھن جائے گی۔ وہ متاع جو اسے ان انسانوں سے ملی تھی جن کا کائناتی شعور بیدار ہو چکا تھا اور وہ اپنے آپ کو پہچان چکے تھے۔

اس لئے مستقبل عام انسانوں کے ہاتھ میں نہیں۔ وہ ایسے انسان کے ہاتھ میں ہے جو "فوق البشر" ہے جو ہم میں پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے اور زندہ و پائندہ موجود ہے"۔

[OUSPENSKY IN TERTIUM ORGANUM]

سابقہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نگاہوں سے گزر چکا ہے اس پر نگۂ باز گشت ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ (OUSPENSKY) جس "فوق البشر" کے ہاتھ میں انسانیت کا مستقبل قرار دیتا ہے، وہ اس ذات گرامی (علیہ التحیۃ والسلام) کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟

اور برگسان کے الفاظ ہیں۔

"اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ عقل، انسان کا امتیازی نشان ہے۔ یہ بھی ہر ایک کو تسلیم ہے کہ عقل، متاعِ گراں بہا ہے۔ ایسے ہی جیسے فنِ لطیفہ کا کوئی شاہکار گراں قدر ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیز محتاج وضاحت ہے کہ عقل کے فیصلے کس صورت میں مطلق اور واجب التعمیل قرار پاتے ہیں۔ عقل تو صرف دلائل فراہم کرتی ہے جن کی تردید دوسرے دلائل سے ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس پر اصرار کرنا غلطی ہے کہ ہماری اور آپ کی عقل ایسی گراں بہا ہے کہ وہ مجبوراً ہم سے اپنی عظمت کا اعتراف کرا لے، اور اپنے فیصلوں کو منوا لے۔ ہمیں اس کے ساتھ یہ بھی کہنا [illegible] ہوگا کہ [illegible] ل و بصیرت [illegible] کے پیچھے وہ انسان ہیں جنہوں [illegible] نوع انسانی [illegible] [illegible] رنگ [illegible] [illegible] [illegible] طرح عقل کو [illegible] [illegible] یہ وہ گراں قیمت [illegible] ہیں جو ہمیں ایک

صحیح نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قائم کرنے کا ذمہ دار - اس نظام کا بانی جس میں باطل خداؤں تک کی دنیا میں دخل نہ پا سکیں - جس دنیاوی سلطنتوں اور ان کے اوپر ایک آسمانی بادشاہت کا بانی - یہ ہے محمدؐ -

ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ہمارے اس سوال کا جواب دو کہ

کیا دنیا میں اس سے بڑا انسان بھی کوئی ہوا ہے !"

(LAMARTINE HISTOIRE DE LA TURQUIE

VO. II .276 - 277

اور ان تمام شہادتوں سے بلند شہادت کہ جس سے بلند تر شہادت اور کوئی نہیں ہو سکتی، خود خالق کائنات کی شہادت ہے جس نے فرمایا کہ

وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ (۵۳/۷)

(محمدؐ) انسانیت کے بلند ترین مقام پر ہے۔

انسانیت کے معراج کبریٰ اور شرف اعلیٰ کا یہی وہ مقام ہے جس کے پیش نظر، خدا اور اس کے فرشتے "اس ذات گرامی کو مستحق ہزار تحسین و آفرین قرار دیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۳۳/۵۶)